

جملہ حقوق اضافہ و مکمل کتابت محفوظ ہیں۔

کفار و مشرکین شیعہ غیر مقلدین مغرب زدہ سلمان اور جہاں
طبقہ کے اسلام پر اعتراضات و شبہات پر عقلی و نقلی جامع دلچسپ

جوابات

اشرف الجواب ^{مسمیٰ بہ} اُردو عکسی مکمل

منتخب از خطبات

== تالیف ==

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی مدس سرہ

اضافات

حضرت مولانا مفتی محمد ظفر الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند

باہتمام

وقار علی ابن مختار علی

== ناشر ==

مکتبہ تھانوی دیوبند ضلع سہارنپور

فہرست مضامین حصہ اول

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۷	کیا مسلمان کعبہ کی پرستش کرتے ہیں؟	۵	اسلام پر کئے گئے شبہات و اعتراض کے دلائل و جوابات عقل و نقل کی روشنی میں
۱۸	کعبہ کی خصوصیت	۶	حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ
۱۹	کعبہ پر تجلیات الہی	۷	کیا اسلام بزر و شمشیر پھیلا ہے؟
۲۰	حجر اسود کو بوسہ دینے کی وجہ	۸	حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ
۲۱	حجر اسود کو بوسہ دینے کا راز	۹	قاضی کا فیصلہ
۲۲	غلامی کیا اسلام میں قابل اعتراض ہے؟	۱۰	قاضی کے فیصلہ پر مسرت
۲۳	مسئلہ غلامی کی اصل	۱۱	یہودی کا قبول اسلام
۲۴	جیل رکھ کر راحت پہنچانا	۱۲	اہل یورپ کا خیال اور اس کی تردید
۲۵	محمود غزنوی کا ایک واقعہ	۱۳	قانون اسلام
۲۶	اسلامی تعزیرات اعتراض اور اس کا جواب	۱۴	ہندوستان کا واقعہ
۲۷	شریعت کی قدر و قیمت	۱۵	ہندوستان کی مثال
۲۸	کیا جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں ہے؟	۱۶	مدینہ میں اسلام
۲۹	مسلمان کیا رسول اللہ کو خدا تعالیٰ کے برابر سمجھتے ہیں؟	۱۷	جہشہ میں اسلام
۳۰	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشاعت اسلام	۱۸	جہاد کا منشا
۳۱	مے مقصود کیا اپنی تعظیم ہے؟	۱۹	کیا خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی
۳۲	محبت رسول کا حال	۲۰	معفرت کر دے۔
۳۳	محبت کا اثر	۲۱	اللہ تعالیٰ بغیر زبان کے کیسے کلام کرتا ہے
۳۴	صحابہ کا عشق رسول	۲۲	شریعت میں کفر کی سزا دائمی عذاب
۳۵	آنحضرت کا طریقہ کار	۲۳	جہنم کیوں ہے؟

اس کتاب کے جملہ حقوق و عکس کتابت محفوظ ہیں۔

اشرف الجواب

اردو عکسی مکمل

تصنیف	حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ
اضافات	حضرت مولانا مفتی ظیف الدین مفتی دارالعلوم دیوبند
طابع	دقار علی ابن مختار علی
مطبع	تھانوی آفسیٹ پرنٹرز
ناشر	مکتبہ تھانوی دیوبند ضلع سہانپور
کاتب	قمر الدین اعظمی
صفحات	۶۲۲
سن طباعت عکسی ایڈیشن	اپریل ۱۹۹۰ء

== ناشر ==

مکتبہ تھانوی دیوبند یو پی

اسلام پر کئے گئے شبہات و اعتراضات کے مکمل جوابات

عقل و نقل کی روشنی میں

از: محمد ظفر الدین مفتی دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند انگریزی دور حکومت کا سب سے پہلا اسلامی مدرسہ ہے، جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تحریک اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مشورہ اور قاضی عہدہ کے تعاون سے قائم ہوا، اس نے اپنی بے سرو سامانی کے باوجود برصغیر میں جو تعلیمی اور علمی و دینی انجام دی، وہ ہندوستان کی تاریخ کا نمایاں باب ہے، یہاں سے ہزاروں علماء و صلحاء اور اولیاء اللہ پیدا ہوئے، جنہوں نے ملک و ملت کی بیش بہا خدمات انجام دی، اور ان کے فیوض و برکات سے لاکھوں مسلمانوں نے ایمان و یقین کی لذت پائی، اور تعلیمات نبوی کی اشاعت و ترویج میں امتیازی رول ادا کیا، اور آج بھی دارالعلوم دیوبند اپنی اسی پرانی شاہراہ پر گامزن ہے۔ اور کتاب و سنت کی تعلیم میں مشغول ہے۔

ممتاز فرزندان دارالعلوم دیوبند کے انہی گئے چنے علماء میں حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی ذات اقدس بھی ہے، جو بلاشبہ اپنے دور کے امیر قافلہ تھے، اور جنہوں نے ایسے تجدیدی کارنامے انجام دیئے، جن سے ملت اسلامیہ کا مستقبل روشن ہو گیا، اور بہتات و خرافات کے بادل چھٹ گئے۔

آپ کی ایک ہزار سے زیادہ تصنیفات و تالیفات اور مواعظ مطبوعہ شکل میں اب بھی موجود ہیں۔ جن کے نور سے مسلمانوں کے دل منور ہیں۔ اور گم گشتہ راہ لوگ، اسلام کی شاہراہ پانے میں کامیاب ہیں حکیم الامت حضرت تھانوی نے انگریزی دور حکومت میں ان تمام شبہات و اعتراضات پر نگہری نظر رکھی، جو مخالفین اسلام کی طرف سے پیدا ہوتے رہے، یا پیش کئے جاتے رہے، اور پھر ان تمام کا مقولہ مکمل جواب لکھا اور اپنے مواعظ میں بیان فرمایا، جس کی برکت سے دشمنان اسلام کے سارے الزامات و شبہات اور اعتراضات ختم ہو گئے اور مسلمانوں کا ذہن و فکر اسلامی تعلیمات کے سلسلہ میں مطمئن اور پرکون ہو گیا

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۹	عقلی جواب	۳۳	ایک واقعہ
۵۰	مرحوم خسروانہ سے فریب نہیں کھانا چاہیے۔		ایک فلسفی کا قصہ
	گنہگاروں کی مغفرت	۳۸	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عقیدہ
۵۱	ایک شبہ کا ازالہ		ترب لذات زہد نہیں
۵۲	اللہ کا بے انتہا عفو و کرم	۳۹	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر و ضبط
۵۳	کفر سے پہلے والے گناہ		آپ کے نکاح کرنے کی حکمتیں
	مسلمانوں کا جانوروں کو ذبح کرنا	۴۰	امت کو بتانا تھا کہ عورتوں کے ساتھ کیسے رہنا چاہیئے؟
	عقل و نقل کی روشنی میں۔	۴۱	حکمت سوم
۵۵	ایک حکایت		دل کے میلان پر قابو نہیں ہوتا
	مسلمانوں کی رحم دلی	۴۲	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شادی
۵۶	ذبح کرنے پر اعتراض اور اس کا جواب		حبشیوں کا کھیل
۵۷	مردہ کو دفن کرنا بہتر ہے یا جلادینا		بیوی کی رعایت
	حصہ اول ختم شد	۴۳	وقار کا بھوت
			حکمت چہارم
		۴۴	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاح فرمانا
			مزاح کی دوسری حکمت
		۴۵	مزاح سے رعب کم ہوتا ہے
		۴۶	مرتد کا درجہ کافر صلی سے کیوں بڑھا ہوا؟
			ارتداد کا انجام
		۴۷	مسلمان کا اقدام علی الکبائر اور اس کی وجہ
		۴۸	ایک مسلمان کا واقعہ
			دیانت داری کا دوسرا واقعہ
		۴۹	عقیدہ کا اثر

اسی سلسلہ کی ایک کڑی اشرف الجواب نامی کتاب ہے جو اہل علم اور عوام و خواص میں کافی مقبول ہے، مکتبہ تھانوی دیوبند جو اس وقت دیوبند کا سب سے اہم اور مرکزی کتب خانہ ہے، اس کے مالک عزیز کرم و فارغ علی سلمہ کی خواہش ہوئی کہ یہ کتاب جسطرح اپنے مضامین میں ممتاز ہے، کتابت طباعت میں بھی امتیازی شان سے لوگوں کے سامنے آئے اور اسے آفسٹ سے شائع کیا جائے۔

انفوں نے مجھے یہ کہا کہ اس پر میں نظر ثانی چاہتا ہوں، اور ضمنی عنوانات کا اضافہ کر دیا جائے ساتھ ہی ان آیات کا ترجمہ و آحادیث نبوی کا ترجمہ کر دیا جائے، جن کا ترجمہ نہیں ہو سکا ہے، اور جہاں جہاں عربی کے سخت الفاظ آجائیں حاشیہ پر ان کا معنی بھی درج کر دیا جائے،

چنانچہ اس کام کو اپنے لئے سعادت سمجھ کر پوری کتاب کا اسی نقطہ نظر سے میں نے مطالعہ کیا، اور جو خدمت سپرد کی گئی تھی اس کی تکمیل کی سعی کی ہے، اب کتاب آپ کے سامنے ہے خود مطالعہ کر کے اندازہ لگائیں، مجھے توقع ہے اس سے اس کی افادیت میں کافی اضافہ ہو جائے گا۔

آخر میں خاکسار اپنی کتاب مشاہیر علماء دیوبند سے حضرت اقدس کی مختصر سوانح نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔

حضرت حکیم الامتہ تھانوی قدس سرہ

ولادت ۱۲۸۵ھ فراغت ۱۳۱۵ھ وفات ۱۳۶۲ھ

آپ ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ یوم چہار شنبہ کو بوقت صبح صادق اپنے وطن تھانہ بھون ضلع مظفرنگر میں پیدا ہوئے، پہلے حفظ قرآن کیا، فارسی مولانا فتح محمد تھانوی سے پڑھی، ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، مشکوٰۃ، مختصر المعانی اور طاحسن وغیرہ سے پڑھنا شروع کیا تھا، ۱۳۱۵ھ میں باضابطہ فراغت حاصل کی، قرأت اور تجوید آپ نے قاری محمد عبداللہ مہاجر مکی سے حاصل کی۔

فراغت کے بعد تدریس کیلئے کانپور تشریف لے گئے، پہلے تین چار ماہ مدرسہ فیض عام میں قیام رہا۔ پھر مستقل طور پر مدرسہ جامع العلوم میں منتقل ہو گئے۔ اور عرصہ تک اس مدرسہ میں رہ کر درس و تدریس، افتاء اور وعظ کی خدمات انجام دیتے رہے ۱۳۱۵ھ میں سب کچھ چھوڑ کر کانپور سے تھانہ بھون آ گئے، اندر پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آپ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت تھے۔ اور خلافت بھی سرفراز ہو چکے تھے، چنانچہ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ سے بیعت و ارشاد کی خدمت میں مشغول ہو گئے، لاکھوں علماء، صلحا، مشائخ اور خواص و عوام آپ کے میں داخل ہوئے، انہیں سے ۴۲ مجاز بیعت ہوئے، ۵۹ مجاز صحبت قرار پائے ایک ہزار سے زیادہ تصانیف انہیں آپ کے مواعظ شائع ہوئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد الحمد والصلوٰۃ حقیر ناچیز سراپا تقصیر علی محمد لاہوری مظہر مدعا ہے کہ حضرت اقدس سیدنا و مرشدنا حکیم الامت مجدد الملت جامع شریعت و طریقت مولانا و مقتدا محمد اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم نے اسلام پر اغیار کے اعتراضات اور خود مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اور بالخصوص تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اعتراضات کے جوابات اپنی مختلف تقریروں اور تحریروں میں دیئے ہیں۔ چنانچہ حصہ اول میں جو جناب کے سامنے موجود ہے کفار کے بیس اہم اعتراضات کے دندان شکن جوابات ہیں ان سب کو مع حوالہ صفحات و اسما و مواعظ و ملفوظات ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اور سہولت کے لئے اور ضرورت کے وقت حوالہ دیکھنے کے لئے ان مواعظ و ملفوظات کی فہرست ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

۱۔ روح البیع والبیع (۲) ملفوظات، مجادلات معدلت ملحقہ دعوات عبدیت حصہ سوم، ازالۃ الغفلت شعب الایمان، محاسن اسلام، الرفع والوضع، تقلیل الکلام، الحدود والقیود، انصار المہجوب۔

اس کے دوسرے حصہ میں رسومات و بدعات کی تردید اور اشہات کامل کثیر الوقوع اغلاط کی تردید اور اس کے تیسرے حصہ میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ان شکوک و شبہات و اعتراضات کا جواب جو سائنس جدید کی رو سے پیش آتے ہیں۔

کیا اسلام بزورِ شمشیر پھیلے گا؟ !

جواب :- اگر تلوار کے زور سے لوگ اسلام لاتے تو ان کے قلوب (دلوں) پر تلوار کا اثر کیسے ہو جاتا ہے اور دل پر اثر ہو جانے کی دلیل یہ ہے کہ ان کے عادات نہایت پاکیزہ اور شریعت مطہرہ کی تعلیم کے بالکل مطابق ہو گئے تھے۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زہرہ چوری ہو گئی تھی۔ ایک یہودی کے پاس ملی، آپ نے دیکھ کر پہچان لیا اور فرمایا کہ یہ میری زہرہ ہے، یہودی کے گواہ لاؤ۔

حضرت علی کی زہرہ کا واقعہ اللہ اکبر کہ ستر آپ نے اسلامی تعلیم کا نمونہ اپنے کو بنالیا تھا کہ جہاں رعایا کو زبان سے آزاد کیا، عمل سے بھی دکھلادیا کہ ایک یہودی

رعایا کی یہ جرات ہے کہ وہ صاحب سلطنت خلیفۃ المسلیمن سے کہتا ہے کہ گواہ لاؤ اہل انکم یہود خود ایک ذلیل قوم تھی، جب سے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سرکشی کی تھی اس وقت سے

برابر ذلت و خواری ہی کی حالت رہے اور اب بھی جہاں ہیں ذلیل و خوار ہی ہیں۔ سچ کہا ہے
عزیزے کہ از در گمش سرت بافت بہر در کہ شد پیچ عزت نیافت
جس عزیز نے بھی اس کے آستانے سے منہ موڑا وہ جس دروازہ پر گیا تمام عزتوں سے منہ موڑا
پس ایک تو اس کو قومی ذلت اور پھر یہ کہ آپ کی قلمرو و حکومت، کار ہننے والا، مگر اس پر
بھی یہ جرات ہے، صاحبو یہ ہے حقیقی آزادی نہ وہ جو آج کل اختیار کی گئی ہے کہ دین سے نکل گئے
خدا کو چھوڑا، رسول کو چھوڑا، آزادی یہ ہے کہ کسی صاحب حق کی زبان بند نہ کریں، کسی پر ظلم نہ کریں
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ ایک یہودی کا کچھ فرض آپ کے ذمہ تھا، ایک روز اس نے
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بیباکانہ کچھ الفاظ کہے
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کو دھمکایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان لصاحب الحق مقالا (حق
والے کو بولنے کا موقع ہوتا ہے) تو آزادی یہ ہے کہ حکومت میں رعایا کو اتنا آزاد کر دیں، چنانچہ
حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ نے اپنے عمل سے اتنا آزاد بنا دیا تھا کہ اس یہودی نے کہا کہ گواہ لاؤ
یا ناش کرو، چنانچہ حضرت شریح رضی اللہ عنہ کے یہاں جو اس وقت قاضی تھے۔ اور حضرت عمرؓ کے
وقت سے اسی عہدہ جلیلہ پر چلے آ رہے تھے۔ اور جا کر ناش دائر کی، دونوں مذعی اور مدعا علیہ بن کر
مسادات کے ساتھ عدالت میں گئے۔ حضرت شریح رضی اللہ عنہ نے موافق قاعدہ شریعت کے پوچھنا
شروع کیا۔ یہ نہیں کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے آنے سے پہلے بڑ جائے، غرض نہایت اطمینان سے
اس یہودی سے پوچھا کہ کیا زرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہے؟ اس نے انکار کیا، اس کے بعد حضرت
علیؓ سے کہا کہ گواہ لائیے۔

قاضی کا فیصلہ کہ اللہ اکبر ذرا آزادی دیکھئے کہ ایک قاضی سلطنت خود امیر المومنین سے گواہ طلب
کر رہے ہیں اور امیر المومنین بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ جن پر احتمال دعویٰ خلاف
واقعہ کا ہو ہی نہیں سکتا تھا، مگر یہ محض ضابطہ کی بدولت تھا۔ واللہ جن لوگوں نے تمدن سیکھا
اسلام سے سیکھا اور پھر بھی اسلام کے برابر عمل نہ کر سکے غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ دو گواہ لائے
ایک امام حسن رضی اللہ عنہ (جو آپ کے صاحبزادے تھے) اور ایک اپنا آزاد کردہ غلام جن کا نام
قنبر تھا حضرت شریح رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں یہ مسئلہ مختلف فیہ تھا کہ حضرت شریح
رضی اللہ عنہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں جائز نہ سمجھتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک بیٹے
کی گواہی باپ کے حق میں جائز تھی اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو

کو پیش کر دیا۔

آج اختلاف پر علماء کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ اختلاف پہلے ہی سے چلا آ رہا ہے
مگر آج کل کی طرح علماء کو برا بھلا کہنا نہ تھا۔ ایک دوسرے کی تکفیر و تضلیل نہ کرتے تھے۔ آج کل
سب دشم دگلی گلوچ، کی زیادہ تر درجہ علاوہ نفسانیت کے ایک یہ بھی ہے کہ ہر جگہ اصاغر کی علمداری ہے
اکابر (بڑے) خود آپس میں ملتے نہیں کہ اصل بات کا پتہ چل سکے۔ جسطرح بھولے کہہ دیتے ہیں اسی کو صحیح
سمجھا جاتا ہے یہ نہیں کرتے کہ راوی دبیان کرنے والے کو ڈانٹ دیں۔

غرض حضرت علیؓ کا یہ مذہب تھا کہ بیٹے کی گواہی معتبر ہے اور حضرت شریح رضی اللہ عنہ اس کو
مانتے نہیں تھے۔ حضرت شریح رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ
کی گواہی نہیں مانی، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ غلام چونکہ آزاد ہو چکا ہے۔ اس کی گواہی تو
مقبول ہے، مگر بجائے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے کوئی اور گواہ لائیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ
اور تو گواہ کوئی نہیں ہے۔ آخر حضرت شریح رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ خارج کر دیا۔
قاضی کے فیصلہ پر مسرت لیکن حضرت شریح رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان کی
طرح مذہب فروش نہ تھے۔ وہ مذہب کے ہر امر پر جان فدا کرتے تھے۔ اگر حضرت شریح رضی اللہ عنہ سے
پوچھا جاتا تو وہ قسم کھا کر کہہ سکتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سچے ہیں۔ لیکن چونکہ ضابطہ شریعت اجاڑنا
نہیں دیتا تھا، اس لئے آپ نے اپنی عقیدت پر کاروائی نہیں کی۔

یہودی کا قبول اسلام آخر باہر آ کر یہودی نے دیکھا کہ ان پر تو ذابھی ناگواری کا اثر ظاہر نہ ہوا
یادو دیکھ آپ اسد اللہ ہیں (اللہ کے شیر) برسر حکومت ہیں تو کس چیز
نے ان کو برہم نہیں کیا، غور کر کے کہا کہ حقیقت میں اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کا مذہب بالکل سچا ہے
یہ اثر اسی کا ہے، لیجئے یہ زرہ آپ ہی کی ہے اور میں مسلمان ہوتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اشہدان
لا الہ الا اللہ واشہد ان محمداً عبداً ورسولہ۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں نے
یہ زرہ تجھی کو دی، غرض یہ یہودی مسلمان ہو گیا۔ اور آپ ہی کے ساتھ رہا۔ حتیٰ کہ ایک سلامی لڑائی
میں شہید ہو گیا۔ اب بتلایئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار سر پر دیکھ کر مسلمان ہوا یا اس کو نیام
میں دیکھ کر۔ (دعوت ازالہ الغفلۃ ص ۶)

اہل یورپ کا خیال اور اس کی تردید
 اہل یورپ کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کے زور سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور اس کے لئے دلیل میں وہ واقعات جنگ پیش کرتے ہیں کہ سلاطین نے کس قدر خونریزی کی ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا کہ جنگ مطلقاً تمدن کے خلاف ہے۔ آج تمدن کی قوتیں بھی ضرورت کے موقع پر جنگ کرتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ بروقت ضرورت لڑائی کرنا تہذیب و تمدن کے اعتبار سے جائز ہے، بس اب میں ظالم سلاطین کی تو طرفداری نہیں کرتا البتہ خلفائے راشدین کی بابت میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ انھوں نے بنا ر ضعیف (کمزور بنیاد) پر کبھی جنگ نہیں کی، کسی قوی سبب کی بنا پر ہی وہ لڑائی کرتے تھے اور لڑائی کے متعلق اسلامی قانون اگر مخالفین کی نظر سے گذرتا تو کبھی یہ لفظ زبان سے نہ نکالتے، کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے، تو ان میں جنگ اسلام نے بہت سے بتلائے ہیں مگر میں اس وقت ایک مختصر قانون بیان کرتا ہوں۔

قانون اسلام
 اسلام کا مسئلہ ہے اور خلفائے راشدین کا اس پر ہمیشہ عمل درآمد رہا ہے کہ اگر کوئی شخص مقابلے کے وقت تمہارے باپ کو، تمہارے بیٹے کو اور تمہارے بھائی کو، غرض سب متعلقین کو قتل کر ڈالے اور عرصہ تک خونریزی کرتا رہے۔ پھر کسی وقت قابو میں آجائے اور تم اس سے بدلہ لینا چاہو اور وہ زبان سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہے تو حکم ہوتا ہے کہ اس کو فوراً چھوڑ دو۔ اگرچہ تم کو کامل یقین ہو کہ اس نے جان کے خوف سے ہی کہا ہے اور دل سے اسلام نہیں لایا ہے۔ تب بھی فوراً اس سے تلوار اٹھاؤ ورنہ اگر تم نے اس کو مارا تو تم جہنم میں جاؤ گے، اگرچہ یہ بھی خطرہ ہو کہ یہ اس وقت جان بچا کر پھر تم کو قتل کرے گا، جو کچھ چاہے وہ اب اس کا قتل کرنا ہرگز جائز نہیں۔ جو جس مذہب نے اتنی بڑی سپرد وصال دوسروں کے ہاتھوں میں دیدی ہے، اب اس کے بارے میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ بزور شمشیر پھیلا ہے یقین جانئے اس قانون پر ہمارے صاف صابین پوری طرح عمل کرتے تھے۔

ہرمزان کا واقعہ
 ہرمزان نے مسلمان کو بہت سی ایذا میں پہنچائی تھیں آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گرفتار کر کے لایا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر اسلام پیش کیا مگر اس نے نہ مانا۔ آپ نے اس کے قتل کرنے کا حکم دیا، انے ایک چال چلی کہ حضرت عمر رضے عرض کیا کہ آپ مجھے قتل تو کرتے ہی ہیں، میں تھوڑا پانی منگواؤ۔ پنے پانی منگایا۔ جب پانی منگایا تو

لے شائستگی لے اپنے کو مہذب کہنے والا۔

اس نے کہا کہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ پانی نہ پنی سکوں اور جلاد مجھ پر تلوار چلا دے۔ آپ نے فرمایا نہیں جب تک تم یہ پانی نہ پی چکو گے تو اس وقت تک قتل نہ کئے جاؤ گے۔ یہ سنکر اس نے پانی فوراً زمین پر پھینک دیا، اور کہا کہ اب مجھ کو قتل نہیں کر سکتے، کیونکہ اس پانی کا پینا ممکن نہیں اور اس کے پینے تک مجھ کو امن تھا۔ آپ نے اس کو آزاد کر دیا۔ ہرمزان کو اپنی ذات پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ خوب جانتا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان پر کہ تم جب تک پانی نہ پی چکو گے قتل نہ کئے جاؤ گے ہرگز قتل نہ کریں گے، یہ واقعہ دیکھ کر ہرمزان فوراً اسلام لے آیا کہ واقعی یہ دین برحق ہے جس میں مخالف کے ساتھ بھی اتنا سلوک کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ کو بیان کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ اسلام کی یہ تعلیم ہے اور اس پر خلفائے اس طرح پابندی کی ہے کہ انکی نظیر آج تک کوئی دکھا نہیں سکتا۔ ہاں پچھلے بادشاہوں کے ہمزمر ہاں نہیں ہیں اگر انھوں نے ظلم کیا ہے بھگتیں گے۔ ہمارے اسلاف نے ان قوانین پر پورا عمل کیا۔ اور ان کو ترقی و عروج بھی ایسا نصیب ہوا جو کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ صحابہ کے طرز کا دوسری قوموں پر ایسا اثر تھا کہ بہت لوگ جاسوس بن کر آئے مگر ان حضرات کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔

(دعوت شعب الایمان ص ۱۱۱)

ہندوستان کی مثال
 لوگ اسلام کو بدنام کرتے ہیں کہ وہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ واللہ بالکل غلط ہے۔ اگر مسلمانوں کو لوگوں کے زور سے مسلمان کیا کرتے تو آج ہندوستان میں جہاں اسلامی حکومت چھ سو برس تک رہی ہے ایک بھی ہندو باقی نہ رہتا۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب اس اعتراض کے متعلق یہ ہے کہ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو یہ بتلاؤ کہ وہ شمشیر زن کہاں سے آئے تھے؟ کیونکہ تلوار خود سے تو چل نہیں سکتی تو جن لوگوں نے سب سے پہلے تلوار چلائی ہے یقیناً وہ تلوار سے مسلمان نہیں ہوئے تھے، کیونکہ ان سے پہلے تلوار چلانے والا کوئی تھا ہی نہیں، تو ثابت ہو گیا کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔

مدینہ میں اسلام
 تاریخ سے ثابت ہے کہ جہاد مدینہ منورہ میں آکر شروع ہوا اور اہل مدینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ہی زیادہ تر مسلمان ہو چکے تھے، آخر ان کو کس تلوار نے مسلمان کیا تھا اور مکہ معظمہ میں جو کئی سوادمی مسلمان ہوئے اور کفار کے ہاتھوں سے اذیتیں برداشت کرتے رہے وہ کس تلوار سے مسلمان ہوئے تھے۔

حبشہ میں اسلام

پھر ہجرت مدینہ منورہ سے پہلے بعض صحابہؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی ہے اور وہاں کفار قریش کے ساتھ مسلمانوں کا مناظرہ ہوا اور نجاشی شاہ حبشہ نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی زبان سے قرآن شریف سنکر بے تحاشہ رونا شروع کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن شریف کی حقانیت کی گواہی دی اور اسلام قبول کیا۔ اس پیرسی کی تلوار تلوار چلی تھی۔ اسی طرح صد ہا واقعات تاریخ میں موجود ہیں جن سے ثابت ہے کہ اسلام محض اپنی حقانیت سے پھیلا ہے۔

خصوصاً عرب کی قوم جو جنگ جوی میں شہرہ آفاق ہے وہ کبھی اور کسی طرح تلوار کے خوف سے اسلام کو قبول نہ کر سکتی تھی ان کے نزدیک لڑنا امر نامعمولی بات تھی مگر دین کا بدلنا سخت عیب ہے وہ ہرگز تلوار کے خوف سے اسلام نہیں لاسکتے تھے۔ اس پر شاید یہ سوال ہو کہ پھر جہاد کس لئے مشروع ہوا تو خوب سمجھ لو کہ جہاد حفاظت اسلام کے لئے مشروع ہوا نہ کہ اشاعت اسلام کے لئے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ لوگ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی میں پڑے ہوئے ہیں جہاد کی مثال آپریشن جیسی ہے کیونکہ مادے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک متعدی اور ایک غیر متعدی جو مادہ غیر متعدی ہوتا ہے اس کو دواؤں کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے کوئی مہم لگا دیا، یا اس کی مائش کردی وہ دب گیا۔ اور متعدی مادہ کے لئے آپریشن کیا جاتا ہے اس کو چیر کر نکال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح دشمنان اسلام دو طرح کے ہیں بعض تو جن سے صلح کر لینی مناسب ہوتی ہے وہ صلح کر کے مسلمانوں کو ستانا چھوڑ دیتے ہیں اور ان سے تو صلح و مصالحت کر لی جاتی ہے بعض ایسے موزی اور مفسد ہوتے ہیں کہ صلح پر آمادہ نہیں ہوتے یہ مادہ متعدی ہے ان کے واسطے آپریشن کی ضرورت ہے۔ اسی کا نام جہاد ہے پس جہاد سے لوگوں کو مسلمان بنانا مقصود نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی حفاظت مقصود ہے۔

لوگ عالمگیر جتہ اللہ علیہ کو بدنام کرتے ہیں کہ انھوں نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کیا ہے یہ بالکل غلط ہے۔ عالمگیر جتہ اللہ پابند شرع تھے۔ بارہ ہزار تین احادیث کے حافظ تھے۔ قرآن شریف لکھ کر ہدیہ کر کے گزاری کرتے تھے۔ اپنے خرچ میں خزانہ کا ایک پیسہ نہ لاتے تھے۔ ان کے سامنے لاکھوں آدمی کا حکم موجود تھا۔ وہ اس کے خلاف کیونکر کر سکتے تھے یہ تو پہلے واقعات تھے۔ ان سے قطع نظر کہ میں پوچھتا ہوں کہ اچھا اس وقت جو لوگ ہندوستان میں اسلام لاتے ہیں وہ کیوں مسلمان ہوتے ہیں،

ان پر کون سی تلوار کا زور ہے یقیناً اس وقت کسی طرح بھی ان پر زور نہیں ہے بلکہ ہر طرح آزادی ہے نہ ہم ان کو کسی طرح کی طمع دلا سکتے ہیں مسلمان کے پاس اتنا مال ہی نہیں جو وہ طمع دلا کر کسی کو مسلمان کریں بلکہ یہ حالت ہے کہ آج کوئی نو مسلم اسلام لایا تو کل کو اس سے بھی دینی کاموں میں چند ماہ مانگتے ہیں اور اگر کوئی اسلام لاتے وقت ہم سے روپیہ کی درخواست کرے تو ہم صاف کہتے ہیں کہ تم اپنی نجات کے واسطے اسلام لاتے ہو تو لاؤ ورنہ ہم کو لالچ کے ساتھ مسلمان کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ جو دولت ہم تم کو دے رہے ہیں اس کے مقابلہ میں اگر تم خود ہم کو نذرانہ دو تو بہت بجا ہے لیکن باوجود اس آزادی اور اس استغناء کے پھر بھی بہت سے لوگ اسلام لاتے ہیں اور لارہے ہیں۔ اور اسلام لاتے ہی ان کے ایسی حالت ہوتی ہے کہ گویا پھڑا ہوا محبوب ان کو مل گیا۔ ایک ہندو اسلام لانے کے بعد خدا کی محبت اور اس کی یادیں اس قدر روتا تھا کہ جس کا بیان نہیں اور کہتا تھا مجھ کو توبہ معلوم ہوا کہ خدا کس کو کہتے ہیں غرض اس کی عجیب حالت تھی۔ (دعظ حامان اسلام ص ۷۷)

کیا خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کر دے

جواب :- (۱) اسلام وہ چیز ہے کہ اس کے بغیر مغفرت و نجات ممکن نہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کر دے بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ کافر کی مغفرت چاہیں گے نہیں۔ گو قادر ضرور ہیں۔ ورنہ تعذیب کافر پر خدا کا منظر ہونا لازم آئے گا۔ اور اضطراب منافی وجوب ہے۔ اور بدون ایمان و اسلام کے حق تعالیٰ کا کسی کی مغفرت نہ چاہنا قرآن شریف میں جا بجا مذکور ہے چنانچہ ایک آیت تو دہی ہے ان الله لا يقبل ان يشرك به من لم يشرک به مگر شاید اس پر کوئی شبہ کرے کہ یہاں تو صرف مشرک کا ذکر ہے کفر کا ذکر ہی نہیں۔ اور بعض کافر ایسے بھی ہیں جو مشرک نہیں بلکہ موحدا ہیں، مگر اسلام سے آبار کرتے ہیں۔ ان کی مغفرت نہ ہونا اس آیت میں کہاں مذکور ہے تو اس لئے دوسری جگہ مذکور ہے۔

ان الذين كفروا من اهل الكتاب والمشركين ترجمہ۔ بیشک اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جنھوں نے فی ناچہتم خالین فیہا اولئک ہم شرکاء لبریۃ کفر کیا وہ جہنمی آگ میں ہیشہ رہیں گے۔ لوگ نیامیں بدترین ہیں

لے بیشک اللہ مشرک کرنے والوں کو نہیں بخشنے گا۔

دو گھنٹے کی سزا دیدی۔ اگر حاکم ایسا کرے تو کیا آپ اس کو انصاف و رمانیں گے اور سزا کو جنایت کے مناسب مانیں گے۔ ہرگز نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ سزا اور جنایت میں مناسبت کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دونوں کا زمانہ مناسب و مساوی (برابر) ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سزائیں شدت بقدر شدت جرم ہوا اب تم خود فیصلہ کرو شریعت نے کفر کی سزائیں جو شدت بیان کی ہے وہ شدت جرم کے مناسب ہے یا نہیں۔ اور یہ جرم شدید و سخت ہے یا نہیں۔ شاید آپ کہیں کہ جرم شدید تو ہے مگر نہ ایسا شدید کہ اس کی سزا ابد الابد جہنم ہو، میں کہوں گا کہ یہ خیال آپ کو اس لئے پیدا ہوا کہ تم نے صرف فعل کی ظاہری صورت پر نظر کی ہے حالانکہ سزا درجہ کار کا محض اس کی ظاہری صورت پر نہیں ہے، بلکہ نیت کو بھی اس میں بڑا دخل ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اصل مار نیت ہی پر ہے۔

چنانچہ اگر ایک شخص دھوکے سے شراب پی لے تو اس کو گناہ نہیں ہوا۔ ایک مثال :- گو صورت گناہ موجود ہے۔ کیونکہ نیت نہ تھی۔ اگر ایک شخص شراب پینے کے لئے دوکان پر جائے اور دوکاندار بجائے شراب کے کوئی شربت اس کو دیدے جسے یہ شراب سمجھ کر پیئے تو اس کو گناہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی نیت تو اس کی شراب پینے ہی کی تھی۔ اس لئے فقہاء نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے جماعت (صحبت) کرے، مگر وہ اندھیرے میں یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری بیوی نہیں بلکہ کوئی اجنبی عورت ہے تو اس کو گناہ ہوگا اسی طرح جماعت میں تصور کسی اجنبیہ کا کرے، یعنی بیوی سے جماعت کرتے ہوئے یہ تصور کرے کہ میں گویا فلاں اجنبیہ سے جماعت کر رہا ہوں، اور اس کی صورت ذہن میں حاضر ہو، اس سے لذت لے تب بھی گناہ ہوگا اور اگر شب زفاف میں عورتوں نے اس کے پاس غلطی سے بجلے اس کی بیوی کے کسی دوسری عورت کو بھیج دیا جس کے ساتھ یہ شخص یہ سمجھ کر ہم بستر ہوا کہ یہ میری بیوی ہے تو اس کو گناہ نہ ہوگا اور یہ وطی زنا میں شمار نہ ہوگی بلکہ وطی بالشرع ہوگی جس سے ثبوت نسب بھی ہو جاتا ہے اور عدت بھی لازم ہوتی ہے۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی تو سمجھو کہ ظاہر میں گو کفر کا فرمتنا ہی ہے۔

مگر اس کی یہ نیت تھی کہ اگر زندہ رہا تو ابد الابد (ہمیشہ ہمیشہ) اسی حالت میں رہے گا اس لئے اپنی نیت کے موافق اس کو ابد الابد جہنم کا عذاب ہوگا۔ اور اسی طرح مسلمان کا اسلام گو متناہی ہے مگر اس کی نیت یہ ہے کہ اگر میں ہمیشہ زندہ رہوں گا تو ہمیشہ اسلام پرستقیم رہوں گا

اس لئے ابد الابد تک ثواب جنت میں ملے گا۔

(۲) دوسرا ایک دقیق (باریک) جواب یہ ہے کہ کفر سے حقوق الہیہ کی تفویض ہے اور حقوق الہیہ غیر متناہی ہیں تو ان کی تفویض کی سزا بھی غیر متناہی ہونی چاہیے اور اسلام میں حقوق الہیہ کی رعایت ہے اور وہ غیر متناہی ہیں تو ان کی رعایت کا بدلہ بھی غیر متناہی ہونا چاہیے الحمد للہ اب یہ اشکال بالکل مرتفع ہو گیا۔ (محاسن اسلام ص ۲)

کیا مسلمان کعبہ کی پرستش کرتے ہیں؟

جواب یہ ہے کہ ہم کعبہ کی پرستش نہیں کرتے بلکہ عبادت خدا کی کرتے ہیں اور صرف منہ قبلہ کی طرف کرتے ہیں اور اس کے لئے ہمارے پاس بہت سے دلائل ہیں ایک یہ کہ ہم خود اس کی مبودیت کی نفی کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی عابد اپنے مبود کی مبودیت کی نفی نہیں کیا کرتا دوسرے یہ کہ نماز پڑھتے ہوئے اگر کسی کے دل میں کعبہ کا خیال بھی نہ آئے، مگر کعبہ کی طرف منہ رہے تو نماز درست ہے چنانچہ بہت لوگ ایسے ہیں کہ مسجد میں اگر نماز شروع کرتے ہیں اور کعبہ کا خیال تک ان کو کچھ نہیں آتا پھر بھی ان کی نماز درست ہوتی ہے۔ اگر ہم کعبہ کی عبادت کرتے تو اس کی نیت کرنا شرط ہوتا مگر ایسا نہیں ہوتا ہے تیسرے یہ کہ اگر کسی وقت کعبہ نہ رہے جب بھی نماز فرض رہے گی، اور اس کی طرف منہ کیا جاوے گا جہاں کعبہ موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان پتھر اور اینٹ کو نہیں پوجتے ورنہ انہدام کعبہ کے بعد نماز موقوف ہو جاتی۔ چوتھے یہ کہ اگر کوئی شخص سقہ کعبہ پر نماز پڑھے تو اس کی نماز درست ہے اگر کعبہ مسلمانوں کا مبود ہوتا تو اس کے اوپر چڑھ کر نماز صحیح نہ ہوتی۔ کیونکہ اب اس کے سامنے نہیں ہے۔ دوسرے مبود (خدا) کے اوپر چڑھنا گستاخی ہے، اس حالت میں کسی طرح نماز درست نہ ہونا چاہیے تھی مگر فقہار نے تصریح کی ہے کعبہ کی چھت پر بھی نماز صحیح ہے تو کیا مبود کے اوپر چڑھا کرتے ہیں۔ ہاں معتضین نے اپنے اوپر قیاس کیا ہوگا کہ وہ گائے اور بیل کو دیوتا اور مبود بھی سمجھتے ہیں پھر ان کے اوپر سواری بھی کرتے ہیں مگر اس کا خلاف عقل ہونا ظاہر ہے۔ (ایضاً)

کعبہ کی طرف منہ کرنا کا داوا :- اب آپ کو بتلاتا ہوں کہ استقبالِ قبلہ کا راز یہ ہے کہ عبادت کی روح دلجمعی اور یکسوئی ہے بدوں دلجمعی اور یکسوئی کے عبادت کی صورت ہی صورتِ ہوتی ہے روح نہیں پانی خانی اور یہ ایسی بات ہے جو کو نام اہل دیاں تسلیم کرتے ہیں۔ اب سمجھئے کہ اجتماعِ خواطر اور اجتماعِ ظاہر کو بہت بڑا دخل ہے اس لئے نماز میں سکونِ اعضا کا امر ہے۔ التفات و عبت سے ممانعت ہے صف کے سیدھا کرنے کا امر ہے کیونکہ صف کے طیر ٹھکانے سے قلب پریشان ہوتا ہے، عام قلوب کو اس کا احساس کم ہوگا، کیونکہ ان کو دلجمعی و یکسوئی بہت کم نصیب ہے۔ مگر جن کو نماز میں دلجمعی کی دولت نصیب ہے ان سے پوچھئے کہ صف طیر صی ہونے سے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے، صوفیہ قسم کھا کر کہتے ہیں صف غیر شکم سے قلب کو بہ جان و پریشان ہوتی ہے۔ اس دلجمعی کیلئے سجدہ گاہ پر نظر جمائے کی تاکید ہے۔ کیونکہ جگہ جگہ نظر گھمانے سے بھی قلب کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔ پس نماز میں اگر ایک خاص جہت مقرر نہ ہوتی تو کوئی کسی طرف منہ کرنا کوئی کسی طرف منہ کرتا، اس اختلافِ جہات و تباہیِ بینات سے تفرقِ قلب ہوتا لہذا ایک سوئی کیلئے ایک خاص جہت مقرر کر دی گئی۔

کعبہ کی خصوصیت رہا یہ کہ کعبہ ہی کی جہت کیوں مقرر ہوئی۔ اور جہت کیوں نہیں ہوئی؟ اس سوال کا کسی کو حق نہیں۔ کیونکہ یہ سوال دوسری جہت کو بھی ہو سکتا ہے۔ کہ یہی کیوں ہوئی۔ دوسری کیوں نہ ہوئی۔ دیکھئے عدالتِ وقت مقرر کرنی ہے کہ کچھ ہی کا وقت فلاں وقت تک ہے تو آپ یہ سوال تو کر سکتے ہیں کہ وقت کوئی کیا ضرورت ہے جس کا جواب یہ دیا جائے گا۔ تاکہ کام کرنے والے سب کے سب معاً ساتھ حاضر ہو سکیں اور رعایا اہل حاجت کو وقت مقرر ہونے سے اطمینان ہو جائے کہ عدالت کا یہ وقت ہے تو اس کے علاوہ اوقات میں وہ اپنے دوسرے کام کر سکیں اگر وقت مقرر نہ ہو تو ہر شخص کو تمام دن عدالت میں ہی رہنا پڑے کہ نہ معلوم کس وقت حاکم آجائے باقی اس سوال کا کسی کو حق نہیں کہ گورنمنٹ نے دس بجے سے چار بجے ہی تک کا وقت کیوں مقرر کیا کوئی اور وقت مقرر کر دیا ہوتا کیونکہ وہ کوئی بھی وقت مقرر کرتی یہ سوال تو کبھی ختم نہ ہو سکتا تھا۔ علیٰ ہذا ہم کو یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ جہت کعبہ ہی کو استقبال کے لئے کیوں مخصوص کیا گیا۔ ہاں ہم نے اس کا راز بتلادیا کہ خاص جہت کے تعین میں کیا مصلحت ہے۔ یہ جواب تو ضابطہ کا ہے۔ اور طالب

کے لئے یہ جواب ہے کہ حق تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کی (یعنی حق تعالیٰ کی توجہ کس طرف زیادہ ہے جس طرف ان کی توجہ زیادہ تھی اسی کو جہتِ صلوة مقرر فرمایا ہے۔

کعبہ پر تجلیاتِ الہی سو جن کے آسمانوں میں وہ جانتے ہیں کہ واقعی کعبہ پر تجلیاتِ الہی بہت زیادہ ہیں اور توجہ سے یہی مراد ہے اور وہی تجلیاتِ روح کعبہ اور حقیقت کعبہ ہیں یہی وجہ ہے کہ کعبہ ظاہری کی چھت پر بھی نماز ہو جاتی ہے کیونکہ اس وقت کو صورت کعبہ سامنے نہیں مگر حقیقت کعبہ یعنی تجلی الہیہ تو سامنے ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان اصل قلبی الہی کا استقبال کرتے ہیں کعبہ کی دیواروں کا استقبال نہیں کرتے مگر چونکہ تجلی الہی کا احساس ہر شخص کو نہیں ہوتا اسلئے حق تعالیٰ نے اس خاص بقعہ کی حد مقرر فرمادی جس پر ان کی تجلی دوسرے مکاناتوں سے زیادہ ہے۔ پس یہ عمارت محض اس تجلیِ اعظم کی جگہ دریافت کرنے کیلئے ہے ورنہ خود عمارت مقصود بالذات نہیں چنانچہ انہدامِ عمارت کے بعد نماز کا موقوف نہ ہونا اور کعبہ کی چھت پر نماز کا درست ہونا اسکی دلیل ہے۔ فقہار نے اس راز کو سمجھا ہے اس لئے وہ فرماتے ہیں کہ قبلہ رخ وہ ہوا ہے جو کعبہ کی محاذات میں آسمان تک اور اس کے نیچے زمین کے اسفل طبقات تک سے لیکن چونکہ عمارت کعبہ اور اس جگہ کو تجلی الہی سے تلبس ہے اس تلبس کی وجہ سے اس میں بھی برکت آگئی۔

حجر اسود کو بوسہ دینے کی وجہ

جواب یہ ہے کہ تقبیلِ حجرِ عظمت سے نہیں بلکہ محبت سے ہے جیسے بیوی بچوں کا بوسہ لیا کرتے ہیں۔ اگر بوسہ دینا عظمت کی دلیل ہے تو لازم آئے گا کہ ہر شخص اپنی بیوی کی عبادت کرتا ہے اور اس کا لغو ہونا بدیہی ہے معلوم ہوا کہ تقبیل (بوسہ دینا) عبادت و تعظیم کو مستلزم نہیں بلکہ کبھی محبت سے بھی تقبیل ہوا کرتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ تم حجر اسود سے محبت کیوں کرتے ہو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے گھر کی بات ہے اس کے متعلق مخالف کو سوال کرنے کا حق نہیں دیکھئے اگر کوئی شخص عدالت میں یہ مقدمہ دائر کر دے کہ فلاں مکاں میری ملکیت میں ہے تو اس سے اس پر ثبوت طلب کیا جائے گا۔ لیکن جب وہ ثبوت پیش کر دے گا تو خصم (مخالف) کو اس سوال کا حق نہیں کہ اچھا مکان تو تمہارا ہی ہے مگر یہ بتلا دو کہ اس گھر میں کیا کیا سامان

موجود ہے۔ یا کوئی شخص بیوی کا بوسہ لے تو اس سے یہ سوال تو ہو سکتا ہے کہ تم اس کا بوسہ کیوں لیتے ہو، لیکن جب وہ یہ بتلا دے کہ میں محبت کی وجہ سے بوسہ لیتا ہوں، تو پھر اس سوال کا کسی کو حق نہیں کہ تم کو بیوی سے محبت کیوں ہے۔ اور تم رات دن میں کتنے اس کے بوسے لیتے ہو، اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس کی وجہ نہیں بتلا سکتے کہ ہم کو حجر اسود سے محبت کیوں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مخالفین کے اعتراض کا جواب اسی حد تک دینا چاہیے جہاں تک ان کو سوال کا حق ہے اور جو سوال ان کے منصب سے باہر ہو اس کا جواب نہ دینا چاہیے بلکہ صاف کہہ دینا چاہیے کہ تم کو اس سوال کا کوئی حق نہیں۔ مخالفین کا دماغ ہر بات کی حقیقت سمجھنے کے قابل نہیں۔ امور رفیعہ کو ان کے سامنے نہ بیان کرنا چاہیے۔ بعض لوگ اس پر تعجب کرتے ہیں کہ وہ وجہ کو منسی ہے جس کو ہم نہیں سمجھ سکتے ہیں آخر ہم بھی تو انسان ہیں اگر باریک بات ہمارے سامنے بیان کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کو ہم نہیں سمجھ سکیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایسی بات ہے تو میں ایک ریاضی داں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اقلیدس کی کوئی شکل ایک گھس گھسے کو سمجھا دیں۔ جس نے اقلیدس کے مبادی و اصول موضوعہ کو کبھی نہ سنا ہو یقیناً وہ اقرار کرے گا کہ میں ایسے شخص کو اقلیدس کے اشکال نہیں سمجھا سکتا۔ آخر کیوں کیا وہ انسان نہیں۔ مگر بات وہی ہے کہ بعض امور کے لئے مبادی و مقدمات کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کے ذہن میں مبادی و مقدمات حاضر ہوں ہر شخص اس کو نہیں سمجھ سکتا اور یہ بالکل موٹی بات ہے مگر حیرت ہے کہ آجکل کے عقلا کی کچھ میں یہ بات نہیں آتی۔

حجر اسود کو بوسہ دینے کا راز میں تبرعاً اس کا راز بھی بتلائے دیتا ہوں تقبیل حجر اسود کے راز کے متعلق میں کہہ چکا ہوں کہ اس کا منشاء عظمت و عبادت نہیں بلکہ محض محبت اس کا منشاء ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس حقیقت کو مجمع عام میں ظاہر کر دیا۔ ایک بار آپ طواف کر رہے تھے اس وقت کچھ لوگ دیہات کے موجود تھے۔ جب آپ نے تقبیل حجر کا ارادہ کیا تو حجر کے پاس ذرا اٹھ رہے اور فرمایا **انی اعلم انک الحجر** ۳۰ من۔

یعنی میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ کچھ نفع دے سکتا ہے اور نہ ضرر دے سکتا ہے اور اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھتا تو میں بھی تجھے بوسہ نہ دیتا کیا خشک معاملہ کیا ہے۔ حجر کے ساتھ۔ بھلا اگر مسلمان کا یہ معبود ہوتا تو کیا اس سے بھی خطاب کیا جاتا کہ نہ تو

نفع دے سکتا ہے نہ ضرر پہونچا سکتا ہے اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ اس تقبیل کا منشاء محض محبت کی وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بوسہ دیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فضل بھی کسی جگہ گرا ہو تو ہم کو اس جگہ سے محبت ہوگی۔ چہ جائے کہ وہ جگہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ لگے ہوں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ کا دہن مبارک لگا ہو۔

بامید آنکہ جاناروزے رشیدہ باشد
باغک آستانش داریم جہہ سائی
رہا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کیوں بوسہ دیا اس سوال کا کسی کو حق نہیں اور نہ ہم کو اس کو وجہ بتلانا ضروری ہے۔ ہاں اتنی بات یقین ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور عبادت و عظمت کے بوسہ نہیں دیا۔ ورنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بیباکی کیساتھ لاتقص و تنفح نہ فرماتے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے۔ جب انھوں نے حجر کیساتھ یہ معاملہ کیا تو یقیناً اس تقبیل کا منشاء عبادت ہرگز نہیں اور تبرعاً اس کا جواب بھی بتلائے دیتا ہوں کہ ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حجر کے اندر تجلیات الہیہ کا بہ نسبت دوسرے حصص بیت کے زیادہ ہونا منکشف ہوا ہو پس منشاء اس تقبیل کا تلبس زائد ہے۔ تجلیات الہیہ سے اور جس چیز کو خوب کے الوار سے تلبس ہو اس کا بوسہ دینا اقتضائے محبت ہے۔

احمد علی الدیلمی الخ ص ۳۱

غلامی کا مسئلہ کیا اسلام میں قابل اعتراض ہے؟

جواب :- معاشرت میں اسلام کا یہ حکم ہے کہ اپنے غلاموں کی سرخطائیں روز معاف کیا کرو اس سے زیادہ خطائیں ہوں تو کچھ نہ زاد۔ بھلا غلاموں کے ساتھ یہ برتاؤ کوئی غیر مسلم کر سکتا ہے۔ غلام تو کجا اولاد کے ساتھ بھی کوئی ایسا برتاؤ نہیں کر سکتا مگر افسوس باوجود اس قدر رعایت کے پھر بھی مخالفوں کو اسلام کے مسئلہ غلامی پر اعتراض ہے میں کہتا ہوں کہ اسلام نے تو غلاموں کے ساتھ وہ برتاؤ کیا ہے کہ ان کے باپ بھی ان کے ساتھ ویسا نہیں کر سکتے تھے۔

مسئلہ غلامی کی اصل مسئلہ غلامی کی اصل یہ ہے کہ اس میں مخلوق کی جان بچائی گئی ہے کیونکہ جب تک دشمن مسلمانوں کے مقابلے میں فوج کشی کرتا ہوا اور اس کے ہزاروں لاکھوں آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہوں تو اب ہمیں کوئی بتلا دے کہ ان سے

قیدیوں کو کیا کرنا چاہیے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ان سب کو رہا کر دیا جائے اس کا حاق ہونا ظاہر ہے کہ دشمن کے ہزاروں لاکھوں کی تعداد کو پھر اپنے مقابلے کیلئے مستعد کر دیا۔ ایک صورت یہ ہے کہ سب کو فوراً قتل کر دیا جائے اگر اسلام میں ایسا کیا جاتا تو مخالفین جتنا شور و غل مسئلہ غلامی پر کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اس وقت کرنے کے دیکھے کہ کیا سخت حکم ہے کہ قیدیوں کو فوراً قتل کر دیا گیا۔ ایک صورت یہ ہے کہ سب کو کسی جیل خانے میں بند کر دیا جاوے اور وہاں رکھ کر انکو روٹی پکڑا دیا جاوے یہ صورت گو کہ آج کل کی بعض متمدن سلطنتوں میں پسندیدہ ہے مگر اس میں چند خرابیاں بھی ہیں ایک یہ کہ اس سے سلطنت پر بڑا بار عظیم پڑتا ہے اور ان سے کمائی کرنا خود غرضی کی صورت ہے۔ پھر جیل خانے کی حفاظت کے لئے ایک خاص فوج مقرر کرنا پڑتی ہے۔ قیدیوں کی ضروریات کے لئے بہت سے آدمی ملازم رکھے جاتے ہیں، یہ سارا عملہ بیکار ہو جاتا ہے۔ سلطنت کے کسی اور کام میں نہیں آسکتا قیدیوں ہی کی حفاظت کا ہو رہتا ہے۔

جیل میں رکھ کر راحت پہونچانا پھر تجربہ شائد ہے کہ جیل خانے میں رکھ کر آپ چاہے قیدیوں کو کتنی ہی راحت پہونچائیں ان کی ان کو کچھ قدر نہیں ہوتی کیونکہ آزادی سلب ہونے کا غیظ ان کو اس قدر ہوتا ہے کہ وہ آپ کی ساری خاطر مدارات کو بیکار سمجھتے ہیں تو سلطنت کا اتنا خرچ بھی ہوا اور سب بے سود کہ اس سے دشمن کی دشمنی میں کمی نہ آئے پھر قید خانے میں ہزاروں لاکھوں قیدی ہوتے ہیں وہ سب کے سب علمی اور تمدنی ترقی سے بالکل محروم رہتے ہیں اور یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ اسلام نے اس کے بجائے یہ حکم دیا کہ جتنے قیدی گرفتار ہوں سب لشکر والوں کو تقسیم کر دو، ایک گھر میں ایک غلام کا خرچ معلوم بھی نہ ہوگا۔ اور سلطنت بار عظیم سے بچ جائیگی، پھر چونکہ ہر شخص کو اپنے قیدی سے خدمت لینے کا حق بھی ہے اس لئے وہ اس کو روٹی پکڑا جو کچھ دیا کہ اس پر گراں نہ ہوگا۔ وہ سمجھے گا کہ میں تنخواہ دیکر نوکر رکھتا۔ جب بھی خرچ ہوتا اب اس سے خدمت لوں گا، اور اس سے معاوضہ میں روٹی پکڑا دوں گا۔ پھر چونکہ غلام کو چلنے پھرنے میں تفریح کرنے کی آزادی ہوتی ہے قید خانے میں بند نہیں ہوتا ہے اس لئے اس کو اپنے آقا پر غیظ نہیں ہوتا جو جیل خانے کے قیدی کو ہوتا ہے۔ اس حالت میں اگر آقا نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اس کا احسان دل میں گھر کر لیتا ہے اور وہ اس کے گھر کو اپنا گھر اس کے گھر والوں کو اپنا عزیز سمجھنے لگتا ہے۔

یہ سب باتیں ہی نہیں بلکہ واقعات ہیں۔ پھر اس صورت میں غلام علمی اور تمدنی ترقی بھی تو کر سکتا ہے کیوں کہ جب آقا غلام میں اتحاد ہو جاتا ہے تو آقا خود چاہتا ہے کہ میرا غلام ہندوستانی ہو، وہ اس کو تعلیم بھی دلاتا ہے، صنعت و حرفت بھی سکھاتا ہے چنانچہ اسلام میں صد ہا علماء زیاد عیا دیئے ہوئے ہیں جو اصل میں مولیٰ تھے۔ غلاموں کے طبقہ نے تمام علوم میں ترقی حاصل کی بلکہ غلاموں کو بعض دفعہ بادشاہت بھی نصیب ہوتی ہے۔

محمود غزنوی کا ایک واقعہ

سلطان محمود رحمۃ اللہ علیہ کو مخالفین بہت بدنام کرتے ہیں کہ انھوں نے تلوار سے اسلام پھیلایا ہے مگر تاریخ میں ان کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ اس سے ان کی رحم دلی اور شفقت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ کہ غلاموں کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ تھا۔ ایک بار سلطان محمود نے ہندوستان پر حملہ کیا اور بہت سے ہندو قید ہوئے جن کو اپنے ساتھ غزنی لے گئے ان میں ایک غلام بہت ہونہار و ہوشیار تھا، اس کو آزاد کر کے سلطان نے ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم دی جب وہ تعلیم سے فارغ ہوا تو اس کو حکومت کے عہدے دیئے گئے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس کو ایک بڑے ملک کا صوبیدار بنادیا صوبہ دار کی حیثیت اس وقت وہ تھی جو آج کل کے بڑے والی ریاست کی حیثیت ہوتی ہے جس وقت سلطان نے اس کو تخت پر بٹھلایا اور تاج سر پر رکھا تو وہ غلام رونے لگا، سلطان نے فرمایا کہ یہ وقت خوشی کا ہے یا غم کا۔ اس نے عرض کیا جہاں پناہ اس وقت مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آکر پھر اپنی یہ قدر و منزلت دیکھ کر رونا آگیا۔ حضور میں جس وقت ہندوستان میں بچہ تھا آپ کے حملات منکر ہندو کا پتے تھے اور ان کی عورتیں اپنے بچوں کو آپ کا نام لیکر ڈرایا کرتی تھیں جیسا ہوا سے ڈرایا کرتی ہیں میری ماں بھی مجھے اسی طرح آپ کے نام سے ڈرایا کرتی تھیں میں سمجھتا تھا کہ نہ معلوم محمود کیسا ظالم و جابر ہوگا حتیٰ کہ آپ نے خود ہمارے ملک پر حملہ کیا اور اس فوج سے آپ کا مقابلہ ہوا جس میں یہ غلام موجود تھا۔ اس وقت تک میں آپ کے نام سے بھی ڈرتا تھا۔ پھر میں آپ کے ہاتھوں قیدی ہوا۔ تو میری جان ہی نکل گئی کہ بس اب خیر نہیں مگر حضور نے دشمنوں کی روایات کے خلاف میرے ساتھ نیک برتاؤ فرمایا کہ آج میرا تاج سلطنت رکھا جا رہا ہے تو اس وقت میں خیال کر کے رونے لگا کہ کاش آج میری ماں ہوتی تو میں اس سے کہتا کہ دیکھ یہ وہی محمود ہے جس کو ہوا بتلایا کرتی تھی

غلامی کا کرشمہ :- ایسے واقعات اسلام میں بکثرت ہیں اور یہ اسی مسئلہ غلامی کا نتیجہ ہے اگر یہ لوگ قید خانہ میں قید کر دیئے جاتے تو نہ ان کو مسلمانوں سے انس ہوتا نہ مسلمانوں کو ان سے تعلق ہوتا۔ غلام بن کر یہ لوگ مسلمانوں میں ملے جلے رہے۔ علمی ترقی حاصل کرتے رہے آخر کار اپنی حیثیت کے موافق درجات و مناصب پر فائز ہوتے رہے۔ کوئی محدث بنا۔ کوئی فقیہ، کوئی قاری بنا۔ کوئی مفسر، کوئی نحوی بنا، کوئی ادیب، کوئی قاضی ہوا، کوئی حاکم۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کی نہایت رعایت فرمائی کہ آپ کا حکم ہے جو خود کھاد۔ جو خود پہنود ہی پہناؤ۔ اور جب وہ کھانا پکانا کر لائے تو اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھاؤ۔ عین وصال کے وقت میں آپ کی آخری وصیت یہ تھی۔ الصلوٰۃ و ما ملکت ایمانکم۔ یعنی نماز کا خیال رکھو اور ان غلاموں کا بھی جو تمہارے ہاتھوں کے نیچے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا رعایت ہو سکتی ہے۔ اور الحمد للہ حضرات صحابہ و تابعین اور اکثر سلاطین اسلام نے غلاموں کے ساتھ ہی برتاؤ کیا، اگر کسی ایک دو نے اس کے خلاف عمل درآمد کیا تو وہ اپنے فعل کا خود دمہ دار ہے اس پر اسلام سے اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ایضاً ۵

اسلامی تعزیرات پر اعتراض اور اس کا جواب

آج کل متمدن اقوام نے قصاص باسیف کی جگہ پھانسی تجویز کی ہے یہ بھی سخت موزی ہے کیونکہ اس میں روح نکلنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہوتا اور قتل میں جان نکلنے کا راستہ ہو جوتا ہے پھانسی میں تڑپنے کی وجہ سے زبان باہر نکل آتی ہے۔ اور صورت بگڑ جاتی ہے اور ان سے زیادہ متمدن اقوام نے ایک برقی کرسی تجویز کی ہے جس پر بیٹھے ہی ایک سکڑ میں جان نکل جاتی ہے نہ معلوم اس میں کیسی کشش ہوگی اور روح پریریا گذرتی ہوگی۔ مگر چونکہ دیکھنے والوں کو اس تکلیف کا احساس نہیں ہوتا اس لئے یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں تکلیف نہیں اور قتل میں لاش کے تڑپنے اور سر کٹنے خون پہنے کا منظر سامنے ہوتا ہے اس لئے اس کو وحشی سزا سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے ہاں یوں کہو کہ تم نے اپنی رعایت کر لی تمہارے سامنے بھیا نک منظر نہ ہوا اور اس سے قیاس کر لیا کہ جب میرے سامنے بھیا نک منظر نہیں تو واقع میں بھی کچھ تکلیف نہیں مگر یہ قیاس الغائب علی الشاہ ہے اور یہی اصل ہے تمام نیکیات کے انکار کی جو چیز نظر سے غائب ہے وہ ان کے نزدیک معدوم محض ہے۔

انہوں نے عدم مشاہدہ کو عدم ان کی دلیل بنالیا ہے، حالانکہ امریکہ کا مشاہدہ پہلے ایک عرصہ تک نہ ہوا تھا تو کیا وہ اس وقت بھی معدوم اصلی تھا؟ اور اس کا بطلان ظاہر ہے تو اب اس سوال کے کیا معنی کہ جنت دوزخ اگر کوئی چیز ہے تو وہ ہم کو نظر کیوں نہیں آتی تم کو نظر نہ آنے سے یہ کیونکر لازم آیا کہ وہ معدوم ہیں اسی طرح تم کو اگر پھانسی یا برقی کرسی کی سزا میں تکلیف کا منظر نظر نہیں آتا تو اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ مرنے والے کو بھی تکلیف زیادہ نہیں ہوتی، دلیل عقلی کا مقتضی تو یہ ہے کہ قتل میں مرنے والے کو کم تکلیف ہوتی ہے۔ اور ان مہذب سزاؤں میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے کیونکہ موت نام ہے زہوق روح یعنی جان نکلنے کا اور جن طریق میں جان نکلنے کا راستہ پیدا کیا جائے یقیناً اس میں سہولت سے جان نکلے گی۔ اور جن صورتوں میں گھونٹ کر دبا کر جان نکالی جائے گی، ان میں سخت تکلیف سے جان نکلے گی۔ گودیر کم لگے گی۔

شریعت کی قدر و قیمت :- یہاں سے شریعت کی قدر ہوتی ہے کہ اس نے مجرم کیساتھ بھی احسان کیا ہے اور اس کی آسانی کی رعایت کی ہے کہ تلوار سے قصاص کا امر کیا ہے، رہا یہ کہ اس سے دیکھنے والوں کو وحشت ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جس غرض کے لئے قصاص شروع ہوا ہے یہ وحشت اس غرض سے تحصیل میں معین و مددگار ہے یعنی زجر و تنبیہ کہ اس منظر کو دیکھ کر شخص خائف ہو جائے اور جرائم پر اقدام کرنے سے رک جائے اور جو صورتیں اہل تمدن نے تجویز کی ہیں اس سے دوسرے کو زجر و تنبیہ زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ وحشت ناک منظر سامنے نہیں آتا البتہ مجرم کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اور یہ سخت بے رحمی ہے جب ایک شخص کو جان ہی سے مارنا ہے، تو اس کو راحت دیکر مارنا چاہیئے۔

حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم عام فرمایا ہے۔ اذا قتلتم فاحسوا القتل اذا ذبحتم فاحسوا الذبح جس میں قصاص کی بھی تخصیص نہیں بلکہ قتل کفار کو اور زجر حیوانات کو بھی عام ہے۔ پس شریعت نے ظالموں کی بھی رعایت کی ہے کہ ان کو بے رحمی اور بے دردی سے نہ مارا جائے اور دوسروں کی بھی رعایت کی ہے دوسروں کی رعایت قصاص میں یہ ہے کہ وکم فی القصاص حیوة یا ادبی الاباب لعلمکم تتقون کہ قصاص میں لوگوں کو جراثیم سے زجر کامل ہوتا ہے۔ (افتا المحجب ص ۶)

کیا جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں ہے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں محض تخویف و ترغیب کے لئے یہ نام بیان کئے گئے ہیں۔ نعوذ باللہ ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن میں جتنی وعیدیں چوری، زنا، ظلم و ستم، کفر و معصیت پر ہیں یہ سب ایسی ہیں جیسے بچوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ چپ رہو۔ ہوا آجائے گا ایسے جتنے انعامات جنت و دوزخ میں بیان کئے گئے ہیں بھی محض پھسلایا ہے جیسا کہ بچوں کو پھسلایا کرتے ہیں میل و گول سے جواب میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ بات ادنیٰ حاکم کے کلام میں ہونا بھی سخت عیب ہے چہ جائیکہ احکم الحاکمین کے کلام میں ہو، کیونکہ اس کو تو تھوٹ موٹ، پہلا نالوتے ہیں اور خدا جھوٹ سے بالکل بری ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک المصنف

لیکن اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جنت و دوزخ محض ترغیب و ترہیب کے لئے ہے اور واقع میں کچھ بھی نہیں تو رغبت و رعبت اسی وقت تک ہو سکتی ہے جب تک کہ مخاطب کو یہ راز معلوم نہ ہو کہ کیونکہ ظاہر ہے بعد اصل حال معلوم ہوجانے کے کہ یہ ترغیب و ترہیب ایک غیر واقعی امر ہے رغبت و شوق و رعبت بالکل نہیں رہ سکتی پھر ان لوگوں کا اس امر کے معلوم ہونے کا دعویٰ کرنا کہ جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں سراپا غلط ہے عرض اول تو اس کے خلاف جاننے سے معاذ اللہ کلام اللہ پر لغویت کا دھبہ آتا ہے، جس کو کلام الہی کے لئے ہرگز گوارا نہیں کر سکتا پھر جو مقصود شارع کو ان وعیدوں اور ان کاموں کے بیان کرنے سے ہے کہ لوگوں کو مکلف و عقید بنایا جائے اس صورت میں ہرگز نہیں حاصل ہو سکتا ایسا شخص جس کا ان وعیدوں کے بارے میں ایسا خیال ہے کہ یہ غیر واقعی ہیں یقیناً ارتکاب جرائم میں دیر ہوگا۔ اول تو یہ سب کے سامنے جو چاہے گا کرے گا۔ اگر سامنے کرنے میں کسی کا پاس و لحاظ ہو تو تنہائی میں تو بالکل نہ چونے کا۔ مثلاً فرض کر دو کہ ایک شخص اس خیال کا جنگل میں ہے اور وہاں ایک دوسرے شخص بھی موجود ہے سوائے ان دو شخصوں کے وہاں کوئی موجود نہیں، نہ پولیس چوکی اور پہرہ، اب فرض کر لو کہ اتفاق سے اس دوسرے کی شخصیت کی موت آگئی اور اس کے پاس ایک لاکھ روپیہ کا نوٹ ہے اور اس کے کاغذات سے اس کا پتہ بھی معلوم کر لیا کہ فلاں خاندان کا اور فلاں شہر کا باشندہ ہے اور بھی اسے خبر ہے کہ اس کا وارث ایک یتیم بچہ ہے یہ سب کچھ ہے مگر اس واقعہ کو کسی کو خبر نہیں کہ یہ شخص کہاں مرا اور اس کے پاس

مرتے وقت کیا سامان تھا نہ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے نہ مقدمہ چل سکتا ہے بتلایے ایسی حالت میں یتیم بچہ تک روپیہ پہنچا دینے پر کوئی خوف اس شخص کو بجز خوف خدا عذاب آخرت کے مجبور کر سکتی ہے۔ اور کیا ایسا شخص جو وعید الہی کو محض تخویف سمجھتا ہے اس روپے کو اصل وارث تک پہنچا دے گا۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ اس روپے کی حاجت بھی ہو۔ یہ اسی شخص کا کام ہے جو خدا کے تمام وعدے و وعید کو حق سمجھتا ہے اور اس کے دل میں عذاب آخرت کا خوف ہے، اس گندے عقیدے سے جہاں مصالح شرعیہ برباد ہوتی ہیں مصالح تمدنیہ بھی بالکل فوت ہوئے جاتے ہیں، اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ تمدن کے لئے مذہب کی کس قدر ضرورت ہے صرف حکومت سے تمدن ہرگز قائم نہیں ہو سکتا کیوں کہ حکومت کا زور محض ظاہر تک منحصر ہے۔ دل میں شائستہ اخلاق مذہب ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہے کہ تمدن کے مدعی مذہب کی ضرورت سے کیوں ناواقف ہیں۔ اگر کوئی ضروری چیز ہے تو مذہب اس سے پہلے ضروری ہوگا، مذہب کی ضرورت نہ مان کر کوئی تمدن قائم کرنا چاہے تو ناممکن ہے۔ دعویٰ تمدن کے بعد مذہب سے لاپرواہی کرنا ایسا ہی ہے کہ

بیٹے بر سر شاخ دین می برید
خداوندستان نگہ کرد و دید
تو یہ لوگ جس تمدن کی شاخ پر بیٹھے ہوئے ہیں اسی کی جڑ کوٹ رہے ہیں۔ پس عجیب بات ہے کہ قول سے تو ضرورت تمدن ثابت کی جاتی ہے اور فعل سے اس کی نفی کی جاتی ہے عرض آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ جنت و دوزخ دینی چیزیں ہیں۔
(وعظ شعب الایمان ص ۱۸)

مسلمان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کے برابر سمجھتے ہیں؟

جواب :- شاید کسی مخالف کو یہ شبہ ہو کہ کیا مسلمان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدائے تعالیٰ کے برابر ہیں تو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ عبادت میں مسلمانوں کے نزدیک خدا کا کوئی شریک نہیں حصہ دار بھی اس میں شریک نہیں ہیں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرنا نہ ان کی زندگی میں جائز تھا نہ اب آپ کی قبر کو سجدہ جائز ہے مگر اطاعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے نہ اس لئے کہ آپ شریک فی الاطاعت ہیں، بلکہ اس لئے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب خدا کی طرف سے پیغام ہوتا ہے تو آپ کا حکم درحقیقت آپ کا حکم نہیں بلکہ پیغمبر ہونے کی

وجہ سے وہ خدای کا حکم ہے اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کے احکام کی اطاعت خدا کے احکام کی اطاعت ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ص ۴۴۲۔

اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے بادشاہ وزیر کو حکم دیتا ہے کہ رعایا میں یہ قانون شائع کر دو۔ پس اس وقت وزیر کی زبان سے جو قانون شائع ہو رہا ہے وہ درحقیقت بادشاہ کا حکم ہے اس لئے وزیر کی اطاعت بعینہ بادشاہ کی اطاعت ہے مگر اس سے ہرگز کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ وزیر بادشاہ کے برابر ہو گیا۔ اور اگر کوئی شخص ایسا سمجھنے لگے اور آئندہ سے بجائے بادشاہ کے تخت کو بوسہ دینے کے وزیر کی کرسی کو بوسہ دینے لگے تو یقیناً وہ معتوب ہوگا، اسی طرح اگر آپ کسی مقدمہ میں ایک شخص کو وکیل کر دیں تو جو کچھ وہ کہتا ہے سب آپ کی طرف منسوب ہوتا ہے کہ گویا تم خود کہہ رہے ہو مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وکیل تمہارے برابر ہو گیا کہ تمہاری جائداد کا مالک ہو جاوے کہ اس میں جو چاہے تصرف کرے ہرگز نہیں پس مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو خدا کی اطاعت اسی منیٰ کہتے ہیں جیسے وزیر کی اطاعت بادشاہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اور وکیل کا تول مول کا تول ہوتا ہے خوب سمجھ لو کہ اس سے شرک و مساوات ہرگز لازم نہیں آتی مگر انہوں نے یہ ہے کہ مخالفین اعتراض کرتے ہوئے مسائل اسلامیہ کی حقیقت کو ذرا نہیں سمجھتے ہیں اور اگر سمجھتے ہیں تو منشا اعتراض کا محض حد ہے درنہ مسائل اسلامیہ پر کوئی اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا۔ (فارس اسلام ص ۶)

(۱۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشاعت اسلام سے

مقصود کیا اپنی تعظیم ہے؟

جواب :- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اشاعت اسلام سے اپنی تعظیم کرنا نہ تھا۔ کیونکہ جو شخص بڑا بننا چاہتا ہے وہ تو خود اس کی کوشش کرتا ہے کہ لوگ میرے سامنے جھکیں۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت کہ لوگ آپ کو سجدہ کرنا چاہتے تھے اور آپ نے ان کو اس سے منع کیا اور صرف منع ہی نہیں کیا بلکہ اپنا فانی ہونا اس پر ظاہر فرما دیا۔ مگر پھر بھی بعض جہلار کفر کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض ہے کہ نفوذ باللہ آپ بڑا بننا چاہتے تھے اور دلیل میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر ایک صحابی کو اپنا موئے مبارک دیئے تھے کہ مسلمانوں میں ان کو تقسیم کر دو اس پر وہ جاہل کھتا ہے کہ دیکھئے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بال اس لئے تقسیم کرائے تاکہ لوگ اس کو تبرک سمجھ کر تعظیم سے رکھیں تو گویا آپ نے بڑا بننا چاہا۔ استغفر اللہ یہ آج کل کی فہم و عقل ہے انہوں نے اس شخص کو عبادت و محبت کے مستغنیٰ میں بھی فرق معلوم نہیں، واقعی کفار کو محبت و عشق کا چسکا نہیں لگا۔ اسی واسطے وہ ایسے واقعات کی حقیقت نہیں سمجھتے جی تو یہ چاہتا ہے کہ ان لوگوں کو جواب بھی نہ دیا جائے۔ اور یہ کہہ دیا جائے۔

بامعی بگوئید اسرار عشق و مستی بگزار تا بمیر دور رنج خود پرستی

مگر میں تبرعاً اس کا جواب دیتا ہوں تاکہ کسی مسلمان کو اس اعتراض سے شہ ہو تو وہ اس جواب سے تسلی حاصل کر سکے،

محبت رسول کا حال

بات یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بال کن لوگوں میں تقسیم کرائے تھے، آپ نے ان لوگوں میں بال تقسیم کرائے تھے جن کی محبت کی یہ حالت تھی کہ جب آپ وضو کرتے تھے تو وضو کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرنے دیتے تھے۔ بلکہ آپ کا ٹھوک اور سارا وضو کا پانی اپنے ہاتھوں میں لے لیتے تھے۔ منہ کو ملنے آنکھوں سے لگاتے تھے اور ہر شخص اس کی کوشش کرتا تھا کہ سب سے پہلے آپ کے وضو کا پانی اور آپ کا ٹھوک میرے ہاتھوں میں آئے۔ چنانچہ اس کی کوشش میں ایک دوسرے پر گر پڑتا تھا اور ان کی محبت کا یہ حال تھا کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھے لگوائے اور اس کا خون ایک صحابی کو دیا کہ اس کو کسی جگہ احتیاط سے دفن کر دو۔ صحابی کی محبت نے گوارا نہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خون زمین دفن کیا جائے انھوں نے الگ جا کر اسے خود پی لیا۔ اس پر یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ نفوذ باللہ صحابی بہت ہی محسوس تھے کہ ٹھوک ملتے ہوئے اور خون پیتے ہوئے گھن نہ آتی تھی۔ بات یہ ہے کہ ان امور کا تعلق عشق و محبت سے ہے۔ اور اس کی حقیقت عاشق ہی سمجھ سکتا ہے جس کا مذاق یہ ہے۔

غیرت آن چشم برم روئے تو دیدن ندیم گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندیم
صاحبو! اگر آپ کو بھی کسی سے عشق ہوا ہو تو آپ کو معلوم ہوا
محبت کا اثر ہوگا کہ عاشق بعض دفعہ محبوب کی زبان اپنے منہ میں لے کر چومتا ہے

اور عشاق لعاب دہن محبوب کی بی بیچن نثر کے دفتر اشعار میں لکھ جاتے ہیں تو کیا یہ محسوس ہیں ہرگز نہیں اگر یہ بے حس ہیں تو سمجھئے کہ ساری دنیا بے حس ہے کیونکہ محبت میں ہر شخص یہی کرتا ہے کوئی

عاشق اس سے بچا ہوا نہیں اسی طرح اگر کسی کے محبوب کے بدن میں خون بنے تو عاشق اس جگہ منہ لگا کر خون چوستے ہیں تاکہ محبوب کے بدن میں خون بنے لگے تو عاشق اس جگہ منہ لگا کر خون چوستے ہیں تاکہ محبوب کو زخم کی تکلیف کا احساس نہ ہو یا کم ہو جائے معلوم ہوا کہ خون چوسنا بھی کوئی گھن کی بات نہیں عاشق کو اس سے جو خط ہوتا ہے اس کے دل سے پوچھنا چاہیے پھر جب ادنیٰ ادنیٰ محبوب کا لعاب دہن اور خون گھن کی چیز نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تھوک اور پسینہ اور خون کیونکر گھن کی چیز ہو سکتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ قدرتی طور پر آپ کا تمام بدن خوشبودار تھا آپ کے پیسے میں اس قدر خوشبو تھی کہ عطر کی خوشبو اس کے سامنے بے حقیقت تھی۔ آپ کا لعاب دہن نہایت خوشبودار اور شیریں تھا اور یہی حال آپ کے خون کا تھا تو ایسی چیز سے کون گھن کر سکتا ہے مگر کفار کو ان امور کی کہاں خبر نہ ان کو عشق و محبت کی ہوا لگی ہے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سے اطلاع ہے۔

صحابہ کا عشق رسول

بہر حال صحابہؓ آپ کے ایسے عاشق تھے کہ وضو کا پانی زمین پر نہ گرنے دیتے تھے اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے لئے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے تھے تو ایسی جماعت سے کیا یہ امید تھی کہ وہ آپ کے بالوں کو زمین میں دفن ہونے دینگے کیونکہ یقیناً بال کا درجہ وضو کے پانی سے زیادہ تھا۔ اس کو محض جسم سے تلبس (ملاپ) ہوا تھا اور یہ تو بدن کا جزو ہے پس اگر آپ اپنے بالوں کو دفن کر لے تو یقیناً صحابہؓ زمین میں سے ان کو نکالنے کی کوشش کرتے۔ پھر اس میں ہر شخص یہ کوشش کرنا کہ میرے ہاتھ میں زیادہ بال آئیں تو ایک دوسرے پر گزرتا اور عجب نہیں کہ قتال کی نوبت آجاتی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح قتال سے صحابہؓ کو بچانے کیلئے اپنے بال خود ہی تقسیم کر دیئے۔ اور دفن نہ کر دئے، بتلائے اب اس میں کیا اشکال ہے پس معلوم ہو گیا کہ آپ کا اپنے بال تقسیم کرنا اپنی تعظیم و عبادت کے لئے نہ تھا بلکہ صحابہؓ کی محبت پر نظر کرتے ہوئے ان کے نزاع و قتال کے رفع دفع کرنے کے لئے تھا اگر معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ذرہ برابر بھی بڑائی و تکبر کا خیال ہوتا تو آپ عمدہ لباس پہنتے، مکان عمدہ بناتے، نفیس نفیس کھانے کھایا کرتے، آپ کے پاس خزانہ جمع ہوتا، مگر تاریخ شاہد ہے اور احادیث میں صحیح طریقے سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس موٹا چھوٹا ہوتا تھا آپ کے مکانات سب گچے تھے آپ اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھتے تھے۔

آنحضرتؐ کا طریقہ کار :- یہ نہیں کہ آپ کے پاس مال آسانہ تھا۔ نہیں۔ بعض جنگ میں اتنا مال آیا کہ اس کا شمار نہیں ہو سکتا تھا بکریوں سے جنگل کے جنگل بھر گئے تھے اور آپ نے وہ سب بکریاں ایک اعرابی کو اس کے سوال پر عطا فرمادیں اور اس قدر تھے کہ آپ نے کسی کو تلو کسی کو دو تو عنایت فرمائے۔ جب بحرین کا جزیہ آیا تو اتنا روپیہ تھا کہ مسجد کے اندر سونے کا ڈھیر لگ گیا۔ مگر آپ نے کھڑی دیر میں سب کا سب صحابہ کرام کو تقسیم فرمایا اور اپنے واسطے ایک درہم بھی نہ رکھا تو کیا بڑائی چاہنے والا یہ گوارہ کر سکتا ہے کہ خود تو خالی ہاتھ رہے اور خلق کو مال مال کر دے۔ پھر آپ کی یہ حالت تھی کہ راستہ میں جب چلتے تھے تو صحابہؓ کو اپنے سے آگے چلنے کا حکم کرتے تھے اور خود پیچھے چلتے، بعض دفعہ کوئی صحابہؓ سواری پر سوار ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ پیدل چلتے، اور وہ اتنا چاہتے اور آپ منع فرماتے اکثر آپ اپنا سودا بازار سے خود لے آیا کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی کام میں آپ سے امداد لینا چاہتا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتا لے جاتا آپ اس کا کام کر دیتے تھے، گھر میں اگر آپ اپنے گھر کا کام بھی کرتے تھے، کبھی بکری کا دودھ خود نکال لیا کرتے تھے، کبھی جو اپنے ہاتھ سے کاٹھ لیا، کبھی آٹا گوندھ دیا۔ آپ بعض دفعہ زمین پر بیٹھ جاتے، اور یہ پر لیٹ جاتے تھے جس سے آپ کے پہلو پر نشان ہو جاتے، بعض دفعہ کسی یہودی کا آپ پر قرض ہوتا اور وہ تقاضہ کرنے میں سختی کرتا برا بھلا کہتا اور حضرات صحابہ کو یہودی پر غصہ آتا وہ اس کو دھمکانا چاہتے تو آپ صحابہؓ کو منع فرماتے اور یہ ارشاد فرماتے کہ صاحب کو کہنے سننے کا حق ہے۔

اس جاہل مقرر سے کوئی پوچھے کیا بڑائی اور عظمت چاہنے والوں کے یہی حالات ہوا کرتے ہیں۔ انوس کہ اس نے ایک بال تقسیم کرنے کا واقعہ لیا، اور ان تمام واقعات سے اندھا ہو گیا۔ سو میری تقریر سے معلوم ہو گیا کہ بال تقسیم کرنے کا واقعہ بھی بڑائی یا عظمت کے واسطے نہ تھا بلکہ اس میں وہی تمدن اور سیاسی مصلحت تھی جو میں نے ابھی ذکر کی۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بال تقسیم فرما کر قیامت تک کے لئے یہ بات بتلا دی کہ میں فانی ہوں اور بشر ہوں کیوں کہ بال متغیر و حادث ہیں کبھی وہ سر کے اوپر ہیں کبھی استرے سے مونڈ کر جلائے جاتے ہیں تو جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کو دیکھے گا (چنانچہ بعض جگہ بھلا اللہ اب تک آپ کے بال محفوظ ہیں۔ اور لوگ ان کی زیارت کرتے ہیں، تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فانی و بشر ہونے پر استدلال کرے گا اور سمجھ جائے گا کہ آپ انسان تھے خدا نہ تھے

تو اس سے آپ نے مسلمانوں کی توحید کو کامل فرمایا۔ نہ کہ اپنی عظمت و بڑائی چاہی۔ ع
چوں نذیر نہ حقیقت رہ افسانہ روند، (ایضاً ص ۵)

نجات کیلئے صرف خدا پر ایمان لانا کافی ہے۔ ص ۵۷

حواہ :-

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق قطع کرنا مطلق سلب فیوض و کمالات کا سبب ہے اگر
چہ گستاخی بھی نہ کرے یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو شخص توحید کو نجات کے لئے
کافی سمجھتے ہیں۔ تصدیق رسالت کو ضروری نہیں سمجھتے، افسوس مسلمانوں میں بھی بعض لوگ
ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید کی تعلیم کے لئے آئے
تھے، تو جو شخص توحید کا اقرار کرے وہ نجات پائے گا۔ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار
نہ کرے۔ یاد رکھو یہ قول بالکل باطل ہے، نجات بدون تصدیق رسالت کے ہرگز نہیں
ہو سکتی، جس طرح توحید رکن ایمان ہے، اسی طرح تصدیق رسالت بھی رکن ایمان ہے
لوگوں نے اس آیت سے دھوکہ دینا چاہا ہے۔
ان الذین آمنوا

ترجمہ :- جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی اور نصرانی ہیں اور
جو صابی ہیں (ان میں سے) جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان
لے آئے اور اچھے کام کرے (قانون شریعت کے موافق) ایسوں کے لئے
ان کے پروردگار کے پاس حق الخدمت بھی ہے، اور وہاں ان پر کسی طرح کا
اندیشہ بھی نہیں۔ اور نہ وہ معوم ہوں گے۔

اس آیت میں تصدیق رسالت کا ذکر (ظاہراً) نہیں ہے بلکہ سب فقرات کی نجات
کا مدار صرف ایمان و عمل و ایمان بالآخرت قرار دیا گیا ہے اس سے بعض لوگوں نے اس
غلطی میں ڈالنا چاہا کہ نجات کے لئے تصدیق رسالت محمدیہ کی ضرورت نہیں۔ جواب اس کا
یہ ہے کہ ایمان باللہ و ایمان بالآخرت بغیر تصدیق رسالت محمدیہ کے متحقق ہی نہیں ہو سکتا
پس یہ کہنا غلط ہے کہ یہاں تصدیق رسالت کا ذکر نہیں۔

ایک واقعہ

تفصیل اس سے جواب کی وہ ہے جو میں نے ایک ڈبئی ملکٹر سے کہلا بھیجی تھی وہ
بندہ خدا بھی اس غلطی میں مبتلا تھے ویسے بڑے نیک پابند صوم و صلوة تھے، مگر
شیطان نے ان کے دل میں یہ دوسو سو ڈال رکھا تھا کہ نجات کے لئے صرف ایمان باللہ کافی ہے
تصدیق رسالت کی ضرورت نہیں۔ واقعی بدون علم دین کے کامل اصلاح نہیں ہوتی۔ عقائد بھی
درست نہیں ہوتے۔ افسوس آج کل لوگوں نے انگریزی پڑھنے کو بھی علم سمجھ لیا ہے۔ پس وہ
ایسا ہی علم ہے جس سے روپیہ پیسہ معلوم ہو جاتا ہے۔ خدا اس سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ میں نے
ڈبئی صاحب کو کہلا بھیجا کہ ایمان باللہ کے صرف یہی معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو موجود مان لے کیونکہ وجود کا
انکار مشرکین بھی نہیں کرتے بلکہ ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو صفات کمال سے متصف
اور صفات نقص سے منزہ سمجھتے ہیں اب میں کہتا ہوں کہ صفات کمال میں سے ایک صفت صدق
بھی ہے جس کے ساتھ خدا کو موصوف ماننا توحید کے لئے ضروری ہے۔ اور صفات نقص میں سے
ایک صفت کذب بھی ہے۔ جس سے خدائے تعالیٰ کو منزہ سمجھنا لازم ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اور
دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن
کا کلام الہی ہونا دلائل عقلیہ سے ثابت ہے۔ تو اس خبر کو بھی سمجھنا واجب ہے۔ پس جو آپ کو
رسول نہیں مانتا وہ خدا تعالیٰ کو کاذب کہا تو پھر اللہ تعالیٰ پر کہاں ایمان لایا، پس ثابت ہو گیا کہ
خدائے تعالیٰ پر ایمان لانا بدون تصدیق رسالت کے ممکن نہیں، میں نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ جواب
کے لئے دس سال کی مہلت ہے۔ اس دلیل کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پھر خدائے انکی
اصلاح کر دی بعد میں مجھ سے ملے بھی تھے اس وقت ان کا شبہ بھی رفع ہو چکا تھا۔ بیچاروں
کا خاتمہ اچھا ہوا۔ بس خوب سمجھ لو کہ بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے نجات ہرگز نہیں ہو سکتی۔
ایک فلسفی کا قصہ | ایک فلسفی کی بابت ایک شخص نے خواب دیکھا تھا۔ میں اس فلسفی
کا نام بتلانا نہیں چاہتا خواہ مخواہ ایک مسلمان سے خواب کی بنا پر
بدگمانی ہو جائے مگر اس شخص کے خیالات تھے فلسفیانہ مگر ظاہر میں مسلمان کہلاتا تھا خواب یہ تھا
کہ ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زیارت نصیب ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت
کیا کہ حضور فلاں شخص کا کیا حال ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ بدون میرے تورہ کے جنت میں جانا چاہتا
تھا، مگر میں نے ہاتھ پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا کہ دور ہو کجخت۔ جنت میں بغیر میرے تعلق کے
کوئی نہیں جاسکتا۔ غرض آپ امت کے لئے واسطی العروص ہیں تمام کمالات و فیوض میں

بدون آپ کے واسطے کے کوئی شخص بھی کمالات بلکہ ایمان سے بھی موصوف نہیں ہو سکتا۔ اسی کو حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔

پندار سعدی کہ راہ صفا
خلاف پیمبر کے رہ گزید
یہ تو ان کے واسطے ہے جو بدون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے اس راستہ کو
قطع کرنا چاہیں اور تعلق والوں کے واسطے انشاء اللہ یہ ہوگا۔
سے نماز بعصیان کے درگرد
اور یہ ہوگا۔
کہ دار و جنیں سید ہیں رو

طوبی لنا معشر الاسلام ان لنا
من الغایت رکنًا غیور منہدم
(وعظ الرفع والوضع ص ۲۹)

تمہارے نبی کو معراج جسمانی ۱۶ ص ۵۶

جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عروج صوری یعنی گروج آسمانی کا انکار کرتے ہیں اور اس معراج کو منافی (غواب) یا کشفی بتلاتے ہیں سو یہ بالکل نصوص کے خلاف ہے بلکہ احادیث مشہورہ سے آپ کا آسمان پر تشریف لے جانا ثابت ہے اور بیت المقدس تک تشریف لے جانا نص قرآنی سے ثابت ہے جس کا انکار بلاتوا دلیل کفر ہے، اور بتاویل بدعت، ان منکرین معراج آسمانی کے پاس کچھ دلائل تو عقلی ہیں، کچھ نقلی، عقلی دلائل تو یہ کہ اس سے افلاک میں خرق و التیام (پھٹنا اور ملنا) لازم آتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ کے پاس خرق و التیام پر کوئی دلیل نہیں اور جب وہ دلائل پیش کریں گے تو اس وقت انشاء اللہ ہم ان سب کا نعو اور باطل ہونا ظاہر کر دیں گے۔ چنانچہ متکلمین اس سے فارغ ہو چکے ہیں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ بطرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا قصہ احادیث میں آتا ہے کہ آپ اپنی جلدی سیر ملکوت سے فارغ ہو کر واپس آگئے کہ صبح بھی نہ ہونے پائی تھی یہ محالات سے ہے کہ مکہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے ساتواں آسمان تک آپ سیر کر آئیں اور یہ سارا قصہ ایک رات کے تھوڑے حصہ میں ہو جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس میں استحالة محال ہونے کی کیا بات ہے۔ وہاں استبعاد ہو سکتا ہے، سو وہ بھی

بطور الزام کے اس طرح مدفوح ہے کہ تمہارے نزدیک زمانہ حرکت فلک الافلاک کا نام ہے چنانچہ رات اور دن کا آنا طلوع وغروب کا ہونا یہ سب حرکت فلک (آسمان) سے مربوط ہے اگر حرکت فلک موقوف ہو جائے تو جو وقت موجود ہو گا وہی رہے گا۔ اگر رات موجود ہوگی تو رات موجود ہوگی تو رات ہی رہے گی۔ دن موجود ہوگا تو دن ہی رہے گا۔ تو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے اس رات حرکت فلک کو تھوڑی دیر کے لئے موقوف کر دیا ہو اور اس میں کچھ تعب نہیں۔ معزز مہمان کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے دنیا میں بھی یہ قاعدہ ہے کہ جب بادشاہ کی سواری نکلتی ہے تو سڑک پر دوسروں کا چلنا بند کر دیا جاتا ہے۔ ہم جب حیدر آباد آگئے تو ایک دن دیکھا کہ پولیس کے سپاہی لوگوں کو سڑک پر چلنے سے روک رہے ہیں اس وقت سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی سواری نکلنے والی ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے اگر آسمان اور چاند سورج سب کی حرکت کو اس رات کچھ دیر کے لئے بند کر دیا ہو کہ جو چیز جہاں ہے وہیں رہے پس آفتاب جس جگہ تھا وہیں رہا اور ستارے جہاں تھے وہیں رہے کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ پایا۔ اس میں کیا تعجب ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے فارغ ہو گئے۔ پھر فلک کو حرکت کی اجازت ہو گئی تو اب ظاہر ہے کہ حرکت فلک جس جگہ سے موقوف ہوئی تھی وہیں سے شروع ہوگی تو آپ کی سیر میں چاہے جتنا ہی وقت صرف ہو اور مگر دنیا والوں کے اعتبار سے سارا قصہ ایک ہی رات میں ہوا ہو۔ کونکہ حرکت زمانہ اس وقت موقوف ہو چکی تھی۔ اب اگر کوئی دوام حرکت افلاک کا دعویٰ کرے تو وہ اس کے الزام کو ثابت کرے۔ انشاء اللہ ایک ہی قائم نہ کر سکے گا۔ دوسرا عاشقانہ جواب اس اشکال کا مولانا نظامی نے دیا ہے۔

تن او کہ صافی نراز جان ملت اگر آمد و شد بیک دم رواست

یعنی یہ بات سب کو معلوم ہے خیال انسان ذرا سی دیر میں بہت دور پہنچ جاتا ہے چنانچہ آپ اسی وقت عرش کا تصور کیجئے تو ایک منٹ سے بھی کم میں عرش پر خیال پہنچ جائے گا۔ خیال کی حرکت بہت سریع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال روح کی ایک قوت ہے اور روح نہایت لطیف چیز ہے اور مادیات کی طرح کشیف نہیں اس لئے اس کی سیر میں کوئی حاجب مانع نہیں ہوتا۔ مولانا نظامی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک

کے اس ارشاد کا مطلب صاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر تک گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش کیجاتی۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ساری رات اپنے گھر سے جدا ہی نہیں ہوئے وہیں رہے تاکہ اس سے منامی معراج یا کشفی پر استدلال کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ گھر سے جدا تو ہوئے مگر زیادہ دیر نہیں لگی جس سے گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو اور تلاش کی نوبت آئی ہو۔ اور اگر فقدان کے وہی معنی لئے جائیں جو متبادر ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم شرب معراج میں گم نہیں ہوا تب بھی اس سے معراج کا روحانی یا منامی ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے اس رات جدا نہیں ہوئے۔ کیونکہ فقدان فعل متعدی ہے نہ کہ لازم اس کے معنی غیبت و انقصال کے نہیں بلکہ گم کرنے کے ہیں جس کے لئے ایک فاقد اور دوسرے کا مفقود ہونا ضروری ہے پس مطلب یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رات کسی نے گھر سے غائب اور گم نہیں پایا اور یہ درست ہے کیونکہ آپ گھر والوں کے ساتھ گھر میں سوئے ہوئے تھے اور معراج ایسے وقت ہوئی کہ عادتاً لوگوں کے گہری نیند سونے کا وقت تھا۔ پھر جانے کے وقت سے آپ واپس تشریف لے آئے بلکہ خود اگر گھر والوں کو نماز صبح کے لئے جگایا تو ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے رات کو جاگ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر میں نہ دیکھا ہو اور اتنی بات مقصود ہونے کے لئے ضروری ہے۔ قلت ولعل ههنا المصداق

غرض اس میں شک نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہوئی اور آپ اس جسم سے آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ اس کا انکار ہرگز نہیں ہو سکتا اور یقیناً یہ صورت عروج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا کمال ہے۔ (دعظ الرفع والوضع ص ۳۷)

تمہارے نبی تارک لذات المصداق

آج عیسائی فخر کرتے ہیں کہ ہمارے نبی تارک لذات تھے اور مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارے نبی تارک نہ تھے قبیح شہوت تھے کہ لونکاح کئے جس کا ناواقف مسلمان ان کے سامنے چھپتے ہیں سوا کہ ترک لذات لازم نہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کو ضرور ترک کرتے تاکہ فی النہی کو مسلمانوں پر اعتراض کا موقع نہ ہو تا جملہ اعتراض کلیتہً ایک بے ادب گوارنے ایک بے ادب عیسائی کے جواب میں بک دیا کہ پہلے تم یہ ثابت کر دو کہ عیسیٰ علیہ السلام میں قوت مردانگی بھی تھی

تو ہمارے خیال سے بھی پاکیزہ تر ہے۔ جب خیال ذرا سی دیر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے تو آپ کا جسم اظہر زمین سے آسمان تک اور وہاں سے عرش تک ذرا سی دیر میں ہوا آئے تو امین تعجب کی کیا بات ہے ایک بیل فلاسفہ پیش کیا کرتے ہیں کہ ہوا کے طبقہ سے اوپر جو خلا ہے اس میں ہوا نہ ہوگی سبکٹی تنفس زندہ نہیں ہو سکتا تو آپ امین سے اگر گذرتے تو زندہ کیسے رہتے۔ مگر انہوں نے یہ دیکھا کہ بعد تسلیم اس استدلال کے یہ اس وقت ہے جب متنفس (سانس لینے والے) کو اس میں کچھ مکث (تاجرا) بھی ہو چنانچہ آگ کے اندر سے اگر جلدی جلدی ہاتھ کو نکالا جاوے تو آگ کا اثر نہیں ہوتا۔ پس اگر آپ نہایت سرعت کے ساتھ اس خلا سے گذر جائیں تو وہ عدم تنفس میں موثر نہ ہوگا۔ اور دلیل نقل ان منکرین کے پاس حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول ہے۔ واللہ ما فقد جسد محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی لیلة الاسراء کہ بخدا شرب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مفقود یعنی غائب نہیں ہوا۔ اس کا جواب لوگوں نے یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کہاں تھیں۔ نیز اس وقت ان کی عمر بہت ہی کم تھی شاید چار یا پانچ سال کی ہو۔ اور اگر معراج صحت نبوت میں ہوئی جیسا کہ زہری کا قول ہے تو وہ اسی سال پیدا ہوئی ہونگی (جامع) اس لئے اجل صحابہ کی روایت اس واقعہ میں انکی روایت سے مقدم ہے مگر اس کا حاصل بظاہر یہ ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بے تحقیق ایک روایت فرمادی ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ گمان نہیں کر سکتے نہ کسی صاحب ادب کو ایسی جرات ہو سکتی۔ یہ مانا کہ اس وقت وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں موجود نہ تھیں اور کم سن بھی تھیں مگر جو بات وہ فرما رہی ہیں وہ تو عقل و بلوغ کے زمانے میں ان سے صادر ہوئی ہے اور ایسے وقت میں وہ بدون تحقیق کے کوئی بات نہیں فرما سکتیں یقیناً تحقیق کے بعد فرما رہی ہیں ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے واقعہ کی نسبت فرماتی ہوں کیونکہ معراج میں تعدد ہے تو پھر کچھ بھی مضائقہ نہیں۔ میرے ذہن میں اس کا جو جواب آیا ہے وہ بہت لطیف ہے وہ یہ کہ فقدان کے دو معنی ہیں ایک تو چیز کا اپنی جگہ سے گم ہو جانا، ہٹ جانا۔ دوسرے تلاش کرنا۔ چنانچہ دوسرے معنی میں فقدان کا استعمال نص میں بھی آیا ہے۔ قالوا واثبوا علیہم ماذا تفقدون یعنی برادران یوسف علیہ السلام نے متوجہ ہو کر ندا کرنے والوں سے کہا کہ تم کس چیز کو تلاش کرتے ہو۔ یہاں فقدان کے معنی طلب کے زیادہ ظاہر ہیں پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

اسی وقت ان کے ترک نکاح پر فخر کرنا۔ مگر یہ بھی سخت بے ادبی ہے۔ عیسیٰ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عقیدہ ہو سکتا۔ کیونکہ حدیث بخاری میں ہر قل کا قول مذکور ہے جس پر اجل صحابہ نے سکوت کیا جس سے تقریر ہو گئی۔ کذا لد الرسل تبعث فی احساب قومنا۔ کہ انبیاء علیہم السلام اعلیٰ حسب میں مبعوث ہوتے ہیں۔ اور حسب کہتے ہیں کمالات ذاتیہ کو جس کو معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام تمام کمالات سے علی وجہ الکمال موصوف ہوتے ہیں۔ تاکہ کسی کو انکی اتباع عار نہ ہو اور ظاہر ہے کہ اگر آپ کسی شخص کی نسبت یہ سن لیں کہ وہ غین ہے تو طبیعت کو اس سے نفرت و رد کاوٹ ہو جاتی ہے اور وہ شخص فوراً نگاہوں سے گر جاتا ہے۔ مگر کچھ قاعدہ ہے کہ انسان کے ساتھ اعتقاد جب ہی ہوتا ہے جب کہ اس میں مواد تو سب موجود ہوں۔ پھر اس کے روکنے میں فرشتہ ہوا اور اگر خالص ہو تو اعتقاد کم ہو جاتا ہے اس واسطے بجلی علیہ السلام کے بارے میں حضور وارد ہے اس کے معنی مفسرین نے صبراً لکھے ہیں۔ اور غین کے ساتھ تفسیر کو منکر کہا ہے، کذا فی الشفاء معللاً بان ہذا فیقیضہ و عیب ولا ینلق بالانبیاء علیہم السلام بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو روکنے والے ہیں چنانچہ سیرے معلوم ہوا کہ بجلی علیہ السلام نے اخیر عمر میں نکاح کیا تھا۔ رکذا فی الشفاء جس کے ان کے غین ہونے کا شبہ بالکل زائل ہو گیا بلکہ معلوم ہوا کہ ایسے قوی مرتھے کہ ان کی قوت مردانگی بڑھاپے میں باقی رہی۔ اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانے میں نازل ہو کر نکاح کریں گے حدیث میں آتا ہے۔ ویولد لہ ان کے اولاد بھی ہوگی جس سے ان کے ضعف ہونے کا شبہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ معلوم ہوا کہ ان کی قوت اتنی زیادہ تھی کہ ہزاروں برس فرشتوں میں رہ کر بھی طاقت کم نہ ہوئی۔ بلکہ اس سے تو بظاہر نظر ان کی قوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے مگر نصوص سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات میں تمام انبیاء علیہم السلام سے اکمل ہیں اس لئے یہ شبہ نہیں ہو سکتا۔ الغرض ترک لذات زہد نہیں

الغرض ترک لذات لازمی زہد نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح نہ کرتے بلکہ تقیل لذات زہد ہی میں داخل ہے۔ کیونکہ احادیث میں وارد ہے کہ صحابہؓ آپ کے اندر تیس سال مردوں اور بعض روایات میں چالیس مردوں کی قوت کا اندازہ کرتے تھے اور مرد کی قوت چار عورتوں کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے شریعت نے چار

تک کرنے کی اجازت دی ہے اس اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی قوت تھی جو ایک سو بیس عورتیں کی اور دوسری روایت کے موافق ایک سو ساٹھ عورتوں کے لئے کافی تھی بلکہ شرح شفا میں ابو نعیم سے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ چالیس مرد جنت کے مردوں میں سے ہیں اور ان میں ہر مرد کی قوت حسب روایت ترمذی ستر مرد کے برابر ہوگی اور ایک روایت میں سو مردوں کے برابر آیا ہے تو ایک حساب سے آپ میں قریب تین ہزار مرد کے برابر اور ایک حساب سے چار ہزار مرد کے برابر قوت ہوئی۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نو پر صبر کرنا یہ کمال زہد تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر وضبط اور آپ اس پر بھی قادر تھے کہ بالکل صبر کریتے چنانچہ جوانی میں آپ نے پورا صبر کیا کہ پچیس سال کی عمر میں چالیس سال کی بیوہ عورت سے نکاح کیا۔ بھلا کنور امر دایسی عورت سے نکاح کر سکتا ہے جو اس کی ماں بن سکے ہرگز نہیں پس جوانی میں آپ کا چالیس سالہ عورت سے نکاح کرنا اور ساری جوانی اسی کے ساتھ بسر کر دینا اس کی کافی دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تنوع شہوات ہرگز نہ تھے بلکہ آپ اعلیٰ درجہ کے زائد تھے مگر بڑھاپے میں آپ نے نو نکاح کئے تو ضرور آپ کے ان نکاحوں میں کوئی حکمت تھی۔

آپ کے نکاح کر نیکی حکمتیں چنانچہ حکمت اول ایک حکمت تو وہ تھی جو بعض عارفین نے بیان کی ہے کہ منشاء تکوین عالم محبت ہے جیسا کہ کنت کنزاً مخفیاً فاحیث ان احرف فخلقت الخلق سے معلوم ہوتا ہے گویہ حدیث ان الفاظ سے محدثین کے نزدیک ثابت نہیں مگر مضمون حدیث صحیح ہے جو حدیث ان اللہ جلیل یحب الجمال۔ اور اللہ تعالیٰ جمیل ہے جمال کو محبوب رکھتا ہے۔ اسے ثابت ہے جس کی تقریر نکت و دقیقه کے مضمون ہشت قدم میں اور کلید مشنوی دفتر اول میں قبول کر دند خلیقہ ہدیہ راتحت شعر گنج محض بدر پیری جوش کر دیں احقر نے کی ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اس محنت تکوین کا مظہر سب سے زیادہ دفاع ہے کہ اس میں بھی محض بواسطہ دفاع کے سبب ہو جاتا ہے۔ تکوین ولد کا بدون کسی تدبیر خاص کے جیسے تکوین عالم میں محض محبت بواسطہ کلمہ کن کے سبب ہو گیا تکوین عالم کا بدون کسی خاص تدبیر کے پس عارف کو عورت کی تلبیس میں یعنی جماع میں محبت کی تکوین کی تلبی کا مشاہدہ ہوتا ہے اس لئے

وہ نکاح کرتا ہے اور اسی لئے جماع کی اس کو دوسروں سے زیادہ رغبت ہوتی ہے اور حدیث حبیب من دنیاکم النساء کا مبنی اسی راز کو بعض عارفین نے فرمایا ہے۔

امت کو بتانا تھا کہ عورتوں کے ساتھ کیسے رہنا چاہیے

حکمت دوم :- دوسری حکمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں میں یہ تھی کہ امت کو عورتوں کے ساتھ برتاؤ کرنا مکلف معلوم ہوا اگر آپ نکاح نہ کرتے اور پھر عورتوں کے حقوق کی تعلیم دیتے تو اس کا زیادہ اثر نہ ہوتا۔ کسی کو شبہ ہو سکتا تھا

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خود نکاح کیا انہیں اس لئے بتانا مل عورتوں کے اتنے حقوق بیان فرما دینے نکاح کر لے تو شاید ان حقوق کا ادا کرنا مشکل ہوتا اور اب کسی کو یہ کہنے کا منہ نہیں۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت سے زیادہ نکاح کر کے دکھلا دیئے۔ اور سب کے حقوق ان خوبی سے ادا فرمائے کہ اس کی نظیر کوئی پیش نہیں کر سکتا حقیقت میں بیبیوں کے حقوق ادا کرنا عقلمند کا کام ہے کیونکہ بیوی سے دو قسم کے تعلق ہوتے ہیں۔ ایک علاقہ ملکیت و محکومیت کا کہ مرد کا ہوتا ہے اور عورت محکوم، دوسرا علاقہ محبت و محبوبیت کا کہ مرد محب اور عورت محبوب ہوتی ہے علاقہ محکومت کے ساتھ علاقہ محبت کی رعایت کرنا بڑا دشوار ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر محبت کے حقوق ادا کرتے ہیں تو محکومت کے حقوق فوت ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ بیبیوں کے عاشق مشہور ہیں وہ اکثر ان کی غلامی ہی کرنے لگتے ہیں ان کی خاک حکومت نہیں ہوتی نہ بیوی پر کچھ رعب ہوتا ہے۔ اور جو لوگ حکومت کے حقوق ادا کرتے ہیں ان سے محبت کے حقوق فوت ہو جاتے ہیں دونوں کو جمع کرنا اور ہر ایک کے پورے حقوق ادا کرنا کہ بی بی پر رعب بھی ہو حکومت بھی ہو اس کے ساتھ اس کا دل بھی شوہر سے کھلا ہوا ہو۔ کہ بے تکلف ہنس بھی لے، بول بھی لے۔ مذاق بھی کرے اور اس پر ناز بھی کرے انسان کامل کا کام ہے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کر سکتے تھے یا وہ شخص کر سکتا ہے جو آپ کا کامل متبع ہو۔ چنانچہ احادیث میں وارد ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یاد فرمایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ آپ ان بڑھیا کو کیا یاد فرمایا کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اچھی بیوی آپ کو دیدی حدیث میں ہے۔ فغضب حتی قلت وائدی بعثتک بالحق لا اذ کرھا بعدھذا لا بیخیر۔ یعنی آپ کو غصہ آگیا۔ جس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ڈر گئیں۔ اور بقسم عرض کیا کہ اب سے جب کبھی ان کا ذکر کرونگی بھلائی سے کرونگی یہ حالت رعب کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تھی جن کو سب سے زیادہ ناز

تھا اور دوسری ازواج کی کیا حالت ہوگی۔ تو ناز برداری کے ساتھ رعب کا جمع کرنا سرسری نہیں۔

حکمت سوم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چند نکاح کر کے یہ بھی بتلادیا کہ جس کے چند بیبیاں ہوں اسے سب کے ساتھ کس طرح عدل کرنا چاہیے خصوصاً اگر ایک ساتھ محبت

زیادہ ہو اور دوسریوں سے کم ہو تو اس وقت اپنی طرف سے کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے اس کی ترجیح ظاہر ہو بلکہ امور اختیار میں برابری کا پورا خیال رکھے چنانچہ آپ نے یہ بھی کر کے دکھلادیا کہ باوجودیکہ آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سب سے زیادہ محبت تھی مگر عدل میں بھی کبھی آپ نے فرق نہیں کیا۔ ان میں اور دوسری بیبیوں میں بلکہ ہمیشہ سب میں عدل کی پوری رعایت فرماتے تھے۔

دل کے میلان پر قابو نہیں ہوتا

دل کا ایک طرف زیادہ مائل ہونا یہ آپ کے اختیار سے باہر تھا۔ اس میں برابری کیسے کرتے

اسی لئے فرمایا کرتے تھے۔ اللھم ہذا قسمی فی ما املک فلا تلمنی فیما لا املک۔ اے اللہ یہ میری برابری ہے اس چیز میں جس پر مجھے قدرت ہے پس مجھ سے اس بات میں مواخذہ نہ کیا جائے جس پر مجھے قدرت نہیں اس میں میلان قلب ہی کی طرف اشارہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف زیادہ تھا اور یہ بات آپ کی طرف سے نہ تھی بلکہ غیب کی طرف ایسے سامان لئے گئے کہ خواہ مخواہ آپ کے دل کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف میلان ہو چنانچہ نکاح سے پہلے حق تعالیٰ نے خود ایک حریر کے کپڑے میں فرشتے کے ذریعہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تصویر بھیجی کہ یہ آپ کی بی بی ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کھولا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تصویر پر نظر پڑی اور وہاں یعنی عالم آخرت میں تصویر جائز اگر تم وہاں اپنا نوٹو کھینچو اوگے تو ہم منع نہیں کریں گے۔ یہ معاملہ حق تعالیٰ نے کسی اور بی بی کے ساتھ نہیں کیا۔ دوسرے وحی میں یہ عالم تھا کہ کسی بیوی کے لحاف میں آپ برہمنہ نہ آتی تھی بجز عائشہ رضی اللہ عنہا کے کہ ان کے لحاف میں بھی آپ ہوتے تو بے تکلف آتی تھی تو یہ باتیں محقق جن کی وجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ ہی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب زیادہ مائل فرمادیا پھر اس پر ان کی قدرتی ذہانت و فقاہت اور حسن ستیر سونے پر سہاگ تھا اصل وجہ آپ کی محبت کے وہی تھے جو پہلے مذکور ہوئے حق تعالیٰ کو بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ سب بیبیوں سے زیادہ محبت تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر کیوں محبت نہ ہوتی۔ مگر بایں ہمہ سوائے محبت قلبی کے ظاہری برتاؤ آپ کا سب کے ساتھ برابر تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی شادی پھر آپ نے جس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر نو سال کی تھی وہ بالکل بچی تھیں اور بچہ ان کے کوئی بی بی آپ کی کنواری نہ تھیں اس میں حکمت یہ تھی کہ آپ کو امت کو یہ دکھانا تھا کہ جس شخص کی عمر زیادہ ہو اس کو کنواری بچی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے عموماً عادت یہ ہے کہ ایسی صورت میں مرد کا بڑا واپسی عمر کے تقاضے کے موافق ہو کر رہتا ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو ان کے بچپن کی پوری رعایت فرماتے تھے۔

حبشیوں کا کھیل چنانچہ ایک مرتبہ مسجد کے قریب میں حبشی اڑکے عید کے دن کھیل کود رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حبشیوں کا کھیل دیکھو گی انھوں نے خواہش ظاہر کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ کر کے دیر تک ان کو کھیل دکھلایا اور محض کہنے میں تو کھیل تھا ورنہ ورزش اگر اچھی نیت سے ہو تو عبادت ہے اور چونکہ ان کھیلنے والوں کو دیکھنے میں کوئی فتنہ نہ تھا۔ اس لئے یہ بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ حبشی مردوں کو کیسے دیکھا۔ اور جب تک وہ خود ہی نہ ہٹ گئیں اس وقت تک آپ برا بکھڑے ہو کر ان کو کھیل دکھلاتے رہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بچپن کی وجہ سے بڑیوں (دینامی) کی لڑکیاں تھیں تصویر نہ تھی کہ کھیل کا بہت شوق تھا اور محلہ کی لڑکیاں بھی ان کے پاس کھیلنے کے لئے آتی تھیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے تو وہ لڑکیاں متفرق ہو جاتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جمع کر کے پھیر لاتے کہ آؤ بھاگتی کیوں ہو جس طرح کھیلتی تھیں کھیلتی رہو۔

بیوی کی رعایت ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مسابقت بھی کی کہ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے۔ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہلکی پھلکی تھیں وہ آگے نکل گئیں کچھ عرصہ کے بعد آپ نے پھر مسابقت کی اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بدن بھاری ہو چلا تھا اس مرتبہ آپ آگے نکل گئے تو آپ نے فرمایا یہ اس کا بدلہ ہے۔ فرماتے کنواری بچی کی دلجوئی اور دلداری اور اس جذبات اور کی رعایت بڑھاپے میں کوئی مرد اس طرح کر سکتا ہے جس طرح حضور نے کی۔ حاشا وکلا۔ بوڑھوں سے یہ بہت دشوار ہے۔ مگر ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بڑھاپے میں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے وہ برتاؤ کیا جو جوان شوہر کو جوان بی بی کے ساتھ کرنا چاہیے بلکہ کوئی جوان بھی اتنا نہیں کر سکتا تھا جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ کیا۔

وقار کا بھوت آج کل جو لوگ وقار وقار پکارتے ہیں یہ وہ تزکیر کا پوٹلہ ہے ان لوگوں نے تزکیر کا نام وقار رکھ لیا ہے۔ یاد رکھو وقار کے خلاف وہ کام ہے جس میں دین پر بات آتی ہو اور جس میں دینی مصلحت پر کوئی اثر نہ پہنچے محض اپنی عرفی سبکی ہوتی ہے تو ایسا کام عین تواضع ہے۔ آج کل جو لوگ وقار کا پوٹلہ لعل میں دبائے ہوئے ہیں وہ بیوی کے ساتھ دوڑ کو خلاف وقار سمجھتے ہیں مگر وہ زبان سنبھالیں اور آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مسابقت کی ہے تو کیا معاذ اللہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو بھی خلاف وقار سمجھتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر کوئی ایسا کہے تو اس کے ایمان کی خیر نہیں یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل خلاف وقار نہ تھا ہاں تزکیر کے خلاف ضرور تھا پس آج کل کے مدعیان متکبر نہیں ہیں تو ذرا وہ ہم کو بیوی کے ساتھ دوڑ کر دکھلائیں مگر ان سے قیامت تک ایسا نہ ہوگا۔ ہاں جو شخص تزکیر ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع ہوگا وہ ضرور ایسا کر سکتا ہے اور بحمد اللہ ہم نے بھی اس سنت پر عمل کیا ہے۔

حکمت چہارم ایک حکمت یہ تھی کہ عورتوں کے متعلق جو خاص احکام ہیں ان میں عورت کا واسطہ ہونا زیادہ نافع اور موجب سہولت ہو سکتا ہے دوسری عورتوں کے لئے پھر وہ احکام جن امور کے متعلق ہیں ان میں عادات عورتوں کی مختلف ہوتی ہیں تو یہ نہایت مصلحت کی بات ہے کہ وہ واسطے متعدد ہوں تاکہ ہر قسم کے احکام سہولت سے ظاہر ہو سکیں اور ظاہر ہے کہ منکوحہ کے برابر کوئی بے تکلف واسطہ نہیں ہو سکتا۔ عرض چکیتیں تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد نکاحوں میں اور یہ بھی نمونے کے طور پر چند بیان کر دی گئی ہیں ورنہ اور بہت سی حکمتیں ہیں جن کے بیان کو عمر طویل چاہئے ان وجوہ سے آپ نے متعدد نکاح کئے ہیں ورنہ اگر آپ چاہتے تو بالکل صبر کر لیتے اور جس طرح پوری جوانی ایک چالیس سالہ بیوہ کے ساتھ آپ نے گذاردی بڑھاپے کو بھی ایک بیوہ کے ساتھ گزار سکتے تھے مگر آپ نے ان بچوں کی وجہ سے جن کا ابھی ذکر ہوا ہے متعدد نکاح کئے جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ترک لذات زہد کے لئے لازم نہیں بلکہ صرف تقلیل لذات کافی ہے ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترک نکاح ضرور

نہ مارتے۔

(وعظ تقلیل الکلام ص ۳۲)

(۱۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج فرمانا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مزاج فرمانے تھے اس میں بھی حکمت تھی ایک تو تطبیق قلوب اصحاب تھی اور دوستوں کا دل خوش کرنا بھی عبادت ہے میں نے اپنے استاد مولانا فتح محمد صاحب سے سنا ہے کہ ایک دفعہ وہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں دیر تک بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے جب اٹھنے لگے تو حضرت نے عرض کیا کہ آج میں نے حضرت کا وقت بہت ضائع کیا حضرت کی عبادت میں خلل ڈالا۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ کیا نفلیں پڑھنا ہی عبادت ہے دوستوں سے باتیں کرنا عبادت نہیں؟ یہ تم نے کیا کہا کہ وقت ضائع کیا؟ نہیں بلکہ سارا وقت عبادت ہی میں گذرا۔ اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ناٹو قوی رحمۃ اللہ علیہ صبح کی نماز کے بعد بعض دفعہ مصلیٰ پر بیٹھے رہتے تھے اور اشراق کے وقت تک دوستوں سے باتیں کرتے تھے۔ عامی تو یہ سمجھتا تھا کہ یہ وقت عبادت سے خالی گذرا۔ مگر مولانا اس کو بھی عبادت میں مشغول سمجھتے تھے کیونکہ تطبیق قلوب میں بھی عبادت ہے۔ پس ایک حکمت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں یہ تھی۔

مزاج کی دوسری حکمت دوسری حکمت وہ تھی جو مجھے خواب میں بتلائی گئی۔ میں نے شباب میں خواب دیکھا تھا کہ ملکہ و کٹورہ ایک ایسی سواری میں سوار ہے جس میں نہ انجن ہے نہ گھوڑا نہ بیل، اس وقت تو میں اس سواری کی حقیقت کو نہیں سمجھتا تھا مگر اب موٹر دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ وہ سواری لاری موٹر کی شکل میں تھی۔ اور میں نے دیکھا کہ ملکہ کی سواری تھا نہ بھون کی گلیوں سڑکوں میں پھر رہی ہے پھر ٹھوڑی دیر بعد میں نے اپنے کو بھی اس سواری میں سوار دیکھا اس وقت ملکہ نے مجھ سے کہا کہ مجھے حقانیت اسلام میں کوئی شبہ نہیں صرف ایک بات ٹھٹھکتی ہے اگر حل ہو جائے تو پھر اسلام کے حق ہونے میں مجھے کوئی اشکال نہ رہے گا۔ میں نے کہا بیان کیجئے وہ شبہ کیا ہے۔ کہا حقیت میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مزاج بھی فرمانے تھے اور مزاج وقار کے خلاف ہے۔

لے دلوں کا خوش کرنا۔

اور نبی کے لئے وقار کا ہونا ضروری ہے یہ اشکال سلاطین ہی کے مذاق کے مناسب ہے کیونکہ وقار خود ای کا سب سے زیادہ اہتمام انہی کو ہوتا ہے، میں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں بڑی حکمت تھی وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رعب و جلال اس درجہ عطا فرمایا تھا کہ ہر قتل و کسری اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے آپ کے نام سے پھرتے تھے (حدیث میں ہے نصرت بالربیب مسیّر شہر) کہ اللہ تعالیٰ نے میری مدد رعب سے بھی کی ہے جو ایک مہینہ کی مسافت تک پہنچا ہوا ہے یعنی اس مخلوق پر بھی آپ کا رعب طاری تھا جو بقدر ایک مہینہ کی مسافت کے آپ سے دور تھے پاس والوں کا تو کیا ذکر۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بڑی چیز ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامان غلام کے نام سے بھی سلاطین کا پنتے تھے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہما و امثالہما، اور یہ معلوم ہے کہ حضور صرف سلطان نہ تھے بلکہ رسول بھی تھے اور رسول کا کام یہ ہے کہ امت کی ظاہری و باطنی اصلاح کرے جس کے لئے افادہ و استفادہ کی ضرورت ہے اور افادہ اور استفادہ کی شرط یہ ہے کہ مستفیدین کا دل مرنے سے کھلا ہوا ہوتا کہ وہ بے تکلف اپنی حالت کو ظاہر کر کے اصلاح کر سکیں اور جس قدر رعب و جلال خدا تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا وہ صحابہ رضی اللہ عنہما کو استفادہ سے مانع ہوتا ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم گاہ گاہ مصلحت سے مزاج فرمانے تھے کہ صحابہ کے دل کھل جائیں اور وہ ہر وقت زخوب رہ کر اپنے دل کی باتیں بیان کرنے سے نہ رکیں اور یہ سلم نہیں کہ ہر مزاج خلاف وقار ہے۔ خلاف وقار صرف وہ مزاج ہے جس میں کوئی مصلحت و حکمت نہ ہو اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج سے آپ کے وقار و عظمت میں کمی نہ آئی تھی بلکہ اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہما کے قلوب میں انشراح پیدا ہوتا اور وہ انقباض جاتا رہتا تھا جو غایت رعب کی وجہ سے قلوب میں عادت پیدا ہوتا ہے۔ جس کا اثر یہ تھا کہ قلوب میں آپ کی محبت جاگزیں ہوتی تھی اگر آپ مزاج نہ فرمانے تو صحابہ کے اوپر آپ کا خوف بھی غالب ہوتا محبت غالب نہ ہوتی اور جب سے آپ کی محبت غالب ہوتی۔ تو آپ کے وقار میں کچھ کمی نہ ہوتی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ہوتی کیونکہ پہلے تو وقار و عظمت کا منشا صرف خوف تھا اب محبت و خوف دونوں مل کر کام کرنے لگے۔

مزاج سے رعب کب کم ہوتا ہے اگر کوئی یوں کہے کہ مزاج سے تو خوف زائل ہو جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ

یہ وہاں ہوتا ہے جہاں مزاج کرنے والے میں شان رعب کم ہو اور وہ مزاج بکثرت کرے اور اگر شان رعب بہت زیادہ ہو جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت احادیث میں وارد ہے اور مزاج بھی بکثرت نہ ہو تو اس صورت میں مخاطب بے خوف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مشاہدہ اس کی دلیل ہے اور احادیث سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے قلوب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کس درجہ تھی اور جب کبھی کسی بات میں آپ کو غصہ کیا ہے تو صحابہ کی کیا حالت ہوتی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے قوی القلب شجاع بھی ہٹ جاتے اور گھٹسوں کے بل بیٹھ کر عاجزانہ التجا کرنے لگتے تھے۔ اس جواب کے بعد ملکہ نے کہا کہ اب میرا اطمینان ہو گیا اور اب مجھے تحاوت اسلام میں کوئی شبہ نہیں رہا۔

(الحکود والقیود ص ۹)

(۱۶) مرتد کا درجہ کافر اصلی سے کیوں طحا ہوتا ہے

جواب :- ترک اسلام کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اول ہی سے اسلام قبول کرے دوسرے یہ کہ بعد قبول کے ترک کر دے دونوں صورتوں میں یہی سزا ہے بلکہ دوسری صورت پہلی سے اشد ہے چنانچہ قوانین سلطنت میں باغی کی سزا ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ جو پہلے ہی سے اس سلطنت کی رعایا نہیں ہے بلکہ کسی مخالف سلطنت کی رعایا ہیں ایسے لوگوں پر اگر کبھی غلبہ ہو جائے تو ان کو غلام بنالیتے ہیں یا احسان کر کے رہا کر دیتے ہیں یا عزت کے ساتھ نظر بند کر دیتے ہیں۔ مگر باغی کے لئے بجز قتل یا عبور دریا سے شورو کے کچھ سزا ہی نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رعایا بڑا کر باغی ہو جانے میں سلطنت کی زیادہ توہین ہے۔

ارتداد کا انجام اسی طرح اسلام لا کر مرتد ہو جانے میں اسلام کی سخت توہین ہے اور اس کی تعلیم کو دوسرے کی نظر میں حقیر کرنا ہے۔ دیکھتے ایک تو وہ شخص ہے جس سے کبھی آپ کی دوستی نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ سے مخالف ہے اس کی مخالفت سے آپ کا اتنا ضرر نہیں ہوتا اور اگر وہ کبھی آپ کی مذمت و ہجو کرے تو لوگوں کی نظروں میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی سب کہہ دیتے ہیں میاں اس کو تو ہمیشہ سے اس کے ساتھ عداوت رہی ہے دشمنی

میں ایسی باتیں کرتا ہے۔ اور ایک وہ شخص ہے جو سالہا سال سے آپ کی دوست رہا کبھی وقت مخالف بن گیا اس کی مخالفت سے بہت ضرر ہو جاتا ہے اور وہ جو کچھ برائیاں آپ کی کرتا ہے لوگ اس پر توجہ کرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا نشانہ محض عداوت نہیں ہے اگر دشمن ہوتا ہے تو سالہا سال تک دوست کیوں بنتا، معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دوستی کے بعد فلاں شخص کے اترے پترے معلوم ہو گئے ہیں اسی لئے مخالف ہو گیا حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص دوستی کے بعد دشمن بنا ہو وہ اترے پترے معلوم کرنے کے بعد دشمن بنا ہو، ممکن ہو کہ اس نے دوستی بھی اس نیت سے کی ہو کہ لوگ دوستی کے زمانے میں مجھے اس کا رازدار سمجھ لیں گے تو مخالفت کی حالت میں جو کچھ کہوں گا اس کو سمجھ کر قبول کریں کہ یہ شخص رازدار ہے اس کو ضرور کچھ راز کی باتیں معلوم ہوتی ہیں اس لئے مخالف ہو گیا یا بعض ہونے اسلام کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ وَقَالَ طَاغُفْتُ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْ اُنْزِلَ عَلٰی الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَحٰجَةُ النَّبَاِ وَانْكَرُوا الْاٰخِرَةَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔ پس ہر چند کہ دوست کے دوست کی مخالفت میں یہ احتمال بھی ہے مگر (جاریع) عاداتاً لوگ دوستوں کی مخالفت میں عمل جلدی متاثر ہوتے ہیں (اور اس احتمال پر نظر نہیں کرتے) اس لئے عقلاً و شرعاً و قانوناً وہ شخص بہت بڑا مجرم شمار ہوتا ہے جو موافقت کے بعد مخالفت کرے۔ اس لئے شریعت میں مرتد کے لئے دنیاوی سزا بھی سخت ہے اور عذاب آخرت بھی اشد ہے۔

(محاسن اسلام ص ۱۹)

(۱۷) مسلمان کا اقدام علی الکبائر اور اس کی وجہ

اس کا جواب یہ ہے کہ اقدام جرائم اگر عقیدہ اسلام کا ثمرہ ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جن لوگوں کو اسلام سے جتنا زیادہ تعلق ہے مثلاً علماء اقیار و صوفیاء ان میں یہ ثمرہ زیادہ ظاہر ہوتا کیونکہ قاعدہ ہے کہ مذہب کے ثمرات کا ظہور ان ہی لوگوں میں زیادہ ہوتا ہے جن کو مذہب سے زیادہ تعلق ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں اور کفار بھی اس کا شاہدہ کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو اسلام سے تعلق زیادہ ہے وہ جرائم کا ارتکاب کم تو کیا کرتے وہ شبہات سے بھی احتراز کرتے ہیں۔

ایک مسلمان کا واقعہ چنانچہ ہمارے ایک دوست کا جو کہ بی، اے، ہیں واقعہ ہے کہ وہ ایک بار ریل کا سفر کر رہے تھے، ان کے پاس اسباب

پندرہ سیر سے زیادہ تھا۔ اسٹیشن پر تنگی وقت کی وجہ سے وہ اس کو وزن نہ کر سکے اس وقت تو جلدی میں سوار ہو گئے لیکن جب منزل مقصود پر اتارے تو وہاں کے بابو سے جا کر اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں جلدی میں اسباب کو وزن نہ کر سکا اب آپ اس کو وزن کر لیں اور جو محصول میرے ذمہ ہو اس کو وصول کر لیجئے بابو نے انکار کیا کہ مجھ کو ذمت نہیں تم ویسے ہی لے جاؤ ہم تم سے محصول نہیں لیتے۔ انھوں نے کہا کہ صاحب آپ کو اس معافی کا کوئی حق نہیں کیونکہ آپ ریلوے کے مالک نہیں ہیں بلکہ ملازم ہیں آپ کو محصول مجھ سے لینا چاہیے مگر اس نے پھر بھی انکار کیا تو یہ اسٹیشن ماسٹر کے پاس گئے اس نے بھی کہا کہ آپ بلا تکلف سامان لے جائیں ہم آپ سے محصول نہیں لیتے۔ انھوں نے اس سے بھی کہا کہ آپ کو معافی کا کوئی حق نہیں ہے اس کے بعد اسٹیشن ماسٹر اور اس بابو میں انگریزی میں گفتگو ہونے لگی وہ یہ سمجھے کہ یہ مسافر انگریزی نہیں سمجھتا ہو گا کیونکہ ان کی صورت ملاؤں کی سی تھی غرض ان دونوں نے اس گفتگو میں یہ رائے قرار دی کہ یہ شراب پیئے ہوئے معلوم ہوتا ہے باوجود ہمارے انکار کے یہ محصول دینے پر اصرار کرتا ہے، انھوں نے جواب دیا کہ صاحب میں نے شراب نہیں پی ہے بلکہ ہمارا مذہبی حکم ہے کہ کسی کا حق اپنے ذمہ نہ رکھو، اس پر وہ دونوں بولے کہ ہم تو اس وقت اسباب وزن نہیں کر سکتے آخر یہ اسباب اٹھا کر ٹرکٹ فارم سے باہر لائے اور سوچنے لگے کہ یا اللہ تعالیٰ اب میں ریلوے کے اس حق سے کیسے سبکدوشی حاصل کروں آخر اللہ تعالیٰ نے امداد کی اور یہ بات دل میں ڈالی کہ جتنا اسباب زیادہ ہے اس کے محصول کے برابر ایک ٹکٹ اسی ریلوے کے کسی اسٹیشن کا لے کر چاک کر دیا جائے۔ اس طرح ریلوے کا حق اس کو پہنچ جائے گا چنانچہ ایسا ہی کیا۔

دیانت داری کا دوسرا واقعہ میرے ایک اور دوست کا جو ڈپٹی کلرک بھی تھے واقعہ ہے کہ ان کا ایک بچہ ریل کے سفر میں

ان کے ہمراہ تھا جس کا قد بہت کم تھا کہ دیکھنے میں دس سال کا معلوم ہوتا تھا مگر اس کی عمر تقریباً ۱۳ سال کی تھی اور ریلوے کے قاعدے سے اس عمر کے بچے کا ٹکٹ پورا لینا ضروری ہے انھوں نے ٹکٹ لینا چاہا تو سائیکٹوں نے بہت منع کیا کہ اس کو تیرے سال کا کون کہہ سکتا

ہے آپ آدھا ٹکٹ لے لیجئے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ انھوں نے کہا کہ بندے کچھ نہ کہیں گے تو کیا حق تعالیٰ بھی باز پرس نہ فرمائیں گے؟ کہ تم نے دوسروں کی چیز میں تھوڑی اجرت بدوں اس کی اجازت کے کیوں تصرف کیا۔ غرض انھوں نے پورا ٹکٹ لیا اور ان کے ساتھ ہی ان کو بے وقوف بناتے رہے مگر ع۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ شد

بھلا اس کی نظیر کوئی تو م بھی دکھلا سکتی ہے کہ ایک شخص کو ریل بابو اور اسٹیشن ماسٹر خود کہہ دے کہ تم بلا تکلف اسباب لے جاؤ ہم محصول نہیں لیتے اور وہ پھر بھی اس پر اصرار کرے کہ میں تم کو محصول لینا پڑیگا تم کو معافی کا کوئی حق نہیں اور جب وہ کسی طرح وصول نہیں کرے تو یہ محض خدا کے خوف سے ریلوے کا ٹکٹ مقدار محصول کے برابر خرید کر چاک کر دیتا ہے اور یہ صورت شبہات سے احتراز کرنے کی عام لوگوں کی نظر دوسری ہے ورنہ حقیقت میں یہ شبہات کی قسم نہیں بلکہ صریح واجب کا امتثال ہے۔

عقیدہ کا اثر پس اگر اس عقیدہ کا اثر اقدام علی الجرائم ہوتا تو علماء صلیا سب سے زیادہ بیباک اور جرائم پر اقدام کرنے والے ہوتے حالانکہ مسلمانوں میں یہ طبقہ جو اسلام کے حقیقی مرتبہ کو مہانتا ہے سب سے زیادہ جرائم سے بچنے والا اور شبہات سے احتراز کرنے والا ہے پس معلوم ہوا کہ عقیدہ کا یہ اثر نہیں ہے جو مقررہ قانون نے سمجھا ہے بلکہ اس کا اثر جرائم سے رکنا اور گناہوں سے نفرت پیدا ہونا ہے جس کی وجہ میں عنقریب تبتلاؤں کا کہ اس عقیدے کا اثر گناہوں سے نفرت پیدا ہونا کس طرح ہے مگر افسوس۔

چشم بد اندیش کہ برکت باد عیب نماید ہنرش در نظر
ایسا پاکیزہ مسئلہ جو جرائم کی جڑ کاٹنے والا ہے بداندیش کو اقدام جرائم کا سبب معلوم ہوتا ہے جو اب تو مشاہدہ کے متعلق ۔ ۔ ۔ ۔ ہے کہ حسد و مشاہدہ اس عقیدہ کا لہر
جو تم تبتلا رہے ہو غلط ثابت ہو رہا ہے۔

عقلی جواب (۲) اور جواب عقلی اس کا یہ ہے کہ یہ عقیدہ عقلاً اقدام جرائم کا سبب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ جب کو چاہیں گے باوجود کبائر کے عذاب سے معاف کر دیں گے جس میں تعین نہیں ہے یعنی کسی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ میرے متعلق مشیت الہی بصورت عفو ہے یا بصورت عذاب پھر اس صورت میں کوئی

شخص بھی عذاب سے بے فکر نہیں ہو سکتا بلکہ ہر ایک کو یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ شاید میرے ساتھ قانونی برتاؤ کیا جائے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک عین (نامرد) شخص شرم و ندامت کی وجہ سے خود کشی پر آمادہ ہو کر سنگیا استعمال کرے اور وہ اتفاقاً سنگیا کھا کر ہلاک نہ ہو بلکہ سنگیا ہضم ہو کر اس کے اندر قوت مردنی پیدا کر دے چنانچہ بعض جگہ ایسے واقعات ہوئے ہیں۔ مگر کیا اس اتفاقی واقعہ سے کسی کو سنگیا کھانے کی جرأت ہو سکتی ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ ہر عامل تحقیق ہے کہ زہر کا خاصہ تو ہلاک کرنا تھا مگر اتفاقاً اس شخص میں آپ کی خاصیت کا ظہور نہ ہوا تو اس سے یہ خاصیت نہیں بدل گئی اس لئے مردانگی بڑھانے کے لئے سنگیا کھانے کی کوئی نہ اجازت دے سکتا ہے اور نہ ہر شخص اس پر جرأت کر سکتا ہے۔

مراحم خسروانہ سے فریب نہیں کھانا چاہیے | علیٰ ہذا سب لوگوں کو معلوم ہے کہ بعض دفعہ سلاطین و حکام مراحم خسروانہ سے کسی قاتل کو رہا بھی کر دیتے ہیں مگر اس علم کی وجہ سے ہر شخص کو قتل کی وجہ سے ہر شخص کو قتل پر جرأت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ قتل کی اصل سزا تو پھانسی ہی ہے اور عمل بھی اکثر اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے اور مراحم خسروانہ کوئی قانون نہیں بلکہ محض حاکم کی مشیت پر ہے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس کے ساتھ مراحم خسروانہ کا برتاؤ کرے، لہذا مراحم خسروانہ کے بھروسہ پر اقدام جرم کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ بعینہ اسی طرح کبار کا بدو عذاب کے معاف ہو جانا بطور مراحم خسروانہ کے ہے پس اس مسئلہ کو اقدام جرم کا سبب کیونکر سمجھ لیا گیا۔ بھلا اگر کوئی شخص جنگل میں پاخانہ کرنے جائے اور استنجے کے لئے ڈھیلا ٹوڑتے ہوئے اس کو زمین میں سے سونے کا گھڑا مل جائے تو کیا اس اتفاقی بات پر بھروسہ کر کے کوئی شخص بھی زراعت و تجارت سے مستغنی ہو کر بیٹھ سکتا ہے کہ مجھ کو بھی اسی طرح پاخانہ کرتے ہوئے سونے کا گھڑا مل جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ اسی طرح اتفاقاً کسی مرتکب کبار کا بدو عذاب کے بخشدیا جانا اتفاقی ہے اس لئے یہ اقدام جرم کا سبب ہرگز نہیں ہو سکتا مگر پھر بھی جو لوگ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اپنی طبیعت کے جث سے ایسا کرتے ہیں اس عقیدے کا اس میں کیا دخل۔

گنہ گاروں کی مغفرت | جواب (۳) پھر یہ جو بعض گنہ گاروں کی مغفرت و بدو عذاب کے بھی ہو جاتی ہے اس کی وجہ بھی معلوم ہے کہ مغفرت

کیونکر ہوگی؟ یہ بھی کسی عمل صالح کی وجہ سے ہوگی۔ ابو داؤد کی ایک حدیث شریف ہے ابھی مسئلہ معلوم ہوا ہے وہ حدیث شریف یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی مقدمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم کھائی اور اس طرح کہا اشهد باللہ الذی لا الہ الا هو ما فعلت ذالک قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ فقال رسول اللہ بل قد فعلت لکنی غفرا للہ لک باخلاص قول لا الہ الا الہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو نے یہ کام ضرور کیا اور تیری قسم جھوٹی ہے جس کا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے (لیکن حق تعالیٰ نے تجھے اس اخلاص کی برکت سے بخش دیا جو لا الہ الا اللہ کہتے ہوئے تجھ سے صادر ہوا نہ معلوم اس وقت کس دل سے اس نے خدا کا نام لیا ہے جو اس درجہ مقبول ہو گیا دینی اس نے خدا کا نام اس وقت کامل اخلاص سے لیا تھا اس کی برکت سے حلف کا گناہ معاف ہو گیا اس کا مطلب نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈگری اس کی کر دی۔ بلکہ محض اس گناہ کی مغفرت کا ذکر فرمایا مقصود ہے کیونکہ جب وحی سے اس کا کاذب فی الحلف ہونا معلوم ہو گیا تو اب ڈگری اس کے حق میں کیونکر ہو سکتی تھی۔ تو دیکھئے گناہ کتنا سنگین تھا جھوٹی قسم کھانی اور وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم کھانا ایسا ہے جیسا خدا کے سامنے۔ اور ظاہر ہے کہ محل و زمان کی عظمت سے بھی فعل میں عظمت پیدا ہو جاتی ہے۔ زنا کرنا گناہ ہے مگر مسجد میں زنا کرنا اور بھی اشد ہے اور اگر کوئی نامعقول کعبہ شریف میں ایسا فعل کرے تو بہت ہی سخت ہے اسی طرح جھوٹی قسم کھانا گناہ ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا گناہ اور بڑھ جاتا ہے کیونکہ آپ نائب خدا ہیں آپ کے سامنے جھوٹی قسم الیسی ہے جیسی خدا کے سامنے ہو۔

ایک شبہ کا ازالہ | شاید کوئی یہ کہے کہ ہم تو اس وقت بھی جو کرتے ہیں سب خدا ہی کے سامنے کرتے ہیں اور جس جگہ جو کام بھی ہوگا وہ خدا کے سامنے ہوگا تو چاہیے ہر جگہ وہی گناہ ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم سے ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت تو تم خدا کے سامنے ہو مگر خدا تمہارے سامنے نہیں اور میرا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قسم کھانا ایسا ہے جیسا خدا کو سامنے سمجھ کر قسم کھانا۔ خلاصہ یہ کہ قرب کی دو قسمیں ہیں ایک قرب حسی یہ تو جہاں ہوتا ہے طرین سے ہوتا ہے اور ایک قرب علی یا ایک طرف سے بھی ہو سکتا ہے پس اس وقت جو تم خدا کے سامنے ہو یہ قرب علی ہے کہ خدا تعالیٰ سے تمہارا کوئی حال مخفی نہیں وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر اس حالت میں تم کو قرب حاصل نہیں اور نہ

ہر شخص کا مقرب ہونا لازم آئے گا اور قیامت میں جو تم خدا کے سامنے ہوں گے وہ قرب جانیں سے ہوگا کہ تم بھی خدا تعالیٰ کے سامنے ہوں گے۔ اور خدا تعالیٰ بھی تمہارے سامنے ہوں گے یعنی اقرب الیہ من جبل الوریث میں قرب علمی مراد ہے۔ اسی لئے یہ نہیں فرمایا گیا کہ تم بھی ہم سے قریب ہو بلکہ صرف اپنا قرب بیان فرمایا ہے کیونکہ یہاں تماشا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تو ہم سے قریب ہیں مگر ہم ان سے دور ہیں۔

یا نزدیک تر زین بن است دیں عجب ترکہ من ازوے دورم
تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم الیسی ہے جیسی قیامت میں خدا کے سامنے جھوٹی قسم کھانا جب کہ تم بھی حق تعالیٰ کو اپنے سامنے سمجھو گے۔ (محاسن اسلام ص ۹)

اللہ کا بے انتہا عفو و کرم | جواب (۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ بعض گناہوں کا بدون عقاب کے ہو جانا یہ حق تعالیٰ کا عفو و کرم ہے اس کو سن کر لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ بڑے ہی رحیم و کریم ہیں جو اپنے بندوں پر بے حد عنایت فرماتے ہیں اور قاعدہ ہے کہ طباخ سلیمہ میں عنایت و کرم سے اطاعت و عبادت کو ترقی ہوتی ہے۔ نہ کہ سرکشی کو، اگر تا کی عنایت زیادہ ہوں تو اس کی اطاعت کا شوق بڑھتا ہے۔ وہ نوکر بڑا ہی پاجی ہے جو اتنا کی بے حد عنایات کے بعد بھی سرکشی ہی کرے۔ طباخ سلیمہ احسان و کرم و عنایات سے بندہ بے درم ہو جاتا ہے اس لئے عقیدہ اقدام علی الجرائم کا سبب ہرگز نہیں بلکہ جرائم و سرکشی کی جرط کا ٹٹنے والا ہے۔ جن لوگوں کی طباخ سلیمہ ہیں وہ خدا کی ان نعمتوں اور عنایتوں کو دیکھ کر اور زیادہ عبادت کرتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ کہ اسلام سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں ان میں یہ اثر مشاہد ہے اب اگر اس عقیدہ سے کسی میں اقدام جرائم کا وصف پیدا ہو تو کہاجانیکا کہ یہ اس عقیدہ کا اثر نہیں بلکہ اس شخص کی کچی طبع کا اثر ہے۔ جیسا بادشاہ کا کریم ہونا طباخ سلیمہ کے لئے زیادت و فاداری کا سبب ہوتا ہے گو بعض نالائق بادشاہ کے کرم کی وجہ سے جرائم پر بھی دلیر ہو جاتے ہیں مگر کیا اس کا سبب بادشاہ کے کرم کو کہاجائے گا یا ان کی بد طبیعتی کو اس کا فیصلہ عقلاً خود کر سکتے ہیں بعض لوگوں کو یہ آیت لَا تَقْضُوا دِیْنَکُمْ رَحْمَةً مِّنْ اِلٰہِکُمْ اِنَّ اِلٰہَکُمْ یَعِظُ اَلَّذِیْنَ یُؤْتِیْکُمْ جَمِیْعًا سے دھوکا ہوا ہے اور وہ بے فکر ہو گئے ہیں کیونکہ وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ یقیناً سب گناہوں کو معاف کر دیں گے کیونکہ لمن یشترک فی قید نہیں ہے۔ سوان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اول تو یہ آیت عام نہیں ہے بلکہ اس کا شان

نزول ان لوگوں کے بارے میں ہوا ہے جو کفر سے اسلام کی طرف آنا چاہتے تھے۔ مگر ان کو اسلام سے یہ خیال مانع تھا کہ ہم نے حالت کفر میں بڑے بڑے جرائم کئے ہیں ان کا کیا حشر ہوگا۔ آیا اسلام کے بعد ان پر مواخذہ ہوگا یا نہیں۔ اگر مواخذہ ہوا تو پھر اسلام ہی سے کیا فائدہ۔

کفر سے پہلے الے گناہ | چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ فاحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا لو اسلمنا (دفعاً فی فعل

بن فونیہ الی اسلفنا او کما قال لعل) کہ اگر ہم اسلام لے آئیں تو ہمارے پہلے گناہوں کے متعلق کیا برتاؤ ہوگا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بعد پہلے گناہ جو حالت کفر میں کئے گئے ہیں سب معاف ہو جائیں گے پس اس میں جو مغفرت کا دعویٰ جتنی ہے وہ عام نہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور لوگوں کے گناہ بدون عقاب کے معاف نہ ہوں گے نہیں دوسروں کے بھی معاف ہوں گے جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں لیکن ان کے لئے وہی وعدہ ہے جو دوسری آیت میں مذکور ہے۔ وَ یَعِظُ مَا دُونَ ذَٰلِکَ لِمَنۢ تَشَآءُ جس میں جتنی وعدہ نہیں کیا بلکہ مشیت کی قید سے مشروط ہے اور اس آیت میں جو بلا قید حتیٰ وعدہ کیا گیا ہے یہ صرف نومسلموں کے لئے ہے کہ اسلام سے ان کے پہلے گناہ ضرور معاف ہو جائیں گے جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہو رہا ہے اور شان نزول مثل تفسیر کے ہے بہت سے نصوص بظاہر عام ہیں لیکن شان نزول سے ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔ (وعظ محاسن اسلام ص ۷)

(۱۸) مسلمانوں کا جانور کو ذبح کرنا عقل و نقل کی روشنی میں

دوسری قوموں کا یہ شبہ کہ یہ لوگ بڑے سنگدل ہوتے ہیں کہ انھیں جانوروں کے گلے پر چھری پھرتے ہوئے ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ محض ناواقفی یا تعصبات سے ناشی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ شبہ اور یہ اعتراض فقط گائے کی قربانی کے متعلق ہے۔ چوہے۔ بکری، مرغی۔ کبوتر کے متعلق نہیں معلوم ہوتا ہے وال میں کالا ہے۔ یعنی اس شبہ کا سبب رحم نہیں ہے۔ بلکہ محض حمیت مذہبی ہے اور اگر کوئی ذہین آدمی مذہب سے قطع نظر کرے سب جانوروں کے

متعلق یہی الزام دے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسے یہ کیا خبر کہ مسلمانوں نرم دل ہوتے ہیں یا سخت دل۔ پس ان کا اعتراض اگر حیمت مذہب سے نہیں تو ناواقفیت سے ضرور ہے۔ پس ان کا یہ فیصلہ بہت ہی ظاہر ہے مگر باوجود اس کے ظاہر ہونے کے علماء مناظرین نہ معلوم جواب میں کہاں کہاں بہو گئے ہیں۔ لیکن ان پر بھی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ وہاں تحقیق مقصود نہیں ہوتی۔ محض الزام و اسکاٹ مقصود ہوتا ہے۔ باقی جہاں تحقیق منظور ہوتی ہے وہاں حق تعالیٰ کی جانب سے اصل حقیقت کا انکار ہوتا ہے۔ سو الحمد للہ حق تعالیٰ اس وقت مجھے جواب میں یہ بات سمجھا دی کہ انھیں کیا خبر کہ مسلمانوں میں رحم نہیں۔ اب آپ سب مسلمان کو ٹٹول لیجئے کہ ذبح کے وقت کیا قلب کی کیفیت ہوتی ہے۔ بڑھتا ہے یا نہیں۔ بعض موجودہ بزرگوں کا قصہ سنا ہے کہ ذبح کے وقت آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ آخر یہ کیا بات ہے۔ رحم اور کسے کہتے ہیں۔ لیکن اس سے بڑا کمال مسلمانوں کا عدل ہے کہ ایک ہی طرف نہیں چلے گئے۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّتًا وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا اوسط کی تفسیر عدل ہے کہ اعتدال ہو۔ قوت و عمل دونوں ہیں کہ جزیرہ و بلاہت کے وسط میں حکمت جن و تہور کے وسط میں شجاعت اسی طرح قوت شہونیہ خود و فجور میں توسط عفت ہے۔ اور تینوں کے مجموعہ یعنی حکمت و شجاعت و عفت کا نام عدل ہے تو یہ امت عادلہ ہے۔ حق تعالیٰ نے احکام ایسے رکھے ہیں کہ اگر ان کے اندر صفت عدل کم ہو تو ان احکام کے برتنے سے درست ہو جائے نہ افراط ہو کہ چھری ڈال دو۔ اور نہ تفریط کہ رحم ہی نہ ہو۔ غرض دونوں میں اعتدال رکھو تو ہمارا کمال یہ ہے کہ رحم بھی ہے اور چھری بھی پھیرتے ہیں مگر یہ سمجھ کر۔

ع آنکھ جان بخشد رگ بخشد رواست

اگر کوئی کہے کہ انہوں نے تو مارا انہیں تو اس کا جواب دوسرے مصرعہ میں دیتے ہیں ع

ع نائب است اور دست اور دست خداست

یہ تو مسلم ہے کہ جان جس کی دی ہوئی ہو۔ وہ لے سکتا ہے ہم اس کے نائب ہیں اس نے ہمیں حکم دیا ہے اس لئے ہم نے چھری پھیری۔ باقی ہم نے جان نہیں نکالی ہم نے تو فقط راستہ کھول دیا ہے جان تو انھیں نے نکالی ہے پھر کیا شبہ رہا اہل اسلام پر کہ بڑے سنگدل ہوتے ہیں۔ آپ بڑے رحم دل ہوتے ہیں کہ خود چوبے نہیں مارتے مسلمانوں کے محلے میں چھوڑ آتے ہیں کہ یہ

لے خاموش کرنا۔ نہ انصاف

ماریں جب تم ہمیں موش کشی میں اپنا نائب بناتے ہو تو اگر اللہ تعالیٰ نے گاؤں کشی میں ہمیں اپنا نائب بنایا تو کیا قباحت ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کی نیابت میں یہ فائدہ بھی ہے کہ ماروا دکھاؤ اور تہاڑی نیابت میں تو فقط مار کر پھینک دینا ہی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ سبحان اللہ! یہ رحم دلی ہے کہ ہم سے نہیں مارتے تو تم نارو۔ نیابت اور کسے کہتے ہیں۔ یہ تو زبان سے بھی کہنے سے بڑھ کر ہے اگر زبان سے کہتے تو ایک مسلمان بھی نہ کر سکتا۔ کیونکہ یہ کسی کی غرض تھی کہ وہ اپنا کاروبار چھوڑ کر تہارے گھروں اور دوکانوں پر چوبے مارتے جاتا۔ مگر ان کے گھر لاکر چھوڑ دینے کے اچھی طرح ان کو ماریں۔

ایک حکایت

یہ رحم تو ویسا ہی ہو گیا کہ کسی ایک کی بے جیا بہو تھی اس سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا شوہر کہاں گیا ہے جیا کی وجہ سے منہ سے تو نہ کہہ سکی مگر بتلانا بھی ضرور تھا۔ تو آپ نے کیا کیا کہ لہنگا اٹھا اس کے سامنے مٹوٹا اور پھانگ گئی۔ مطلب یہ کہ ندی پار گیا ہے۔ تو حضرت بعض رحم بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ کسی نے زنا کیا۔ حمل رہ گیا رسوائی ہوئی لوگوں نے کہا۔ کبخت تو نے عزت کیوں نہ کر لیا دغل انزال سے پہلے علیحدہ ہو جانے کو کہتے ہیں، تو آپ کہتے ہیں کہ سنا تھا کہ عزت کمزور ہے۔ کم بخت منحوس اور زنا کو سافض سنا ہوا۔ بعضوں کا تقویٰ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ تو رحم ویسا ہی ہے جیسی اس بہو کی شرم تھی کہ منہ سے بولنے میں توجیہ تھی اور لہنگا کھول کر سامنے بیٹھ جانے میں جیانا تھی اور پھر مسلمانوں پر اعتراض حضرت میں قبضہ نہ ہوتا ہوں کہ رحم مسلمانوں کے برابر کسی قوم میں نہیں۔ مگر امتحان کے وقت معلوم ہوتا ہے۔ کسی کا قطعہ ہے جس کے بعض اشعار یہ ہیں۔

دیکھ قسم کہے کہ تو میرا ہو پئے * * * * *
اس وقت ہم سلام کریں قبلہ لپکے * * * * *
اور امتحان غیر تو یہ آپ کا غلام * * * * *

دنیا کے واقعات نے کھلم کھلا ثابت کر دیا ہے کہ رحم کے موقعوں پر رحم کرنا یہ خاصہ مسلمانوں ہی کا ہے۔ مسلمانوں کے برابر کوئی قوم رحمدل نہیں۔ میرے پاس ایک برہمن کا خط آیا تھا کہ مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جیو مارتے ہیں۔ مثلاً گاؤں کشی وغیرہ کرتے ہیں مگر وہ جیو کا نہیں مارتے (جیو کا آدمی کے نفس کو کہتے ہیں مگر یہ معترض قوم جیو کا مارتی ہے یعنی آدمیوں پر ظلم کرتی ہے۔ مجھے اس شخص کے قول نقل

کرنے سے فقط مقصود ہے۔

عَ الْخَقِّ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ،

یعنی جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے اب تو کسی شہادتیں ہو گئیں کہ مسلمان بڑے رحم دل ہوتے ہیں۔ بہر حال ان کی رحمت ثابت ہو گئی۔ (وغطر روح النج والنج ۱۵۷)

۱۹) فوج کرنے پر اعتراض اور اس کا جواب

ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ سے زیادہ رحم کسی مذہب میں بھی نہیں ہے۔ اور ذبح حیوان رحم کے خلاف نہیں۔ بلکہ ان کے حق میں اپنی موت مرنے سے مذبح ہو کر مرنے بہتر ہے۔ کیونکہ خود مرنے میں قتل و ذبح کی موت سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر انسان کو ذبح کر دیا جائے تاکہ آسانی سے مرجایا کرے اس کا جواب یہ ہے کہ حالت یاس سے پہلے ذبح کرنا تو دید و انتہ قتل کرنا ہے اور حالت یاس پتہ نہیں چل سکتا کیونکہ بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں کہ مرنے کے قریب ہو گئے تھے پھر اچھے ہو گئے اور یہ مشہد حیوانات میں کیا جائے کہ ان کی تو یاس کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا۔ جواب یہ ہے کہ بہائم اور انسان میں فرق ہے وہ یہ کہ انسان کا تو البقا مقصود ہے۔ کیونکہ خلق عالم سے وہی مقصود ہے۔ اس لئے ملائکہ کے موجود ہوتے ہوئے اس کو پیدا کیا گیا۔ بلکہ تمام مخلوق کے موجود ہونے کے بعد اس کو پیدا کیا گیا۔ کیونکہ نتیجہ اور مقصود تمام مقدمات کے بعد موجود ہو کرنا ہے اس لئے انسان کے قتل اور ذبح کی اجازت نہیں دی گئی۔ ورنہ بہت لوگ ایسی حالت میں فوج کر دیئے جاتیں گے۔ جس کے بعد ان کے تندرست ہونے کی امید تھی۔ اور ذبح کرنے والوں کے نزدیک وہ یاس کی حالت تھی اور جانور کا البقا مقصود نہیں۔ اس لئے ان کے ذبح کی اجازت اس بنا پر دیدی گئی کہ ذبح ہو جانے میں ان کو راحت ہے۔ اور ذبح ہو جانے کے بعد ان کا گوشت وغیرہ بقائے انسانی میں مفید ہے جس کا البقا مقصود ہے۔ اس کو اگر ذبح نہ کیا جائے اور یونہی مرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے تو وہ مردہ ہو کر اس کے گوشت وغیرہ میں سمیت کا اثر پھیل جائے گا اور اس کا استعمال انسان کی صحت کے لئے مضر ہوگا تو البقا انسان کا وسیلہ نہ بنے گا اور قصاص جہاد میں چونکہ انفاء بعض افراد

لے باقی رکھنا نہ ناکرنا۔ چلا کرنا۔

بفرض البقا جمیع الناس متیقن ہے اس لئے وہاں قتل انسانی کی اجازت نہیں دی گئی مگر ساتھ ہی اس کی رعایت کی گئی کہ حتی الامکان سہولت کی صورت سے مارا جائے۔ یعنی قصاص میں جو کہ قتل اختیاری ہے تلوار سے اور جہاد میں مشلہ وغیرہ کی ممانعت ہے۔ (انفار المحبوب ص ۵)

۲۰) مردہ کو دفن کرنا بہتر ہے یا جلا دینا؟

اسلام کی خوبی یہ ہے کہ مردہ کے دفن کا حکم دیا گیا اور جلانے کی ممانعت کر دی کہ دفن میں کلمہ ہے۔ اور احراق میں اس اصل سے عدول ہے۔ بعض مدین فلسفہ جلانے کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور دفن کی خرابیاں کہ اس سے مٹی خراب ہوتی ہے اور اس سے جو بخارات اٹھتے ہیں وہ گندے زہریلے اور متعفن ہوتے ہیں اس طرح کے نکٹوں سے ثابت کرتے ہیں کہ جلانا اچھا ہے مگر ہم تو اس کے خلاف مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کسی مدفون کی قبر میں بد بو نہیں آتی۔ مگر گھٹ پر تو اس قدر متعفن اور گندی ہوا ہو جاتی ہے کہ ناک نہیں دی جاتی۔ ایسے مہل نکتے تو ہر خرم میں بیان ہو سکتے ہیں مگر سلامتی فطرت حق و باطل کا فیصلہ خود کرتی ہے بلکہ عقل و ذہن کو پسند کرتی ہے کہ اس میں بدن کو اس کی اصل میں پہنچا دیا۔ باقی خاک ہونا اصل ہے سو اس کی دلیل یہ ہے کہ ہر عنصر اپنی چرخی طرف میلان ہے۔ اگر کوئی شخص کو سٹھ پر سے اچھلا کر وہ اوپر چلا جاتا تو ہوا یا نار غالب ہوتی۔ اب تو خاک غالب ہے۔ اور آب (پانی) کا غلبہ ہونا بھی ظاہر ہے ورنہ آب میں پہنچ کر عقیق کی طرف نہ جاتا بس خاک کا غلبہ متعین ہو گیا۔ اور یہ قاعدہ عقلی ہے کہ کل شیء یرجع الی اصلہ ذہر جز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے تو خاک میں دفن کرنا بالکل عقل کے موافق ہے اور اس کے ماسوائے فطرۃ سلیمہ اور عقل کے بالکل خلاف ہے۔ باقی احراق جلانے کی رسم کیسے نکلی۔ سوا یک بزرگ فرماتے ہیں کہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں پڑائی نارنج میں اوتار اور دیوتاؤں کی معاشرت کا ذکر ہے یہ وہ جن تھے غالباً۔ ان کے شریع اور تھے اور انسان کے اور تو ان عنصر غالب یعنی نار کا مقتضی عقلی یہ تھا کہ بعد موت ان کے ابدان کو اسی میں ملا دیا جائے چونکہ ان میں آگ غالب تھی۔ اس لئے آگ میں جلا دیئے جاتے تھے۔ یہ قصہ ان کی کتابوں میں مذکور ہوں گے۔ جہالت اور نادانی سے خدا پچائے یہ ایسے بزرگوں کی سنت سمجھ کر خود بھی یہی کرنے لگے۔ ع۔

لہ عزت دینا نہ جلا ڈالنا۔

۴۰ چوں ندید حقیقت

۴۱ افسانہ زند - گویات تاریخ سے ثابت نہیں مگر تائیں سے ہی مؤید ہیں۔

(وعظ ارواح الخ والیخ ص ۱۲)

حصہ اول ختم شد

فہرست مضامین حصہ دوم

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۷۷	اہل بدعت کے شبہات کے جوابات	۶۷	روافض کے اعتراضات کے جوابات
۷۸	ایصال ثواب کیلئے تاریخ مخصوص کرنا		بوقت وصال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا
۷۹	نیت کی اصلاح		دوات مانگنا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کہنا کہ
۸۰	بدعت کی مثال		کیا ضرورت ہے۔
	حضرت گنگوہی کا واقعہ		الزامی جواب
	بدعات کی قباحت	۶۸	اس شبہ کا جواب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو
	خیر القرون کے بعد کی چیزیں		خلیفہ کیوں نہیں بنایا۔
	کتابوں کی تصنیف اور مدارس	۶۹	ایک واقعہ
	خانقاہوں کی تعمیر		شیخین کے احسانات
۸۱	بدعات میں کیا چیز داخل ہیں		کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ طالب دنیا تھے
۸۲	اہل حق کو وہابی کہنا محض بہتان ہے	۷۰	مگر اہل فرقہ کا غلط دعویٰ
	شیخ عبدالقادر جیلانی کی گیارہویں	۷۱	ازواج مطہرات بھی اہل بیت میں داخل ہیں
	منانے والوں کی غلطیاں۔		اس شبہ کا جواب کہ بعض علوم سینہ بسینہ ہیں
۸۳	عقائد کی خرابیاں	۷۲	سینہ بسینہ علم کا موجد
	حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے متعلق	۷۳	صوفیاء پر الزام
	ایک بے بنیاد حکایت۔	۷۴	ایک حکایت
۸۴	بعض لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم		ایک مشہور قصہ
	کے خدا ہونے کی حدیثیں گھڑ لی ہیں۔	۷۵	حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان
۸۵	جاہلوں کے خرافات		امام ابو یوسف کا واقعہ
۸۶	جانوروں وغیرہ کو محسوس سمجھنا سب و اہیات ہے۔	۷۶	

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۹۹	نیوٹہ کی رسم	۸۶	اصطلاح صوفیہ میں کافر سے مراد فانی ہے
	نیوٹہ کی خرابیاں	۸۷	مزاج حدیث میں
۱۰۰	دوسری رسمیں		ایک واقعہ
۱۰۱	غلوں کی رسمیں	۸۸	حق تعالیٰ کا مزاج
۱۰۲	دلائل عقلیہ	۸۹	خطبہ الوداع محض بدعت ہے
	ایصال ثواب کے غلط طریقے		عوام کا اہل قبور سے مدد مانگنا شرک سے خالی نہیں۔
۱۰۳	ایک حکایت	۹۰	شرک کی ایک مثال
	بارت کا ایجاد	۹۱	قبروں سے مدد چاہنا
۱۰۳	دین چھوڑنے کا انجام		ایک حکایت
	عفت وعصمت کی حفاظت	۹۲	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت پر جلوس نکالنا۔
۱۰۵	دلہن کی حفاظت	۹۳	ایک بزرگ کی حکایت
	شوہر کے مرنے کے بعد شوہر والوں کا عورت کے نکاح میں اپنا حق سمجھنا غلط ہے۔	۱۰۴	دنیا داروں کا سامعہ نبی کے ساتھ
۱۰۴	زبردستی نکاح	۹۳	یوم ولادت پر خوشی منانے کی دلیل نہیں
۱۰۷	مائیوں بٹھانے کی رسم ناجائز ہے		عرس کے حقیقی معنی اور بزرگوں کے
	چالیسویں وغیرہ کا کھانا محض برادری کی خوشنودی کیلئے کیا جاتا ہے۔	۱۰۸	مروجہ عرسوں کا خلاف شرع ہونا۔
۱۰۸	ایک حکایت	۹۵	مرنے پر خوشی
۱۰۹	ایک گوجر کا واقعہ	۹۶	ابن الفارض کا واقعہ
	ایک رئیس زادہ کی حکایت		بزرگوں کی موت یوم مسرت ہے۔
۱۱۰	حاصل کلام	۹۷	شادی اور غمی کی رسوم خلاف شرع اور واجب الترتک ہیں۔
	تبرکات نبوی کی زیارت	۹۸	تکبر کی حمایت
۱۱۱	موتے مبارک		شادی میں انسان کا حال
	تبرکات نبوی کے سلسلہ میں حدیثیں		

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۲۶	ایک قصہ	۱۱۲	جبہ مبارک کا تذکرہ
	پختہ قبریں بنانا خلاف شرع اور اہل اللہ کے مذاق کے خلاف ہے۔	۱۱۳	مولے مبارک سے متعلق حدیث
۱۲۷	زیارت قبور کا منشاء		لباس مبارک
۱۲۸	صحابہ کا عمل	۱۱۳	تبرکات نبوی کیساتھ غلو
۱۲۹	کچی قبریں	۱۱۴	تبرکات کام نہیں آتے
	پختہ قبر ممنوع ہے	۱۱۵	رمضان شریف کیلئے نیک کاموں کا روک رکھنا۔
۱۳۰	قبروں سے فیض کا سوال		نیکی میں تاخیر نہیں کرنا چاہیئے
	ربیع الاول کے مخصوص ہمینہ میں میلاد کی مانعت۔	۱۱۶	عید میلاد النبی کی دلائل اربعہ سے تزیید
۱۳۱	صوفیاء اور علماء کے ذوق کافرق		میلاد کی تردید قرآن میں
	صوفیاء اور علماء کی رائے کافرق ایک مثال سے۔	۱۱۷	میلاد کی تردید حدیث میں
۱۳۲	حب رسول کا درجہ	۱۱۸	فضائل یوم ولادت کی صراحت نہیں
	واقعہ خواجہ باقی باللہ		روضہ مبارک کی زیارت
۱۳۳	ناز بھگوان یا مجرد عرس کے بعد مل کر بلند آواز سے ذکر بدعت ہے۔	۱۱۹	چوتھی حدیث سے استدلال
	علماء کی مثال	۱۲۰	عدم جواز پراجماع سے ثبوت
۱۳۳	مولانا اسماعیل شہید کا حال		ایک شبہ کا جواب
	شیخ الہند کا واقعہ	۱۲۱	عید میلاد کا عدم جواز قیاس سے
۱۳۵	سجادہ نشین محل میراث نہیں بلکہ محض رسم ہے۔	۱۲۱	موجدین کے دلائل اور ان کا جواب
	حکیم الامت کا ایک واقعہ	۱۲۲	پہلا استدلال اور اس کا جواب
۱۳۶	گدی نشینی	۱۲۲	دوسرا استدلال اور اس کا جواب
			تیسرے استدلال کا جواب
		۱۲۳	چوتھا استدلال اور اس کا جواب
		۱۲۳	پانچواں استدلال اور اس کا جواب
		۱۲۵	عقلی دلائل کا جواب

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۴۴	عوام کے لئے ترجمہ قرآن شریف دیکھنا مضرب -	۱۴۱	ایک مشہور حکایت عہد عمر میں تراویح و وتر	۱۳۸	خود غرضی کا ایک واقعہ	۱۳۶	حضرت تھانویؒ کا واقعہ
۱۴۵	ایک بڑے میاں کا واقعہ	۱۴۳	حضرت امام ابو حنیفہ درایت میں	۱۳۹	ایک حکایت تقلید شخصی کی ضرورت	۱۳۸	عید گاہ میں بچوں کے لانے کی مانعت
۱۴۷	قبولیت دعا پر شبہ کا جواب	۱۴۲	سب ائمہ سے بڑھے ہوئے ہیں۔	۱۵۰	اس اعتراض کا جواب کہ مقلدین حدیث کو چھوڑ کر اقوال ائمہ کرتے ہیں۔	۱۳۷	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں ایسا مبالغہ کہ جس سے دوسرے انبیاء کی توہین ہونا جائز ہے۔
۱۴۸	دعا کی قبولیت کی شکلیں	۱۴۵	عوام کے شبہات کا حل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے صاحبزادے ابراہیمؓ کی وفات پر رونا۔	۱۵۱	ایک اعتراض اور اس کا جواب مسائل اجتہادیہ	۱۳۹	غلط کتابیں
۱۸۰	اجابت دعا کا معنی	۱۴۶	ہم عمری کا خیال	۱۵۲	اس شبہ کا جواب کہ توسل میں بزرگ کی بزرگی کو حجت میں حق میں کیا دخل ہے۔	۱۳۸	انبیاء کی شان میں گستاخی
۱۸۱	بغیر عمل کے کوئی دینی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا	۱۴۷	عورت کا کم عمر ہونا مناسب ہے	۱۵۳	اس شبہ کا حل کہ لا الہ الا اللہ کے سوا تمام اذکار بدعت ہے۔	۱۳۷	حسن کی دو قسمیں ہیں
۱۸۲	مجاہدہ کو ضروری نہ سمجھنا غلطی ہے	۱۴۸	علم دین حاصل کرنے کا سہل اور آسان طریقہ۔	۱۵۴	حنفی کہلانے پر اعتراض کا جواب	۱۳۶	نبی کی ایسی تعریف جس سے دوسرے کی تنقیص ہو
۱۸۳	انبیاء علیہم السلام پر تکالیف انہی وجہ فرقہ خشوع کی تردید	۱۴۹	قرآن شریف ایک متن ہے فقہ اور حدیث اس کی شرح ہے۔	۱۵۵	مقصود اتباع الہی ہے	۱۳۵	ہر خوبی کا ظہور ہر وقت لازم نہیں
۱۸۴	جہلا کی اس غلطی کا جواب کہ خیرات کی ہوئی چیز بعینہ مردہ کو پہنچتی ہے۔	۱۵۰	آج کل مستحبات کی پرواہ نہیں کجانی نہی ان کی تعلیم کا اہتمام ہے۔	۱۵۶	روضہ نبویؐ کی زیارت کیلئے سفر کرنے پر شبہ کا جواب، نیز یہ کہ زیارت حقوق محبت نبویؐ سے ہے۔	۱۳۴	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ
۱۸۵	خیرات ہونے والی چیزوں کا ثواب پہنچتا ہے۔	۱۵۱	اللہ تعالیٰ سے صرف قانونی تعلق تعلقات میں درجہ کمال	۱۵۷	کاہنوں کا ایک واقعہ	۱۳۳	انداز بیان میں احتیاط
۱۸۶	خیرات کی جانے والی چیزیں مردہ کو نہیں پہنچتی ہیں۔	۱۵۲	کمزور تعلق پر افسوس نہیں ہمارا فرض کیا ہے۔	۱۵۸	امام مالک کا جملہ اور اس کا جواب	۱۳۲	صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جاں نثاری
۱۸۷	حوریں اور ان کے ڈوپٹے حوض کوثر کا پانی	۱۵۳	کسی مصلحت سے ترک مستحبات مستحبات بھی ضروری ہیں	۱۵۹	سید احمد رفاعی کا واقعہ	۱۳۱	حضرت موسیٰ علیہ السلام
۱۸۸	اس کا جواب کہ مشائخ بعض مرتبہ اہل کو خلیفہ کر دیتے ہیں۔	۱۵۴	تراویح بیس رکعت سنت ہے	۱۶۰	ایک واقعہ مقصد سہولت ہے	۱۳۰	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کا معتشوق قرار دینا سخت بے ادبی اور گستاخی ہے۔
۱۸۹	اس اعتقاد کی تردید کہ نجات آخرت ہمارے اختیار سے باہر ہے۔	۱۵۵	فعل اختیاری کے دو معنی ہیں جنت میں جانا اختیاری ہے			۱۲۹	مردہ کی روح دنیا میں واپس نہیں آتی

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۸۹	تقویٰ کا بیان	۲۰۲	چھوٹے بچوں کو روزہ پر مجبور کرنا
۱۹۰	توکل اور اس کی حقیقت		درست نہیں۔
۱۹۱	آخرت کیلئے سعی کرنا	۲۰۳	فرشتہ کو پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا
۱۹۲	اختلاف رویت کی صورت میں روزہ		حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشریت کا اعلیٰ و ارفع نمونہ ہیں۔
	کون سی تاریخ کا افضل ہوگا۔	۲۰۴	احکام میں نبی کریم کے عمل کی موافقت
۱۹۳	جس کے یہاں جو تاریخ ثابت ہو وہی		ضروری ہے۔
	برکت ہے۔	۱۹۴	فرشتہ رسول بنا کر کیوں نہیں بھیجے گئے
۱۹۴	عورتوں کے اس عمل کی تردید کہ گھر میں	۲۰۵	سید المرسلین کا انتخاب
	میلی کچلی رہتی ہیں اور باہر زینب زینت کے ساتھ۔	۲۰۶	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان
	مردوں کی کوتاہی کہ عورتوں کے دینی	۲۰۷	بعض جدید تعلیم یافتہ کا حال ان سے
	امور اپنے ذمہ نہیں سمجھتے۔	۲۰۸	مسلمان لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا۔
۱۹۷	زنانہ اسکولوں کا قیام عورتوں کے لئے		حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں
	زہر قاتل ہے۔		پیدا ہونے کی تمنا۔
	موجودہ زمانہ میں اسکول کا حال		لوگوں نے غفور رحیم کے معنی غلط سمجھے
۱۹۸	لڑکیوں کی تعلیم کا طریقہ	۲۰۹	طوطے کی مثال
	خصوصی مسائل		غفور رحیم کا حاصل
۱۹۹	لکھنا بھی سکھایا جائے	۲۱۰	خدا کی مخالفت
	ماں باپ کا حق پیر سے زیادہ ہے	۲۱۱	خطا معاف کر کے مقرب بنانا
	پیروں کا حال	۲۱۲	جاہل واعظوں کے وعظ کی خرابیاں
	آج کل کے پیر مریدوں کو غلام سمجھتے ہیں	۲۱۳	جاہل واعظ کی خرابیاں
	حضرت جریج صوفی کا واقعہ		ضعف ایمان ضعف طبیعت
	شریعت کا حسن و جمال		سونا چاندی خریدنے کا مسئلہ
	عبادت کا اثر	۲۱۴	طلاق کا مسئلہ

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۲۸	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کی وجہ	۲۱۵	مطلق و مقید کا فرق
۲۲۹	دنیا و آخرت میں فرق	۲۱۶	عوام کا ہر دینی کام میں دلیل تلاش
۲۳۱	درود پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی احسان غلط ہے۔		کرنا بڑی غلطی ہے۔
	درود کا فائدہ		حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت میں
۲۳۲	مساجد و مجالس کی آرائش فضول حرکت ہے		جانا رحمت سے ہو گا نہ کہ عمل سے اس پر
۲۳۳	مجلس اسلامی کی شان	۲۱۷	ایک شبہ کا جواب۔
۲۳۴	اہل حق کا کلام		حضرت ابراہیمؑ کا حضرت اسمعیلؑ
۲۳۵	حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام کی حیات برزخہ کا اثبات۔		سے بوقت ذبح رائے دریافت کرنے پر
۲۳۶	حیات برزخہ کے مراتب	۲۱۹	ایک شبہ کا جواب۔
۲۳۷	شہید کی حیات	۲۲۰	مقتدا بنانے کیلئے عوام کا غلط معیار
۲۳۸	انبیاء کی حیات		بزرگی کیا ہے
	نبی کریم ص کی حیات	۲۲۱	بی بی تمیزہ کا وضو
	سلطان مدینہ کا جواب		بزرگی کیا ختم نہیں ہوتی ہے
۲۳۹	سرسنگ کھودنے والے پکڑے گئے		پیشوا بنانے کا صحیح معیار
۲۴۰	علم تجوید سے لاپرواہی کرنا ٹھیک نہیں	۲۲۲	بعض لوگ حج کے بعد بد عمل کیوں
۲۴۱	تجوید سیکھنا فرض ہے		ہو جاتے ہیں ؟
	علماء کا باہمی اختلاف اور مہارافض	۲۲۳	جب بری باتوں سے بچنا نماز کا خاصہ
۲۴۲	ضروری سمجھنے کے بعد		تو پھر اس کے خلاف کیوں ہوتا ہے۔
۲۴۳	علماء کی نا اتفاقی	۲۲۴	ہماری نمازیں
۲۴۴	اختلاف کی بنیادی وجہ		صورت نماز بھی فائدہ سے خالی نہیں
۲۴۵	فاتحہ مروّجہ کا نقصان	۲۲۵	اعتراض کا جواب
	اختلاف ہل شکایت نہیں		معراج میں دیدار باری تعالیٰ
		۲۲۶	دیدار الہی
		۲۲۷	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدار الہی معراج میں ہوئی

روافض کے اعتراضات کے جوابات

(۱) بوقت وصال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دوات مانگنا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہنا کیا ضرور ہے

یہ اعتراض حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر نہیں بلکہ اس میں تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کتمان حق کا اعتراض لازم آتا ہے۔ آپ پر تبلیغ احکام فرض تھی۔ اگر کوئی حکم واجب تھا تو آپ نے کیوں نہ ظاہر فرما دیا۔ اگر اس وقت دوات قلم نہیں لے تو دوسرے وقت منگا کر تحریر فرما دیتے۔ کیونکہ آپ کوئی روز اس واقعہ کے بعد زندہ رہے ہیں۔ جتنا بخیر یہ واقعہ پیشینہ کلے اور وفات دو شنبہ کو ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی نیا حکم ارشاد فرمانا نہ تھا بلکہ کسی امر قدیم کی تجدید و تاکید مقصود تھی۔

(ب) چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے اس لئے آپ نے گوارا نہ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکلیف فرمائیں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ طبیب کسی کو زبانی نسخہ بتلا دے۔ پھر براہ شفقت کہے قلم دوات لاؤ لکھ دو اور بعض یہ دیکھ کر کہ اس وقت ان کو تکلیف ہوگی کہنے کہ کیا حاجت ہے اس وقت تکلیف مرت دو۔

اور جواب الزامی یہ ہے کہ قصہ حدیبیہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلح نامہ لکھا تھا۔ ہذا اما قضی علیہ محمد رسول اللہ کفار نے مزاحمت کی کہ ابن عبد اللہ لکھو، کیونکہ اسی میں تو جھگڑا ہے اگر ہم رسالت کو تسلیم کریں تو نزاع ہی کس بات سے یہ فیصلہ ہے جو اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔

الزامی جواب

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۶۴	چندہ وصول کرنے کے مفاسد بیوی کے مال میں طیب نفس کی قید	۲۴۶	مولوی کی صحبت میں رہ کر دیکھے بعض لوگ کہتے ہیں کہ روزے صرف تین ہی ہونے چاہئیں اس کی تردید۔
۲۶۵	چندہ و ہدیہ کے آداب	۲۴۷	اس شبہ کا جواب کہ تبلیغ عذر سے ساقط ہوتی ہے یا نہیں۔
۲۶۶	ایک انجمن کا واقعہ	۲۴۸	تبلیغ اسلام کا اسلم طریقہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی مثال
۲۶۸	حق تعالیٰ بدوں ابتلا و امتحان کے جنت کیوں عطا نہیں فرماتے۔	۲۴۹	مجتہدین کے اختلاف کا راز
۲۶۸	ابتلا و امتحان کی حکمت	۲۵۰	آمین میں اختلاف
۲۶۹	عبادت میں لذت کے باوجود ثواب	۲۵۱	درود ابراہیمی علیہ السلام کے فضل
۲۶۹	اختلاف رویت قمر کی صورت میں ایلتہ القدر کے متعدد ہونیکا شبہ اور اس کا جواب۔	۲۵۲	ہونیکا شبہ اور اس کا جواب
۲۷۰	محض کتابیں دیکھ کر ہی اپنی اصلاح نہیں ہو سکتی	۲۵۳	ایک اشکال اور اس کا جواب
۲۷۱	حضرت کا اپنا واقعہ	۲۵۴	واصل بحق ہونے پر شبہ
۲۷۲	نفع متعدی کا علی الاطلاق نفع لازمی سے	۲۵۶	بعض لوگوں کا بغیر عمل کامل ہو جانے کی تمنا کرنا غلط ہے
۲۷۳	افضل ہونا درست نہیں۔	۲۵۷	بزرگوں کے طریقہ اصلاح پر شبہ کا جواب
۲۷۳	اپنی اصلاح مقدم ہے۔	۲۵۸	طاعون سے بھاگنا تدبیر کے خلاف ہے
۲۷۳	اجازت کی قید کی وجہ	۲۶۰	منافقین کے نماز جنازہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے افضل ہونے کا شبہ اور اس کا جواب۔
۲۷۵	جسٹیل کا فرعون کے ڈوبنے کے وقت اس کے منہ میں مٹی ٹھوسنا۔		حضور کی شان
۲۷۶	فرعون کا ایمان لانا	۱۶۲	تکمیل نماز کا طریقہ
۲۷۶	فرعون کی لغش کا محفوظ رہنا		سجدہ و رکوع میں سوچ
۲۷۶	خدا تعالیٰ کی پیشین گوئی کسی امر کے متعلق اس کو لازم نہیں کہ وہ غیر اختیار ہو جائے۔	۱۶۳	جلسہ تشہد میں سوچے
۲۷۹	خلافت فاروقیہ کو خلافت صدیقیہ سے کثرت فتوحات کی وجہ سے افضل سمجھنا غلط ہے۔		اخیر نماز میں تصور
۲۸۰	ایک غلط فہمی کا ازالہ		
۲۸۱	کیا چار سو برس کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا		
۲۸۱	نئے مسائل کے جوابات		
۲۸۲	اجتہاد فی الاصول کی بندش		
۲۸۲	اجتہاد فی الفروع باقی ہے		
۲۸۳	علم الاعتبار نکات و لطائف کے درجہ میں ہے		

کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ اس کو مٹا دو۔ انھوں نے انکار فرمایا پس ایسی مخالفت تو اس میں بھی ہوئی۔ جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مخالفت کی تھی پھر فرمایا کہ جواب الزامی مجھے پسند نہیں ہے مگر بطور لطیفہ کے اس وقت بیان کر دیا (مجادلات معدت حصہ اول دعوات عبدیت ص ۲۳)

(۲) اس شبہ جواب کہ حضرت علیؑ کو خلیفہؑ ان کوں نہیں بنایا

جواب (۱) ہمارے بعض بھولے بھالے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے لڑتے ہیں کہ شیخین نے خلافت لے لی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہ دی۔ میں کہتا ہوں کہ شیخین کے لئے دنا کیجئے اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اول ہی سے خلافت دیدی جاتی اور اتنی مدت تک یہ خلیفہ رہتے اور ان حضرات کی مشقت و تعب دین کے لئے۔ اور فلت دنیا کے لئے معلوم ہو چکی۔ تو ان کو کس قدر مزید تکلیف ہوتی جو اٹھائے نہ اٹھتی۔ ان حضرات نے یہ بڑا سلوک کیا کہ اس مصیبت کو خود بانٹ لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تکلیف نہ پہنچے دی اور جو کچھ ان حضرات میں شکر رکنی ہوئی۔ اول تو بہت واقع غلط مشہور ہیں۔ دوسرے جب اتحاد اور دوستی ہوتی ہے تو شکر رکنی بھی ہو جاتی ہے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دو خادموں سے جو کہ آپس میں نہایت درجہ اتحاد رکھتے تھے پوچھا تم دونوں میں کبھی لڑائی بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ انھوں نے عرض کیا حضور کبھی بھی ہو جاتی ہے۔ مگر پھر اتحاد ہو جاتا ہے۔ فرمایا کہ تمہارا اتحاد دیا سدا رہے۔ ذوق کہتا ہے سہ

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے رہے۔ بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے رہے ایک عربی حکیم لکھنا ہے "وَيَبْقَى الْوُدُّ مَا بَقِيَ الْعِتَابُ"، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دوستی جب باقی رہتی ہے کہ دل میں عتاب باقی نہ رہے۔ اور اگر عتاب نہ کیا جائے۔ اور بات کو دل میں رکھا جائے تو عمر بھر بھی دل سے کدورت نہ نکلے گی اور اگر دل کی بھر اس نکال لی جائے تو بھر دل صاف ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو کہ سب سے زیادہ محب اور محبوب تھیں، وہ بھی کبھی کبھی ناز کے طور پر روٹھ جاتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تمہاری خوش و ناز رضی کے وقت کو پہچانتا ہوں جب تم ناراض ہوتی تو قسم میں لا ورت ابڑا ہیہم کہتی ہے جب تک عتاب رہتا ہے محبت باقی رہتی ہے نہ نبی ابراہیم کے رب کی قسم۔

ہو۔ اور جب خوش ہوتی ہو تو لا ورت محمد کہتی ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عرض کرتی تھیں وَهَلْ أَهْجُرُ إِلَّا سَمَكَ کہ حضور اس وقت صرٹ آپکا نام نہیں لیتی ورنہ دل میں تو آپ ہی بسے ہوتے ہیں۔ تو اگر آپس میں ان حضرات میں کوئی بات ہوتی بھی ہو تو باہم ایک دوسرے پر ناز ہے۔ ہمارا منہ نہیں کہ ہم اعتراض کریں۔

ایک واقعہ

کانپور میں ایک صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہتے تھے۔ ایک مرتبہ اتفاق سے میں ان سے ملا انھوں نے وہی تذکرہ چھیڑا۔ اور یہ حدیث پڑھی۔ مَنْ سَبَّ أَحْمَدًا فَقَدْ سَبَّنِي وَمَنْ سَبَّنِي فَقَدْ سَبَّ أَدْلَسَ۔ اور کہا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں نامناسب الفاظ کہہ دیتے تھے تو وہ اس حدیث کے مصداق ہو گئے۔ میں نے کہا کہ صاحب آپ نے غور نہیں کیا۔ اس حدیث کے معنی نہیں آپ نے سمجھے۔ بلکہ اس کے معنی دوسرے ہیں ان کے سمجھنے کے لئے اول آپ ایک محاورہ سمجھئے کہ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ جو شخص میرے بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا میں اس کی آنکھیں نکال دوں گا تو اب بتلایئے کہ یہ وعید کس شخص کے لئے ہے آیا اپنی دوسری اولاد کے لئے بھی کہ اگر وہ آپس میں لڑیں جھگڑیں تو ان کے ساتھ بھی وہی کیا جاوے گا۔ یا عزیزوں اور اجانب کے لئے ہے۔

ظاہر ہے کہ اجانب کے لئے یہ وعید ہے بس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ غیر اصحاب میں سے جو شخص میرے اصحاب کو برا کہے اس کے لئے یہ حکم ہے (فضائل اثنیۃ ص ۳) (ب) میں بقسم کہتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل شیخین کے احسانات سے پوچھا جائے وہ تو حضرات شیخین کے احسان مند ہوں گے کہ انہوں نے ان کو مصیبت سے بچا لیا کیونکہ حضرات صحابہ کی خلافت شاہان اودھ کی سی بادشاہت نہ تھی کہ رات دن عیش و مستیاں کرتے ہوں وہاں تو ایسی بادشاہت تھی کہ ایک دن گرمی کے سخت دوپہر میں جب کہ لوچل رہی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ تنہا جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ امیر المؤمنین ہیں جب ان کے گھر سے قریب ہوئے تو آواز دی کہ امیر المؤمنین اس وقت سخت گرمی۔۔۔ اور لو میں کہاں جا رہے ہیں۔ فرمایا بیت المال کا ایک اونٹ ضائع ہو گیا ہے اس کی تلاش میں جا رہا ہوں

انہوں نے عرض کیا کسی خادم کو نہ بھیج دیا۔ فرمایا کہ قیامت میں تو سوال مجھ سے ہوتا۔ خادم سے سلوا نہ ہوتا۔ عرض کیا پھر تھوڑی دیر تو وقف کر کے تشریف لے جائیے ذرا گرمی کم ہو جائے۔ فرمایا انا جہنم اسند محل جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے یہ کہہ کر اسی دھوپ اور لوہیں جنگل تشریف لے گئے یہ سلطنت تھی۔ ایک بار آپ منبر پر کھڑے ہوئے خطبہ پڑھ رہے تھے۔ خطبہ میں فرمایا۔ اَسْمَعُوا وَاَطِيعُوا ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا۔ لَا نَسْمَعُ وَلَا نَطِيعُ۔ آپ نے پوچھا کیوں۔ اس نے جواب میں کہا کہ آپ نے دو کپڑے پہن کر کھے ہیں جو مال عنیت سے نفی ہوئے ہیں۔ مگر سب کے حصہ میں تو ایک کپڑا آیا تھا۔ آپ نے دو کپڑے کیسے لئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ بے شک تم سچ کہتے ہو۔ اے عبد اللہ! تم اس کا جواب دو۔ اسی پر حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کھڑے ہوئے اور کہا۔ امیر المؤمنین کے پاس آج کوئی کپڑا نہ تھا۔ جس کو پہن کر نماز پڑھاتے تو میں نے اپنے حصہ کا کپڑا ان کو عاریتہ دیدیا ہے اس طرح ان کے پاس دو کپڑے ہو گئے۔ جن میں سے ایک کی لنگی بنائی اور ایک کی چادر۔ یہ جواب سن کر سائل رونے لگا۔ اور کہا جہاں اک اللہ۔ اب آپ خطبہ پڑھیں ہم نہیں گے اور اطاعت کریں گے۔ یہ ان حضرات کی حکومت تھی کہ رعایا کا ہر شخص ان پر روک ٹوک کرنے کو موجود تھا۔ تو ایسی صورت میں خلافت کوئی راحت کی چیز نہ تھی۔

کیا حضرت علیؓ ظالم بنیائے تو کیا حضرت علیؓ اس کے نہ ملنے سے رنجیدہ ہو سکتے تھے کبھی نہیں۔ دوسرے اگر مان بھی لیا جائے کہ خلافت بڑی راحت کی چیز تھی۔ تو اس کی وہ تناکرے جس کے دل میں دنیا کی ہوس اور وقعت ہو تو کیا نعوذ باللہ ان لوگوں نے حضرت علیؓ کو دنیا دار اور طالب دنیا سمجھ رکھا ہے جو وہ اس کے نہ ملنے سے رنجیدہ ہوئے ہوں گے، اگر وہ ایسا سمجھیں تو ان کو یہ خیال مبارک ہو۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی نظر میں دنیا کی کچھ بھی وقعت یا ہوس نہ تھی۔ کیونکہ ان کو تعلق مع اللہ کی سلطنت حاصل تھی جس کی خاصیت یہ ہے کہ

آکس ترا شناخت جاں را چہ کند

فرزند و عیال و خانہاں را چہ کند

پھر ان کو خلافت دیر میں ملی تو کیا اور نہ ملتی تو کیا ان کو کبھی بھی اس کا رنج نہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ وہ تو اس سے خوش ہوتے پھر جس بات سے ان کو خوشی ہو آپ اس میں رنج کرنے والے کون

لے سنو اور مانو۔ نہ نہ سنوں گا اور نہ مانوں گا۔

ہیں یہ وہی مثل ہوئی مدعی سست گواہ چست، اسی دنیا کی بے وقعتی کو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ مال و بنون زینت حیوة دنیا ہیں۔ (مظاہر الآمال ص ۱۹)

گمراہ فرقہ کا غلط دعویٰ (ج ۱) ایک فرقہ ضالہ نے حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کی خلافت بلا فصل ایک حدیث سے ثابت کی ہے جس میں حضرت کی نسبت لَحْمًا لَحْمًا دَمًا دَمًا دَجَیْ آیا ہے۔ اور استدلال اس طرح کیا ہے کہ حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ رسولؐ ہیں۔ اس لئے ان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو خلافت کا استحقاق نہیں تھا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں دوسرے میں کہتا ہوں کہ اگر اس سے عینیت حقیقت مراد ہے تو اس سے حضرت علیؓ کی خلافت ہی کی نفی ہوتی ہے کیونکہ خلیفہ تو غیر ہی ہونا چاہیے کوئی شخص خود اپنا خلیفہ نہیں ہوا کرتا۔ پس بہت سے بہت تم یہ کہہ سکتے ہو کہ حضرت ابو بکرؓ جیسے حضورؐ کے خلیفہ تھے حضرت علیؓ کے بھی خلیفہ تھے تو اس میں ہم تم سے نزاع نہ کریں گے۔

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی گوشت خاک ما ہم بر باد رفت باشتی
مگر ان کا مدعا تو باطل ہو گیا۔ اور ایک جواب دوسرے علمائے نے دیا ہے کہ حضرت علیؓ عین رسولؐ ہیں تو حضرت فاطمہؓ کے ساتھ ان کا نکاح کیسے ہوا۔ یہ تو حضرت حسینؓ کے حق میں معاذ اللہ سخت گالی ہو گی۔ اور اگر عینیت حقیقت مراد نہیں اور لقیئاً مراد نہیں بلکہ صرف عینیت عرفیہ مراد ہے۔ جیسا کہ صوفیہ حضورؐ کو اسی معنی کر عین حق کہتے ہیں تو پھر یہ حضرت علیؓ کے ساتھ خاص نہیں۔ اس معنی کر تو ہر صحابی عین رسولؐ تھا۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سبھی کو تعلق تھا کسی کو بھی اجنبیت نہ تھی۔ (ارضا راجح حصہ دوم ص ۱۲)

(۳) ازواج مطہرات بھی اہل بیت میں داخل ہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے۔ اللہم اجعل ذوق آل محمد قوتاً کہ اللہ آل محمد کا رزق بقدر قوت کیا جائے اور قدر قوت وہ ہے جس میں بقدر کفایت گذر ہو جائے۔ کچھ فاضل ہو۔ اور اس میں شک نہیں کہ ازواج مطہرات بھی آل محمد میں داخل ہیں اس لئے کہ دعا راجح بھی شامل تھی۔ اور اسی طرح ذریت بھی داخل ہے بلکہ اصل مقتضای لغت یہ ہے کہ ازواج تو آل محمد میں اصلاً داخل ہوں اور ذریت تبعاً داخل ہوں۔ کیونکہ آں کہتے ہیں اہل بیت کو معنی

گھر والوں کو اور گھر والوں کے مفہوم میں بیوی سب سے پہلے داخل ہے پس یہ احتمال نہیں ہو سکتا کہ ذریت تو آل میں داخل ہو اور ازواج داخل نہ ہوں بعض لوگوں کو ایک حدیث سے شبہ ہو گیا ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت علیؓ اور فاطمہؓ و حضرات حنین رضی اللہ عنہم کو اپنی عبا میں داخل فرما کر فرمایا اللہم ھولاء اھل بیتی کہ اے اللہ میرے اہل بیت ہیں اس سے بعض عقلمندوں نے یہ سمجھا ہے کہ ازواج مطہرات اہل بیت میں داخل نہیں۔ حالانکہ حدیث کا مطلب ہے کہ اے اللہ یہ بھی میرے اہل بیت ہیں سے ہیں ان کو بھی ائمتہ کبریٰ اہل بیت ہیں۔ عَنْهُمْ الرِّجْسُ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهَّرُونَ۔ کی فضیلت میں داخل کر لیا جائے یہاں حصر مقصود نہیں کہ بس یہی اہل بیت ہیں اور ازواج مطہرات اہل بیت نہیں ہیں۔ اور یہ جو اس حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو عبا میں داخل فرما کر یہ دعا کی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ تجھے بھی ان کے ساتھ شامل فرمائیے تو آپ نے فرمایا کہ تم اپنی جگہ ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کو عبا میں داخل کر نیکی ضرورت نہیں تم تو پہلے ہی سے اہل بیت میں داخل ہو۔ دوسرے حضرت علیؓ حضرت ام سلمہؓ سے اجنبی تھے ان کے ساتھ حضرت ام سلمہؓ کو عبا میں کیونکر داخل کیا جاسکتا تھا یہ تو اشکالات کا جواب تھا۔ اور اصل مدعا کے لئے دلیل اول تو لغت ہے کہ آل محمد میں ازواج اولاد داخل ہیں دوسرے قرآن کا محاورہ یہی ہے حتیٰ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں جبکہ ملائکہ نے ان کو ولد کی بشارت دی اور حضرت سارہؓ کو اس بشارت پر تعجب ہوا۔ ملائکہ کی طرف سے یہ قول نقل فرمایا ہے قَالُوا اتَّعَجِبِينَ مِنْ آَمْرِ اللَّهِ رَحْمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُمْ حَمِيدٌ تَجِيدُونَ۔ ظاہر ہے کہ یہاں اہل بیت میں حضرت سارہؓ علیہا السلام یقیناً داخل ہیں کیونکہ خطاب انھیں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ اہل بیت میں ازواج بھی داخل ہیں۔ (النسوان فی رمضان ص ۶)

(۴) اس شبہ کا جواب کہ بعض علوم بسینہ ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ سئل هل خصکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم بشیء دون الناس قال لا فہمنا و تہیہ الرجل فی القرآن اوما فی ھذا الصّحیفۃ۔ اے اہل بیت اللہ تم سے چاہتا ہے کہ گندگی دور فرماؤ اور تم خوب اچھی طرح پاک و صاف کر دے۔

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ حضرات اہل بیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خاص باتیں دوسروں سے الگ بتائی ہیں۔ فرمایا نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو قرآن کا فہم (خاص درجہ میں) عطا فرمادیں (تو وہ دوسروں سے زیادہ صاحب علوم ہو جائے گا) یا وہ چند باتیں جو اس صحیفہ میں ہیں۔ اس کو دیکھا گیا تو اس میں دیت وغیرہ کے کچھ احکام تھے جو حضرت علیؓ کے ساتھ مخصوص نہ تھے بلکہ دوسرے صحابہ کو بھی اس کا علم تھا مقصود اس سے نفی کرنا تھا تخصیص کی اس سے معلوم ہوا کہ فہم میں تفاوت ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے ایک شخص کو قرآن سے وہ علوم حاصل ہوں گے جو دوسروں کو حاصل نہیں حضرت علیؓ جو کہ قرآن سے خاص مناسبت تھی اس لئے ان کو بعض دوسروں سے زیادہ قرآن کے علوم حاصل تھے۔ شاید اس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کچھ باتیں دوسروں سے الگ بتلائی ہیں کسی نے ارٹائی ہو یہ خیال اسی وقت سے لوگوں میں پیدا ہو گیا کہ بعض علوم بسینہ بسینہ ہیں۔ یہ خیال کتاب و احادیث میں نہیں۔

سینہ بسینہ علم کا موجب

یہ خیال عبداللہ بن سبا بانی فرقہ سبائیہ نے ایجاد کیا ہے جس مقصود اس کا اسلام کا استیصال تھا کیونکہ عبداللہ بن سبا اول یہودی تھا پھر بطور رفاق کے مسلمان ہوا اور حضرت علیؓ کی محبت کا دم بھرنے لگا اور ان کے متعلق مسلمانوں میں غلط اعتقادات پھیلانے لگا کیونکہ وہ لوگ یہ سمجھ چکے تھے کہ تلوار سے اسلام کا خاتمہ نہیں ہو سکتا تو اب انھوں نے یہ تدبیر نکالی کہ احکام اسلام غلط کرنا چاہیے اور اس کا ذریعہ یہ نکالا کہ بعض علوم کو سینہ بسینہ بتلایا مگر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاَنَّا لَآذِلْنَا لِحَافِظُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے دین کی خود حفاظت۔۔۔ کی ہے کہ احکام میں غلط نہیں ہو سکتا گو فرقہ صلاہ اسلام میں بہت ہوتے ہیں اور اب بھی ہیں جن کے متعلق حدیث میں ہے کہ میری امت کے تہمتہ فرماتے ہوں گے اور یہ تہمتہ تو اصول کے اعتبار سے ہیں ورنہ ہر فرقے کے اندر بہت سے فرقے ہو گئے ہیں۔ بلکہ آج کل تو ہر شخص ایک مستقبل فرقہ ہے کیونکہ ہر شخص دین کے متعلق اپنی الگ رائے قائم کرتا ہے اور اس میں بھی حکمت ہے۔ تاکہ اس تفرق سے پریشانی نہ ہو کیوں کہ اختلاف تو ناگزیر تھا کسی قدر اختلاف تو ضرور ہوتا اس عالم میں نہایت حکمت یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی امر میں اختلاف نہ ہو اب اگر اختلاف کبھی بھی ہوتا تو طالب حق کو تباہ احتمال ہو سکتا تھا کہ نہ معلوم ان میں سے گمراہ فرماتے۔

کون حق پر ہے۔ اور جب روزانہ نئے نئے فرقے نکلتے آتے ہیں تو اس کا اثر طبعاً ہو جائے گا اور دیکھئے گا کہ اختلاف کی تو کہیں انتہا ہی نہیں یہ تو روز کی دال روٹی ہو گئی کہاں تک ہر چیز کی تحقیق کیا کرے۔ پس وہ رانا ہی طریقہ اسلم ہے بہر حال یہ خیال بالکل غلط ہے کہ بعض علوم بسینہ بسینہ ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض علوم فہم عالی سے سمجھیں آتے ہیں عقل متوسط یا ادنیٰ ان کے لئے کافی نہیں۔ (الارتیاب ص ۸)

اور بعض لوگ صوفیہ کو بھی اس مضمون کے ساتھ بدنام کرتے ہیں کہ ان کے یہاں بھی کچھ علوم سینہ بسینہ ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے صوفیہ کے یہاں جو چیز سینہ بسینہ ہے وہ علوم نہیں علوم تو ان کے پاس وہی ہیں جو کتاب سنت میں مذکور ہیں ہاں ایک بات ان کے یہاں سینہ بسینہ ہے یعنی نسبت اور طریق سے مناسبت اور یہ وہ چیز ہے جو ہر علم میں سینہ بسینہ ہی ہے حتیٰ کہ بڑھتی اور باورچی کے پیشے میں بھی مناسبت اور مہارت جس کا نام ہے وہ سینہ بسینہ ہی ہے یعنی یہ بات استاذ کے پاس رہنے سے حاصل ہو سکتی محض کتاب پڑھ لینے یا زبانی طریقہ سے دریافت کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی۔ خوان نصرت ایک رسالہ چھپ گیا ہے جس میں ہر قسم کے کھانوں کی ترکیب لکھ دی ہے لیکن کیا اس کو دیکھ کر کوئی شخص باورچی بن سکتا ہے ہرگز نہیں جب تک کسی پکانے والے کو پکانا ہو نہ دیکھے اور ایک دوبار کا دیکھنا کافی نہیں۔ بلکہ بار بار کا مشاہدہ شرط ہے۔

چنانچہ ایک عورت گلگلے پکاری تھی خاوند آتے اور کوئی کام بتلایا کرتی مگر فلاں کام کرو۔ گلگلے میں پکالوں گا۔ بیوی نے کہا کہ تم یہ کام نہیں کر سکتے اس نے کہا وہ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے کہ ڈالا اور نکال لیا۔ اس نے کہا بہت اچھا ابھی معلوم ہو جائیگا چنانچہ شوہر صاحب نے کھڑے کھڑے ہی اوپر سے گلگلے کو گھی میں ڈال دیا جس سے گھی کی چھینٹ گرم گرم اڑ کر ان کے بدن پر گرے اور بدن جل گیا چھالے پڑ گئے بیوی نے کہا میں نہ کہتی تھی کہ تم سے یہ کام نہ ہو گا وہ یہ سمجھ سکتے کہ اس میں کیا مشکل بات ہے بس ڈالا اور نکال لیا جیسے گندوہ کے ایک پیر جی کہا کرتے تھے کہ کھانا کیا مشکل ہے منہ میں رکھا اور نگل لیا اور چلنا کیا مشکل ہے قدم اٹھانا اور رکھنا یہ ظالم بہت کھانا کھا جاتا تھا اور دن میں بہت مسافت طے کر لیتا تھا۔ مگر ان دو لفظوں سے کہیں کام چلتا ہے ذرا آپ تو ایسا کر کے دیکھیں حقیقت معلوم ہو جائے گی اسی طرح بخاری کا کام ایک دوبار دیکھئے سے نہیں آ سکتا۔ بندر بھی تو بڑھتی کو دیکھ کر بڑھتی

بنا تھا مگر کیا گت بنی تھی اسی لئے کہتے ہیں ع کار بوزین نیست بخاری۔ غرض تصوف میں سینہ بسینہ ایک چیز ہے یعنی نسبت اور مناسبت اور مہارت اور ایک اور چیز ہے یعنی برکت جو مشائخ سے معلوم ہو گئی بدون مشاہدہ کے اس کا علم نہیں ہو سکتا جیسے نابالغ کو لذت جوار قبل البلوغ کے معلوم نہیں ہو سکتی۔

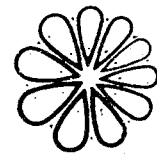
ایک قصہ مشہور ہے کہ چند سہیلیوں نے مل کر آپس میں تذکرہ کیا کہ شادی کی لذت کیسی ہوتی ہے ایک لڑکی نے کہا کہ میرا نکاح ۔۔۔ ہو جائے تو میں بتلاؤں گی جب اس کا نکاح ہو گیا تو ساتھیوں نے اس سے پوچھا کہ اب بتلاؤ اس نے جواب دیا کہ سہ

بیاد یوں ہی جب تمہارا ہو جائے گا تب مزہ معلوم سارا ہو جائے گا غرض امور ذوقیہ و عمارت میں بیان نہیں کر سکتے وہ مشاہدہ ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں اسی طرح برکت بھی مشاہدہ ہی سے معلوم ہوتی ہے اس کے بغیر نہیں معلوم ہو سکتی پس جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو کچھ علوم سینہ بسینہ عطا ہوئے ہیں۔ وہ احکام میں غلط کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس خیال کی تردید خود فرمادی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان
 الا فہما اوتیہ الرجل فی القرآن کہ ہاں ایک چیز تو سینہ بسینہ ہے کہ انسان کو قرآن کا خاص فہم عطا ہو جائے اس میں قرآن سے مراد تمام شریعت الہیہ ہے جیسا ایک حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو شخص آئے اور انھوں نے کہا اقص بیننا بکتا ب اللہ کہ ہمارے درمیان کتاب اللہ سے فیصلہ کر دیجئے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے لئے رحم کا حکم دیا۔ مرد کے لئے سودرے اور جلا وطنی کا، حالانکہ رحم کا حکم قرآن میں نہیں ہے تو یہاں بھی کتاب اللہ سے مراد شریعت الہیہ ہے کیونکہ تمام احکام شرعیہ کتاب اللہ ہی کی طرف راجع ہیں۔ کلیتاً یا جزئاً۔ چنانچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بعض احکام حدیث کو قرآن کا بدلہ فرما کر یہ آیت پیش کی مَا تَنكُمُ الرَّسُولُ تَخَذُوْكَ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا اور یہی فہم ہے جس کا اختلاف بعض اوقات اس درجہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کو حدیث معلوم ہے مگر اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس حدیث سے فلاں مسئلہ مستنبط ہوتا ہے۔

امام ابو یوسفؒ کا واقعہ

چنانچہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ایک محدث کے ساتھ جو کوئٹہ کے بہت بڑے محدث ہیں مشہور ہے کہ محدث نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ تمہارے استاد امام ابو حنیفہؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا خلاف کیوں کیا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کس مسئلہ میں۔ کہا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتویٰ ہے کہ باندی کی بیع طلاق ہے (یعنی جو باندی کسی کے نکاح میں ہو اگر مالک اس کی بیع کسی دوسرے شخص کے ہاتھ کر دے تو بیع ہوتے ہی باندی پر طلاق ہو جائے گی) اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ باندی کی بیع طلاق نہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ تم ہی نے تو ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع جاری کو طلاق نہیں قرار دیا۔ محدث نے کہا کہ میں نے ایک یہ حدیث بیان کی۔ کہا ہم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ہم سے بیان کی ہے جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بریرہ کو خرید کیا اور آزاد کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ کو اختیار دیا کہ خواہ اپنا نکاح شوہر سابق سے برقرار رکھیں یا منسوخ کر دیں۔ تو اگر بیع جاریہ سے ہی طلاق واقع ہو جایا کرتی تو اختیار دینے کے کیا معنی؟ محدث سوچنے لگے اور کہا اے ابو یوسفؒ کیا مسئلہ اس حدیث میں ہے۔ کہا ہاں۔ محدث نے کہا واللہ انتم الاطباء ونحن الصیالۃ بخدا تم طبیب ہو اور ہم عطار ہیں! اصحابو! فقہار کے بیان کے بعد اب تو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ نفلان حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا اور نفلان آیت سے وہ مسئلہ منکر و نہ بیان فقہاء کے اس کا سمجھنا دشوار اور سخت دشوار ہے اسی کا نام اجتہاد ہے اور یہی وہ فہم ہے جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے۔ اَلَا فَهْمًا اَوْ تَبَيُّرًا الرَّجُلُ فِي الْقُرْآنِ (ایضاً ص ۷)



اہل بدعت کے شہرہائے جوتا

۵۔ بدعت کی ایک پہچان اور اس کی صحیح حقیقت

ایک پہچان بدعت کی بتلائے دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جو بات قرآن و حدیث اور اجماع و قیاس چاروں میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہ ہو اور اس کو دین سمجھ کر کیا جاوے وہ بدعت ہے۔ اس کی پہچان کے بعد دیکھ لیجئے کہ ہمارے بھائیوں کے جو اعمال ہیں مثلاً غرس کرنا، فاتحہ دلانا، تخصیص اور تعین کو ضروری سمجھ کر ایصال ثواب کرنا وغیرہ جتنے اعمال ہیں کسی اصل سے ثابت نہیں ہیں۔ اور ان کو دین سمجھ کر کیا جاتا ہے یا نہیں اور اگرچہ خواص کا عقیدہ ان مسائل میں خراب نہیں، لیکن یہ فقہ حنفیہ کا مسئلہ ہے کہ خواص کے جس مستحسن امر سے جب کہ وہ مطلوب عند الشرع نہ ہو۔ عوام میں خرابی پھیلے تو خواص کو چاہئے کہ اس امر کو ترک کر دیں۔ ہاں اگر وہ امر مطلوب عند الشرع ہو۔ اور اس میں کچھ منکرات مل گئے ہوں تو منکرات کے مٹانے کی کوشش کریں گے اور اس امر کو نہ چھٹائیں گے مثلاً اگر جنازہ کے ساتھ منکرات بھی ہوں تو مشائیت جنازہ کو ترک کر دیں گے کیونکہ مشائیت جنازہ کی مطلوب عند الشرع ہے پس ایصال ثواب میں دو امر ہیں ایک تعین وقت دوم ایصال ثواب، اور ان میں تعین وقت مطلوب عند الشرع نہیں اگرچہ مباح ہے۔ اور چونکہ تعین سے عوام میں خرابی پھیلی ہے اس لئے ہم تعین کو ترک کر دیں گے البتہ اگر ساری امت کا یہ عقیدہ ہو جائے کہ وہ تعین کو ضروری نہ سمجھے تو ہم خواص کو بلکہ سب کو تعین کی اجازت دیدیں لیکن حالات موجود ہیں جب کہ اکثر دلوں کا خیال ہے کہ خاص تاریخوں میں ثواب پہنچانے سے زیادہ مقبولیت ہوتی ہے اور یہ خلاف شریعت ہے۔ کیسے اجازت دیدی جائے۔

ایصال ثواب کے لئے تاریخ مخصوص کرنا | اسٹار ہوئی تاریخ تک ہو سکتی ہے پھر نہیں ہو سکتی۔ ایک وعظ میں میں نے ان رسوم کا بیان کیا۔ بعد وعظ کے ایک صاحب کہنے

لگے کہ علماء کو ایسے مضامین نہ بیان کرنے چاہئیں کہ تفریق امت ہوتی ہے میں نے کہا کہ ہمارا بیان کرنا تو آپ کے عمل کرنے پر موقوف ہے جیسے لوگوں کے اعمال اور حالات ہوں گے ویسا ہی ہم بیان کریں گے۔ اگر لوگ ان اعمال کو چھوڑ دیں گے تو ہم بھی اس قسم کے بیان کو چھوڑ دیں گے تو تفریق کا الزام ان اعمال کے ارتکاب کرنے والوں پر ہے نہ کہ ہم پر غرض یہ امور مطلوب عند الشرائع نہیں اور ان سے خرابیاں بہت کچھ پھیل رہی ہے اس لئے ان کو ترک کر دینا چاہئے ایک تو تخصیص اور تعین قابل ترک ہے۔ دوسرے جو نیات ایصال ثواب کی اختراع کر رکھی ہے وہ قابل ترک ہے۔ مجھ سے ایک دیہاتی کہنے لگا کہ اگر ایصال ثواب کے وقت کھلنے پر چند سورتیں پڑھ لی جائیں تو ہرج ہی کیا ہے میں نے جواب دیا کہ جس مصلحت سے کھانے پر سورتیں پڑھی جاتی ہیں کبھی روپیہ یا کپڑے پر کیوں نہیں پڑھی جاتی۔

نیت کی اصلاح اور ایک نیت میں اصلاح کرنی ضروری ہے کیونکہ اکثر یہ نیت ہوتی ہے ہم ان کو ثواب پہنچائیں گے تو ان سے ہمارے دنیا کے کام نکلیں گے تو صاحبو قطع نظر سے اعتقاد کے اس کی ایسی مثال ہے کہ آپ کسی شخص کے پاس ہدیہ مٹھائی لے جائیں اور پیش کرنے کے بعد اس شخص سے کہیں کہ آپ میرے مقدمہ میں گواہی دیدیں اندازہ کیجئے یہ شخص کس قدر کبیہہ ہوگا اور اس سے اس کو کیسی اذیت ہوگی۔ پس جب اہل دنیا کو اذیت ہوتی ہے تو اہل اللہ کو اس سے زیادہ اذیت ہوگی پھر خصوصاً وفات کے بعد لطافت زیادہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ نفس عنصری لوٹ جاتا ہے۔ اور صرف روح ہی روح رہ جاتی ہے اور اس کا ادراک کامل ہو جاتا ہے پس جس وقت ان کو یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ یہ ہدیہ اس غرض سے پیش کیا گیا ہے کہ قدر ناگواری ہوتی ہوگی اس کے ماسوا کس قدر شرم کی بات ہے کہ اہل اللہ سے دنیا کے لئے تعلق اور محبت ہو۔ صاحبو! ان کے پاس دنیا کہاں ہے ان سے دنیا کی امید رکھنی ایسی بات ہے جیسے کسی سنار سے گھر پانے کی امید رکھنی یا کسی حکیم سے یہ فرمائش کرنی کہ تم چل کر ہمارے گھر کی گھاس کھو دو۔ صاحبو! ہم کو حضرت عوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ سے جو محبت ہے تو اس لئے کہ انہوں نے ہم کو راہ ہدایت دکھلائی۔ اس کے مکانات میں ہم ان کو کچھ ثواب بخش دیں کہ ان کی روح خوش ہو اور اس کے خوش ہونے سے خدا تعالیٰ ان خوش ہوں۔ اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم لوگ ایصال ثواب سے منع نہیں کرتے بلکہ اس کی اصلاح کرتے ہیں اور جس دن اصلاح عام ہو جائے گی اس دن ہم بھی نہ کہیں گے مگر جب تک اصلاح نہ ہو اس وقت تک ہم ضرور لایحوز

کہتے رہیں گے۔ رہی بدنامی سو بحمد اللہ اشاعت دین میں ہم کو اس کی مطلق پرواہ نہیں ہے ہمارا وہ مذہب ہے۔

ساقیا بر خیز و در دہ جام را
گرچہ بدنامیت نزد عافلاں

خاک بر سر کن غم ایام را
مانی خواہم بنگ و نام را

(تقویم الزیغ ص ۱۷۹)

بدعت کی مثال

(ب) بدعت کے بارے میں فرمایا کہ کوئی ظہر کی چار رکعت کے بجائے پانچ رکعت پڑھے تو اس کی وہ چار رکعت بھی نہ ہونگی حالانکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے کوئی برا کام تو کیا ہی نہیں منازہی پڑھی ہے بلکہ اور اچھا ہے کہ چار رکعت کے بجائے پانچ پڑھیں پھر منازکیوں نہ ہوئی بات یہ ہے کہ اس نے خلاف ضابطہ کام کیا۔ اس لئے چار رکعت بھی گئی گذری ہوئیں جیسے لفاظ پر کوئی بجائے ڈاک کے دو پیسہ کے ٹکٹ کے کوڑٹ نیس کا ٹکٹ آٹھ آنے کا لگا دے تو خط بزرگ ہو جائے گا وہ کہہ سکتا ہے۔۔۔۔۔ کہ میں نے بجائے دو پیسے کے آٹھ آنے صرف کئے اور پھر بھی بزرگ ہو گیا لیکن چونکہ اس نے ٹکٹ کا استعمال بے محل اور خلاف ضابطہ کیا اس لئے آٹھ آنے کا ٹکٹ ضائع ہو گیا اسی ٹکٹ کو اپنے موقع پر یعنی عدالت میں لگاتا تو کام کا ہوتا اسی طرح ان پانچ رکعتوں کو سمجھ لیجئے مگر ان پانچ رکعتوں کے نہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں کرتا۔ لیکن اور بدعتوں کو ایسا نہیں سمجھتے۔ اس میں شبہ کرتے ہیں کہ صاحب یہ تو نیک کام ہیں ان میں کیا برائی ہے۔

حضرت گنگوہی کا واقعہ

ایک شخص نے نقل کیا کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تو لا الہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کہنے سے روکتے ہیں بعد کو تحقیق ہوا کہ اذان کے آخر میں جلا لا الہ الا اللہ موزن کہتا ہے اس کے جواب کے بعد اکثر اوقات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہہ لیتے ہیں حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ اذان کا جواب کلمات اذان ہی میں دینا چاہیے چنانچہ بعد کلمہ آخری لا الہ الا اللہ کے چونکہ موزن محمد رسول اللہ کہتا نہیں ہے۔ اس لئے صرف لا الہ الا اللہ کہہ کر جواب بھی ختم کر دینا چاہیے یہ مقصود تھا حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کو اس کو اس صورت میں پیش کیا گیا کہ صاحب وہ تو کلمہ میں محمد رسول اللہ کہنے سے منع کرتے ہیں (نفوذ باللہ) اذان کا دین ہونا ظاہر ہے اس کے احکام میں بی طرفی سے زیادتی کرنا بھی بدعت ہے۔ اسی طرح ساری ممنوع بدعتیں دین کی یکساں ہیں فرق کوئی وجہ نہیں۔

(مقالات حکمت دعوات عتد حصہ سوم)

(ج) بدعت کے قبح کا یہی راز ہے مگر اس میں غور کیا جائے

تو پھر بدعت کے منع میں تعجب نہ ہو۔ روزہ

بدعات کی قباحت

میں اس کی مثال دیکھئے اگر کوئی صاحب مطبع گورنمنٹ کے قانون کو طبع کرے اور اخیر میں ایک دفعہ کا اضافہ کر دے اور وہ ملک سلطنت کے لئے بھی سودمند ہو تب بھی اس کو جرم سمجھا جائیگا اور یہ شخص مستوجب سزا ہوگا پس جب قانون دنیا میں ایک دفعہ کا اضافہ جرم ہے تو قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ جس کو اصطلاح شریعت میں بدعت کہتے ہیں کیوں جرم نہ ہوگا تو اگر کوئی اس طرح سے گوشت وغیرہ کو ترک کرے گا تو بلاشبہ جرم ہوگا لیکن ان حضرات نے ایسا نہیں کیا بلکہ محض علاج کے طور پر ترک کیا ہے بخلاف اس وقت کے جہلاء کے کہ وہ اس کو دین اور عباد اور زینت قریب سمجھ کر کرتے ہیں (احسان التذہب ص ۱۲)

خیر القرون کے بعد کی چیزیں

(د) پس جانا چاہیے کہ بعد خیر القرون کے جو چیزیں زیاد گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ کہ ان کا سبب داعی بھی جدید ہے اور وہ موقوف علیہ کسی مامور ربہ کی ہیں کہ بغیر ان کے اس مامور ربہ پر عمل نہیں ہو سکتا جیسے کتب دینیہ کی تصنیف اور تدریس۔ مدرسوں اور خانقاہوں کی بنیاد کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان میں سے کوئی شئی نہ تھی اور سبب داعی ان کا جدید ہے اور نیز یہ چیزیں موقوف علیہ ایک مامور ربہ کی ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ دین کی حفاظت سب کے ذمہ ضروری ہے اس کے بعد سمجھئے کہ زمانہ خیریت نشاۃ میں دین کی حفاظت کے لئے وسائل محدثہ میں سے کسی شئی کی ضرورت نہ تھی۔ تعلق مع اللہ یا لفظ آخر نسبت سلسلہ سے برکت حضرت نبوت سب مشرف تھے۔۔۔ قوت حافظہ اس قدر قوی تھی کہ جو کچھ سنتے تھے وہ سب نقش کا لچر ہو جاتا تھا انہم ایسی عالی پائی تھی کہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ سبق کی طرح ان کے سامنے تقریر کریں۔ ورع و تدین بھی غالب تھا۔

کتابوں کی تصنیف اور مدارس خانقاہوں کی تعمیر

بعد اس زمانہ کے دوسرے زمانہ آیا غفلتیں بڑھ گئیں قوی

مرد ہو گئے ادھر اہل اہوا اور عقل پرستوں کا غلبہ ہوا دین مغلوب ہونے لگا پس علماء امارت کو نہ جس کا حکم دیا گیا ہو۔ نہ پرہیزگاری۔

قوی اندیشہ دین کے ضائع ہونے کا ہوا۔ پس ضرورت اس کی واقع ہوئی کہ دین کی یکجہ اجراء تدریس کی جائے۔ چنانچہ کتب دینیہ حدیث۔ اصول حدیث فقہ۔ اصول فقہ۔ عقائد میں تصنیف ہوئیں اور ان کی تدریس کے لئے مدارس تعمیر کئے گئے۔ اسی طرح نسبت سلسلہ کے اسباب تقویت و البقاء کے لئے بوجہ عام رعیت نہ رہنے کے مشائخ نے خانقاہیں بنائیں۔ اس لئے کہ بغیر ان چیزوں کے دین کی حفاظت کی کوئی صورت نہ تھی پس یہ چیزیں وہ ہوئیں کہ سبب ان کا جدید ہے کہ وہ سبب خیر القرون میں نہ تھا۔ اور موقوف علیہ حفاظت دین مامور ربہ کی ہیں پس یہ اعمال گویا ضرورتاً بدعت ہیں لیکن واقعہ میں بدعت نہیں بلکہ حسب قاعدہ مقدمہ الواجب واجب واجب ہیں۔

بدعات میں کیا چیز داخل ہیں

اور دوسری قسم وہ چیزیں ہیں جن کا سبب قدیم ہے جیسے مجالس میلاد و مرجعہ اور تیجہ، دسواں چہلم وغیرہ یا من البدعات کہ اس کا سبب قدیم ہے مثلاً میلاد کے منعقد کرنے کا سبب فرح علی الولادۃ النبویہ ہے اور یہ سبب حضور کے زمانے میں موجود تھا لیکن حضور نے یا صحابہ نے یہ مجالس منعقد نہیں کیں کیا انھوں نے اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فہم یہاں تک نہیں پہنچا۔ اگر سبب اس کا اس وقت نہ ہوتا تو البتہ یہ کہہ سکتے تھے کہ مشائخ ان کا موجود نہ تھا لیکن جبکہ باعث اور بنابر اور مدار موجود تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مجلس میلاد منعقد کی اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پس جس شئی کو باوجود اس بنابر اور مدار کی موجودگی کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسی شئی کا حکم یہ ہے کہ وہ بدعت صورتاً بھی اور معنی بھی اور حدیث مَنِ احْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هَذَا مَا لَیْسَ مِنْہُ فِہٖ وَرَدٌ (مشکوٰۃ) میں داخل ہو کر واجب الرد ہیں۔ اور پہلی قسم مامند میں داخل ہو کر مقبول ہے یہ قاعدہ کلیہ ہے بدعت اور سنت کے پہچاننے کا اس سے تمام ترجزئیات کا حکم مستنبط ہو سکتا ہے اور ان دو قسموں میں ایک اور فرق عجیب ہے کہ پہلی قسم کے تجویز کرنے والے خواص یعنی علماء ہوتے ہیں اور اس میں عوام تصرف نہیں کرتے اور دوسری قسم کے تجویز کرنے والے عوام کا الانعام ہوتے ہیں۔ اور وہی اس میں ہمیشہ تصرفات کیا کرتے ہیں چنانچہ مولود شریف کی مجلس کو ایجاد ایک بادشاہ نے کی ہے کہ اس کا شمار عوام ہی میں ہے۔ اور عوام ہی اب تک اس میں شرکت بھی کرتے ہیں۔ (السرور ص ۲۷)

لہ جس نے ہمارے دینی امور میں کوئی نئی چیز پیدا کی جن کا دین سے تعلق نہیں وہ مردود ہیں۔

(۶) اہل حق کو وہابی کہنا محض بہتان ہے

اہل بدعت کی جماعت ہے جو ہم لوگوں کو وہابی کہتی ہے لیکن ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ ہم کو کس مناسبت سے وہابی کہا گیا کیونکہ وہابی وہ لوگ ہیں جو ابن عبد الوہاب کی اولاد میں ہیں یا اس کے متبع ہیں۔ ابن عبد الوہاب کے حالات مدون ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ نہ اتباع کی رو سے ہمارے بزرگوں میں ہیں نہ نسب کی رو سے۔ البتہ آج کل جن لوگوں نے تقلید کو ترک کر دیا ہے ان کو ایک اعتبار سے وہابی کہنا درست ہو سکتا ہے کیونکہ ان کے اکثر خیالات ابن عبد الوہاب سے ملتے جلتے ہیں۔ البتہ ہم لوگوں کو حنفی کہنا چاہیے کیونکہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اصول چار ہیں۔ کتاب اللہ، حدیث رسول، اجماع امت، قیاس مجتہد، سو ان چار کے اور کوئی اصل نہیں۔ اور مجتہد اگرچہ مستند ہیں لیکن اجماع امت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ائمہ اربعہ (یعنی امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام مالک بن انس) کے مذہب کے باہر ہونا جائز نہیں۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ ان چاروں میں جس کا مذہب رائج ہو، اس کا اتباع کرنا چاہیے تو چونکہ ہندوستان میں امام ابو حنیفہ کا مذہب رائج ہے اس لئے ہم انھیں کا اتباع کرتے ہیں ہم لوگ وہابی کے لقب سے برا نہیں مانتے۔ لیکن اتنا ضرور کہہ دیتے ہیں کہ قیامت میں اس بہتان کی باز پرس ضرور ہوگی۔ (تقویم الزیلع ص ۲۹)

(۷) شیخ عبد القادر جیلانی کی گیارہویں منانے والوں کی غلطیاں

اس روز لوگ حضرت غوث الاعظم سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی گیارہویں منانے ہیں اول تو لَحْمٌ مِّنْ خِدْوٰی اَقْبَرُ حُجَّی عَیْدًا سے اس کا بھی رد ہو گیا کیونکہ مثل یوم المیلاد وغیرہ کے یہ دن بھی متبدل ہو گیا جب غیر متبدل یعنی قبر نبوی کا عید بنانا حرام ہے تو متبدل یعنی بڑے

لہ میری قبر کو میلہ نہ بنانا

پر صاحب کی گیارہویں کا عید بنانا کیسے جائز ہوگا۔ دوسرے یہ تاریخ حضرت کے وفات کی کسی تاریخ نے نہیں لکھی، نہ معلوم عوام نے گیارہویں تاریخ کس کشف والہام سے معلوم کر لی۔ بعض لوگ ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت غوث الاعظم خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں کیا کرتے تھے تو اول تو یہ روایت ثابت نہیں اس کا ثبوت دینا چاہیے دوسرے اگر ہو بھی تو کیا حضرت غوث الاعظم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کرتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں چھوڑ کر بڑے پر صاحب کی گیارہویں کرتے ہو یہ تو ان کے خلاف ہے کیونکہ اگر بالفرض وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں کیا کرتے تھے تو وہ اس کو وہ ہرگز گوارا نہ کر سکتے تھے کہ میرے بعد بجائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں کی جائے۔ تیسرے اس میں عقیدہ بھی ناسد ہے کہ تو کہ حضرت غوث الاعظم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا میلاد کرتے ہیں تو بڑے پر کی گیارہویں بلکہ بعض جگہ حضرت غوث الاعظم کا میلاد بھی ہونے لگا گویا بالکل ہی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مساوی ہو گئے۔

اور غضب یہ ہے کہ کرنے والوں کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر گیارہویں نہ کریں گے تو بلا نازل ہوگی بڑے پر صاحب ناخوش ہو جائیں گے اور پھر نہ معلوم کیا سے کیا کر دیں گے۔ گویا نوزدیا اللہ وہ مخلوق کو تخلیف دیتے پھرتے ہیں نیز گیارہویں کرنے کو مال و اولاد کی ترقی کا باعث سمجھتے ہیں۔ اس میں حضرت غوث الاعظم کے ساتھ دنیا کے لئے تعلق رکھنا ہوا، یہ کیسی بے حیائی ہے کہ جس مردار کو وہ چھوڑ کر الگ ہوئے تھے۔ اسی کے لئے اُن سے تعلق کیا جائے غرض گیارہویں کے اند بھی عملی اور اعتقادی بہت سی خرابیاں ہیں اس کو چھوڑنا چاہئے اگر کسی کو حضرت غوث الاعظم کے ساتھ محبت کا دعویٰ ہو تو کچھ ترکان پڑھ کر ان کی روح کو ثواب بخش دیا جائے۔ یا بلا تعین تاریخ غربا کو کھانا کھلا دے۔ (الحجور ص ۳۲)

(۸) حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے متعلق ایک بے بنیاد حکایت

ایک حکایت مشہور کی جاتی ہے کہ آپ کے پاس ایک بڑھیا آئی جس کا لڑکا مر گیا تھا۔

کہ حضرت اس کو زندہ کر دو، آپ نے فرمایا کہ اس کی عمر تو ختم ہو چکی اب زندہ نہیں ہو سکتا۔ وہ رونے اور اصرار کرنے لگی تو آپ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور عرض کیا کہ اس لڑکے کو زندہ کر دیا جائے وہاں سے خطاب ہوا کہ اس کی تقدیر میں اور حیات نہیں، اس لئے اب زندہ نہیں ہو سکتا، تو حضرت عوث اعظم حق تعالیٰ سے کہتے ہیں ذرا ملاحظہ کیجئے۔ یہ حق تعالیٰ سے باتیں ہو رہی ہیں کہ حضرت آپ سے کہنے کی تو اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس کی تقدیر میں اور حیات نہیں اور اس کی تقدیر میں کچھ اور زندگی ہوتی تو آپ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی، پھر تو آپ مجبور ہو کر خود ہی زندہ کرتے (نمود با لہ منہ) وہاں سے حکم ہوا کہ کچھ تقدیر کے خلاف تو نہیں ہو سکتا اس پر عوث اعظم کو جلال آیا، اور آپ نے قوت کشمیریہ سے ملک الموت کو ٹوٹا کہ وہ کہاں ہیں آخر نظر آئے تو دیکھا کہ ایک پھیلے میں اس دن کے مردوں کی رومیں بکھر کر لے جا رہے ہیں ابھی تک ہیڈ کو اڑنے پہنچے تھے کہ عوث اعظم نے ان کو ٹوکا اور کہا کہ بڑھیا کے لڑکے کی روح واپس کر دو۔ تم اس کو نہیں لیجا سکتے، وہ انکار کرنے لگے۔ آپ نے وہ پھیلہ ان کے ہاتھ سے چھین کر کھول دیا جتنی رومیں تھیں سب کچھ پکڑ لگئیں اور اس دن جتنے مردے مرے تھے سب زندہ ہو گئے، تو عوث اعظم نے حق تعالیٰ سے کہا کہ کیوں اب راضی ہو گئے ایک مردے کے زندہ کرنے پر راضی نہ ہوئے اب بہت جی خوش ہوا ہوگا۔ جب ہم نے سارے مردوں کو زندہ کر دیا تو بے توبہ۔ استغفر اللہ کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ اس طرح گفتگو کرنے کی کسی کو مجال ہے۔ مگر یہ سب حکایتیں جاہلوں نے گھڑی ہیں اور ان کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نمود با لہ منہ عوث اعظم وہ کام کر سکتے ہیں جو خدا بھی نہیں کر سکتا۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس کفر کا جب جاہلوں نے عوث اعظم کو اس مرتبہ پر پہنچا دیا۔ تو اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آثار طبعیہ اور لوازم بشریہ کو ذکر نہ کیا جاتا۔ تو نہ معلوم یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں پہنچاتے۔

(فنا فی النفوس فی رضا القادوس ص ۵)

(۹) بعض لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا ہونے کی

حدیثیں گھڑ لی ہیں

بعض لوگوں نے اس مضمون کی احادیث بھی گھڑی ہیں جن سے معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کا خدا ہونا ثابت کیا ہے چنانچہ ایک حدیث یہ گھڑی ہے اَنَا عَرَبٌ بِلَا عَرَبٍ اس کے الفاظ ہی بتلا رہے ہیں کہ کسی جاہل نے فرصت میں بیٹھ کر گھڑی ہے۔ بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس چیستان کی کیا ضرورت تھی، آپ نے صاف ہی کیوں نہ فرما دیا۔ انا عرب ہر پکیر کے ساتھ انا عرب بلا عین کہنے کی کیا ضرورت تھی، پھر اس سے مدعا کیونکر حاصل ہوا۔ کیونکہ عرب میں با مشد نہ نہیں ہے مخف ہے تو عین نکال کر رب بلا تشدید باقی رہا اور یہ کوئی لغت نہیں ہے۔ عرب بال تشدید ثابت نہ ہو دوسرے آپ عرب کہاں تھے آپ تو عربی تھے پھر انا عرب میں حمل کیونکر صحیح ہوگا۔ حدیث یہ گھڑی تو ایسی جس کے سر نہ پاؤں۔ جس میں ایک ادنیٰ طالب علم بھی غلطیاں نکال سکتا ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے فصیح و بلیغ تھے کہ آپ کے کلام میں کسی کی مجال نہیں کہ انگلی بھی صر سکے اسی لئے محدثین نے فرمایا ہے کہ رکاکت الفاظ بھی حدیث کے موضوع ہونی ہی علامت ہے اور یہاں تو رکاکت الفاظ کے ساتھ مضمون بھی لیک ہے کیونکہ اس سے رب ہونا نہیں نکلتا۔ بلکہ رب نکلتا ہے۔ اور رب بلا تشدید ایک مہمل لفظ ہے، ایک حدیث یہ گھڑی ہے۔ اَنَا أَحْمَدٌ بِلَا مِیْمٍ یہ حدیث نہیں ہے بلکہ احمد جام رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے جو ان سے حالت سُکرمیں صادر ہوا اور قابل تاویل ہے اور اگر تاویل نہ کی جائے تو قابل رد ہے کیونکہ غلبہ حال کے اقوال افعال قابل اعتبار نہیں ہوتے ایک حدیث یہ گھڑی ہے۔ رَأَيْتُ رَبِّي يَطُوفُ فِي سِكَكِ الْمَلَكِ یہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے کہ انھوں نے آپ کو مدینہ کی گلیوں میں دیکھا تو فرمایا رایت ربی یطوف فی سکت المملدینہ کہ میں نے خدا کو مدینہ کی گلیوں میں گھومتے ہوئے دیکھا۔ بس پھر تو ہر صوفی خدا ہو گیا۔ جیسے ایک جاہل صوفی کہتا ہے نمود با لہ منہ۔

ع اللہ جسے کہتے ہیں واللہ میں ہی ہوں۔

ان بیوقوفوں نے نقیصوں کو ان خرافات سے بدنام کر دیا غیاض

جاہلوں کے خرافات | بھی ان باتوں پر ہنستے ہیں۔ ایک نگریز ایک مسلمان سے کہتا تھا کہ ہم پر خدا کے تین کہنے پر اعتراض کرتا ہے تمہارا ٹوپی (صوفی) تو ہر چیز کو خدا کہتا ہے۔ یہ مسئلہ وحدۃ الوجود کا ناس مارا ہے ان جاہلوں نے اس کی حقیقت تو سمجھی نہیں۔ بس یہ سمجھے کہ ہر چیز کو خدا کہنے لگے ان ہی لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بشریت سے نکالنے کی کوشش کی ہے حالانکہ واقعات اس پر یقینی شاہد ہیں کہ آپ بشر تھے چنانچہ اکل و شرب بول و براز سے آپ

لے سستی دیے ہوشی تھے میں نے اپنے رب کو مدینہ کی گلیوں میں پھرتے ہوئے دیکھا

منزلہ نہ تھے۔ جنگ اُحد میں کفار کے ہاتھ سے آپ زخمی ہوئے، یہود نے آپ پر سحر کیا۔ اور اس کا اثر ہو گیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام سے آپ نے درخواست کی کہ مجھے اپنی اصلی صورت میں دکھاؤ۔ جب وہ اپنی اصلی صورت میں نظر آئے۔ تو آپ بے ہوش ہو گئے۔ (دعظا خفصیل المرام ص ۱۱)

(۱۰) جانوروں وغیرہ کو منحوس سمجھنا سب ایسی بات ہے

ایک بار عرض کیا گیا کہ لوگ جو بعض گھوڑوں وغیرہ کو منحوس سمجھتے ہیں۔ اس کی بھی کوئی اصل ہے۔ فرمایا کہ جی نہیں۔ سب واپسیت ہے اس پر تو میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ کسی جستی کو راہ میں ایک آئینہ پڑھو اگلا اٹھا کر دیکھا تو اپنی ہی صورت نظر پڑی اور اس آئینہ کا قصور سمجھا۔ اسی طرح ہم لوگوں کو اپنے عیوب و درغبات نظر آنے میں مصیبت تو آتی ہے اپنے معاصی کی نحوست سے اور اسکو منسوب کر دیتے ہیں بے گناہ جانور کی طرف کہ نلال گھوڑا ایسا منحوس آیا۔ یا فلاں جانور فلاں وقت بول دیا اس لئے کام نہ ہوا اس پر عرض کیا گیا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب کوئی شگون بد دل میں کھٹکے تو فلاں دعا پڑھے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ جب اس میں کچھ اثر ہو۔ اور اس کے ازالہ کے لئے یہ دعا بتلائی گئی ہو فرمایا کہ یہ محض رفع تردد اور حصول اطمینان کے لئے ہے، اور اس کی کسی اثر کا اثبات لازم نہیں آتا۔ فال نیک لینے کی جو اجازت ہے اس کی بابت استفسار کیا گیا۔ فرمایا کہ وہ بھی موثر نہیں بلکہ فال نیک کا حاصل صرف یہ ہے کہ کوئی اچھی چیز پیش آئی اس کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ گمان نیک رکھا کہ انشاء اللہ تعالیٰ میرا کام ہو جاوے گا اور فال بد کو اگر اسی درجہ میں سمجھتے تو اس کا حاصل یہ ہو گا کہ خدا تعالیٰ پر بد گمانی رکھے اور اللہ تعالیٰ پر گمان نیک رکھنا بہت اچھا ہے اور بد گمانی ناجائز ہے۔ اس لئے فال نیک کی اجازت ہوئی اور فال بد کی ممانعت۔

(مجاہد ملت معدلت عیادت حصہ سوم ص ۴۴)

(۱۱) اصطلاح صوفیہ میں کافر سے مراد فانی ہے

علماء ظاہر تو امکان کذب ہی میں آج تک لڑ رہے ہیں اس میں تو وقوع کذب لازم آگیا
اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں کذب نہیں کیونکہ کافر باصطلاح صوفیہ بمعنی فانی ہے خسر فرماتے ہیں کہ
کافر عشقم مسلمان مراد کار نیست ہر رگ من نار گشتہ حاجت زنا نیست

اے فانی عشقہ تو اس غیبی آواز کا مطلب یہ ہوا کہ جو چاہے عمل کر تو فانی ہو کر مرے گا، اب یہ کلام ایسا ہو گیا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے لعل اللہ، اطلع الی اہل بدر، فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لكم اور صوفیہ نے یہ اصطلاح لغت سے لی ہے کیونکہ لغت میں کفر معنی ستر (چھپانا) ہے اور فانی بمعنی اپنی ہستی کا ساتر ہے صوفیہ کی اصطلاحات کہیں لغت سے ماخوذ ہیں کہیں عرف عام سے۔ کہیں فلسفہ سے، کہیں علم کلام سے۔ کہیں کسی اور فن سے۔ اور یہ خلط مبحث انھوں نے اس لئے کیا ہے تاکہ اس پر پردہ پڑا رہے۔ بل تک نہ پہنچ جائیں۔

باجدعی ہو گیا اور اس عرش عشق و مستی
بجذارتا بمیرد و درخ خود پرستی

اسی لئے ان علوم و اسرار کو بر سر مہر بیان کر نیکی مانفت ہے یعنی بلا ضرورت بیان نہ کرے
اور میں اس وقت ضرورت سے بیان کر رہا ہوں۔ غرض یہ غیبی صدا صوفیہ کی اصطلاح میں کھتی عالم
اصطلاح میں نہ کھتی۔ اور یہ عنوان مزاح کے لئے اختیار کیا گیا۔ تاکہ ذرا تھوڑی دیر کو عاشق پریشان
ہو جائے۔

مزاج حدیث میں

اور مزاح حدیث سے ثابت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض دفعہ مزاح فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک بڑھیا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

سے دعا کی درخواست کی کہ اے اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں پہنچا دے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
لَا تَدْخُلُ الْعُجُورُ الْجَنَّةَ کہ بوڑھی عورت جنت میں نہ جائے گی۔ وہ روئے لگی تب
آپ نے یہ آیت پڑھی اِنَّا اَنْشَاْنَا هُنَّ اَنْثَاءً وَجَعَلْنَا هُنَّ اَبْكَارًا عُرَابًا اَتَرَبَا لِاصْحَابِ
الْيَمِينِ۔ مطلب یہ تھا کہ بوڑھی عورت بڑھیا ہو کر جنت میں نہ جائے گی بلکہ جوان ہو کر جائے گی۔
ایک بار حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے ایک مسئلے کے متعلق بار بار سوال کیا۔ آپ نے ہر دفعہ جواب
دیا پھر اخیر میں فرمایا۔ وَاِنْ رَعِمْنَا فَاَبَى دَرْءُ کہ ہاں یہی جواب ہے اگرچہ ابو ذر کی ناگ رگڑ جائے
یہ مزاح ہی تو تھا۔ گو یہ رنگ عتاب تھا مگر عاشرین کو ایسا لطف آتا ہے کہ حضرت ابو ذر جب اس
حدیث کو بیان فرماتے تو اخیر میں یہ بھی کہتے وَاِنْ رَعِمْنَا فَاَبَى دَرْءُ۔ وَاِنْ رَعِمْنَا فَاَبَى دَرْءُ
کو نیکہ ان کو اس میں خطا آتا تھا۔

ایک واقعہ

حضرت شیخ ابوالعالی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید جھگڑا تو آپ نے اس کے ہاتھ
روضۂ اقدس پر سلام بھیجا جب مرید نے شیخ کا سلام پہنچایا تو روضۂ اقدس

اوازانی۔ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہہ دینا شیخ کو یہ واقعہ مکشوف ہو گیا مگر جب مرید واپس آتا تو اس سے پوچھا کہ تم نے ہمارا سلام ہو چکیا تھا۔ کہا ہاں حضور بھی دیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی آپ کو سلام فرمایا ہے فرمایا انھیں لفظوں سے کہہ جو حضور قسلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے ہیں کہا جب آپ کو وہ الفاظ معلوم ہیں تو مجھے آپ کیوں بے ادب بناتے ہیں۔ فرمایا اس میں کسے ادبی کیسی۔ اس وقت تمہاری زبان سے وہ الفاظ ادا نہ ہوں گے، بلکہ تمہاری زبان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک ہوگی۔ تم تو محض سیفہ و غرض اس نے وہی الفاظ کہے کہ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہنا۔ یہ سنتے ہی شیخ پر وجد طاری ہو گئی اور یہ شعر پڑھا۔

بدعتی زور و زور کند عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ نمی زید لب لبعل شکر خارا
یہی راز تھا حضرت ابوذر کے بار بار وان رعنم انف ابی ذر کہنے میں ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

اگر ایک بار بگوید بندہ من
اگر عرض بگذر و خندہ من
اگر وہ کہدے مجھے اپنا غلام
سب سے بیا را نام ہو میرا یہی

حق تعالیٰ کا مزاج
حق تعالیٰ کا مزاج فرمایا بھی حدیث سے ثابت ہے کہ جنہم سے جو مسلمان نکالے جائیں گے ان کا لقب جنہم ہوگا۔ کیونکہ ان کو اسی میں حظ ہوگا۔ جس کی مثال اوپر گذر چکی۔ ان میں ایک شخص جو سب سے اخیر میں نکالا جائے گا حق تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ مانگ کرنا مانگتا ہے وہ عرض کرے گا کہ میرا منہ جنہم کی طرف سے پھیر دیا جائے حق تعالیٰ فرمائیں گے بس اس کے بعد کچھ نہ مانگے گا وہ کہے گا نہیں اور کچھ نہ مانگوں گا۔ چنانچہ جنہم کی طرف سے اس کا منہ پھیر دیا جائے گا اس وقت اس کو جنت کا ایک درخت نظر آئے گا۔ عرض کرے گا اس درخت کے نیچے مجھے مہیا دے۔ ارشاد ہوگا کہ تو نے تو ابھی وعدہ کیا تھا کہ کچھ نہ مانگوں گا وہ معذرت کرنے لگے گا کہ میں یہ درخواست اور پوری کر دیکھتے پھر کچھ نہ مانگوں گا غرض اسی طرح رفتہ رفتہ وہ جنت میں پہنچ جائیگا تو یہ بھی مزاج ہی ہے کہ مقصود تو جنت میں پہنچنا تھا مگر اس کو رگڑ کر پہنچایا جائے گا لہذا اب اس حکایت پر کچھ اشکال نہیں کیونکہ مزاج کا ثبوت اس میں بھی ہے۔ دوسرے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کافر سے مراد صدائے غیبی میں کافر باللہ نہ تھا بلکہ کافر بالظاہر تھا۔ اور یہ استعمال نص میں بھی وارد ہے جنت کفر بالظاہر و لیومن باللہ فقد استمسک بالعروة الوثقی جس نے

طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا اس نے مضبوط دستے کو تھا مایا۔

۱۲ خطبہ الوداع محض بدعت ہے

خطبہ الوداع میں مصلحتیں بیان کرنا من وجہ خدا اور رسول پر اعتراض ہے سو اس کا بیان یہ ہے کہ جب بعض بدعتیں بھی بوجہ مصالح مطلوب ہوئیں تو گویا اس شخص کے نزدیک کتاب و سنت کی تعلیم نا تمام ہوتی کہ بعض مصالح ضروریہ کی تعلیم میں فرو گذاشت ہو گئی کیا کوئی اس کا قائل ہو سکتا ہے، اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بدعت کو ضلالت فرمایا ہے۔ اور بعض بدعت کے حسنہ ہونے سے اگر شبہ ہو تو درحقیقت وہ بدعت ہی نہیں۔ اور اس قسم کا احتمال خطبہ الوداع میں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر معنی سنت ہوتا تو سلف میں اس کی نظیر ضرور ہوتی پھر بعد عرق ریزی کے اگر کوئی دور کی نظیر نکال بھی لی جاوے، تو دوسرے مانع کا کیا جواب ہوگا کہ عوام کے التزام سے بدعت ہو گیا اور بدعت بھی بدعت ضلالت، جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نار کی وعید فرما رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد دین ارشاد حق ہے، تو ایسے امر کا التزام اور اس میں مصلحتیں نکالنا خدا اور رسول پر اعتراض بھی ہے اور خدا اور رسول سے مزاج بھی ہے۔ لیکن ہمارے اس قول سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد خداوندی ہے کوئی یہ نہ سمجھ جاوے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد نہ فرماتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد ضرور فرماتے تھے لیکن آپ کا اجتہاد موقوف رہتا تھا اگر وحی میں اس پر حکم نہ ہوتی تب تو وہ حجت رہتا تھا کیونکہ سکوت اس کی تقریر دلالت کرتا ہے۔ ورنہ وحی سے اس کی اصلاح ہو جاتی تھی غرض حال میں وہ اجتہاد بھی حکما وحی ہو جاتا تھا لہذا اب وجود اجتہاد کے بھی یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ گفتہ او گفتہ اللہ بود

(اکمال العوام والعباد ص ۷)

۳ عوام کا اہل قبور سے دمانگنا شرک خالی نہیں

(۴) فرمایا شرک جس کی نسبت وعید ہے۔ اِنَّ الدِّنَّ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهِ۔ اس کی تشریف

ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ شرک کو نہ بخشتا نہیں ہے۔

جائزہ کو بعد تو تسل شرک

(مقالات حکمت نمبر ۵، دعوات عبدیت لحد اول)

قبروں سے مدد چاہنا

(ب) لوگ قبروں پر جا کر ان سے دنیا کے کاموں میں مدد اور اعانت چاہتے ہیں اور قبروں پر جانے میں بالکل بھی اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ ہمارے مدد معاون ہو جائیں گے۔ سو یہ اور بھی بے ادبی ہے اس لئے کہ وہ حضرت مقرب ہیں جب دنیا میں زندہ رہ کر دنیوی تذکروں اور جھگڑوں کو پسند نہیں فرماتے تھے تو اب عالم آخرت میں جا کر کیسے پسند کریں گے جبکہ امور آخرت میں مستغرق بھی ہوں اور ایسی حالت میں ان سے دنیوی تقصوں میں مدد چاہنا دین کے خلاف تو ہے ہی تو وہ عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ جب دنیا ان کے پاس نہیں رہی تو ان سے دنیا مانگنا یا دنیوی کاموں میں مدد، یا اعانت کی خواہش کرنا، کیسے تسلیم کی جاتی ہے۔ ہاں ان سے وہ چیزیں مانگو جو ان کے پاس ہوں تو اب بھی صاحب نسبت ان سے فیض حاصل کر سکتا ہے اور روپیہ اور بیٹا تو ان کے پاس ہے بھی نہیں۔ پس وہ تم لوگوں کو کیسے دیں گے۔ کوئی قبر کھول کر دیکھے تو وہاں ایک روپیہ بھی نہ ہوگا تو پھر ایسی چیزیں ان سے مانگو جو ان کے پاس بھی نہیں کیسی بے عقلی کی بات ہے رہا یہ خیال کہ وہ دعا کروں گے تو ایسا کون خیال کرتا ہے کوئی بڑا ہی خوش عقیدہ ہوگا کہ اس خیال سے قبروں پر جانا ہوگا، ورنہ عام عقیدہ تو یہی ہے کہ وہ خود دیتے ہیں۔

ایک حکایت

چنانچہ کانپور میں ایک بڑھیا ایک شخص کے پاس آئی کہ بڑے پر صاحب کی نیاز دیدو۔ انہوں نے کہا کہ بڑی نیاز تو اللہ میاں کی دیتے۔ دیتا ہوں اور ثواب بڑے پر کو پہنچائے دیتا ہوں، اس نے جواب دیا کہ نہیں اللہ میاں کی نیاز تو اس دلائی ہو۔ اس پر بڑے پر ہی کی نیاز دیدو۔ اس سے صاف ظاہر ہوا کہ عوام بزرگوں کو صاحب اختیار بال استقلال سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ جامع مسجد میں ایک بڑھیا آئی اور کہنے لگی کہ ایک پرزہ تعزیر پر لٹکانے کو لکھد وہم نے کہدیا کہ یہاں کسی کو ایسا پرزہ لکھنا نہیں آتا۔ ایک اور قصہ مجھے یاد آیا۔ ایک صاحب یہاں تک بیان کرتے تھے کہ میں نے تعزیر میں ایک تیلاموم کا رکھا دیکھا۔ قصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک عرضی لٹکانی اور اولاد کی درخواست کی ایک شخص نے اس عرضی کے پیچھے یہ جواب لکھ دیا کہ تمہاری بیوی باکھ ہے اسے طلاق دیکر دوسری شادی کر لو اور یہ شکر لکھ دیا۔

لہ وسیلہ کی خاطر عبادت کرنا لے ڈوبے ہوئے۔

یہ ہے کسی کو مستحق عبادت سمجھنا اور عبادت کہتے ہیں کسی کے سامنے نہایت تضرع و تذلل سے پیش آنے کو چونکہ حق تعالیٰ قادر مطلق و خالق و رازق ہیں، ان کو غیبت آتی ہے کہ سوا ان کے کسی دوسرے کے سامنے غایت تضرع و تذلل سے پیش آئے مثلاً دو شخص ہوں۔ ایک ان میں بڑے مرتبہ کا ہے اور اس مرتبہ والے نے کسی سائل کو کچھ دیا۔ اور سائل بجا ہے معطی کے دوسرے کی ایسی ہی تعریف و توصیف کرنے لگے جو اس کے لئے چاہئے تھی تو طبعی بات ہے کہ معطی کس قدر غضبناک ہوگا۔ اسی طرح حق تعالیٰ کو بھی عزت آتی ہے۔ جو لوگ مزارات پر اولیا اللہ سے سوال کرتے ہیں یا دیکھنا چاہئے آیا محض وسیلہ سمجھ کر سوال کرتے ہیں یا کوئی امر اس سے زائد ہے۔ سو مشرکین عرب بھی بتوں کی عبادت وسیلہ قرب الہی سمجھ کر کرتے ہیں چنانچہ مذکور ہے۔ مَا تَعْبُدُوهُمْ إِلَّا لِيَقَرَّبُوكُمْ إِلَى اللَّهِ تَعَالَىٰ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ أَلَمْ يَكُنْ لَكُمْ بَالِغٌ فِي الْأُمُورِ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ سو سمجھنے کی بات یہ ہے کہ وسیلہ میں بھی دو صورتیں ہیں۔ مثال سے فرق معلوم ہوگا۔

شرک کی ایک مثال

مثلاً ایک کلکٹر ہے اس کے پاس ایک منشی نہایت زیرک مائل ہے کلکٹر نے اپنا سارا کاروبار حساب و کتاب اسی منشی کے سپرد کر دیا ہے اور اس کے ذمہ چھوڑ دیا۔ اور ایک دوسرا کلکٹر ہے اس کے پاس بھی منشی ہے مگر کلکٹر زبردست عادل ہے اپنا کاروبار خود دیکھتا رہتا ہے منشی کے ذمہ نہیں چھوڑا اب اگر کوئی شخص اس منشی زیرک کے پاس جو پہلے کلکٹر کے پاس ہے جس کے سپرد سب کام ہے کوئی درخواست پیش کرے تو کیا سمجھ کر کرے یا یہ ظاہر ہے کہ منشی کو کاروبار میں ذخیل سمجھ کر پیش کرے گا اور اسی واسطے اس کی خوشامد کرے گا کہ یہ خود سب کام کر دیں گے کیونکہ ان کے کل کام سپرد ہیں۔ کلکٹر تو فارغ بیٹھا ہے گو ضابطہ کے دستخط وہی کرے گا مگر اس منشی کے خلاف کبھی دستخط نہ کرے گا اور اگر دوسرے کلکٹر کے منشی کے یہاں عرضی دی جائیگی تو محض اس خیال سے کہ کلکٹر زبردست ہے۔ رعب والا ہے اس کے سامنے کون جاسکتا ہے اس منشی کے ذریعہ درخواست کرنی چاہیے کیونکہ اس منشی کو تقرراً حاصل ہے۔ یہ وہاں پیش کر دیگا۔ کیونکہ کل کام کلکٹر خود دیکھتا ہے۔ اب دیکھئے ان دونوں صورتوں میں کس قدر فرق ہے۔ عوام اہل مزار سے اکثر پہلی صورت کا بتاؤ کرتے ہیں۔ ان کے افعال اعمال سے یہ ظاہر ہے پھر شرک نہیں تو اور کیا ہے۔ برخلاف محض وسیلہ سمجھنے کے۔ پس شرع شریف میں عبادت غیر اللہ جہاں صادق آئے گا گو بہ نیت تو تسل ہی یہی وہ مشرک ہوگا۔ غرض تو تسل تو

لہ ہم انکی پوجا نہیں کرتے مگر صرف اس لئے کہ وہ ہیں اللہ سے قریب کر دیں گے

در تخم عمل ضائع مگر داں

زمین شور سنبل بر نیاید

اور اس کے نیچے لکھ دیا۔ راقم امام حسین رضی اللہ عنہ نے جو اس جواب کو دیکھا تو بہت بگڑے کہ کہیں میرے ساتھ مذاق کیا۔ کسی نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ اور کسی نے لکھ دیا ہے ممکن ہے کہ یہ انھوں نے ہی لکھا ہو۔ کیونکہ اگر وہ اس کے پڑھنے پر قادر ہیں تو لکھنے پر بھی قادر ہوں گے۔ لہذا ممکن ہے کہ خود حضرت امام ہی لکھ گئے ہوں۔

خلافت ادب کا کام سوانح کل لوگوں کی یہ محال ہے اور یہ شریعت اور ادب اور عقل سب کے خلاف ہو رہا ہے۔ غرضیکہ جب زندوں سے اس قسم کی باتیں کرنا خلافت ادب میں تو مردوں سے تو اور بھی زیادہ خلاف ادب ہونگی ان حضرات کو ایسی باتوں سے ایسی ہی نفرت ہوتی ہے جیسے کسی مہذب مجلس میں گو موت کے ذکر سے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان حضرات کو تو دنیا کے تذکرہ سے بھی نفرت ہوتی ہے۔ حضرت رابعہ کے یہاں چند بزرگوں نے دنیا کی مذمت کی تو انھوں نے فرمایا کہ تم میرے پاس سے کھڑے ہو جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو دنیا کی محبت ہے۔ من احب شئیئا اکثر ذکرہ۔ (اتباع المنیب ص ۹)

۱۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت پر

جلوس نکالنا

آج کل ہمارے چند انخوان زمان نے ایک عظیم الشان مفسدہ کی بنیاد ہندوستان میں ڈالی ہے یعنی یوم ولادت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوم عید بنانے کی تجویز کی ہے اور یہ خیال ان کے ذہن میں دوسری اقوام کے طرز عمل کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے لیکن اس قاعدہ مذکورہ کی بنا پر لوگوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ یوم ولادت کی خوشی دنیوی خوشی نہیں ہے۔ یہ مذہبی خوشی ہے پس اس کے تعین طریق کے لئے وحی کی اجازت ضروری ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم بطور سال گرہ کے دنیوی طرز پر کرتے ہیں تو میں کہوں گا کہ ایسا کر نیوالے سخت بے ادبی اور گستاخی جناب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کر رہے ہیں۔ صاحبوا کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جلالت و عظمت پر دنیا اور دنیا

لئے زمانہ کے بھائیوں نے

کے بادشاہوں پر جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی نسبت نہیں ہے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس فرحت کے لئے بس ایک دنیوی رذیل سامان اسی طرح کا کرتے ہو۔ جیسا ان سلاطین کے لئے کیا کرتے ہو۔ ع۔

”چہ نسبت خاک را با عالم پاک“

ایک بزرگ کی حکایت مجھے اس موقع پر ایک بزرگ کی حکایت یاد آگئی کہ وہ جنگل میں رہتے تھے ایک کتیا بال رکھی تھی اتفاق سے ایک مرتبہ کتیا نے بچے دیئے تو آپ نے تمام شہر کے معززین کو مدعو کیا لیکن ایک بزرگ شہر میں رہتے تھے ان کو نہیں بلایا۔ ان بزرگ نے اذراہے تکلفی دوستانہ شکایت کی تو ان بزرگ نے جواب میں کہلا کر بھیجا کہ حضرت میرے یہاں کتیا نے بچے دیئے تھے اس کی خوشی میں سگان دنیا کی دعوت کر دی۔ سخت گستاخی تھی کہ میں ان دنیا کے کتوں کے ساتھ آپ کو مدعو کرتا جس روز میرے اولاد ہوگی اور مجھ کو خوشی ہوگی اس دن آپ کو مدعو کروں گا۔ اور کتوں میں سے ایک کو بھی نہ پوچھو گا۔

جب اولیاء کے ساتھ دنیا داروں کا سا برتاؤ بے ادبی ہے تو سید الانبیاء کے ساتھ دنیا داروں کا سا برتاؤ کیسے بے ادبی نہ ہوگی۔ اب اس کی دلیل سنئے کہ یوم ولادت مذہبی خوشی ہے دنیوی خوشی نہیں ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ دنیا کا اطلاق اس خطہ زمین پر یا زیادہ سے زیادہ چند فرسخ اس کے متصل ہوا پر ہوتا ہے پس اگر کوئی دنیوی خوشی ہوگی تو اس کا اثر اس خطہ زمین تک محدود رہے گا اس سے متجاوز نہ ہوگا اور ولادت حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے دن نہ صرف زمین کے موجودات بلکہ ملائکہ عرش و کرسی اور باشندگان عالم سب کے سب مسرور اور شادمان تھے، وجہ یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریف کفر و ضلالت کی ماحی اور توحید حق کی حامی تھی۔ جس کی بدولت عالم کا قیام ہے کیونکہ قیامت اسی وقت قائم ہوگی جب ایک شخص بھی دنیا میں خدا کا نام لینے والا نہ رہے گا اور قیامت کے قائم ہونے سے فرشتے بھی کثر فنا ہو جائیں گے، پس آپ کا ظہور جو کہ سبب تھا تمام عالم کے بقا کا اس لئے تمام عالم میں یہ خوشی ہوئی۔ جب اس کا اثر دنیا سے متجاوز ہو گیا۔ تو اس خوشی کو دنیاوی خوشی نہیں کہہ سکتے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ دنیوی خوشی نہیں بلکہ مذہبی خوشی ہے تو اس میں ضرور ہر طرح سے وحی کی احتیاج ہوگی۔ یعنی اس کے وجود میں بھی اور اس کی کیفیت میں بھی۔

یوم ولادت پر خوشی منانے کی کوئی دلیل نہیں | اب مجوزین ہم کو دکھلائیں کہ کس وحی سے یوم ولادت

کے یوم عید بنانے کا حکم معلوم ہوتا ہے اور کیا صورت اس کی بتلائی گئی ہے اگر کوئی قل بفضل اللہ سے استدلال کرے تو میں کہوں گا کہ صحابہ کرام جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور تمام عالم سے زیادہ کلام مجید کو سمجھتے تھے ان کی سمجھ میں یہ مسئلہ کیوں نہیں آیا۔ بالخصوص جب کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی ان کے دگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی۔ علی ہذا تابعین رحمہم اللہ جنہیں بڑے بڑے مجتہدین ہوئے ہیں ان کی نظر یہاں تک کیوں نہیں پہنچی۔ ہاں جن امور کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت ہے اس کو ضرور کرنا چاہئے۔ مثلاً آپ نے اپنی ولادت کے دن روزہ رکھا اور فرمایا۔ ذالک الیوم المذی ولدت خنیہ اس لئے ہم کو بھی اس دن روزہ رکھنا مستحب ہو سکتا ہے۔ دوسرے پر کے دن نامہ اعمال حق تعالیٰ کے روبرو پیش ہوتے ہیں پس یہ مجموعہ وجہ ہوگی اس حکم کی۔ اگر منفرد ابھی مانا جاوے تب بھی صحیح ہے لیکن صرف اسی قدر کی اجازت ہوگی جتنا کہ ثابت ہے (اکمل الصوم والعیصۃ ۲)

۱۵۔ عرس کے حقیقی معنی اور بزرگوں کے مروّجہ عرسوں کا خلاشرع ہونا

آج کل جو لوگوں نے بزرگوں کے عرس کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہ بھی محض لغو اور تجاوز عن الحد ہے۔ اصل حقیقت اس کی یہ بھی کہ عرس . . . کے معنی لغت میں شادی کے ہیں۔ اور حاصل شادی کا یہ ہے کہ محب کا محبوب سے وصل ہو۔ پس چونکہ ان حضرات کی موت ان کے لئے وصل محبوب ہے۔ اس لئے ان کے یوم وصال کو یوم العرس کہا جاتا ہے۔ نیز ایک روایت میں بھی آیا ہے کہ جب کسی مقبول بندہ کی وفات ہوتی ہے اور فرشتے . . . ان کی قبر میں آکر سوال کرتے ہیں۔ تو سوال و جواب کے بعد کہتے ہیں۔ ینکم کثرت العرس تو وہ دن ان حضرات کے لئے یوم العرس ہوا۔ اسی کو ایک بزرگ خوب کہتے ہیں۔

نہ دہن کی طرح بے فکر سوچا

۵۔ خوشاروزے و خرم روزگارے کہ بارے پر خور و از وصل یارے
اور گو وصل ان حضرات کو دنیا میں بھی ہوتا ہے تاہم اس وصل میں اور اس وصل میں
فرق ہے کہ یہاں پر حجاب ہے اور وہاں بلا حجاب۔ جیسا مولانا نے فرمایا۔

گفت مکشوف و برہنہ گو کہ من سے نہ گنج با صنم در پیر بن
اگرچہ خدا تعالیٰ جسم اور لوازم اور عوارض جسم سے پاک ہے لیکن یہ مثال کے لئے۔ کہا جاتا ہے اور جیسا حضرت غوث فرماتے ہیں۔
بے حجابانہ در آذر کا شانہ ما کہ کسے نیست بجز درد تو در خانہ ما
یہ کیفیت تو وہاں کے وصال کی ہے اور دنیا میں بوجہ حجاب اور سیری نہ ہونے کے ان کی یہ حالت ہوتی ہے۔

دل آرام در بردل آرام جو لب از تشنگی خشک بر طرف جو
نگویم کہ بر آب قار نیستند کہ بر ساحل نیل مستسقی اند
اور چونکہ ان کو مرکز یہ دولت نصیب ہوتی ہے اس لئے وہ تمنائیں کرتے ہیں اور شدت شوق میں یوں کہتے ہیں کہ۔

۶۔ خرم آزد و زکزیں منزل ویراں بردم راحت جاں طلبم ز پئے جاناں بروم
اور ان حضرات کو چونکہ مرنے کی خوشی ہوتی ہے اس لئے اس میں نہایت طمئن ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک نقشبندی بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے وصیت کی تھی جب میراجنازہ لے چلو تو ایک شخص ساتھ ساتھ یہ اشعار

پڑھتا چلے۔
مفلسا نیم آمدہ در کوئے تو شیا للہ از جمال روئے تو
دست بکش جانب ز نیل ما آفریں بردست و بر بازوئے تو
کیوں صاحب کیا بے اطمینانی میں کسی کو ایسی فرمائشوں کی سوجھ سکتی ہے۔ یہ غایت فرحت کا اثر تھا۔ حضرت سلطان نظام الدین اولیا قدس سرہ کی حکایت مشہور ہے کہ جب آپ کا انتقال ہو گیا اور جنازہ لے چلے ایک مرید نے شدت غم میں درد کے ساتھ یہ اشعار پڑھے۔
سرو سیمینا بصحرا می روی سخت بے مہری کہ بے مایروی
اے تماشہ کا عالم روئے تو تو کجا بہر ناز شامی روی۔

لکھا ہے کہ ہاتھ لکھنے کے اندر ملن ہو گیا۔ صاحبو ایک ایسا شخص جس کی یہ حالت ہو کہ ع
پابندی دگرے دست بدست دگرے
کیا اس کو وجد ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی بے حد فرحت کا دن ہوتا ہے ایک دوسرے
بزرگ انتقال کے وقت منتظرانہ و مشتاقانہ فرماتے ہیں ۷
وقت آں آمد کہ من عریاں شوم
جسم بگذارم سرسرا جاں شوم
اور یہ حالت کیوں نہ ہو جب کہ وہ جانتے ہیں کہ اب پردہ ہائے ہیولانی جو کہ مانع دیدار رکھتے
اٹھتے ہیں اور کوئی گھڑی ہے کہ محبوب حقیقی کا دیدار نصیب ہو گا صرف یہ نہیں کہ ان کو جنت یا حوروں
کی ہوس ہوتی ہے۔

ابن الفارض کا واقعہ
حضرت ابن الفارض کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کا انتقال ہونے لگا تو جنت
منکشف ہوئی آپ نے اس طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا ۷
ان کا ان منزلتی فی الحب عندکم
ما تدرا بیت نقد ضیعت ایاہی
کہ جان تو آپ کے لئے دے رہا ہوں جنت کو کیا کر دل آخر جنت چھپ گئی اور نورانی ظاہر ہوئی
اور جان بحق ہوئے ان کی بالکل وہی حالت ہو گئی کہ۔

گر بایں ملک الموت کہ جائے برد
تا نہ بینم رخ تو روح رسیدان مذہم
اکثر لوگ اتن حالات کو سزا تجب کریں گے لیکن یہ تعجب صرف اس وجہ سے ہے کہ خود اس سے محروم
ہیں۔ مگر ایسے لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ ع
”تو مشو منکر کہ حق لبس فت دراست“

بزرگوں کی موت یوم مرتبہ ہے
عرض بزرگوں کے حالات اور حدیث وغیرہ
سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان بزرگوں
کی وفات کا دن یوم العرس ہے لیکن لوگوں نے اس کے مفہوم و مصداق کو بالکل خراب
کر دیا ہے مصداق کی خرابیاں تو ظاہر ہیں کہ تمام شرک و بدعت اس عرس کا جزو ہو گئی ہیں۔ باقی
مفہوم کی خرابی یہ کہ اس لفظ کے لغوی معنی لے کر شادی کے لوازم بھی وہاں جمع کر دیئے چنانچہ اکثر
جگہ رسم ہے کہ بزرگوں کی قبر پر بھندی چڑھاتے ہیں۔ لوبت نقارہ رکھتے ہیں اسی طرح مزامیر
وغیرہ سب لغو رکتیں جمع کر رکھی ہیں غریب مردہ پر تو بس چلتا نہیں قبر کی گت بنائی جاتی ہے تو
حقیقت میں وہ یوم العرس اس اعتبار سے ہے کہ جس کو ذکر کیا گیا کہ وہ ان بزرگوں کی خوشی

کا دن ہے۔ اور یہ کوئی دنیوی خوشی نہیں ہے تو اس میں کوئی طریقہ مقرر کرنے کے لئے ضرورت دہی کی
ہوگی اور وحی ہے نہیں بلکہ اس کے خلاف پر وحی ہے چنانچہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے
ہیں۔ لا تتخذن واثقوی عیداً کہ میری قبر کو عید نہ بنانا۔ عید میں تین چیزیں ضروری ہیں ایک
اجتماع دوسرے تعیین وقت۔ تیسرے فرحت۔ تو ممانعت کا خلاصہ یہ ہوا کہ میری قبر پر کسی یوم
معین میں سامان فرحت کے ساتھ اجتماع نہ کرنا ہاں اگر خود بخود کسی وقت میں کسی عرض سے اجتماع
ہو جائے تو اور بات ہے۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہاں سے تشریف لے جانا اگرچہ آپ
کے لئے باعث سرور ہے لیکن ہمارے لئے تو باعث حزن ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات
سے جو ہم پر نعمت کامل فرمائی ہے جس کو میں نے نشر الطیب میں لکھا ہے وہ دوسرے اعتبار سے
ہے پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر ایسا اجتماع جائز نہیں تو دوسروں کی قبر پر ایسا اجتماع کیونکر
جائز ہو گا اور عجیب برکت ہے کہ آج تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر اجتماع کا کوئی خاص
دن معین نہیں ہوا۔ (ایضاً ص ۲۶)

۱۶۔ شادی اور عینی کی رسوم خلاف شرع

اور واجب الترتیب ہیں

(۱) شادی اور عینی کی رسمیں ہیں کیا آج کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ رسمیں شریعت کے
خلاف نہیں ہیں اور اگر واقعی کسی کو معلوم نہیں تو اس کو چاہیے کہ اس قسم کی کتاب میں مطالعہ کرے جو
اس کے بیان کرنے کے لئے تصنیف کی گئی ہیں باجو لوگ اس مجمع میں موجود ہیں وہ اسی وقت
کچھ سُن لیں۔ سنئے۔ شادی عینی کی رسمیں دو قسم کی ہیں ایک تو وہ ہیں کہ جن کا قبیح ہونا نہایت
ہی ظاہر ہے اور شرفاء و ثقافت نے ان کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے اب صرف اسافل اور فساق
اناس اس میں مبتلا ہیں۔ مثلاً ناچ رنگ وغیرہ۔ اور بعض وہ رسمیں ہیں کہ ان کا بیج اتنا ظاہر
نہیں۔ ان میں عوام و خواص قریب قریب سبھی مبتلا ہیں اور ان کو بالکل جائز سمجھا جاتا ہے بلکہ
بسا اوقات اعلیٰ تقویٰ کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم نے شادی میں کوئی رسم کی ہے نہ ہمارے
ہاں ناچ ہوا اور نہ باجا منگایا گیا۔ پھر ہم نے کیا گناہ کیا۔ سو میں بتانا ہوں کہ آپ نے کیا گناہ

کیا ہے لیکن پہلے مجھے یہ بتلادیکجئے کہ گناہ کہتے کس کو ہیں۔ ظاہر ہے جو امر شرعاً ممنوع ہو۔ وہ گناہ کہلاتا ہے خواہ وہ ناپاچ ہو یا کوئی دوسرا امر ہو کیونکہ ناپاچ بھی تو اسی واسطے حرام ہوا کہ شریعت نے اس کو حرام اور جرم قرار دیدیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ناپاچ کے علاوہ دوسری رسوم کو بھی شریعت نے جرم قرار دیا ہے یا نہیں۔ اس پر مفصل گفتگو تو اصلاح الرسوم میں ملے گی۔

تجربہ کی حمایت | میں مختصراً اس وقت بقدر ضرورت بیان کئے دیتا ہوں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث شریف میں تجربہ کی سخت ممانعت فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے اِنَّ الدِّلَّةَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ط حدیث شریف میں ہے لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مَقْتَالٌ حَتَّىٰ مِنْ خُرْدٍ مَنْ كَبِرَ۔ دوسری حدیث میں ہے مَنْ لَبَسَ ثَوْبًا شَهْرًا اَلَيْسَ اَلَدُّ ثَوْبَ الذَّلِيلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کسی اگر طینوالے اور فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتے، اور حدیث اول کا ترجمہ یہ ہے جس کے قلب میں رائی برابر کبھی تجربہ ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ دوسری حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر شہرت کے لئے پٹر اپنہ گا تو قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کو ذلت کا لباس پہنائیں گے۔ اس آیت اور حدیث سے معلوم ہوا کہ فخر کے لئے کوئی کام کرنا حرام ہے۔ ایک حدیث شریف میں ارشاد ہے مَنْ سَمِعَ اَلدِّلَّةَ بِهٖ وَمَنْ سَآءِ اَلدِّلَّةَ بِهٖ اس سے معلوم ہوا کہ دکھلاوے اور شہرت کا کام کرنا حرام ہے۔

شادی پہل انسان کا حال

اب غور کر کے دیکھئے کہ شادیوں میں جو کام ہم کرتے ہیں اور جن کے لئے ہم نے نہایت خوبصورت الفاظ تراش رکھے ہیں کہ بھات دیا ہے اور بھائیوں کو کھلایا ہے اور بیٹی کو دیا ہے وغیرہ وغیرہ ان میں نیت ہماری کیا ہوتی ہے۔ صاحبو! محض الفاظ کے خوبصورت ہونے سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل جاتی۔ سب سے بڑی چیز نیت ہے لہذا نیت کو دیکھنا چاہیے کیا ہم لوگ یہ تمام رسمیں محض رسم اور نمونہ کے لئے نہیں کرتے۔ بہنوں کو بڑا بھات دیا جاتا ہے اور اس کو صلہ رحمی کہا جاتا ہے کیوں صاحب آج سے آٹھ دن پہلے بھی تو یہ بہن آپ ہی کی بہن تھی۔ پھر کیا آپ نے اسکی خبر لی ہے کبھی بہن کے فقر و فاقہ پر آپ کو رحم آیا ہے نیز اگر یہ صلہ رحمی ہے تو تمام برادری کو اس کا مساعنہ کرانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کبھی اپنی لڑکی کے لئے یا کپڑا خریدتے وقت یا اس کو کھلاتے پلاتے وقت بھی آپ نے

برادری کو جمع کیا ہے اگر منہیں کیا تو بھات اور چہنر دینے وقت برادری کو کیوں جمع کیا جاتا ہے، معلوم ہوا کہ محض فخر و نام و نمود کے لئے ایسا کیا جاتا ہے بس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ سب رسوم محض شہرت کے لئے نہیں اور شہرت کے لئے جو کام کیا جاتا ہے وہ بروئے حدیث شریف حرام ہوتا ہے، تو سب رسوم بھی حرام ہوئیں۔

نیوتہ کی رسم | بالخصوص ایک رسم تو ایسی گندی ہے کہ وہ تو بے سے بھی منافع ہونا مشکل ہے کیونکہ اس کی تو بے بھی شکل ہے اور لطف یہ ہے کہ اس کو بظاہر عبادت سمجھا جاتا ہے اور اس پر فخر کیا جاتا ہے اور وہ رسم نیوتہ لینا دینا ہے لوگ اس کو قرض حسنہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی بھائی کی مدد کرتا ہے اور مدد کرنا عبادت ہے تو گویا نیوتہ دینا عبادت ہوا۔ حالانکہ نیوتہ دینا اس قدر بری رسم ہے کہ سب رسموں میں گندی ہے اس کو شاید آپ نے آج تک نہ سنا ہو گا۔ مگر اس وقت انشاء اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت بیان کر دوں گا اور وہ کوئی عجیب اور نئی بات نہ ہو گی، بلکہ پرانی بات ہے لیکن آپ نے عدم توجہ کے سبب اس میں غلطی کر رکھی ہے۔ مقدمات سب آپ کے مسلم میں صرف نتیجے میں کر غلطی ہو رہی ہے جیسے کسی شخص نے تبت کے بجائے کئے تھے تبت زیر تبت ت زیر تبت اور واں پڑھا تھا۔ بطح۔ نو آپ نے بھی بجے تو صحیح کئے ہیں مگر واں میں غلطی کر رکھی ہے اس کو میں بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ سب کو مسلم ہے اور کوئی شخص اس سے منکر نہیں کہ نیوتہ فرض ہے دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض واجب الادا ہوتا ہے۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض خواہ کی موت کے بعد اس کا ترکہ اس کے ورثہ کی ملک ہوتا ہے خواہ وہ ترکہ عین ہو یا کسی کے ذمہ دین ہو مثلاً اگر کوئی شخص مرے دوسرے روپے اس کے گھر میں موجود ہوں اور سور روپے ادھا میں تو اس کا کل ترکہ دوسرے سمجھا لے گا۔ اور یہ دوسرے روپے ملا کر سب ورثہ کو تقسیم کئے جائیں گے۔ ان تینوں مسئلوں کے معلوم ہونے کے بعد دیکھئے۔ نیوتہ میں کیا ہوتا ہے۔ سو نیوتہ میں یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص نے پچیس جگہ دو دو روپے لئے۔ اور اس طرح پچاس روپے اس کے قرض میں پھیل گئے اور اس کے بعد یہ شخص مرا۔ اور دو بیسے اس نے وارث چھوڑے جن میں ایک بالغ اور دوسرا نابالغ، تو موجودہ ترکہ میں سے تو ان دونوں نے نصف نصف لے لیا وہ بھی جب بڑا بھائی بڑا یا نانا ہو۔

وہ کی خرابیاں | لیکن جو نبوتے میں فرض ہے اس کو کوئی بھی تو تقسیم نہیں کرنا۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر چند روز کے بعد اس بالغ لڑکے کی کسی اولاد کی شادی ہونے لگی تو وہ نبوتہ اسی کو لاکر دیں گے اور یہ بلانا مل سارا نبوتہ خود ہی خرچ کرے گا اور ایسے کو ہی اس کا مالک

سمجھے گا۔ حالانکہ ان پچاس روپیوں میں سے پچیس روپے اس کا حق ہے اور پچیس اس کے چھوٹے
نابالغ بھائی کا حصہ ہے۔ اسی طرح علی العموم تمام نبوتوں میں یہی کیا جاتا ہے۔ کیا کوئی شخص بتلا سکتا
ہے کہ کسی نبوت کو فریض کی رو سے تقسیم کیا گیا ہو میرے خیال میں ایک جہتی بھی اس کی نہیں بتلائی
جاسکتی تو اس میں ایک گناہ تو اسی نابالغ بھائی کا ہوا کہ اس نے یتیم کا مال کھایا فرآن بھی
میں ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتِیْمِ ظُلْمًا اَنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہُمْ نَارًا وَّہُمْ لَا
سَیْصِلُوْنَ سَعٰیءًا ط اور ایک گناہ نبوت واپس کرنے والوں پر ہوا کہ انھوں نے مشرک مال
ایک مشرک کو دیدیا اور لطف یہ ہے کہ نبوت دیئے والے سمجھتے ہیں کہ ہم قرض سے سبکدوش ہو گئے
حالانکہ ابھی پچیس روپے یتیم کے ان کے ذمے باقی ہیں اور درختاریں روایت لکھی ہے کہ اگر کسی کے
ذمے کسی کے تین پیسے رہ جائیں گے تو قیامت میں سات سو نمازیں قرض خواہ کو دلائی جائیں گی اور
یہ اس وقت ہے کہ جب مالک کے بیٹے ہی کو وصول ہو گیا ہو۔ اور اگر دو تین لپٹیں گزر گئیں اور نمازوں
جاری ہو گیا تو پھر تو خدا جانے دو روز تک کس کس کا حق اس میں متعلق ہو گیا جس کا یہ چنانچہ سخت
ہی دشوار ہے۔ اگر کوئی کہے کہ یہ تو باپ دادا کے وقت سے چلا آتا ہے تو میں
کہوں گا یہ عذر بہرگز قابل سماعت نہیں کیونکہ اگر اسی پر عمل کیا جاتا تو آج ہم لوگ مسلمان نہ ہوتے
تو خرم کو اسلام تو اسی لئے نصیب ہوا کہ ہمارے باپ دادا نے اپنے آباؤ اجداد کے رسم و رواج
کو ترک کر دیا۔ لہذا یہ عذر نہایت کمزور ہے اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ پچھلے قرض کو
تحقیق کر کے ادا کیا جائے اور آئندہ کو یہ رسم بالکل چھوڑ دی جائے۔ یا کوئی عربی خواں یا انگریزی
خواں اس کے سوا کوئی دوسرا علاج مجھے بتلا دیں غرض نبوت کی رسم نہایت گندی اور خراب ہے
اگرچہ بظاہر یہ ثواب کا کام نظر آتا ہے۔ اور جب یہ اس قدر خراب رسم ہے جس میں ایک گونہ اعانت
عزیز کی مصلحت بھی ہے تو دوسری رسوم تو جہیں کوئی بھی مصلحت نہیں بالکل ہی قابل ترک
ہوں گی۔

دوسری رسمیں | اسی طرح ہم نے ہر قدم پر ایک ایک رسم ایجاد کی ہے کہ جب تک وہ نہ ہو گویا شادی ہی نہ منہیں ہو سکتی اور ان رسوم میں جو دنیا کی مضر تیں ہیں ان کا بیان کرنا گو میرا منصب نہیں ہے لیکن ایک مختصر سے جملے میں ایک گونہ رعایت کبھی غریب کی مصلحت کبھی ہے تبرعاً ان کو بھی بیان کر دیتا ہوں وہ یہ کہ مسلمانوں پر جس قدر تباہی آئی ہے زیادہ تر نہ بلا شک جو بتیوں کا مال کھاتے ہیں ظلم کر کے وہ اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ کھاتے ہیں ۔

انہیں رسوم کی بدولت آتی ہے کیونکہ آمدنی ہر مسلمان حتمی ہے سب رظا ہر ہے اور خرچ ان رسوم کی بدولت جیسا کچھ ہوتا ہے وہ کبھی سب کو معلوم ہے۔ مآل اس مجموعہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ آج زمین رہن ہو رہی ہے کل مکان پر قرض ہے پرسوں زیور اور اثاث البیت نیلام ہو رہا ہے چوتھوں نہیں آیا کیا پابند رسوم ہیک مینی دودگوں رہ گئے۔ بعض لوگ اس کا یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ ہم میں گنجائش ہے اور ہم کو قرض لینا نہیں پڑتا۔ سوا دل یہ جواب تو مسلم نہیں۔ کیونکہ ہر حیثیت کا آدمی اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرنا چاہتا ہے اور اس میں قرض لینا لازمی ہے۔ دوسرے اگر مان بھی لیا جائے کہ ان کو قرض نہ لینا پڑے گا۔ تو کم از کم ان کو اپنے غریب بھائیوں کا تو خیال ضرور ہی کرنا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ ہم کریں گے تو حرص کے مارے وہ بھی کریں گے اور تباہ ہوں گے تو اس لئے ہم بھی نہ کریں۔ تیسرے جب یہ گناہ ہے اس لئے بھی اس کو چھوڑ دینا چاہیے گو دنیوی حضرت کبھی نہ ہو۔

عمنوں کی رسمیں | اسی طرح غنی کی رسمیں ہیں کہ ان میں بھی جو کچھ کیا جاتا ہے وہ محض شہرت کے لئے کیا جاتا ہے نہ کہ خدا کے لئے کیونکہ اگر خدا کے لئے کیا جاتا تو پوشیدہ طور پر کرنا بھی گوارا کیا جاتا اس دکھلانے اور سب پر ظاہر کرنے کا اہتمام کیوں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ محض شہرت ہی مقصود ہے اور امتحان اس کا یہ ہے کہ اگر کسی پابند رسوم سے یہ کہا جائے کہ بجائے اس ٹھونگ کے تم پچاس روپے دس مساکین کو دیدو اور کسی کو خیر نہ کرو تو وہ ہرگز راضی نہ ہوگا بلکہ یوں سمجھے گا کہ اس طرح کرنے سے یہ پچاس روپے ضائع ہی ہو جائیں گے اور کہے گا اچھا مولوی صاحب نے رائے دی کہ پچاس روپے کبھی کروں اور کسی کو خیر بھی نہ ہو۔ صاحبو! یہ تو آپ لوگوں کی حالتیں ہیں اور پھر کہا جاتا ہے کہ مولوی ثواب بخشنے سے روکتے ہیں تو بتلاؤ کہ خود آپ کو ہی کب ثواب ہوا تھا کہ دوسرے کو بخشے میں سچ کہتا ہوں کہ مولوی تو آپ کو ثواب ملنے اور ثواب بخشنے کی ترکیب بتلاتے ہیں۔ ثواب سے منع نہیں کرتے اور وہ ثواب بخشنے کی ترکیب یہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دواور بائیں کو۔۔۔۔۔ خبر نہ ہونی زاپے خاص حصے سے دومرکے وہ کپڑے جن میں وہ تمام دھنارنا بالغ و بالغ کا حق متعلق ہو گیا ہے وہ نہ دیدو۔ اگر دو توان کو تقسیم کرلو۔ اور جو ہتھارے حصہ میں آئیں وہ دو۔ مشترک ہرگز نہ دو۔ ثواب کا طریقہ یہ ہے نہ وہ جو آپ نے تراش رکھا ہے لوگ چاہتے ہیں کہ نام بھی ہو اور ثواب بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ سو ریا میں ثواب کہاں اور الٹا عذاب ہے۔ شیخ علیہ الرحمۃ اس کی بابت فرماتے ہیں ۷

کلید در دوزخ است آں نماز کہ در چشم مردم گذاری دراز

نمونہ کے طور پر میں نے بیان کر دیا ہے دوسری رسوں کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہیے۔

یہ تو دلائل عقلیہ تھے۔ عقلی بھی سنو! رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ

دلائل عقلیہ

زہرا رضی اللہ عنہا کی شادی کر کے دکھلادیا ہے کہ شادی اس طرح کرنی چاہیے

علی ہذا اپنے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ کی عمنی کر کے بتلادیا کہ عمنی یوں ہونی چاہئے پھر جب اس

کے موافق نہ کیا اور ہر امر میں اپنی ٹانگ اڑائی اور اس کا خلاف کراں ہوا تو سہولت اطاعت کہاں

ہوئی۔ پھر بت مطلوبہ کہاں ہوئی۔ اس محبت کا اثر قویہ ہے کہ طاعت میں سہولت پیدا ہوا ورنہ جب

کہ ہم نے بالشرعیہ کے خلاف کیا کہ وضع وہ اختیار کی جو شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ معاشرہ وہ پیدا

ہوئی جس کو شریعت سے کچھ بھی لگاؤ نہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہم کو کامل محبت خدا اور رسول سے

ہے

(آثار المحبت ص ۱۳)

ایصال ثواب کے غلط طریقے

(ب) وصول ہونے کے لئے ہی زیادہ تر ان لوگوں

نے اپنی ہوشیاری سے ایصال ثواب کے ایسے

طریقے ایجاد کئے ہیں جن کو سوائے ان کے دوسرا عامی آدمی جان ہی نہیں سکتا کہ اول قل ہوا اللہ

ہو۔ پھر تبارک الذی ہو اور پھر یہ ہو اور پھر وہ ہو بعض سورتوں پر بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اور بعض پر

نہیں یہ ایسی بات ہے کہ اس کو مولوی بھی نہیں جانتے تو چونکہ یہ طریقہ وہی لوگ جانتے ہیں اس لئے

مجبوراً سب عوام ان کے محتاج ہو کر انھیں کے پاس جاتے ہیں اور اس طرح سے انہیں کو مناد ہے

اور پھر غضب یہ کہ یہ لوگ اس میں اور بھی بڑی بڑی چالاکیاں کرتے ہیں ایک سب اسپیکٹر مجھ سے

کہتے تھے کہ میں کسی تھانہ میں تھا کہ میرے پاس ایک شخص ریپٹ لکھوانے آیا کہ کوئی آدمی میری فائتہ

چرا کر لے گیا میں سخت پریشان ہوا کہ فائتہ چرانے کے کیا معنی۔ اس شخص سے پوچھا تو اس نے کہا

موت پر چلئے آخر موقع بچا کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک ننگی میں پرچی ایک سال کے لئے فائتہ پڑھ

کر بند کر جاتے ہیں کہ جب ضرورت ہو اس میں سے کھوڑی سی جھاڑ لینا۔ فی ملکی (عدم) ان کی مقرر

ہے اتفاق سے کسی شخص کے پاس روپیہ تھا نہیں اور اس کو فائتہ کی ضرورت ہوئی تو اس نے اس

شخص کی ننگی چرائی۔ اس سے بڑھ کر ایک۔

ایک حکایت

حکایت حضرت مولانا گنگوہیؒ سناتے تھے کہ کسی مسجد میں ایک ملا رہتا

تھا سب لوگ اس سے فائتہ وغیرہ دلاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بڑھیا

کھانا لیکر آئی۔ اتفاق سے ملاجی اس وقت مسجد میں موجود نہ تھے ایک مسافر بیٹھا ہوا تھا وہ یہ سمجھ کر کہ مقصود

تو ثواب ہی ہے چلو مسافر ہی کو دید۔ اس کو کھانا دیکر چلی گئی۔ مسجد کے دروازے سے نکلی ہی تھی کہ ملاجی

مل گئے۔ پوچھا کہ بڑھیا کیسے آئی تھیں۔ اس نے سب واقعہ بیان کر دیا آپ نوراً مسجد میں آئے اور

لاکھڑی لے کر تمام مسجد کے فرش کو خوب پٹنا شروع اور شور مچانا شروع کیا۔ اور بیٹے بیٹے کھوڑی دیر میں

دھم سے مسجد کے فرش پر گر گئے۔ لوگوں نے جو غل شور سنا تو سب آکر جمع ہو گئے پوچھا کہ ملاجی کیا ہوا۔

کہنے لگے بھائیو میں تو مدت سے یہاں رہتا ہوں۔ سب مردوں سے واقف ہوں۔ انہیں کو ثواب

بخش دیتا تھا۔ یہ نیا آدمی ہے خدا جانے اس نے کس کو ثواب بخش دیا۔ کہ یہاں کے سب مردے

مجھے آکر لپیٹ گئے میں نے ان کو بہت کچھ بھگایا۔ لیکن میں تنہا تھا۔ کہاں تک لڑنا۔ آخر تھک

کر گر گیا۔ اگر دو چار دفعہ ایسا ہوا تو میں مر ہی جاؤں گا۔ اس لئے اور کہیں جاتا ہوں۔ لوگوں نے کہا

ملاجی آپ کہیں نہ چلیے ہم آپ ہی کو ہر چیز دیا کریں گے۔ توجہ بنا ان رسوم کی یہ غرض ہیں تو جب

فائتہ کی عوض ان کو کچھ نہ ملے گا تو الگ آگ پتہ پر فائتہ پڑھنا ان کو خود ہی مشکل معلوم ہو گا۔ اور

اسی طرح بہت جلد اس کا اسناد ہو جائے گا۔ اور یہ بھی ایک علامت ہے ان رسوم کے زائد

علی الدین ہونے کی۔ کیونکہ اصلی چیز سخائب اللہ ہر حالت میں محفوظ رہتی ہے چنانچہ جس زمانے میں

طاغون کی کثرت ہوئی تو تیرہ دسواں وغیرہ سب چھوٹ گئے تھے۔ صرف وہی چیزیں باقی رہ گئی تھیں

جو شرعاً ضروری تھیں۔ بعض لوگوں سے جو میں نے کہا کہ اب وہ رسوم کیوں نہیں ہوتیں تو کہنے لگے کہ

صاحب کس کس کی رسمیں کریں یہاں تو رزق تیرہ ہی رہتا ہے میں نے کہا دیکھو اسی سے اندازہ ہو سکتا

ہے کہ یہ امور محض زائد ہیں ورنہ اس کثرت موت میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مردے کو بغیر کفن

دیئے اور بلا نماز پڑھائے دفن کر دیا ہو۔ اور تیرہ دسواں بہت لوگوں کا نہیں ہوا۔ غرض یہ کہ

دین کے کاموں میں بھی عجیب عجیب طریقے ایجاد کئے ہیں جن سے مقصود دین میں کامیابی یعنی بھلا

(احسان التذییر ص ۱۹)

بارات کا ایجاد

(ج) اصل میں یہ برات وغیرہ ہندوؤں کی ایجاد ہے کہ پہلے زمانے میں

اس نہ تھا دہن کی حفاظت کے لئے ایک جماعت کی ضرورت تھی اور

اس وجہ سے فی گھر ایک آدمی لیا جاتا تھا کہ اگر اتفاق سے کوئی بات پیش آوے تو ایک گھر میں

ایک ہی بیوہ ہو۔ اور اب تو امن کا زمانہ ہے اب اس جماعت کی کیا ضرورت ہے اور اگر خوف

بھی ہو تو اس قدر پہنا کر کیوں لاؤ۔ اور اگر کہئے گا اس میں بھی مصلحت ہے تو اس کا کیا جواب

دو گے کہ بارات والے جاتے تو ہیں جمع ہو کر اور لوٹتے ہیں متفرق ہو کر اور اکثر دلہن اور کھار اکیلے رہ جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظت وغیرہ کچھ مقصود نہیں صرف رسم کو پورا کرنا اور نام آوری مد نظر ہوتی ہے اور شامت یہ کہ اکثر عصر کے وقت برات چلتی ہے اور لڑکی کے ماں باپ بھی ایسا غضب کرتے ہیں کہ اسی وقت رخصت کر دیتے ہیں شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اب ہماری چیز نرہی ورنہ حفاظت کی اب پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ زیب و زینت کی حالت میں ہے خدا جانے کیا بات پیش آوے۔

دین چھوڑنے کا انجام صاحبو! جب انسان دین چھوڑتا ہے تو عقل بھی رخصت ہو جاتی ہے لوگوں کا یہ عام خیال ہے کہ کنواری کی حفاظت کی زیادہ ضرورت ہے بیاہی ہوئی کی نگہبانی کی ضرورت نہیں۔ اور یہ خیال ہندوؤں سے ماخوذ ہے اس کا منشا یہ ہے کہ اگر کنواری سے کوئی بات ہو جائے تو اس میں بدنامی اور رسوائی ہوتی ہے اور بیاہی سے کوئی بات سرزد ہو تو بدنامی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے توشوہر ہے اسی کی طرف نسبت کی جائے گی مگر یہ خیال محض جہالت پر مبنی ہے اگر عقل سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کنواری کی حفاظت کی اتنی ضرورت نہیں جتنی بیاہی ہوئی کے لئے ضرورت ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ کنواری کو قدرتی طور پر بھی شرم و حجاب بہت ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ایک طبعی مانع موجود ہے اس کی زیادہ نگہبانی کی ضرورت نہیں اور بیاہی کا حجاب چونکہ کم ہو جاتا ہے اس کی طبیعت کھل جاتی ہے مانع طبعی اس کے ساتھ نہیں رہتا اس کی عفت و عصمت محفوظ رکھنے کے لئے بہت بڑی نگہبانی کی ضرورت ہے نیز کنواری کو علاوہ مانع طبعی کے خوفِ فضیحت بھی زیادہ ہوتا ہے اور بیاہی ہوئی کو اتنا خوف نہیں ہوتا۔ کنواری میں تو کوئی آڑ نہیں اور اس میں شوہر کی آڑ ہے اس کا فعل اس کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔ اس لئے بیاہی ہوئی کی طبیعت برے کاموں پر کنواری سے زیادہ مائل ہو سکتی ہے اس کی حفاظت کنواری سے زیادہ ہونی چاہیے مگر لوگوں نے اس کا الٹا کر رکھا ہے۔

عفت و عصمت کی حفاظت وجہ یہ ہے کہ اس کی پردہ آجکل نہیں کی جاتی کہ عصمت و عفت محفوظ رہے صرف اپنی بدنامی اور رسوائی کی پردہ کی جاتی ہے سو چونکہ کنواری میں بوجہ کوئی آڑ نہ ہونے کے بدنامی کا قوی اندیشہ ہے۔ اس کی نگہبانی تو کی جاتی ہے اور بیاہی ہوئی میں ایک آڑ موجود ہے اس لئے بدنامی کا خوف کم ہے

اس کی حفاظت کم کی جاتی ہے۔ اسی خیال کی بنا پر رخصت کے وقت ماں باپ کچھ خیال نہیں کرتے کہ یہ وقت مناسب ہے یا نہیں جب چاہیں برات کے ساتھ کر دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک تو حفاظت کا وقت کنواری تک تھا وہ اب ختم ہو چکا ہے چاہے راستے میں ڈاکو ہی مل جائیں بھلا لڑکے والوں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ان باتوں پر خیال کریں مگر لڑکی والوں کو تو سمجھ کر رخصت کرنا چاہیے۔ خرابیاں ہیں برات میں جن کی وجہ سے برات کو منع کیا جاتا ہے اور میں جو پہلے باتوں میں جایا کرتا تھا جب تک میری سمجھ میں خرابیاں نہ آئی تھیں اب میں ان رسوم کو بالکل حرام سمجھتا ہوں۔ اور اگر تنہا ہی سمجھیں نہ آویں تو اصلاحِ رسوم دیکھ لو ان ہی رسوم کے روکنے کی وجہ سے ایک گاؤں کا آدمی مجھ سے کہنے لگا کہ یوں سنا ہے کہ تمہارے مسئلے کڑے بہت ہیں۔ میں نے کہا مسئلے تو ایسے ہی ہونے چاہئیں جن میں احتیاط ہو تو حقیقت میں میرے مسئلے کڑے نہیں۔ مگر خدا نے میرے قلم سے بعض باتوں کی خرابیاں ظاہر کر دیں جو دوسروں نے ظاہر نہیں کیں۔ اس لئے مجھے لوگ سخت مشہور کرنے لگے۔

دلہن کی حفاظت غرض اگر دلہن کی حفاظت کے لئے برات ہی ہوتی ہے تو متفرق ہو کر کیوں لوٹتے ہیں حتیٰ کہ بعض دفعہ دلہن اور کھار اکیلے رہ جاتے ہیں اگر کوئی کہے کہ دولہا تو دلہن کے ساتھ ہوتا ہے تو وہی حضرت کون سے بہادر ہوتے ہیں کیونکہ آجکل رائے یہ ہے کہ شادی جلدی ہوئی چلیے کیونکہ اب عفت و دیانت طبائع میں نہیں رہی جو پہلے تھی اب زیادہ ضبط کی ہمت نہیں ہوتی۔ غرض آجکل دولہا صاحب کو خود حفاظت کی ضرورت ہے اگر کہیں چو ریڈا کو چلا آوے تو پہلے دولہا صاحب ڈولے میں گھسیں گے بعض دفعہ دولہا اور دلہن اور دو چار عزیزوں نے ایک گاؤں میں قیام کیا اور برات آگے چلی گئی۔ یہ لوگ حفاظت کے لئے تھے۔ لہذا اب برات کو چھوڑ دینا چاہیے۔

(دعواتِ عبدیت حصہ ششم وعظِ عضل الجاہلیت ص ۵۵)

۱۰۔ شوہر کے مرنے کے بعد شوہر والوں کا عورت

کے نکاح میں پناہ تو سمجھنا غلط ہے

بعض مسلمان قوموں میں یہ آذت ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد عورت میں شوہر والے اپنا حق

ہوا۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا یہ واپس آتے تو کہنے لگے کہ نکاح کی نیت سے نہیں کیا۔ ذرا بارٹھ لگا دی تاکہ کسی اور جگہ سے نکاح نہ کر سکے۔ مگر اس کم بخت نے بعد عدت کے پھر بھی نکاح نہیں کیا۔ اس پر لوگ شکایت کرتے ہیں کہ وہ آگئی ہے طاعون آگیا۔ جب لوگ اس طرح حلال کے پردے میں حرام کاری کریں تو طاعون کیوں نہ آئے۔ صابو! ع

ع از زنا افتد و با اندر جہاں

سو بعض لوگ تو زبان سے بھی نہیں کہلاتے اور بعض لوگ زبان سے گو کہلاتے ہیں مگر کچھ بھی اس پر تو ظلم ہوا۔ چونکہ یہ لوگ اپنے آپ کو مالک سمجھ کر کہلاتے ہیں دوسری خرابی اس میں یہ ہوتی کہ ماں باپ کو مالک نہیں سمجھتے حالانکہ خدا اور رسول کے بعد ماں باپ کا حق ہے عطا کا۔ (وعظ ایضاً ص ۵۸)

۱۸ - مایوں بھٹانے کی رسم ناجائز ہے

اپنی دلہن کو دیکھنے کے سال بھر تک منہ پر ہاتھ رہتے ہیں۔ شادی کے زمانے میں تو کہیں وہ اپنے منہ سے پانی تک بھی مانگ بیٹھے تو چاروں طرف سے غلج جائے کہ ہے ہے کسی بے حیائی کا زمانہ آگیا۔ بلکہ شادی کے پہلے ہی سے یہ مصیبتیں اس بے چاری پر آجاتی ہیں۔ اول سخت قریظینہ میں رکھی جاتی ہے جس کو آب کی اصطلاح میں مایوں بیٹھنا کہتے ہیں ایک کو ٹھری میں بند کر دی جاتی ہے جہاں ہوا تک اس کو نہیں پہنچتی۔ سارے گھر سے بولنا بند ہو جاتا ہے اپنی ضروریات تک میں دوسرے کی محتاج ہو جاتی ہے۔ اپنے آپ پاخانہ پیشاب کو نہیں جاسکتی۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا کہ ان رسموں کی بدولت دنیا کی ہزلیں بھگتیں۔ لیکن غضب یہ ہے کہ اس قریظینہ میں نماز تک نہیں پڑھتی۔ کیونکہ اپنے منہ سے پانی مانگ نہیں سکتی۔ اور اوپر والیوں کو اپنی ہی نماز کی پرواہ نہیں۔ اس کی کیا خبریں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ نماز جو کہ مرتے وقت بھی معاف نہیں چنانچہ کتاب میں لکھا ہے کہ ایک شخص کشتی میں سوار ہوا کشتی ٹوٹ جائے اور یہ شخص ڈوبے لگے اور وقت نماز کا آگیا ہو تو اس شخص کے ذمے واجب ہے کہ اسی غوطہ کرائے کی حالت میں نماز کی نیت باندھ لے پھر چاہے بچے چاہے ڈوبے۔ لے زنا کی وجہ سے جہاں میں و با و با پھیلتی ہے۔

سمجھتے ہیں یعنی ماں باپ اس کے مالک نہیں رہتے بلکہ دیور خسر مالک ہو جاتے ہیں بلکہ وہ عورت خود بھی اپنی مالک نہیں رہتی نہ وہ خود کہیں اپنا نکاح کر سکے نہ ماں باپ کر سکیں۔ بلکہ جہاں جیسٹ وغیرہ چاہیں وہاں ہوگا۔ مثلاً خسر تو چاہے کہ اپنے چھوٹے بیٹے سے نکاح کر دوں اور باپ چاہے کہ غیر جگہ کرے تو باپ کا کچھ زور نہ چلے گا اور تنہا یہ ہوتی ہے کہ ہو گھر سے باہر نہ جائے چنانچہ ایک عورت نے اپنی بہو کا نکاح ایک بچہ سے کر دیا۔ انسوس تو یہ ہے کہ عورتوں کی عقل پر تو پردہ ڈرایا تھا مردوں کی عقل بھی ماری گئی۔ ان کو بھی اس کا کچھ خیال نہیں ہوتا۔ اور اس کو اپنے نزدیک ملکی بات سمجھتے ہیں اس لئے میں نے اس وقت یہ آیت پڑھی۔ حسیل شاد ہے کہ ایسا دستور کہ عورتوں کو اس طرح سے اپنی ملک میں سمجھیں ناجائز ہے۔ فرماتے ہیں۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرْتَوُوا النِّسَاءَ كَرَهًا وَلَا تَفْضُلُوهُنَّ لَمَّا تَهَبُوا بَعْضُ مَا أَنْتُمْ مَوْحُونَ** **إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيَّنَةٍ وَعَاشِرُهُنَّ بِالْمَحْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَجَعَلَ اللَّهُ فِتْنَةً خَبِيرًا**۔ ترجمہ :- اے ایمان والو تم کو یہ بات حلال نہیں کہ عورتوں کے جبراً مالک ہو جاؤ اور ان کو اس غرض سے مفید مت کرو کہ جو کچھ تم لوگوں نے ان کو دیا ہے، اس میں کا کوئی حصہ وصول کر لو۔ مگر یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح ناشائستہ حرکت کریں اور ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ گزارا نہ کیا کرو۔ اور اگر وہ تم کو نا پسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم ایک شئی کو نا پسند کرو۔ اور اللہ تعالیٰ اس میں بڑی منفعت رکھ دے۔ یہ ہے اس کا ترجمہ، دیکھئے کہ قرآن میں اس رسم کو مٹایا گیا ہے یا نہیں اور گمراہی قید واقعی ہے احترازی نہیں کیونکہ عورتیں اس وراثت سے راضی بھی نہ ہوتی تھیں اگر وہ راضی ہوں تب بھی حرمہ کی ملکیت جائز نہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے تو اس کی زبان سے اذن نکاح کہلوا یا تھا تو یہ زبان سے کہلوانا بھی محض نام کرنے کو ہے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ بے پوچھے نکاح کر دیا۔ کیونکہ مسئلہ یہ ہے کہ بیوہ کا نکاح بدون زبان کے کہے۔ - جائز نہیں ہوتا۔ طیب خاطر کا اس میں خیال نہیں کیا جاتا۔

اور بعض مرتبہ بے پوچھے ہی نکاح کر دیتے ہیں۔ نالوثہ میں ایک بیوہ کا نکاح ہوا اور دیور بند رخصت ہوئی وہ راضی نہ ہوتی تھی تو اس کو جبراً رات کے ساتھ کر دیا اور کہہ دیا کہ وہاں لے جا کر اس کو راضی کر لینا۔ اور یہاں ایک نکاح عدت میں

زبردستی نکاح

دیکھئے نماز کی یہ ناکید ہے مگر اس قرطبیہ میں فضا کی جاتی ہے کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ باوجود ان منکرات کے یہ رسم جائز ہو سکتی ہیں۔ حاشا وکلا۔ دین سے قطع نظر عقل کے بھی تو یہ بات خلاف ہے کہ اس کو آدمی سے حیوان بلکہ جاننا دیا جائے اس کا کھانا پینا بند کیا جاتا ہے محض اس لئے کہ اگر کم کھانے کی عادت نہ ہوگی تو سسرال میں کھاو گی۔ پھر پاخانہ جاو گی۔ جو قانون جیسا کہ خلاف ہے حتیٰ کہ بہت جگہ یہ دیکھا گیا ہے کہ فاقے کرتے کرتے لڑکیاں بیمار ہو گئیں لاجلہ لا قوتہ الا باللہ۔ جب دین کو کوئی چھوڑتا ہے تو عقل بھی سلب ہو جاتی ہے شادی کی تقریبات کو کہاں تک بیان کر دوں۔ جس رسم کو چاہے دیکھ لیجئے وہ دین کے خلاف ہونے کے ساتھ عقل سے بھی خارج ثابت ہوگی (وعظ من ازغہ الہوی ص ۶۲ دعوات عبدیت حصہ ہفتم)

۱۹۔ چالیسویں غیر کا کھانا محض برادری کی خوشنودی کے لئے کیا جاتا ہے

برادری کا کھانا فقط اسی واسطے ہوتا ہے کہ یہ دیکھتے ہیں کہ فلا نے کیا کیا کھلایا تھا۔ عینی میں دیکھئے کہ زبان سے تو یہ کہا جاتا ہے کہ ثواب کے لئے کھانا کھلاتے ہیں مگر امتحان یہ ہے کہ اگر اس شخص سے خلوت میں یہ کہا جائے کہ قاعدہ یہ ہے کہ جس صورت میں زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس میں روپیہ دینے سے زیادہ ثواب ملتا ہے اور جن کی تم دعوت کرتے ہو یہ سب کھاتے پیئے عینی ہیں۔ تم یہ دعوت کا روپیہ فلاں مدرسہ میں فلاں مسجد میں دید و یا فلاں ابرودا غریب آدمی کو چیکے سے دید و اور اس کا ثواب میت کو بخش دے ثواب دیکھئے اس شخص کے دل پر کیا گذرتی ہے یہی کہے گا کہ سجان اللہ! روپیہ بھی خرچ ہوا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی تو بتلائیے کہ یہ صاف ریا ہے کہ نہیں معلوم ہوا کہ یہ سب دکھلا دے کے لئے کیا جاتا ہے۔ جب یہ حال ہے تو ثواب کہاں سے ہوگا۔ اور جب اس کو ثواب نہ ملا تو میت کو کیا بخشے گا۔ کیونکہ ثواب پہنچانے کا خلاصہ یہ ہے کہ تم نے ایک نیک کام کیا۔ اور جو ثواب اس کا تم کو ملا وہ تم نے کسی دوسرے کو بخش دیا۔ اور جب یہاں ہی صفر ہے تو وہاں کیا بخشو گے۔

ایک حکایت اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ رامپور کے ایک شخص کسی جھوٹے پیر سے مدد ہو گئے کچھ دنوں کے بعد کسی نے ان سے پوچھا۔ کہو پیر صاحب سے کیا فیض پہنچا۔ یہ سچے صاف آدمی کہا۔ جب پانی سفادہ ہی میں نہ ہو تو بدھنے میں کہاں سے آوے تو یہی صورت ہے ثواب ملنے کی۔ پہلے کرنے والے کو ملتا ہے پھر وہ دوسرے کو دیتا ہے تو جب اسی کو نہ ملا تو کیسی کو کیا دے گا گویا سارا روپیہ ضائع ہو گیا اور یہ تو سب دعوے ہی دعوے ہیں کہ ثواب کے لئے کھانا کھلاتے ہیں۔ صرف برادری سے شرمنا کر کیا جاتا ہے۔ اور لوگ اس کا زبان سے اقرار بھی کرتے ہیں۔

ایک گوجر کا واقعہ کہ ان میں ایک گوجر بار تھا۔ اس کا لڑکا حکیم صاحب کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ حکیم جی اس مرتبہ تو کسی طرح میرے باپ کو اچھا ہی کر دو مجھے اس بڈھے کے مرنے کا تو غم نہیں مگر آجکل چاندل بہت گراں ہیں برادری کو کھانا کھلانا تو مشکل ہوگا وہ بیچارہ تو سیدھا تھا۔ اس نے سچی بات کہدی۔ ہم با وضع ہیں زبان سے ظاہر نہیں کرتے مگر دل میں سب کے یہی ہے۔ یہ تو کھلانے والوں کی حالت ہے باقی کھانے والے وہ تو پورے ہی گجیا ہیں کہ ایسے غم میں بجائے ہمدردی کے اور الٹا اس پر بار ڈالتے ہیں

ایک رئیس زادہ کی حکایت اسی باب میں ایک صاحب حکایت بیان کرتے تھے کہ ضلع بلند شہر میں ایک رئیس کا انتقال ہو گیا چالیسویں دن رسم ادا کرنے کو ان کے تمام عزیز و قریب دوست، حباب، ہاتھی گھوڑے لیکر جمع ہوئے رئیس زادے نے سب کی خاطر مدارات کی عمدہ عمدہ کھانے پکوائے۔ جب کھانے کا وقت آیا اور تمام دسترخوان پر رنج ہو گئے اور سب کے آگے کھانے چن دیئے گئے۔ رئیس زادے نے کھڑے ہو کر تقریر کی کہ صاحبو! کھانے سے پہلے میری ایک بات سن لیجئے۔ پھر کھانا شروع کیجئے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو گ اس وقت کس لئے جمع ہوئے ہیں چونکہ مجھ پر ایک بڑا احاد نہ گذرا ہے کہ میرے والد صاحب کا سایہ میرے سر پر سے اٹھ گیا ہے اس لئے آپ لوگ میرے ساتھ ہمدردی کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں تو کیا ہمدردی اسی کا نام ہے کہ میں تو غم میں مبتلا ہوں اور اس کی وجہ سے نہ کھانے کا رہا نہ پیئے گا۔ اور آپ لوگ ستین چڑھا کر عمدہ عمدہ کھانے کھانے بیٹھ گئے۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ بس اب کھانا شروع کیجئے۔ بڑا ب کون کھاتا۔ تمام شرفاء مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ایک جگہ جمع ہو کر مشورہ کیا کہ واقعی یہ چالیسویں کی رسم

اٹھا دینے کے قابل ہے۔ چنانچہ سب نے متفق ہو کر اس رائے پر دستخط کر دیئے اور وہ تمام کھانا غریبوں کو تقسیم کر دیا گیا۔

حاصل کلام

حقیقت میں اگر غور کرو تو یہ سارے کھانے جو بادرسی کو کھلائے جاتے ہیں اسی قسم کے ہیں جن سے کھلانے والوں کو بخیر تکلیف کے اور کھانیوالوں کو بخیرے حیاتی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اب بھی لوگ مولویوں ہی کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ ایصالِ ثواب سے منہ کرتے ہیں۔ صاحبو! ایصالِ ثواب سے کوئی منہ نہیں کرتا۔ البتہ بے ڈھنگے پن سے منہ کیا جاتا ہے۔ دیکھو اگر کوئی قبلہ کی طرف پشت کر کے نماز پڑھے تو اس کو منہ کریں گے یا نہیں اگر شریعت کے موافق عمل ہو تو پھر دیکھو کون منہ کرتا ہے جس کی بڑی شرط یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ ہو یعنی ثواب کی نیت سے کیا جائے (دعظا) (الدين الخالص ص ۵۵)

۲۰۔ تبرکاتِ نبویؐ کی زیادت

(۱) تبرکاتِ نبویؐ میں ایک تو دی زیادتی کی جا رہی ہے جو اور بدعات میں ہے کہ اس کو لوگوں نے عید بنا رکھا ہے اس باب میں اکثر لوگ یہاں تک بعض طلباء بھی شک میں ہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے جبہ نبویؐ کی زیارت باعثِ برکت ہے اگر کوئی صرف زیارت کی نیت سے جائے تو کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ مجھ سے ایک طالب علم نے جن کا مکان جلال آباد میں ہے اور جبہ شریف کے مکان کے پاس ان کی دکان ہے سوال کیا کہ میں دکان پر بیٹھ کر جبہ کی زیارت کروں گا مگر میں نے اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ وہ مجھ بالکل سیلوں، عرسوں کی طرح ہوتا ہے۔ تاریخ کی تعیین ہوتی ہے دعوت ہوتی ہے دور سے آدمی آتے ہیں عورتوں کا اجتماع بھی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جو نماز بھی نہیں پڑھتے۔ زیارت کو آتے ہیں حالانکہ زیارت جبہ شریف کی فضیلت قبر شریف کے برابر نہیں ہو سکتی۔ حدیث: لَا تَتَخَذُوا قُبُورِي عِيدًا (میری قبر پر عید کا سا ہجوم نہ لگاؤ) سے اس کی نفی ہو گئی کیونکہ جبہ شریف کی فضیلت قبر شریف کے برابر نہیں ہو سکتی۔ گو اس میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مثلِ یومِ ولادت وغیرہ کے اس میں بھی تبدل ہو گیا۔ اگرچہ عدم تبدل کا یقین بھی نہیں۔ مگر خیر جو بات دل میں نہیں اس کو زبان پر بھی نہ لانا چاہئے مگر ایک دوسری بات مابہ الامتیاز یہاں بھی موجود ہے کہ اس وقت وہ ملبوس جسداہر سے

محاسن چھوڑا نہیں اور قبر شریف کو شرفِ ماس حاصل ہے اسی لئے جبہ نبویؐ کو کسی نے عرش سے افضل نہیں کہا۔ پس جب قبر کا عید بنانا حرام ہے تو ملبوس شریف کو عید بنانا کس طرح جائز ہوگا۔

موئے مبارک

کہیں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک اس وقت تک موجود ہیں عید بنانا ان کی بھی جائز نہیں کیونکہ اگرچہ بظاہر یہ خیال کر کے موئے مبارک جزو بدن ہے مگر قبر میں انصال اور ماس کی ایسی فضیلت موجود ہے جو موئے مبارک کو بالفعل حاصل نہیں۔ اس لئے دونوں خیر سادی ہوئے۔ موئے مبارک جزو بدن ہے مگر اب ماس نہیں اور قبر شریف جزو نہیں مگر ماس (ملا ہوا) ہے تو دونوں برابر ہوئے اور ایک سادی سے دوسرے سادی کا حکم معلوم ہو سکتا ہے پس حدیث لَا تَتَخَذُوا قُبُورِي عِيدًا سے موئے مبارک کو عید بنانا حرام ہو گیا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غایتِ بلاغت ہے کہ آپؐ نے قبر کو ذکر میں اختیار فرمایا۔ جس سے ملبوس اور شعر وغیرہ سب کے احکام خود بخود معلوم ہو گئے علاوہ ازیں صحابہ اور سلف صالحین نے عید منانے کو بھی اختیار نہیں کیا۔ حالانکہ ان کے پاس ہم سے زیادہ تبرکاتِ نبویہ موجود تھے اور ان کو ہم سے زیادہ ثواب کے کاموں میں سبقت تھی اگر یہ کوئی خیر ہوتی تو سلف میں اس کی کچھ تاوصل ہوتی اب صرف یہ سوال رہ گیا کہ صحابہ عید کی طرح اجتماع نہ تھا تو آخر تبرکات کے ساتھ ان کا برتاؤ کیسا تھا تو اس کے لئے میں نے چند احادیث ایک پرچہ پر لکھ لی ہیں کیونکہ ان کا بلفظ یاد رکھنا دشوار تھا۔

تبرکاتِ نبویؐ کے سلسلہ میں حدیثیں

اس وقت ان کو نقل کئے دیتا ہوں۔ عن عثمان بن عبد اللہ بن وہب قال نا رسلی اہلی الی ام سلمۃ بقدر من ماء وکان اذا اصاب الانسان عین او شیئ بعث الیہا مخضیت لہا فاخرجت من شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانت تمسکہ فی جابل من فضۃ فحضخت لہ فشرب منه قال فاطلعت فی الجابل فرأیت شعرات حمراء ، (رواہ البیہاقی) عثمان بن عبد اللہ بن وہب سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے گھر والوں نے حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ایک پیالہ پانی کا دیکر بھیجا اور قاعدہ تھا کہ جب کسی انسان کو نظر وغیرہ کی تکلیف ہو تو حضرت ام سلمہؓ کے پاس پانی کا پیالہ بھیج دیتا۔ ان کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال تھے جن کو انہوں نے

چاندی کی نلکی میں رکھ رکھا تھا۔ پانی میں ان بالوں کو بلا دیا کرتی تھیں اور وہ پانی بیمار کو بلا دیا جاتا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے جو جھک کر نلکی کو دیکھا تو اس میں چند سرخ بال تھے۔ اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ ایک صحابیہ کے پاس نلکی میں رکھے ہوئے تھے۔ جس کے ساتھ بیڑتا دیکھا جاتا تھا کہ بیڑوں کی شفا کے لئے اس کا غسلہ بلا دیا جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خضاب کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال بچنے لگے تھے۔ جس سے دیکھنے والوں کو خضاب کا شبہ ہوتا تھا۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خضاب نہیں کیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کل سفید بال قریب ۲۰ کے تھے یا کچھ زائد۔

جسبہ مبارک کا تذکرہ عن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا انہا اخرجت جبة طیالیسیة کسرة ایتة لیتة دیباج و فرجیہا مکفوفین بالدیباج و قالت هذه جبة رسول الله صلى الله عليه وسلم كانت عند عائشة فلما قبضت قبضتها۔ وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یلبس بها فنحن نغسلها للمرضی نستشفى بها۔ (رد الواعظ)

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک جبہ طلیسانی کسری نکالا جس کے گریبان اور دونوں چاک پر زینم کی سبھان لگی ہوئی تھی اور کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا ان کی وفات کے بعد میں نے اسے لے لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پہنا کرتے تھے ہم اس کو پانی میں دھو کر وہ پانی بیماروں کو پلا دیتے ہیں شفا حاصل کرنے کے لئے۔

موئے مبارک سے متعلق حدیث وعن انس قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتی منی فاتی الحجرة فرماها ثم اتی منزلة بمنی وضح منک۔ ثم دعا بالخلان وناول الخالق شقة الايمن فخلقه۔ ثم دعا بالطلحة الانصاری فاعطاها ایاہ ثم ناول الشق الايسر فقال اخلق فخلقه۔ فاعطاها اباطلحة فقال اقسم۔ بین الناس۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں عرفات سے منیٰ میں تشریف لائے تو حجرہ عقبہ کے پاس پہنچے اور اس کی رمی کی کچھ منیٰ میں جو مکان آپ کے لئے مقرر تھا اس میں تشریف لائے۔ اور قربانی کے جانوروں کو ذبح کیا۔ پھر حلاق (نائی) کو بلایا اور

اس کو سر کا داہنا حصہ دل دیا اس نے داہنے حصے کو مونڈا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کو بلایا اور وہ بال ان کو عطا کئے پھر نائی کو سر کا بایاں حصہ دیا۔ اور فرمایا مونڈو اس نے بائیں حصہ کو بھی مونڈا آپ نے وہ بال بھی ابوطلحہ انصاری کو دیئے اور فرمایا کہ اس کو لوگوں میں تقسیم کر دو۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت مقدار میں اپنے موئے مبارک صحابہ میں تقسیم فرمائے ہیں اور ظاہر ہے کہ صحابہ شرفاً و عزاً بانشہ ہو گئے تھے اور اگر کہیں موئے مبارک پایا جاوے تو جلدی سے اس کا انکار نہ کر دیا جائے بلکہ اگر سند صحیح سے اس کا پتہ معلوم ہو جائے تب تو اس کی تعظیم کی جائے ورنہ اگر یقینی دلیل افتراء و اختراع کی نہ ہو تو سکوت کیا جائے یعنی نہ تصدیق کی جاوے نہ تکذیب۔ مشتبہ امیں شریعت نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔

لباس مبارک وعن ام عطیة فی قصة غسل زینب بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم وتكفينها انها قالت فالتقي حقق نقال اشعرنها اياها فقال الشيخ في المعاني وهذا الحديث اصل في البركة باناس الصالحين ولباسهم۔

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا حضرت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل و کفن کے واقعہ میں روایت کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تمہ بند ہمارے پاس ڈال دیا کہ اس کو مومنہ کے بدن سے ماس کر کے پہناؤ۔ یعنی سب سے نیچے اس کو رکھو تا کہ اس کی برکت بدن سے متصل رہے۔ حضرت شیخ عبدالحق رحمہ اللہ لمعات شرح مشکوٰۃ میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث آثار و ملبوسات صالحین سے برکت لینے میں اصل ہے معلوم ہوا کہ تبرکات سے برکت حاصل کرنا ایک یہی طریقہ ہے کہ بعد موت کے اس کو کفن میں رکھ دیا جائے مگر اس سے قرآن اور دعاؤں کی کتابوں کا کفن میں رکھنا جائز نہ ہوگا کیونکہ اس میں ان کا احترام باطل ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن کے ساتھ ناپاکی کا اتصال حرام ہے۔ اور بدن میت چند روز کے بعد پھولے پھٹنے کا وہ نجاست قرآن کو بھی لگے گی۔ اسی طرح وہ کتابیں جن میں دعائیں اور اللہ رسول کا نام جا بجا ہے قابل احترام ہیں بلکہ الفاظ و حروف مطلقاً قابل احترام ہیں بلکہ سادہ کاغذ بھی بوجہ آکرم ہونے کے قابل احترام ہے۔ بعض لوگ فرعون و ہامان کا نام لکھ کر اس پر جوتے مارتے ہیں۔ یہ بالکل لغو و ہل حرکت ہے اس پر تو بس نہ چلا۔ الفاظ کی ہی بے حرمتی پر بہادری دکھائی مگر ان سب کے ساتھ ان کو عید نہ بنانا چاہیے کیونکہ سمجھتے کی بات ہے کہ ان چیزوں کی قدر کس لئے ہے۔ اسی لئے

تاکہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چیزیں ہیں پھر احکام بھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چیزیں ہیں۔ پھر احکام بھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چیزیں ہیں۔ ان کی بھی توقد رکھنی چاہئے ان میں بھی تو برکت ہے اس برکت کو بھی تو لینا چاہئے۔ غرض وہ جو سوال کیا گیا تھا کہ سلف صالحین کا تبرکات کے ساتھ کیسا برتاؤ تھا۔ ان روایتوں سے اس کا جواب معلوم ہو گا۔ انہی کے موافق ہم کو بھی عمل کرنا چاہئے اس سے زیادہ تعدی نہ کرنا چاہئے۔

تبرکات نبوی کیساتھ غلو

بعض لوگ یہاں تک غلو کرتے ہیں کہ جبہ شریف کے لئے نذریں مانتے ہیں، فقہاء نے اس کو حرام لکھا ہے۔ کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لئے نہیں ہو سکتی عبادت خالق جل و علی شانہ کے لئے خاص ہے۔ بجز اللہ میں اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ نذر ماننا مخلوق کے لئے سب کے نزدیک اتفاقاً حرام ہے نہ وہ نذر منعقد ہوگی اور نہ اس کا پورا کرنا ذمہ میں واجب ہو گا۔ اور وہ حرام بلکہ سخت حرام ہے مجاوروں کو اس کا کھانا لینا اور اس میں کسی قسم کا تصرف کرنا جائز نہیں۔ (وغظ الجبور ص ۲۱)

تبرکات کام نہیں آتے

(د) تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے۔ بدون ایمان کے سب بیکار ہیں چنانچہ دیکھ لو کہ ابن اُبی کے پاس کتنے تبرکات جمع ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قمیص مبارک اس کے کفن میں دیا۔ بھلا یہ بات کس کو نصیب ہوتی ہے آجکل کوئی بہت کر بگا غلان کعبہ کا ٹکڑا رکھ دیکھا مگر غلان کعبہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قمیص سے کیا نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر عرش و کعبہ سب سے افضل ہے اور اگر غلان کعبہ کو قمیص نبوی کے برابر مان بھی لیا جائے تو یہ دولت کس کو نصیب ہو سکتی ہے کہ حضور کا لعاب مبارک اس کے منہ میں پڑے۔ عبد اللہ بن ابی کے مرنے کے بعد آپ نے اپنا لعاب مبارک بھی اس کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ وہ تو آپ کا جزو تھا جس کی برکت لباس سے بھی زیادہ ہے۔ پھر آپ نے اس کے جنازے کی نماز پڑھی گویا اس کے دعا مغفرت فرمائی۔ بھلا یہ شرف آج کس کو نصیب ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر اس کے جنازہ کی نماز پڑھیں مگر باوجود ان تمام باتوں کے عبد اللہ بن ابی کو ان تبرکات سے کچھ بھی نفع نہ ہوا کیونکہ وہ ایمان سے محروم تھا جن تعالیٰ صاف فرما دیا۔ انہم کفروا باللہ و بر سولہ و ماتوا و ہم ناسقون۔

(الرفع والوضع ص ۳۲)

۲۱۔ رمضان شریف کے لئے نیک کاموں کا روکے رکھنا؟

بعض لوگ رمضان سے پہلے بعض نیک کاموں کو روکے رکھتے ہیں مثلاً کسی کی زکوٰۃ کا سال شبان میں پورا ہو گیا اب وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا رمضان کے انتظار میں روکے رکھتا ہے چاہے رمضان میں اس کو توفیق ہی نہ ہو۔ روپیہ چوری ہی ہو جائے یا رمضان کے انتظار میں محتاج کا قلیہ ہی ہو جائے یا در کھوشا راع کا اس ترغیب سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ رمضان کے انتظار میں نیک کاموں کو روک دیا جائے بلکہ شائع کا مقصود تاخیر عن رمضان سے روکنا ہے کہ اگر رمضان تک کسی کو توفیق نہ ہوئی ہو تو رمضان میں ہرگز دیر نہ کرے جو کرنا ہو کر ڈالے۔ تقدیم علی رمضان سے روکنا مقصود نہیں۔ وشتان سینہا۔ یعنی ان دونوں باتوں میں برفاق ہے مگر تم قسمی نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ لوگ رمضان میں خرچ کرنے کے لئے فضائل اور ثواب سن کر اس کے انتظار میں طاعات کو روکنے لگے خوب سمجھ لو کہ تعمیل فی الخیر میں خود بہت بڑا ثواب ہے اور وہ اتنا بڑا ثواب ہے کہ رمضان کے پہلے جو تم خرچ کر گئے تو گو اس میں کمابہ نسبت رمضان میں خرچ کرنے کے ثواب کم ہو مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کیا تم تقریباً الی اللہ وہ تعمیل بہتر ہے اور اس درجہ میں اس کا ثواب رمضان کے ثواب سے بڑھ جائے گا۔ مجھے کوئی تو اطمینان ہے جو میں شرح صدر کے ساتھ اس مضمون کو بیان کر رہا ہوں۔ بس قسم سے زیادہ اطمینان دلانے کا ذریعہ میرے پاس کوئی نہیں تمہیں کیا خبر ہے کہ شعبان میں اگر تم کو غریب کو زکوٰۃ دیدیے تو اس وقت اس کے دل کیسی دعا کل جاتی ہیں جس کے سامنے شہر رمضان میں بھی مسیح ہیں یہی بات لوگوں کو معلوم نہیں یا در کھو جب زکوٰۃ کا سال پورا ہو جائے اس کے بعد تاخیر کرنے میں فقہاء

نیک میں تاخیر نہیں کرنا چاہیے

کا اختلاف ہے کہ اس تاخیر سے گناہ ہوتا ہے یا نہیں۔ بعض وجوب علی الفور کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک تاخیر سے گناہ ہوتا ہے اور بعض وجوب علی التراخی کے قائل ہیں ان کے نزدیک گناہ نہیں ہوتا۔ بس احتیاط اسی میں ہے کہ وجوب کے بعد دیر نہ کرے تاکہ سب کے نزدیک گناہ سے محفوظ رہے۔ پھر اگر رمضان کے انتظار میں صدقات کا روکنا موجب ثواب ہوتا تو شریعت نے کہیں تو یہ کہہ دیا ہوتا کہ رمضان سے اتنے دن پہلے تمام صدقات کو روک دو جب

شریعت نے کہیں یہ نہیں کہا تو اب ہمارا ایسا کرنا زیادتی فی الدین اور بدعت ہے کہ جس کام کے لئے شریعت نے ثواب بیان نہیں کیا تم اس میں ثواب سمجھ کر کرتے ہو۔ یہ مقاومت و مقابلہ ہے حکم شرعی کی بجز چونکہ اب تک جہل میں مبتلا تھے علم نہیں تھا اس لئے اُمید ہے کہ گنہ گار نہیں ہوتے۔۔۔ ہوں گے ہاں اب جو لوگ ایسا کریں گے وہ گنہ گار ہوں گے، کیونکہ اب مطلع صاف ہو گیا۔ (تقلیل النمام ص ۲)

۲۲۔ عید میلاد النبی کی دلائل بعید سے تردید

جاننا چاہئے کہ عید میلاد النبی کے نام سے جو ایک رسم شائع ہوئی ہے اس کے متعلق دو کلام ہیں ایک تو اس کے نام شروع ہونے کے متعلق دلائل۔ دوسرے مخالفین کے دلائل کا جواب اس کے بعد سمجھئے کہ شریعت کے دلائل چار ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع، قیاس۔ انشاء اللہ چاروں سے گفتگو کی جاوے گی۔

میلاد کی تردید قرآن میں

اول کتاب اللہ کو لیجئے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ ام لَہُمْ شَہْرٌ کَاۡءُ شَہْرِہٖم مِّنَ الدِّیۡنِ مَا لَہُمْ بِاَیۡدِیۡہِ اللّٰہِ۔ یعنی کیا ان کے شرکار کے لئے ہیں کہ انھوں نے ان کے لئے دین کی وہ بات مقرر کر دی جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی؟ یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ دین کی بات بدون اذن الہی یعنی بدون دلیل شرعی کسی کو مقرر کرنا مذموم و مستنکر ہے۔ یہ تو کبریٰ ہے اور صغریٰ یہ ہے کہ عید میلاد النبی دین ہی کی بات سمجھ کر بلا دلیل مقرر کی گئی ہے اور دلیل نہ ہونا جزئیاً تو ظاہر ہے کہ یہ امر شریعت میں نہیں ہے، امر مستحدث ہے۔ اگر احتمال ہے تو اس کا ہے کہ کسی کلیہ میں داخل کرتے ہوں گے بمقتل گفتگو تو ان کلیات کی جبین یہ داخل ہو سکتی ہے آگے آوے گی۔ باقی محلاً یہ سمجھ لینا چاہئے کہ سبب داعی اس کا قدیم ہے خواہ وہ فرج ہو یا اظہار شوکت اسلام ہو کہ وہ بھی قدیم ہے بہر حال ان میں سے جو بھی سبب ہو۔ تو ہم یہ کہتے ہیں کہ جب کہ یہ سبب حضور و صحابہ و خیر القرون کے زمانہ میں موجود تھا اور وہ حضرات قرآن و حدیث کو خوب سمجھنے والے تھے اور ایسا سمجھتے تھے کہ اس کو دیکھ کر اب اجتہاد کو جائز نہیں رکھا گیا۔ پس جب مسلم ہو چکا کہ وہ کتاب سنت کو ہم سے زیادہ سمجھنے والے تھے اور یہ اسباب بھی اس وقت موجود تھے، یعنی اظہار فرج اور شوکت اسلام کی اس لئے برا۔ نہ مکروہ۔ نہ نیکار گناہوا۔

وقت بھی ضرورت تھی بلکہ اس وقت سے زیادہ ضرورت تھی مگر ان حضرات نے اس پر عمل نہیں کیا پس معلوم ہوا کہ کسی کلیہ میں اس کا داخل کرنا صحیح نہیں اور یہ بالکل مستحدث اور جدید ہے کہ جس کی کچھ اصل نہیں اور بدعت کی حقیقت یہی ہے کہ غیر دین کو دین سمجھ کر کیا جائے اور اس کو یہ لوگ دین سمجھتے ہیں پس یہ بدعت واجب التکرار ہیں یہ تو قرآن مجید سے اس کے متعلق کلام تھا۔

اب حدیث لیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ من احدث فی امرنا ہذا ما لیس منہ فہو کاذب۔ میں نے اس میں وہ شئی نکالے جو اس میں سے نہیں۔ پس وہ واجب الرد ہے۔ جو تقریر آیت کے ذیل میں کی گئی ہے وہی یہاں بھی ہے۔ اور مراد نئی شئی سے وہ ہے جس کا سبب قدیم اور پھر اس وقت تحول نہ ہوئی ہو۔ بانی سبب جدید ہو۔ اور نیز وہ تو قوت علی کسی مامور کی ہو۔ وہ مامور میں داخل ہو کر راجب ہے۔ اور دوسری حدیث لیجئے۔ مسلم کی روایت ہے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تختصموا الیلة الجمعة بقیام من بین الیالی ولا تختصموا یوم الجمعة بصیام من بین الایام الا ان یکون فی یوم بصریومہ احدکم یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب جمعہ کو اور راتوں میں سے شب بیداری کے ساتھ خاص مت کرو اور یوم جمعہ کو ایام میں سے روزہ کے ساتھ خاص مت کرو مگر یہ کہ اس دن میں کوئی تم میں سے پہلے سے روزہ رکھتا ہو۔ اس حدیث سے یہ قاعدہ کلیہ نکلا کہ جو شخص منقول نہ ہو وہ منہجی عمدہ ہے یہ دوسری بات ہے کہ جمعہ کے روزہ روزہ رکھنا کیسا ہے ہمارے علماء نے دوسری دلیل مستقل سے جواز کا حکم دیا ہے اور یہی کو عارضی کہہ لیں اس وجہ سے کہ روزہ رکھ کر وظائف جمعہ سے ضعیف نہ ہو جائے یہ فرعی گفتگو ہے۔ یہاں تو صرف اس قاعدہ کلیہ کا مستنبط کرنا مقصود ہے سو قاعدہ کی صحت میں مجوزین صوم جمعہ کو بھی کلام نہیں ہے غرض یہ قاعدہ کلیہ کو تخصیص غیر منقول دین کے اندر جائز نہیں صحیح ہے یہ تو کبریٰ ہے اب خاص یوم ولادت کی عید منانے کی تخصیص دیکھتے کہ یہ تخصیص کیسی ہے ظاہر ہے کہ منقول نہیں اور نہ تخصیص عادی ہے بلکہ اس کو دین کی بات سمجھتے ہیں چنانچہ اس کے تارک کو ملامت کرتے ہیں اور بدین سمجھتے ہیں۔ اگر تخصیص عادی ہوتی تو ملامت نہ کرتے اور نہ ان کو بدین جانتے جیسے کسی کو عادت مکمل پہننے کی ہو تو اس کے تارک کو ملامت نہیں کرتے۔ بہر حال اس کو دین سمجھتے ہیں۔ پس یہ تخصیص دین میں ہوئی اور غیر منقول ہے جس سے روکا گیا ہو۔

ہوئی۔ یعنی ہوا اور رکبئی اول آپکا ہے نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ تخصیص ناجائز ہے بلکہ اگر عزو کیا جائے تو مقیس علیہی یوم جمعہ سے بھی بڑھ کر ہے اس لئے کہ یوم جمعہ کے فضائل و احادیث میں صلۃ بھی وارد ہیں اور یوم ولادت کی کوئی فضیلت صلۃ وار نہیں۔ گو قواعدہ سے فی نفسہ یوم ولادت میں برکت اور فضیلت کے بھی مسلمان قائل ہیں ایسا کون ہوگا جو اس دن بلکہ اس ماہ کی برکت کے قائل نہ ہو چنانچہ سیوطی یاملاً علی تباری اس ماہ کی فضیلت میں فرماتے ہیں

هذا الشهر في الاسلام فضل
ربيع في ربيع في ربيع
اور میں اس پر اضافہ کر کے کہتا ہوں
ظہور فی ظہور فی ظہور
سدر فی سدر فی سدر

پس نفس برکت اور فضیلت کا انکار نہیں گفتگو
اس میں ہے کہ جسے جمعہ کے فضائل تصریحاً وارد
ہیں ایسے یوم ولادت کے نہیں پس جس کے فضائل مخصوص نہ ہوں اس کی تخصیص کیسے ناجائز نہیں ہوگی
بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یوم ولادت کی فضیلت بھی حدیث میں آئی ہے۔ چنانچہ کیا ہے کہ
حضور صلی اللہ علیہ وسلم دو شنبہ کے روز روزہ رکھا کرتے تھے کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ اس دن
روزہ کیوں رکھتے ہیں فرمایا ولدت يوم الاثنين یعنی میں پیر کے دن پیدا ہوا ہوں۔ تو اس کا جواب
انشاء اللہ مخالفین کے دلائل کے ذیل میں آئے گا۔

اور تیسری حدیث سنئے۔ نسائی نے روایت کیا ہے قال
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تجعلوا قبیری عیداً
وصلوا علی فان صلواتکم تبلغنی حیث کنتم۔

ترجمہ :- یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری قبر عید مت بناؤ۔ اور
مجھ پر روزہ نہ بچھو۔ کیونکہ تمہارا روزہ میرے پاس پہنچے گا جہاں کہیں تم ہو گے۔ اس حدیث میں غیر عید کو
عید بنانے کی بات تخصیص ممانعت ہے شاید اس میں کوئی شبہ کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر تو سب
جمع ہوتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ عید میں جیسے جمع ہوتے ہیں اسی طرح میری قبر پر مت جمع ہو۔ اور
عید میں اس طرح جمع ہوتے ہیں کہ اس کی تاریخ معین ہوتی ہے اور نیز اس میں تداعی یعنی اس کا
اہتمام ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو وہاں جمع ہونے کے لئے بلاتا ہے پس اس طرح جمع ہونی

ممانعت ہے اور اتفاقی اجتماع سے ممانعت نہیں ہے چنانچہ روضہ اقدس کی زیارت کے لئے جو جاتے
ہیں تو اس میں یہ دونوں امر نہیں ہیں اس کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں ہے بلکہ آگے پیچھے کیف مانتق
قائل جاتے ہیں اور زیارت کر کے چلتے ہیں اور نہ کچھ ہوتا ہے کہ سب کا اجتماع ضروری سمجھا جاتا ہو
بہر حال اس حدیث سے صلۃ ثابت ہونا ہے کہ قبر شریف پر بطور عید کے جمع ہونا ناجائز ہے پس
جس طرح عید کا فی ممنوع عنہ ہے اسی طرح عید زمانی بھی منہی عنہ ہوگی۔ اب رہی نکات کہ اس کے
بعد صلوات علی نان صلاۃ تکم تبلیغنی حیث کنتم۔ بڑھانے سے تو اجتماع کا عدم جواز بھی منہم ہوتا ہے جیسا
علت فان صلاۃ تکم ظاہر اس پر دال ہے سو شرانے مختلف توجہات اس کی کی ہیں میرے ذہن میں اب
سے اقرب توجہ اس کی یہ آتی ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس نہی لا تجعلوا میں اہل بدعات یہ عدد کر سکتے
تھے کہ ہم تو صلوٰۃ یعنی درود شریف پڑھنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر جمع ہوتے
ہیں اور صلوٰۃ مامور بہ ہے تو ہمارا اجتماع جائز ہوگا۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس شبہ کا جواب
دیتے ہیں اور اس احتمال کا استیصال فرماتے ہیں کہ درود شریف یہاں آنے پر موقوف نہیں ہے
جہاں کہیں تم ہو گے درود شریف میرے پاس پہنچتا ہے اس لئے یہ عذر غیر موجد ہے اور اس سے ایک
بہت بڑی بات مستنبط ہوتی ہے کہ صلوٰۃ جس کے بعض افراد مندوب اور بعض واجب اور بعض فرض
ہیں جب اس کے لئے عید کے طرز پر جمع ہونا جائز نہیں تو کسی اور عرض مخرع کے لئے جمع ہونا تو
کیسے جائز ہوگا لیکن اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خود زیارت کے لئے جانا بھی جائز نہیں اس لئے
کہ وہاں جو جاتے ہیں تو مقصود اصلی صلوٰۃ نہیں ہے بلکہ زیارت مقصود ہے اور وہ بدولت قبر حلیہ
مکن نہیں۔

چوتھی حدیث یہ ہے کہ عید کے روز کچھ ایسا کھیل رہی تھیں
اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے تھے حضرت عمر رضی
اللہ عنہ تشریف لائے انہوں نے لڑکیوں کو ڈانٹا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان لکلی قوم
عید او هذا عیدنا یعنی اسے عمر منع۔۔۔ نہ کر وہ قوم کی ایک عید ہوتی ہے
اور یہ ہماری عید ہے۔ اس حدیث میں علت ان کے کھیلنے کی اباحت کی یہ فرمائی کہ یہ ہماری عید
ہے۔ اس میں جواز لعب کو یوم عید ہونے سے معلل فرمایا گیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ
عید کے ساتھ خاص ہے سو اگر ہر شخص کو عید منانا جائز ہو تو ہر روز ایسا لعب جائز ہو جائیگا
نہ جس سے روکا گیا ہو۔

اور تخصیص منصوص باطل ہو جاوے گی جس سے مخترع کی ثابت ہوئی۔

عدم جواز پراجماع سے ثبوت

ہو جائیہ اجماع ہوتا ہے اس کے عدم جواز پر۔ چنانچہ فقہائے نابجا اس کے قاعدے سے استدلال کیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل کو ہمیشہ ترک کرنے سے استدلال کرتے تھے۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھی لیکن اس میں اذان اور کبیر نہیں تھی اسی طرح جس شیئی کو تمام امت نے ترک کر دیا ہو وہ واجب الزک ہے اسی بنا پر فقہائے صلوٰۃ عید میں بلا اذان و کبیر کہا ہے۔ پس اگر یہ قاعدہ مسلم نہ ہوتا تو آج سے ہی عید میں اذان اور کبیر کا بھی اضافہ کر دینا چاہئے۔ اور اگر مسلم ہے تو اس قاعدے سے اور کبیر بھی کام لو۔

ایک شبہ کا جواب

رہا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اصول فقہ کا قاعدہ مسلمہ ہے کہ اختلاف متاخر اتفاق مقدم کا رافع نہیں ہے یعنی جس امر پر تمام امت کا اتفاق زمان سابق میں متحقق ہو چکا ہو اب اس اتفاق کو بعد کا اختلاف نہ ٹھا دیگا پس جب تک تم لوگوں نے ایجاد نہیں کیا تھا اس وقت تک تو امت کا اس کے ترک پر اتفاق تھا اب وہ اتفاق مرتفع نہیں ہو سکتا۔ اس قاعدہ کی ایک جزئی اور ہے کہ علماء حنفیہ نے نماز خزانہ کا کلام طحاوی نہیں رکھا اور دلیل یہی لکھی ہے کہ صحابہؓ اور تابعینؒ سے ثابت نہیں۔ غرض یہ قاعدہ مسلم ہے کہ امت کا کسی امر کو ترک کرنا اس کے عدم حوازی دلیل ہے پس بفضلہ تعالیٰ اجماع امت سے بھی ثابت ہو گیا کہ یہ عید بدعت اور امر مخرع واجب الزک ہے۔

اب رہا قیاس تو قیاس کی دوئیں ہیں۔ ایک نو ذہ
قیاس جو مجتہد سے منقول ہو، اور ایک ذہ جو مجتہد سے

منقول نہیں اور یہ قاعدہ کہ غیر مجتہد کا قیاس مجتہد نہیں ہے ان واقعات میں ہے کہ جو مجتہدین کے زمانہ میں پائے گئے ہیں اور جو نئے واقعات پیش آویں ان میں قیاس غیر مجتہد کا معتبر ہے چنانچہ جس قدر نئی تجارتیں اور ایجادات اس زمانے میں ہوتی ہیں سب کا حکم قیاس سے ہی ثابت ہوتا ہے۔ مع ہذا غم خود قیاس نہیں کرتے اس لئے کہ ہم کو قیاس کرنے کی ضرورت تو جب تکھی جب کہ سلف کے کلام میں اس سے تعرض نہ ہوتا۔ اس لئے کہ ان حضرات کا قیاس ہمارے قیاس سے مقدم ہے اور ان کے

کلام میں اس سے تعریف ہے، چنانچہ تبعیہ الشیطان و صراط مستقیم میں بہت زور و شور سے اس امر پر گفتگو کی ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ کسی زمانہ یا مکان کو عید بنانا ممنوع ہے پس قیاس سے بھی اس عید کا ناجائز ہونا ثابت ہوا تو ہمارے دلائل کفے۔

اب موجدین کے دلائل اور ان کا جواب

میں نے اس احتمال سے کر دی ہے کہ شاید ان میں سے کبھی کوئی ان سے استدلال کرنے لگے ورنہ میں نے یہ دلائل ان سے منقول نہیں دیکھے بلکہ وہ تو اگر برسوں بھی کوشش کریں تو ان کو ایک دلیل بھی میسر نہ ہو اسی واسطے جی تو نہیں چاہتا تھا کہ ان کو دلائل دیئے جاویں لیکن صرف اس وجہ سے کہ کسی کو کوئی گنجائش نہ رہے اس لئے میں ان دلائل کو بھی معجول قتل کئے دیتا ہوں -

پہلا استدلال و اس کا جواب | اول آیت وہ ہے۔ قل بفضل اللہ ورحمۃ
فیذ لك فلیفحوا۔ سے استدلال کر سکتے ہیں

کہ اس آیت سے فرحت کامور بہ ہونا ثابت ہوا اور یہ عید بھی اظہار فرحت ہے۔ لہذا جائز ہے۔ جواب
ظاہر ہے کہ اس آیت سے فقط فرحت کا مامور بہ ہونا نکلا۔ اور گفتگو اس ہیئت خاص میں ہے لہذا اس
آیت سے اس کو کوئی سن نہیں اور اگر اس کلیہ میں اس کا داخل کرنا صحیح ہو تو فقہاء کے کتب فقہ میں جن
بدعات کو رد کیا ہے وہ کبھی کسی ایسے ہی کلیہ میں داخل ہو سکتی ہیں چاہئے کہ وہ کبھی جائز ہو جاویں مالائم
کتب فقہ جو مسلم علماء الفقیہ ہیں ان میں ان کی ممانعت مصرحاً مذکور ہے اور ان اہل نیغ کو ہمیشہ یہ
دھوکہ ہونا ہے اور یا تجاہل ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اور اہل حق کے قضیہ کا موضوع ایک ہی ہے
اسی بنا پر اہل حق پر اعتراض کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی مغالطہ ہے۔ ہم جس بات کو ناجائز کہتے ہیں
یہ وہ ہیئت خاصہ ہے اور جو فرحت آیت ”فلپ عوا“ سے ثابت ہوتی ہے وہ فرحت مطلقہ ہے۔

پس یہ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ فرحت کو منع کرتے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ بلکہ اگر غور سے کام لیا جاوے تو ہم اس فرحت پر زیادہ عمل کرتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ موجدین و توسل بھریں الجھرتہ خوش ہوتے ہیں۔ اور درمیان میں ان کی فرحت منقطع ہو جاتی ہے اور ہم ہر وقت خوش ہیں (اس لئے کہ اہل نسبت ایمان کی بشارت اور اس کے ذوق سے ہر وقت محجور رہتے ہیں) اور اہل حق میں ہی بہت سے افراد اس دولت سے مشرب ہیں۔ وَذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَهُوَ غَافِرٌ مَّا مَوْهِہٗ

کہا مرنی تفصیل (جامع) پس جو فرح کو منقطع کر دیں وہ آیت کے تارک ہیں ہم تو کسی وقت بھی

قطع نہیں کرتے پس ہم بفضلہ تعالیٰ آیت پر بھی بروقت عمل کرتے اور دلائل منع بدعات پر بھی عمل کرتے ہیں اہل بدعات کو دونوں امر نصیب نہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ فرح مامور بہ کے تین درجے ہیں۔ افراط، تفریط، اعتدال۔ تفریط تو یہ ہے کہ تحدید بالحد المملہ کہ دیں کہ فلاں وقت پر یہ فرح ہوگی جیسا محض خشک مزاجوں کے کلام سے ترشح ہو گیا ہے اور افراط یہ ہے کہ فرح کو جلدی کھیں مگر محدود و منظم سے تجاوز کریں۔ جیسا کہ اہل تجدید باجمیع المعجمہ کا طریق متعارف ہو گیا اور اعتدال ادا میں ہے پس نہ ہم محدود بلکہ قدیم ہیں والحمد للہ علی ذالک۔

دوسرا استدلال و اس کا جواب

اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خبر سنی تو خوشی میں اگر ایک باندی کو آزاد کر دیا اور اس پر عقوبت میں تخفیف ہو گئی۔ پس معلوم ہوا کہ ولادت پر فرح جائز ہے اور زوجہ برکت ہے۔ جواب اس کا بھی ظاہر ہے کہ ہم نفس فرحت کے منکر نہیں ہیں بلکہ اس پر ہر وقت عامل ہیں گفتگو اس ہیئت کذا یمید میں ہے۔

تیسرا استدلال کا جواب

تیسرا استدلال اس آیت سے ہو سکتا ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ **وَإِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنْزِلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ** (دالی قولہ) رَبَّنَا **أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِنْكَ**۔ یعنی یاد کرو اس وقت کو جب کہ خوار یوں نے کہا کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرمادیں۔ عیسیٰ کی اس دعا تک اے اللہ ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ وہ ہمارے لئے عید بن جائے ہمارے پہلوں کے لئے اور ہمارے پچھلوں کے لئے اور ایک نشانی قدرت کی ہو آپ کی طرف سے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ عطا نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور ہمارے اصول میں یہ طے ہو چکا ہے کہ امام سابقہ کے شرائع اگر حق تعالیٰ ہم پر نازل فرما کر ان پر انکار نہ فرمادیں تو وہ ہمارے لئے حجت ہیں، اور یہاں کوئی انکار نہیں پس معلوم ہوا کہ عطا نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ظاہر ہے کہ نعمت عظیمہ ہے پس آپ کی تاریخ ولادت کو عید بنانا جائز ہوگا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس امر پر انکار اسی جگہ ہو، جہاں وہ منقول ہے دیکھئے **وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ ط**

میں سجدہ تحیت منقول ہے اور سجدہ تحیت اور سجدہ عظیمی ہماری شریعت میں منسوخ ہو چکا لیکن یہاں پر اس پر انکار منقول نہیں۔ اس کے لئے دوسرے دلائل ہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جو آیت واقعہ ہم نے عید بنانے کی ممانعت میں اپنے دلائل میں بیان کی ہیں وہ اس پر انکار کے لئے کافی ہیں۔ یہ جواب تو اس تقدیر پر ہے جب کہ آیت کے معنی یہی ہوں جو مستدل نے بیان کئے ہیں ورنہ اس آیت سے یہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ نزول ماندہ کی تاریخ کو عید بنا دیں، اس لئے کہ تکنوں میں ضمیر ماندہ کی طرف راجح ہے پس اس سے یوم نزول ماندہ لینا مجاز ہوگا۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب تک حقیقی معنی بن سکیں مجاز کی طرف رجوع نہ کیا جاوے گا پس معنی یہ ہیں کہ لکوں ماندہ سرور الٰہی، یعنی وہ ماندہ ہمارے لئے سرور کا باعث ہو جاوے۔ عید کے معنی متعارف نہیں ہیں بلکہ عید کا اطلاق مطلق سرور پر بھی آتا ہے یہ کیا ضرور ہے کہ جہاں کہیں لفظ عید آوے اس سے عید میلاد النبی ہی مراد ہو جیسے حضرات شیعہ کے نزدیک جہاں کہیں م، ت، ع آئے اس سے عید کا جواز ہی نکال لیتے ہیں ان کے نزدیک جہاں گویا شیخ سعدی کے شعر

متع زہر گوشت یافتہ سے یہی متع نکلتا ہے۔ اور آیت، **رَبَّنَا آتِنَا مِن مَّنْ دُونِ هَذِهِ** ایسے ہی ان حضرات کے نزدیک جہاں کہیں ع، می، د، آوے اس سے عید میلاد النبی کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

چوتھا استدلال و اس کا جواب

چوتھا استدلال اس قصہ سے ہو سکتا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب آیت **الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ** نازل ہوئی تو ایک یہودی نے حضرت عمر سے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنا لیتے۔۔۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ آیت عید کے دن ہی نازل ہوتی ہے یعنی یوم جمعہ اور یوم عرفہ کو نازل ہوتی ہے اور ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن عباس نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے **نَزَلَتْ فِي يَوْمِ جُمُعَةٍ وَعَرَفَةٍ** یہ حدیث کا مضمون ہے تقریباً استدلال کی اس آیت سے یہ ہے کہ حضرت عمرو بن عباس رضی اللہ عنہما نے عید بنانے پر انکار نہیں فرمایا معلوم ہوا کہ عطا نعمت کی تاریخ کو عید بنانا جائز ہے اگرچہ یہ استدلال ان کو قیامت تک نہ سوجھتا۔ لیکن ہم نے تبرعاً نقل کیا ہے کہ ان کو اس میں بھی گناہش ہو سکتی ہے۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب تو یہی ہے کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ انکار نہیں کیا۔ تو یہ کیا ضرور ہے کہ انکار یہاں ہی منقول ہو۔ چنانچہ ہمارے فقہار نے تعریف یعنی یوم عرفہ جناح کے مشابہت سے جمع ہونے پر

انکار فرمایا ہے۔ یہ تو ضروری نہیں ہے کہ اسی مقام پر انکار کریں۔ نیز حضرت ابن عباسؓ نے تخصیص کی
لیس لینی کہا ہے حالانکہ وہ منقول بھی ہے مگر حضرت عادت کو عبادت سمجھنے سے انہوں نے یہ انکار
فرمایا تو غیر منقول کو قربت سمجھا۔ تو ان کے نزدیک زیادہ منکر ہوگا۔ اور حضرت عمرؓ کا انکار اجتماع
علی بنجرۃ احدیسیہ پر مشہور ہے۔ پس دونوں حضرات کا انکار ایسے امور پر ثابت ہو گیا۔ گو ہر مقام
پر انکار منقول نہ ہو۔ دوسرے جواب یہ ہے کہ وہ شخص مسلمان نہ تھا یہودی تھا۔ اس کا خاص طور پر الزامی
جواب دیا کہ ہمارے یہاں تو پہلے سے عید ہے بلکہ اس جواب سے خود معلوم ہوتا ہے کہ عید بنا ناجائز
نہیں۔ یعنی مطلب حضرت عمرؓ کا یہ ہے کہ ہماری شریعت میں جو نہ تسمیہ جائز نہیں ہے اس لئے
ایسے عوارض سے ہم کسی دن کو اپنی طرف سے عید نہیں بنا سکتے تھے۔ مگر خداے تعالیٰ نے
پہلے ہی سے اس یوم کو عید بنا دیا۔

پانچواں استدلال و اس کا جواب

پانچواں استدلال اس حدیث سے وہ
آکر سکتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے پر کے دن روزہ رکھا۔ کسی نے پوچھ پوچی تو یہ ارشاد فرمایا۔ ذالک المیثاق الذی لک
فنیہ۔ یعنی میں اس دن میں پیدا ہوا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یوم ولادت عبادت
اور قربت کا دن ہے اور قربت دوسرے ولادت قربت ہے لہذا یہ جائز ہے۔ اس کے بھی دو
جواب ہیں۔ اول تو یہ کہ تسمیہ نہیں کرتے کہ یوم ولادت ہونا علت روزہ رکھنے کی ہے اس لئے
دوسری حدیث میں اس کی علت یہ منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جعرات اور پر کو نالہ اعمال
پیش ہوتے ہیں تو میری چاہتا ہے کہ میرے اعمال روزے کی حالت میں پیش ہوں۔ اس سے صحت
معلوم ہوا کہ علت صوم کی غرض اعمال ہے۔ پس جب یہ علت ہوتی تو ولادت کا ذکر فرمانا محض حکمت
ہوگا اور مداحم کا علت ہوتی ہے۔ اب آپ لوگ جو دیگر قربات کو قیاس کرتے ہیں تو تم نے حکمت
حکمت کو اصل علت ٹھہرایا۔ حالانکہ حکمت کے ساتھ حکم دائر نہیں ہوتا۔ دوسرے جواب یہ ہے کہ ہم
تسمیہ کرنے میں اس کی علت حکم کی یہی ہے لیکن علت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ علت جو اپنے امور کے
ساتھ خاص ہو اور ایک وہ جس کا تعدیہ دوسری جگہ بھی ہو۔ اگر یہ علت متعدیہ ہے تو کیا وجہ ہے کہ
اس دن میں تلاوت قرآن اور اطعام طعام وغیرہا کیوں مقبول نہیں اور نیز مثل یوم الاثنین کہ
یوم ولادت ہے تاہم ولادت میں بھی کہ ۱۲ ربیع الاول ہے روزہ رکھنا چاہیے دوسرے یہ کہ
نعمتیں اور بھی ہیں مثلاً ہجرت، فتح مکہ، معراج وغیرہا۔ آپ نے ان کی علت سے کیوں کوئی عبادت نہ

فرمائی۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ علت اگر ہے تو عام ہے بلکہ اسی مقام کے ساتھ خاص ہے اور
اصل مدار روزہ رکھنے کا وحی ہے باقی حکمت کے طور پر ولادت کو ذکر فرمایا ورنہ دوسری نعمتوں کے دن
بھی روزہ تسمیہ چاہئے، اور اگر اس پر کہا جاوے کہ تخصیص یوم ولادت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل ہے
تمام نعمتوں کی۔ پس ولادت اور ہجرت وغیرہ میں یہ فرق ہے۔ اس فرق کی وجہ سے یہ تخصیص گئی
ہے تو ہم کہتے ہیں کہ محل اس کی بھی اصل ہے اس کو اصل ٹھہرایا چاہئے۔ پھر حیرت یہ ہے کہ یوم ولادت
دو شنبہ کے روز تو عید نہ کریں اور تالیخ ولادت یعنی ۱۲ ربیع الاول کو عید مناویں۔ یوم الاثنین میں
تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت بھی کی ہے اور تالیخ ولادت میں تو کچھ بھی منقول نہیں ہے پس اس
دلیل کا مقتضی تو یہ تھا کہ ہر ہر پر کو عید کیا کریں۔ غرض اس حدیث سے بھی مدعا موجودین کا ثابت
نہیں ہوتا۔ یہ تو ان حضرات کے نقلی دلائل تھے۔

عقلی لائق جواب

اب ہم اس باب میں عقلی گفتگو کرتے ہیں اس لئے کہ ان لوگوں میں بعض
عقلی پرست بھی ہیں اور وہ اس عید میں کچھ عقلی مصلحتیں پیش کیا کرتے
جو راجح ہیں ملک و قوم کی طرف۔ اس لئے ہم اس طرز پر بھی اس مسئلہ کو بیان کئے دیتے ہیں خانچاہیے
کہ جس قدر عبادت شائع علیہ السلام نے مقرر فرمائی ہیں۔ ان کے اسباب بھی مقرر فرمائے ہیں اور اس
اعتبار سے مامور بہ کی چند قسمیں نکلتی ہیں۔ اول تو یہ کہ سبب میں نکرا ہو جنی سبب بار بار پایا جاتا ہو سبب
کے مکرر ہونے سے سبب بھی مکرر پایا جاوے گا، مثلاً وقت صلوٰۃ کے لئے سبب ہے پس جب وقت
آوے گا صلوٰۃ بھی واجب ہوگی۔ اسی طرح صیام رمضان کے لئے شہود و شہر سبب ہے۔ جب شہود
شہر ہوگا صوم واجب ہوگا اور عید کے لئے نظر اور انھیہ کے لئے یوم انھیہ بھی اسی باب سے ہے۔ دوسری
بات یہ ہے کہ سبب بھی ایک اور سبب بھی ایک جیسے بیت اللہ شریف حج کے لئے۔ چونکہ سبب
ایک ہے اس لئے مامور بہ یعنی حج بھی عمر بھر میں ایک ہی فرض ہے۔ یہ دونوں قسمیں تو مدرک بالعقل
ہیں اسی لئے کہ عقل بھی اسی کو مقتضی ہے کہ سبب کے تکرار اور توحید سے سبب تکرار اور توحید ہو تیری
قسم یہ ہے کہ سبب ایک ہو اور سبب کے اندر تکرار ہو، جیسے حج کے طواف میں رمل کا سبب رارۃ
وقت سختی اب وہ ارارۃ قوت تو ہے نہیں اس لئے کہ نقصان کا یہ ہوا تھا کہ جب مدینہ طیبہ سے مسلمان
حج کے لئے مکہ معظمہ گئے تو مشرکین نے کہا تھا ان لوگوں کو شرب کے بخار نے ضعیف اور بودا کر دیا
ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ طواف میں رمل کریں یعنی شلنے ہلاتے

۱۔ ایک ہونا نہ مکرر ہونا نہ ایک ہونا۔

کی مشابہت تھی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک منفرہ ہو گیا اور فرمایا سبحان اللہ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے قوم موسیٰ علیہ السلام نے موسیٰ سے کہا تھا۔ اَجْعَلْ لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ۔ پس جب اس مشابہت کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا تو جس صورت میں ان کی پوری شکل بنائی جائے یہ تو بطریق اولیٰ ناجائز ہو گا یہ اس باب میں گفتگو تھی جو اختصار کیساتھ بیان کی گئی ہے غرض عقل سے نقل سے ہر طرح کجداشت ثابت ہو گیا کہ یہ عید منفرع ناجائز اور بدعت واجب ترک ہے خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو فرحت کا حکم ہوا ہے اور اس کی تجدید یا تجدید کا حکم نہیں بلکہ فرح دائم اور مستمر دائمی کا حکم ہے اس لئے کسی خاص دن کو اس کے لئے مخصوص نہ کریں اور ہر وقت اسی آیت پر عمل کریں (السورہ ص ۲۹)

۲۳۔ پختہ قبریں بنانا خلاف شرع اور اہل اللہ کے مذاق کے خلاف ہے

حضرت اولیاء اللہ کے مزارات اسی تعظیم کی وجہ سے بڑے عالی شان پختہ بنائے جاتے ہیں یہاں بھی شہادہی عظمت ہے مگر اس کا ظہور بری طرح ہو ا کیونکہ شرعاً تعظیم اولیاء کی یہ صورت حرام ہے اہل اللہ کی تعظیم کچھ اسی میں منحصر نہیں کہ ان کے مزارات پختہ بنائے جائیں وہ تو کچھ قبریں بھی دیسے ہی معظم و محترم ہیں جیسے کچھ قبریں بلکہ کچھ قبروں پر بوجہ موافقت سنت کہ انوار زیادہ ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ بختیار کاکیؒ کی قبر پر ایسی ہیست برستی ہے جو سلاطین کی قبروں پر خاک بھی نہیں اور اگر کسی کے آنکھیں ہوں تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ کچھ قبر پر جو انوار ہیں وہ پختہ قبر پر کیاں۔ اور اگر کسی کی آنکھیں بند ہوں تو وہ اس دلیل ہی سے سمجھ لے کہ اول تو انوار سنت کے ساتھ مخصوص ہیں اور پختہ مزارات تا مگر سب اور امراء اور سلاطین کے بنائے ہوئے ہیں بزرگوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ امراء اور سلاطین کی بنائی ہوئی چیزیں انوار کہاں؟ اور اہل اللہ کو اپنے بدن تک کی تو پر واہ نہیں ہوتی پھر یہ جو چلے قبروں کے پختہ و آراستہ بنانے کے ان میں کہاں سے آجائے ہیں۔ یقیناً یہ بزرگوں کا کام نہیں بلکہ سلاطین و امراء کے جو چلے ہیں انہیں کو ایسی باتیں سوچا کرتی ہیں جو سلاطین و دوسار دین

نہ گھڑت

ہوئے اگر طوطا ان کو قوت مسلمان کی مشاہدہ ہو۔ اب وہ سب تو ہے نہیں لیکن مامور یعنی دل فی الطواف بجا رہا باقی ہے۔ یہ امر غیر مد رک بالعقل ہے اور جو عمل خلاف قیاس ہوتا ہے اس کے لئے نقل اور وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ وہ تاریخ گذر گئی یا بار بار آتی ہے ظاہر ہے کہ وہ ختم ہوگئی کیونکہ اب جو ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ آتی ہے۔ وہ اس خاص یوم ولادت کی مثل ہوتی ہے نہ کہ عین اور یہ ظاہر ہے۔ پس مثل کے لئے وہی حکم ثابت ہونا کسی دلیل نقلی کا محتاج ہوگا بوجہ غیر مد رک بالعقل ہونے کے قیاس اس میں حجت نہیں ہوگا۔ لیکن یہاں پر شبہ ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوم الاثنین میں روزہ رکھنے کی وجہ ولدت فیه سے فرمائی ہے تو اس میں بھی یہ کلام ہو سکتا ہے کہ یوم ولادت تو گذر گیا ہے اب یہ اس کا مثل ہے اس کو حکم صل کا کیوں ہوا۔ جواب یہ ہے کہ یہ صوم تو خود منقول ہے اور آپ نے وحی سے روزہ رکھا ہے اس لئے اس پر قیاس نہیں ہو سکتا۔ اب ہم ترغاب ان حضرات کو بھی ایک لیل عقلی لکھ کر اور اس کا جواب دیکر مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ یہ مقابلہ ہے اہل کتاب کا کہ وہ ولادت مسیح علیہ السلام کے دن عید کرتے ہیں ہم مقابلہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت میں عید کرتے ہیں تاکہ اسلامی شوکت ظاہر ہو۔ جواب یہ ہے کہ یہ تو اس وقت کسی رجب میں صحیح ہو، ہمارے یہاں اظہار شوکت کے لئے کوئی شئی نہ ہو، ہمارے یہاں جمعہ عیدین سب اظہار ریشا اسلام کے لئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کا مقابلہ ہی کرنا مقصود ہے تو ان کے یہاں اور دنوں میں بھی عیدین اور میلے ہوتے ہیں تم کو بھی چاہیے کہ ہر ہر دن کے مقابلہ میں تم بھی عید کیا کرو۔ اسی طرح عاشورہ کے دن تفریہ داری بھی کیا کرو، تاکہ اہل تشیع کا مقابلہ ہو۔ چنانچہ بعض جاہل تحض مقابلہ کے لئے ایسا کرتے بھی ہیں اور جناب اگر یہی مصلحت ہے تو ہندوؤں کے یہاں ہولی یولی ہوتی ہے ان کے مقابلہ کے لئے ہولی دیوالی کیا کرو۔

ایک قصہ میں ایک قصہ بیان کرتا ہوں اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اصل اور قاعدہ آپ کا بالکل بے اصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے کفار نے ایک درخت بنا رکھا تھا اس پر پھینا لٹکائے تھے اور اس کا نام ذات الوطار رکھا تھا۔ بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اَجْعَلْ لَنَا ذَاتَ الْوَطَا "یعنی یا رسول اللہ ہمارے لئے کبھی آپ ایک ذات الوطار مقرر فرمادیتے یعنی کوئی ایسا درخت ہمارے لئے بھی آپ مقرر فرمادیتے کہ اس پر ہم پھینا اور کپڑے وغیرہ لٹکا دیا کریں۔ دیکھئے بظاہر اس میں کچھ جرح معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کسی درخت پر کپڑے یا پھینا لٹکا دینا ایک امر مباح ہے اس میں تشبیہ بھی کچھ نہیں لیکن صلوٰۃ ان

سے نا آشنا ہیں ان کو تو دوسری طرح کے منفق و مجور کے چوچلے سو جھٹے ہیں اور جن کو ذرا دین سے کچھ تعلق اور دینداروں سے کچھ محبت ہے ان کو پختہ مزار بنانے کے اور بدعات کے چوچلے سو جھٹے ہیں۔ جیسے ایک رئیس حضرت مولانا گنگوہیؒ کے واسطے ایک نہایت قیمتی خوشنما بھڑکدار پوشین لائے تھے کہ حضرت اس کو پہنا کر یں۔ مولانا نے اسے ایک اب صاحب کو دیدیا اور فرمایا کہ نواب صاحب اس کو آپ پہن لیجئے آپ کے کپڑوں پر یہ اچھی لگے گی کیونکہ آپ کا اور لباس بھی اس کے موافق قیمتی ہوگا۔ اور میں نے گھاڑھے دھوڑے اور اس کو پہن کر کیا اچھا لگوں گا پھر اس کی حفاظت کیڑے سے کون کریگا مجھے اتنی فرصت نہیں فضول اس کو رکھ کر کبھی ضائع کروں۔ غرض اہل اللہ جب اپنے بدن کے واسطے یہ جھکڑے پسند نہیں کرتے تو قبروں کے لئے ان خرافات کو کیسے پسند کریں گے پختہ مزارات اہل اللہ کے مذاق کے بالکل خلاف ہے۔ پھر یہ قبر کے وضع کے بھی خلاف ہے کیونکہ قبروں کی زیارت سے جو مقصود ہے وہ ان پختہ قبروں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

زیارت قبور کا منشا

زیارت قبور سے غرض ہے کہ موت یاد آئے اور دنیا کے زوال و فنا کا نقشہ سامنے آجائے تو یہ بات کچی اور شکستہ قبروں ہی سے حاصل ہو سکتی ہے شکستہ قبر سے دل پر اثر نہ ہوتا اور موت یاد آتی ہے۔ ان شاہی قبروں سے موت بھوڑا ہی یاد آتی ہے نہ زوال و فنا پیش نظر ہوتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ ایسی قبروں سے بزرگوں کی محبت و عظمت تو دل میں آتی ہے تو میں کہوں گا یہ محبت تعزیروں والی جیسی ہے کہ ان کو بدون تعزیر بنائے اور مرثیہ گائے شہداء پر رونا نہیں نا پسچی محبت و عظمت کو اس سا زو سامان کی ضرورت نہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضرت صحابہ کرامؓ کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت نہ تھی ان کو تو ایسی محبت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا پانی کبھی زمین پر نہ گرتا تھا بلکہ صحابہؓ اس کو ہاتھوں میں لے کر اپنے منہ اور آنکھوں پر ملتے تھے۔

صحابہ کا عمل

مگر اس ہمہ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر سجدہ نہیں بنائی بلکہ کچی ہی رکھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پختہ قبر بنانے سے منع فرمایا ہے پس محبت و عظمت نبویؐ کا تقاضا یہی تھا کہ قبر پختہ نہ بنائی جائے اور ظاہر ہے کہ اولیاء اللہ اپنی زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع پر جان و مال سے فدا تھے پس جس بات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی ہے اسی میں اولیاء اللہ کی بھی خوشی ہے اگر یہ کہا جائے کہ پختہ قبر بنانے میں اہل اللہ کے نشان کا بقاء ہے تو اس کے جواب میں اول تو میں یہ کہتا ہوں کہ خدا ان کو باقی رکھنے والا ہے تمہارے باقی رکھنے سے وہ باقی

رکھنے سے وہ باقی نہیں رہ سکتے۔ دیکھو بہت سی پختہ قبر والے مردے ایسے بھی ہیں جن کے نام سے کبھی کوئی آشنا نہیں تو کیا پختہ قبر ہی بنانا بقاء کا ذریعہ ہے ہرگز نہیں باقی اصل رکھنے والی چیز اہل اللہ کی ولایت اور ان کے کمالات معرفت و محبت ہیں پس وہ آپ کی بقاء کے محتاج نہیں۔ عارف فرماتے ہیں کہ ہرگز منیر و آشوب زندہ شد مشق ثبت است بر جریۃ عالم دوام ما۔

اور مولانا نیا فرماتے ہیں کہ

طبع فاتحہ از خلق ندایم نیاز

عشق من از پس من فاتحہ خواہم بابت

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ نشان باقی رکھنے کی یہ بھی صورت ہے کہ قبر کچی رکھو اور ہر سال اس کی لپیٹ کرتے رہو۔ مٹی ڈلو اتے رہو اور ایک عجیب تماشا ہے کہ یہ اہل دنیا کچی قبر اس بزرگ کی بنواتے ہیں جس کو اپنے دھم میں پورا متبع سنت نہیں سمجھتے اور جس کو متبع سنت سمجھتے ہیں اس کی قبر کچی ہی بناتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی قبر کچی ہے اور وہاں عورتیں بھی حاضر نہیں ہوتیں ان کے مجاہدوں سے میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا حضرت متبع شریعت بہت تھے اس لئے ان امور کو جائز نہیں رکھا گیا۔ گویا نود باللہ دوسرا دیدار اللہ متبع شریعت نہ تھے تو اس فعل سے اپنے بزرگوں پر ایک سخت الزام لگانا ہے کہ یہ متبع شریعت نہ تھے۔ سو اس وجہ سے بھی فیصل قابل ترک ہے۔

پختہ قبر ممنوع ہے

قبر پختہ بنانا شریعت میں ممنوع ہے اور اس کے ممنوع ہونے کی ایک اور حکمت پختہ قبر ممنوع ہے سمجھو وہ یہ کہ کچی قبر بنانے سے جو شریعت نے منع کیا ہے حقیقت میں یہ ہم پر بڑا احسان کیا کیوں کہ اگر ابتداء سے اس وقت تک سب قبریں پختہ ہی ہوتیں تو آدمیوں کو تو رہنے کے لئے جگہ بھی نہ ملتی نہ زراعت کے لئے زمین ملتی کیونکہ مردے اس قدر گھڑپھٹے ہیں کہ کوئی حصہ زمین کا مردوں سے خالی نہیں۔ بتلائیے اگر سب کی قبریں پختہ ہوتیں تو ہمارے لئے کہاں ٹھکانا ہوتا۔ پس قبروں کے اوپر دو منزلہ سر منزلہ مکان بناتے جو ایک پہاڑ سا ہو جاتا۔ اور کچی قبر میں تو یہ بات ہے کہ جب نشان مٹ گیا تو اب وہاں دوسری قبر بنا سکتے ہیں اور اگر زمین وقف نہ ہو تو اسپر اتنی مدت کے بعد زراعت بھی کر سکتے ہیں جس میں یہ یقین بھی ہو جلتے کہ مردہ کا جسم خاک خوردہ ہو گیا ہوگا۔ اور یہ بات کہ ہر جگہ فردے ہیں زندوں کی مردم شماری پر نظر کر کے سمجھیں اس کی ہے کہ جب ایک زمانے میں اتنے آدمی جمع ہیں تو اس چھ سات ہزار سال کی مدت میں کس قدر بے شمار ہوں گے اور ہر شخص کی قبر کے لئے کتنی جگہ ضروری ہوتی ہے تو زمین میں اتنی جگہ کہاں تھی اور اسی حساب پر نظر کر کے اہل سنت

یہ کہتے ہیں کہ اگر آج سب زندہ ہوتے تو اس زمین پر رہے کی جگہ نہ ملتی۔ غرض قبروں کے بچنے ہونے سے یہ تیگی ہوتی اور اب تو انہی کے دفن ہونے کی جگہیں سب بس رہے ہیں ان ہی کے مدفن بلکہ خود ان کے جسد کی مٹی سے مکان بنا رہے ہیں۔ برتن بنا رہے ہیں لیکن ہے کہ ہمارے گھروں کے گھرے، صراحی، پیالے ہمارے بزرگوں کی مٹی کے بنے ہوئے ہوں تو قبر کا بچنے بنانا ان مفاہد شیطانی ہے علاوہ اس کے موت تو مٹانے ہی کے واسطے ہے اس کے بعد بقا کا سامان کرنا ایک امر فضول ہے۔

قبروں سے فیض کا سوال | اس پر اگر کوئی کہے کہ قبروں سے فیض ہوتا ہے اس لئے قبروں کی بقا کی ضرورت ہے تو میں اس کے وقوع کا انکار نہیں کرتا۔ مگر اول تو وہ فیض معتبر نہیں کیونکہ قبروں سے جو فیض ہوتا ہے وہ ایسا نہیں جس سے تکمیل ہو سکے یا سلوک ملے ہو سکے بلکہ اس کا درجہ صرف اتنا ہے کہ صاحب نسبت کی نسبت کو اس کے کسی قدر قوت ہوجاتی ہے۔ غیر صاحب نسبت کو تو خاک بھی فیض نہیں ہوتا صرف صاحب نسبت کو اتنا فیض ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے نسبت کو قوت اور حالت میں زیادت ہوجاتی ہے مگر وہ بھی دیر پا نہیں ہوتی بلکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے تنور کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر کے لئے جسم میں حرارت پیدا ہوجاتی ہے کہ جہاں تنور سے ہے اور ہوائی اور وہ سب گرمی جاتی رہی اور زندہ مشائخ سے جو فیض ہوتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی مقوی دوا کھا کر قوت و حرارت حاصل ہوتی ہے کہ وہ تمام جسم میں پھیلتا ہوجاتی ہے پس صاحب نسبت کو اول تو قبر سے فیض لینے کی ضرورت نہیں۔ زندہ شیخ اس کے لئے قبروں سے زیادہ نافع ہے اور ضرورت بھی ہو تو صاحب نسبت کے لئے قبر کا بچنے ہونا ضروری نہیں وہ تو آثار سے معلوم کرے گا کہ یہاں کوئی صاحب کمال مدفون ہے پس یہ ذبح بھی کالعدم ہوگئی۔

(الفاظ القرآن ص ۵۶)

۲۴۔ رجب الاول کی مخصوص تاریخ میں میلاد کی ممانعت

رجب الاول کے مہینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے،

کیونکہ یہ مہینہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و تشریف آوری کا ہے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد تقاضہ کے ساتھ دل میں پیدا ہوتی اور ایک خاص تحریک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی ہوتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ منکرات منظم نہ ہوتے تو اس ماہ میں یہ حالت اور اس حالت میں آپ کا ذکر کرنا علامت محبت ہوتی مگر انوس ہے کہ منکرات کی وجہ سے اہل فتویٰ کو اس ذکر کی ہیئت مخصوصہ سے روکنے کی ضرورت ہوتی ورنہ یہ مسئلہ فی نفسہ اختلافی ہونے کے لائق نہ تھا مگر اہل فتویٰ کو روکنے کی ضرورت اس لئے ہوتی کہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ دفع مضرت جلب نفع۔۔۔ سے مقدم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت حاصل ہے اس لئے اس کی تبلیغ و جوہر کے درجے میں نہیں ہے صرف مستحب اور احب المستحبات ہے۔ اور منکرات سے بچنا واجب ہے تو اس حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنا اسی وقت مستحب ہو سکتا ہے جبکہ منکرات سے خالی ہو۔

اب اس میں صوفی کی اور علماء کی رائے مختلف ہے۔ صوفیہ صوفیاء اور علماء کے ذوق کافرق کہتے ہیں کہ فعل مستحب کو کسی حال میں ترک نہ کیا جائے اور منکرات کی اصلاح کی جائے۔ اور علماء کہتے ہیں کہ بعض احوال میں منکرات کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ خود بھی اس کو ترک نہ کیا جائے۔ اس لئے شیوخ منکرات کے وقت وہ اس مستحب ہی کے ترک کا امر کرتے ہیں۔ جس کے ساتھ منکرات کا انضمام ہوا ہے۔ اور اس بارہ میں رائے علماء کی مانجا دے گی کیونکہ صوفیہ تو اہل شوق ہیں۔ ان کو دوسروں کے انتظام کی پرواہ نہیں۔ یعنی جو صوفیہ کہ محض صوفی ہوں عالم محقق نہ ہوں اور علماء منتظم ہوتے ہیں اور منتظم کی رائے غیر منتظم سے مقدم ہوتی ہے۔

دو دنوں کی حالت کافرق ایک مثال سے صوفیاء اور علماء کے درمیان کافرق (ایک مثال سے) سمجھئے۔ مثلاً موسم و بایں اطباء کا اسپر اتفاق ہو گیا ہے کہ آج کل امرد دکھانا زیادہ مضر ہے۔ اس کے بعد ایک طبیب نے تو یہ کیا کہ امرد دکھانا نہیں چھوڑا بلکہ قلیل مقدار میں مصالحت کے ساتھ کھاتا رہا۔ اور ایک طبیب وہ ہے جس نے خود بھی امرد دکھانا چھوڑ دیا اس خیال سے کہ میں قلیل مقدار میں یا مصالحت کے ساتھ کھاؤنگا تو مجھے کھانا ہوا دیکھ کر دوسرے بھی کھائیں گے اور وہ ان امور کی رعایت نہ کریں گے جن کی میں رعایت کرتا ہوں بلکہ اندھا دھند کھائیں گے اور ہلاک ہوں گے اس لئے وہ بالکل ہی امرد دکھانا چھوڑ دیتا ہے دوسروں کو بھی علی الاطلاق منع کرتا ہے۔ بلکہ لوگوں کے ٹوکے پھینکو دیتا ہے اور دہلا دیتا ہے جس کی اس حالت کو دیکھ کر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو امرد سے رغبت نہیں۔ اور جو طبیب امرد دکھا رہا ہے یہ

ان کو امر و نہی بہت رغبت ہے۔ مگر جاننے والے جانے ہیں کہ رغبت تو اس کو ان کے برابر یا ان سے بھی زیادہ ہے مگر محض دوسروں کی رعایت سے ترک کر رہا ہے بتلائے ان دونوں میں سے کونسا طیب لائق اتباع ہے۔ یقیناً یہ دوسرا طیب زیادہ قابل اقتدار ہے۔ کیونکہ اس کی رائے انتظام پر مبنی ہے سب اسی کی رائے کو ترجیح دیں گے۔ بس یہی حال علماء و صوفیہ کا ہے۔ صوفیہ اپنے غلبہ شوق کا ضبط نہیں کرتے بلکہ مستحب کو برا کر کے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ اصلاح منکرات کا قصد کرتے ہیں اور علماء رشتہ طبعہ خشک نہ ہوں، انتظام کی وجہ سے اپنے شوق کو ضبط کر لیتے اور ظاہر میں اس مستحب ہی کو ترک کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ عوام بدون ترک مستحب کے منکرات کو ترک نہیں کر سکتے۔

صاحبو! کیا ہمارے دل میں یہ دیکھ کر لگدگی نہیں اٹھتی کہ ہر طرف مجلس مولد ہو رہی ہے۔ مگر محض انتظام عوام کی وجہ سے ہم اپنے شوق کو دبا کر بیٹھے رہتے ہیں۔ (نور اللکھ و صف)

حُبِّ رسول کا درجہ | منع کرتے ہیں۔ استغفر اللہ۔ ارے ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم و حب

رسولؐ تو ہمارے یہاں عین ایمان ہے۔ پھر بھلا عین ایمان سے بھی کوئی مسلمان منع کر سکتا ہے۔ بلکہ دراصل ہمارے علماء ان منکرات سے روکتے ہیں جو اس ذکر کے ساتھ عوام نے منظم کر رکھی ہیں۔ مگر چونکہ ان منکرات کی اصلاح اس ذکر کو باقی رکھ کر نہیں ہو سکتی۔ اور یہ ذکر خاص ایام میں واجب نہیں۔ اس لئے وہ منکرات کی اصلاح کے لئے قیود کے ساتھ ذکر ہی سے منع کرتے ہیں چنانچہ مجملہ ان منکرات کے ایک قیام بھی ہے جس میں عوام کے اعتقادات حدود و ضرع سے تجاوز ہیں۔ اس میں بھی بعض لوگ ہمارے علماء کو بدنام کرتے ہیں کہ قیام تو ذکر رسولؐ کی تعظیم کے لئے ہے۔ اور یہ مولوی حضورؐ کی تعظیم سے منع کرتے ہیں۔ اس کا جواب ایک مولوی صاحب نے خوب دیا کہ ہم ذکر رسولؐ کی تعظیم سے نہیں روکتے بلکہ ذکر اللہ کی تعظیم سے روکتے ہیں کیونکہ تم لوگ ذکر اللہ کے وقت قیام نہیں کرتے، پس اگر سارا ذکر مولد قیام ہی سے کر دو اور مابین بھی سارا ذکر کھڑے ہو کر سنیں۔ تو ہم اس قیام سے کبھی منع نہ کریں گے اور مرزا ہے کہ اس قسم کے اعتراضات مولویوں ہی پر رکھے جاتے ہیں صوفیوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا حالانکہ بعض دفعہ وہ مولویوں سے بھی زیادہ وحشت ناک حکم دے ہیں۔

واقعی خود (حب) باقی بالادہ | چنانچہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ایک شخص کی زبان سے مہر کے ساتھ لفظ اللہ نکل گیا۔ چونکہ وہ نقشبندی تھے جن کے یہاں ضبط احوال کی تاکید ہے یہاں تک کہ ذکر بھی نہی بتلاتے ہیں جہری نہیں بتلاتے۔ اس لئے

آپ نے فرمایا کہ نکال دو اس کو۔ ظاہر میں یہ حکم بہت وحشت ناک تھا کہ اللہ کے کہنے پر مجلس سے نکال دیا اگر کوئی مولوی ایسا کرتا تو اسی وقت کفر کا فتویٰ دیا جاتا کہ ذکر اللہ سے منع کرتے ہیں۔ مگر صوفیوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتا یہاں بڑی جلدی حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں کہ ذکر اللہ پر نہیں نکالا بلکہ عدم ضبط پر نکالا۔ اتنا ضبط بھی نہ ہو سکا اور معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کو قرآن سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس کو ضبط کی طاقت تھی باوجود طاقت ضبط کے پھر ضبط نہیں کیا۔ اور اگر واقعی حد ضبط سے نکل جاتا تو پھر ملامت نہ فرماتے۔ اسی کو شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں

و مادم شراب الم در کشند / و گر تلخ نیستند دم در کشند

تیسلم سرد در گریباں برند / چو طاقت نماند گریباں درند

اسی طرح مولوی بھی قیام تعظیمی کو منع نہیں کرتے بلکہ قیام بے تعظیمی سے روکتے ہیں، جس میں احکام شریعت کی مخالفت کی جاتی اور شریعت میں ایک جدت تراشی جاتی ہے لیکن وہ غریب دنیا میں بدنام ہیں۔ ان کے اقوال کی حقیقت سمجھنے کی کوئی بھی کوشش نہیں کرتا۔ مگر مولویوں کو شریعت کی مخالفت کے سامنے اپنی بدنامی کی بھی پرواہ نہیں چاہئے کوئی کچھ کہے ان کی بلا سے۔ ایک غازی پوری مولوی اٹا وہ میں مجھ سے کہنے لگے کہ جماعت دیوبند کے متقویٰ اور متقدس کی تمام دنیا مقصد ہے صرف ایک بات لوگوں کو کھٹکتی ہے کہ آپ حضرات قیام نہیں کرتے اگر آپ قیام کرنے لگیں تو تمام دنیا آپ کی غلام ہو جائے۔ میں نے کہا کہ وہ ہمارے آقا بن جائیں لیکن کبھی ہاں تو ہم قصداً نہیں کھا سکتے۔ اب چاہے دنیا مقصد ہو یا بے اعتقاد ہو۔ (ایضاً ص ۵۲)

۲۵۔ نماز پنجگانہ یا فجر و عصر کے بعد مل کر بلند آواز سے ذکر کرنا بدعت ہے۔

ہر نماز کے بعد یا فجر و عصر کے بعد سارے نمازی مل کر جہراً لا الہ الا اللہ کہتے ہیں اور اس کا سختی کے ساتھ التزام کرتے ہیں جالانکہ سب کے واسطے بزرگوں نے نہیں کہا تھا بلکہ خاص لوگوں کو بتلایا تھا مگر جاہلوں نے اس کو حکم عام ہی بنالیا اور التزام کر لیا۔ اسی واسطے علماء نے اس کو بدعت کہا۔ اب ان پر آوازے کسے جاتے ہیں کہ لو بھائی ذکر اللہ بھی بدعت ہو گیا۔ ہمارے علماء کی بھی مصیبت

ہے۔ ان سے بھی کوئی جماعت خوش نہیں۔ مگر محققین صوفیہ ان سے خوش ہیں وہ ان کی قدر کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شعلانی رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے محقق تصوفی ہیں فرماتے ہیں کہ کثرت شرع صوفیہ دقیق ہے جو عوام کی فہم سے بالا ہے اس لئے عوام کو بھی لازم ہے کہ علوم میں صوفیہ کا اتباع نہ کریں بلکہ علماء اور چھوڑ کا اتباع کریں کیونکہ یہ لوگ منظم ہیں۔

نظام شریعت بلکہ عالم علماء ہی کے اتباع سے قائم رہ سکتا ہے۔ ہمارے ماموں صاحب علماء کی مثال کہتے تھے کہ اگر علماء دنیا میں نہ ہوتے تو ہم تو سب لوگوں کو کافر ہی بنا دیتے۔ کیونکہ ہماری باتیں عوام کی فہم سے خارج ہیں نہ معلوم وہ کیا سے کیا سمجھتے اور ایمان کو برباد کر دیں۔ مولویوں کا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے مخلوق کا ایمان سنبھال رکھا ہے تو اے وہ صوفی جو مولویوں سے ناخوش ہے اور ان پر آوازے کس کرتے ہیں تو اس کا احسان مان کہ تو انہی کی بدولت چین سے بیٹھا ہوا اللہ اللہ کر رہا اور گوشہ یافت میں بیٹھا ہوا ہے۔ منظم پولیس کی قدر جب ہی ہوتی ہے جبکہ رات کو راحت سے پر کر سوتے ہوا پس یہ علماء منظم پولیس ہیں کہ مخلوق کے ایمان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر یہ اپنا کام چھوڑ دیں تو پھر صوفی صاحب کو حجرہ سے نکل کر یہ کام کرنا پڑتا اور سارا تصوف اور حال و حال رکھا رہ جاتا۔ کیونکہ اصلاح خلق کا کام فرض کفایہ ہے۔ اگر مولوی اس کو چھوڑ دیں تو پھر صوفیوں پر بلا بنتا فرض ہو جائے گا۔ پس تیری گٹھڑی کی خیر اسی وقت تک ہے جب تک کہ یہ منظم جماعت دنیا میں موجود ہے تم تو رات کو پڑ کر آرام کرتے ہو۔ اور آٹھ کھل گئی تو نماز اور ذکر میں مشغول ہو جاتے ہو۔

اور مولویوں کی یہ حالت ہے کہ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ رات کو مولانا اسماعیل شہید کا حال حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہمانوں کے پیر دبا کر تے تھے اور کوئی پوچھتا کون ہے تو فرما دیتے کہ میں ہوں سید صاحب کا نوکر، یہ سن کر ہمان خاموش ہو جاتے۔ بہت عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا اسماعیل صاحب پیر دبائے آیا کرتے ہیں۔

یہ تو پہلے بزرگوں کا قصہ ہے اور میں نے اپنے استاذ مولانا محمود حسن صاحب شیعہ الہند کا واقعہ کہ اس مرتبہ کی ایک حکایت اس سے بڑھ کر سنی ہے مجھے تو یہ حکایت سن کر پسینہ آگیا کہ حضرت نے اپنے کو کس درجہ مثلاً دیا تھا۔ وہ یہ کہ حضرت کے یہاں ایک ہمان آئے جن کے ساتھ ایک کافر بھی تھا، گرمی کی دوپہر میں جب ہمان سو رہے تو مولانا دبے پاؤں تشریف لائے اور اس ہندو کے پاؤں دبا کر شروع کئے، راوی کا بیان ہے کہ اس وقت میں اتفاق سے جاگ رہا تھا میں گھبرا کر ہونچا اور عرض کیا کہ حضرت آپ یہ کیا کر رہے ہیں، فرمایا یہ چارہ تھکا ماندہ ہے۔

اس کی ٹھکن اتار رہا ہوں۔ میں نے کہا حضرت پھر میں دباؤں گا آپ اللہ سٹ جائیں فرمایا نہیں تم تو خود تھکے ہوئے ہو اور ہمان بھی ہو۔ بس تم پڑ رہو۔ غرض نہ معلوم کتنی دیر تک اس کافر کے پیر دبائے اور وہ بے ہوش پڑا سو تار رہا۔ کیونکہ کافروں کی آنکھ تو مرنے ہی پر کھل گئی جب عذاب کے فرشتے نظر آئیں گے یہ تو بیداری میں بھی سوتے ہی۔۔۔ ہیں۔ اور مولانا پر غلبہ حال تھا کہ منتہی ہو کر ایسا کام کیا۔ بھلا آج کل کسی صوفی نے بھی ایسا کیا ہے ہم نے تو کسی کو بھی نہیں سنا۔ پھر وہ کس منہ سے علماء پر آوازے کسے ہیں۔ (الرحمنۃ المرغوبہ ص ۲)

۲۶۔ سجادہ نشینی محل میراث نہیں بلکہ محض رسم ہے۔

آج کل سجادہ نشینی بھی میراث ہو گئی ہے چاہے گدی پر گدھے ہی بیٹھیں اور ناٹا ہے کہ کبھی تو مشائخ مریدوں کے سر پر خلافت کی چوڑی باندھتے تھے، آج کل مرید مشائخ کو خلافت کی چوڑی دیتے ہیں کہ جہاں پیر کا انتقال ہوا۔ اور مریدوں نے اس کے بیٹے کو گدی پر بیٹھا کہ خلافت کی دستار دیدی بس اب وہ سب کے پیر ہو گئے۔ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس گدی نشینی کی رسم کو بالکل مٹا دیا۔ چنانچہ حاجی صاحب کی گدی پر کوئی نہیں ہے بلکہ ان کی گدی ایک گنگوہ میں تھی ایک دیوبند میں تھی (یعنی مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ) اور ایک کہیں، ایک کہیں، میں کہتا ہوں کہ اس میں زیادہ شان ہے کہ ایک شخص کی گدیاں جا بجا ہوں۔ یہ کچھ نہیں کہ ایک ہی گدی ہو۔ سو خوب سمجھ لو کہ یہ چیزیں میراث کا محل نہیں۔ مجھ سے میرے قصبہ والوں نے ایک بار جمعہ کی مستقل امامت قبول کرنے کے حکیم الامتہ کا ایک واقعہ لے۔۔۔۔۔ کہا تھا تو میں نے چند شرطوں کے بعد قبول کیا تھا۔ ایک یہ کہ امامت۔۔۔۔۔ میرا حق نہ ہوگی دوسرے میں پابند نہ ہوں گا۔ جب چاہوں گا چھوڑ دوں گا۔ اس کے بعد میں نے اعلان کر دیا کہ میں لوگوں کے اصرار سے امامت کرتا ہوں اور صفات کہتا ہوں کہ میرا حق نہ ہوگا۔ نہ اس میں وراثت چلے گی۔ جس وقت کسی ایک شخص کو بھی میری امامت ناگوار ہو۔ چاہے وہ جولاہا یا قصائی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ڈاک میں ایک کارڈ پڑا تا لکھ کر میرے نام ڈال دے کہ ہم کو تیری امامت ناگوار ہے پس قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک جولاہا بھی منع کر دے گا تو میں اسی روز سے امامت چھوڑ دوں گا یہ انتظام کر کے پھر میں نے امامت کی کیونکہ اب وراثت کا خطرہ نہ رہا تھا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد میں نے خود ہی چھوڑ دی۔

گدی نشینی عرض اجمل امامت کی طرح گدی نشینی بھی میراث ہوگئی ہے اور بعض لوگ ایسی گدی کی تعظیم کرتے ہیں۔ بس یوں سمجھتے ہیں کہ اسی میں سب کچھ ہے یہ سب رسم پرستی ہے۔ ان لوگوں میں ایک اور رسم دیجی گئی کہ گدی نشینی کے بعد خانقاہ سے باہر نہیں نکلتے۔ میں بھاگلپور گیا تو ایک مجاہد نشین کے بابت سنا کہ وہ چالیس سال سے خانقاہ سے علیحدہ نہیں ہوئے اور ان کے مرید اس بات کو فخر کے طور پر بیان کرتے تھے۔ میں نے کہا یادہ تورات ہیں، مرد تو وہ ہے خوش شیر رہنے لے پھرے، ایک جگہ جم کر بیٹھ جانا مردانہ نہیں، البتہ کوئی معذور ہو یا کوئی ضروری مصلحت مقتضی ہو تو اور بات ہے۔ پھر اس التزام کے بعد اگر سجاد نشین صاحب کی کبھی کسی عدالت میں طلبی ہوگی تو اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ کسی طرح سجادہ صاحب کو حاضری عدالت سے مستثنیٰ کرا لیا جائے۔ کیونکہ اجمل کے مشائخ عدالت کی حاضری کو کبھی عیب سمجھتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں عیب یا ذلت کی کیا بات ہے۔

حضرت تھانویؒ کا ایک واقعہ کہ انہوں میں ایک مقدمہ چل رہا تھا۔ کسی طرح طے ہی نہ ہوتا تھا۔ حاکم نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ تم کسی کو حکم بنا کر فیصلہ کرا لو، پھر اس فیصلہ کو عدالت کی طرف سے نافذ کر دیا جائے گا۔ فریقین حکم بنانے پر راضی ہو گئے۔ اس کے بعد عدالت کی طرف سے کئی عمار کا نام لیا گیا مگر کسی پر دونوں فریق کا اتفاق نہ ہوا پھر میرا نام لیا گیا تو دونوں راضی ہو گئے۔ بالآخر میرے نام کن آیا اور مجھے شہادت کے لئے عدالت میں بلا لیا گیا تو اس وقت بعض دوستوں کا خیال تھا کہ عدالت میں جانا ذلت ہے۔ میں نے کہا اس میں ذلت کی کیا بات ہے بلکہ یہ تو عزت کی بات ہے کہ ہماری شہادت پر ایک مقدمہ کا فیصلہ ہوگا۔ چنانچہ میں گیا اور میرا بیان ہوا۔ اور میری..... شہادت پر اٹھارہ سال کا مقدمہ طے ہو گیا۔ اسی طرح ایک دفعہ میں بریلی گیا تو وہاں کے جنٹ نے مجھ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا کیونکہ ان کو اہل علم سے ملنے کا شوق تھا۔ اس وقت بھی بعض دوستوں کی یہ رائے تھی کہ جنٹ صاحب مکان پر آئیں، اس میں عزت ہے اور خود جلنے میں ذلت ہے مگر میں نے سوچا کہ اگر وہ یہاں آیا تو ہم کو اس کی تعظیم و استقبال کرنا پڑے گا اور اگر اس جاؤں گا تو وہ میری تعظیم و استقبال کریں گے پھر میں خود گیا اور جنٹ نے نہایت عزت سے تعظیم و استقبال کیا۔ یہ جواب تو دوستوں کے مذاق پر تھا ورنہ اصل بات یہ ہے کہ خدا نے ان کو حکومت دی ہے ہمارے اوپر حاکم بنایا ہے مجھے شرم آتی ہے کہ حاکم کو محکوم بناؤں اور اس کو اپنے یہاں بلاؤں جب خدا نے ایک شخص کو ہم پر حاکم بنایا ہے تو ادب و محبت کا مقتضی یہ ہے کہ ہم اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو محکوم کو حاکم کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اس لئے جب کوئی حاکم مجھ سے ملنا چاہتا ہے تو میں خود جانا پسند کرتا ہوں۔ مگر آج کل رسم کا غلبہ ہے لوگ

اس کو ذلت سمجھتے ہیں۔

ایک حکایت

اصل مضمون گدی نشینی اور فضائیں میراث ملنے کے متعلق تھا۔ ایک خرابی یہ ہے کہ ہندو ریاست میں ایک مقام پر کوئی قاضی صاحب ایک بننے کے مقروض ہو گئے اس نے ناش کر دی جہاں قاضی صاحب کی زمین فرق ہوئی۔ وہاں خطابت کی آمدنی بھی فرق ہوئی، کیونکہ عید بقرعید کو قاضی صاحب کی آمدنی ہوتی تھی۔ راوی کہتے تھے کہ انہوں نے ایک سال دیکھا کہ سب لوگ کپڑے بدل کر عید گاہ میں پہنچتے رہے اور امام صاحب کے منتظر ہیں تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک لالہ صاحب دھوٹی باندھے آ رہے ہیں۔ اس کے آتے ہی لوگوں میں شور ہوا کہ امام صاحب آ گئے ہیں بڑا حیران ہوا کہ یا اللہ یہ کیسا امام ہے۔ کیا بنیاد عید کی نماز پڑھا ہے گا۔ اب وہ بنیا اگر سلام کر کے ممبر پر کھڑا ہو گیا اور کہا: اب تو اجازت ہے، لوگوں نے کہا جی ہاں اجازت ہے اس کے بعد اس نے کپڑا بچھا دیا اور لوگوں نے روپیہ پیسہ ڈالنا شروع کیا، جب سب دے چکے تو اس نے رقم کو جڑا۔ اور یہی میں سمجھ لیا کہ اس سال عید کو اتنی آمدنی ہوئی۔ پوئلہ باندھ کر گردن پر رکھا اور کہا صاحبو! اجازت ہے لوگوں نے کہا اجازت ہے وہ سلام کر کے اپنے گھر کو چل دیا اور اس کے بعد لوگ بھی اپنے گھر چلے گئے نہ نماز تھی نہ خطبہ۔ انہوں نے پوچھا کہ میاں کیا عید کی نماز نہ ہوگی تب لوگوں نے قصہ بیان کیا کہ امام صاحب اس بننے کے مقروض ہیں عیدین کی آمدنی بھی اس نے فرق کر لی ہے اس لئے امام صاحب کئی سال سے نہیں آتے ہم لوگ بدستور آجاتے ہیں اور یہ بنیا آمدنی لے جاتا ہے کئی سال سے نماز نہیں ہوتی۔ یہ نتیجہ ہے امامت اور قضاء کی مورد وثیت کا کہ ہندو بھی اس کی آمدنی فرق کرانے لگے۔ ایک خرابی اس مورد وثیت میں یہ ہے کہ بزرگوں کے نام کی آمدنی بڑی بھڑووں میں صرف ہوتی ہے ہزاروں اوقات اجمل برباد ہو رہے ہیں کیونکہ بزرگوں کی خانقاہوں کے لئے جو آمدنی وقف تھی اس گدی نشینی کی وجہ سے ان کی اولاد ہی اس کی متولی ہوتی ہے خواہ وہ لائق ہوں یا نالائق۔ پھر تولیت سے گذر کر ملکیت کا دعویٰ ہونے لگا۔ اسی طرح ہزاروں اذناف برباد ہو گئے۔

(اصلاح ذات البین ص ۵۹)

۲۷۔ عید گاہ میں بچوں کے لانے کی ممانعت

عید گاہ میں باوجود کسی مفسدہ کے اس میں جمع ہونا ترک نہ کریں گے بلکہ اس میں جو مفسدہ بچوں کے اجتماع سے ہے اس کی اصلاح کریں گے اور ہم خود کیا اصلاح کریں گے ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی اصلاح فرما گئے ہیں۔ ارشاد ہے جب نو مسجدیں صلیب تک، کہ اپنی مسجدوں سے اپنے بچوں کو علیحدہ رکھو، لیکن ممکن ہے کہ کوئی صاحب عید گاہ کو مسجد میں داخل نہ کریں اس لئے استدلال مذکور کو کافی نہ سمجھیں تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ مسجد کے اندر داخل ہونا یا تو اس کو عام لیا جاوے کہ مطلق مقام صلوٰۃ مراد ہے تب تو عید گاہ کا اس حکم میں داخل ہونا ظاہر ہے۔ اگر اس کو عام نہ لیا جاوے تو گوان الفاظ میں عید گاہ داخل نہ ہوگی لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ آخر علت اس حکم کی کیا ہے سو ظاہر ہے کہ علت اس حکم کی یہی ہے کہ چونکہ بچے پاک صاف نہیں ہوتے ان کی آمد و رفت سے ایسی جگہ ملوث ہونے کا اندیشہ ہے جہاں نماز ہوگی اور اس سے نماز میں خلل پڑیگا اور یہ علت جیسے کہ مسجد میں پائی جاتی ہے عید گاہ میں بھی پائی جاتی ہے لہذا وہاں بھی یہ حکم جاری ہوگا چنانچہ خود عید گاہ کے باب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ولتعتزلن الحیض المصلی پس اس مثال سے سمجھیں آگیا ہوگا کہ وہ مکہ اس وقت ہے جب کہ وہ امر مطلوب نہ ہو ورنہ مفسدہ کی اصلاح کریں گے اور اس کام کو ترک نہ کریں گے۔ (دعظ اکمال الصوم والعید ص ۱)

۲۸۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں ایسا مبالغہ کہ جس سے دیگر انبیاء علیہم السلام کی توہین ہو جائز نہیں،

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کی کوکھ میں انگلی چبھادی تھی انہوں نے کہا کہ میں تو بدل لوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً فرمایا کہ بدلے لو اور اپنی کوکھ ان کے سامنے کر دی انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا بدن تو کھلا تھا اور آپ تو کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً کرتا اٹھا دیا وہ صحابی آپ کے پہلوئے مبارک سے چھٹ گئے اور بوسے دینے لگے اور

عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرا تو یہ مقصود تھا۔ لوگوں نے وفات نامہ میں حضرت عکاسہ کی حکایت گھڑی ہے وہ صحیح نہیں۔ صحیح حکایت یہ ہے جو میں نے اس وقت بیان کی ہے۔

ہمارے اطراف میں جتنی کتابیں عورتوں میں رائج ہیں سب گھڑی ہوئی ہیں جیسے غلط کتابیں | سائین نامہ، معجزہ آل نبی، وفات نامہ، نور نامہ، معراج نامہ، علی محمد، البتہ معجزہ ہر نبی صحیح ہے۔ اس کے علاوہ جتنی کتابیں قصوں کی ہیں بالخصوص جن کا میں نے نام گنوا دیا ہے سب لغویں اور چھوڑ دیئے کے قابل ہیں۔ ایک دہ مسکس ہے جس کا ٹیپ ٹاپ کا مہر یہ ہے۔
ع ” مری یار کیوں دیر اتنی کری“

یہ مسدس بھی نہایت لغو ہے اس کو بھی ہرگز نہ پڑھنا چاہیے اس ظالم نے ابتداء سے انتہا تک خدا سے تعالیٰ سے لڑائی کی ہے کہیں انبیاء کے نبوت کے مل جانے پر حسد ہے کہیں سلاطین کی بادشاہت پر رشک ہے اور پھر حسد کے بعد یہ شکایت ہے کہ مجھے کیوں نہیں ملایا کتاب میں ہرگز اپنے پاس یا اپنے گھر میں رکھنے کے قابل نہیں۔ یہ اس قابل ہے کہ اس کو بلاتامل آگ میں رکھ دینا چاہیے معجزہ آل نبی جس میں یہ قصہ لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے کو کسی سائل کو دیدیا اور اس نے بیچ ڈالا۔ بالکل ہی غلط ہے اور لغو ہے، اسی طرح حضرت عکاسہ کی حکایت جو مشہور ہے بالکل غلط ہے۔ (دعظ مضار المصیبت ص ۱)

بعض مصنفین اور داعین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت جزئی اس انبیاء کی شان میں گستاخی | طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شان میں صریح گستاخی ہو جاتی ہے۔

۱۔ ارشاد فرمایا کہ یہ جو بعض مصنفین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور انبیاء پر ثابت کرنے کے لئے یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہر ایک فضیلت جزئی میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت کریں خواہ اس کی نسبت کوئی ثبوت نفی سے بہت پہنچ سکے یا نہ خواہ دلائل نفی اس اثبات مدلل کے معارض ہی کیوں نہ ہوں اور خواہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تنقیص ہی ہو جاوے، پر فضیلت جزئی بھی ثابت ہو جاوے یہ کوشش پسندیدہ نہیں، کیونکہ فضیلت کلی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت ہے اور کسی جزئی فضیلت کا ثابت ہونا ناقارح فضیلت نہیں جیسا کہ کسی صحیح البصر کی آنکھ کا کامل ہونا دلیل اس کی نہیں کہ وہ معیوب علیہ السلام سے افضل ہو۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کے جس ظاہری کی فضیلت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و

(ج) غضب ہے کہ بعض مصنفین بھی جن پر مقول کا غلبہ ہے اس انداز میں میل و محتاط

ایک مصنف نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح فضیلت بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار ثور میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جب وہ کفار کے آجانے سے پریشان ہوئے تسلی دی تھی کہ **لَا تَحْزَنْ فَرَأَاكَ كَرَمًا كَرِيمًا** کو بلا کر دیا پھر اپنے ساتھ سمیت حق کو بیان فرمایا جس میں خدا تعالیٰ کے ذکر کو مقدم فرمایا۔ اور سمیت میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی شریک فرمایا کہ صیغہ جمع معنی استعمال فرمایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرعون اور شکر فرعون کے آجانے سے پریشانی ہوئی اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس پریشانی کو ظاہر کیا تو آپ نے فرمایا۔ **كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِيْنِ** جس میں سب سے پہلے کلام کا استعمال فرمایا جو دھمکی کے واسطے موضوع ہے عربی میں لفظ کلام کا ایسے ہی موقعوں میں استعمال ہوتا ہے جہاں اردو کا کلام بھی استعمال ہوتا ہے گویا کلمے پر طائر مار دیا پھر اپنے ساتھ سمیت حق کو بیان فرمایا تو اپنے ذکر کو خدا تعالیٰ کے ذکر سے مقدم فرمایا۔ یعنی لفظ مسمیٰ کو رہائی سے پہلے ذکر کیا۔ گویا یہ حضرت مصنف میدان موسیٰ علیہ السلام کو بولنا سکھاتے ہیں کہ حضرت آپ کو خدا کا ذکر اپنے ذکر سے پہلے کرنا چاہیے تھا۔ گویا ان کو آداب کلام بھی نمودار اللہ معلوم نہ تھے پھر بھی وجہ فضیلت کی بیان کی کہ موسیٰ علیہ السلام نے حتیٰ بصیغہ مفرد بیان فرمایا جس میں میت البیہ کو اپنے ساتھ خاص کیا تو کم کو اپنے ساتھ اس دولت میں شریک نہ کیا۔ مجھے اس مصنف صاحب پر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے قلم سے یہ مضمون نکلا کیونکر، بس میں تو یہ کہوں گا کہ

”سخن شناس نئی دہرا خطا ایجا است“

اول تو ان کو جزئیات میں کلام کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کلیہ منصوص کیا کچھ کم ہیں جو جزئیات غیر منصوص سے آپ کا افضل ہونا ثابت کیا جائے اگر ان کو ایسا ہی شوق تھا تو غور کرنا چاہیے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مخاطب کون ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مخاطب کون ہے، کیونکہ بلاغت کا مسئلہ ہے کہ ہر حال و ہر موقع و محل کے لئے ایک ہی طرز کلام نہیں ہوتا بلکہ ہر موقع کے لئے جدا طرز ہوا کرتا ہے

”ہر سخن نکتہ دہر نکتہ مقامے دارد“

میں بطور احتمال کے کہتا ہوں اور رمانع کے لئے بمقابلہ استدلال کے احتمال کافی ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ جیسے لوگ ہوتے تو وہ بھی وہی نہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب وہ لوگ ہوتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی فرماتے جو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ آپ کے ساتھ غار ثور میں حضرت صدیق صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے جن کی جان نثاری کی یہ حالت تھی کہ جب حضور غار ثور پہنچے ہیں تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا چادر یا لنگی پھاڑ کر غار کے تمام سوراخ بند کئے تاکہ کوئی مؤذی جانور نہ داخل کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا نہ دے۔ سارے سوراخ تو بند ہو گئے مگر ایک رہ گیا۔ اس کے لئے کپڑا نہ رہا تھا اس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنا پیر لگا لیا کہ اگر کچھ نکلا تو میرے ہی پر میں کاٹ لے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچ سکے گا۔ اس حالت میں جو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو کفار کے آجانے سے پریشانی ہوئی ظاہر ہے کہ وہ پریشانی اپنی جان کے خوف سے نہ تھی بلکہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال سے پریشانی ہوئی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ دشمن آپ کو دیکھ جائیں اور حضرت کو اذیت پہنچائیں۔ جو شخص اتنا عاشق ہو جس نے سانپ کے بل میں اپنے پیر رکھ دیئے جس میں سانپ نے کاٹ بھی لیا تھا اس کو بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے اپنی جان کا خیال ہو سکتا ہے ہرگز نہیں ان کو جو کچھ خطرہ تھا وہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت کا تھا اور اس خطرہ کا منشاء بھی محض یہ تھا۔

”عشق است دھزار بدگمانی“

ورنہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ دولت توکل سے پوری طرح مالا مال تھے، ایسے شخص کی تسلی کے لئے وہی کلام مناسب تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا کہ اول ان کے غم کو ہلکا کرنے کے لئے ”لا تحزن“ فرمایا۔ پھر سمیت حق میں ان کو بھی شریک کیا اور چونکہ آپ کو حصر مقصود تھا اس لئے موافق اصل وضع کے ذکر اللہ کو اپنے ذکر سے مقدم فرمایا۔

اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ تھے وہ نہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے برابر متوکل نہ تھے نہ ایسے جان نثار تھے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ بالکل نہ تھا۔ محض موسیٰ علیہ السلام کی اذیت کا خطرہ تھا بلکہ ظاہر ہے کہ ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا پھر خطرہ ہی نہیں بلکہ انہوں نے اس کو جزم دیقین کے ساتھ ظاہر کیا۔ **قَالَ اصْحَابُ مُوسَىٰ لَمَّا كُنُوكُمْ** جس میں اُن اور جملہ امیہ اور لام تاکیدہ۔ تین موکدات موجود ہیں یعنی بس ہم تو یقیناً بکڑے گئے حالانکہ بار بار دیکھ چکے تھے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے مقابل میں کس طرح

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تو دنیا میں بھیجا اور چونکہ وہ مشوق تھے اور عاشق کو بدون مشوق کے قرار نہیں ہوتا۔ اسلئے تسلی کے واسطے سایہ ان کا دہاں دکھ لیا کہ اسی سے مجھ کو تسلی رہے گی۔ جیسے یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کے کرتے سے تسلی ہوگئی تھی۔ یہ نعمت نہیں یہ حد درجہ کی بے ادبی ہے باری عز اسمہ کی جناب میں اور نیز حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی ایسے اشارے اور پڑھنا گناہ ہیں، احتراز ضروری ہے بعض دیداروں کو بھی ضبط ہوتا ہے کہ اشارہ منتہی خواہ ان کا مضمون شریعت پر منطبق ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو ذوق شوق سے پڑھتے ہیں۔ بعض اشعار نفرت کے ایسے ہیں کہ ان میں دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام کی بے ادبی ہوتی ہے۔ الحاصل مشوق کہنا یہ سخت بے ادبی ہے۔ اس لئے کہ عشق خاصہ آدمی کا ہے اس لئے کہ عشق نام ہے نفس کے ایک خاص انفعال کا اور اللہ تعالیٰ انفعال اور ذاتاً ترسے پاک ہے۔ ہاں یہ کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول ہیں اگر کوئی عشق کو معنی مجازی میں لے لے لگے توقع تعالیٰ کی جناب میں ایسا اطلاق اذن شرعی کا محتاج ہے۔ البتہ اگر کسی مغلوب الحال کے کلام میں ہو۔ اس کو معذور سمجھیں گے بدون غلبہ حال کے کسی کو اجازت نہ ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ مقربان الہی کو محبوبان مجازی پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔

(و عظ الرق والمغظ ص ۶۷)

۳۔ مردہ کی روح دنیا میں واپس نہیں آتی۔

کسی مردہ کی روح کا جیسا کہ عوام میں شہور ہے کسی پرانا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ گو بعض آثار سے ایسا شہرہ ہوتا ہے کیونکہ قرآن میں ہے، کافر بعد موت کے کہتا ہے۔ رَبِّ اَرْجِعْ عَلَيَّ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَاتٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِنْ وَرَآئِهِمْ بَارِئٌ اِلٰى يَوْمِهِ يَتَبَعُ شُؤْنَ اَسْرَءِ معلوم ہوتا ہے کہ موت اور قیامت کے مابین وہ ایسی حالت میں رہتے ہیں کہ دنیا میں آئینی تنہا ہوتی ہے لیکن برزخ یعنی حائل دنیا میں آنے سے باز رکھتا ہے اور عقلاً بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر تعملاً میں مردہ بے تواسے یہاں آکر پے پیچھرنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر معذبت ہے تو فرشتگان عذاب کیونچھوڑ سکتے ہیں کہ وہ دوسرے کو لپیٹتا پھرے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے حدیث میں آیا ہے کہ ہر شخص کے ساتھ ایک فرشتہ اور ایک شیطان رہتا ہے ممکن ہے کہ وہی شیطان ہوتا ہے جس کا لوگوں پر اثر

لہ عیش راحت لہ عذاب میں مبتلا۔

مرد فرمائی اور اس وقت بھی خدا کے حکم سے اور اس کے وعدہ نصر کو سن کر چلے تھے ان تمام امور کے ہوتے ہوئے اتنی پریشانی کہ اپنے پچھلے جانے کا ایسا جزم ہو گیا۔ صاف ان کے غیر متوکل اور غیر کامل یقین ہونے کی دلیل ہے اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے دھمکا کر فرمایا کلاً۔ گویا چیت لگا دیا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جس تاکید سے ان لوگوں نے اپنے پچھلے جانے کو ظاہر کیا تھا۔ اس کا جواب ایسی ہی تاکید سے ہو سکتا تھا جو لفظ کلاً میں ہے پھر چونکہ یہ لوگ بوجہ کامل یقین نہ ہونے کے معیت حق سے محروم تھے۔

اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے حصر کے لئے مؤخر کو مقدم کیا اور مقدم کو مؤخر کیا کیونکہ قاعدہ ہے تقدیم ماحققاً الناحیہ فیہد الحصر اور اسی وجہ سے معنی بصیغہ مفرد فرمایا۔ صیغہ جمع استعمال نہیں فرمایا۔ مطلب یہ تھا کہ میرے ہی ساتھ میرا بد درگزار ہے تم بوجہ ضعیف یقین ہونے کے معیت حق سے محروم ہو، اب بتلائے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقصود کو ادا فرماتا چاہتے تو موسیٰ علیہ السلام نے ادا۔۔۔ فرمایا کیا اس وقت بھی آپ لاخرن ان اللہ معنا ہی فرماتے ہیں جو لوگ بلاغت کے کچھ بھی ذوق رکھتے ہیں وہ کبھی اس کے قائل نہ ہوں گے بلکہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اس مقصود کے ادا کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی طرز اختیار فرماتے تو موسیٰ علیہ السلام نے اختیار فرمایا یا مجھے تفصیلی جزئیات میں کلام ایسا ہوتا ہے کہ اس کو ایک ادنیٰ طالب علم بھی اخیال نکال کر باطل کر سکتا ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فصائل میں ہمیشہ اجمالی گفتگو کرنا چاہیے تفصیلی کلام کبھی نہ کرنا چاہیے۔

(و عظ الرق والمغظ ص ۶۷)

۲۹۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کا معشوق قرار دینا سخت بے ادبی اور گستاخی ہے

بعض لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا معشوق کہتے ہیں، چنانچہ شہسوار اشارہ منتہی میں اس مضمون کو باندھتے ہیں عشق کا خاصہ ہے عاشق کو مضطرب کر دینا۔ اور حق تعالیٰ اس سے منزہ ہے۔ مگر غضب یہ ہے کہ بعض مبہم کون نے اس اضطراب کو بھی خود بخود خدا تعالیٰ کے لئے مان لیا، چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے

پے تسکین خاطر متور پر ابن یوسف محمد کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا۔

کی گنجائش نہ رہی۔ (تظہیر الاعضاء ص ۷)

۳۲ - انقطاع اجتہاد پر شبہ کا جواب،

غیر مقلد کہا کرتے ہیں کہ کیا حنفیوں کے پاس انقطاع اجتہاد کی دہی آگئی ہے حالانکہ قدرتی قاعدہ ہے کہ ہر شیء عموماً اپنی ضرورت کے وقت ہی ہوا کرتی ہے جس فصل میں عموماً بارش کی حاجت حاجت ہوتی ہے اسی فصل میں بارش ہونے کا قاعدہ ہے اسی طرح ہوائیں حاجت کے وقت چلا کرتی ہیں جہاں سردی زیادہ پڑتی ہے وہاں کے جانوروں کے اون بہت بڑے ہوتے ہیں اس کے پیشتر انکار میں اسی طرح جب تک تدوین حدیث کی ضرورت تھی بڑے بڑے قوی حافظ کے لوگ پیدا ہوئے تھے اب ویسے نہیں ہوتے اور تو اور اہل حدیث میں سے بھی کسی کو بخاری اور مسلم تک خود امام بخاری اور مسلم کی طرح مع سند حفظ نہیں اسی طرح جب تک تدوین دین کی ضرورت تھی قوت اجتہاد یہ لوگوں میں بخوبی موجود تھی اب چونکہ دین مدون ہو چکا ہے، اور اصول و قواعد مہم ہو چکے ہیں اب اجتہاد کی اتنی ضرورت نہیں رہی، ہاں جس قدر اب بھی اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے اتنی قوت اجتہاد یہ بھی باقی ہے (یعنی اصول مجتہدین کے تحت میں جزئیات جدیدہ کا استخراج کر لینا۔)

(مجادلات معدلت ص ۳ حصہ ہفتم)

۳۳ - آج کل دین کی حفاظت کے لئے تقلید شخصی

نہایت ضروری ہے

کوئی نفس یہ بھی جائز ہے کہ مختلف لوگوں کا اتباع ہو مثلاً کسی شیخ سے کوئی شغل پوچھ لیا اور کسی دوسرے سے اور کوئی شغل پوچھ لیا تو اسی طرح متعدد کا اتباع بھی فی نفس جائز ہے اور سلف کی یہی حالت تھی کہ کبھی امام حنفیہ سے پوچھ لیا کبھی اور زائی سے اور اسی طرح سلف کی حالت دیکھ کر آج بھی لوگوں کو یہ لایا جاتا ہے کوئی نفس تو یہ جائز ہے مگر ایک عارض کی وجہ سے ممنوع ہو گیا اس کے سمجھنے کے لئے اول ایک مقدمہ سن لیجئے وہ یہ کہ حالت غالب کا اعتبار ہوتا ہے۔ سو حالت غالبہ کے اعتبار سے آج میں اور اس وقت میں فرق ہے کہ اس وقت کے لوگوں میں تدوین غالب تھا۔ ان کو مختلف لوگوں سے پوچھنا یا تو

ہوتا ہے اور جس شخص پر مسلط تھا اسی کا نام لے دینا ہو اور ممکن ہے کہ دوسرے کوئی شیطان ہو، اور شیطان کے متعلق حدیث میں آیا ہے۔ "بَعَثَ بَنِي إِسْرَافِيلَ فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَجُلًا يَكُونُ فِيهِ عَذَابٌ ذُو قُنُودٍ لَّهُمْ فِيهَا خُزُونٌ" اور شیطان کا اثر کہ وہ بھی شریر جن میں ہوتا ہے اور مردہ رجوں کا اڑھیا کہ مشہور ہے صحیح نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ تصرف کرنے کے لئے ارجح کیا یہاں آنا ضروری نہیں دور سے بھی تصرف ہو سکتا ہے، جواب ارشاد فرمایا کہ احتمال تو ہے لیکن جب تک اس کی دلیل قوی نہ ہو اس احتمال کو قبول نہیں کیا جاسکتا، محض امکان کافی نہیں۔ (مجادلات معدلت ص ۷ دعوات عبدیت حصہ ہفتم)

(غیر مقلدین کے اعتراضات کا حل)

۳۱ - اور اس کا جواب

کسی کو شبہ قیاس فقہی کے بطلان کا نہ ہو کہ ظاہر وہاں بھی اتباع ہے ایسے امر کا جس کی تحقیق یقینی نہیں کیونکہ حکم مجتہد ظاہر ہے کہ ظن ہوتا ہے، خصوص میں جب کہ دوسری آیت میں بھی اتباع ظن کی مذمت فرمائی گئی ہے۔ "وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً" اور "وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً"۔

جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ جب دلائل شرعیہ مستقلہ سے مسئلہ تحقیق کو پہنچ گیا کہ قیاس اور اجتہاد جائز اور واجب اصل ہے تو اس پر مایوسی لازم ہے علم صادق نہ آوے گا بلکہ وہ مایوسی ہو جائے گا مصداق ہوگا کیونکہ علم کے عموم میں وہ دلائل شرعیہ مستقلہ ثبوت قیاس بالیقین داخل ہیں اگر قیاس کے متعلق اس علم کا تحقق نہ ہوتا تو بے شک اس کا اتباع مایوسی لازم ہے علم کا اتباع ہوتا اور اب تو وہ اتباع مالک بہ علم کا ہوگا خوب سمجھ لو اور اتباع ظن کی جو مذمت آئی ہے وہاں ظن کے معنی مصطلح فقہی نہیں بلکہ ظن اصطلاح قرآن میں عام ہے، باطل یقینی اور مخالف دلیل صحیح کو بھی، چنانچہ منکرین بعثت کے قول میں "ان تظن الاظن" آیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کو اس کا احتمال بھی نہ تھا۔ چہ جائے کہ احتمال راجح بلکہ وہ اس کو اپنے علم میں صحیح کے خلاف سمجھتے تھے پھر بھی اس کو ظن کہا گیا پس ثابت ہو کہ اصطلاح قرآن میں ظن عام ہے امور باطلہ کو بھی، پس معنی آیت ذم ظن کے یہ ہیں۔ "ان یتبنون الاماخذ الدلیل القطعی وکل ما خلف الدلیل القطعی لایبغی من الحق شیئاً بل ہو باطل قطعاً۔" پس اس آیت سے بھی شبہ ملہ نہیں پڑی کرتے ہیں مگر ان کی اور کوئی شک نہیں مگر ان حق سے بے نیاز نہیں کرتا ہے۔

اتفاق طور پر ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ جس کے قول میں زیادہ احتیاط ہوگی اس پر عمل کریں گے بس اگر تین کی اب بھی وہی حالت ہوتی تو ایک کو خاص کر کے اور اس کی تقلید کرنے کی ضرورت نہ تھی، مگر اب تو وہ حالت ہی نہیں رہی اور کیسے رہتی۔ حدیث میں ہے، **ثُمَّ يَفْشُو الْكَذِبَ** کہ خیر القرون کے بعد کذب پھیل جائے گا اور لوگوں کی حالت بدل جائے گی سو جتنا خیر القرون سے بعد ہوتا گیا اتنی ہی لوگوں کی حالت ابتر ہوتی گئی اب تو وہ حالت ہوگئی ہے کہ عام طور پر غرض پرستی غالب۔۔۔۔۔ ہے اب مختلف لوگوں سے اس لئے پوچھا جاتا ہے کہ جس میں اپنی غرض نکلتی ہو اس پر عمل کریں گے۔

ہمارے وطن کے قریب ایک قصبہ ہے وہاں ایک مرد کا ایک عورت خود غرضی کا ایک واقعہ سے نکاح۔۔۔ ہوا پھر بعد میں معلوم ہوا کہ ان دونوں نے ایک عورت کا دودھ پیا تھا۔ ایک شخص میرے پاس دریافت کرنے آئے کہ اب کیا کرنا چاہیے میں نے کہا کہ ان کا نکاح جائز نہیں، ان میں جدائی نہ کر دینی چاہیے۔۔۔۔۔ کہنے لگے اس میں تو بڑی بدنامی ہے اب تو کوئی صورت جواز کی نکال ہی دیجئے، میں نے کہا اول تو تفریق میں بدنامی نہیں بلکہ تفریق نہ کرنے میں ہے کہ لوگ کہیں گے کہ بھائی بہن کو جمع کر رکھا ہے دوسرے اگر ہو تو ہوا کرے جب شریعت کا حکم ہے تو بدنامی کا کچھ خیال نہیں کیا جاسکتا کہنے لگے اس نے تو پی کر اگل بھی دیا تھا میں نے کہا خواہ اگلا ہو یا نہ اگلا ہو، حرمت کے حق میں یکساں ہے جب میرے پاس انہیں صاف جواب ملا تو وہ دہلی بیہوش ہوئے وہاں ان کو ایک عامل بالحدیث مل گئے مجھے اس وقت ان پر طعن کرنا منظور نہیں ہے بلکہ اس شخص کی غرض پرستی بیان کرنی ہے کہ اپنی غرض حاصل کرنے کے لئے عامل بالحدیث کے پاس گیا کہ شاید یہاں کوئی بات مل جائے۔ اس نے کہا اگر پانچ گھنٹے سے کم پیا ہے تو حرمت ثابت نہیں ہوگی۔ بس آپ نے ایک استفتاء تجویز کیا کہ ایک لڑکے نے ایک عورت کا دودھ گھونٹ پیا تھا۔ حرمت ثابت ہوئی یا نہیں انہوں نے جواب لکھ دیا کہ **لَا تَحْرُمُ الْمَصَّةُ وَلَا الْمَصْتَانِ** آپ بہت خوش ہوئے اور ان میں ان بیوی کو وہ فتویٰ لاکر دیدیا کہ یہ بھی تو عالم ہی کا فتویٰ ہے اس پر عمل کر لیا جاوے گا تو کون سی خرابی ہے آج کل لوگوں میں ایسی غرض پرستی ہے بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ بندہ خدا تو کیا گن رہا تھا کہ اس نے گھونٹ پیئے تھے اور بالفرض اگر اس کی تعداد معلوم بھی تھی تو اس کی وجہ ان کے فتویٰ کو مانا جھوٹوں نے حلال بتایا اور ان کے فتویٰ کو نہ مانا جھوٹوں نے حرام بتایا۔ حالانکہ جھوٹوں نے حلال بتلایا یہ شخص ان کا ہم مذہب بھی نہ تھا۔ ہاں اگر اول ہی سے اس کا وہ ہی مذہب ہوتا تو مضائقہ نہ تھا، مگر اول تو یہ شخص

ان کے مذہب پر تھا جب دیکھا کہ ان کے مذہب سے اپنا کام نکلتا ہے تو اس کا مذہب لے لیا۔ سو اس نے دین پر دنیا کو ترجیح دی اور افسوس ہے کہ بعض اہل علم کو بھی اس میں شبہ ہو گیا کہ اس میں کیا حرج ہے کہ ایک مجتہد فی مسئلہ میں دوسرے امام کے مذہب پر عمل کر لیا جاوے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ فرما دیا ہے کہ **لَا تَدْرَأُ مَا يَلْبِثُكَ** کہ نیت کا اعتبار ہے سو آج کل دوسرے امام کے مذہب پر دین ہونے کی حیثیت سے عمل نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اپنی دنیوی غرض کے حاصل کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

علامہ شامی نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک فقیہ نے ایک محدث کے ایک حکایت یہاں اس کی لڑکی کے لئے پیام بھیجا۔ اس نے کہا کہ اس شرط پر نکاح کرتا ہوں کہ رفقہ دین اور امین باہر کیا کر دے، فقیہ نے اس شرط کو منظور کر لیا اور نکاح ہو گیا اس واقعہ کو ایک بزرگ کے پاس ذکر کیا گیا تو انہوں نے اس کو سن کر سر ہٹا لیا اور تھوڑی دیر سوچ کر فرمایا کہ مجھے اس شخص کے ایمان جاتے رہے کا خوف ہے اس واسطے کہ جس بات کو وہ سنت سمجھ کر کرتا تھا بدون اس کے کہ اس کی رائے کسی دلیل شرعی سے بدلی ہو صرف دنیا کے لئے اس کو چھوڑ دیا۔ لوگوں کی یہ حالت دنیا طلبی کی ہوگئی ہے۔

ایسے وقت میں اگر تقلید شخصی نہ ہو تو یہ ہوگا کہ ہر مذہب میں سے جو صورت اپنے تقلید شخصی کی ضرورت مطلب کی پادیں گے اختیار کریں گے مثلاً اگر دھوکہ دینے کے بعد اس کے خون نکل آیا تو اب امام ابوحنیفہ کے مذہب پر تو وضو ٹوٹ گیا اور امام شافعی کے مذہب پر نہیں ٹوٹا۔ سو یہاں تو شخص شافعی مذہب اختیار کر لے گا اور پھر اس نے یوی کو بھی ہاتھ لگایا تو اب شافعی کے مذہب پر وضو ٹوٹ گیا اور ابوحنیفہ کے مذہب پر نہیں ٹوٹا تو یہاں حنفیہ کا مذہب لے لے گا حالانکہ اس صورت میں کسی امام کے نزدیک وضو نہیں رہا۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک تو خون نکلنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا اور امام شافعی کے نزدیک عورت کے چھونے کی وجہ سے، مگر اس شخص کو ذرا پرواہ نہ ہوگی، ہر امام کی رائے کو وہ اسی میں قبول کرے گا جو اس کے مطلب کے موافق ہے اور جو اس کے مطلب کے خلاف ہے اس کو نہ مانے گا سو دین تو رہے گا نہیں۔ غرض پرستی وہ جادے کی پس یہ فرق ہے ہم میں اور سلف میں، ان کو تقلید شخصی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ ان میں تدین غالب تھا اور سہولت اور غرض کے طالب نہ تھے خلاف ہمارے کہ ہم میں غرض پرستی غالب ہے اور ہم سہولت پسند اور غرض کے بندے ہیں اس لئے ہم کو اس کی ضرورت ہے کہ کسی خاص ایک شخص کی تقلید کریں کہ ہم تقلید شخصی کوئی نفع

واجب یا فرض نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ تقلید شخصی میں دین کا انتظام ہوتا ہے اگر ترک تقلید میں بے انتظامی ہوتی ہے ترک تقلید کی حالت میں اگر تمام مذاہبے احوط کو تلاش کر کے عمل کرے گا تو مصیبت میں رہے گا اور اگر اس کا تلاش کرے گا تو غرض پرستی میں مبتلا ہو جائے گا پس تقلید میں راحت بھی ہے اور نفس کی حفاظت بھی ہے اور جیسے کہ مجتہدین کی تقلید شخصی میں یہ حکمت ہے اسی طرح اس مذہب کے علماء و اخبار میں سے ایک مذہب کے علماء میں بھی آپس میں مسائل کے اندر اختلاف، ہیں اگر ایک عالم کو متعین نہ کیا جائے گا تو اس کے اندر بھی اندیشہ ہے کہ کہیں غرض پرستی میں نہ پڑ جائیں کہ جس عالم کی رائے نفس کے موافق ہوئی اس کو مان بھی لیا اور جس کی رائے نفس کے خلاف ہوئی اس کو نہ مانا۔ (اتباع المذہب) ۳

۳۴۔ اس اعتراض کا جواب کے مقلدین حدیث چھوڑ کر اقوال ائمہ پر عمل کرتے ہیں؟

بعض اہل تعصب کو ائمہ کی تقلید میں ایسا جود ہوتا ہے کہ وہ امام کے قول کے سامنے احادیث کو عین معارضہ کو بے دھڑک رد کر دیتے ہیں۔ میرا تو اس سے رد بگڑا کھڑا ہوتا ہے چنانچہ ایک ایسے شخص کا قول ہے۔ ”قال قال بسیار است: مرا قال ابو حنیفہ در کار است۔“

اس جملہ میں احادیث نبویہ کے ساتھ کیسی بے اعتنائی اور گستاخی ہے۔ خدا تعالیٰ ایسے جمود سے بچائے، ان لوگوں کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں اب اس تقلید کو کوئی شرک فی السنوت کہہ تو اس کی کیا خطا ہے مگر یہ بھی غلطی ہے کہ ایسے دوچار ہوں حالت دیکھ کر سارے مقلدین کو شرک فی السنوت سے مٹھون و مٹھن کیا جائے خدا نہ کرے سب مقلد ایسے کیوں ہوتے۔ میرے دل میں تقلید کی تفسیر یہ ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و انشاء پر عمل کرتے ہیں اس تفسیر پر جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کی ہے کیونکہ وہ ہمارے نزدیک درایت و فقہ میں اعلیٰ پایہ ہیں اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کیونکہ امام صاحب کا فقہ الامت ہونا تمام امت کو تسلیم ہے اور ان کے علوم اس پر شاہد عدل ہیں۔ اب بتلائیے اس تفسیر کی بنا پر تقلید میں شرک فی السنوت کیونکر ہو گیا۔ اس لئے کہ جس کے نزدیک تقلید کا یہ درجہ ہوگا اس کے نزدیک اتباع حدیث مقصود بالذات ہوگا اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ محض واسطہ فی التہمہ ہوں گے جو شخص بلا واسطہ عمل بالحدیث کا دعویٰ

کرنا ہے وہ حدیث کا اتباع اپنی فہم کے ذریعہ سے کرتا ہے، اور یقیناً سلف صالحین کی فہم و عقل و در و تقویٰ و دیانت و امانت و خشیت و احتیاط جاریے اور آپ سے زیادہ بھی، تو بتلائیے عمل بالحدیث کس کا کامل ہوا۔ آپ کا جو اپنی فہم کے ذریعہ سے حدیث پر عمل کرتے ہیں یا مقلد کا جو سلف کے ذریعہ سے حدیث پر عمل کرتا ہے اس کا فیصلہ اہل انصاف خود کر لیں گے بہر حال تقلید کی جو تفسیر میں نے بیان کی ہے یہ علم عظیم ہے اس کو یاد رکھئے۔

ابا مدعیان عمل بالحدیث کا یہ اعتراض کہ تمہارے سامنے ایک حدیث ایک اعتراض اور اس کا جواب پیش کی جائے اور تم اس کو نہیں مانتے محض اس وجہ سے کہ تمہارے امام کا قول اس کے خلاف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو تقلید حدیث مقصود بالذات نہیں بلکہ تقلید قول امام مقصود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے اس میں احادیث مختلف ہوتی ہیں، جس حدیث کو تم تمہارے سامنے پیش کرتے ہو۔ ہمارا عمل اس حدیث پر نہیں تو اس مسئلہ میں دوسری حدیث پر ہمارا عمل ہوتا ہے اور تم اس حدیث کو نہیں مانتے جس کو ہم مانتے ہیں پھر تمہارے اوپر کیا الزام ہے تم پر بھی تو الزام ہے۔ رہا تمہارا یہ کہنا کہ ہماری حدیث راجحہ تمہاری مرجوحہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ طریق ترجیح کا مدار ذوق پر ہے۔ تمہارے ذوق میں ایک حدیث راجحہ ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ذوق میں دوسری راجحہ ہے۔ اور ہمارے نزدیک امام کا ذوق تمہارے ذوق سے اعلیٰ و ارجح ہے۔ پھر تمہارا یہ ہے آپ کو عامل بالحدیث کہنا اور مقلدین کو عامل بالحدیث نہ کہنا محض ہٹ دھرمی ہے۔ اسی کو میں دو کسر عنوان سے کہتا ہوں کہ عمل بالحدیث کے معنی آیا عمل بکل الاحادیث ہے یا عمل ببعض الاحادیث اگر کہو عمل بکل الاحادیث مراد ہے، سو یہ تم بھی نہیں کرتے اور یہ ممکن بھی نہیں۔ کیونکہ آثار مختلفہ و احادیث متعارضہ میں سب احادیث پر عمل نہیں ہو سکتا یقیناً بعض پر عمل ہوگا اور بعض کا ترک ہوگا۔ اور اگر عمل ببعض الاحادیث مراد ہے تو اس معنی کو ہم بھی عامل بالحدیث ہیں۔ پھر تم اپنے ہی کو عامل بالحدیث کہہ رہے کہتے ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ مسائل منصوصہ تو بہت کم ہیں زیادہ مسائل اجتہادیہ ہیں اور ان میں مدعیان عمل بالحدیث بھی حنفیہ کی کتابوں سے فتوے دیتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ یا اگر کسی امام کے قول کو لیتے ہیں تو زیادہ مسائل میں آپ بھی مقلد ہوئے تو یہ کیا بات کہ تقلید کرنا تو حرام انہیں صرف تقلید کا نام لینا ہی ناجائز اور شرک ہے۔ اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ تمام مسائل میں احادیث منصوصہ ہی پر

عمل کرتا اور فتویٰ دیتا ہے تو وہ ہم کو اجازت دیں کہ معاملات و عقد و فسخ و شفعہ و رہن وغیرہ کے چند سوالات ہم ان سے کریں اور ان کا جواب وہ ہم کو احادیث منصوصہ صریحہ سے دیں قیامت آجائے گی، اور احادیث سے وہ کبھی جواب نہ دے سکیں گے، اب یا تو وہ کسی امام کے قول سے جواب دیں گے تو یہ تقلید ہوئی یا یہ کہیں گے کہ شریعت میں ان مسائل کا کوئی حکم نہیں یہ (لایوم الذکلت لکم وینکم کلمات ہوگا اور یہیں سے قیاس و استنباط کا جواز بھی معلوم ہو گیا کیونکہ جب حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دین کو کامل کر دیا گیا تو چاہیے کہ کوئی صورت ایسی نہ ہو جس کا حکم شریعت میں نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ احکام منصوصہ بہت کم ہیں تو اب تکمیل دین کی صورت بجز اس کے اور کیا ہے کہ قیاس و استنباط کی اجازت ہو کہ ان ہی مسائل منصوصہ پر غیر منصوصہ کو قیاس کر کے ان کا حکم معلوم کریں۔ یہاں سے ان مدعیان عمل بالا قیاد کی غلطی بھی ظاہر ہو گئی جو قیاس اور استنباط کو مطلقاً رد کرتے ہیں اور بعض احادیث میں جو قیاس کی مذمت ہے، وہ قیاس ہے جو اصول شریعت کے خلاف ہو یعنی جس کی اصل نص میں موجود نہ ہو بلکہ اس کا مبنی محض اپنی رائے ہو اور جس قیاس کی اصل نص میں موجود ہو اس کی مذمت ہرگز نہیں، ورنہ دین کا نقص لازم آئے گا۔ (ارضاء الحق حصہ اول ص ۲۷)

۳۵۔ اس شبہ کا جواب کہ توسل میں بزرگ کی بزرگی کو رحمت حق میں کیا دخل ہے

توسل بالصالحہ کی جو صورت ہے کہ اے اللہ فلاں بزرگ کے طفیل سے ہمارے حال پر رحم فرما۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اے اللہ فلاں شخص میرے نزدیک آپ کا مقبول ہے اور مقبولین سے محبت رکھنے پر (لأمرؤئمی حبیب) میں آپ کا وعدہ رحمت ہے۔ میں آپ کے اس رحمت کو مانگتا ہوں پس توسل میں یہ شخص اپنی محبت کو ادلیا را اللہ کے ساتھ ظاہر کر کے اس محبت پر رحمت و ثواب مانگتا ہے اور محبت ادلیا را اللہ کا موجب رحمت و ثواب ہونا نصوص سے ثابت ہے۔ چنانچہ متحابین فی اللہ کے فضائل سے احادیث بھری پڑی ہیں۔ اب یہ اشکال جاتا رہا کہ بزرگی کی بزرگی اور برکت کو رحمت میں کیا دخل ہے؟ دخل یہ ہوا کہ اس بزرگ سے محبت رکھنا حبیب فی اللہ کی فرد ہے۔ اور حبیب فی اللہ پر ثواب کا وعدہ ہے۔ اس تقریر کے بعد میں انا بنعمہ ازیکت فی خدشہ پر عمل

کر کے محدث بالسنۃ کے طور پر کہتا ہوں کہ ابن تیمیہ اگر یہ تقریر سنت تو توسل کے جواز کا ہرگز انکار نہ کر سکتے کیونکہ اس کے سبب مقدمات صحیح ہیں۔ میرا حسن ظن یہ ہے کہ علامہ ابن تیمیہ نے اپنے زمانہ کے جاہلوں کے توسل کو منع فرمایا ہے جس کی حقیقت استعانت و استغاثہ ہے۔ (اکبر الاموال ص ۱)

۳۶۔ اس شبہ کا حل کہ لا الہ الا اللہ کے سوا تمام اذکار بدعت ہیں۔

علامہ ابن تیمیہ لا الہ الا اللہ کے سوا ان سب اذکار کو بھی بدعت کہتے ہیں۔ کیونکہ سنت سے ان کا ثبوت نہیں۔ اگر میں اس وقت ہوتا تو ادب کے ساتھ ان سے استفتا کرتا کہ علامہ دین اس مسئلہ میں کیا ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک شخص قرآن حفظ کرتے ہوئے اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ کے کلمات کو الگ الگ یوں ادا کرتا ہے۔ اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ یاد کرتا ہے یا نہیں۔ اور شبہ کی وجہ یہ ہے کہ اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ لفظ بے معنی ہے۔ اسی طرح فطرت یاد کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اور شبہ کی وجہ یہ ہے کہ اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ لفظ بے معنی ہے تو میں حلفاً کہتا ہوں کہ ابن تیمیہ اس کو ضرور جائز کہتے، اور وجہ یہ بتلاتے کہ یہ تلاوت نہیں ہے۔ نہ اس شخص کو اس وقت تلاوت مقصود ہے بلکہ مقصود ذہن میں جمانا ہے تو اس پر میں کہتا ہوں کہ لا الہ الا اللہ اور اللہ اللہ کرنا کیوں بدعت ہے اس میں بھی تو ذکر اللہ کو ذہن میں جمانا ہے۔ اور ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ بنا بر تجربہ رسول ذکر کے لئے یہ ترتیب بے حذاغ ہے اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، جس کو شک ہو تجربہ کر کے دیکھ لے اب اگر وہ کہیں کہ جیسا وہ قرآن یاد کرنے والا اس حالت میں تالی نہیں مبتدی للتلاوت ہے۔ اسی طرح یہ شخص اس حالت میں یہ ذکر تو نہ ہوا مبتدی للذکر ہوا تو میں کہوں گا کہ انتظار صلوة بحکم صلوة ہے اس لئے وہ حجتاً ذکر ہے۔ افسوس یہ ہے کسی نے ان کے سامنے یہ مقدمات ذکر نہیں کئے اس لئے وہ ان کو بدعت کہتے ہیں معذور ہیں بلکہ طرفہ یہ ہوا کہ ان کے سامنے جہلاء صوفیاء کے غلط مقدمات پیش ہوئے چنانچہ بعض نے قل اللہ ثم ذرہم فی خوفہم یلعبون سے استدلال کیا ہے۔ اس دلیل پر علامہ ابن تیمیہ نے صوفیہ کے بہت لئے دیے ہیں۔ اور واقعی اس سے استدلال ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ اس میں اللہ قل کا مقولہ نہیں۔ کیونکہ قول کا مقولہ مفرد نہیں ہوتا بلکہ جملہ ہوتا ہے، بلکہ یہ تو انزل مقدر کا

فاعل ہوتا ہے جس کا قرینہ سیاق کلام ہے، کیونکہ اوپر ارشاد ہے قُلْ مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِمُوسَىٰ مُوسَىٰ مُؤْتَىٰ وَهُدًى لِلنَّاسِ مَخْلُوبَاتٍ مَّا قَرَأَ طَيْسٌ يَنْبُذُهَا وَتَنْحَقُونَ كَيْدًا وَعَلَّمْتُمْ مَا لَمْ تَعْلَمُوا إِنَّا نَعْلَمُ قُلْ أَبَاءُكُمْ قُلِ اللَّهُ أَيْ قُلِ أَنْزَلَ اللَّهُ تَوْبَهُ اسْتَدْلَالِ کسی جاہل نے کیا ہوگا۔ ابن تیمیہ کو خوب موقع مل گیا۔ انہوں نے خوب خبر لی مگر انارڈی طبیب غلطی کرے تو اس سے محمود خاں اور عبدالمجید خاں ہے تو بدگمانی جائز نہ ہو جاوے گی ہاں بوت خاں کو برا کہو تو ہم بھی مہتر ہے ساتھ ہیں یہ کیا کہ انارڈیوں کے ساتھ تحقیق کو بھی ایک لکڑی سے ہانکا جائے تحقیق کے دلائل سے ہوتے تو ابن تیمیہ کو صوفیہ پر انکار کی ہرگز جرأت نہ ہوتی۔ خلاصہ یہ کہ ذکر کا ایک درجہ یہ ہے کہ اللہ کے نام کو یاد کر دو۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ بواسطہ نام کے ذات کو یاد کر دو۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ نام کا بھی واسطہ نہ رہے۔ محض ذات کے ذکر پر قادر ہو جائے۔ (ذکر اللہ ص ۲)

۳۷۔ حنفی کہلانے پر اعتراض کا جواب

مبتوع صرف حق تعالیٰ ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اور ائمہ مجتہدین کے اتباع کے یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ کا اتباع ان کے ارشاد کے موافق کیا جاوے تو حنفی کہتے اور مجتہدی کہنے میں جواز اور عدم جواز میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر اس نسبت سے اتباع بالاستقلال وبالذات مراد لیا جائے، تب تو یہ نسبت دونوں میں صحیح ہوگی۔ کیونکہ ایسا اتباع تو خدا سے تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اگر اس نسبت کے یہ معنی ہیں کہ ان کے ارشاد کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کیا جاتا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے دونوں کی نسبت صحیح ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک کی نسبت کو جائز کہا جاوے اور دوسرے کی نسبت کو ناجائز۔ پس معلوم ہو گیا کہ حنفی کہنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اس نسبت کو کفر و شرک کہنا غلطی ہے کیونکہ اس نسبت سے یہ مراد نہیں ہے کہ یہ مبتوع مستقل ہیں بلکہ یہی معنی ہیں کہ ان کی تحقیق کے موافق حق تعالیٰ کے احکام کا اتباع کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمہ جو فروع مستنبط کئے ہیں ہم کو ان کے متعلق اجمالات بات معلوم ہے کہ وہ ہم سے زیادہ صحیح سمجھے۔ اس وجہ سے ہم ان کی تحقیقات کا اتباع کرتے ہیں اور نہ بحیثیت مستقل مبتوع ہونے کے ان کا اتباع نہیں کرتے۔ تو جیسی نسبت ہم حضرت ابوحنیفہ رحمہ کی طرف کرتے ہیں ایسی نسبت

عہ کے کلام میں بھی دوسرے کی طرف موجود ہے ارشاد ہے۔

وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ (الذی) قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى الْطَّبَعِ -

سو یہاں تو سبیل کی نسبت رسول اور ان لوگوں کی طرف کی جو حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وَاصْبِرْ وَنَعْنِ سَبِيلِ اللَّهِ، میں سبیل کی نسبت اللہ کی طرف ہے تو یہ ایسا کہ

ع عبادتنا شقي وحسنك واحد

بہر رنگ کے خواہی جامہ می پوش من بہر انداز قدرت می شناسم

بات یہ ہے کہ جن کو محبت ہوتی ہے وہ محبوب کو ہر حالت میں پہچان لیتے ہیں۔ اسی طرح

جنہوں نے دین کو سمجھ لیا ان کے سامنے وہ قرآن کے لباس میں آوے یا حدیث کے لباس میں وہ

یہی شعر پڑھ دیتے ہیں بعض نے حدیث کو اور بعضوں نے فقہ کو صرف عنوان بدلنے سے قرآن

سے الگ کر دیا حالانکہ وہ سب اصل میں ایک چیز ہیں اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک

مطب لکھنؤ کا کہلاتا ہے اور ایک دہلی کا مگر ہیں دونوں طب یونانی، سو اسی طرح قرآن و حدیث

اور فقہ کو فرعیات کے اندر مختلف ہیں مگر ہیں سب دین الہی، اگر فرعیات میں تھوڑا سا اختلاف

ہو گیا تو کیا وہ دین الہی نہیں رہا۔ جیسے طب یونانی اصول کا نام ہے تو کیا لکھنؤ کا مطب اور دہلی کا

مطب فرعیات کے اندر مختلف ہونے سے طب یونانی نہیں رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جس کو سبیلی فرمایا تھا اس کو یہاں سبیل من

مقصد اتباع الہی ہے اناب الی فرما رہے ہیں۔ پس سبیلی اور سبیل من اناب الی مصداق کے اعتبار

سے ایک ہوتے۔ اسی طرح ایک جگہ فرمایا شَمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِّ عِبَادِي مِنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا۔

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع

کیجئے۔ اب اس کے کیا معنی ہیں ظاہر ہے کہ اسی شریعت محمدیہ کا ایک لقب ہے۔ ملت ابراہیم علیہ السلام

یہ ہے عنوان کا اختلاف باقی اصل اتباع احکام البیہ کہ ہے پھر اتباع علماء کے عنوان سے کیوں متوحش

ہوتے ہیں۔

باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستقل ہیں مگر پھر بھی کہا جاتا ہے کہ واتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ

اگر اس کے یہ معنی ہیں کہ جو ان کا طریقہ ہے۔ اس کا اتباع کیجئے تب تو یہ بڑا سخت مضمون ہے کیونکہ یہ

تواضع کا کام ہے کہ دوسروں کے طریقے کا اتباع کرے نہ کہ نبی کا۔ تو بے تکلف توجیہ اس کی تقریر

سمجھ میں آجائے گی کہ ملت ابراہیم اس ملت الہیہ کا نام ہے۔ اس کے بہت سے لقب ہیں ان

میں سے ایک لقب ملتِ ابراہیم بھی ہے چونکہ یہ دونوں شریعتیں فروع میں بھی بجزت متفق ہیں۔ اس مناسبت سے اس ملت کا نام ملتِ ابراہیم رکھا گیا ہے تو واقع میں ملتِ ابراہیم کا اتباع نہیں ہے بلکہ ملتِ الہیہ کا اتباع ہے، جو کہ ایک مناسبت سے ابراہیم کی طرف منسوب کر دی گئی ہے۔ تو جیسے یہاں پر ملتِ الہیہ کو ملتِ ابراہیم کہہ دیا گیا ہے۔

اسی طرح اگر ایک دین کو مذہبِ شافعی یا مذہبِ ابوحنیفہ یا قولِ قاضی غلام احمد اربعہ کی طرف نسبت کہہ دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تو مولوی صاحب کا فتویٰ ہے کوئی خدا اور رسول کا حکم تو نہیں ہے۔ حالانکہ واقع میں وہ مولوی صاحب کا فتویٰ نہیں بلکہ خدا کا مسئلہ ہے۔ مولوی صاحب نے اس کو سمجھ کر بتلادیا ہے۔ اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ القیاس منظرِ لامتناہی، پس اب بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم علامہ ہی کا اتباع لازم ہوا۔ کیا خوب کہا ہے۔

چونکہ شہِ خوشنید و مارا کر دواغ چارہ نود در مقامش جز چسراغ

یعنی آفتاب چھپ گیا تو اب سوائے چراغ کے اور کیا علاج ہو سکتا ہے تو جب صاحبِ دینی ہماری نظروں سے غائب ہو گئے تو سوائے اتباعِ علامہ کے اور کیا چارہ ہے۔

چونکہ گلِ رفت گلستاں شد خراب بوسے گلِ راز کر جویم از گلاب

یہ شعر بمعجم اجزاء تو یہاں منطبق نہیں ہوتا ہے کیونکہ گلستاں شریعت احمدیہ دیا ہی ہر ابھرا ہے مگر مطلب یہ ہے کہ اب چونکہ صاحبِ دینی تشریف نہیں رکھتے اس لئے اب دین کو ان لوگوں سے حاصل کرنا چاہیے جن کے اندر صاحبِ دینی کا فیض موجود ہے کیونکہ اس وقت بھی جو کچھ فیوض ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے تو ہیں جو مجتہدین اور علماء کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوئے ہیں اور ان کے ذریعہ سے ہم تک پہنچے ہیں۔ پس بغیر ان کے اتباع کئے چارہ نہیں اور اصل میں یہ علماء کا اتباع نہیں بلکہ خدا اور رسول کا اتباع ہے جس کا طریقہ ان سے معلوم کر لیا جاتا ہے اور گویہ سیل من اناب کہلاتا ہے مگر واقع میں سیل اللہ اور سیل الرسول ہے۔ علماء چونکہ اسے ہمیں سمجھاتے ہیں اس معنی کو کہ واسطہ میں صرف اس مناسبت سے ان کی طرف منسوب کر کے سیل من اناب کہا گیا۔

(و عطا اتباع المنیب ص ۲۴)

۳۸۔ روضہ نبوی ﷺ کی زیارت کے لئے

سفر کرنے پر شبہ کا جواب، نیز یہ کہ زیارتِ حقوقِ مجتہد

نبوی سے ہے

(۱) فرمایا کہ ایک بار حضرت حاجی صاحب نور الشرم قدہ اور ایک متشدد غیر مقلد سے مناظرہ ہوا اور غیر مقلد مدینہ منورہ جانے سے منع کرتا تھا۔ ولاتشد الرجال الاثلثین مسلحین استدلال تھا۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا، کیا زیارت ابویں، طلب علم وغیرہ کے لئے سفر جائز نہیں، اس کا اس نے جواب نہیں دیا۔ پھر کہنے لگا اگر جانا جائز بھی ہو تو کوئی فرض و واجب تو ہو ہی گا نہیں کہ خواہ مخواہ جائے۔ حضرت نے فرمایا ہاں شرمعاً تو فرض نہیں لیکن طریقِ عشق میں تو ہے خیال کیجئے۔

سلیمان علیہ السلام بیت المقدس بنائیں اور وہ قبلہ بن جائے حضرت ابراہیم علیہ السلام مسجد بنائیں تو قبلہ قرار پائے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسجد بنائیں تو کیا اتنی بھی نہ ہو کہ وہاں لوگ زیارت کو جایا کریں چونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ عبودیت کی تھی اور شہرتِ ناپسند تھی۔ اس لئے آپ کی مسجد قبلہ نہیں ہوئی اس شخص نے کہا کہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تو جانا جائز ہے مگر روضہ اقدس کے قصد سے نہ جانا چاہیے۔ حضرت نے فرمایا مسجد نبوی فی فضیلت آئی کہاں سے ہے۔ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے، تو مسجد کے لئے تو جانا جائز ہو اور صاحبِ مسجد جن کی وجہ سے اس میں فضیلت آئی۔ ان کی زیارت کے لئے جانا جائز ہو، عجب تماشہ ہے وہ لاجواب ہوئے اور اگر کوئی کہے کہ آپ کی زیارت کہاں ہوتی ہے صرف قبر کی ہوتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ ایک حدیث میں آپ نے دونوں کو مساوی فرمایا ہے۔ من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا اھدنا الصراط المستقیم پڑھتے وقت معنی کا خیال کر کے پڑھا کرو اور ہدایت کی دعا مانگا کرو، وہ کہنے لگا کہ مجھے اس بارے میں دعائے ہدایت کی ضرورت نہیں۔ حضرت نے فرمایا دعا کرنے میں حرج کیا ہے۔ ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ اگر حق میرے نہ ہوں تو خدا کی ہدایت کرے۔ اس کے بعد قریب ہی مغرب کی غازیں وہ غیر مقلد کی وجہ سے

لے جس نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں زیارت کی۔

گرفتار کر لیا گیا۔ پھر اس نے کہا کہ میں تو مدینہ منورہ جاؤں گا۔ اس وقت چھوٹ کر آگیا اور مدینہ منورہ روانہ ہو گیا۔ (مجادلات محدث ۲۴۴ حصہ ایضاً)

باب :- ایک حق آپ کی محبت کا یہ ہے کہ قبر شریف کی زیارت سے مشرف ہو، بالخصوص جو حالت حیات میں زیارت سے مشرف نہیں ہوئے وہ روضہ اطہری سے برکات حاصل کر لیں کہ وہ برکات اگرچہ زیارت کی برکات جیسے بالکل نہ ہوں مگر ان کے قریب قریب ضرور ہیں حدیث میں ارشاد موجود ہے من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی اس سے معلوم ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بھی خود قابل توجہ ہے اگر آپ سے تعلق صرف بتلج ہی ہونے کی حیثیت سے ہوتا تو زیارت قبر مسنون نہ ہوتی۔ کیونکہ اس وقت تبلیغ کہاں ہے۔ انیسویں کی بعض لوگ ایسے خشک ہیں کہ وہ زیارت قبر شریف کو فضیلت نہیں مانتے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ناجائز کے قائل ہیں۔

کاپور میں ایک مرتبہ ایک مہتمم امین حدیث میں بچوں کا امتحان تھا۔ جلد امتحان کاپور کا ایک واقعہ میں ایسے ہی ایک شخص تھے جو کہ زیارت قبر شریف کو ناجائز سمجھتے تھے۔ ایک بچہ کا امتحان شروع ہوا اس نے اتفاق سے یہ حدیث پڑھی من حج ولحم یزرنی فقد جفانی ان صاحب نے اعتراف کیا کہ ”لم یزرنی“ فرمایا ہے تو یہ آپ کی حالت حیات کے ساتھ خاص ہے بعد وفات زیارت ثابت نہیں۔ طاعن یہ تھا اشکال سمجھا نہیں نہ اس کو کوئی جواب معلوم تھا۔ وہ سادگی سے آگے بڑھنے لگا خدا کی شان آگے جو حدیث موجود تھی وہ اس اعتراف ہی کا جواب تھی کہ من زارنی بعد مماتی فکانما زارنی فی حیاتی جتنے علماء اس وقت موجود تھے سب نے ان صاحب سے کہا کہ تجھے مہرت آپ کے اعتراف کا جواب من جانب اللہ ہو گیا۔ بس غلوش رہ گئے۔ بعض لوگ زیارت قبر پر ایک شبہ کرتے ہیں کہ اب تو قبر کی بھی زیارت نہیں ہوتی کیونکہ قبر شریف نظر نہیں آتی اس کے گرد چھتر کی دیوار قائم ہے جس کا دروازہ بھی نہیں۔ یہ عجیب لغو اشکال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر زیارت قبر کے لئے قبر کا دیکھنا ضروری ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے بھی یہ شرط ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا جائے حالانکہ بعض صحابہ نابینا تھے۔ عبداللہ بن ام مکتوم صحابی ہیں یا نہیں، مستورات کے بارے میں کیا کہو گے۔ جس طرح صحابیت کے لئے حجابی زیارت کافی مانی گئی ہے اسی طرح زیارت قبر شریف بھی حجابی زیارت کو کیوں نہ کافی مانا جائے گا۔

نہ جس نے حج کیا اور میری زیارت کو نہیں آیا۔ اس نے میرے ساتھ ظلم کیا

یعنی ایسی جگہ پہنچ جانا کہ اگر کوئی حامل نہ ہوتا تو قبر شریف کو دیکھ لیتے یہ بھی حجابی زیارت قبر شریف ہے۔

تیسرا شبہ امام مالک رحمہ اللہ کے قول سے کرتے ہیں کہ امام مالک کا قول ہے بیکہ قولہ ان امام مالک جملہ ادراس کا جواب است ذرت قبولہ بنی علیہ السلام یعنی امام مالک فرماتے ہیں کہ یہ بات کہنی مکروہ ہے کہ میں نے قبر شریف کی زیارت کی توجہ زیارت قبر کا قول تک مکروہ ہے تو فعل زیارت کیسے مکروہ نہ ہوگا جواب یہ ہے کہ امام مالک کا یہ قول اول تو ثابت نہیں اور اگر ثابت بھی ہو تو ان کا یہ مطلب نہیں جو تم کہتے ہو، ورنہ ان کو اس قدر پھر بھار کی کیا ضرورت تھی وہ صاف یہی نہ فرما دیتے کہ بیکہ زیارۃ القبر النبی علیہ السلام یہ قول کی کراہت بیان کرنا اس سے زیارت کی کراہت نکالنا اس تکلف کی ان کو کیا ضرورت تھی بلکہ ان کا مطلب تو یہ ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں زندہ ہیں اس لئے زیارت کرنے والے کو یہ نہ کہنا چاہیے کہ میں نے قبر کی زیارت کی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں مومن دنیا میں ایسے خشک مذاق بھی موجود ہیں جن کو زیارت قبر کا خود تو کیا شوق ہوتا۔ اس کو حرام کر کے دوسروں کو بھی روکنا چاہتے ہیں۔ مگر جو زیارت کر چکے ہیں ان سے پوچھو کس قدر برکات حاصل ہوتے ہیں۔ بس اب میں بیان کو ایک واقعہ پر ختم کرتا ہوں جس سے زیارت قبر شریف کے برکات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبر شریف میں زندہ ہونا معلوم ہوگا۔

سید احمد رفائی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مزار شریف پر حاضر ہوئے اس وقت زنائی کا واقعہ عرض کیا السلام علیک یا جمدی جواب مسرع ہوا وعلیک

السلام یا ولدی اس پر ان کو وجد ہوا اور بے اختیار یہ اشعار زبان پر جاری ہوئے

فی حالت البعد رحمی کنت ادسلھا تقبل الارض عفی وھی ناشتی
فلنہذہ دولت الاشباہ قد حضرت فامن یمینک کی تخطی بہا شفیق

بس فوراً قبر شریف سے ایک منور ہاتھ جس کے رُبرُود آفتاب بھی ماند تھا باہر نکلا۔ انہوں نے بے ساختہ دوڑ کر اس کا بوسہ لیا اور وہاں ہی گر گئے۔ ایک بزرگ سے جو اس واقعہ میں حاضر تھے کسی نے پوچھا کہ آپ کو اس وقت کچھ رشک ہوا تھا فرمایا ہم تو کیا تھے۔ اس وقت ملائکہ کو رشک تھا۔ (شکوۃ النعمۃ بذكر الرحمة ص ۴۴)

۴۰۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ درایت میں سبائتمہ میں بڑھے ہوئے ہیں۔

ابن خلکان کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہؒ کی نسبت لکھا ہے کہ امام صاحب کو کل سترہ حدیثیں پہنچی ہیں۔ یہ قول اگرچہ کسی درجہ میں بھی صحیح ماننے کے قابل نہیں کیونکہ امام صاحب کے واسطے جس قدر روایات مؤطا و کتابا و مجاز و غیرہ میں اس وقت موجود ہیں اگر ان سب کو ہی جمع کر لیا جائے تو وہ اس سے بدرجہا زیادہ نکلیں گی اور یہ ظاہر ہے کہ ان حضرات نے مسند امام ابوحنیفہؒ رحمۃ اللہ علیہ کے احاطہ کا قصد نہیں کیا تھا بلکہ تبعاً و ضمناً امام صاحب کی روایات کو بھی دیگر شیوخ کی روایات کے ساتھ ذکر کر دیا۔ تو اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امام صاحب کی روایات کس قدر ہوں گی۔ سترہ کا غلط ہونا تو بالکل بیہیہ ہے مگر میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ تم ابن خلکان کے اس قول کی تردید کیوں کرتے ہو۔ اس سے تو ہمارے امام کی منقبت نکلتی ہے، منقصت نہیں نکلتی۔ کیونکہ امام صاحب کا مجتہد ہونا تو سب کو مسلم ہے۔ اس کا تو کسی کو انکار نہیں۔ اور انکار کیونکر ہو سکتا ہے، جب کہ ہر باب میں امام صاحب کے اقوال موجود ہیں، اور ہر مسئلہ میں وہ دخل دیتے ہیں اور مخالفین بھی اکثر مسائل میں امام صاحب کے اختلاف کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ مخالفین کو امام کو محدث نہ تسلیم کریں مگر مجتہد ضرور مانتے ہیں۔ علاوہ ازیں صراحت کے ساتھ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ائمہ و ائین نے ابوحنیفہؒ کے فقیہ و مجتہد ہونے کا اقرار کیا ہے اور نہ صرف مجتہد ہونے کا بلکہ تمام فقہاء کا فقیہ میں عیال ابوحنیفہؒ ہونا تسلیم کیا ہے، تو ایک مقدمہ تو یہ لے لیا جائے اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملایا جائے کہ امام صاحب کو حدیثیں کل سترہ ہی پہنچی تھیں اب دونوں مقدموں کو ملا کر دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ وہ نتیجہ یہی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی فہم بہت ہی عالی تھی کہ صرف سترہ حدیثوں سے اس قدر مسائل استنباط کئے کہ دوسرا ائمہ باوجود لاکھوں احادیث کے حافظہ ہونے کے بھی ان کے برابر مسائل مستنبط نہ کر سکے۔ اس سے زیادہ فہم کی کیا دلیل ہوگی۔ معلوم ہوا کہ بہت ہی بڑے مجتہد تھے تو ہمارے احباب حنفیہ ابن خلکان کے اس قول سے فضول چیں بچیں ہوتے ہیں۔ اس پر وہ میں تو وہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اتنی بڑی مدح کر گئے جس کی کوئی حد نہیں خواہ مخواہ ہم اس قول کی تردید

لوگ یہ کہیں گے کہ اس کو دو کی ضرورت ہی نہیں اور پناہی بھی صاف کہہ دیجاکہ مجھے دستخط دکھلانے کی ضرورت نہیں، لیتے ہو لو، نہیں لیتے ہو موت لو، اسی طرح محققین سلف طریز یہ ہے کہ وہ مدعی کے لئے مغفرتی نہیں کرتے تھے، بس مسئلہ بتلادیا، اور اگر کسی نے اس میں تحتیں نکالیں تو صاف کہہ دیا کہ کسی دوسرے محقق کو جو حیرتم کو اعتماد ہو، ہمیں بحث کی فرصت نہیں۔ مولانا القیوم مقیم بھوپال رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی مسئلہ پوچھتا تو کتاب میں دیکھ کر جواب دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ کتاب میں یوں لکھا ہے اور جو کوئی حدیث پوچھتا تو وہ فرمادیتے کہ بھائی میں تو مسلم نہیں میرے آباؤ اجداد سب لکھان تھے، اور اسی طرح ان کے آباؤ اجداد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک سب لکھان تھے۔ جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کو دیکھ کر عمل کیا۔ اور جو ان کے بعد تھے انہوں نے اپنے بڑوں کو دیکھ کر عمل کیا۔ اسی طرح سلسلہ سلسلہ ہمارے گھر میں وہی ہوتا آ رہا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل تھا اس لئے مجھے حدیث ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں اس کی ضرورت تو نو مسلموں کو ہے اس جواب کا حاصل وہی قطع نزاع ہے کہ فضول بحث کو یہ حضرات پسند نہ کرتے تھے بھلا اگر عوام کو بتلادیا جائے کہ حدیث میں یہ ہے تو ان کو طریق استنباط کا علم کس طرح ہوگا اس میں پھر وہ فقہاء کے محتاج ہوں گے تو پہلے ہی فقہاء کے بیان میں اعتماد کیوں نہیں کرتے۔

الغرض عمل کے لئے تو تراویح کا اتنا ثبوت کافی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قوال اس کو سنون فرمایا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم علاؤن کی پیشکش رکعتیں پڑھتے تھے۔ عوام کے لئے اتنا کافی ہے اس سے زیادہ تحقیق علماء کا منصب ہے۔ اس وقت اس سے بحث نہیں۔ اس تراویح کا نام قیام رمضان بھی ہے کیونکہ یہ رمضان کے ساتھ مخصوص ہے اور احادیث میں ان کو قیام رمضان سے تعبیر کرنا اس کی دلیل ہے کہ تراویح تہجد سے الگ کوئی عبادت ہے کیونکہ تہجد رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں، اور اس کے علاوہ اس پر اور بھی دلائل قائم ہیں کہ یہ دونوں الگ الگ عبادتیں ہیں۔

(تقلیل المنام بصوت القیام ص ۱)

کے درپے کیوں ہو، مان لینا چاہیے اچھا امام صاحب کو شترہ ہی حدیثیں کل ملی تھیں، مگر کس قدر عالی فہم تھے کہ چند حدیثوں سے لاکھوں جزئیہ اور مسائل سمجھ گئے۔ خیر یہ تو ایک لطیف تھا اس قول کے غلط ہونے کا تو خود محدثین کو بھی اقرار ہے مگر اس میں شک نہیں کہ روایت میں حنفیہ کا پلہ دوسرے رائے محدثین کے برابر نہیں، مگر روایت میں یہ اس درجہ بڑھے ہوئے ہیں کہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حدیث و قرآن کو پڑھا پڑھایا سب نے، مگر گنا حنفیہ ہی نے ہے۔

ایک عامل بالحدیث کا قصہ ہے کہ وہ مجھ سے اکثر معاملات سے یہ مسائل کیوں نہیں پوچھتے۔ مجھ سے کس لئے پوچھتے ہو تو حالانکہ وہ اپنے مسلک میں بہت ہی بختہ ہیں مگر انصاف کی بات چھپا نہیں کرتی۔ زبان سے بے ساختہ ہی نکلا کہ ہمارے علماء تو آئین و رفع یدین کے سوا کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہ مسائل ان کو نہیں آتے آپ ہی سے پوچھ کر تسلی ہوتی ہے عرض معلوم ہو گیا کہ کسی بات کا سننا اور بے گنا اور ہے۔

(المجلد للابتداء ص ۷)



عوام کے شبہات کا حل

۴۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے صاحبزادے

ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات پر رونا

ایک شبہ ظاہری یہ ہوتا ہے کہ ہمارے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ اپنے صاحبزادے کے انتقال پر روئے اور بعض اولیاء اللہ کی حکایت ہے کہ وقت مصیبت کے انہوں نے انحرش کیا، حالانکہ انبیاء علیہم السلام کے مرتبے کو کوئی نہیں پاسکتا جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ حق فرزند یہ ہے کہ ایسے وقت میں اس پر روئے۔ حق خالق یہ ہے کہ امر الہی پر بصرہ کرے۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو جمع فرمایا، حق فرزند بھی اور حق خالق بھی، اور دونوں کو ادا فرمایا۔ اور بعض اولیاء اللہ مرتبہ میں کم ہیں کہ ایک حق ان سے ادا ہوا اور دوسرا نہ ہوا۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ قیامت میں بعض انبیاء بعض اولیاء پر رشک کریں گے۔ ظاہر الہی بھی شبہ ہوتا ہے کہ افضل کو مفضل پر غبطہ کیوں ہوگا بات یہ ہے کہ غبطہ کئی قسم کا ہوتا ہے۔ سبھی تو کمال سے سوئے تو ہوگا نہیں، اور کبھی بسبب ایک خاص قسم کی عافیت کے مثلاً کوئی بڑے عہدہ پر ہو اور پھر ذمہ داریوں کی کثرت سے یہ کہے کہ پانچ روپے والے مجھ سے اچھے کہ آرام سے تو ہیں، اس قدر حساب کا لوچھ تو نہیں۔ حضرت انبیاء علیہم السلام کا رشک کرنا اسی طرح پر ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا بڑا مرتبہ ہے۔ امت کی فکر میں مشغول ہوں گے اور بعض اولیاء اللہ ایسی مشغولی سے آزاد ہوں گے پس اس غبطہ کا یہ محل ہے۔

(مجادلات محدث ملتا)

۴۲۔ لڑکا لڑکی کی عمر بوقت شادی برابری ہونی چاہیے

بعض لوگ غضب کرتے ہیں کہ مال کے لالچ میں بوڑھوں سے نکاح کر دیتے ہیں۔ گنگوہہ میں ایک لڑکی اپنی ساتھیوں سے کہا کرتی تھی کہ جب میاں گھر میں آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نانا جان آگئے امام صاحب کی روح پر ہزاروں رحمتیں ہوں کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ جب لڑکی بالغ ہو جائے

ہے رہیں عورتیں ان کے لئے آسان یہ ہے کہ جو عورتیں پڑھ لکھی ہیں وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر ہستی زیورہ وغیرہ پڑھا کریں۔ اور جو پڑھی ہوئی نہیں ہیں وہ اپنے لڑکوں بچوں سے کسی وقت ہستی زیورہ کے مسائل سن لیا کریں۔ اور یہ بھی نہ ہو تو لڑکیوں کو پڑھا کر تیار کر لیں اور ان سے اسی سلسلہ کو جاری کریں یہ مختصر دستور العمل۔ اس سے انتشار اللہ ہر شخص کو علم دین حاصل ہو جائے گا اور محبت بھی بڑھے گی، اور دین کی تکمیل ہوگی۔ (وعظ آثار المحبۃ ص ۱۲)

۴۴۔ قرآن شریف ایک متن ہے، فقہ اور تہذیب اس کی شرح ہے

قرآن ایک متن ہے۔ حدیث و فقہ سب اس کے شروح ہیں اسی کو فقہاء نے کہا ہے القیاس مظهر لامثبت توحیدیت و فقہ قرآن کے مطالب کو ظاہر کر دیا ہے کوئی حکم قرآن کے خلاف بیان نہیں کیا۔ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک صندوق مقفل ہے اور کبھی سے اسے کھول دیا اور بہت سے جواہرات نظر آنے لگے تو یہ جواہرات کبھی سے پیدا نہ ہوئے نہیں، بلکہ وہ صندوق میں موجود تھے مگر پوشیدہ تھے، کبھی نے ان کو ظاہر کر دیا تو حدیث و فقہ قرآن کے لئے کبھی ہیں جتنے علوم ہیں سب قرآن ہی سے نکلتے ہیں، اس کی تو یہ شان ہے۔

عبادتنا شقی وحسنک واحد
وکل الی ذلک الجمال یشیر
ایک محبوب ہے، جس نے صبح کو دھائی جوڑا پہنا۔ شام کو دوسرا جوڑا پہنا تو جو عاشق نہیں وہ تو نہیں پہچانے گا۔ مگر عاشق کہہ گا کہ
بہرے کے خواہی جامدی پوشش
من ہر انداز قدرامی شناسم۔

کہ جو لباس چلے پہن لے، میں تو چال پہچان لیتا ہوں، تو قرآن کا جو عاشق ہے اس کو حدیث و فقہ میں بھی قرآن ہی نظر آتا ہے مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی حضرت مولانا گنگوہی سے فرمایا کرتے تھے کہ حدیث تو آپ کے سامنے آ کر خفی ہو جاتا ہے ان حضرات کو حدیث میں فقہ نظر آتا تھا اور ان اہل نظر کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ
بسکہ درجاں نگار چشم میدارم متونی
ہرچہ پیدای شود از دور پندارم متونی

جیسا کہ اہل اللہ کو ہر شئی میں خدا نظر آتا ہے۔ مگر معاذ اللہ یہ معنی نہیں کہ یہ سب خدا ہی ہیں۔ استغفر اللہ بندہ بندہ... ہے، خدا خدا ہے جیسا کہ قرآن قرآن ہے اور حدیث حدیث، مولانا جامی کا فقہ ہے کہ ایک دفعہ حال میں فرما رہے تھے کہ۔

ع " ہرچہ پیدای شود از دور پندارم متونی"
کسی منکے نسخہ پن سے کہا کہ "مولانا اگر خسر پیدا شود" تو آپ نے کیا مزہ کا جواب دیا کہ
"پندارم متونی"۔ (دعوت حق الاطاعت ص ۱۲)

۴۵۔ آج کل مستحبات کی پرواہ نہیں کی جاتی نہ ہی ان کی تعلیم کا اہتمام ہے

آج کل مستحبات کو ضروری نہیں سمجھتا۔ اور عمل کے درجے میں وہ واجبات و فرائض کے برابر ضروری ہیں بھی نہیں۔ مگر تعلیم ان کی بھی ضروری ہے دو وجہ سے، ایک اس لئے کہ لوگوں کو ان کا مستحب ہونا معلوم ہو جائے گا تو کوئی ان کو ناجائز نہ سمجھے گا۔ یا فرض و واجب نہ... خیال کرے گا۔ یہ تو اصلاح اعتقاد کے لحاظ سے ضرورت ہے اور اس درجے میں مباحات کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ دوسرے اس لئے کہ ان کی برکات اور ثمرات بے شمار ہیں۔ جن پر نہ مطلع ہونا ہی ان سے بے رغبتی کا باعث ہے اگر ان برکات و ثمرات کی اطلاع ہو جائے جو ادنیٰ ادنیٰ مستحبات سے حاصل ہوتے ہیں تو آپ خود کہیں کہ انفس ہم اب تک بڑے خسارے میں تھے جو ایسے قیمتی جواہرات سے بے خبر رہے یہ ضرورت تکمیل عمل کے درجہ میں ہے۔ غرض مستحبات کا ذکر بھی قرآن میں بے ضرورت نہیں بلکہ تعلیم کے درجے میں ہے ان کا ذکر بھی ضروری اور بہت ضروری ہے اگر محبت ہو تو اس کی قدر ہو۔ عاشق کا مذاق یہ ہوتا ہے کہ وہ محبوب کی خوشی کی ذرا ذرا سی بات کی تلاش میں رہتا ہے اور جب اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ محبوب فلاں فلاں بات سے خوش ہوتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ بھی کروں اور وہ بھی کروں اور کوئی بات اس کے خوش کرنے کی مجھ سے رہ نہ جائے۔ اگر ہم لوگوں کو یہ مذاق عاشقانہ نصیب ہو جائے تو اس وقت ان مستحبات کی قدر معلوم ہو اور ان کے بیان کو خداوند تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت سمجھیں گے کہ اللہ اور رسول نے کس تفصیل سے ان باتوں کو بتلادیا

جو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والی ہیں اور اگر شریعت میں صرف ضروریات ہی کا بیان ہوتا مستحبات کا ذکر نہ ہوتا تو عشاق کو سخت بے چینی ہوتی ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ عاشق شخص ضروریات پر اکتفا نہیں کرتا ان کو تو وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔ بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ فرض منصبی کے علاوہ بھی کچھ ایسا کام کر دے جس سے محبوب کو مجھ پر زیادہ توجہ ہو۔ دیکھئے ایک نوکر تو وہ ہے جو محض تنخواہ کے لئے کسی خاص کام پر آپ کا ملازم ہے وہ تو یہ چاہے گا کہ فرض منصبی کو ادا کرتا ہوں اس سے زیادہ کی اس کو خواہش نہ ہوگی اور ایک وہ نوکر ہے جس کو بچپن سے آپ نے پالا پرورش کیا ہے اور اس کو آپ کے ساتھ جان نثاری کا تعلق ہے وہ ہرگز فرض منصبی پر اکتفا نہ کرے گا بلکہ وہ اس کی کوشش کرے گا کہ آقا کے خوش کرنے کا جو بھی کام ہو وہ میرے ہاتھ سے ہو جائے وہ اپنے خاص کام کے علاوہ رات کو آپ کے پر بھی دبائے گا پنکھا بھی جھلے گا اور آپ کے جاگنے سے پہلے تمام ضروریات کے سامان مہیا کرے گا، اور یہ بھی خیال نہ کرے گا کہ یہ کام تو میرے فرض منصبی سے زیادہ ہیں انہیں کیوں کریں۔ نہیں بلکہ اس کی محبت اور جان نثاری مجبور کرے گی کہ جس کام سے بھی آقا خوش ہو وہ ضرور کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ سے صرف قانونی تعلق | صا جو! ہمارا علاقہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارے خیال فاسد میں محض قانونی رہ گیا ہے اسی لئے ہم واجبات و فرائض کے علاوہ مستحبات کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اگر ہم کو حق تعالیٰ کے ساتھ محبت اور جان نثاری کا علاقہ ہوتا۔ تو فرائض و واجبات پر ہم کبھی اکتفا نہ کر سکتے بلکہ مستحبات کی تلاش میں خود بخود رہتے اور جس بات کے متعلق بھی یہ معلوم ہو جاتا کہ حق تعالیٰ کو یہ پسند ہے وہ اس سے خوش ہوتے ہیں اس کی طرف شوق سے سبقت کرتے اور جس بات کے متعلق معلوم ہو جاتا کہ یہ حق تعالیٰ کو ناپسند ہے یا کم، عاشق کو اتنا جان لینا کسی کام سے روکنے کے لئے کافی ہے کہ یہ محبوب کو ناپسند ہے وہ یہ بھی نفیض نہیں کرتا کہ یہ ایسا ناپسند ہے کہ اس کی سزائیں ضرب و جس کی جاتی ہے یا ایسا ناپسند ہے کہ محبوب کسی قدر کبیدہ خاطر ہو جانا، اور رخ پھر لینا ہے اس کے نزدیک دونوں کام برابر ہیں وہ اس کو بھی ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ محبوب اس سے کچھ کبیدہ خاطر ہو، یا بے رخ ہو جائے۔ اور جس کام میں کبیدگی کے علاوہ سزا سے ضرب و جس بھی ہو تو بھلا کیوں ہی کرنے لگا مگر آج کل ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کسی کام کے نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ یہ گناہ ہے تو سوال ہوتا ہے کہ کیا بڑا گناہ ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ اگر چھوٹا گناہ ہو تو کریں گے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ بہت ضعیف ہو گیا ہے، گو پوری بے تعلقی بھی نہیں ہے کیونکہ یہ سوال

لے ضرب مار پیٹ، جس قید کرنا۔

ہی تعلق کی دلیل ہے۔ میں ان لوگوں کی طرف داری کرتا ہوں کہ ان کو خدا تعالیٰ سے بالکل بے تعلق نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ ان کو اتنا تعلق تو ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو زیادہ ناراض کرنا پسند نہیں کرتے۔ اگر اتنا بھی تعلق نہ ہوتا تو اس سوال ہی کی کیا ضرورت تھی کہ کیا بڑا گناہ ہے؟ معلوم ہوا کہ بڑے گناہ سے ڈرتے ہیں کیونکہ اس سے خدا تعالیٰ بہت ناراض ہوتے ہیں لیکن زیادہ تعلق نہیں ہے اس لئے غلطی مانا ناراض کر دینا گوارا ہے غرض یہی سوال تعلق کی بھی دلیل ہے اور ضعف تعلق کی بھی۔

اس تقریر سے وہ لوگ خوش ہوئے ہوں گے جو گناہ کے متعلق بڑا چھوٹا ہونے کا

تعلقات میں بے کمال | سوال کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق بھی ثابت ہو گیا۔ اور یہ بات ایک درجے میں ہے بھی خوش ہونے کی کیونکہ ص:۔

ص:۔ "بلا بولے اگر اینہم نبودے" مگر وہ یاد رکھیں کہ نفس تعلق پر قناعت نہیں ہو سکتی۔ آخر آپس میں جو ایک دوسرے ہم تعلقات رکھتے ہیں کیا ان میں نفس تعلق پر کوئی شخص قناعت کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر تعلق کا درجہ کمال ہر شخص کو مطلوب ہے۔ دیکھئے بیوی کے ساتھ جو ارتباط ہے حالانکہ وہ ایک نہایت ضعیف تعلق ہے جو صرف دو لفظوں سے جوڑا جاتا ہے اور ایک لفظ سے ٹوٹ جاتا ہے مگر اس میں ہم نے کسی کو نہیں دیکھا۔ جو نفس تعلق پر قناعت کرتا ہو، بلکہ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بیوی کو میرے ساتھ کامل تعلق ہو اسی لئے محض حقوق ضروریہ پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے خوش کرنے کے لئے وہ کام کئے جاتے ہیں اور وہ زیور اور لباس تیار کئے جاتے ہیں جو اس کا حق نہیں مگر محض اپنے مصالح کی وجہ سے ان کا مول کو کیا جاتا ہے تاکہ یہ تعلق بڑھے اور سخت ہو، اگر مرد بیوی کے ساتھ یا بیوی مرد کے ساتھ قانونی علاقہ رکھے اور حقوق ضروریہ سے زائد کچھ نہ کرے تو گو نفس تعلق باقی رہ سکتا ہے مگر تعلق کا لطف حاصل نہیں ہوتا۔ اور اس صورت میں ہر وقت قطع تعلق کا اندیشہ رہتا ہے تعلق کو بقا جب ہی ہوتی ہے کہ اس کے استحکام کی تدبیر کی جاوے، چنانچہ مرد کے ذمہ بیوی کا محض کھانا پکڑنا ضروری ہے زیور اور ریشمی لباس ضروری نہیں نہ اس کی دوا دار دلازم ہے، نہ اس کے کبے والوں کی ضیافت دعوت ضروری ہے مگر محض تعلق بڑھانے کے لئے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ اور اس کی خوش کرنے کو ہر کام ملحوظ رکھا جاتا ہے حالانکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ تعلق نہایت ہی ضعیف ہے مگر باوجود اس ضعیف کے اس کا منقطع ہو جانا ہر شخص کو ناگوار ہے اور اگر کبھی منقطع ہو جاتا ہے تو کتنا رنج ہوتا ہے اور انقطاع سے بچنے ہی کے لئے اس کے استحکام کے اسباب اختیار کئے جاتے ہیں۔ پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہم کو ایک ضعیف

تعلق میں تو نفس تعلق پر تو قناعت نہ ہو بلکہ خوف انقطاع سے اس کے استحکام کی فکر ہو۔ اور حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق پر اکتفا گوارا نہیں۔ حالانکہ خدا تعالیٰ سے ہمارا ایسا قوی علاقہ ہے کہ اس کے برابر کوئی تعلق نہیں ہو سکتا پھر کیا وجہ ہے کہ اس کے استحکام کی ہم کو فکر نہیں اور محض نفس تعلق کو کافی سمجھ رکھا ہے اور یہاں وہ خیال کیوں نہیں کیا جاتا تعلق کا بقا استحکام پر موقوف ہے۔ نفس تعلق بقا کے لئے کافی نہیں بلکہ اس میں زوال و انقطاع کا خطرہ لگا ہوا ہے تو کیا کوئی اس بات کو گوارا کر سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ جو اس کا علاقہ ہے وہ منقطع ہو جائے ہرگز نہیں۔ پھر اس کے استحکام کا کیوں خیال نہیں کیا جاتا۔ مولانا فرماتے ہیں سے

ایک صبرت نیست از فرزند وزن
ایک صبرت نیست از دنیائے دوں
صبر چوں داری زرب ذوالمنن -
صبر چوں داری زخم الماہدون

ہائے ہمیں جھوٹی جھوٹی چیزوں سے صبر نہیں ہو سکتا مگر معلوم خدا تعالیٰ کے کمر در تعلق پر انصاف نہیں | لوگوں کو کیسے صبر آگیا۔ ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کے ساتھ ضعف تعلق ہم کو گوارا نہیں اور خدا تعالیٰ کے ساتھ ضعیف تعلق ہونے پر ذرا جی نہیں دکھتا۔ پس گو حق تعالیٰ کے ساتھ نفس تعلق بھی ایک نعمت ہے مگر ضعیف تعلق پر قناعت کر لینا بھی بڑا ظلم ہے۔ بعض لوگ تو بے تعلقی ہی پر راضی ہیں، یہ تو کفار ہیں۔ ان سے اس وقت خطاب نہیں۔ یہ ہم آج کل کے مسلمان ہیں۔ حیرت ہے کہ ہم کو خدا تعالیٰ کے ساتھ ضعیف تعلق رکھنے پر صبر کیسے آتا ہے۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ آج کل ہم کو مستحب کی قدر نہیں اور ان کو غیر ضروری سمجھا جاتا ہے، میں اپنی کہتا ہوں کہ بچپن میں بہت سے نوافل کا پابند رہا۔ مگر منیتہ المصلیٰ پڑھتے ہی جب معلوم ہوا کہ یہ تو مستحبات ہیں جن کے نہ کرنے میں کچھ گناہ نہیں اسی وقت سے نوافل کو چھوڑ دیا۔ اس وقت تو متنبہ نہ ہوا کہ میں کیا کر رہا ہوں، مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالت بہت بری تھی۔ اس کا تو یہی حاصل ہوا کہ ہم حق تعالیٰ کے ساتھ ضابطہ کا تعلق رکھنا چاہیے ہیں کہ ضروریات کو بجالائیں۔ تو کیا دنیا میں ہم اپنے مربیوں کے ساتھ بھی یہ برتاؤ کر سکتے ہیں کہ کھانا و اجبہ کے سوا کچھ نہ کریں۔ ہرگز نہیں، دیکھئے بعض اوقات کسی طبع کی وجہ سے یا محبت کی وجہ سے ہم اپنے مربیوں کی خدمت و عیز و اجبہ بھی بہت کرتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کا اتنا بھی حق نہیں جتنا مربیوں اور بزرگوں کا حق ہوا کرتا ہے ذرا کچھ تو انصاف سے کام لینا چاہیے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی طاعت میں اس قدر اکتفا کرتے ہیں۔ جو فرض و واجب ہے۔ اور طاعت غیر واجبہ کو کسی درجہ میں بھی ضروری نہیں سمجھتے۔

ہمارا فرض کیا ہے | یہ ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ کی شان کے لائق ہم سے اس کی اطاعت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اور ہم جتنا بھی کچھ کریں وہ اس کے حق کے مقابلے میں بہت کم ہے اور یہ بھی ایک سبب ہے مستحبات میں ہماری کوتاہی کا۔ کیونکہ اس سے ہم کو یہ دھوکہ ہو گیا ہے کہ جب حق ادا ہو ہی نہیں سکتا تو پھر کس لئے زیادہ کوشش کریں، مگر یہ سخت غلطی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم اس کی شان کے موافق عمل نہیں کر سکتے مگر اپنے مقتضی حال کے موافق تو کر سکتے ہیں۔ دنیا میں رات دن دیکھا جاتا ہے کہ لوگ سلاطین کے سامنے ہدایا و تحائف لے جاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ بادشاہ کی شان کے موافق ہمارا ہر دین نہیں ہو سکتا مگر اس کا یہ اثر کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہر دینا موقوف کر دیں بلکہ جتنا اپنے سے بڑا شاہ کو کوشش کرے عہدہ سے عہدہ ہر پیش ہی کرتے ہیں اسی لئے مثل مشہور ہے کہ ہر دین یا تو دوسرے کی شان کے موافق ہو یا کم، زکم اپنی ہی شان کے موافق ہو۔ پس ہم کو اپنی ہمت اور طاقت کے موافق عمل تو کرنا چاہیے۔ اور میں اطمینان دلاتا ہوں کہ حق تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے اتنا ہی عمل کافی ہے جتنا آپ کر سکتے ہیں آپ اپنی طاقت سے زیادہ نہ کیجئے۔ حق تعالیٰ نے بندہ کو اس کا مکلف نہیں کیا کہ وہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق عمل کرے بلکہ اسی قدر کا مکلف کیا ہے کہ وہ اپنی طاقت و ہمت کے موافق عمل کرے تو اب یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ ہم مستحبات کو اس لئے ترک کر دیں کہ حق تعالیٰ کا حق تو ادا ہو ہی نہیں سکتا۔

کسی مصلحت سے ترک مستحبات | یہ اور بات ہے کہ کسی وقت مستحب کو کسی مصلحت شرعی کی وجہ سے ترک کر دیا جائے۔ مثلاً لوگوں کو یہ بتلانے کے لئے کہ بغیر واجب نہیں یا سفر میں رفتار کی رعایت سے نوافل وغیرہ کو چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ وہ انتظار سے پریشان نہ ہوں یا کسی وقت تعب کی وجہ سے اپنی راحت کے لئے ترک کر دیا جائے کہ شرعاً اس وقت مستحبات پر ملامت نہیں۔ چنانچہ راحت حاصل کرنے کے لئے تو حدیث میں وارد ہے۔ ان لنفسك علیک حقاً ولعلینک علیک حقاً اولک قال مگر بلا وجہ ترک کرنا اس سے حدیث میں پناہ آتی ہے کیونکہ یہ سستی اور کلامی ہے جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اللہم انی اعوذ بک من العجز والکسل خوب سمجھ لیجئے کہ طلب راحت اور چرہ ہے اور سستی اور چرہ ہے دونوں کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔ طلب راحت کا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا ہے اور اس کے لئے بعض صحابہ کو ترک

منہ یقیناً تجھ پر ترے نفس کا حق ہے اور تری آنکھوں کا حق ہے۔

سکے اسے اسٹیمبوری اور کالی سے تری پناہ چاہتا ہوں ۱۲۔

(۲۷۱) قبولیت دعا پر شبہ کا جواب

جواب یہ ہے کہ منظوری اور اجابت اور قبول کے دو درجے ہیں ایک یہ ہے کہ درخواست لے لی جائے اور اس پر توجہ کی جائے۔ دوسرے یہ کہ درخواست کے موافق فیصلہ بھی کر دیا جائے۔

صاحبو! درخواست کا لے لیا جانا بھی ایک قسم کی منظوری اور بڑی کامیابی ہے۔ آپ نے مقدمات میں دیکھا ہو گا کہ جب کسی مقدمہ کی اپیل کی جاتی ہے تو وہاں بھی دو درجے ہیں ایک یہ کہ اپیل لے لی جائے اور اس میں غور کیا جائے۔ اور یہ بھی بڑی کامیابی ہے۔ بڑی ناکامی ہے اس شخص کی جس کی اپیل لی ہی نہ جائے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ کامیابی کا یہ ہے کہ اپیل منظور کر لینے کے بعد درخواست کے موافق فیصلہ کر دیا جائے اور پہلے فیصلہ کو منسوخ کر دیا جائے۔ جب یہ بات سمجھیں آگئی تو اب سمجھئے کہ ”اُجیب دَعْوَةِ الدَّاعِ“ منظوری کی قسم اول پر محمول ہے۔ قسم ثانی پر محمول نہیں۔ جس کی دلیل خود نص کے الفاظ ہی ہیں کیونکہ اس کو مرتب فرمایا ہے ”اِنَّ قَرِیْبَ“ پر اور اس جملہ میں قرب تعلق کو بیان فرمایا ہے اور قرب تعلق کا مقتضایہ یہ ہے کہ درخواست کو لے لیا جائے اس پر توجہ کی جائے خواہ فیصلہ دیر میں ہو یا جلدی ہو، موافق ہو یا نہ ہو، کیونکہ فیصلہ تو قانون کے موافق ہو گا۔ یا سائل کی مصالحت پر نظر کر کے اور مقدمہ کی روداد دیکھ کر حاکم کے تعلق اور توجہ کا مقتضی صرف اتنا ہے کہ سائل کی درخواست کو واپس نہ کرے بلکہ اس کی درخواست کو توجہ کے ساتھ سنے۔ اور اس کے فیصلے کے واسطے لے لے پس ”اُجیب“ کے معنی ہوتے ہیں کہ ہم ہر دعا کرنے والے کی درخواست لے لیتے ہیں اس پر توجہ کی جاتی ہے۔ بے توجہی نہیں کی جاتی۔ تو یہ کیا تھوڑی بات ہے۔ صاحبو! دنیا میں تو اتنی ہی بات کے لئے بہت سی تدبیریں اور خوشامدیں کی جاتی ہیں۔ کہ بادشاہ ہماری دست کو لے لے اس کے بعد جی کو سمجھا لیتے ہیں کہ اگر فیصلہ قانون کے موافق ہوا تو ہماری مرضی کے موافق ہو گا ورنہ نہیں۔

لے لیں دعا کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہوں۔

اہلیت نہیں۔ بھلا اگر ایک سائنس کسی کالج کے پروفیسر سے کہے کہ مجھے اقلیدس کے پہلے مقالے کی پانچویں شکل سمجھا دو اور وہ اس کی تقریر کرے اور سائنس نہ سمجھ سکے اور کہے نہ معلوم کیا بکتا ہے۔ تو بتلائے تصور کس کا ہے یقیناً سائنس کی عقل کا تصور ہے۔ مگر جاہلوں کے نزدیک تو وہ پروفیسر ہی تجا ہے جسے ہمارے یہاں ایک دفعہ زمانے میں وعظ ہوا ایک جولاہی بھی وعظ سننے آئی۔ وہ کچھ دیر تو خاموش رہی جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو کہتی ہے جانے کیا کیا بھونکے ہے واقعی اس کے نزدیک تو سارا بھونکنا ہی ہوا۔ فرمائیے اس نے یہ اعتراض اپنے اوپر کیا یا وعظ پر کیا اسی طرح اگر میں ان ملاجی کو علمی قاعدہ سے سمجھا سکاتا تو تصور کس کا ہے ان کی عقل کی تو یہ حالت تھی کہ مہتمم مسجد نے ان سے یہ کہہ رکھا تھا کہ تاریکی کے وقت پاخانہ میں چراغ رکھ دیا کرو ایک دن آپ چراغ لے کر گئے۔ تو پاخانہ میں کوئی طالب علم تھا۔ آپ اس سے کہتے ہیں۔ میاں مولوی صاحب آنکھیں بند کر لینا میں چراغ رکھو بنگا۔ جی ہاں وہ تو آپ کو کپڑا پہنے ہوئے بھی نہ دیکھیں اور آپ اس کو ننگا دیکھ لیں۔ اب ایسے کم عقل کو کوئی کس طرح سمجھائے کہ اس جگہ کا تعلق دعوہ حکم و اید یکم سے ہے یہ منصوب مسطور ہے مجرور و عطف نہیں ہے۔ جس شخص کو تو اعدا و نحوہ کچھ بھی مس نہ ہو وہ اس جواب کو کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ بس ایسے شخص کا جواب یہی ہے کہ تم کو جس طریقہ سے قرآن کا قرآن ہونا معلوم ہوا۔ اسی طریقہ سے اس کے احکام بھی معلوم کرو۔ تم کو خود ممانی سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ تفصیل میں نے اس لئے کی تاکہ آپ ترجمہ قرآن دیکھ کر اپنے کو ماہر نہ سمجھیں جو لوگوں میں بڑا مرض ہے۔ (تو اسی باخت حصہ اول ص ۵)

دعا کی قبولیت کی شکلیں

ایسے ہی یہاں بھی دل کو سمجھانا چاہیے کہ جب درخواست لے لی گئی ہے تو اگر اس کا پورا کرنا ہماری مصلحت کے خلاف نہ ہو تو ضروری پوری ہوگی ورنہ اس کی جگہ کچھ اور مل جائے گا یہ اس واسطے کہا کہ اللہ تعالیٰ دعا کے پورا کرنے میں تو کسی قانون کے پابند نہیں۔ ہاں بندے کی مصالحہ پر ضرور نظر فرماتے ہیں کہ اس دعا کا پورا کرنا اس کے لئے مضرت نہ ہو۔ سو یہ تو عین کامیابی ہے۔ دیکھو پھر باپ سے پیسہ مانگتا ہے تو ایک درجہ تو قبول کا یہ ہے کہ باپ اس کی درخواست کو سن کر محبت سے اس کو پیار کرے کہ ہاں ہاں ہم نے تمہاری درخواست سُن لی۔ اب کبھی تو وہ اس کو پیسہ دیدیتا ہے اور کبھی اس خیال سے کہ پیسہ لیکر یہ بازار جائے گا اور نہ معلوم کیا خرید کر کھا لیگا۔ جس سے نقصان پہنچے، یا بازار جانے سے عادت خراب ہو جائے تو وہ اس کو بجائے پیسہ دینے کے کوئی چیز خود اپنے ہاتھ سے چار آنے کی خرید کر دیدیتا ہے تو کیا اس کو یوں کہا جاوے گا کہ درخواست پوری نہیں کی۔ ہرگز نہیں کہا جاوے گا۔ بلکہ یوں کہا جاوے گا گو صورت پوری نہیں کی مگر حقیقتاً درخواست پوری کر دی گئی کیونکہ اس کو پیسہ سے بہتر چیز دیدی گئی۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ حق تعالیٰ کبھی بھی تمہاری درخواست کو قبول نہیں کرتا۔ مگر یہاں بھی اس سے زیادہ بندہ پر مہربان ہیں اس کے بعد بھی جو کبھی طلب کے موافق عطا نہیں ہوتا تو دل کو سمجھانا چاہیے کہ ضرور ہماری درخواست کا مجسمہ پورا کرنا حکمت کے موافق نہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ بجائے اس کے ہم کو کچھ اور نعمت عطا فرمائیں گے۔ حکام دنیا تو درخواست منظور کرنے کے بعد فیصلہ کرنے کے وقت صرف اتنا دیکھتے ہیں کہ درخواست کا پورا کرنا قانون کے خلاف تو نہیں اگر قانون کے خلاف ہوا تو اس کو رد کر دیتے ہیں اور اس جگہ کچھ اور نہیں دیتے۔ اور اللہ تعالیٰ اس قانون کے ساتھ اس کو کبھی دیکھتے ہیں کہ درخواست کا پورا کرنا بندہ کی مصالحہ کے خلاف تو نہیں اور اسی صورت میں درخواست کا پورا کرنا عین کامیابی ہے۔

اجابت دعا کا معنی

پس اجابت جس کا وعدہ ہے اس کے معنی درخواست لے لینا اور درخواست پر توجہ کرنا ہے یہ اجابت یقینی ہے اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ آگے دوسرا درجہ ہے کہ جو مانگا ہے وہی مل جائے اس کا وعدہ نہیں بلکہ وہ ان شاء سے مقید ہے اگر مشیت ہوگی تو ایسا ہوگا وگرنہ نہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے بل ایاہ تدعون فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء۔ بعض علماء نے اجیب دعویٰ اللہ کو کبھی ان شاء سے مقید کیا ہے اور اس کو بعض لوگوں نے حذاف میں شمار کیا ہے۔ مگر

میرے نزدیک یہ صحیح نہیں کیونکہ دوسری آیت میں ہے۔ وَقَالَ رَبِّمُودِعُوْنِیْ اَسْجِدْ لِّکُمْ مَّحْطٌ یٰہاں سباق آیت بتلا رہا ہے کہ دعا پر اجابت ضرور مرتب ہوتی ہے کیونکہ جواب امر کا مرتب امر پر ضروری ہے۔ اس میں "ان شاء" کی قید خلاف ظاہر ہے نیز یہاں بھی اتنی قریب کے بعد اجیب دعویٰ اللہ کو بیان فرمانا جس میں قرب کو محقق و مؤکد کیا گیا ہے اس امر کی دلیل ہے کہ اجابت مشیت کے ساتھ مقید نہیں ورنہ قرب کا معلق بالمشیت ہونا لازم آئے گا حالانکہ حق تعالیٰ کا قرب ہونا محقق ہے علما بھی اور تعلق خصوصیت سے بھی۔ لِقَوْلِهِ سُبْقَتْ حَقِّیْ عَلٰی غَضَبِیْ، وَهُوَ الْمُرَادُ بِالْمُتَلَقِّ۔ پس میرے نزدیک اجیب بالمعنی الاول نہیں۔ ہاں بالمعنی الثانی ان شاء سے مقید ہے۔ جب دعا اس طرح سے مقبول ہے پھر دعائیں کوتاہی کیوں بنے اگر کسی کے ذہن میں یہ تحقیق نہ ہو تو وہ دعائیں اس طرح بھی تو دل کو سمجھا سکتا ہے کہ دنیا میں تو نفع مومہم کبھی بہت سے کام کر لیتے ہیں گو آخر میں خسارہ بھی ہو جاوے اور خسارہ کا خطہ کبھی ہوتا ہے۔ جسے تجارت وغیرہ میں احتمال ہے۔ اور دعائیں تو خسارہ کا احتمال ہی نہیں پھر اس میں کوتاہی کیوں کی جاتی ہے۔ دعائیں ایک بات اور ہے وہ یہ کہ دعا کرنے سے بندہ کو حق تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جاتا ہے۔ جس وقت آدمی دعا کرتا ہے اس وقت غور کر کے ہر شخص دیکھ لے کہ اس کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق محسوس ہوگا۔ پس دعا کے بعد اگر مطلوب بعینہ حاصل نہ ہو تو یہ بات اسی وقت حاصل ہو جاوے گی کہ دل میں قوت و اطمینان حاصل ہوگا۔ اور یہ برکت اسی کی ہے کہ دعا سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ کو خاص تعلق ہو جاتا ہے۔ عشاق کو تو دعا سے یہی مطلوب ہے۔ اور کچھ مطلوب نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں سہ

از دعا بود مراد عاشقان جز سخن گفتن باں شیریں دباں

اسی لئے عشاق کو دعا قبول ہونے یا نہ ہونے پر کبھی التفات نہیں ہوتا کیونکہ عاشق کے لئے یہی بڑی بات ہے کہ محبوب اس کی باتیں سُن لے عاشق کے لئے یہی بات بہت کافی ہے اس کے بعد اگر اجابت کی دوسری قسم کا بھی ظہور ہو جائے تو مزید عنایت ہے تو چاہئے کہ حق تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کیا جائے جس کا بہت آسان طریقہ دعا ہے۔ بغیر

لے تیرے رب نے کہا مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔

سہ میری رحمت میرے غضب پر غالب آگئی۔

اس کے خاص تعلق پیدا کیا جائے بلکہ ہوائی تعلق ہوتا ہے کہ اگر سوچا جائے اور غور کیا جائے تو حق تعالیٰ سے بہت دور نظر آتا ہے۔ صاحبو! پھر یہ کتنے انہوس کی بات ہے کہ ہمارا ایک تو خدا جس سے سابقہ ہے اور آئندہ بھی سابقہ پڑے گا۔ اور ہم اس سے اس قدر دور ہو رہے ہیں وہ تو قریب ہی ہیں۔ بس ہم دور ہو رہے ہیں۔ (الاصابتہ ص ۷)

۴۸۔ عمل کے بغیر کوئی دینی ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔

باب عمل میں آج کل دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں جن کو صرف اعتقاد کی درستی کا خیال ہے وہ عمل کو بہتم بالشان ہی نہیں سمجھتے، اس لئے ان کو اصلاح عمل اور تکمیل اعمال کا اہتمام ہی نہیں۔ اگر یہ لوگ یوں سمجھتے کہ عقیدہ کا درجہ عمل سے زیادہ ہے تو ہم کو ان سے منازعت کی ضرورت کبھی کیونکہ اس کا ہم کو بھی انکار نہیں۔ واقعی یہ درست ہے کہ عمل کا درجہ عقیدہ سے تو خیر ہے مگر اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ عمل فضول و بیکار ہے۔ کیا جو چیز کسی سے تو خیر ہو وہ بیکار ہو کر رہتی ہے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ شاخوں کا مرتبہ جڑ سے موخر ہے۔ مگر بایں ہم کوئی بھی شاخوں کو بیکار نہیں کہہ سکتا کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ درخت بار آور نہیں ہو سکتا۔ جس کی شاخیں نہ ہوں اگرچہ اس کی جڑ کیسی ہی مضبوط ہو۔ ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ خالی عقیدہ جس میں عمل نہ ہوں بار آور نہ ہوگا۔ مجرد عقائد سے بغیر عمل کے وہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جو مطلوب شارع ہے گو کبھی بعض کیفیات بغیر اعمال کے حاصل ہو جائیں۔ مگر کیفیات خود مطلوب نہیں۔ بانی جو ثمرہ شارع کے نزدیک مقصود ہے وہ بغیر اعمال کے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم کو اخبار شارع سے ہی معلوم ہوا ہے کہ بدو عقیدہ و عمل دونوں کی درستی کے ثمرہ مقصودہ کے حصول کا یقین نہیں ہو سکتا گو یہ ممکن ہے کہ بعض کو صرف اصل کی درستی سے بھی حاصل ہو جائے مگر بوجہ وعدہ نہ ہونے کے اس کا یقین نہیں۔ ان لوگوں نے قرآن کی صرف ایک آیت یاد کر لی ہے۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔ جس سے یہ سمجھ لیا کہ محض علم

کافی ہے یعنی اصلاح عقیدہ۔ اور یہ نہ دیکھا کہ قرآن میں بہت جگہ یہ بات مصرح ہے کہ عمل کرنے والے اور عمل نہ کرنے والے بھی برابر نہیں ہو سکتے۔ سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: - اَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ۔ ایک مقام پر ارشاد ہے اَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ۔ ایک جگہ ارشاد ہے اَفَنْسَ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ۔ بہر حال ثابت ہو گیا کہ عادت اللہ یہ ہے کہ دین سے جو خاص ثمرہ مطلوب ہے وہ بغیر عمل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ (المجادلہ ص ۷)

۴۹۔ مجاہدہ کو ضروری سمجھنا غلطی ہے

بعض لوگ اعمال کو تو ضروری سمجھتے ہیں مگر اعمال کے ساتھ کسی اور شے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ظاہر میں ان کی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے عقیدہ اور عمل دونوں کو ضروری سمجھنا مگر اس میں بھی ایک نقص ہے وہ یہ کہ صحیح عقائد کے بعد اصلاح اعمال اور تکمیل اعمال و مواظبت اعمال کے لئے صرف ارادہ کو کافی سمجھا۔ حالانکہ تجربہ اور مشاہدہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اصلاح اعمال کی سہولت کے لئے ایک اور شے کی بھی ضرورت ہے اگرچہ نفس اصلاح ممکن ہے یعنی وہ امر اصلاح کا موقوف علیہ عقلاً نہیں ہے۔ اور نہ عادتاً۔ اس معنی کہ موقوف علیہ ہے کہ اس کے بغیر کسی طرح بھی عمل نہ ہو سکے، لیکن اس معنی کہ ضرور موقوف علیہ ہے کہ بدو ان کے عمل سہولت نہیں ہو سکتا۔ پس وہ سہولت میں موقوف علیہ ہے گو صدور عمل بغیر اس کے ہو سکتا ہے۔ اس کی مثال ریل کی سی ہے کہ جیسے مسافت طویلہ بدو ریل کے سہولت طے نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ بدقت طے ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی یہاں سمجھئے کہ اصلاح عقائد کے بعد گو صدور عمل بتکلف بدو ان اس خاص شے کے ہو سکتا ہے مگر سہولت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ سہولت اعمال کے لئے اس خاص شے کی ضرورت ہے۔ مجھے اس وقت اس کا بیان کرنا مقصود ہے اور یہی وہ مسئلہ ہے جس کے معنی معلوم نہ ہونے سے باب عمل میں بہت لوگ غلطی کر رہے ہیں حاصل اس شے کا یہ ہے کہ صدور اعمال بعد اصلاح عقائد کے گوارادہ سے ہو سکتا ہے لیکن اس

ارادہ کے کچھ موانع مزاحم ہو جاتے ہیں جس سے صدور عمل دشوار ہو جاتا ہے اور اس دشواری سے بعض اوقات عدم صدور عمل کی نوبت آ جاتی ہے تو سہولت کے لئے اس شے کی ضرورت ہوئی۔ اس شے کے حصول کے بعد صدور اعمال بالکل سہل ہو جاتا ہے اور میں اس کو تجربہ سے ثابت کرتا ہوں ابھی آیات سے استدلال نہیں کرتا کیونکہ آیت میں دوسرے معنی بھی تحمل ہیں۔ اس لئے اول میں تجربہ سے اس کا ثبوت دیتا ہوں اور پھر بعد میں تبرئاً آیات سے تائید کر دوں گا۔ سینے اس شے کا نام ہے مجاہدہ نفس اور مخالفت نفس۔ یہ بات بہت قابل تدریس ہے اس کو معمولی نہ سمجھئے۔ اب تجربہ سے اس کی ضرورت معلوم کیجئے کہ یہ تو سب مسلمان جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے اور نماز پڑھنے کو سب لوگوں کا بھی چاہتا ہے ترک الصلوٰۃ سے ان کا دل بھی بُرا ہوتا ہے مگر پھر بھی بہت لوگ نماز نہیں پڑھتے۔ باوجودیکہ سب کا عقیدہ فرضیت صلوٰۃ کا حاصل ہے۔ اسی طرح بعض ارادہ کر کے پڑھتے بھی مگر وہ ارادہ بعض عوائق سے مضحک ہو کر موثر نہیں رہتا اور اس وجہ سے نماز پر دوام نہیں ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ صدور دوام اعمال کے لئے صرف اصلاح عقائد یا ارادہ ضعیف کافی نہیں ہے بلکہ کسی اور شے کی ضرورت ہے جس کے بعد صدور دوام و رسوم اعمال ضروری ہے اور وہ تکمیل اعمال کا موقوف علیہ ہے اور وہ شے مجاہدہ نفس اور مخالفت نفس ہے چنانچہ بے نمازی اس واسطے بے نمازی ہے کہ وہ اپنے نفس کا۔۔۔ متباع کرتا ہے۔ اور اس کو آرام دیتا ہے اگر وہ مجاہدہ نفس کرتا تو بے نمازی نہ ہوتا۔ (المجاہدہ ص ۷)

۵۔ انبیاء علیہم السلام پر کالیف انبی کی وجہ

اہل حق کا تو یہ مذہب ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں گناہوں سے پاک ہیں۔ حشوئہ نے انبیاء کی قدر نہیں کی۔ وہ ان کو معصوم نہیں مانتے۔ میں کہتا ہوں کہ حشوئہ کا یہ قول نقل کے خلاف تو ہے ہی عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ دنیا کے حکام بھی جس کے سپرد کوئی عہدہ کرتے ہیں تو انتخاب کر کے اس کو حاکم بناتے ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کے یہاں عہدہ نبوت کے لئے انتخاب نہیں یا ان کا انتخاب ایسا غلط ہے کہ ایسے شخص کو نبوت کا عہدہ دیدیا جاتا ہے کہ اوروں کو تو قانون کا پابند بنا دیں اور خود ان کے خلاف کریں۔ عقل کبھی اس کو باوجود احسان کے طور پر نہ چھوڑ دینا کہ گناہیں نہ پابندی نہ ایک فرقہ ہے۔

نہیں کر سکتی بس جواب اشکال کا یہ ہے کہ انبیاء کو جو کچھ پیش آیا وہ مصیبت نہ تھی بلکہ صورت مصیبت تھی محض تاویل ہی نہیں بلکہ اس کی ایک دلیل ہے میں آپ کو ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے حقیقت مصیبت اور صورت مصیبت میں فرق معلوم ہو جائے گا وہ یہ کہ جس مصیبت سے انقباض اور پریشانی بڑھے وہ تو گناہوں کی وجہ سے ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو تسلیم و رضا زیادہ ہو۔ وہ حقیقت میں مصیبت نہیں گو صورت اس کی ہے۔ اب ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود دیکھ لے کہ مصیبت کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے اور اسی معیار کو حضرت انبیاء راویا کے مصائب اور اہل دنیا کے مصائب۔

میں موازنہ کرے تو اس کو معلوم ہو گا کہ حضرات انبیاء راویا پر ان واقعات سے یہ اثر ہوتا تھا کہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھتا اور رضا و تسلیم میں ترقی ہوتی تھی وہ غایت النقاہ و تقویٰ سے یوں کہتے تھے کہ۔

اے حریفانِ سلطہ اربابہ یار
غیر تسلیم و رضا کو چارہ
آہوئے نیگ و اوشیر شکار
در کف مشیر زخو خوارہ
اور یوں کہتے ہیں کہ

ناخوش تو خوش بود بر جان من
دل ندائے یار دل رنجان من

یہ حشوئہ کی حماقت ہے کہ انھوں نے انبیاء علیہم السلام کو اپنے اوپر قیاس کر لیا اور کہہ دیا کہ وہ بھی ہم جیسے بشر ہیں ان سے بھی گناہ ہو جاتے ہیں ان پر بھی مصائب آتے ہیں اور یہ نہ دیکھا کہ ہمارے مصائب میں کتنا زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس قیاس فاسد ہی نے مخلوق کو تباہ کیا ہے۔ اور یہی تو وہ بات ہے جس کی وجہ سے بہت سے کفار کو ایمان نصیب نہ ہوا۔ کیونکہ انہوں نے انبیاء کا ظاہر دیکھ کر ان کو اپنے جیسا سمجھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ

جملہ عالم زیر سبب گمراہ شد
گفتہ اینک ما لبشر ایشان شد
کم کسے زابدال حق آگاہ شد
ماؤ ایشان بستم خوابیم و خور
ایں ندانند ایشان از عی
کار یا کاں را قیاس از خود گیر
در میان فرقتے بودے منتہا
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

ایک شخص نے اس پر یہ میں اضافہ کیا ہے کہ

شکیں باشند کہ آدمی خورد شکیں باشند کہ آدم را خورد -

صاحبو! آغوش میں لینا دو طرح ہے ایک چور کو پکڑ کر بغل میں دبانا۔ گودبانے والا حسین و محبوب ہی ہو مگر چور اس دبانے سے خوش نہ ہوگا کیونکہ وہ عاشق نہیں ہے وہ اس دبانے سے پریشان ہوگا۔ بھاگنا چاہے گا۔ اور ایک آغوش میں لینا یہ ہے کہ محبوب اپنے عاشق کو لے کر بغل میں دباتے اور زور سے دباتے۔ اب تم اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کیا کہتا ہے کیا وہ اس تکلیف کی وجہ سے آغوش محبوب سے نکلنا چاہے گا۔ ہرگز نہیں، بلکہ یوں کہے گا کہ نہ شود نصیب شش کہ شود ہلاک تیغت سردوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی اسی طرح حق تعالیٰ دو طرح کے لوگوں کو دباتے ہیں ایک تو ان کو جو چور ہیں اور ایک ان کو جو اللہ تعالیٰ کے عاشق ہیں، چور تو خدا کی بندش سے گھبراتا ہے۔ اور عشاق کی یہ حالت ہے کہ

اگر تلخ بنیند و گر مر ہمیش

خوشا وقت شورید گمان عشش

بامیدش اندر گردائی صبور

گدایان از بادشاہی نفور

اگر تلخ بینند دم در کشند

دادم شراب لم در کشند

اب تو آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ ایک صورت مصیبت ہے ایک حقیقت مصیبت ہے۔ حقیقت مصیبت تو واقعی گناہوں سے آتی ہے مگر صورت مصیبت رفع درجات اور امتحان محبت کے واسطے بھی آتی ہے۔ (اکبر الاعمال ص ۱۴)

۱۵ جہلا کی اس غلطی کا جواب خیرات کی ہوئی

چیز بعینہ مردہ کو پہنچتی ہے،

بعض لوگ ہر موسم پر موسم کی چیزیں اپنے عزیزوں کے لئے خیرات کیا کرتے ہیں خاص کر وہ چیزیں جن سے مرنے والوں کو رغبت تھی اس میں بڑھے لکھے بھی مبتلا ہیں اور وہ بہت دور پہنچنے، انہوں نے اس عمل کے لئے کہ تَنَاوُا الْبَرَّ حَتَّى تَنْفِقُوا مِمَّا مَحَبُورَاتٍ سے استدلال کیا کہ انفاق محبوب شرعاً مطلوب ہے، پھر اس میں کیا حرج ہے کہ مرنے

والے کا محبوب مر غوب خیرات کیا جائے ہیں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے "تَمَاتُجُونَ" فرمایا ہے "یَا جُنُودُ" نہیں فرمایا۔ پس خیرات کرنے والے کو اپنا محبوب خیرات کرنا چاہئے نہ کہ مردہ کا محبوب، اور اس میں یہ ہے کہ اصل مدار فضیلت کا اخلاص ہے اور اپنے محبوب کے انفاق میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے نہ کہ دوسرے کے محبوب کے انفاق میں، یہ تو ان کے استدلال کا جواب تھا۔

اب میں وہ دلیل بیان کرتا ہوں جس سے یہ معلوم ہوگا کہ جو چیز ہم خیرات کرتے ہیں مردوں

خیرات ہونی والی چیزوں کا ثواب پہنچتا ہے

کو وہ بعینہ نہیں پہنچتی بلکہ اس کا ثواب پہنچتا ہے۔ سنئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لَنْ يَنَالَ آثِلُ لُحْمٍهُمْ اَوْ لَا دِمَائُهمَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ النَّفْسُ حَتَّى مَسْكُوٍّ۔ اس میں صاف تصریح ہے کہ قربانی کا گوشت و خون خدا کے یہاں نہیں پہنچتا۔ بلکہ تمہارا خلوص و اخلاص پہنچتا ہے۔ اور اسی ہی کام کو ثواب پہنچتا ہے اور وہی ثواب مردوں کو پہنچا دیا جاتا ہے جب کہ ان کی طرف سے قربانی یا اور کوئی خیرات کی جائے اور اس سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ محرم کے شربت میں بھی عوام کے عمل کا مبنی یہی خیال ہے کہ شہداء کے کر بلا پیاسے شہید ہوئے تھے، اس لئے شریعت پہنچانا چاہئے کہ پیاس نہجھے۔ سو اول تو یہی سمجھنا غلط ہے کہ ان کو یہ شربت پہنچتا ہے۔ شربت ہرگز نہیں پہنچتا۔ دوسرے یہ عمل عقیدت کے بھی خلاف ہے۔ کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ حضرات ابھی تک پیاسے ہیں۔ یہ اعتقاد آپ ہی کو مبارک ہو۔ ہمارا تو یہ اعتقاد ہے کہ ان کو شہادت کے وقت ہی انشاء اللہ تعالیٰ شراب طہور کا وہ جام مل چکا ہے جس سے پہلی بھی پیاس جاتی رہی اور آئندہ بھی جاتی رہی۔ اور اس اعتقاد فاسد کا ایک مفسدہ یہ ہے کہ بعض دفعہ محرم کا مہینہ سردیوں میں آتا ہے۔ تو اس وقت بھی شربت ہی پلایا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت لوگ بیمار ہو جاتے ہیں کسی کو مونیہ ہو جاتا ہے خدا بچائے ایسی پابندی رسم سے اور غور کر کے دیکھا جاتا ہے کہ رسوم کی پابندی ہمیشہ بے سمجھے ہی ہوتی ہے۔ (دارالمسعود ص ۵)

جس کا مبنی یہ خیال ہے کہ

خیرات کی جانیں والی چیزیں مردہ کو نہیں پہنچتی ہیں

جو چیز خیرات کی جاتی ہے مردہ کو وہی پہنچتی ہے سو یہ خیال غلط ہے اور مردہ کی محبوب چیز خیرات کرنے کا مبنی یہ حسرت ہے کہ ہائے آج وہ ہوتا تو وہ بھی کھاتا۔ جب وہ نہیں ہے تو لاؤ خیرات ہی

کرد و تاکہ اس کو پہنچ جائے۔ منشا یہ ہے کہ ہم کو نعمائے جنت کا استحقاق نہیں ہے اگر ہم کو بات مستحضر ہوتی کہ وہ تو نعمائے جنت سے محظوظ و مسرور ہو رہا ہے۔ تو یہ حسرت بہگز نہ ہونی کیونکہ نعمائے جنت سے دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کو کیا نسبت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمائے جنت میں رُساؤں و نخلؑ وغیرہ کا بیان فرمایا ہے ان کو دنیا کے نخل و زناں پر قیاس نہ کیا جاوے۔ نعمائے آخرت کو نعمائے دنیا سے محض اسی مشارکت ہے۔ ورنہ حقیقت میں وہ اوپر چڑیں ہیں برائے نام دونوں میں کچھ مشابہت ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے راجہ محمود آباد نے وائسرائے کی دعوت میں ایک انار تیار کر لیا تھا جو دوسروں پر بے میں تیار ہوا تھا اس کی صورت اور نام تو انار کا تھا۔ مگر حقیقت میں وہ اوپر چڑھی خود قرآن شریف میں ارشاد ہے ۔ ۔ ۔ ۔ - قَوَّامٌ مِّنْ فَضْلِهِ تَذَرُّهُ كَانَدٍ مُّرَا - کہ جنت میں چاندی کے شیشے ہوں گے یعنی جن میں آئینہ کی سی شفافی اور صفائی ہوگی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی چیزیں دنیا کی چیزوں سے صرف نام میں مشابہ ہیں ورنہ وہاں کی چاندی آئینہ کی طرح شفاف ہوگی جس میں نگاہ آپار ہو جائے گی۔ دنیا کی چاندی میں یہ بات کہاں۔ تو اب تم اس دنیا میں ہو کہ مُردے یہاں ہوتے اور مردے اس متنا میں ہی ہیں کہ تم وہاں ہوتے۔ خدا جانے یہاں کیا رکھا ہے جس پر لوگ فریفتہ ہیں

حیثیت صورت تاچینس مجنوں شہوی

زیر و نقره چسبیت تا مفتول شوی

وہاں کی نعمتوں کو حدیث سے معلوم کرو۔ حدیث میں آتا ہے کہ حوروں کے سر پر ایسی نفیس خوبصورت

حوریں واران کے دُوبے

اور دھیناں ہیں کہ اگر ان کا ایک پلہ دنیا میں لٹک جائے تو آسمان کے چاند و سورج ماند پڑ جائیں وہاں کی خوں ایسی حسین ہیں کہ ستر جوڑوں کے نیچے سے ان کا بدن جھلکتا ہے جنت کی مٹی جو اہرات اور مشک کی ہے ۔

حوض کوثر کا پانی لا یشربا بعدھا ابداً۔ جس نے اس میں سے ایک دفعہ پانی پی لیا اس کو کبھی پیاس ہی نہ لگے گی اور لطف یہ کہ بدون پیاس کے بھی اس کی عنت ہوگی اور اس کا لطف حاصل ہوگا۔ دنیا کے پانی میں پیاس کے وقت تو مزہ آتا ہے بدون لہ انار لے کھجور۔

پاس کے مزہ نہیں آتا۔ جنت کے پانی کی میٹھان ہے کہ ایک دفعہ پی کر عمر بھر کے لئے پیاس کی کلفت دفع ہو جاوے گی اور بدون پیاس کے اس کامزہ حاصل ہوگا۔ بتلاؤ دنیا میں ایسا پانی کہاں ہے جس سے پیاس ہی نہ لگے اور بدون پیاس کے اس سے مزہ آئے۔ اس پر تمام نعمتوں کو قیاس کر لو کہ ان کی رائے جنت کو دنیا کی لذتوں سے محض نام کی مشارکت و مشابہت ہے۔ اب یہ حسرت کرنا کہ ہمارے مُردہ عزیز دنیا میں ہوتے اور یہاں کی نعمتوں سے متلذذ ہوتے مگر حرافت نہیں تو اور کیا ہے۔ ارے ان نعمتوں کو ان کے سامنے رکھو تو شاید ان کو فتنے آنے لگے۔ (ایضاً ص ۱۸)

۵۲ اس شبہ کا جواب کے مشائخ بعض مرتبہ

نااہل کو خلیفہ کر دیتے ہیں

جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اجازت کے وقت اہل ہو پھر نا اہل ہو گیا۔ اور ایسا ہونا مستبعد نہیں اسی لئے عقائد کی کتابوں میں مذکور ہوا ہے۔ ایک قویہی کہ المستعید قد یسقطیٰ ایک آدمی کبھی شفی بھی ہو جاتا ہے اور یہ اہل سنت کے عقائد میں داخل ہے (العبدالربانی ص ۲۵) یہ امر موجب اعتراض نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے اجازت کے وقت وہ اہل ہی ہوں بعد میں شفی ہو گئے ہوں اور یہ الواصل لایر کے خلاف نہیں۔ کیونکہ اس مسئلہ میں واصل فی الواقع مراد ہے نہ نئی زعم شیخ باقی الواصل لایر کا قاعدہ واقع کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے بخاری کی ایک حدیث میں ہر قل کا قول مذکور ہے۔ وکن الیک الایمان اذا خلط بشأنة القلوب کہ ایمان کی حلاوت جب قلب میں پیوستہ ہو جاتی ہے تو اتراد ممکن نہیں۔ اس قول کو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نقل فرمایا ہے کسی نے اس پر کلام نہیں کیا۔ پس تقریر صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ مسئلہ ثابت ہو گیا۔ دوسرے جواب اس اعتراض کا اور ہے جو لطیف بات ہے اور اس مقام پر اسی کو ذکر کرنا مقصود ہے وہ یہ کہ مشائخ بعض دفعہ کسی نا اہل میں جبار و شرم دادہ دیکھ کر اسے اس امید پر مجاز کر دیتے ہیں کہ وہ دوسروں کی تربیت کرے گا تو اس کی وجہ اور شرم سے اپنی بھی اصلاح کرتا رہے گا یہاں تک کہ ایک دن کامل ہو جائے گا۔ پھر بعضے کی شیخ کی اس امید کو غلط کر دیتے ہیں مگر ایسے کم نکلتے ہیں۔ غالب حالت یہی ہے کہ جس میں

ہے۔ پھر اتنا زکوٰۃ کا یہ طاعت مالیہ ہے اور اوپر جو اتنا مال کا ذکر ہوا ہے۔ وہ انفاق و نفقہ ہے۔ جس کی حدیث ترمذی میں تصریح ہے ان فی المال لحقاً سو ہی الزکوٰۃ شتم تلا الایۃ (اور علیٰ حبہ اس کا قرینہ بھی ہے کیونکہ اگر اس کا مرجع مال ہے تو حب مال کے ازالہ کیلئے فقط اتنا زکوٰۃ کافی نہیں کچھ زائد انفاق کرنا چاہیے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ مرجع میں تو حب الہی کا مقتضی بھی یہی ہے کہ فرض کے علاوہ کچھ مال محض محبت کی وجہ سے خرچ کیا جائے، اس کے بعد ایفا عہد کا امر ہے جو معاشرت کے متعلق ہے۔ پھر صبر کا امر ہے جو سلوک کے متعلق ہے غرض اس میں تمام شعب تقویٰ کو اجمالاً جمع کر دیا گیا ہے اس لئے اولئک هم المتقون پراس کو ختم فرمایا ہے۔ تو اب بتلانیے کہ خدا تعالیٰ نے یہ تدبیر بتلانی ہے یا نہیں۔ اور یہ تدبیر اختیاری ہیں یا نہیں۔ تو اب جنت میں جانا اختیاری ہوا یا نہیں۔ رہا یہ کہ تدبیر توحید تعالیٰ نے بتلانی ہیں مگر ان پر عمل کرنا اور ان کا بجالانا تو مشیت پر موقوف ہے بدو مشیت کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو بے شک یہ ہمارا عقیدہ ہے مگر اس میں جنت و دوزخ ہی کی کیا تخصیص ہے دنیا کے بھی سب کام مشیت ہی پر موقوف ہیں کھیتی کرنا ملازمت کرنا بھی تو مشیت پر موقوف ہے۔ پھر ان کے لئے کیوں سعی کی جاتی ہے۔ وہاں تو یہ کہا جاتا ہے

رزق ہر چند بیگیاں برسد
لیک بشرط است جستن از درہا
اور مزاج بھی تو مشیت پر موقوف ہے۔ پھر سانپ بچھو وغیرہ سے کیوں حفاظت کی جاتی ہے اس کے متعلق یوں کہتے ہیں

اگر چہ کس بے اجل نہ خواہد مرد
تو مرد در دہان اژدہا
یہ کیا کہ سارا توکل امور آخرت ہی میں صرف کیا جاتا ہے اگر بڑا توکل کا دعویٰ ہے تو پہلے

دنیاوی امور میں بھی کیا ہونا۔ میں توکل کو منع نہیں کرتا بلکہ آپ کی غلطی ظاہر کرتا ہوں کہ جبکہ آپ نے توکل سمجھا ہے وہ توکل نہیں ہے توکل کے معنی نہیں کہ اسباب تدبیر کو قطعاً ترک کر دیا بلکہ طریقہ حق ہے کہ تدبیر و تقدیر دونوں کو ملایا جائے۔ یعنی کام کر کے توکل کرنا چاہیے

گرتوکل می کنی دو کار کن
کسب کن پس تکیہ بر جبار کن
دنیا میں بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ کھیتی کر کے مٹھ کے متعلق خدا تعالیٰ پر نظر رکھو۔ خلاصہ یہ کہ عمل میں تو اسباب کو اختیار کرو اور مٹھ میں توکل کرو۔ چنانچہ دنیوی معاملات میں سب

یہی طرز ہے مگر نہ معلوم یہ تجزیہ کیسا ہے کہ امور اخرویہ میں عمل اور مٹھ دونوں میں توکل سے کام لیتے ہو۔ حالانکہ وہاں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا جو معاملات دنیا میں اختیار کر رکھا ہے ورنہ دونوں میں فرق بتلانا چاہیے بلکہ اگر عذر کیا جائے تو دنیا و آخرت کا فرق اس کو مقتضی ہے کہ مقاصد دنیویہ میں تو ترک تدبیر و تعطیل اسباب کی گنجائش ہے اور مقاصد اخرویہ میں ترک تدبیر و تعطیل اسباب کی مطلقاً گنجائش نہیں کیونکہ توکل معنی ترک اسباب کی حقیقت ہے۔ ترک اسباب منظومہ عین مامور بہا یعنی جن اسباب پر مسبب کا ترک عادتاً یقینی قطعی نہ ہو اور شرعاً واجب بھی نہ ہوں ان کو ترک کر دیا جائے باقی جن اسباب پر عادتاً مسببات کا ترک یقینی ہے ان کا ترک جائز نہیں اور نہ اس کو توکل کہا جائے گا کہ بھوک کی حالت میں آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر میٹھ جائیں کہ اللہ میاں کو منظور ہوگا تو چرٹ خود بخود ہو جائے گا۔ اگر شخص بھوکوں مگر کیا تو عاصی ہوگا۔ اور اسباب منظومہ کا ترک بھی اس کو جائز ہے جو خود بھی قوی الہمت ہو اور اس کے اہل و عیال بھی یا اس کے اہل و عیال ہی نہ ہوں۔ اور ضعیف الہمت کو یا جس کے عیال ضعیف ہوں اس کو ان کا بھی ترک جائز نہیں۔ اسی طرح اسباب مامور بہا کا ترک توکل نہیں جب توکل کی حقیقت معلوم ہوگئی تو اب سوچئے کہ ثمرات آخرت کے لئے جو اسباب شریعت نے بیان کئے ہیں وہ کیسے

ہیں۔ آیا مامور بہا ہیں یا نہیں۔ سونپا ہے کہ مامور بہا ہیں اور نیز آیا ان پر مسبب کا ترتب شرعاً ضروری ہے یا منظومہ تو نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اسباب آخرت پر ترتب مسبب لازم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَإِنَّهُ يَكُونُ مِنَ الْمُتَّقِينَ وَلَا يَطْلُمُونَ نَفْسِيَّ اور ارشاد ہے فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ اور بہت سے نصوص ہیں جن میں اعمال آخرت کے متعلق ترتب وعدہ ہے کہ جزا ضرور مرتب ہوگی۔ اور دنیا کے متعلق نہ وعدہ ہے نہ اکثر اسباب میں ترتب ضروری ہے گو ہر چہ کے لئے اسباب موجود ہیں چنانچہ حدیث میں ہے مَا جَعَلَ اللَّهُ دَاءً لِّأَجْلِ دَاءٍ اور اسی واسطے تدبیر مشروع ہے مگر ان پر مٹھ ہونے کا حق تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے اس لئے کبھی تخلف بھی ہو جاتا ہے کہ کھیتی کرتے ہیں اور پیداوار نہیں ہوتی اور کرتے ہیں اور شفا نہیں ہوتی۔ اور نہ اس پر عادتاً ترتب ضروری ہے اور نہ یہ شرط

ہے کہ بدون دوا کے صحت نہ ہو سکے یا جب دوا کی جائے تو صحت ضرور ہو جائے بخلاف اعمال آخرت کے کہ ان کو اپنے ثمرات کے ساتھ علیت و مشروطیت دونوں کا علاقہ ہے گو یہ علیت و مشروطیت عقلی نہ ہو۔ شرعی ہی ہو، تو لزوم ترتب میں اعمال آخرت کی سب کی وہ حالت ہے جو دنیا میں بعض اسباب قطعہ یقینیہ کی حالت ہے جن پر عادتاً ترتب اثر ضروری ہے جیسے اکل پیشین کا اور مشرب پر ریٹ کا مرتب ہونا بلکہ وعدہ و عدم وعدہ کا تفاوت سے اعمال آخرت ان اسباب سے بھی الصق ہیں پس جیسے ان اسباب کو دنیا میں ترک کرنا جائز نہیں یہی حکم جملہ اسباب آخرت کا ہے کہ ان میں سے کسی کا بھی ترک جائز نہیں۔ کیونکہ وہ سب اسباب قطعہ یقینیہ ہیں جن پر ترتب اثر کا بعض میں وعدہ بھی ہے۔ پھر حیرت ہے کہ جن اسباب پر ترتب اثر کا وعدہ بھی نہیں وہاں تو چھوٹی سے چھوٹی تدبیر سے بھی دریغ نہیں اور جہاں ترتب اثر کا وعدہ ہے نہ تخلف کا احتمال ہی نہیں وہاں تو کل اختیار کر لیا ہے پس دنیا و آخرت کے فرق پر نظر کی جائے تو اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے کہ دنیا کے تو بعض اسباب میں توکل جائز ہو اور آخرت کے کسی سبب میں بھی جائز نہ ہو۔ یہ تو اسباب کا حکم تھا۔ رہے مسببات اور ثمرات تو ان میں مطلقاً توکل واجب ہے خواہ ثمرہ دنیا میں یا ثمرہ آخرت میں۔ یعنی ثمرات کو اسباب کا نتیجہ نہ سمجھے خدا تعالیٰ کی عطا سمجھے خوب سمجھ لو۔ (دوائر النفاذ ص ۱)

۵۴ اختلاف رویت کی صورت ہیں روزہ کو نبی تاریخ کا افضل ہوگا

خوب کہہ لو کہ تمہارا یہی خیال غلط ہے کہ ثواب کے اعتبار سے بھی پندرہ ایک ہی ہوگی گو حساب میں پندرہ ایک ہو۔ مگر حق تعالیٰ کسی خاص مکان یا زمانہ میں ایک فضیلت پیدا کر کے اس کے پابند نہیں ہو جائے کہ دوسرے مکان میں یا زمانہ میں اس کی فضیلت کو پیدا نہیں کر سکتے ہیں بلکہ وہ ہر جگہ رات اور ہر دن میں اس کی فضیلت کو پیدا کر سکتے ہیں۔ رہا یہ کہ امکان سے دو تہ تو لازم نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری نصوص سے اس کا وقوع بھی ثابت ہو رہا ہے کہ حق تعالیٰ ایسا ہی کرتے ہیں کہ جو برکت ایک تاریخ میں تمہارا سے واسطے ہے وہی برکت دوسری

لہ آسودگی لہ سیرانی لہ زیادہ چکینے والا

کے لئے دوسری تاریخ میں پیدا کر دیتے ہیں جس کو وہ اپنی تحقیق کے موافق پندرہ سمجھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کو برکت کا ایک رات سے دوسری رات میں منتقل کر دینا کیا مشکل ہے۔ ان کی شان تو یہ ہے۔ اُولَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ كَمْ حَقُّ تَعَالَىٰ كُنَّا هُمْ كَوْحَنُ بِنَادِيْتِے اور حرم کو طاعت کر دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ حشر میں اللہ تعالیٰ ایک بندہ سے دریافت فرمائیں کہ کیوں تو نے ایسا کیا تھا تو نے فلاں گناہ کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اول چھوٹے چھوٹے گناہوں کو گناہیں گے بندہ سب کا اقرار کرے گا اور اپنے دل میں ڈرے گا کہ ابھی سنگین گناہوں کا تو ذکر ہی نہیں ہوا دیکھئے ان پر کیسی گرفت ہو مگر حق تعالیٰ کہا ترک کے ذکر سے پہلے ہی یہ فرمائیں گے کہ جاؤ ہم نے تم کو ہر گناہ کے عوض ایک نیکی دی۔ اب وہ بندہ خود اپنے گناہ گنواؤں کا کہ الہی میں نے تو اور بھی بڑے بڑے گناہ کئے ہیں ان کا یہاں ذکر ہی نہیں آیا مجھے ان کے عوض بھی نیکیاں دلوائیں یہ تو آخرت میں ہوگا اور دنیا میں بیدل اللہ سیئاتہم حسنات کا مصداق یہ ہے کہ ملکات سیئات کو مبدل بہ ملکات حسنات کر دیتے ہیں بخل و سناوت سے اور جہل کو علم سے بدل دیتے ہیں، اور حسنات میں یہ صورت ہے کہ پانی کو بول کر دیتے ہیں جیسا کہ قوم فرعون پر عذاب دم مسلط ہوا تھا اور خون کو دودھ بنا دیتے ہیں جیسا کہ عورتوں اور گائے بکری کے پستان میں مشاہد ہے تو اگر وہ ایک تاریخ کی برکت دوسری تاریخ میں بھی رکھ دیں تو کیا بعید ہے۔ مولانا فرماتے ہیں یہ

گر بخواب عین غم نشا دی شود عین بندہ بے آزادی شود
کیسا داری کہ تبدلش کنی گرچہ جوئے خون بود تبدلش کنی

واقعی حق تعالیٰ سے زیادہ کیسا بنانے والا کون ہوگا جب تم کیسا وی تدبیر سے تابنے کو مونا اور رانگ کو چاندی بنا دیتے ہو تو وہ پتھر کو سونا بنا دیں تو کیا بعید ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے بلکہ سونا چاندی اور سب ہا میں زمین ہی سے نکلتی ہیں اللہ تعالیٰ نے اس مٹی ہی سے کیا کیا دیا۔

س کی یہاں جو تاریخ ثابت ہوئی کرے رہا یہ کہ ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں اس کے لئے دوسری نصوص موجود ہیں جن سے معلوم ملے کہ ہر بستی اور ہر شہر کے لئے اسی تاریخ میں برکت ہے جو ان کے حساب سے پندرہ تاریخ ہے۔ حدیث میں ہے۔ الصوم یوم تصومون والفضل یوم تفضلون والاضعی

یوم تصحون۔ ترجمہ: روزہ اسی دن کا ہے جس دن تم روزہ رکھو اور عید الفطر کا وہی دن ہے جس دن تم عید الفطر منانا اور عید الاضحیٰ اسی تاریخ کو ہے جس دن تم قربانی کرو اس کا مطلب حضرت استاد نے یہ فرمایا کہ جس تاریخ میں تم اپنی تحقیق کے موافق روزہ شروع کر دیا تحقیق کر کے روزہ ختم کر دو تو خدا کے نزدیک وہی روزہ اور افطار کی تاریخ ہے یعنی جو ثواب اور برکت ماہ رمضان و عید الفطر و عید الاضحیٰ کے دن میں رکھی گئی ہے۔ ہر شہر کے مسلمانوں کو ان ایام میں حاصل ہوگی جو ان کے نزدیک رمضان وغیرہ کی تاریخیں ہیں۔ لہذا تم اپنی تحقیق کے موافق جس دن کو پندرہ شعبان سمجھ کر روزہ رکھو گے وہی مہتر ہے اور اس دن سے پہلی رات تمہارے لئے پندرہویں رات ہے۔ اختلاف تاریخ سے شب میں نہ پڑو (السرمد ص ۳)

۵۵ عورتوں کے اس عمل کی زدید کہ گھر میں میلی کھلی رہتی ہیں اور باہر زینت کیسا کھتے

جو عورتیں اپنی راحت کے لئے یا اپنا اور اپنے خاوند کا جی خوش کرنے کے لئے قیمتی کپڑا یا زیور پہنتی ہیں ان کو تو گناہ نہیں ہوتا اور جو محض دکھاوے کیلئے پہنتی ہیں وہ گناہ گار ہیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ اپنے گھر میں تو ذلیل و خوار بھنگوں کی طرح رہتی ہیں اور جب کہیں تقریب میں نکلیں گی نواب کی بچی بن کر جائیں گی۔ جیسے لکھنؤ کے مزدور دن بھر تو لنگوٹا باندھ کر مزدوری کریں گے اور شام کو کرائے کے کپڑے پہن کر جیب میں دو پیسہ ڈال کر نکلتے ہیں جن میں سے ایک پیسہ کا توپان کا بیڑا لیں گے اور ایک پیسہ کا پھولوں کا بگڑا گلے میں ڈالیں گے جیسے کسی نواب کے بچے ہوں۔ اب عورتیں دیکھ لیں کہ یہ جوڑے بدل بدل کر جاتی ہیں۔ اس میں ان کی نیت کیا ہے۔ اگر اپنی راحت اور دل کی خوشی ہے تو گھر میں اس بٹھاٹھ سے کیوں نہیں رہتیں بعض کہتی ہیں کہ ہم تو اپنے خاوند کی عزت کے لئے عمدہ جوڑا پہن کر نکلتی ہیں اگر اس تاویل کو مان لیا جائے تو پہلی دفعہ جو ایک جوڑا تم نے تقریب کے لئے نکالا تھا خداوند کی عزت کے لئے تمہارے خیال میں وہی کافی تھا۔

اب دیکھو کہ اگر تقریب میں پے درپے دو تین دن جانا ہو جاوے تو تم تینوں دن

اسی ایک جوڑے میں جاؤ گی یا ہر دن نیا جوڑا بدلو گی۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہر دن نیا جوڑا بدلا جاتا ہے آخر کیوں خاوند کی عزت کے لئے ایک ہی کافی تھا۔ مگر نہیں ہر دن نیا جوڑا بدلتی ہیں اس لئے کلیک جوڑے میں ہر دن نہیں جاسکتیں اگر اور کچھ نہ بدلیں گی تو دوپٹہ ضرور ہی بدل لیں گی۔ تاکہ ہر دن نیا جوڑا معلوم ہو۔ پھر محفل میں بیٹھ کر ان کو زیور دکھانے کی حرص ہوتی ہے بعض تو اسی عرض کے لئے ننگے سر رہتی ہیں تاکہ سب کو سر سے پر تک کا زیور نظر آجائے اور جو ان میں سے مولوں ہیں وہ ننگے سر تو نہیں رہتیں مگر کسی نہ کسی بہانے سے وہ ابھی اپنا زیور دکھلا دیتی ہیں کہیں سر کھجلاتی ہیں کہیں کان کھجلاتی ہیں۔ یہ ریا ہے اور اس عرض سے قیمتی کپڑا پہننا یا زیور حرام ہے۔ ایک مرض عورتوں میں یہ ہے کہ جب یہ کہیں محفل میں جاتی ہیں تو سب کے لباس اور زیور کو سر سے پر تاک لیتی ہیں تاکہ دیکھیں کہ ہم سے تو کوئی زیادہ زیور نہیں رکھتی ہے اور ہم کسی سے گھٹے دے تو نہیں ہیں یہ بھی اس ریا اور تجر کا شعبہ ہے یہ مرض مردوں میں کم ہے۔ اور اگر دس آدمی مل جلے مجتمع ہوں تو مردوں میں سے کسی کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ کس کا لباس کیسا ہے اسے مجلس سے اٹھ کر وہ کسی کے لباس کا حال بیان نہیں کر سکتے۔ اور عورتوں میں سے ہر ایک کو یاد رہتا ہے کہ کس بیوی کے پاس کتنا زیور تھا اور لباس کیسا تھا۔ یاد رکھو اس عرض کے قیمتی لباس پہننا جائز نہیں۔ (غریب لدینا ص ۲۹)

۵۶ مردوں کی کوتاہی کہ عورتوں کے دینی امور اپنے ذمہ نہیں سمجھتے!

وہ اپنے ذمہ کو صرف دنیوی حقوق سمجھتے ہیں دینی حقوق اپنے ذمہ سمجھتے ہی نہیں کہ ہمارے ان کے دین کا بھی کوئی حق ہے مثلاً گھر میں اگر یہ تو پوچھتے ہیں کہ کھانا تیار ہوا یا نہیں۔ مگر یہ ہی نہیں پوچھتے کہ تم نے نماز پڑھی یا نہیں اگر کھانے گھر میں آئے اور معلوم ہوا کہ ابھی تیار نہیں ہے تو خفا ہوتے ہیں یا تیار تو ہو گیا مگر مرضی کے موافق تیار نہیں ہوا تب بھی خفا ہوتے ہیں یہی یہ معلوم ہوا کہ بیوی نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی تو ان کو ذرا بھی ناگواری نہیں ہوتی نہ بیوی خفا ہوتی ہے۔ بلکہ اگر کسی کی بیوی عمر بھر بھی نماز نہ پڑھے تو بہت سے مردوں کو اس کی بھی

پرواہ نہیں ہوتی اور کبھی کسی کو خیال بھی ہوتا ہے تو یہ وہ ہیں جو دیندار کہلاتے ہیں اور وہ بھی یوں ہی چلتی سی بات کہہ دیتے ہیں کہ بی نماز کا ترک کرنا بڑا گناہ ہے۔ بس اتنا کہہ کر اپنے نزدیک سبک دوش ہو گئے اور جب کسی نے ان سے کہا کہ تم اپنی بیوی کو نماز کے لئے منبہ کیوں نہیں کرتے تو یہ جواب دیتے ہیں کہ کہہ تو دیا تھا اب وہ نہیں پڑھتی تو میں کیا کروں لیکن میں کہتا ہوں کہ انصاف سے بتلائیے کیا آپ نے نماز کے لئے اسی طرح کہا تھا جیسے نمک تیز ہونے پر کہا تھا اور اگر ایک دو دفعہ کے کہنے سے اس نے نمک کی دسٹی کا اہتمام نہ کیا ہو تو کیا وہاں بھی آپ ایسے ہی خاموش ہو جاتے ہیں جیسے نماز کے لئے ایک دو دفعہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ ہرگز نہیں۔ نمک تیز ہونے پر تو آپ سر توڑنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں اور ایسی بڑی طرح خفگی ظاہر کرتے ہیں کہ بی بی سمجھ جاتی ہے کہ میاں بہت ناراض ہیں اس لئے وہ بہت جلد نمک کی اصلاح کا اہتمام کرتی ہے۔ صاحبو! نماز کے لئے آپ نے اس طرح کبھی نہیں کہا جس سے بی بی سمجھ جائے کہ میاں بہت ناراض ہو گئے ہیں اگر یہاں بھی اسی طرح خفگی ظاہر کرتے تو وہ اس کا بھی ضرور اہتمام کرتی۔ اور اگر ایک دفعہ کے کہنے سے نہ پڑھتی تو دوسرے وقت پھر خفا ہوتے پھر نہ پڑھتی تو تیسرے وقت پھر کہتے اور جب تک وہ نماز نہ پڑھتی برابر کہتے رہتے اور مختلف طریقوں سے اپنی خفگی ظاہر کرتے مثلاً پاس لیٹنا ترک کر دیتے یا اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہ کھاتے جیسا کہ نمک کی تیزی پر اگر ایک بار خفا ہونے سے اثر نہ ہوا تو آپ خاموش نہیں ہو جاتے بلکہ برابر کہتے رہتے ہیں اور وہاں کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ اتنی دفعہ تو کہہ دیا ہے اب بھی وہ نہیں ماننی تو میں کیا کروں۔ بس خاموش ہو جاؤں۔ صاحبو! انصاف سے بتلائیے کہ ہم نے کبھی کھانے پینے کے باب میں بھی اپنے جی کو اسی طرح سمجھایا ہے جیسا نماز کے باب میں سمجھایا جاتا ہے۔ ہرگز نہیں یہ تو سرسہ کو تا ہی ہے اگر آپ بی بی کو نمازی بنانا چاہیں تو کچھ دشوار بات نہیں کیونکہ عورت حاکم نہیں بلکہ محکوم ہے۔ چنانچہ اپنی غرض کے لئے ان پر حکومت کی بھی جاتی ہے مگر دین کے لئے اس حکومت سے ذرا کام نہیں لیا جاتا۔

(حقوق البیت ص ۶)

۵۷ زنانه اسکولوں کا قیام عورتوں کیلئے

زہرِ قاتل ہے

بعض آدمی اپنی لڑکیوں کو آزاد میاں عورتوں سے تعلیم دلاتے ہیں یہ تجربہ ہے کہ ہم صحبت کے اخلاق و جذبات کا آدمی میں ضرور اثر آتا ہے خاص کر جب وہ شخص ہم صحبت ایسا ہو کہ متبوع و معظم بھی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ استاد سے زیادہ ان خصوصیات کا کون جامع ہوگا تو اس صورت میں وہ آزادی و بیباکی ان لڑکیوں میں بھی آوے گی اور میری رائے میں سب سے بڑھ کر جو عورت کا چیا اور انقباض طبعی ہے اور یہی مفتاح ہے تمام تخری۔ جب یہ نہ رہا تو اس سے پھر نہ کوئی نیر متوقع ہے نہ کوئی شر مستبعد ہے، ہر چند کہ اذا فائدت الجیاء فافعل ما شئت یعنی جب تجھ سے جیا جاتی رہے تو کر جو جی چاہے حکم عام ہے لیکن میرے نزدیک ”ما شئت“ کا عموم نساء کے لئے بہ نسبت رجال کے زیادہ ہے اس لئے کہ مردوں میں پھر بھی عقل کسی قدر مانع ہے اور عورتوں میں اس کی بھی کمی ہوتی ہے اس لئے کوئی مانع ہی نہ رہے گا اسی طرح اگر استانی ایسی نہ ہو لیکن ہم سبق اور ہم مکتب لڑکیاں ایسی ہوں تب بھی اس کے قریب مضرتیں واقع ہوں گی۔

اس تقریر سے دو جزئیوں کا حال بھی معلوم ہو گیا ہو گا جن کا اس وقت بے تکلف

موجودہ زمانہ میں اسکول کا حال

شیوع ہے۔ ایک لڑکیوں کا عام زمانہ اسکول بنانا اور مدارس عامہ کی طرح اس میں مختلف طبقات اور مختلف خیالات کی لڑکیوں کا روزانہ جمع ہونا۔ گو معلمہ مسلمان ہی ہو اور یہ ناڈولیوں ہی میں ہو اور گو یہاں اگر پردہ ہی کے مکان میں رہنا ہو لیکن تاہم واقعات نے دکھلادیا ہے اور تجربہ کر دیا ہے کہ یہاں ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں کہ جن کا ان کے اخلاق پر بڑا اثر پڑتا ہے اور یہ صحبت اکثر عفت سوز ثابت ہوتی ہے۔ اور اگر استانی بھی کوئی آزاد یا مکار مل گئی تو کرملہ و نیم چڑھائی کی مثال صادق آجاتی ہے۔ اور دوسری جزئی یہ کہ اگر کہیں مشن کی میم سے بھی بروزانہ یا ہفتہ وار نگرانی تعلیم یا صنعت سکھانے کے بہانے سے اختلاط

لہ کنجی

ہونے لگا تب تو نہ ابرو کی خیر ہے نہ ایمان کی۔ مگر افسوس صد افسوس ہے کہ بعض لوگ ان آفات کو باریہ افتخار سمجھ کر خود اپنے گھروں میں بلاتے ہیں۔ میرے نزدیک تو آفات مجسمہ سے کچی تو بچی اور اور تابع ہو کر تو کیا ذکر کسی بڑی بڑھی سلمان عورت کا مقبوع ہو کر بھی عمر بھر میں ایک بار تک کام ہونا بھی خطرناک ہے۔ جن مضر توں کے ذکر کا اوپر وعدہ تھا ان میں سے بعض یہی ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم کا طریقہ | اسلام برقی لڑکیوں کے لئے یہی ہے جو زمانہ دراز سے چلا آتا ہے کہ دو دو چار چار لڑکیاں اپنے اپنے تعلقات کے مواقع میں آئیں اور پڑھیں اور حتی الامکان اگر ایسی استانی مل جاوے جو تنخواہ نہ لے تو تجربہ سے تعلیم زیادہ بابرکت اور با اثر ثابت ہوئی ہے اور بدرجہ مجبوری اس کا بھی مضائقہ نہیں کہ استانی تنخواہ سے ملے۔ اور جہاں کوئی ایسی استانی نہ ملے اپنے گھر کے مرد پڑھا دیا کریں۔ تو پڑھانے کا تو یہ طرز ہوا۔ اور نصاب تعلیم ہو کہ اول قرآن مجید حتی الامکان صحیح پڑھا یا جائے پھر کتب دینیہ سہل زبان کی جن میں تمام اجزاء دین کی مکمل تعلیم ہو میرے نزدیک اس وقت بہشتی زیور کے دسوں حصے ضرورت کے لئے کافی ہیں اور اگر گھر کا مرد تعلیم دے تو جو مسائل شرمناک ہوں ان کو چھوڑ دے اور اپنی بی بی کے ذریعہ سے سمجھا دے اور اگر یہ نظام بھی نہ ہو سکے تو ان پر نشان کر دے تاکہ ان کو یہ مقامات محفوظ رہیں پھر وہ سیانی ہو کر خود سمجھ لیں گی۔ یا اگر عالم شہر مسیر ہو تو اس سے پوچھ لیں گی یا شوہر کے ذریعہ سے کسی عالم سے تحقیق کرائیں گی دچنانچہ بندہ نے بہشتی زیور کے دستور العمل میں جو مائیکل پڑھوایا ہوا ہے اس کا خلاصہ لکھ دیا ہے۔

خصوصی مسائل | مگر بعض لوگ اس کو دیکھتے نہیں اور اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ اگر کوئی مرد پڑھانے لگے تو ایسے مسائل کس طرح پڑھاوے اس لئے ان کا لکھنا ہی کتاب میں مناسب نہ تھا کیسی کچی سمجھ ہے، بہشتی زیور کے اخیر میں مفید رسالوں کا نام بھی لکھ دیا ہے جن کا پڑھنا پڑھانا اور مطالعہ عورتوں کو مفید ہے اگر سب نہ پڑھیں تو ضروری مقدار پڑھ کر باقیوں کو مطالعہ میں ہمیشہ رکھیں اور تعلیم کے ساتھ ان کے عمل کی بھی نگرانی رکھیں اور اس کا بھی انتظام رکھیں کہ ان کو تدریس کا شوق ہوتا کہ عمر بھر علمی شغل رہے تو اس سے علم و عمل کی تجدید و تخریص ہوتی رہتی ہے اور اس کی ترعیب دیں کہ مطالعہ کتب مفیدہ سے کبھی غافل نہ ہوں اور ضروری نصاب کے بعد اگر طبیعت میں

قابلیت دیکھیں تو عربی کی طرف متوجہ کریں تاکہ قرآن و حدیث و فقہ اصلی زبان میں سمجھنے کے قابل ہو جائیں اور قرآن کا خالی ترجمہ جو بعض لڑکیاں پڑھتی ہیں میرے خیال میں سمجھنے میں زیادہ غلطی کرتی ہیں۔ اس لئے اکثر کے لئے مناسب نہیں۔ یہ تو سب پڑھنے کے متعلق بحث تھی رہا لکھنا تو اگر قرآن سے طبیعت میں بے باکی معلوم نہ ہو لکھنا بھی سکھایا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ضروریات خانگی کے لئے اس کی بھی حاجت ہوتی ہے اور اگر اندیشہ خرابی کا ہو تو مفاسد سے کچنا جلب مصاح غیر واجبہ سے اہم ہے۔ ایسی حالت میں لکھنا نہ سکھائیں اور نہ خود لکھنے دیں اور یہی فیصلہ ہے عقلا کے اس اختلاف کا کہ لکھنا عورت کے لئے کیسا ہے۔ (حقوق البیت ص ۲۵)

۵۸ ماں باپ کا حق پیر سے زیادہ ہے

مجھ سے ایک سوال کیا گیا کہ ماں باپ کا حق زیادہ ہے یا پیر کا۔ تو میں نے یہی جواب دیا کہ ماں باپ کا زیادہ حق ہے البتہ لأطاعة لہم خلوق فی معصیۃ الخالق یعنی اگر پرشہریت کے موافق حکم کرے اور ماں باپ اس کے خلاف کہیں تو اس وقت پیر کی اطاعت ہوگی والدین کی نہ ہوگی یعنی پیر ہونے کی وجہ سے۔ سو پیر کی اس لئے وقعت ہے کہ وہ شریعت کے احکام پر چلا تا ہے حق کے اعتبار سے نہیں۔ حق کے اعتبار سے والدین کا مرتبہ خدا کے بعد ہے اور پیر بھی آجکل اپنے کو مالک سمجھتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نواح میں تو موردی پیر بھی کچھ بہت زیادہ برے نہیں۔

پیر و کا حال | پورب میں ایک پیر تھے وہ عورتوں کے پاس جا کر بٹھیر جاتے تھے خدا ایسے پیروں کو غارت کرے اس کے ساتھ وہ بڑے بزرگ اور قطب اعظم مشہور تھے اور کئی لاکھ آدمی ان سے مرید ہیں۔ ہندو بھی ان سے مرید ہیں اسلام اور درویشی میں پہلے عوم و خصوص مطلق کی نسبت تھی مگر اب اس زمانہ میں من و دھرم کی نسبت ہو گئی یعنی پہلے درویشی کے لئے مسلمان ہونا ضروری تھا۔ اب کافر بھی صوفی اور درویش ہو سکتے ہیں۔ یہ ان رہزنوں کی بدولت ہے۔ ان کے نزدیک کافر بھی مرید ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ دجال پر ضرور ایمان لے آویں گے لہذا کفر نامزدی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔

کیونکہ وہ تو بڑا صاحب تصرف ہو گا۔ اور چونکہ ان کے نزدیک صوفی کا مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ اس لئے دجال کو تو بے تکلف پیشوا بنالیں گے اور جس کا یہ عقیدہ ہے کہ جہاں شریعت نہیں وہاں کچھ نہیں اس کے نزدیک کرامات و عجزہ کی کوئی وقعت نہیں۔ وہ سب سے پہلے اتباع شریعت کو دیکھے گا۔ اور چونکہ دجال کا فرہوگا اس لئے یہ شخص اس کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔

صاحبو! دجال قریب ہی نکلنے والا ہے اس لئے جلد اپنے عقیدہ کی درستی کر لو! اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے لہام ہوا ہے بلکہ علامات و آثار بتلاتے ہیں کہ دجال کا زمانہ خروج قریب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خودیہ تھا کہ کہیں میرے ہی زمانے میں نہ نکل آوے اس لئے ممکن ہے کہ ہمارے زمانے میں نکل آوے۔ اس لئے اپنے عقائد درست کر لو۔ جس کو خلاف شریعت دیکھو اس کے ہرگز معتقد نہ بنو۔ آگے آپ کو اختیار ہے۔

آجکل کے پیر میروں کو غلام سمجھتے ہیں | غرض آجکل پیر سمجھتے ہیں کہ مرید ہمارے سب سے چھڑا دیتے ہیں۔ یاد رکھو اگر پیر کہے رات کو نفلیں پڑھو۔ اور باپ کہے سو رہو تو باپ کی اطاعت مقدم ہے ہاں اگر باپ شریعت کے خلاف کوئی حکم کرے تو اس وقت باپ کی اطاعت جائز نہیں۔ شریعت کا لحاظ مقدم ہے۔ اور ماں باپ کا اتنا حق ہے کہ جرتج ایک درویش تھے بنی اسرائیل میں۔ وہ جنگل میں رہتے تھے۔ پہلی شرائع میں رہبت کا حکم تھا۔ ہماری شریعت میں یہ مطلوب نہیں۔ اس کے متعلق آجکل کے اعتبار سے ایک موٹی بات بتلاتا ہوں کہ تنہائی سے جو غرض ہوتی ہے جنگل میں رہنے سے آجکل وہ حاصل نہیں ہوتی کیونکہ ایسے شخص کو لوگ بہت ستاتے ہیں برخلاف اس کے اگر کوئی مسجد کے حجرہ میں رہے اسے کوئی نہیں پوچھتا دوسرے سب کو چھوڑ کر تنہا عبادت کرنا کمزوری کی بات ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے۔

زادہ نہ داشت تاب جمال پری رھاں | کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت
ہمت کی بات یہ ہے کہ سب میں ملے جلے رہو اور پھر اپنے کام میں لگے رہو۔ حدیث میں ہو۔ المؤمن القوی خیر من المؤمن الضعیف اور اگر جنگل میں کوئی نہ ستاوے تو بہتر ہے

نہ قوی مضبوط مسلمان کمزور مسلمان سے بہتر ہے

بے کچھ مضائقہ نہیں مگر حدود شرعیہ سے تعدی کرنا حرام ہے۔ خوب کہا ہے۔
بزد و ورع کوش و صدق و صفا | ولیکن میفرمائیے بر مصطفیٰ
خلاف پیر کہے رہ گزید۔ | کہ ہرگز بمنزل خواہد رسید
میں دارا سوری کہ راہ صفا | تو اس یافت جز بر پے مصطفیٰ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کر کے حاصل کرو جو حاصل کرنا ہو۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر پوری نظر نہ ہو تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات دیکھو وہ آئینہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

حضرت جرتج صوفی کا واقعہ | غرض جرتج ایک عابد تھے۔ وہ ایک تہہ اپنی عبادت گاہ میں نماز نفل پڑھ رہے تھے کہ ان کی ماں نے آکر پکارا۔ یہ سخت پریشان ہوئے کہ جواب دوں یا نہ دوں۔ جواب دوں تو نماز جاتی ہے نہ دوں تو ماں کی خفگی کا اندیشہ۔۔۔۔۔ آخر انھوں نے جواب نہیں دیا۔ اس نے دو تین آویں دی اور بدو عادی کے چلی گئی کہ اللہم لا تمتد حتیٰ تریہ وجو لا المومسات کہ اے اللہ جب تک کہ کسی زانیہ کا منہ نہ دیکھ لے اس کی موت نہ آئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکایت بیان فرما کر ارشاد فرمایا۔ لَوْ كَانَ فَتِيًّا لَأَجَابَ امْتًا اگر فقیہ ہوتا تو اپنی ماں کو ضرور جواب دیتا۔ اور یہ قول اس کا قرینہ ہے کہ نماز نفل بھی کیونکہ فرض کو بالاجماع ٹوٹنے کی اجازت نہیں۔ البتہ اگر کسی پر مصیبت آوے مثلاً جلنے لگے یا گرنے لگے تو اس وقت اس کے بچانے کے لئے نماز فرض بھی توڑنا واجب ہے خواہ ماں ہو یا کوئی غیر ہو۔

صاحبو! آپ نے شریعت کی تعلیم کو دیکھا۔ اللہ اکبر کس قدر رحمت کا قانون ہے آپ نے اس کے حسن و جمال کو دیکھا نہیں اس لئے کچھ قدر نہیں کرتے اس کی توبہ حالت ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نہ گرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا ست

شریعت کا حسن و جمال | شریعت تو ایسی حسین و خوبصورت ہے کہ اس کی جس چیز کو دیکھو دل رہا ہے جس ادا کو دیکھو دلکش ہے۔ آپ

میتیں خوشامدیں کیں مگر کسی ظالم نے اس کی جان پر رحم نہ کیا۔ اور کسی نے ایک گھونٹ بھی پانی نہ دیا۔ آخر وہ خود اٹھا۔ رئیس نے اتنا سامان کیا تھا کہ مٹکوں میں برت بھری گئی تھی وہ مٹکے سے لپٹا کہ کچھ تو پانی سے قرب ہو۔ اور لپٹے ہی جان نکل گئی۔ اس کا وبال بے رحم ماں باپ پر ہوا۔

صاحبو! شریعت کا تو یہ حکم ہے کہ اگر جوان کی بھی جان نکلنے لگے تو روزہ توڑ دینا واجب ہے۔ مگر اہل سوم کے نزدیک معصوم بچہ کو بھی اجازت نہیں۔ افسوس! خدا کو ایسے روزہ کی ضرورت نہیں خدا تو تم سے زیادہ تم پر رحمت کرنے والا ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تم سے زیادہ شفقت ہے۔ اَللّٰہُمَّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ توجب مکلف کو یہ حکم ہے کہ ایسے وقت روزہ دے تو چار پانچ برس کا بچہ کشا میں ہے اسی لئے میں کہہ کرتا ہوں کہ شریعت میں اتنی شفقت و مہولت ہے کہ تم بھی اپنے ساتھ اتنی نہیں کر سکتے۔

(عضل الجاہلیہ ص ۵)

۶۔ فرشتہ کو پیغمبر بنا کر کیوں نہ بھیجا گیا؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشریت کا اعلیٰ ارفع نمونہ ہیں

(۱) لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (الایۃ)

جس کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ کی ذات مبارک میں ایک اچھا نمونہ دیا ہے۔ نمونہ دینے سے کیا غرض ہوتی ہے۔ یہی کہ اس کے موافق دوسری چیز تیار ہو۔ میں نے ایک بزرگ محقق کا اس کے متعلق ایک لطیف مضمون سنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ہماری مثال ایسی ہے جیسے کسی نے درزی کو ایک اچکن سینے کو دی اور نوں کے لئے ایک سلی ہوئی اچکن بھی دی کہ اس ناپ اور نمونہ کی اچکن سی لاؤ۔ درزی نے ساری اچکن نمونہ کے موافق تیار کی۔ غرض طول بھی برابر لاتی یکساں۔ غرض کہیں تصور نہیں کیا۔ فرق کیا تو صرف یہ کیا کہ ایک آستین ایک بالشت چھوٹی بنا دی۔ جب وہ اچکن لیکر مالک کے پاس پہنچے گا۔ تو مالک اسے کیا کہے گا۔ وہ اچکن خوش ہو کر لے لے گا یا اس کے سر سے ماریگا

ملاحظہ کیا کہ کس قدر ضرورت کے قوانین ہیں کہ جب کسی کو گرفتار مصیبت دیکھو تو نماز فرض بھی توڑ دو اور ایسے موقع پر پہنچو۔ اور نفل میں تو اگر بلا ضرورت بھی ماں باپ پکاریں تو نیت توڑ دینا چاہئے بشرطیکہ ماں باپ کو اطلاع نہ ہو کہ یہ نماز پڑھ رہا ہے مگر جرجی چونکہ فقیہ نہ تھے اس لئے جواب نہ دیا اور ماں کی بددعا لگ گئی اور یہ واقعہ ہوا کہ قریب ایک آدھ عورت تھی۔ اس کو کسی کا محل رہ گیا۔ کچھ لوگ جرجی کے دشمن تھے انہوں نے اس سے کہہ دیا کہ تو جرجی کا نام لے دینا کہ اس کا بچہ ہے۔ اس کجبت نے ایسا ہی کیا لوگ اس کے عبادت خانے پر چڑھ آئے اور اس کو توڑنے لگے اور جرجی کو پیٹنا چاہا۔ اس نے پوچھا کہ اس حرکت کا آخر کچھ سبب بھی ہے یا نہیں۔ کہنے لگے تو ریاکار ہے۔ عبادت خانہ بنا کر زنا کرتا ہے۔ فلاں عورت سے تو نے زنا کیا ہے اس کے بچہ پیدا ہوا ہے۔

یہ عبادت خانے سے اترے۔ آخر اللہ کے مقبول بندے تھے عبادت کا اثر | رحمت خدا کو جوش ہوا اور ان کی ایک کرامت ظاہر ہوئی۔ حضرت جرجی نے اس کے لڑکے سے پوچھا کہ بتلاؤ تو کس کا ہے۔ اس نے کہا میں فلاں چرواہے کا ہوں۔ یہ قصہ حدیث میں مذکور ہے۔ اس سے ماں کا کتنا باحق معلوم ہوا مگر اس پر اجماع ہے کہ اگر پر پکاریے تو نماز نفل کا توڑنا بھی جائز نہیں۔ تو پر کا حق ماں باپ سے زیادہ نہیں۔ اور یہ اچھے پیر صاحب ہیں کہ دوسرے کے پالے پلائے پر قبضہ نہ کریں کیا پیری مریدی کے یہی معنی ہیں۔ (دعظ عضل الجاہلیہ ص ۹)

۵۹ چھوٹے بچہ کو روزہ پر مجبور کرنا درست نہیں

ایک جگہ میں نے دیکھا کہ لڑکیوں نے ایک ذرا سی لڑکی کو روزہ رکھوایا اور وہ جب پاخانہ لگی تو ایک ساتھ گئی۔ غرض چاہے بچہ کی جان پر بن جائے مگر روزہ ضرور ہو۔ مگر بعض دفعہ یہ روزہ روضہ میں بھی لے جاتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک رئیس زادہ سے روزہ رکھوایا گیا گرمی کے دن تھے۔ دو پہر تک تو بیچارہ نے بنا دیا۔ مگر عصر کے وقت پیاس سے سخت پریشان ہوا۔ رئیس نے روزہ کشائی کا بہت اہتمام کیا تھا۔ تمام خاندان کی اور دوستوں کی دعوت کی تھی۔ آخر بہلایا کہ تھوڑی دیر اور صبر کرو مگر اس بے چارہ کو تاب کہاں تھی اول تو اس نے لوگوں کی

اگر درزی جواب میں یہ کہے کہ جناب ساری اچکن تو ٹھیک ہے صرف ایک آستین میں ذرا سی کمی ہے تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ مالک اس کو پسند کر لے گا۔ ہرگز نہیں۔ اس سارے کپڑے کی قیمت رکھوا لے گا۔

احکام میں نبی کریم ﷺ کے عمل کی موافقت ضروری ہے | حق تعالیٰ نے

احکام نازل کئے جو بالکل مکمل قانون ہیں اور ان کا عملی نمونہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا۔ سو اگر آپ کے اعمال نمونہ کے موافق ہیں تو صحیح ہیں ورنہ غلط ہیں۔ اگر نماز آپ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے موافق ہے تو نماز ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ اگر ذکر آپ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے موافق ہے تو ذکر ہے ورنہ الٹی معصیت ہے۔ دیکھئے نماز میں بجائے دو کے ایک سجدہ کر لے تو وہ نماز نہ رہی دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔ کوئی قرآن شریف بجا لے جنابت پڑھے تو بجائے ثواب کے لٹا لگانا ہوتا ہے۔ اسی قلیل سے یہ بھی ہے کہ اسمائے الہی تو قیسی ہیں اپنی طرف سے کوئی نام رکھنا جائز نہیں۔ اگر آب روزہ رکھیں تو وہی روزہ صحیح ہوگا۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو۔ علیٰ ہذا حج وہی صحیح ہوگا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے موافق ہو اگر حج میں کوئی احرام نہ باندھے تو وہ حج حج نہیں اسی طرح زکوٰۃ وہی صحیح ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے موافق ہو اور کوئی سارا مال خلان تعلیم خرچ کر دے تو زکوٰۃ سے فارغ نہیں ہو سکتا۔ یہ ارکان اسلام ظاہری ہوئے۔ اسی طرح اعمال باطنی کو سمجھ لیجئے اور معاملات اور طرز معاشرت سب میں یہی حکم ہے۔

فرشتے رسول بنا کر کیوں نہیں بھیجے گئے | حق تعالیٰ نے ہمارے پاس

نہیں بھیجا۔ اس میں حکمت یہی ہے کہ اگر فرشتہ آتا تو وہ ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتا تھا۔ اس کو نہ کھانے کی ضرورت ہوتی نہ پہننے کی نہ ازدواج کی نہ معاشرت کی۔ ان چیزوں کے احکام میں صرف یہ کہنا کہ ہم کو پڑھ کر سنا دیتا یہ کام صرف کتاب کے بھیج دینے سے بھی نکل سکتا تھا۔ کہ ایک کتاب ہمارے اوپر آتی۔ اس میں سب احکام لکھے ہوتے اس کو ہم آپ پڑھ لیتے اور عمل کر لیتے۔ فرشتے کے اترنے سے اس سے زیادہ کوئی بات نہ پیدا ہوتی جو کتاب سے ہو سکتی تھی۔ حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہماری جنس میں سے پیغمبر

بنائے کہ وہ ہماری طرح کھاتے پیتے بھی ہیں۔ ازدواج اور تعلقات بھی رکھتے ہیں تمدن اور معاشرہ کے بھی خوگر ہیں اور ان کے ساتھ کتابیں بھی ہیں تاکہ کتاب میں احکام ہوں۔ اور وہ خود بنفس نفیس ان کی تعمیل کر کے دکھلا دیں تاکہ ہم کو سہولت ہو۔ اسی واسطے فرمایا ہے۔ وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا أَنَّهُمْ لِيَاكُلُوا مِنَّا لَظَلَامًا وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ یعنی ہم نے جس قدر رے سے پہلے پیغمبر بھیجے وہ اور آدمیوں کی طرح کھاتے پیتے والے اور معاشرت رکھنے والے بھیجے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَجَعَلْنَاهُ رَجُلًا۔ یعنی اگر ہم فرشتے کو احکام لیکر بھیجتے۔ تب بھی یہ ہوتا کہ وہ انسان کی صورت میں آتا۔ ورنہ انسان کو اس سے ہدایت نہ ہو سکتی کیونکہ وہ نمونہ نہ بن سکتا۔

سید المرسلین کا انتخاب

حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے کالات فرشتوں سے بھی زیادہ ہیں لیکن حکمت الہی اس کی مقتضی ہوتی کہ آپ نسل انسانی سے پیدا ہوں تاکہ تمام افعال انسانی میں نمونہ بن سکیں۔ دیکھ لیجئے کہ صحتی باتیں انسان کو پیش آتی ہیں سب آپ کو پیش آئیں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیبیاں رکھیں، اپنی اولاد کا نکاح کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں غنی کی تقریبیں بھی ہوتیں کسی صاحبزادیوں نے انتقال کیا جو حالات ہم کو پیش آتے ہیں وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں نکلے تاکہ ہمارے لئے پورا ایک دستور العمل بن جائے۔ اب آپ دیکھ لیجئے کہ کون سا فعل ہمارا نمونہ کے موافق ہے۔ کوئی تقریب خوشی کی ہوتی ہے تو ہم نہیں دیکھتے اور کوئی تقریب غمی کی ہوتی ہے تب ہم نہیں دیکھتے کہ دستور العمل میں کیا ہے اس درزی کی مثال کو یاد رکھئے کہ ایک بالشت کپڑا کر دینے سے اچکن منہ پر ماری جاتی ہے اور اگر وہ بجائے سینے کے کپڑے کی ڈھجیاں کر کے مالک کے سامنے جا رکھے تو وہ کس سزا کا مستوجب ہے جبکہ مالک قادر بھی ہو۔ واللہ باللہ ہمارے اعمال کی حالت یہی ہو گئی ہے کہ جو طریقہ ان کا بتلایا گیا تھا وہ تو کوسوں دوران اعمال کو تباہ کر کے اور ڈھجیاں اڑا کے ہم حق تعالیٰ کے سامنے رکھ دیتے ہیں یہ کچھ مبالغہ آمیز الفاظ نہیں ہیں دیکھ لیجئے کہ جیسے اچکن سینے کے واسطے کپڑے کا اپنی اصل پر رہنا شرط ہے اور ڈھجیاں کرنے والا اس کو اس اصل سے نکال دیتا ہے کہ جس سے اچکن تو کیسی، کپڑے کی کوئی غرض بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح تمام اعمال کے صحیح ہونے کے واسطے ایمان کا ہونا شرط ہے کوئی چاہے کہ ایمان کھو کر کوئی عمل کرے تو وہ ایسے ہی بیکار ہوگا۔ جیسے

کوئی کپڑے کی دھجیاں کر کے اچکن سینا چاہے (وعظ منازعۃ الہوی ص ۶۳)

(ب) یہ بڑی غلطی ہے کہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان

اور آپ کے حالات کو اپنے حالات پر، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے۔ بشر لا کا البشر ولكن کالیاقوت بین الحجر آپ بشر تو ہیں مگر اور انسانوں کے مانند نہیں ہیں بلکہ آپ انسانوں میں ایسے ہیں جیسے پتھروں میں یا قوت ہو کرتا ہے کہ جنس کے اعتبار سے تو وہ بھی پتھر ہی ہے مگر زمین و آسمان کا فرق ہے یا قوت میں اور دوسرے پتھروں میں۔ اب اگر کوئی محض اشتہار جنس کی وجہ سے یا قوت کو اور پتھروں پر قیاس کرنے لگے تو اس سے یوں ہی کہا جائے گا کہ عقل پر پڑیں پتھر۔ لہذا محض انسان سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اوپر قیاس نہ کیا کرو۔ کیا انسان سارے یکساں ہی ہوا کرتے ہیں دیکھو ایک آدمی تو حبشی کا لکھن کا ہے آدمی تو وہ بھی ہے اور ایک حسین یوسف ثانی ہے وہ بھی آدمی ہی ہے مگر کیا دونوں برابر ہیں اور کیا ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جاسکتا ہے ہرگز نہیں ان دونوں میں اتنا فرق ہے کہ اگر کسی نے آدمیوں میں صرف اس یوسف ثانی کو دیکھا ہو اس کے بعد پھر حبشی کو دیکھے تو وہ ہرگز یقین نہ کرے گا کہ یہ بھی آدمی ہے بلکہ اس کو جن یادیں سمجھے گا کیونکہ اس کے نزدیک تو آدمی اسے کہتے ہیں جو اس حسین کے مشابہ ہو۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے انسان ہیں کہ آپ کو دیکھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم بھی آدمی ہیں وہ تو نہ معلوم ہم کو کیا سمجھے گا کہ یہ گدھے ہیں یا بیل ہیں اب یہاں میں فرتے ہو گئے بعض تو وہ ہوئے جنہوں نے حضور کو بشر ہی نہ سمجھا۔ وہ تو خواص الوہیت کو حضور کے لئے ثابت کرنے لگے اور بعض وہ ہیں جنہوں نے آپ کو بالکل ہی پنا جیسا بشر سمجھا یہ دونوں غلطی پر ہیں اور ایک فرقہ متوسط ہے جو حضور کو بشر تو سمجھتا ہے۔ مگر سب سے اعلیٰ و ارفع سمجھتا ہے۔ اور وہی بات کہتا ہے۔ بشر لا کا البشر بل کالیاقوت بین الحجر۔ واقعی سچی بات ہے

گفت اینک ما بشر انشاں بشر ما و انشاں بستہ خواہیم و نور

این ندانند انشاں از عے در میاں فرقی بود بے منتہا۔

(وعظ ایوار الیتامی ص ۲۵)

نہ بشر ہیں مگر عام بشر کی طرح نہیں بلکہ جیسے پتھروں میں یا قوت ہوتا ہے۔

۱۱ بعض تجدیدیم یافتہ کا حال اُن سے
مسلمان لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

افسوس ہے کہ آج کل جن لڑکوں کو بیٹیاں دی جاتی ہیں بعضے ان میں سے جدید تعلیم

کے اثر سے ایسے آزاد نش ہوئے ہیں کہ ان کو دین ایمان سے کبھی کچھ علائقہ نہیں رہا۔ زبان سے کلمات کفر بک جاتے ہیں اور کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ پھر انہیں میں سے ایک سے مسلمان لڑکی کا نکاح پڑھوایا جاتا ہے اور سب گھروالے خوش ہوتے ہیں کہ ایک سنون طریقہ ادا کیا جاتا ہے اس سنت کی صحبت کے لئے موقوف علیہ ایمان۔ افسوس ہے کہ فوشہ صاحب نہ جانے کتنی دفعہ اس سے خارج ہو چکے ہیں اب وہ مثال صادق آتی ہے یا نہیں کہ کپڑے کے پُرزے پُرزے کر کے بلکہ جلا کے اچکن سینے کا ارادہ کیا جاتا ہے ہم کو تو اسی کا ردنا تھا کہ اچکن نمونہ کے موافق نہیں سی جاتی۔ ایک آستین بالشت بھر کر کی جاتی ہے یہاں نہ آستین رہی نہ دامن اور خیال یہ ہے کہ اچکن تیار ہے۔ ایک نیک بخت لڑکی ایک انگریزی خواں سے بیاہی گئی جو ایک مجمع میں یہ لفظ کہہ رہے تھے کہ محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی بہت بڑے رفیقاہم تھے اور مجھ کو آپ سے بہت تعلق ہے لیکن رسالت میں ایک مذہبی خیال ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ یہ کلمہ کفر ہے نکاح اس سے ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اگر لڑکی والوں کو بتلایا جاتا ہے تو اٹے لڑنے کو سیدھے ہوتے ہیں کہ ہمارے خاندان کی ناک کٹواتے ہیں۔ اب وہ زمانہ ہے کہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ دیکھ لیا جاوے کہ داماد مسلمان ہے یا کافر بجائے اس کے پہلے دیکھا جاتا تھا نیکو کار ہے یا بدکار۔ اس قصہ سے میرے قول کی تصدیق ہوگی کہ ہمارے اعمال خراب ہی نہیں بلکہ باطل ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ ہم ان کو اچھے سمجھ کر اجر کے امیدوار بیٹھے ہیں

وسوف تری اذا انکشف الغیار : افرس تحت رجلك ام حمار

(عبار چھٹ جانے کے بعد ظاہر ہوگا کہ تم گھوڑے پر ہو یا گدھے پر -)

(وعظ منازعۃ الہوی ص ۶۵)

۶۲ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہونے کی تمنا؟

فرمایا کہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے تو اچھا ہوتا میں کہتا ہوں کہ ایک اعتبار سے ہم لوگوں کا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ ہونا ہی اچھا ہو کیونکہ ہم لوگوں کی حالت ٹھیک نہیں ہے خدا کی راہ میں مال دینا مشکل معلوم ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شب و روز امتحان و پریش تھا کبھی زکوٰۃ کا حکم ہوتا تھا کبھی جہاد میں جان دینے کا، عزیز و اقارب کو چھوڑنا پڑتا تھا۔ سوہاری ایسی طبیعت والے اگر احکام بنوی کے بجالانے میں کوتاہی کرتے۔ تعجب نہ تھا کہ انکار نبوت تک نوبت آجاتی۔ جس کا انجام کفر و حسرت دارین تھا۔ دوسرے خدا جانے معاصرہ کہیں اپنا رنگ نہ لاتی اور اب توجہ کی کرائی شریعت ہم کو مل گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات ہم نے سُن لئے حضور کی عظمت بھی قلب میں بلامرأحم موجود ہے اگر خدا بخودہ خلافت بھی کریں گے تو کسی خطاب جزئی کا تو خلافت نہیں ہے۔ ان لوگوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدا سے عمر سے ہر حالت میں دیکھا۔ آپ ان کے معبودوں کو بُرا کہتے تھے آپ کی قرابت تھی لوگوں سے تعلقاً تھے بہت سے امور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایسے پیش آتے تھے جو لوگوں کے خلاف جمع ہوتے تھے لیکن پھر بھی وہ لوگ اطاعت کرتے تھے کہاں ان کا تھا نہ کہ ہم لوگوں کا (مقالات حکمت، دعوات عبدیت حصہ نہتم)

۶۳ لوگوں نے غفور رحیم کے معنی غلط سمجھے!

خدا غفور رحیم ہے۔ توبہ استغفار کر لیں گے گناہ معاف ہو جائیں گے مگر دنیا کا نفع یعنی مکان بنانا بغیر رشوت کے نہیں ہو سکتا اگر رشوت نہ لی تو منافع حاصل نہ ہوں گے۔ اور اس نقصان کی بظاہر کوئی تلافی نہیں معلوم ہوتی۔ پس جس نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے اس کو گوارا کر کے رشوت لینا چاہیے۔ پھر خدا سے معافی کرائیں گے۔ تو صاحبو! آپ نے

دیکھ لیا کہ نفس بدخواہی کو کس رنگ آمیزی کے ساتھ خیر خواہی کی صورت میں لاتا ہے۔

مگر شیطان کے اس سبق کی وہی مثال ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک طوطے کی مثال شخص نے اپنے طوطے کو لفظ دریں چہ شک سکھلادیا تھا وہ ہر بات کے جواب میں یہی لفظ کہہ دیا کرتا تھا مگر یہ لفظ ایسا ہے کہ اکثر باتوں کا جواب بن بھی جاتا ہے چنانچہ اس شخص نے طوطہ کو یہ لفظ یاد کرا دیا اور برسر بازار لا کر دعویٰ کیا کہ میری طوطی فارسی بولتی ہے ایک شخص نے اس کا امتحان لیا کئی باتیں اس سے کیں سب کے جواب میں اس نے دریں چہ شک ہی کہا۔ مگر ان باتوں پر یہ جواب چسپاں تھا۔ اس نے خوش ہو کر اس کو خرید لیا۔ اور گھر پر لایا اب اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیں اس نے سب کے جواب میں دریں چہ شک ہی کہا چاہے جو طرے لگے یا نہ لگے آخر اس نے جھلا کر کہا کہ افسوس میں نے تیرے خریدنے میں بڑی بیوقوفی کی اس نے اس کے جواب میں بھی کہا۔ دریں چہ شک، کہ اس میں کیا شک ہے۔ ایسے ہی ہمارے نفس کو بھی ایک سبق یاد ہے۔ ہر جگہ اس کا استعمال کرتا ہے وہ یہ کہ اللہ بڑا غفور رحیم خواہ وہ کیسا ہی گناہ ہو حق اللہ ہو یا حق العبد۔

دوسرے راجح نہیں جانتا کہ غفور رحیم ہونے سے یہ کیسے لازم غفور رحیم کا حاصل آتا ہے کہ گناہ کا ضرر نہ ہوگا۔ اگر غفور رحیم ہونے کے لئے یہ ضروری ہے تو جیسے خدا تعالیٰ آخرت میں غفور رحیم ہیں دنیا میں بھی تو ہیں کیونکہ صفات باری سب قدیم ہیں۔ پھر سنکھیا کھانے سے ضرر کیوں ہوتا ہے اگر غفور رحیم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ چاہو کہ کچھ ضرر نہ ہوگا تو سنکھیا کھانے سے بھی کوئی نقصان نہ ہونا چاہیے۔ مگر ضرر یقینی ہوتا ہے اور باوجود ضرر ہونے کے خدا کے غفور رحیم ہونے میں فرق نہیں آتا تو ایسے ہی آخرت میں بھی غفور رحیم ہوں گے اور گناہ کا بھی ضرر نہ ہوگا کیونکہ غفور رحیم ہونے کے لئے ضرر نہ ہونا لازم نہیں خداوند تعالیٰ رحیم اس طرح ہیں کہ تم کو بتلادیا کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى وَلَا تَقْرَبُوا اللَّهَ كَأَنْ تَكُنْ حَشَاةً۔ یہ کتنے بڑے رحم کی بات ہے کہ خود بخود ایک قانون مفید تجویز فرما کر سب کو بتلادیا کہ طریق فلاح و رضا الہی یہ ہے ورنہ کام تو خود ہمارے ذمہ تھا کہ رضائے مولا کا طریقہ معلوم کرتے۔ دوسرے حق تعالیٰ نے حق جہاں اپنی رضا حاصل کرنے کے طریقہ بیان فرمائے ہیں وہاں ایسے امور کی تعلیم دی ہے جن سے امن عام قائم رہے اس کے سوا اور بھی رحیم ہونے کے معنی ہیں جو میں آئندہ بتلاؤں گا۔ اور غفور ہونے کے یہ

بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ بعد سزا کے بخش دیں۔ اگر کہتے کہ کیسی مغفرت ہے کہ سزا بھی ہو اور بخشش بھی ان دونوں میں تو منافات ہے۔ تو صاحبو! آپ نے نہ خدا کی عظمت سمجھی نہ گناہ کی حقیقت معلوم کی تو سمجھو کہ گناہ کہتے ہیں حاکم کی کسرشی کو۔ اور جس قدر حاکم بڑا ہوتا ہے اسی قدر اس کی کسرشی بھی جرم عظیم ہوتی ہے۔ مثلاً ایک کسرشی تو یہ ہے کہ حاکم ضلع کا کہنا نہ ماننا۔ مگر اس سے بڑھ کر وائسرائے کا کہنا نہ ماننا اور بادشاہ کا کہنا نہ ماننا اس سے بہت بڑا جرم ہے۔ ایسے ہی بڑے بھائی کا کہنا نہ ماننا ایک جرم ہے مگر باپ کا کہنا نہ ماننا اس سے بہت بڑا جرم ہے غرض کسرشی کی شدت کا مدار اس شخص کی عظمت پر ہوتا ہے جس کی کسرشی کی گئی۔ ایک مقدمہ تو یہ سمجھ لیجئے۔ دو ستر مقدمہ سب پہلے سے مسلم ہے کہ خدا سے بڑا کوئی حاکم نہیں کیونکہ اور سب کی تو عظمت محدود ہے اور عظمت الہی غیر محدود، خارج از۔۔۔ وہم و قیاس ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ بھی سب کے نزدیک بدیہی اور مسلم ہے کہ سزا بقدر گناہ ہوا کرتی ہے۔

خدا کی مخالفت بس اب سمجھئے کہ جب خدا سے بڑھ کر کوئی نہیں تو اس کی مخالفت سے بڑھ کر کوئی مخالفت نہیں اور اسی کی مخالفت کی سزا ہے بڑھ کر کسی کی مخالفت کی سزا نہیں ہو سکتی۔ تو جیسا عظمت غیر اللہ محدود ہے اس کی مخالفت کی سزا بھی غیر محدود ہوتی ہے اور چونکہ عظمت الہی نامحدود ہے اس لئے اس کی مخالفت کی سزا بھی غیر محدود ہونی چاہیئے پس اس عقلی قاعدہ کا مقتضا تو یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی صغیرہ گناہ بھی ہو جائے تو چونکہ خدا کی نافرمانی ہے اس لئے اس کی سزا بھی ابد الابد جہنم ہونی چاہیئے اور اس کے لئے بھی مغفرت نہ ہونی چاہیئے مگر خدا تعالیٰ نے ابد الابد جہنم سوائے مشرکین و کافرین کے کسی کے واسطے مقرر نہیں فرمائی۔ پس اگر حق تعالیٰ کسی گناہ میں دس ہزار لاکھ برس کے بعد بھی چھوڑ دیں تو یہ ان کی مغفرت اور بخشش ہے یا نہیں یقینی ہے اور ضرور ہے اور دنیا کے قصوں میں ہم اس کو رات دن جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دس سال کی جیل کا ستم ہو اور حاکم اس کو دو برس کے بعد چھوڑ دے یہ اس کا انعام سمجھا جاتا ہے یا نہیں۔ پس نامحدود عذاب کے بجائے اگر حق تعالیٰ محدود عذاب دے کر دس ہزار یا دس لاکھ برس کے بعد بھی نجات عطا فرمادیں تو یہ بھی یقیناً مغفرت ہوگی۔ اب آپ کی سمجھ میں آگیا کہ غفور ہونے کے لئے سزا نہ دینا ضروری نہیں بلکہ غفور ہونے کے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ایک محدود زمانہ تک سزا دے کر رہا کر دیا جائے اور غفور ہونے

ایک یہ بھی صورت ہو سکتی ہے کہ گناہ کرتے ہی فوراً سزا نہ دی جائے جس کا ظہور نیا میں ہوتا ہے اور اس کی رحمت بھی کہہ سکتے ہیں اور رحیم کے دو معنی سنئے۔ وہ یہ کہ عرفا یا بات سب کو معلوم ہے کہ جس کی خطا معاف کرتے ہیں اس کے لئے یہی بڑی بات ہوتی ہے کہ جیل سے رہا کر دیا جائے اس کے لئے انعام کا کوئی قاعدہ نہیں نہ کوئی مستحق انعام و اکرام سمجھے تو حق تعالیٰ کو کبھی یہ حق حاصل تھا کہ جہنم سے نکال کر چھوڑ دیتے جس حال میں چاہے رہے خواہ مرے یا جسے خواہ راحت میں رہے یا تکلیف میں مگر وہ رحیم بھی ہیں ان کی رحمت کا مقتضا یہ ہے کہ وہ جہنم سے نکال کر وہ جگہ دیتے ہیں جو جنت کے نام سے مشہور ہے جس میں وہ چیریں ہیں کہ جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کان نے سنا نہ کسی دل پر ان کا خطرہ گذرا۔ دینہا ما لاعین، اذ لا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔

خطا معاف کر کے مقرب بنانا پھر یہ خطا معاف کر کے اس کو اپنا مقرب کرے گی کسی سے ماہو اگر کسی سے سالانہ۔ اور سب سے مقرب وہ شخص ہوگا جس سے دن میں دو مرتبہ صبح و شام ملاقات ہو کرے گی۔ پھر یہ نہیں کہ آنے والوں کو حکم ہو کہ خود سلام کریں بلکہ حدیث میں ہے کہ سب لوگوں کو ایک باغ میں جمع کیا جائے گا اور حق تعالیٰ ان پر متجلی ہوں گے اور پہلے خود فرمائیں گے السلام علیکم پس اس کی نظیر کوئی پیش کر سکتا ہے کہ خطا دار اور گنہ گار کے ساتھ اس قدر انعام کیا جاتا ہے تو آپ نے دیکھا کہ حق تعالیٰ کیسے کیسے انعامات فرمائیں گے کہ خود اپنے بندوں کو سلام فرمائیں گے پھر نہیں کہ ان کو بلا دیں گے بلکہ خود ان کے پاس تشریف لے جا کر متجلی ہوں گے اس کے وقت وہ حال ہوگا کہ سب زبان حال سے کہتے ہوں گے۔

”امروز شاہ شاہاں مہاں شدت مارا“

تو دیکھئے خدا کی رحمت کے معنی سمجھ میں آگئے اب اس تفسیر کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ رحمت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ گناہ کی سزا ہی نہ ہو تو یہ نفس کا بڑا دھوکہ ہے کہ حق تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے سے یہ سمجھتا ہے کہ گناہ کی سزا ہی نہ ہوگی اسی کو کہتے ہیں۔ کلمۃ حق اریہا الباطل“ اسی لئے میں کہتا تھا کہ نفس خیر خواہی کے پردے میں بدخواہی کرتا ہے۔ (دعوت وحدۃ الحب ص ۵۵ پانچواں و عظیم دعوت عبدیت حصہ ہشتم)

۶۲ جاہل واعظوں کے وعظ کی خرابیاں

غیر عالم کبھی وعظ نہ کہے۔ اس میں چند مفاسد ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں حدیث کی مخالفت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر ہے کہ ہر کام اس کے اہل کے سپرد کرنا چاہیے اور آپ فرماتے ہیں: "اذا وصل الاموالی غیر اہلہ فانما تخطى الساعة"۔ کہ جب کام نااہلوں کے سپرد کئے جانے لگیں تو قیامت کے منتظر ہو۔ گویا نااہل کو کوئی کام سپرد کرنا اتنی سخت بات ہے کہ اس کا ظہور قیامت کے علامت سے ہے اور یہ امر مصرح و ثابت ہے کہ جو فعل اختیاری علامات قیامت سے ہوں وہ معصیت اور مذموم ہیں اور ظاہر ہے کہ غیر عالم وعظ گوئی کا اہل نہیں۔ یہ منصب صرف علماء کا ہے اس لئے غیر عالم کو اس کی اجازت ہرگز نہ دی جائے۔ دوسری خرابی اس میں یہ ہے کہ بعض دفعہ جاہل کو کسی مسئلہ میں جو بجا و ثابت ہے ایسی غلطی پیش آتی ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوتی۔ گو بعض بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ وہ اپنی علمی حیثیت ہی کے موافق احتیاط کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں کر سکتے اور جب پورا علم نہیں تو غلطی کا احتمال رہے گا۔

جاہل واعظ کی خرابیاں

علاوہ ازیں جب یہ شخص وعظ کہے گا تو لوگ عالم سمجھ کر اس سے ہر قسم کے مسائل بھی پوچھیں گے پھر آج کل ایسے نفس کہاں ہیں جو صاف کہیں کہ ہم جاہل ہیں ہم کو مسائل معلوم نہیں ضرور کچھ گھڑا کر جواب دیں گے اور اکثر وہ غلط ہوگا اور اگر گول مول جواب دیا اور اس طرح غلط جواب سے اپنے کو بچا لیا تو ممکن ہے کہ عوام اس سے کسی غلطی میں پڑ جائیں بعض جاہل ایسے ہوشیار ہوتے ہیں کہ جو مسئلہ ان کو معلوم نہیں ہوتا۔ اس کا ایسا جواب دیتے ہیں جس سے نہ جواب معلوم ہو اور نہ جہل ظاہر ہو دے۔

گنگوہی میں ایک جاہل فتویٰ دیا کرتا تھا۔ مولانا گنگوہی نے اپنی نوعمری میں اس سے امتحاناً سوال کیا کہ حالت حمل میں بے شوہر عورت سے نکاح کرنا کیسا ہے۔ کہا ایسا ہے جیسے گھیر دینا۔ اس گول مول جواب سے نہ اس کا جہل ظاہر ہوا نہ جواز کا فتویٰ ہوا۔ مگر ایسے جوابات سے عوام کیا سمجھیں گے یقیناً غلطی میں پڑیں گے شاید کوئی جاہل واعظ یہ کہے کہ ہم کتابیں دیکھ کر فتویٰ دیا کریں گے اور آج کل اگر دو میں بھی مسائل کا ذخیرہ موجود ہے تو

تو میں کہتا ہوں کہ بعض مسائل کا تعلق دو باب سے ہوتا ہے ایک باب میں تو اس میں اطلاق ہوتا ہے اور دوسرے باب میں اس کا مقید ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ قیود و شرائط بعض دفعہ ایسی ہوتی ہیں جن پر جاہل تو جاہل ناقص عالم کی نظر بھی نہیں پہنچتی۔ بعض دفعہ ناقص عالم سے لوگوں کو تنگی میں ڈالے گا۔ (چنانچہ بعض غیر محقق مولوی وعظ میں کہا کرتے ہیں کہ روزی پہنچانے کا خدا کا وعدہ ہے اور مسلمانوں کو بھروسہ نہیں، گھبراتے ہیں۔ یہ ان کا عام مضمون ہے اور اس پر وہ ضعیف ایمان کا حکم لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کوئی مخلوق دعوت کر دے تو اس پر پکا اعتبار ہوتا ہے اور اس وقت کے رزق سے بے فکری ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کے وعدہ پر بھروسہ نہیں۔ سو یہ غیر محقق خوب سمجھ لیں کہ یہ ضعیف ایمان نہیں بلکہ ضعیف طبیعت ہے

ضعف ایمان ضعف طبیعت

ضعف ایمان اور بے اور ضعف طبیعت اور۔ اور کوئی مسلمان ایسا نہیں جس کو خدا کے وعدہ پر بھروسہ نہ ہو۔ اور تنویر کے لئے جو مثال بیان کی جاتی ہے وہ محض غلط ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا قیاس مخلوق کے وعدہ پر صحیح نہیں۔ کیونکہ جو شخص وعدہ کرتا ہے وہ یہ بتلا دیتا ہے کہ فلاں وقت کی دعوت ہے جس سے پورے طور پر یہ حال معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے کھانے کا اس وقت پورا بند و بست ہو گیا۔ اگر ایسا ہی تفصیلی وعدہ اللہ تعالیٰ کا ہوتا تو مسلمانوں کو مخلوق سے زیادہ اس پر اعتماد ہوتا مگر خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ نہیں ہے کہ دونوں وقت دیں گے۔ یا وہ پھر دیں گے ناغہ نہ کر س گے۔ بلکہ مبہم وعدہ ہے کہ روزی دیں گے۔ اس کی کیفیت اور کمیت نہیں بتلائی گئی۔ ممکن ہے کہ تیسرے روز ملے غرض ابہام ہے اور اس شخص کا وعدہ ہے کہ شام کا وقت بتلا دیا ہے تو ضعف ایمان کی وجہ سے یہ تردد نہیں بلکہ اس کی کیفیت اور مقدار معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تردد ہے جس کا باعث طبعی ضعف ہے اگر داعی کا بھی ایسا ہی وعدہ ہو تو اس سے زیادہ تردد ہو جائے تو یہ کیا ظلم ہے۔ الزام لگانے والوں نے الزام لگایا ضعف ایمان کا۔

(وعظ شعبان ۱۴۰۱ھ، دعوات عبدیت حصہ ششم)

سونا چاندی خریدنے کا مسئلہ | مثلاً شریعت کا حکم ہے کہ اتحاد جنسین کے ساتھ تفاضل ناجائز ہے۔ مثلاً

چاندی کے بدلے چاندی - یا سونے کے بدلے سونا خریدا جائے تو مساوات ضروری ہے -
تفاضل کی بیشی حرام ہے - اب جاہل تو اس مسئلہ کو دیکھ کر اسی طرح بیان کر دے گا - اور ممکن
ہے کہ ایک وقت چاندی کا بھاد روپے کے برابر نہ ہو بلکہ چاندی دس آنہ تو نہ ہو جو ایک روپے
کے مقابلہ میں روپے کے وزن سے زیادہ آئے گی اور ان حضرات کو صرف اتنا ہی مسئلہ
معلوم ہو کہ اتحاد جنس کے وقت تفاضل حرام ہے - تو یہ حضرات یا تو خود روپے کے برابر ہی
لائیں گے پھر گھر والے ان کو بے وقوف بنائیں گے یا دوسروں کو اس پر مجبور کریں گے - اور
دونوں صورت میں شریعت کو بدنام کریں گے کہ یہ اچھا مسئلہ ہے کہ ایک چیز روپے
میں روپے سے زیادہ آسکتی ہے مگر شریعت کہتی ہے کہ نہیں برابر ہی تو لو - زائد مدت
تو - تو یہ خرابی جہل کی وجہ سے ہوئی - محقق اگر اس مسئلہ کو بیان کرے گا تو ساتھ ساتھ یہ
بھی کہہ دے گا کہ اگر چاندی ایک روپے کے بدلہ میں اس سے زیادہ آتی ہو تو اس وقت
روپے سے چاندی نہ خریدو بلکہ روپے کو بھنکا کر کچھ دینیاں چویناں اور ان کے ساتھ کچھ
پیسے ملا کر خریدو اب جائز ہے کہ ایک روپے کے بدلے میں تو نہ بھرے زیادہ چاندی لے
اؤ کیونکہ ریزگاری میں جتنی مقدار چاندی ہوگی اس کے مقابلہ میں تو اس کے برابر چاندی آئیگی
باقی چاندی پیسوں کے مقابلے میں ہو جائے گی - اور پیسہ اور چاندی ہیں - جنس بدل گئی -
اس میں کمی بیشی جائز ہے - یہ تو مثال تھی تنگی میں ڈالنے نہ ڈالنے کی -

طلاق کا مسئلہ | اب مسئلہ اطلاق و تقید کی مثال سنئے - مثلاً باب الکنايات میں
فقہا نے لفظ اختیاری کو کنايات طلاق میں بیان کیا ہے - اور
اس کا حکم یہ بیان کیا ہے کہ اس سے وقوع طلاق نیت کے بعد ہوتا ہے تو اس سے ظاہر یہ
معلوم ہوتا ہے کہ اختیاری میں بھی صرف نیت سے وقوع طلاق کا ہو جاوے گا - لیکن اس
اختیاری سے وقوع طلاق کی ایک شرط اور بھی ہے جو باب التفویض میں مذکور ہے وہ یہ کہ
اختیاری میں نیت کے ساتھ وقوع نہیں ہوتا بلکہ عورت جب اسی مجلس میں طلاق کو اختیار
کرے اس وقت وقوع ہوتا ہے اور اختیار منکوحہ کی شرط فقہا نے باب الکنايات میں
نہیں بیان کی بلکہ یہ شرط باب التفویض میں لکھی ہے پس اگر کوئی لفظ اختیاری کو صرف
باب الکنايات میں دیکھ کر حکم بیان کر دے گا وہ ضرور غلطی کرے گا اور نیت زوج کے بعد
فوراً وقوع کا فتویٰ دیدے گا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے - اور اس میں بعض علماء تک بھی غلطی

کر چکے ہیں - چنانچہ علامہ شامی نے ایک فقیہ کی غلطی نکالی ہے کہ انہوں نے اس
مسئلہ میں غلط فتویٰ دیا ہے -

مطلق و مقید کا فرق | نیز بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ ایک کتاب میں مطلق
ہے دوسری کتاب میں مقید ہے اس لئے مسائل فقہ میں مفتی
کو لازم ہے کہ صرف ایک کتاب کو دیکھ کر فتویٰ نہ دے بلکہ مختلف کتابوں میں دیکھ کر جواب
دے بغرض فقہ کا فن بہت دقیق ہے - جاہل و اعظم ضرور غلطی کرے گا - اور اس کے امتحان
کی آسان صورت یہ ہے کہ کسی جاہل کے وعظ میں ایک عالم کو دو چار دفعہ پردہ میں بٹھلاؤ
دو چار دفعہ کی اس لئے ضرورت ہے کہ ایک دفعہ تو غلطی سے محفوظ رہ جانا ممکن ہے - مگر
ہمیشہ محفوظ رہ جانا جاہل سے دشوار ہے - دو چار دفعہ کے بعد ان عالم صاحب سے پوچھ
لینا کہ اس نے کتنی غلطیاں کی ہیں - انشاء اللہ حقیقت معلوم ہو جائیگی - اس لئے میں
کہتا ہوں کہ یہ کام نااہل کو نہ دینا چاہیے - میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ عالم سے غلطی نہیں ہوتی
عالم بھی بشر ہے اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے - مگر وہ خفیف اور قلیل غلطی کرے گا - شدید اور
بحرث غلطی نہ کرے گا یعنی اس کے بیان میں شاذ و نادر کبھی سو بائیں ایک بار غلطی ہوگی اور جاہل
کے وعظ میں کثرت سے غلطیاں ہوں گی پھر عالم دوسرے وقت اپنی غلطی پر متنبہ ہو سکتا ہے -
اور دوسرے بیان میں اس کی اصلاح بھی کر سکتا ہے اور جاہل کو متنبہ بھی نہیں ہوگا کہ میں نے
کیا غلطی کی ہے اس لئے یہ اس سے اشد ہے خوب سمجھو -

صاحب آپ کو تجربہ نہیں اور مجھے تجربہ ہے جس کی بناء پر میں کرتا ہوں کہ نااہل کو
وعظ کی اجازت نہ دینا چاہیے - واللہ جہل کی وجہ سے بڑی خرابیاں ہو رہی ہیں - کانپور میں
ایک شخص نے ایک ایسے بکرے کی قربانی کی جس کا کوئی عضو عیب سے خالی نہ تھا - لوگوں
نے اس سے کہا کہ اس کی قربانی جائز نہیں تو وہ کہتا ہے - واہ ہمارے بیوی صاحبہ نے
فتویٰ دیا ہے کہ اس کی قربانی جائز ہے - پھر اس نے بیوی سے جا کر کہا کہ لوگ تمہارے
فتویٰ میں غلطی نکالتے ہیں اس نے شرح و قایہ کا اردو ترجمہ پڑھا تھا اس میں مسئلہ کا موقع
نکال کر باہر بھیج دیا کہ دیکھو اس میں لکھا ہے کہ تہائی عضو سے کم کٹا ہو تو قربانی جائز ہے - اول
اس بکرے کا کوئی عضو تہائی سے زائد نہیں کٹا بلکہ کم ہی ہے - گو مجموعہ مل کر بہت زیادہ تھا -
کچھ ٹھکانا ہے اس نامعقول حرکت کا کہ ایک عورت بھی شرح و قایہ کا ترجمہ پڑھ کر مفتی بن گئی

۶۵ عوام کا ہر دینی کام میں دلیل تلاش کرنا

بڑی غلطی ہے

فرمایا کہ ہر عمل کا مدار اعتماد پر ہوتا ہے۔ مثلاً باورچی نے کھانا سامنے لا کر رکھ دیا۔ اب صرف اس کے اعتماد پر کھانا کھا لیا جاتا ہے حالانکہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ کہیں زہر نہ ملا دیا ہو۔ چنانچہ بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے۔ اب دیکھئے یہاں پر زہر ملانے کا احتمال کا خیال نہیں کیا جاتا۔ علیٰ ہذا تاجر لوگ کروڑوں روپے کی تجارت صرف ملازمین کے اعتماد پر کرتے ہیں حالانکہ بعض اوقات ملازم لوگ بہت سماں غبن کر ڈالتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہوں کا بھی سارا کام نوکر چاکر ہی کے ذریعہ چلتا ہے اسی طرح دین کا بھی کل کام اعتماد پر ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید کو قرآن مجید ماننا علماء کے اعتماد پر ہے۔ اور اس زمانہ کے علماء کو اپنے سے اگلے علماء پر۔ پھر ان کو صحابہ کرام پر۔ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ پس ثابت ہوا کہ کل کام خواہ۔۔۔ دین کا ہو یا دنیا کا۔ سب کا دار و مدار اعتماد ہی پر ہے۔ اب عوام کو ہر امر دین میں دلیل تلاش کرنا غلطی ہے۔ (مقالات حکمت ۱ دعوات عبدیت حصہ ششم)

۶۶ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت میں جانا

رحمت سے ہو گا نہ کہ عمل سے اس کی ایک شے کا جواب

کوئی یہ سن کر کہ اعمال کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں نہ جائیں گے۔ یہ نہ سمجھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال میں کچھ نقصان تھا۔ بات یہ ہے کہ عمل کی وجہ سے جنت میں جانا یہ اعلیٰ درجہ نہیں ہے بلکہ رحمت کی وجہ سے جانا یہ ہی اعلیٰ درجہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ثمرہ تابع سبب کے ہوتا ہے اگر سبب ناقص ہے تو ثمرہ بھی ناقص ہوگا۔ اور اگر سبب کامل ہے تو ثمرہ بھی کامل ہوگا ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ خدا کی رحمت کا کتنا ہی حصہ لے لیا جاوے وہ غیر محدود ہی ہوگا۔ غیر متناہی کا نصف بھی غیر محدود

ہی ہوگا رحمت حق کا اول تو تجربہ نہیں ہو سکتا لیکن اگر بالفرض کسی درجہ میں کسی نسبت سے تجربہ ہو بھی تو وہ غیر متناہی ہوگا کیونکہ اگر اس کو متناہی مانا جاوے تو اس سے مجموعہ کا متناہی ہونا لازم آئے گا کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ مرکب متناہی سے برات متناہی متناہی ہوتا ہے بہر حال نصف وغیرہ بھی غیر متناہی کا غیر متناہی ہوتا ہے اور پہلے میں مقدمہ عرض کر چکا ہوں کہ سبب مسبب کے تابع ہوتا ہے یعنی سبب ناقص تو ثمرہ بھی ناقص۔ اور سبب کامل تو ثمرہ بھی کامل۔

سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ جنت میں اگر آپ کے عمل کی وجہ سے ہو گا تو متناہی ہوگا۔ کیونکہ عمل متناہی ہے اور اگر رحمت کی وجہ سے ہو گا تو غیر متناہی ہوگا کیوں کہ رحمت غیر متناہی ہے۔ اس لئے رحمت کی وجہ سے جانا یہی اعلیٰ درجہ ہے۔ غرض آپ کا عمل محدود تو ہو گا مگر نفع و بارشنا ناقص نہیں۔ پس عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جانے سے لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں کوئی نقصان ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ سے بڑھ کر کسی کا بھی عمل نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر اعمال ہر طرح کامل ہیں۔ مگر چونکہ رحمت حق کی وجہ سے جنت میں جانا اعلیٰ درجہ ہے اس لئے آپ کے اعمال کو سبب نہیں بنایا گیا دخول جنت کا۔ بلکہ اعمال تو کسی حال میں بھی دخول جنت کا سبب نہیں ہو سکتے چاہے کیسے ہی کامل ہوں کیونکہ خود اعمال کا کمال بھی تو رحمت حق ہی پر مرتب ہے پس جب اعمال کا کمال بھی اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت کا ثمرہ ہوا تو پھر بندہ کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے۔ خیال تو فرمائیے۔ پس کسی کو کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے۔ خیال تو فرمائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا درجہ ہے مگر کچھ بھی آپ یوں فرما رہے ہیں کہ میں بھی جنت میں اپنے اعمال سے نہ جاؤں گا۔ تو پھر ہمارا کیا منہ ہے۔

(وعظاً یحیوۃ ص ۱۸)

۶۷:- حضرت ابراہیمؑ کا حضرت اسمعیلؑ سے

بوقت ذبح رادریا کرنے پر ایک شے کا جواب

بعض لوگ یہ سمجھے کہ رائے دریافت کرنے کے لئے ابراہیم علیہ السلام نے اسمعیل علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ تمہاری کیا رائے ہے تو انہوں نے کہا یا اَبَتِ افْعَلْ مَا تَوْصَرُّ

بعض نے معیار بنایا کر امت کو۔ بعض نے وجد و سماع کو۔ بعض نے حرارت کو کہ جس کے اندر حرارت زیادہ ہو اور بہت روتا ہو۔ وہ بزرگ ہے بعض نے معیار بنایا تقرفات کو کہ ایک نظر اٹھا کر دیکھا اور مدھوش ہو گیا۔ تو سمجھئے کہ یہ بڑا بزرگ ہے۔ اور بعض نے معیار بنایا بجزد کو۔ گو بعض حالتوں میں اس کی اجازت ہے مگر معیار نہیں۔ بعض نے معیار بنایا تند مزاجی کو چنانچہ سب سے زیادہ اس کے معتقد ہوتے ہیں جو پتھر ڈھیلے مارے۔ وہ تو ان پر ظلم کرتے ہیں اور یہ ان کے معتقد ہوتے ہیں اور جو گالیاں دیتے ہیں۔ یہ ان کو بھی کہتے ہیں کہ مجذوب ہیں کیونکہ صاحب کشف ہیں۔ سو کشف ان کے نزدیک بڑا کمال ہے حالانکہ کشف مجنونوں کو بھی ہوتا ہے چنانچہ میرے یہاں ایک عورت کو جنون ہوا۔ تو اس کو کشف ہوتا تھا مگر جب سہل نہ آیا تو اس کے ساتھ کشف بھی ختم ہو گیا۔ شرح اسباب میں لکھا ہے کہ مایعہ یلیا کے مرض میں کشف ہونے لگتا ہے۔ پس کشف کوئی کمال کی بات نہیں۔

بزرگی کیا ہے؟ ہے کہ ان لوگوں کو خبر نہیں کہ بزرگی کیا چیز ہے؟ اس فن میں کو جاننے نہیں اور یہ لوگ تو کیا اکثر اہل علم بھی نہیں جانتے کہ بزرگی کیا چیز ہے؟ میں نے اہل علم کو بھی دیکھا کہ اکثر ایسوں کے معتقد ہو جاتے ہیں اور بعضوں نے نزدیک بزرگی کا معیار یہ ہے کہ وہ ان گھڑت باتیں کہیں۔ ہمارے یہاں ایک شخص تھا۔ اس سے اکثر سٹے والے پوچھ جاتے تھے کہ ہم جیتیں گے یا ہاریں گے۔ وہ اس کے جواب میں بڑبڑانے لگتا۔ ان لوگوں نے پھر اصطلاح مقرر کر رکھی تھی اس اصطلاح کے موافق اس کی ہوا اس سے اپنا جواب سمجھ لیتے تھے یہ حال ہے لوگوں کے اعتقاد کا۔ کہ کوئی شخص صوفی بن جائے۔ پھر اس کی ہر بات بزرگی ہو جاتی ہے خاموش رہیں تو خاموش شاہ کہلاتیں اور گالیاں اور خلاف شریعت کریں تو مجذوب کہلاتیں۔

ایک دفعہ بزرگی جب طری ہوئی چاہیے پھر وہ ایسی پختہ ہو جاتی ہے۔ جیسے بی بی تیزہ کا وضو مشہور ہے کہ بی بی تیزہ نام کی ایک فاحشہ عورت تھی۔ ایک بزرگ نے اسے نصیحت کی اور وضو کروا کے نماز پڑھوائی اور تاکید کر دی کہ ہمیشہ اسی طرح پڑھا کرنا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے ایک مدت کے بعد وہ پھر ان کو کہیں ملی تو انھوں نے اس سے دریافت کیا کہ نماز پڑھا کرتی ہو۔ اس نے کہا

بی بی تیزہ کا وضو

پڑھوائی اور تاکید کر دی کہ ہمیشہ اسی طرح پڑھا کرنا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے ایک مدت کے بعد وہ پھر ان کو کہیں ملی تو انھوں نے اس سے دریافت کیا کہ نماز پڑھا کرتی ہو۔ اس نے کہا

جی ہاں پڑھا کرتی ہوں۔ انہوں نے کہا اور وضو بھی کیا کرتی ہو۔ اس نے جواب دیا کہ وضو اس روز آپ نے کرنا نہیں دیا تھا۔ سو جیسا اس کا وضو پکا تھا کہ بند کاری سے ٹوٹا نہ پھٹے سے دموتے سے آجکل کی بزرگی بھی ایسی ہی پختہ ہے کہ اس میں کسی طرح خلل نہیں آتا۔ حتیٰ کہ اگر نماز بھی نہ پڑھیں تب بھی بزرگ ہی ہیں۔

بزرگی کیا ختم نہیں ہوتی ہے

غرض ایک مرتبہ جس سے اعتقاد ہو گیا پھر خلل نہیں پڑتا ہاں ایک صورت سے خلل پڑتا ہے شریعت کی بات بتلانے لگے ایسا کرے تو کہتے

ہیں کہ میاں یہ تو زائل ہے۔ اور جو شریعت کے خلاف کرے تو اس کو سمندر کہتے ہیں اس کو کوئی مصیبت گندہ نہیں کر سکتی یہ تو سمندر ہے۔ سمندر میں چاہے کتنی ہی بجا ست بچائے اس کو ناپاک تھوڑا ہی کر سکتی ہے لیکن اگر سمندر پیشاب ہی کا ہو تو کیا تب بھی یک ہو گا۔ سو یہ حضرت تو میرے پر تک گو ہی میں بھرے ہوئے ہیں ایک پر صاحب اپنی دیدنی کا گانا سن رہے تھے۔ گانا سننے سننے آپ کو مستی سوار ہوئی۔ اور تخلیہ میں لے جا کر اس کے ساتھ منہ کا لایا اور وہاں سے باہر آکر فرماتے ہیں کہ جب آگیا جوش نہ رہا ہوش گرم بدوں کے نزدیک پھر بھی بزرگ ہی رہے۔ سبحان اللہ کیا اچھی بزرگی ہے۔ چاہے سیاہی کام کر لیں مگر پھر بھی بزرگ کے بزرگ۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں نے وہ ذرّت الی کہ یا تو اتباع ہی نہ تھا۔ اگر ہوا تو بلا معیار ہوا۔ اور اتباع کی شکایت تھی۔ پھر جب اتباع و اتوا ایسا کہ اس کا کوئی صحیح معیار ہی نہیں۔ سو یہ وہ قصہ ہوا کہ

اگر غفلت سے باز آیا جھانکی تملانی کی بھینٹا لم نے تو کیا کی۔ (و عطا اتباع المنیب من)

۶۹۔ پیشوا بنانے کا صحیح معیار

سَبِيلُ مَنْ أَنَابَ كَاتِبُ كَرُو۔ اندھا دھند ہر ایک کا اتباع نہ کرو اور خوبی دیکھئے و اتبع من اناب الی تنہیں فرمایا۔ کیونکہ اس میں ابہام ہے اس امر کا کہ وہ خود متبوع ہیں اس لئے سبیل کا لفظ اور بڑھایا اور فرمایا و اتبع سبیل من اناب الی کہ وہ خود

متبوع نہیں ہیں بلکہ ان کے پاس ایک سبیل ہے۔ وہ ہے متبوع یہ ہے اتباع کا معیار۔ کہ جس شخص کا اتباع کرو۔ اس کو دیکھ لو کہ وہ صاحب انابت ہے یا نہیں۔ جو صاحب انابت ہو اس کا اتباع کرو۔ سبحان اللہ کیا عجیب معیار ہے پس اتباع اس معیار کے موافق کرنا چاہیے اور سب معیار چھوڑ دیئے جائیں۔

خلاصہ یہ کہ حق تعالیٰ نے توجہ الی اللہ کو معیار بنایا۔ اور توجہ الی اللہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کو مانے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ وَتَتَذَكَّرُ أَلِيَّهِ مَنْ يُنِيبُ کہ توجہ الی اللہ کو ہدایت لازم ہے۔ اور ہدایت یہ ہے کہ افعال درست ہوں۔ پس اس سے معلوم ہو گیا کہ توجہ الی اللہ کے لئے لازم ہے کہ اس کے افعال درست ہوں۔ پس اب من اناب الی سے مراد وہ شخص ہوا جو کہ باعمل ہو۔ اور عمل بدون علم کے ہو نہیں سکتا۔ تو حاصل یہ ہوا کہ اس کا اتباع کرو جو احکام خداوندی کے علم و عمل دونوں کا جامع ہو۔ بس دو چیزیں اصل ٹھہریں۔ ایک علم دین اور عمل دین۔ اور اب تک جتنے معیار لوگوں نے مقرر کر رکھے ہیں۔ ان میں نہ عمل ہے نہ علم۔ اور علم و عمل کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے وہ توجہ الی اللہ ہے۔ پس سب سے اول تو علم ہونا چاہیے اور پھر اس پر مرتب ہونا چاہیے کہ عمل اور توجہ الی اللہ ہو۔ سبحان اللہ کیا جامع کلام ہے کہ ایک اناب کے لفظ میں تینوں امور علم و عمل اور توجہ الی اللہ کی طرف اشارہ فرمادیا۔ بس اب معلوم ہوا کہ کامل اور اتباع کے متبادل وہ ہو گا کہ جسمیں یہ تینوں باتیں ہوں۔

(اتباع المنیب مثلاً)

۴۔ بعض لوگ حج کے بعد بدعمل کیوں

ہو جاتے ہیں؟

بات یہ ہے کہ حجر اسود کسوٹی ہے۔ اس کو چھونے کے بعد انسان کا اصلی رنگ ظاہر ہو جاتا ہے جو حالت پہلے سے مخفی تھی وہ اب کھل جاتی ہے۔ اگر طبیعت میں نیکی تھی تو پہلے سے زیادہ

لہ وہ اس کو اپنی طرف راہ دیکھتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے ۱۲

نیک ہو جاتا ہے اگر بدی تھی تو وہ بدی اب نکل جاتی ہے۔ بہت لوگ ظاہر میں نیک معلوم ہوتے ہیں مگر کسوٹی پر لگانے سے کھر اکھوٹا معلوم ہو جاتا ہے۔

نقد صوفی نہ بہر صافی وہ غش باشد اے بساخر تو کو مستوجب آتش باشد
خوش بود گر مہک تجر بہ آید بر میاں تاسیر وئی شود ہر کہ دروغش باشد
ستاید تم کہو کہ اچھا ہوا تم نے یہ بات ظاہر کر دی۔ اب تو ہم حج ہی کو نہ جائیں گے۔ نہیں صاحب حج کو جاؤ مگر اکسیر بن کر جاؤ اور لوں تم کو اکسیر بننے کا طریقہ بھی بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ کسی کی کیا گرسے تعلق پیدا کر لو۔

کیسیا نیست عجیب بندگی پر معناں خاک او گشتم و چندیں در جام دادند
کیسیا گرسے میری مرادیہ ننگوئی باندھے والے نہیں تھے ہیں بلکہ باطن کے کیسیا گمراد ہیں جن کو اہل اللہ کہتے ہیں ان کی شان یہ ہوتی ہے۔

آہن کہ پارس آشنانشاں فی الحال بصورت طلبا باشد
پارس ایک پتھر ہوتا ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ جہاں لوہے کو اس سے مس کیا فوراً سونا بن جاتا ہے۔ اہل اللہ کی تو یہ خاصیت مشاہد ہے پارس میں یہ بات ہویا نہ ہوا اہل اللہ کی صحبت سے تو یہ نصوح حاصل ہو جاتی ہے جس سے پہلی تمام گندگیاں دھل جاتی ہیں۔ پس تم کو چاہیے کہ کسی اللہ والے سے تعلق پیدا کر کے حج کو جاؤ۔ اس کی صحبت سے تم کو توبہ خالص عطا ہوگی تو بکرے جاؤ گے تو پھر حج کا یہ اثر ہو گا کہ پہلے سے زیادہ تم کو اعمال صاف کی توفیق ہوگی۔ میرا مطلب نہیں کہ مرید ہو کر جاؤ۔ اس کی ضرورت نہیں صرف تعلق محبت اور چند روزہ صحبت کی ضرورت ہے۔ (محاسن الاسلام ص ۳)

۱۔ جب کہ بری باتوں سے بچنا نماز کا خاصہ ہے

تو پھر اس کے خلاف کیوں ہوتا ہے

اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نماز کس شان کی پڑھتے ہیں۔ اے صاحب! آپ کی نماز کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ مجھے آدمی کی ضرورت ہے اور آپ اس کے سلسلے نیک

اپنا بیچ مضفہ گوشت کو لاکر پیش کر دیں اور جب وہ کہے کہ میں اپنا بیچ کو لیکر کیا کروں؟ یہ بھی کوئی آدمی ہے؟ آپ اس کے جواب میں یہ کہیں کہ صاحب تم نے آدمی کو کہا تھا میں نے آدمی لادیا۔ دیکھ لو یہ حیوان ناطق ہے یا نہیں؟ تو بیشک وہ معقولی آدمی تو ہے مگر معقول آدمی نہیں وہ اس قابل نہیں ہے جس سے آدمیوں کے کام لئے جائیں گے۔

بس یہی حال ہماری نماز کا ہے کہ نام کو تو نماز ہے مگر اس کی شان یہ ہے کہ اس کے لئے ہاتھ ہیں نہ پیر ہے نہ منہ ہے نہ سر ہے نہ آنکھیں۔ اگر ہاتھ ہے تو سر کٹا ہوا ہے سر ہے تو آنکھیں اندھی ہیں۔ اہل حقیقت تو ایسی نماز کو کالعدم سمجھتے ہیں جیسے اپنا بیچ مضفہ گوشت کو کالعدم سمجھا گیا تھا۔ مگر فقہاء نے یہ دیکھ کر کہ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے اگر نہ ہونے کا حکم لگایا جائے گا لوگ اسے بھی چھوڑ بیٹھیں گے اس پر صحت کا حکم لگا دیا ہے۔ مگر حیم صحت ویسا ہی ہے جیسے آپ نے اس اپنا بیچ کو حیوان ناطق ہونے کی وجہ سے آدمی کہا تھا پس ایسے ہی آپ کی نماز اصطلاحی نماز تو ہے مگر حقیقی نماز نہیں ہے۔

صورۃ نماز بھی فائدہ سے خالی نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اس کو بالکل بیکار یہ بھی نہیں۔ نہ ہونے سے اس کا ہونا پھر بہتر ہے کیونکہ بعض دفعہ اگر نظر عنایت ہو جائے تو حق تعالیٰ کے یہاں صورت بھی قبول ہو جاتی ہے۔ مولانا نے ایسی نماز کے قبول ہونے کی عجیب مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ۔

اِس قبول ذکر و تَوَاضُعِ رَحْمَتِ اِسْتِ چوں نماز مستحاضہ رخصت است
یعنی جس طرح عورت مستحاضہ کی نماز شرعاً صحیح مانی گئی ہے حالانکہ نماز کے اندر بھی اس کا خون جاری ہے اور حقیقت کے اعتبار سے وہ ناپاک ہے مگر محض رحمت کی بناء پر اس کو قبول کر لیا جاتا ہے۔ یہی حالت ہماری تمام نمازوں کی ہے کہ گو حقیقت کے لحاظ سے وہ کالعدم ہیں مگر حق تعالیٰ کی نظر عنایت سے کبھی یہ بھی قبول ہو جاتی ہے۔ نیز بعض دفعہ شدہ یہ نماز حقیقی کی طرف وسیلہ ہو جاتی ہے۔ جیسے بعض طلبہ بدشوق ہوتے ہیں نہ مطالعہ کر کے پڑھتے ہیں نہ پڑھ کر دیکھتے ہیں تو ان کا اس وقت پڑھنا نہ پڑھنے کے مثل ہے مگر

لے گوشت کا لکھڑا۔ نہ وہ عورت جس کو حیض کے علاوہ استحاضہ خون آرہا ہے

شفیق استاذ اس کو محنت سے نہیں نکالتا۔ اور یہ کہتا ہے کہ گو یہ اس وقت متوقین طالب علم کے برابر نہیں مگر شدہ شدہ شوق کی امید ہے چنانچہ اکثر ایسا ہو بھی جاتا ہے کہ جن طالب علموں کو بتدریس میں شوق نہ تھا جب وہ عرصہ تک کام میں لگے رہے تو ایک وقت میں خود بخود ان کو شوق پیدا ہو گیا انہیں سبب پر نظر کر کے حضرات فقہاء نے ایسی نمازوں پر صحت کا حکم لگا دیا۔ اور واقعی فقہاء کا وجود بھی امت کے لئے رحمت ہے پس آپ اپنی نماز کو بیکار تو نہ سمجھیں مگر کامل بھی نہ سمجھیں۔

اعترض کا جواب اب اعتراض کا جواب ہو گیا کہ نماز کی تاثیر تو حق تعالیٰ نے یہ بتلائی ہے کہ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ۔ اور ہم اپنے اندر یہ اثر نہیں پاتے تو بات یہ ہے کہ یہ شان کامل نماز کی ہے اور آپ کی نماز کامل نہیں۔ اس لئے اس کا اظہار نہیں ہوتا۔ ہم نماز کو بُری طرح ادا کرتے ہیں جیسے کوئی جوشاندے کو سفوف بنا کر پھانک لے تو بتلائیے نفع کیونکر ہو۔ دوسرے یہ کہ جیسی ہماری نماز ہے ویسی اس کی بھی عن الفحشاء بھی ہے۔ اگر کامل نماز ہوتی تو وہ ہم کو تمام فحشاء سے روکتی۔ اب ناقص ہے تو کسی قدر فحشاء سے روکتی ہے۔ اور اس کا انکار نہیں ہو سکتا تجربہ ہے کہ نمازی آدمی عموماً بے نمازیوں سے کم گناہ کرتے ہیں اور ادنیٰ نفع تو یہی ہے کہ نمازی آدمی کے پاس کوئی کافر بہکانے کے واسطے نہیں آتا لہذا جس کو نمازی دیکھتے ہیں اس کو دین کا پابند اور پختہ سمجھ کر کچھ نہیں کہتے۔ اس سے وہ ناامید ہو جاتے ہیں کہ یہ ہماری بہکانے میں نہیں آ سکتا۔ (ابو ابراہیم صلا)

۲۲ - معراج میں دیدار باری تعالیٰ

دنیا میں خدا کو دیکھنا محال عادی و شرعی ہے۔ محال عقلی تو نہیں کیونکہ محال عقلی کا وجود کسی جگہ نہیں ہوتا۔ اور حق تعالیٰ کا دیدار آخرت میں ہو گا۔ جیسا کہ نصوص سے ثابت ہے۔ اور دنیا میں بھی وجہ استحالة رویت اُدھر سے نہیں بلکہ ہماری طرف سے ہے ہم اس کے مستعمل نہیں۔ ورنہ حق تعالیٰ میں خفا نہیں وہ تو یہاں بھی ظاہر ہیں اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ حق تعالیٰ کی

لے وہ بُری اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے۔

صفت باطن بھی تو ہے چنانچہ نص میں ہے۔ **هُوَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ** پھر تمہارا یہ کہنا کیونکر صحیح ہے کہ حق تعالیٰ میں خفا نہیں۔ صفت باطن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ میں خفا ہے اس کا جواب محققین نے یہ دیا ہے کہ حق تعالیٰ جو باطن ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں خفا ہے بلکہ غایت ظہور سے بطون ہو گیا رہا یہ کہ غایت ظہور سے بطون کیسے ہو گیا۔ اس سے تو ظہور ہونا چاہیے تھا تو بات یہ ہے کہ ہمارے ادراک کے لئے غیبت و خفا کی بھی ضرورت ہے۔ اگر کسی چیز میں غیبت بالکل نہ ہو اس کا ادراک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں ہو سکتا کیونکہ ادراک التفات سے ہوتا ہے اور التفات غیبت کی وجہ سے ہوتا ہے جو چیز من کل وجہ حاضر ہو۔ اس کی طرف التفات نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی روح حالانکہ بہت ظاہر ہے اور انسان سے جتنا قرب روح کو ہے کسی چیز کو بھی نہیں پھر بھی روح کا ادراک نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ رگ رگ میں سرایت کی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی درجہ غیبت کا نہیں۔ اس لئے اس کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا اور جب التفات نہیں تو ادراک کیسے ہو اسی طرح بلاشبہ کیونکہ یہ تشبیہی ناقص ہے حق تعالیٰ میں چونکہ کوئی درجہ غیبت و خفا نہیں۔ اس لئے وہ بوجہ غایت ظہور کے باطن ہیں ہم کو دھوپ کا ادراک اس لئے ہے کہ وہ کبھی غائب بھی ہو جاتی ہے اگر غائب نہ ہوئی تو آپ اس کو دیکھتے تو مگر ادراک ہوتا۔ دھوپ کا ادراک ظلمت ہی کی وجہ سے ہے اور ظلمت خفا تصور ہی کا نام ہے۔ نیز اگر غیبت نہ ہو تو پھر روشنی سے لذت بھی نہ آتی۔ دن میں جو لذت ہے وہ اسی لئے ہے کہ رات میں دھوپ غائب ہو جاتی ہے۔

از دست ہجر یا رشکایت نمی گتم
گر نیست غیبی نہ دہد لذت حضور۔

دیدار الہی ہمارا ادراک ایسا ضعیف ہے جو غائب من وجہ کے ساتھ ہی متعلق ہو سکتا ہے ظاہر من کل وجہ کے ساتھ متعلق نہیں ہو سکتا۔ ہاں آخرت میں یہ ادراک قوی ہو جائے گا۔ تو ظاہر من کل وجہ کے ساتھ بھی متعلق ہوگا۔ وہاں روح کبھی انکشاف ہوگا اور حق تعالیٰ کا بھی دیدار ہوگا اور معلوم ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ تو بے حجاب تھے حجاب ہماری طرف سے تھا ہماری آنکھوں میں اس وقت اس کے دیکھنے کی قوت نہیں جیسے خفا میں

لہ پوشیدگی نہ توجہ

آفتاب کے دیکھنے کی قوت نہیں کسی نے خوب کہا ہے۔
شد ہفت پردہ بر چشم ایں ہفت پردہ چشم
بے پردہ ورنہ ماہے چوں آفتاب دارم
یعنی آنکھ کے سات پردے ہی دیدار سے مانع ہو گئے تو یہ آنکھ خود ہی مانع ہو رہی ہے ادھر سے مانع کوئی نہیں۔ اگر آفتاب چمک رہا ہے اور تم آنکھ پر ہاتھ دھر لو تو مانع تمہاری طرف سے ہوگا آفتاب کو مخفی نہ کہا جاوے گا اور وہ جو حدیث میں آخرت میں حجاب کا ذکر آتا ہے لا یبقی علی وجہہ الا رداء الکبریا۔ وہ حجاب ادراک کنہ سے مانع ہے دیدار سے مانع نہیں۔ آخرت میں ہماری آنکھوں کی قوت بڑھ جائے گی تو خدا تعالیٰ کو دیکھیں گے تو مگر کنہ کا ادراک نہ ہوگا۔ اور رویت کے لئے ادراک کنہ لازم نہیں۔ ہم یہاں کبھی بہت چیزوں کو دیکھتے ہیں مگر کنہ کا ادراک نہیں ہوتا۔ بہر حال دنیا میں رویت الہی محال عادی ہے چنانچہ حدیث مسلم ہے۔ **انکم لم تروا ربکم حتی تنوتوا**۔ دم اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے یہاں تک کہ تم کو موت آجائے اور نص میں موسیٰ علیہ السلام کی درخواست دیدار کے جواب میں ارشاد ہے۔ **لن ترائی**۔ یہ جواب قابل دید ہے حق تعالیٰ نے لن ترائی فرمایا ہے لن اری نہیں فرمایا۔ بتلادیا کہ میں تو اب بھی قابل ہوں کہ دیکھا جاؤں۔ میری طرف سے کوئی حجاب نہیں مگر تم قوت دیدار نہیں تم مجھے اس وقت تک نہیں دیکھ سکتے۔ محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ کیونکہ دنیا میں رویت محال عادی ہے ہاں تجلی ہوئی تھی اور حق تعالیٰ نے عجائبات اٹھا دیئے تھے مگر موسیٰ علیہ السلام دیکھنے سے پہلے ہی بے ہوش ہو گئے۔

آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدار الہی معراج میں ہوئی ہے۔

البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اختلاف ہے کہ معراج میں آپ نے حق تعالیٰ کو دیکھا ہے یا نہیں۔ اس میں اکثر علماء اور صوفیہ اور

نہ اس کے چہرہ پر کبریا کی چادر کے سوا کوئی اور چیز باقی نہیں رہتی ہے۔ نہ تو ہرگز مجھے نہ دیکھ سکے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اجماع کا قول یہی ہے کہ آپ نے دیکھا ہے مگر اسی کے ساتھ محققین کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ آیات سورہ نجم کی تفسیر اس حدیث سے صحیح نہیں ہے کیونکہ عَلَّمَ شَدِيدُ الْقُوَى ذُو مِرَّةٍ - یقیناً حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں ان صفات کا عنوان بیان اس کو مقتضی ہے کیونکہ حق تعالیٰ پر شدید القوی کا اطلاق نہیں ہو سکتا ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اب آگے چلئے۔ فاستوی وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَى بھی انہی کی صفت ہو سکتی ہے کا مرجع جبریل علیہ السلام ہی ہیں کیونکہ اَسْتَوَى بِالْأُفُقِ بھی انہی کی صفت ہو سکتی ہے اس کے بعد شَمُّ دَنَا فَتَدَنَى فَنَكَبَتْ وَتَسْتَوِي اَوَادِنِ میں سب ضمیریں جبریل علیہ السلام ہی کی طرف راجع ہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف راجع نہیں ورنہ انشاء ضرور لازم آئے گا یہ رویت جبریل تو دنیا میں ہوتی کھتی آگے فرماتے ہیں۔ وَ لَقَدْ رَأَوْا نَزْلَةً أُخْرَىٰ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ۔ یہ دوبارہ رویت سدرۃ المنتہیٰ پر ہوئی اور گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کو بہت دفعہ دیکھا ہے مگر یہاں اصلی صورت میں دیکھنے کا ذکر ہے وہ دوسرے ہوئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان آیات کی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خود پوچھی تھی۔ آپ نے فرمایا۔ ہُوَ جِبْرِیلُ۔ یعنی یہ رویت جبریل علیہ السلام کی تھی، باقی جو علماء معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رویت کے قائل ہیں وہ دوسرے دلائل سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا قول ہے کہ آپ نے معراج میں حق تعالیٰ کو دیکھا ہے اور ان کی سند صحیح ہے حضرت ابن عباسؓ کا قول تو مسلم میں ہے۔ اور سیوطی نے مستدرک حاکم سے اس باب میں حدیث مرفوعہ نقل کی ہے بس قرآن میں گو اس رویت کا ذکر نہیں مگر جنت حضرت صباؓ رضی اللہ عنہا اس کا اثبات کرتے ہیں تو یقیناً انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

ابن علماء نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کی وجہ کو اس قاعدہ سے کہ دنیا میں رویت محال عادی ہے مستثنیٰ

کیا ہے کیونکہ دلیل سے آپ کا دیکھنا ثابت ہو چکا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں استقامت رویت کی علت رائی کی عدم قابلیت تھی ورنہ مرنی میں تو کوئی مانع ہی نہیں مگر شیخ ابن عربی

نے عجیب تحقیق لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس قاعدہ کو میں استثنائے ضرورت نہیں بلکہ یہ اپنے عموم پر بجا لہا باتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت سے اس پر نقص دار نہیں ہوتا کیونکہ ہم تو معراج میں رویت کے قائل ہیں۔ اور معراج عرش تک ہوئی ہے اور سموات و عرش مکان آخرت ہیں۔ وہ دنیا میں داخل نہیں بلکہ اس سے خارج ہیں تو ممکن ہے کہ اس مکان کی یہ خاصیت ہو کہ جو شخص وہاں پہنچ جاوے خواہ مرنے کے بعد یا مرنے سے پہلے اس میں قوت تحمل رویت پیدا ہو جائے جیسے عیسیٰ علیہ السلام اس وقت آسمان پر موجود ہیں اور وہ وہاں کھانے پینے اور بول و براز سے منزہ ہیں صرف ذکر اللہ سے ان کی حیات ہے کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس وقت دنیا میں نہیں ہیں بلکہ مکان آخرت میں ہیں اور مکان کی خاصیت مکان دنیا سے الگ ہے۔ اگر یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ غذا سے فضلات پیدا ہوں تو ممکن ہے وہاں کی یہ خاصیت ہو کہ فضلات پیدا نہ ہوں۔ اگر یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ حرکت سے حرارت بدن تحلیل ہوتی ہے تو ممکن ہے کہ وہاں کی یہ خاصیت نہ ہوں۔ اسی طرح یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ اعراض میں وزن نہ ہو اور وہاں کی یہ خاصیت ہے کہ اعراض میں وزن ہو۔ یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ ایک دن موت ضرور آتی ہے وہاں کی یہ خاصیت ہے کہ جو وہاں پہنچ جائے اسے کبھی موت نہ آئے جیسے کسی شاعر نے کشمیر کی تعریف میں کہا ہے۔

ہر سوختہ جانے کہ یہ کشمیر در آید۔ گر مرغ کباب است کہ بابل پر آید

خیر یہ تو شاعرانہ مبالغہ ہے مگر اتنی بات تو مشاہدہ ہے کہ دنیا میں بھی ہر جگہ یکساں خاصیت نہیں۔ بلکہ بعض جگہ کی کچھ خاصیت ہے بعض شہروں کی کچھ خاصیت

ہے بعض ملکوں میں عمریں کم ہوتی ہیں اور بعض ملکوں میں لمبی لمبی ہوتی ہیں بعض مقامات کے آدمی کمزور ہوتے ہیں اور بعض مقامات کے بہت قوی اور توانا و تندرست ہوتے ہیں بعض ملکوں میں بیماریوں کی کثرت ہے آئے دن طاعون و ہیضہ پھیلا رہتا ہے۔ اور بعض ملکوں میں کوئی ان بیماریوں کا نام بھی نہیں جانتا۔ جب ایسا اختلاف خاص دنیا کے مکانات

لے برداشت۔ لے پانخانہ پیشاب

میں بھی مشاہد ہے تو اس میں کیا اشکال ہے کہ مکان آخرت کی خاصیت دنیا سے بالکل الگ ہو ایک کو دوسرے پر قیاس کرنے کی کجوجہ ہے اس تحقیق سے سب معادیات سہل ہو جاویں گی۔ اب نہ وزن اعمال میں اشکال ہے نہ رویت خداوندی میں کچھ شبہ ہو سکتا ہے معتزلہ کی عقل ماری گئی جو انہوں نے خواہ مخواہ ان امور کا انکار کیا جس کا منشا نہج قیاس الغائب علی الشاہد کے کچھ نہیں اور قیاس کا فاسد ہونا ظاہر ہے۔

غرض شیخ ابن عربی کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ ایک تو زمان آخرت ہے اور ایک مکان آخرت ہے زمان آخرت تو مرنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور مکان آخرت اسی وقت موجود ہے۔

چنانچہ جنت اور دوزخ کے بارے میں جملہ اہلسنت کا قول ہے کہ وہ اس وقت موجود ہیں۔ تو کیا وہ دنیا میں ہیں۔ اگر دنیا میں ہیں تب تو اس شخص کا قول صحیح ہو جاویگا جو کہتا ہے کہ ہم نے تمام دنیا کا جغرافیہ پڑھا۔ جنت و دوزخ کا اس میں کہیں پتہ ہی نہیں۔ اس کا جواب اہل حق کی طرف سے نہ دیا گیا ہے کہ تم نے دنیا کا جغرافیہ پڑھا ہے اور ایک جغرافیہ آخرت کا ہے تم نے وہ نہیں پڑھا۔ وہ تمہارے کورس میں داخل نہیں ہے اس لئے تم کو جنت و دوزخ کا پتہ نہیں چلا۔ اگر آخرت کا جغرافیہ پڑھتے تب ان کا پتہ چلتا۔ بس اہل حق جنت و دوزخ کو دنیا میں موجود نہیں مانتے بلکہ ان کو مکان آخرت میں موجود مانتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مکان آخرت اس وقت بھی موجود ہے اور جس طرح زمان آخرت میں رویت ممکن ہے اسی طرح مکان آخرت میں بھی ممکن ہے۔ گو دیکھنے والا بھی زمان آخرت میں داخل نہ ہوا ہو۔ پس قاعدہ مذکورہ منتقص نہیں ہوا۔ جس رویت کو آپ کے لئے ثابت کیا جاتا ہے وہ دنیا میں نہ تھی بلکہ مکان آخرت میں تھی۔ اور دنیا میں آپ کے واسطے بھی رویت ممکن نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو قویٰ بشریہ میں سب سے اکمل ہیں مگر پھر بھی بشر ہیں۔

(تحصیل المرام ص ۵)

۷۳) درود پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی احسان

سمجھنا غلط ہے

اگر کہو کہ ہم درود شریف پڑھتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نفع ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ حضور والا کو اتنا نفع نہیں ہوتا جتنا آپ لوگوں کو ہوتا ہے ہمیں ارشاد ہے حق تعالیٰ کا کہ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ اگر آپ اپنے نوکر سے کہیں کہ یہ ہزار روپے ہیں ہم سے کہو کہ ہم اپنے بیٹے کو دے دیں۔ تو اس نوکر کو مقبول بنانے کو اس کی عزت بڑھانے کو یہ صورت تجویز کی ہے نہ کہ بیٹا روپے ملنے میں اس نوکر کا محتاج ہے۔ اگر نوکر نہ بھی کہے تب بھی روپیہ بیٹے کے لئے تجویز کر لیا گیا ہے صرف نوکر کی عزت افزائی کے لئے ایسا کیا ہے۔ یہی حال درود شریف کا ہے کہ حق تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ رحمت کی دعا کرو۔ رسول کے لئے رحمت بھیجنا تو منظور ہی ہے خواہ ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں چنانچہ اس کے قبل اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ موجود ہے مگر ہماری قدر بڑھانے کو ہمیں کہہ دیا کہ درود بھیجو کہ تمہارا کبھی بھلا ہو جاوے گا کوئی شخص کیا منہ لیکر کہہ سکتا ہے کہ آپ ہمارے محتاج ہیں اور اس کہنے پر آپ پر رحمت ہوگی یہ شہر شایہ کسی خشک مزاج کو ہوتا اس لئے رفع کر دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاملہ حق تعالیٰ کا ہے وہ ہماری درخواست پر موقوف نہیں اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ اور عبادات بعض دفعہ مقبول ہوتی ہیں اور بعض دفعہ مردود، لیکن درود شریف ہمیشہ مقبول ہوتا۔ سو اگر ہمارے عمل کا آپ پر رحمت نازل ہونے میں کوئی اثر ہوتا ہے تو جیسے اور اعمال ہیں یہ بھی ہمارا عمل ایسا ہی ہونا چاہئے تھا کہ کبھی مقبول اور کبھی مردود ہوتا ہے۔ سو ہمیشہ مقبول ہونا دلیل ہے اس کی کہ معلوم ہو کہ ہمارے عمل کا اس میں کوئی اثر نہیں۔ حق تعالیٰ ضرورت رحمت بھیجتے ہی ہیں ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں۔ اس لئے درود شریف کبھی غیر مقبول نہیں ہوتا۔

بس خدا تعالیٰ کو رحمت بھیجنا ہے ہی۔ ہم کو جو حکم دیا تو صرف

درود کا فائدہ

ہماری عزت بڑھانے کے لئے نیز ہمارے اعمال ظاہر ہیں کہ

مقبول ہونے کے قابل ہیں نہیں اور جو عمل مقبول نہ ہو وہ کالعدم ہے۔ پھر ہمارا درود پڑھنا کالعدم ہوا۔ مگر پھر بھی آپ پر رحمت ہوتی ہے کوئی شخص یہ احسان نہ سمجھے کہ میں درود بھیجتا ہوں۔ تب ہی رحمت ہوتی ہے اگر ہم آفتاب کے سامنے ہو گئے تو آفتاب نے ہم کو منور کرنا آفتاب ہمارا محتاج شعاع میں نہیں۔ پس علماء کے قول سے بھی اس کی تائید ہوگی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے نفع کے محتاج نہیں۔ البتہ اس مقام پر ایک اور شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دین کی تعلیم کی ہے اور ہمارے عمل کرنے سے آپ کو بھی ثواب پہنچتا ہے تو اگر ہم عمل نہ کریں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ثواب کیسے ملے گا۔ پھر ہمارے عمل کو اس میں دخل ہوا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس نیت سے تسلیم فرمایا تو آپ ہر حال میں ماحور تو ہو گئے۔ اب ہمارے عمل کرنے کا اثر اتنا رہا کہ عمل کرنے سے آپ کا جی خوش ہوتا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں امتی نے یہ عمل کیا تو آپ خوش ہوتے ہیں۔ بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے کوئی نفع نہیں (ذکر الرسول ص ۳)

۷۴۔ مساجد و مجالس کی آرائش فضول حرکت ہے

اس وقت عام طور پر سب کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ مجالس اسلامیہ کو آرائش و زیبائش سے بالکل تھیرا بنا دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ غیر قوموں کے مقابلہ میں ہم کو ان سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔

اے حضرات غیر قومیں کہ جن کے سامنے آپ یہ ظاہر کر رہے ہیں آپ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان کے برابر دولت آپ کے پاس کہاں ہے اگر وہ بھی صند باندھ لیں تو یقیناً آپ ان کے مقابلہ میں شرمندہ ہوں گے۔ اس لئے آپ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پیروی کیجئے اور کفار کا یہ نفسانی مقابلہ چھوڑیئے بس ایک سچے مسلمان کی یہ شان ہونی چاہیئے۔

دل فرمایا بناتی ہر زیور بستند دلبر راست کہ حسن خدا داد آمد
یہود اپنی زمینیں دکھلائیں۔ نصاریٰ اپنی زمینیں دکھلائیں۔ ہنود اپنی زمینیں دکھلائیں

اور ایک مسلمان پھٹا ہوا کرتا پہن کر نکلے گا۔ تو خدا کی قسم سب کی رونقوں کو ماند کر دے گا۔ ارے صاحب! خدا نے وہ حسن آپ کو دیا ہے کہ آپ کو زینت کی حاجت ہی نہیں۔ اے حسین! خدا نے تجھے وہ حسن دیا ہے کہ تیرے حسن کے آگے آفتاب مانتا ہر شرماتے ہیں۔ ارے تو! پوڈر ملنے کا بے کو اپنے قدرتی حسن کو پوشیدہ کرتا ہے۔ تجھے اپنے حسن کی خبر نہیں۔ یہ عارضی حسن تیرے اصلی حسن کو پوشیدہ کئے دیتا ہے۔ متنبی ہوتا ہے۔

حسن الحضرة مجلوب بنظریتہ و فی البدلۃ حسن غیر مجلوب
یعنی شہری عورتوں کا حسن تو بناؤ سنگار سے ہے اور دیہاتی عورتوں کا حسن خدا داد ہے واقعی ایک دیہاتی عورت اگر حسین ہو تو بوجہ اس کے کہ اس کے قویٰ بھی اچھے ہوتے ہیں اور محنت کی عادت کی وجہ سے صحت عمدہ اور جسم توانا ہوتا ہے۔ ایک شہری حسین عورت سے جو بیسیوں تکلفات سے اپنے حسن کو بڑھا لیتی ہے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے ارے صاحب! مجالس اسلامی کے لئے یہ حسن اور شرف کیا کم ہے کہ وہ اسلام کی طرف حقیقی نسبت سے منسوب ہے تم نے اسلامی مجلس منعقد کی، اس کو شہنشاہ دد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار ٹھہرایا۔ اور اس کو اتنا بھی آراستہ نہ کر سکے جتنا کہ ولی کا دربار، اور ملاطین یورپ کے دربار یا یورپ کے بڑے بڑے تھیتھر۔ تو تم نے گویا ایک نقل کی اور کوٹے کی طرح ہنس کے مقابلہ میں ذلیل ہوئے۔

مجالس اسلامی کی شان

ارے صاحب! مجلس اسلامی ایسی ہو کہ دور سے دیکھ کر خبر ہو جاوے کہ یہ مجلس اسلامی ہے یہ کسی ناچ رنگ یا تھیتھریا سرس کا اسٹیج نہیں

ہے۔ باہر سے مجلس بالکل سادہ ہو۔ اس کے بعد اندر پہنچیں تو صحابہ رض کا رنگ جھلکتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ بازاری عورتوں کی طرح گلے میں پھولوں کے ہار پڑے ہوئے۔ لباس نہایت پر تکلف اور ایک ایک چیز اور ہر ہر ادارے سے روسا کا سا بکھر نایاں ہو۔ اور حقیقت کا پتہ نہیں۔ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ زینت وہ شخص کرتا ہے جس کے پاس مال ہے کمال نہیں ہے ورنہ بجائے مال کے اپنے کمال کا اظہار کرتا۔ اور اب۔۔۔۔۔ کمال نہ ہونے سے مال کا اظہار کر رہا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے

ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے کہ گنجا آدمی اپنے سر کا عیب چھپانے کے لئے خوب صورت ٹوپی کا اہتمام کرتا ہے اور جس کا سر اور بال درست ہوں وہ تو یہ چاہے گا کہ ٹوپی ہی نہ ہو تو بہتر ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کسی خوبصورت مانگ اور کتنے اچھے بال ہیں۔ حضرت میں قسم کہتا ہوں کہ اگر قلب میں حقیقت ہے تو ظاہری آرائش سے نفرت ہوگی اور اگر حقیقت سے کورے ہیں تو ظاہری شان و شوکت سے اس کی لیب پوت کریں گے مجالس اسلامیہ میں کیسا بناؤ۔ اسلام کی طرح مجالس اسلامیہ میں بھی سادگی ہونی چاہیئے۔ غرض انجنوں میں بہت سے داعظین کا جمع کرنا یہ سب اسی افتخار اور نمونہ و انہماک کے لئے ہوتا ہے اور اس میں ایک عرض اور بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ کوئی کسی واعظ کو پسند کرتا ہے کوئی کسی کو سب کو جمع کر لو۔ تاکہ ہر مذاق کے لوگ جمع ہوں اور جلسہ میں خوب رونق ہو۔ میں کہتا ہوں اگر آپ صحیح غرض کے لئے جلسہ کر رہے ہیں تو آپ کو لوگوں کے مذاق کی کیا ضرورت ہے اگر کوئی ردِ پیغمبر کر رہا
تو مسائل خود بخود جمع ہو جائیں گے اس اشتہار کی کیا ضرورت ہے جو مسائل ردِ پیغمبر آئے گا اسے مٹھائی بھی ملے گی۔ معلوم ہوتا ہے ردِ پیغمبر جلی ہے۔ اگر سودا کھرا ہے تو بغیر قافیہ اور سب ملے بک جائے گا ورنہ مقفیہ اور مسجع عبارت بولنا پڑے گی۔ حضرت اپنا متاع خالص رکھئے۔ دیکھئے خود بخود خریدار آئیں گے اسی طرح حق ایسی چیز نہیں کہ اس کی طرف کشش نہ ہو۔ اہل حق اور ملمع سازوں کے کلام میں بھی فرق کہ ملمع سازوں کی آمد بڑی رنگین ہوتی ہے اور اس میں بڑا زور و شور ہوتا ہے مگر حاصل سو اے قافیہ بندی کے کچھ نہیں ہوتا۔

اہل حق کا کلام

اہل حق کے کلام میں ابتداء تو بہت دھیمی ہوتی ہے۔ مگر انتہا ہر میں روز اور قوت اور خاص اثر ہوتا ہے ابتداء ان کی ہلکی بارش کی طرح آہستہ آہستہ ہوتی ہے جو کہ قلب میں آہستہ آہستہ ایسی بارش کی طرح جذب ہو جاتی ہے مگر اس کا انتہائی اثر کلزار اور گل بار ہوتا ہے بقول

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک شوتا گل بر وید رنگ برنگ

اور ملمع ساز اپنا رنگ جانے کے لئے ابتداء میں خوب مثنوی کے اشعار پڑھتے ہیں

اور کہیں کہیں اب تو ڈھولک ستار اور ہار مونی سے کبھی مجلس وعظ کو گرم کیا جاتا ہے مضامین کے الفاظ بھی دلگذا رہتے ہیں کہ اس وقت تو ذرا سا جوش پیدا ہو جاتا ہے پھر جہاں مجلس بخاصت ہوئی اثر بھی تشریف لے گیا اور جو ذرا سابق رہ گیا وہ دوچار روز کا مہمان ہوتا ہے اور اہل حق کا اثر پائدار ہوتا ہے۔ مگر کلام ان کا رنگین نہیں ہوتا پس ان دنوں میں ایسا فرق ہے جیسا ایک چمکدار گلاب کے چمچے اور رنگ آلود روپے میں روپیہ کا رنگ اگر نہ بھی چھوڑا وہ شہ بھی سولہ ہی آنے کو چلتا ہے اور گلاب کے چمچ پر اگر گلاب بھی چڑھا رہے پھر بھی اسے کوئی نہیں پوچھتا اور اگر وہ بھی اترا جائے تو پھر وہ کچھ بھی نہیں۔ غرض روپے کو سفیدی اور چمک کی حاجت نہیں اور وہ جو گلاب کا چمچ اپنے سفید ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اور ظاہر روپے سے بھی زیادہ چمکدار ہے۔ اس کی سفیدی اور چمک تھوڑے دنوں کی ہے کہ اس کے بعد دو کوڑی کا بھی نہ ملے گا۔

۱۔ نقدِ صوفی نہ ہمہ صافی بے غش باشد۔

۲۔ بسا خرقة کہ مستوجب کش باشد۔

جب یہ کسوٹی آئے گی تو ردِ پیغمبر تو سامنے آکھڑا ہوگا اور گلاب کا چمچ نہ چھپاتا پھر گرا۔

۳۔ نہ باشد اہل باطن در پئے آرائش ظاہر۔

۴۔ بنقاش احتیاج نیست دیوار گلستاں را۔

یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہنیت سادہ زندگی تھی۔ آپ میں لطف اور ظاہری وجہ میں کوئی شان و شوکت نہ تھی۔ کیونکہ آپ سچے تھے باوجودیکہ آپ اعلیٰ درجہ کے قادر اور انتہا درجہ کے متین تھے مگر ساتھ ہی اس کے مہنیت بے تکلف تھے۔

(اصلاح الیتامی ص ۱۲)

۵۔ حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیائے کرام

کی حیات برزخہ اثبات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے لئے بہت کچھ شرف حاصل ہے کیونکہ

مگر میں قتل ہو جائے بلکہ حقیقی شہادت کے لئے کچھ باطنی شرائط بھی ہیں۔ مثلاً نیت کا طہا لیس وجہ اللہ ہونا۔ جس کی خبر سوائے خدا کے کسی کو نہیں ہو سکتی۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس کو آپ نے اس کے خلاف مشاہدہ کیا ہے وہ شہید حقیقی نہ تھا صرف شہید احکام تھا اور حیات اقویٰ درجہ صرف شہید حقیقی کے ساتھ خاص ہو گا اور اگر ان بھی لیا جاوے کہ وہ حقیقی شہید تھا تو ممکن ہے کہ کسی عارض کی وجہ سے ایسا ہو گا ہو کہ اس کی لاش گل گئی۔ مثلاً اس کے لئے کسی مٹی تیز ہو۔ ہم نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ شہید کی حیات ایسی ہوتی ہے کہ اگر جلاؤ بھی اس کی لاش نہ جلے بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ اگر شہید کو موافق عادت کے دفن کر دیا جاوے یا کہ عموماً مردے دفن ہوتے ہیں کہ اس کی قبر میں کوئی خاص عارض دوسروں سے زیادہ مثل شوریٰ زمین وغیرہ کی نہ ہو تو اس کی لاش مثل دوسرے مردوں کے نہیں گلے گی۔

تیسرا درجہ جو سب سے قوی ہے وہ انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخیہ کا ہے کہ وہ شہید کی حیات سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہے چنانچہ اس کا ایک اثر تو محسوس ہے اور وہ وہی ہے جو

انبیاء کی حیات

شہید کے لئے ہے کہ ان کے جسم مبارک کو زمین نہیں کھا سکتی حدیث میں ہے۔ حرم اجساد الانبیاء علی الارض۔ اور دوسرا اثر محسوس تو نہیں مگر منصوص ہے اور حرمت نکاح ازواج انبیاء علیہم السلام ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج مطہرات بعد ان کے وصال کے کسی امتی کو نکاح جائز نہیں نیز انبیاء علیہم السلام کی میراث ورثہ تسلیم نہیں ہوتی۔ نفع معاشرۃ الانبیاء لا فورث ماتر کنا صدقۃ انبیاء علیہم السلام ہم ترکہ صدقہ ہوتا ہے یہ باتیں شہید کے لئے شریعت نے مشروع نہیں کیں۔ تو اگرچہ شریعت اس کا کوئی خاص راز نہیں بیان کیا۔ مگر علماء محققین یہی کہتے ہیں اس کا راز قوت حیات انبیاء علیہم السلام ہے کہ حیات مانع ہے ان دونوں سے۔ اور گواہ ازواج نبی سے بعد وفات نبی نکاح حرام ہونا تمام انبیاء علیہم السلام کے بارے میں منقول نہیں ہوا۔ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ خصوصیت قرآن میں ذکر کی گئی ہے مگر علماء میراث پر قیاس کر کے اس

جسد اطہر اس کے اندر موجود ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود یعنی جسد مع تلبس الروح اس کے اندر تشریف رکھتے ہیں۔ کیونکہ آپ قبر میں زندہ ہیں۔ قریب قریب تمام اہل حق اس پر متفق ہیں۔ صحابہ کا بھی یہی اعتقاد ہے حدیث بھی نص ہے۔ ان نبی اللہ حتیٰ فی قبرہ یدعون کہ آپ اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں اور آپ کو رزق پہنچتا ہے۔ مگر یاد رہے کہ اس حیات سے مراد ناسوتی نہیں ہے وہ دوسری قسم کی حیات ہے جس کو حیات برزخیہ کہتے ہیں۔

حیات برزخیہ کے مراتب

باقی یہ کہ حیات برزخیہ تو سب کو حاصل ہے۔ پھر اس میں نبی کی کیا تخصیص ہے؟ تو اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس کے مختلف مراتب ہیں ایک مرتبہ تو تمام مومنین کو حاصل ہے جس کے ذریعہ سے تعلیم قبر کی ہر مسلمان کو حاصل ہوگی۔ دوسری حیات شہداء کی ہوگی تمام مومنین کی حیات برزخیہ اقویٰ ہوگی عام مومنین کی حیات برزخیہ نسبت شہداء کے کمزور ہوتی ہے۔ اگرچہ اس حیات ناسوتیہ سے وہ بدرجہا اعلیٰ ہو۔ پس یہ کوئی نہ سمجھے کہ مومنین کی حیات برزخیہ اس حیات دنیویہ سے کمزور ہوگی اور حیات شہید کے اقویٰ ہوگی مگر یہ ہوتا ہے کہ زمین اس کی لاش کو نہیں کھا سکتی اور یہ نہ کھانا ایک اثر ہے حیات برزخیہ کا۔

شہید کی حیات

پس شہید میں اس کا اثر ظاہر ہونا اور عام مومنین میں نہ ہونا یا دلیل ہے شہید کے حیات کے اقویٰ ہونے کی بر نسبت عام کی حیات کے بعض لوگوں نے اس کا انکار بھی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مشاہدہ اس کے خلاف ہوا ہے۔ مگر یہ کوئی انکار کی وجہ نہیں بن سکتی۔ کیونکہ جس طرح اس کے خلاف مشاہدہ ہوا ہے اس کے موافق بھی مشاہدہ ہوا ہے جب دونوں طرح مشاہدے موجود ہیں تو دوسرے سے اس کا انکار کیونکر کیا جاسکتا ہے۔ بہت سے بہت یہ کہاجا سکتا ہے کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ اور نصوص کا محمل بھی اسی کو کہا جائے گا باقی مطلق انکار تو صحیح نہیں ہو سکتا۔ یہ تو جواز تسلیمی ہے اس تقدیر پر جب کہ ہم مان لیں کہ جہاں تم نے اس کے خلاف کیا ہے وہ مشاہدہ ہی تھا۔ مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ شہید ہی نہ ہو کیونکہ شہادت صرف اسی کا نام نہیں

لہ اللہ کے نبی اپنی قبر میں بلا شیعہ زندہ ہیں رزق پاتے ہیں

انبیاء کے جسموں کو زمین پر اشر نے حرام کر دیا ہے۔

حکم کو بھی عام جملہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج کے لئے سمجھتے ہیں اور میراث کا تقسیم ہونا حدیث سے جملہ انبیاء علیہم السلام کے لئے عام طور پر معلوم ہو چکا ہے تو ان امتیازات سے حیات برزخیہ انبیاء کا شہداء اور عوام مومنین سے اتنی ہونا ثابت ہوا بہر حال یہ بات باتفاق امت ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبر میں زندہ رہتے ہیں۔

نبی کریم کی حیات

اور خاص ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں تو مخالفین بھی حیات کے معتقد ہیں ان کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا اقرار ہے چنانچہ ایک واقعہ سے ان کا اقرار معلوم ہوا تاریخ مدینہ میں یہ واقعہ لکھا ہے اور میں نے خود اس تاریخ میں دیکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند صدی بعد (یا دہائیں رہا کہ کس بادشاہ کے وقت میں) وہ شخص مدینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو نکالنے کے لئے آئے تھے مسجد نبویؐ کے پاس ایک مکان گریہ پرے لیا تھا اور دن بھر نماز و تسبیح میں مشغول رہتے تھے لوگ ان کے معتقد بھی ہو گئے تھے وہ کم محنت رات کے وقت اس مکان سے قبر شریف کی طرف سرنگ کھودتے تھے۔ اور جس قدر سرنگ کھود دیتے راتوں رات مٹی مدینہ سے باہر پھینک آتے تھے اور جگہ جگہ برابر کر دیتے تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ کئی ہفتہ تک وہ لوگ سرنگ کھودنے میں مشغول رہے جب ادھر ان لوگوں نے یہ کام شروع کیا حق تعالیٰ نے اس زمانہ کے سلطان کو (نام یاد نہیں رہا) بذریعہ خواب کے متنبہ کر دیا۔

سلطان مدینہ کا خواب

خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کے چہرہ مبارک پر حزن و غم کے آثار ہیں اور آپ اس بادشاہ کا نام لے کر فرما رہے ہیں کہ مجھے ان دو شخصوں نے بہت ایذا دے رکھی ہے۔ جلد مجھے ان سے نجات دو خواب میں دونوں شخصوں کی صورت بھی بادشاہ کو دکھلا دی گئی۔ خواب سے بیدار ہو کر بادشاہ نے وزیر سے اس کا تذکرہ کیا وزیر نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے آپ جلد مدینہ تشریف لے جائیں۔ بادشاہ نے فوراً فوج کے ساتھ کہ بہت تیزی کے ساتھ مدینہ کی طرف سفر کیا۔ اور بہت جلد مدینہ پہنچ گیا۔ اس عرصہ میں وہ لوگ بہت سرنگ کھود چکے تھے اور بالکل جسد اطہر کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ایک دن کی بادشاہ کو اور تاریخ چنانچہ

تو وہ لوگ اپنا کام پورا کر لیتے۔ بادشاہ نے مدینہ پہنچ کر تمام لوگوں کی مدینہ سے باہر دعوت کی اور سب کو مدینہ سے ایک خاص دروازے سے باہر نکلنے کا حکم کیا۔ اور خود دروازہ پر کھڑے ہو کر ہر شخص کا چہرہ خوب غور سے دیکھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مدینہ کے سب مرد و شہر سے باہر نکل آئے مگر ان دو شخصوں کی صورت نظر نہ پڑی جن کو خواب میں دیکھا تھا۔ اس لئے بادشاہ کو حیرت سخت ہوئی۔ اور لوگوں سے کہا کیا سب لوگ باہر گئے۔ لوگوں نے کہا اب کوئی اندر نہیں رہا۔ بادشاہ نے کہا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا ضرور کوئی اندر رہا ہے۔

سرنگ کھودنیوالے پکڑے گئے

لوگوں نے کہا کہ دوزا ہد اندر رہ گئے ہیں وہ کسی کی دعوت میں جایا نہیں کرتے اور نہ کسی سے ملتے ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ مجھے ان ہی سے کام ہے چنانچہ جب وہ پکڑ کر لائے گئے تو بعینہ وہ دو صورتیں نظر آئیں خواب میں دکھلائی گئی تھیں ان کو فوراً قید کر لیا گیا اور پوچھا گیا کہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ایذا دی ہے۔ چنانچہ بڑی دیر کے بعد انہوں نے اقرار کیا کہ ہم نے جسد اطہر سرنگ کھودنے کے لئے سرنگ کھود دی ہے۔ چنانچہ خود بادشاہ نے وہ سرنگ دیکھی تو معلوم ہوا کہ قدم مبارک تک پہنچ چکی ہے۔ بادشاہ نے قدم مبارک کو بوسہ دے کر سرنگ بند کرادی اور زمین کو پانی کی تہہ تک کھدوا کر قبر مبارک کے چاروں طرف سیسہ پلا دیا تاکہ آئندہ کوئی سرنگ نہ لگا سکے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ مخالفین کو بھی جسد اطہر کے صحیح سالم ہونے کا ایسا پختہ اعتقاد ہے کہ کسی سو برس بعد بھی اس کے کالنے کی کوشش کی۔ اگر ان کو جسد اطہر کے محفوظ ہونے کا یقین نہ ہوتا تو وہ سرنگ یوں نہ لگاتے۔ محض وہم و شبہ پر اتنا بڑا خطرہ کا کام کوئی نہیں کرتا وہ لوگ اہل کتاب ہیں وہ بھی خوب سمجھتے ہیں کہ نبی کے جسم کو زمین نہیں کھا سکتی۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق تھے بوجہ عناد کے اقرار نہیں کرتے۔ غرض کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر موافقین و مخالفین سب کے نزدیک بالاتفاق محفوظ ہے۔

(۷۶) علم تجوید سے لاپرواہی کرنا ٹھیک

نہیں

تجوید کی یہاں تک ضرورت ہے کہ بعض دفعہ اس کی مخالفت سے عربیت جاتی رہتی ہے اور جب لفظ عربیت ہی سے نکل گیا تو قرآن ہی نہ رہا۔ جب نمازیں قرآن نہ پڑھا لگاتو نازیکیسے صحیح ہوگی۔ شاید رہبات آپ کو عجیب معلوم ہوتی ہو کہ تجوید کے نہ ہونے سے عربیت نہیں رہتی مگر میں دلیل سے اس کو ثابت کرتا ہوں سب کو معلوم ہے کہ عربی فارسی اردو جدا جدا زبانیں ہیں اور ہر ایک کے خواص الگ الگ ہیں پس جس طرح کسی لفظ کے فارسی یا اردو ہونے کے لئے تلفظ کی صحت شرط ہے اسی طرح لفظ کے عربی ہونے کے لئے بھی تلفظ کا صحیح ہونا شرط ہے مثلاً آپ ایک کڑے کو گاڑھا کہتے ہیں اس میں ”ڑ“ کا ہونا اور ہائے محفی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے بجائے گارا کہے تو آپ اس کو غلط کہیں گے کیونکہ گارا تو میٹھی کا ہوا کرتا ہے۔ کپڑے کی کوئی قسم گارا نہیں ہے۔ اسی طرح سمجھئے کہ عربی میں جو لفظ ”ثا“ سے مرکب ہے وہاں ”سین“ یا ”صاد“ پڑھ دیئے سے یا ”حا“ کی ”ھا“ پڑھنے سے تلفظ غلط اور معنی بدل جاوے گا اس سے تو صحت الفاظ کی ضرورت معلوم ہوتی اب صفات کی بابت میں لکھتا ہوں کہ اردو میں ایک لفظ پنکھا ہے جس میں ”فن“ کے خفاء کے ساتھ بولا جاتا ہے اسی طرح رنگ سنگ اور جنگ میں جو فارسی الفاظ ہیں فون کو ظاہر کر کے نہیں پڑھا جاتا۔ اب اگر کوئی پنکھے کو باظہار فون پن کھا کہے یا رنگ کو رن گ کہتے تو آپ کہیں گے کہ اردو فارسی نہیں رہی حمل لفظ ہو گیا لیکن اس کے کہنے سے یا آپ بندھ گئے اس طرح کہ جب اس لفظ میں اظہار فون سے آپ نے اس کا غلط ہونا اور اردو زبان سے نکل جانا مان لیا تو جن لفظوں میں عربی زبان میں اخفاء ہے وہاں بھی ماننا پڑے گا کہ اظہار فون سے وہ لفظ عربی نہیں رہتا تو کیا اب بھی تجوید کی ضرورت میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے۔

تجوید سیکھنا فرض ہے

میں تو کہتا ہوں کہ تجوید کا سیکھنا فرض ہے کیونکہ قرآن عربی زبان میں ہے جس کا عربی میں پڑھنا فرض ہے۔ اور عربیت کے موافق صحیح تلفظ بدو تجوید کے نہیں آ سکتا تو تجوید کا سیکھنا فرض ہوا۔ صاحبو! چاہے آپ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے ادھر متوجہ نہ ہوں مگر تجوید کی فی نفع بہت ضرورت ہے۔

اور انفسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس طرف اس لئے توجہ نہیں کہ اس میں دنیا کا بظاہر کوئی نفع نہیں اگر آج ملازمت کے لئے یہ قانون ہو جائے کہ جس کا قرآن باقاعدہ صحیح ہوگا اس کو ملازمت دی جائے گی تو آج یہ سارے بی۔ اے۔ ایم اے قاری ہو جائیں ہم لوگ متاع دنیائے کے لئے سب کچھ کر لیتے ہیں۔ اس لئے یہ سارے عذر جو بیان کے بجاتے ہیں محض بہانے ہیں۔ (اسباب الفتنہ ص ۲۶)

۷۷۔ علماء کا باہمی اختلاف اور ہمارا فرض

یہ بہت کٹھن سوال ہے جس نے مسلمانوں کو اس وقت پریشان کر رکھا ہے وہ دیکھتے ہیں کہ علماء میں باہم سخت اختلاف ہے کوئی ایک بات کو حرام کہتا ہے تو دوسرا اس کو جائز کہتا ہے کوئی ایک بات کو سنت کہتا ہے تو دوسرا اسے بدعت بتلاتا ہے اب کسی کی مانیں اور کس کی نہ مانیں یا تو سب پر عمل کریں یہ تو غیر ممکن ہے یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں۔ تو ترجیح کی وجہ کیا۔ لہذا بعض نے تو یہ فیصلہ کیا کہ سب کو چھوڑ دو۔ صاحبو! مجھے اس فیصلہ کی تو شکایت نہیں، مگر رونا اس کا ہے کہ جب یہی صورت اختلاف فنون دینا کے ماہروں میں پیش آئی تو وہاں آپ نے یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا۔ وہاں کسی ایک کو ترجیح دیکر کیوں پکڑا۔ یعنی بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی مریض کے علاج میں اطباء اور ڈاکٹروں کی رائے مختلف ہوتی ہے کوئی کچھ مرض کی تشخیص کرتا ہے۔ کوئی کچھ۔ اور ہر ایک اپنی رائے کو صحیح بتلاتا ہے اور دوسرے کی رائے پر عمل کرنے کو مریض کے لئے مہلک بتلاتا ہے۔ وہاں آپ نے سب حکیموں کو کیوں نہیں چھوڑا اور یہ کیوں نہیں کہا کہ انفسوس اطباء میں اتفاق ہی نہیں۔ اب ہم کس کا علاج کریں بس جاؤ مریض کو مرنے دو۔ ہم کسی کا

بھی علاج نہیں کرتے۔ وہاں ایک حکیم کو ترجیح دیکر اس کا علاج کیوں کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا اپنے دکلا کے ساتھ بھی ہی برتاؤ کیوں نہیں کیا۔ جو علمائے کے ساتھ کیا گیا ہے کیا دکلا میں باہم اختلاف نہیں ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے پھر وہاں ایک وکیل کو دوسرے پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے اور سب کیوں نہیں چھوڑا جاتا۔ اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے۔

ضروری سمجھنے کے بعد | لیجئے میں ہی اس کا جواب بھی دیتا ہوں۔ جو ایک وہ جن کو ضروری سمجھا جائے دوسرے وہ جن کو ضروری نہ سمجھا جائے۔ جن باتوں کو ضروری سمجھا جاتا ہے ان کو تو کسی اختلاف کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاتا۔ بلکہ وہاں آدمی اپنی عقل سے تدبیر سوچتا ہے اور باوجود اختلاف کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے لیتا ہے اور جن باتوں کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ان کو اختلاف وغیرہ کی صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے وہاں تدبیر و تامل سے ایک کو ترجیح دینے کی مشقت گوارا نہیں کی جاتی۔ یہ قاعدہ ہے طبیعت انسانیہ کا۔ اسی کے موافق یہاں عمل کیا گیا ہے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں۔ جان اور ایمان جان چونکہ عزیز ہے اس لئے اس کی صحت و حفاظت کے اسباب میں اختلاف ہونے سے سب کو ترک نہیں کیا جاتا بلکہ وہاں یہ قاعدہ نکالا جاتا ہے کہ اہل کمال میں تو اختلاف ہوا ہی کرتا ہے۔ اس سے گھبرانا نہیں چاہیے ہم اپنی عقل سے اور اپنے خیر خواہوں سے دریافت کریں گے کہ ان سب حکیموں اور ڈاکٹروں میں کون سب سے زیادہ حاذق ہے سب اس کا علاج اختیار کر لیں گے۔ اور ایمان عزیز نہیں اس لئے علمائے کے اختلاف میں عقل سے کام لینا اور غور و تامل کی محنت برداشت کرنا گوارا نہیں۔ تو اے صاحبو اگر آپ ایمان کو بھی عزیز سمجھتے ہیں تو علمائے میں بھی اسی طرح انتخاب کرتے جس طرح حکماء میں کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس! آپ کو ایمان عزیز نہیں اس لئے صاف سب کو چھوڑ دیا میں یہ نہیں کہتا کہ اس اختلاف میں مولویوں کی خطا نہیں ہے بلکہ ضرور ہے اور آگے میں یہ بھی بتلا دوں گا کہ ان میں سے خطا کس کی ہے مگر آپ کی اتنی شکایت ضرور کروں گا کہ اس اختلاف کی وجہ سے سب کو چھوڑ دینا یہ بے ترتیب اور غلط رائے ہے جو ایمان کو عزیز نہ سمجھنے کی علامت ہے۔ بعض لوگ اس اختلاف کو دیکھ کر علمائے کو رائے دیتے ہیں کہ سب مولویوں کو متفق ہو جانا چاہیے نا اتفاقی بڑی چیز ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے یا اس

کے لئے کوئی قید بھی ہے اگر نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے اور اس کی وجہ سے ہر فریق مجرم ہو جاتا ہے تو عدالت کو چاہیے کہ جب اس کے پاس کوئی مدعی دعویٰ پیش کرے تو قبل تحقیق مقدمہ ہی مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو سزا کر دیا کرے کیونکہ دعویٰ اور انکار سے دونوں میں نا اتفاقی کا ہونا ثابت ہو گیا۔ اور نا اتفاقی علی الاطلاق جرم ہے۔ تو مدعی اور مدعا علیہ دونوں مجرم ہوئے۔ اگر عدالت ایسا کرے تو سب سے پہلے آپ ہی مخالف ہوں گے اور دینا بھر میں شمول غل چمادیں گے کہ یہ کون سا انصاف ہے؟ کہ تحقیق مقدمہ سے پہلے ہی دونوں کو مجرم بنا دیا گیا۔ اب اگر کوئی آپ سے پوچھے کہ پھر کیا کرنا چاہیے تھا۔ تو آپ عاقل بن کر یہ رائے دیں گے کہ عدالت کو تحقیق کرنا چاہیے تھا کہ مدعی اور مدعا علیہ میں جو باہم مخالفت و نا اتفاقی ہے ان میں سے حق پر کون ہے اور ناحق پر کون ہے جو حق پر ہوگا اس کی حمایت کی جاتی اور جو ناحق پر ہوتا اس کو سزا دی جاتی۔ لیجئے آپ ہی کے فیصلے سے ثابت ہو گیا کہ نا اتفاقی علی الاطلاق جرم نہیں بلکہ نا اتفاقی وہ جرم ہے جو ناحق ہو۔ اور جو نا اتفاقی حق ہو وہ جرم نہیں اور اگر کسی معاملہ میں دو فریق ہو جائیں تو ہر فریق کو مجرم نہیں کہا جاسکتا بلکہ جس کی مخالفت ناحق ہو وہ مجرم ہے۔ اور جو حق ہو وہ مجرم نہیں۔

علمائے کی نا اتفاقی

پس علمائے کی باہم نا اتفاقی اور اختلاف سے آپ کا سب کو مجرم بنانا اور ہر فریق سے یہ کہنا کہ دوسرے اتفاق کرلو۔ غلط رائے ہے بلکہ اول آپ کو تحقیق کرنا چاہیے کہ حق پر کون ہے پھر جو ناحق پر ہو اسے مجرم بنائے اور اس کو اہل حق کے ساتھ اتفاق کرنے پر مجبور کرنے کے تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ حق کو چھوڑ کر ناحق طریق اختیار کر لیں اور اس کو کوئی عاقل تسلیم نہیں کر سکتا۔ تو اتنی شکایت آپ کی رہ گئی۔ کہ آپ قبل از تحقیق ہی سب کو متفق ہو جانے کی رائے دیتے ہیں اور مولویوں کی شکایت ہم کو بھی ہے مگر صرف ان کی جو ناحق پر ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ صاحب دوسرا فریق بھی اتفاق سے مجبور ہے کیوں کہ ان کی سمجھ میں ہوں ہی آیا وہ اسی کو حق سمجھتے ہیں جو ان کی سمجھ میں آیا ہے تو جناب ایسا اختلاف رحمت ہے اس اختلاف سے فتنے اور فساد کی نوبت نہیں آیا کرتی۔ دیکھئے ائمہ اربعہ میں سمجھ ہی کا تو اختلاف ہے مگر اس کے ساتھ پھر سب متفق ہیں کوئی ایک دوسرے پر ملاحت و طعن نہیں کرتا بلکہ ہر ایک سب کو حق پر سمجھتا ہے اگر ایسا اختلاف ہوتا تو۔

مسلمانوں کو آج پریشانی نہ ہوتی جو انکھوں سے نظر آرہی ہے بلکہ یہ اختلاف تو ریوٹوں کا ہے۔

میں کہا کرتا ہوں کہ اگر اہل حق کے پاس کافی رزق ہو۔ اور وہ ان سب فرقوں کی تنخواہیں مقرر کریں

تو سارا اختلاف ایک دن میں مٹ جائے۔ سارا اختلاف پیٹ کی وجہ سے ہے۔ کہ کوئی مولود پر زور دیتا ہے۔ کوئی فاختہ پر، کوئی نتیجہ دسویں پر۔ ایک عالم صاحب سے جو بدعات کے بڑے حامی ہیں کسی نے سوال کیا کہ تم مولود و فاختہ کو سنت کہتے ہو اور ان پر بہت زور دیتے ہو اور جو ان سے منع کرے اس کو برا بھلا کہتے ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تنہا ہی مستورات بہشتی زیور پڑھتی ہیں (اللہ کی شان ہے کہ اس کتاب کو سب سلمان اپنی مستورات کے لئے تجویز کرتے ہیں۔ خواہ وہ کسی خیال کے ہوں۔ چنانچہ ان عالم صاحب کی مستورات بھی بہشتی زیور پڑھتی تھیں) تو انہوں نے ایسے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ سارا اختلاف تو اس کی خرابی ہے ورنہ حق وہی ہے جو بہشتی زیور میں لکھا ہے میں نے ایک دفعہ لکھنؤ میں دیکھا کہ ہر کھانے پر الگ الگ فاختہ دی جا رہی ہے پھر وہاں بیان کی فرمائش ہوتی تو میں نے اس بیان میں کہا کہ فاختہ درود کے سنت اور بدعت ہونے کا امتحان بہت آسانی سے اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو مولوی صاحب مولود پڑھیں یا فاختہ دیں ان کو کچھ نہ دیا جائے ان سے خوب مولود پڑھاؤ اور الگ الگ ہر کابی پر فاختہ دلواؤ۔ مگر نذرانہ کچھ نہ دو نہ ٹٹھائی کا دو ہر حصہ دو پھر دیکھنا وہ خود ہی اس کو فضول اور بدعت کہنے لگیں گے چنانچہ بعض لوگوں نے اسپر عمل کیا تو اسی روز شام کو اگر فاختہ خواں صاحب کہنے لگے کہ واقعی یہ تو ایک فضول ساقضہ معلوم ہوتا ہے کہ الگ الگ فاختہ ہو ایک ہی کافی ہے۔ میں نے جی میں کہا کہ اب تو معلوم ہو ہی گا۔ صاحبو! میں سچ کہتا ہوں کہ ان کی آمدنی بند کر دو وہ خود ہی کہنے لگیں گے کہ یہ سب فضول قصہ ہے۔ یہ ساری باتیں روٹیاں کھانے کی ہیں۔ جب ایک سال طاعون کا بہت زور ہوا۔ تو میں دیکھ رہا تھا کہ چنے پڑھوانا فاختہ دلانا اور تیمم دسواں سب موقوف ہے۔ میں دیکھتا رہا جب طاعون کا زور ختم ہو گیا تو میں نے لوگوں سے کہا کہ کیوں جناب وہ چنے اور فاختہ

کہاں گئے اور وہ اب وہ نتیجہ دسویں کیوں نہیں ہوتے۔ کہنے لگے۔ ارجی ان باتوں کی کس فرصت تھی۔ میں نے کہا چھوڑا۔ کہا نہیں۔ میں نے کہا۔ بس سمجھ لو جو کام حذف ہو گئے وہ دین کے کام نہ تھے بلکہ فرصت کی باتیں تھیں اور یہ دین کے کام تھے اس لئے کہ فرصت میں بھی ترک نہ ہوئے۔ بس خاموش ہی تو ہو گئے۔

اسی طرح گاؤں کے ایک صاحب کہنے لگے کہ فاختہ میں حرج کیا ہے بلکہ فائدہ ہے کہ اس میں سورتوں کا ثواب بھی مردہ کو پہنچ جاتا ہے۔ میں نے

فاختہ مروجہ کا نقصان

کہا یہ فائدہ تو کھانے کے ساتھ مخصوص نہیں روپے پیسے اور کپڑے میں بھی ہو سکتا ہے پھر کبھی اللہ کے نام کے روپے پیسے اور کپڑے پر فاختہ پڑھی کبھی نہیں۔ میں نے کہا کیوں نہیں پڑھی مردہ کو فائدہ ہی ہوتا۔ سورتوں کا ثواب پہنچ جاتا۔ کہنے لگے اجی بس سمجھ میں آ گیا۔ تم سچ کہتے ہو۔ صاحبو! یہ بالکل کھلی ہوئی باتیں ہیں یہ سارے قصے محض آمدنی کے واسطے نکالے گئے ہیں۔ اگر ان فاختہ مولود پڑھنے والوں کی آمدنی بند کر دی جائے تو پھر دیکھئے وہ بھی وہی کہیں گے جو ہم کہتے ہیں اس مجلس میں سنت و بدعت کی تحقیق بیان نہیں کی بلکہ وہ باتیں بیان کر دی ہیں جو بہت موٹی ہیں جن سے ہر شخص کو بآسانی حق کا پتہ چل سکتا ہے اگرچہ محمد اللہ سنت و اطاعت کی شناخت کے حقیقی اصول بھی اپنے پاس موجود ہیں۔

ۛ مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز۔

ۛ و نہ در مجلس زنداں خبر نیست کہ نیست۔

ہاں اگر کوئی طلب ظاہر کرے اور ہمارے پاس آکر رہے تو اس کو وہ اصول بھی بتلا دیں گے۔

غرض میں کہہ رہا تھا کہ اختلاف علی الاطلاق محل شکایت نہیں

محل شکایت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ پہلے آپ حق متعین کیجئے اس کے بعد دیکھئے کہ علماء مختلفین میں سے حق پر کون لوگ ہیں اور ناحق پر کون، اس طرح محقق اور غیر محقق کی پہچان ہو جائیگی۔ جس کی میں ایک آسان ترکیب بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ دو قسم کے لوگ ہیں

بعض تو لکھ پڑھے ہیں خواہ اردو ہی میں لکھے پڑھے ہوں اور بعض ان پڑھے ہیں پہلے طبقہ کے لئے تو تحقیق حق کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب علماء کی کتابیں دیکھیں مگر دونوں کے علماء کی کتابیں خالی الذہن ہو کر انصاف سے دیکھیں۔ پہلے کسی کی طرف داری اور حمایت کا خیال دل میں نہ لائیں کیونکہ اعتقاد کے بعد اس کی ہر بات اچھی معلوم ہوگی اور عیب نظر نہ آئے گا۔ سو تحقیق حق کا یہ طریقہ نہیں بلکہ اس کا طریقہ یہی ہے کہ خالی الذہن ہو کر دونوں کی کتابوں کا مطالعہ انصاف کے ساتھ کیا جائے۔ خدا کے ساتھ معاملہ ہے۔ اس کو پیش نظر رکھ کر دیکھنا چاہیے انشاء اللہ تعالیٰ اگر طلب حق ہے تو بہت جلد آپ کے ذہن میں خود بخود حق واضح ہو جائے گا۔ جب ایک کا حق ہو نا معلوم ہو جائے تو بس اسی سے تعلق رکھو۔ اور اسی سے دین کی باتیں اور خدا کا راستہ دریافت کرو۔ مگر دوسرے کو کبھی برا نہ کہو کیوں کہ کسی کا برا کہنے سے تمہارا کیا بھلا ہو جائے گا بس تم اپنی یہ حالت رکھو۔

۵۔ ہمیشہ ہر پر زخواہاں منم و خیال مابے۔

چشم کہ چشم بدخونہ کر بکسنگا ہے۔

دل آرامیکہ داری دل درد بند و گر چشم از ہمہ عالم فرد بند
اگر کوئی برا بھی ہو تو تم اس کو برا نہ کہو۔ وہ اگر برا ہے۔ تو تم کو کیا۔ اور اگر دوسرا تم کو برا کہے جب بھی تم اسے برا نہ کہو۔ ذوق نے خوب کہا ہے۔

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق ہے برا وہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اگر تو ہی برا ہے تو وہ بچ کہتا ہے۔ پھر برا کہنے سے کیوں سکے برا مانا ہے

یہ طریقہ تو پڑھے لکھوں کے واسطے ہے اور جو بے پڑھے ہوں وہ یہ کریں کہ دو مولویوں کے پاس جا کر ایک

ایک ہفتہ رہیں اور جو وقت ان کی فرصت کا ہو دریافت کرنے سے معلوم ہو جائے گا اس میں ان کے پاس سیٹھیں اور ان کی باتیں سنیں اور دیکھیں جو مسائل متفق علیہ ہیں ان کی پابندی کا کس کو زیادہ اہتمام ہے اور نیز یہ کہ کس کے پاس جا کر کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر کسی کے پاس جا کر آخرت کی رغبت پیدا ہو عبادت الہی کا شوق بڑھے اور خدا کی نافرمانی سے دل میں نفرت اور خوف پیدا ہو۔ اور اس کے پاس رہنے والوں کی زیادہ تر حالت اچھی ہو تو

بس اس کو اختیار کر لیں۔ اسی سے ہر بات پوچھا کریں اور اس کی صحبت میں گاہے گاہے آیا جایا کریں اور یہ طریقہ پڑھے لکھوں کو بھی بہت مفید ہے۔ محض کتابوں کے مطالعہ سے کسی عالم کی اصلی حالت ایسی نہیں معلوم ہوتی۔ جیسے پاس رہنے سے معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے وہ بھی اگر یہ طریقہ اختیار کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ (اسباب الفتنة ص ۵)

(۷۸) بعض لوگ کہتے ہیں کہ روزے صرف تین ہی ہونے چاہئیں، اس کی تشریح!

ایک اشتہار میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ روزے صرف تین ہی ہونے چاہئیں۔ یعنی گیارہویں۔ بارہویں۔ تیرہویں۔ اور اس پر دلیل کیا خوب صورت لائے۔ اس کو بھی سنئے۔ آپ نے یوں استدلال کیا کہ روزے کے بارے میں قرآن میں آیا ہے **اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ**۔ یعنی چند روز۔ جس کا اصلی مطلب تو یہ ہے کہ ہماری ہمت بڑھانے کے لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ روزہ کے ٹھوڑے ہی دن میں۔ گھر آؤ نہیں۔ مگر آپ نے اس میں یہ اجتہاد کیا کہ حج کے بارہ میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔ اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ اور وہاں اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ سے یہی گیارہویں، بارہویں۔ تیرہویں۔ تاریخیں مراد ہیں جب وہاں حج میں اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ سے یہ مراد ہیں تو یہاں صوم میں بھی وہی مراد ہیں۔ کیونکہ۔ القرآن بفسر بعضہ بعضاً۔ حالانکہ القرآن بفسر بعضہ بعضاً کے قاعدہ سے وہاں کام لیا جاتا ہے جہاں ایک آیت کی تفسیر معلوم اور دوسرے کی تفسیر معلوم نہ ہو۔ اور یہاں تو دونوں کی تفسیر الگ الگ معلوم ہے مگر اس اندھے نے تو ایک جگہ کی تفسیر لے لی اور دوسری جگہ کی تفسیر نظر انداز کر دی میں کہتا ہوں کہ اگر اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ سے بقرینہ دوسری آیت کے گیارہویں، بارہویں، تیرہویں، مراد ہوں تو یہ تاریخیں تو ذی الحجہ کا روزہ رکھنا قرآن سے۔ گیارہویں۔ بارہویں۔ تیرہویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنا قرآن سے ثابت ہوگا اور یہی ايام تشریق۔ ان میں روزہ رکھنا اجماعاً بالکل حرام ہے تو قرآن سے ایسے ايام کا روزہ رکھنا فرض ہوگا جس کا روزہ رکھنا اجماعاً بالکل حرام ہے۔ اچھا اجتہاد کیا۔ اور نیز نہیں کہتا ہوں کہ اگر حج اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ سے بھی گیارہویں، بارہویں۔ تیرہویں۔

مراد ہیں تو یہود نے جو کہا ہے لَنْ تَسْتَنَّا النَّاسَ إِلَّا آتِيًا مَعَهُ وَدَائِبُ كَمْ هُمْ كُودُ زَخٍ مِیْنِ تَقْوُطِے
دن رہنا پڑے گا تو کیا وہاں بھی تین ہی دن مراد ہیں۔ ایمان سے کوئی بتلا دے کہ کیا یہود کی یہی
مراد تھی کہ فقط گیارہویں۔ بارہویں تیرہویں کو دوزخ میں رہنا پڑے گا۔ اور وہ بھی ذی کج
ہی ہیں۔ اگر یہاں بھی یہی مراد ہے تو یہ ایسا ہوا کہ جو کالا وہی میرے باپ کا سالا غرض اسی طرح
لوگوں نے فتنے ایجاد کئے ہیں کوئی کہاں تک ان کا اشداد کرے بغیر حکومت کے ہو نہیں سکتا
کوئی سلطنت اسلام کی ہوتی وہ ان کو بند کرتی۔ (اجرا الصیام من غیر انصرام حصول ص ۹)

۷۹) اس شبہ کا جواب کہ تبلیغ عذر سے ساقط

ہوتی ہے یا نہیں

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے آپ امر بالمعروف شروع کر دیں جب کام شروع کر کے کہیں
گاڑی اٹکے گی اس وقت استقذار کر لینا اچھی سے عذار کے حکم دریافت کرنے کا آپ کو حق
نہیں۔ بلکہ اس وقت اعذار کا حکم دریافت کرنا گویا جان بچانے کی تدبیریں ڈھونڈنا ہے۔ سب
مسلمان جانتے ہیں کہ شریعت نے طاقت سے زیادہ کوئی حکم نہیں دیا۔ مگر پھر بھی اس قسم
کے عذر کو دوسرے کاموں کی بابت کوئی پیش نہیں کرتا۔ مثلاً وضو بعض دفعہ عذر سے ساقط
ہو جاتا ہے اور نمازیں قیام عذر سے ساقط ہو جاتا ہے مگر جس وقت نماز کے لئے کسی کو کہا
جاتا ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ پہلے مجھے یہ بتلا دو کہ وضو اور قیام کن کن عذروں سے ساقط
ہو جاتا ہے کیونکہ وہاں آپ نماز کے پڑھنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور عذر کو عارضی۔ اسی طرح
کھانے میں بھی کسی نے طبیب سے نہیں پوچھا کہ حکیم جی کھانے کے شرائط بتلا دو۔ اور یہ بھی
سمجھا دو کہ کس وقت چھوڑ دیا جائے کیونکہ یہاں بھی کھانے کو ضروری اور نہ کھانے کو عارضی
سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رمضان میں جو لوگ روزہ رکھتے ہیں وہ کبھی پہلے یہ نہیں پوچھتے
کہ مولوی صاحب روزہ کن کن وجوہ سے ساقط ہو جاتا ہے بلکہ کوئی اگر ایسا سوال کرے
تو اس کی نسبت عام طور پر یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ شاید روزہ نہ رکھنے کے ارادے ہیں۔ حسب
آپ کو چاہیے تھا کہ آپ امر بالمعروف شروع کرتے پھر کسی وقت یا وجاہت آدمی کو خلاف

شرع وضع پر نصیحت کرنے یا کافر کو تبلیغ اسلام کرنے میں گاڑی اٹکتی اس وقت مولوی صاحب
سے پوچھتے کہ اس موقع پر کیا کروں یہ کیا کہ آپ نہ حاکم کو امر بالمعروف کریں۔ نہ محکوم کو، نہ مسلم کو
نہ کافر کو۔ نہ بیوی کو۔ نہ اولاد کو، اور پہلے ہی سے لگے عذر کا حکم دریافت کرنے۔ شاید آپ
یہ کہیں کہ نماز روزہ میں تو عذر کم پیش آتے ہیں اور امر بالمعروف میں تو اکثر پیش آتے رہتے
ہیں میں کہتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے۔ اپنے گھر والوں کو امر بالمعروف کرنے میں کون سا عذر مانع
ہے۔ بیوی نے نماز پڑھی تھی اس کو نصیحت کرتے میں کیا خوف تھا کیا وہ آپ کو مار ڈالیگی
یا لٹکانا زہنیں پڑھتا تو وہ آپ کا کیا کرے گا اگر آپ کہیں کہ وہ سنتا نہیں ہے۔ تو میں کہتا ہوں
کہ اگر وہ کبھی امتحان میں فیل ہو جائے تو اس وقت اس کو کیوں مارتے ہیں اور کیوں سزا دیتے
ہیں۔ اس وقت وہ آپ کی بات کیونکر سننے لگتا ہے۔ پس یہ سب بہانے لغوی ہیں۔ اصل
بات وہی ہے کہ آپ اس کو ضروری ہی نہیں سمجھتے بھلا اگر آپ کا کوئی دوست آپ کے سامنے
زہر کھانے لگے تو کیا آپ اس کو نہیں روکیں گے یقیناً ہاتھ پیر کر زور سے جھٹکا دیکر زہر کو
اس کے ہاتھ سے لے لیں گے اگر تنہا قادر نہ ہوں گے تو دوسروں کو امداد کے واسطے
بلا لیں گے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ دین میں جو افعال مرضیہ ان کے روکنے میں اس اہتمام
سے کام نہیں لیا جاتا۔ معلوم ہوا کہ آپ دین کے ضرر کو ضرر نہیں سمجھتے اور یہ سخت مرض ہے
جس کا علاج بالصد ہے۔ مگر افسوس اس قدر غفلت ہے کہ خدا کی پناہ کسی کو بھی اس مرض
کے علاج کی طرف توجہ نہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

(تو اسی بالحق حصہ اول)

(۸۰) تبلیغ اسلام کا اسلم طریقہ

ہر ضلع میں ایک مجلس تبلیغ قائم کر دی جاوے جس کا نام وغیرہ رکھنے کی کوئی ضرورت
نہیں۔ نہ عہدہ داروں کے نام مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آجکل انجمن کے قوانین
اور عہدہ داروں کی فہرست میں تو رجسٹر سیاہ کئے جاتے ہیں۔ مگر کام نہیں ہوتا۔ ہم
کو کام کرنا چاہیے جتنا جس سے ہو سکے بڑے پیانہ کی بھی فکر نہ کر دو چھوٹے ہی پیانہ پر کام
شروع کر دو۔ ہماری حالت یہ ہے کہ یا تو کام کرتے ہیں ٹیپ ٹاپ سے ورنہ کچھ نہیں کرتے

وہی مثل ہے۔ کھاؤں گا تو کبھی سے ورنہ جاؤں گا تو جی سے۔ یہ بڑی حماقت اور غلطی ہے یاد رکھو! ابتداء ہر کام کی کمزور اور معمولی ہوتی ہے ترقی تدریجاً ہی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے اس عالم میں اپنے افعال کو کبھی تدریجاً ہی ظاہر کیا ہے کہ اول نظر قرار پاتا ہے پھر فوہامہ کے بعد پیدا ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ لشو نہا ہو کر پسندہ برس میں لڑکا بالغ ہو جاتا ہے حالانکہ حق تعالیٰ قادر ہیں کہ ایک ہی منٹ میں سب کچھ کر دیں۔ جیسا کہ جنت میں ہو گا۔ کہ جس شخص کو وہاں اولاد کی منتنا ہوگی تو بیوی کے پاس جاتے ہی حمل قرار پا کر فوراً بچہ پیدا ہو گا اور اسی وقت باب کے برابر ہو جائے گا خدا تعالیٰ کا اس عالم میں یہ نمونہ ظاہر نہ کرنا اور تدریجاً افعال ظاہر کرنا نہایتی تعلیم ہی کے لئے ہے کہ تم دنیا میں ابتداء عمل کے ساتھ ہی ترقی و عروج کے طالب نہ بنو۔ بلکہ چھوٹے پیمانے ہی پر کام شروع کر دو۔ اور اس میں لگے رہو۔ رفتہ رفتہ ایک دن عروج و کمال بھی حاصل ہو جائے گا۔ تم سے جتنا کام ہو سکتا ہے اتنا ہی کرنے لگو۔ تم اسی کے مکلف ہو۔ اس سے زیادہ کے مکلف نہیں حق تعالیٰ اسی میں برکت دیں گے! انجن کا نام کرنے اور عہدہ داروں کے مقرر کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ نہ اشتہار و دل در اخباروں میں چھاپنے سے کچھ ہوتا ہے۔ فائدہ کام کرنے سے ہوتا ہے چلے بھٹوڑا ہی ہو تو دو چار آدمی ہی مل کر تبلیغ شروع کر دو۔ اور اپنی قلت پر نظر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ذات پاک کے ذریعہ سے اسلام کو عرب سے تمام دنیا میں پہنچایا ہے سو وہ خدا اب کبھی موجود ہے تم اسی پر بھروسہ کر کے کام شروع کر دو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرات صحابہؓ کی مثال قرآن میں یوں بیان فرمائی ہے۔

كَذَٰلِكَ أَوْفَوْا لَهُ مِثْلَ مَا أُوفِيَ لَكَ فَسَتُكْمِلُونَ فَاِتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُكْثِرَ بِهَا الصُّفُوفُ الْأُولَىٰ وَلَئِنْ لَمْ تُكْمِلُوا الصُّلُوفَ فَسَوْفَ يَأْتِي الصُّفُوفَ الْآخِرَةَ وَهُمْ فِي مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

اور ان کے کام کو قوت و ترقی حاصل ہو جائے تو کیا بعید ہے مگر آج کل مشکل یہ ہے کہ

کام تو شروع نہیں ہوتا اور پہلے ہی سے گیدڑی دوڑتی ہے کہ اس تجویز کو اخباروں میں شائع کرا دیں۔ اشتہار چھپوا دیں۔ صاحبو! کیا یہ ریا نہیں۔ اور کیا ریا وعیزہ سے ممانعت نہیں اور وہ ممانعت کس کے لئے ہے؟ کیا یہ احکام کفار کے واسطے نہیں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ مسلمانوں ہی کو ریا وعیزہ سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ کفار مخاطب بالفروع نہیں ہیں۔ بعض اس پر یہ کہا کرتے ہیں کہ ہم اخبارات و اشتہارات کے ذریعہ سے اظہار اسلئے کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اس سے ترغیب ہوگی۔ م

میاں بس رہے دو۔ یہ تو تاویل ہی تاویل ہے ذرا دل کو ٹٹول کر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ بزمِ شہرت اور نام کے کچھ مقصود نہیں۔ اگر کسی کی واقعی غرض ترغیب ہی کی ہو۔ جب بھی کوں چاہے کہ اس اشاعت کے اشتہار کے متعلق اول کسی عالم محقق بے غرض سے مشورہ لے۔ (تو اسی بالحق حصہ اول ص ۴۴)

(۸۱) مجتہدین کے اختلاف کا راز -

سنن میں اتنا ذکر نہ کیا کہ شارع کے نزدیک مقصود کون ہے۔ اور غیر مقصود کون ہے کام مجتہدین کا ہے ہر شخص کا کام نہیں۔ اور کبھی اجتہاد میں اختلاف بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ سے نمازیں ر فعی دین ثابت ہے اور عدم ر فعی بھی ثابت ہے اب یہاں مجتہدین کا اختلاف ہوا۔ ایک مجتہد سمجھنے کہ ر فعی دین مقصود ہے اور ترک ر فعی آپ نے جو فرمایا تو بیان جواز کے لئے ہے۔ مقصود نہیں۔ اور ایک مجتہد جو عدم ر فعی کے قائل ہے وہ کہتے ہیں کہ نمازیں سکون چاہیے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا۔ کہ یہ تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم نماز میں ہاتھ اٹھاتے ہو۔ (یعنی اٹھانے کے وقت) نمازیں سکون اختیار کرو۔ پس مقصود عدم ر فعی ہے اور ر فعی بیان جواز کے لئے فرمایا۔ اور جنہوں نے ر فعی کو مقصود سمجھا ہے تو وہ اس میں یوں کہتے ہیں کہ یہ ر فعی جس سے منع فرمایا۔ یہ وہ نہیں ہے جو رکوع میں جانے اور اس سے اٹھنے کے وقت اٹھانا ہے بلکہ یہ وہ ر فعی ہے جو کہ سلام پھرتے وقت کیا جاتا ہے۔ جیسا بعض حدیثوں میں لکھا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جب نماز کا سلام پھرتے تو ہاتھ اٹھا کر کہتے السلام

علیکم ورحمۃ اللہ یہ مانعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمائی۔ ہم اس بارے میں یوں کہتے ہیں کہ مانا اس رخ سے وہی رفع مراد ہے مگر اس سے ایک بات تو ضرور نکلی کہ اصل مطلوب نماز میں سکون ہے اور رفع اس کے خلاف ہے۔ پس مواقع مختلف فیہا میں بھی رفع مقصود نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ نماز کی حالت اصلی یعنی سکون کے خلاف ہے۔ اور رفع چونکہ سکون کے موافق ہے اس لئے وہ مقصود ہوگا۔ اسی طرح اور جہاں کہیں اختلاف ہو اے اسی وجہ سے ہوا ہے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور ایک نے دوسری چیز کو۔

آئین ہیں اختلاف

مثلاً۔ آمین کہنا۔ ایک مجتہد کی رائے یہ ہے کہ مقصود آئین پکار کر کہنا۔ اور اختلاف جو ہوا ہے تو وہ میان جواب کے لئے۔ اور ایک مجتہد کی رائے ہے کہ مقصود اختلاف ہے کیونکہ یہ دعا ہے اور دعائیں اختلاف مقصود ہے اگر پکار کر بھی کہہ دیا ہے تو وہ اس تا کہ معلوم ہو جائے کہ آپ آئین بھی کہا کرتے ہیں اگر کبھی بھی پکار کر نہ کہتے تو خبر نہ ہوتی کہ آئین بھی آپ کہا کرتے ہیں جیسے کبھی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکمت کے لئے سری نماز میں ایک آیت پکار کر پڑھ دی ہے تعلیم کی غرض سے ایک مجتہد کی رائے یہ ہے اور ایک کی وہ رائے ہے یہ اختلاف کا ہے سے ہوا۔ اسی وجہ سے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور دوسرے نے دوسری چیز کو۔ اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو آپس میں لڑائی جھگڑے ہی کا خاتمہ ہو جائے۔ کس یہ راز ہے اختلاف مجتہدین کا۔ اسی بنا پر تمام افعال میں اختلاف ہوا ہے۔

(احکام المال ص ۲)

(۸۲) درود ابراہیمی علیہ السلام کے افضل ہونیکا
شبہ اور اس کا جواب۔

ایک شہور سوال کا حل یہ ہے کہ اَللّٰهُمَّ صَلِّ مُحَمَّدًا وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کما صلیت علی ابراہیم وعلیٰ آل ابراہیم میں جو صلوة علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صلوة علی ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے۔ صلوة ابراہیمیہ کے افضل واکمل ہونیکا صلوة محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اور نشا اس کا وہی ہے کہ عام طور پر لوگوں نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ تشبیہ میں شبہ بہ کا مشبہ سے اقویٰ واکمل ہونا شرط ہے حالانکہ یہ مقدمہ ہی غلط ہے۔ بلکہ صرف اوضح اور اشہر ہونا ضروری ہے افضل واکمل ہونا ضروری نہیں اور اس کی دلیل خود قرآن میں موجود ہے فرماتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى النَّبِيِّ وَالْآلِہِ مِثْلَ صَلَّیْتَ عَلَیْہِمْ کَمْشَکُوۃً فِیْہِمْ مَّصْبَحًا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو چراغ کے نور سے تشبیہ دی ہے حالانکہ چراغ کے نور کو نور حق سے کیا نسبت مگر بوجہ وضوح کے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ نور مصباح لوگوں کے ذہن پہلے سے حاضر ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اس پر اگر یہ سوال ہو کہ لوگوں کے ذہن میں تو نور شمس و قمر بھی حاضر ہے اور ان دونوں کا نور چراغ کے نور سے زیادہ قوی ہے تو ان کے ساتھ تشبیہ کیوں نہیں دی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند کا نور اگرچہ چراغ کے نور سے اقویٰ ہے مگر سورج میں ایک عیب یہ ہے کہ اس پر نگاہ نہیں جمتی۔ اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے تو سامعین کو شبہ ہوتا کہ شاید خدا کا نور بھی ایسا ہی ہوگا اس پر نگاہ نہ جم سکے تو جنت میں بھی دیدار سے مایوسی ہوئی اور مرنے سے اس لئے تشبیہ نہیں دی کہ اس کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ نور القمر مستفاد من نور الشمس تو اس کے ساتھ تشبیہ دینے میں اس کا شبہ ہونا کہ نور حق بھی کسی سے مستفاد ہے پھر چراغ میں ایک صفت شمس و قمر سے زیادہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی منور بنا دیتا ہے کہ ایک گھنٹہ میں ایک چراغ سے ایک لاکھ چراغ روشن ہو سکتے ہیں اور اس کے نور میں کچھ کمی نہیں آتی اور شمس و قمر سے دوسروں کو صرف روشنی پہونکتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ دوسری شئی نورانی بن کر کسی اور کو بھی منور کر سکے۔ اگر کہا جائے کہ آئینہ آفتاب یا چاند کے

لے شمس آفتاب، قمر چاند، لے روشنی والا۔

سامنے کیا جائے تو وہ خود بھی نورانی ہو جاتا ہے اور دیوار کو بھی منور کر دیتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ محض واسطی العرض ہوتا ہے۔ واسطی الثبوت نہیں ہوتا۔ اور چراغ واسطی الثبوت ہو جاتا ہے جیسا کہ نور حق واسطی الثبوت ہوتا ہے مگر یہ تشبیہ من کل وجہ نہیں کہ اس سے نوز بائند دوسرا خدا تصنیف کرنے لگے۔ مطلب صرف یہ کہ نور حق دوسروں کو بھی منور کرتا ہے اور منور بھی ہے گو دوسروں کی تنویر اس درجہ کی نہ ہو۔ اور یہ بات چراغ ہی میں ہے شمس و قمر میں نہیں ہے اور یہ سب نکات ہیں مقاصد نہیں ہیں۔ ہر شئی کو اپنی حد پر رکھنا چاہیے۔

(۸۳) واصل بحق ہونے پر مشبہ

اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ بارگاہ حق کی تو کہیں انتہا نہیں۔ جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں۔

اے برادر بے نہایت درگہست ہرچہ بردے میری برو مانیت
ایک اور عارف کہتے ہیں

نگرد و قطع ہرگز جادہ عشق از دید نہا۔
کہ می بالذخودایں راہ چوں تاک از برید نہا۔

اور جب اس کی انتہا کہیں نہیں۔ پھر وصول کے کیا معنی کیونکہ وصول تو محدود ہو سکتا ہے غیر محدود تک کہاں ہو سکتا ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ وصول کے دو معنی ہیں ایک وصول محدود ہے ایک غیر محدود ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ تعلق مع اللہ کے دو درجے ہیں ایک سیر الی اللہ ہے تو محدود ہے ایک سیر فی اللہ ہے غیر محدود ہے۔ سیر الی اللہ ہے کہ نفس کا علاج شروع کیا یہاں تک کہ امراض سے شفا ہو گئی اور ذکر و شغل سے قلب کی تعمیر شروع کی یہاں تک کہ وہ انوار ذکر سے معمور ہو گیا یعنی تخلیہ و تخلیہ کے قواعد جان گئے۔ موانع مرقعہ کر دیئے۔ معالجہ امراض سے

تہ تخلیہ خالی کرنا تہیہ آراستہ کرنا

لہ راہ خدا طے کر نیوالا۔

واقف ہو گئے نفس کی اصلاح ہو گئی اخلاق رذیلہ زائل ہو گئے۔ اور اخلاق حمیدہ سے انوار ذکر سے قلب آراستہ ہو گیا۔ اعمال صالحہ کی رغبت طبعیت ثانیہ بن گئی۔ اعمال و عبادات میں سہولت ہو گئی۔ نسبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہو گیا۔ تو سیر الی اللہ ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کا حسب استعداد انکشاف ہونے لگا۔ تعلق سابق میں ترقی ہوتی۔ اسرار و حالات کا ورود ہونے لگا یہ غیر محدود ہے یہ تعلق ہے جسکی نسبت کہا گیا ہے

بحریت بحر عشق کہ بیچش کنارہ نیست
آنجا جزا نہ کہ جاں بیارند چارہ نیست

اور اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص سائنس کا امتحان دیتا ہے یہاں تک کہ پاس ہو گیا اور سند مل گئی تو اس وقت سیر الی سائنس ختم ہوئی اس کے بعد سیر فی سائنس ہے کہ تحقیقات میں اضافہ ہوتی نئی باتیں منکشف ہوں اس کی کوئی حد نہیں چنانچہ اہل سائنس خود اس پر متفق ہیں کہ تحقیقات سائنس کا سلسلہ غیر محدود ہے۔

جب ایک دنیوی تعلق کا یہ حال ہے تو تعلق مع اللہ کا کیا حال ہوگا۔ دوسری مثال اور لیجئے کہ ایک کرہ جو اپنے مرکز سے الگ ہو گیا ہو اور وہ حرکت ایسی کر کے مرکز پر پہنچ جائے تو اس وقت حرکت الی مرکز ختم ہوئی۔ پھر اس کے بعد اپنے مرکز پر پہنچ کر وہ حرکت وضعیہ کرتا ہے اس کی کوئی حد نہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو۔ پس وہ شبہ جاتا رہا کہ جب بارگاہ حق غیر متناہی اور غیر محدود ہے تو وصول کے کیا معنی۔ سو میں نے بتلادیا کہ تعلق مع اللہ ایک معنی کے اعتبار سے محدود ہے۔ یعنی سیر الی اللہ کے اعتبار سے اور اکثر اسی حد پر خلافت دے دی جاتی ہے اور سالک کو مجاز بنایا جاتا ہے۔ جیسے علوم ظاہر میں ایک لفظ خاص کے ختم کرنے پر اور پاس کر لیں پسند دی جاتی ہے یہ محدود ہے پھر آگے عمر بھر علوم میں ترقی ہوتی رہتی ہے یہ غیر محدود ہے ایک درجہ غیر محدود ہے۔ اسی طرح یہاں تعلق کا محدود ہونا بھی صحیح ہے اور غیر محدود ہونا بھی صحیح ہے۔

(غایتہ النجاح ص ۲۵)

(۸۴) بعض لوگوں کا بغیر عمل کامل ہو جانے کی تمتنا کرنا غلط ہے

لوگ خاص دین کے باب میں اس کے درپے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کو ایسا شہید تعلق ہو جائے کہ حقوق خود بخود ادا ہوتے رہیں۔ ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے بس محبت و شوق کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ نماز روزہ خود ہی ادا ہوتا رہے۔ سو یہ حالت بغیر اختیاری ہے بندہ کے اختیار میں نہیں۔ بلکہ اس کے ذمہ یہ واجب ہے کہ اپنے ارادہ اختیار سے کام لے اور بغیر اختیاری امور کے درپے نہ ہو۔ یہ بہت ضروری مسئلہ ہے جیسے حدیث میں الطاهر بن عثمان، وارد ہے اسی طرح میں اس مسئلہ کو نصف السلوک سمجھتا ہوں کہ اختیاری میں کوتاہی نہ کرے اور بغیر اختیاری امور کے درپے نہ ہو۔ لوگوں نے آجکل صرف نماز روزہ کا نام دین رکھ لیا ہے۔ حالانکہ عمل دین کا جزو ہے کہ اختیاری امور کے درپے ہو بغیر اختیاری کے درپے نہ ہو۔ یاد رکھو کہ یہ امور بغیر اختیاری یعنی حالات و کیفیات وغیرہ اگر کبھی حاصل ہوتے ہیں اعمال اختیاریہ ہی میں مشغول ہونے سے حاصل ہوتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ عمل اختیاری سے بغیر اختیاری کی نیت بھی نہ کرے کیونکہ حصول میں تعیل و تاخیر اختیار سے باہر ہے کبھی تو نقصان عمل کی وجہ سے تاخیر ہوتی ہے کبھی قلت استعداد و ضعف استعداد کی وجہ سے دیر ہوتی ہے پس ہم اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو۔ خود ان کے درپے نہ ہو۔ بلکہ ان اعمال کے درپے ہو جو تمہارے اختیار میں ہیں۔

تو بندگی چوگدایاں بشر طر مد بکن۔
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند۔

وہ خود جانتے ہیں کہ تمہارے لئے کیا مناسب ہے کیا نہیں اس لئے اگر حالات

لہ پاک و صان رہنا ادھا ایمان ہے۔ لہ تعیل جلدی کرنا تاخیر دیر کرنا

کیفیات تمہارے لئے مناسب ہوں گے عطا کر دیں گے نہیں مناسب ہوں گے تو نہیں عطا کریں گے۔ دیکھو ماں اپنے بچے کے واسطے جو مصلحت سمجھتی ہے وہی کرتی ہے بچہ کی خواہش پر عمل نہیں کرتی۔ خصوصاً باپ کہ وہ بچہ کی حد سے مغلوب ہی نہیں ہوتا۔ ماں تو کسی وقت معلوم بھی ہو جاتی ہے۔ مگر زیادہ حالت یہی ہے کہ والدین بچہ کے ساتھ اپنی رائے کے موافق معاملہ کرتے ہیں جو مصلحت جانتے ہیں ویسا ہی عمل کرتے ہیں گو بچہ کتنا ہی ضد کرے۔ مولانا فرماتے ہیں ص

طفل لى رز زینش اجتمام
مادر مشفق ازاں غم شاد کام
بچہ پچھنے لگانے والے کے شتر و غیرہ کو دیکھ کر دتا ہے ڈرتا ہے مگر ماں خوشی کے ساتھ اس کے پچھنے لگواتی ہے کیونکہ اس کی نظر انجام صحت پر ہے تو جب باپ ماں بچوں کی رائے پر کام نہیں کرتے پھر حق تعالیٰ بندوں کی رائے پر کیوں کام کریں۔ اور تم سے مشورہ کیوں لیں۔ وہاں شخصیت ہے پارلیمنٹ نہیں ہے غرض اعمال اختیار یہ میں بھی امور بغیر اختیار کا قصد نہ کرے۔ جو بات اس کے اختیار میں نہیں اس کی طرف التفات ہی نہ کرے۔ بلکہ اپنے کام میں لگے۔
(رفع اللبتاس عن نفع اللباس ص)

(۸۵) بزرگوں کے طریقہ اصلاح پر شبہ کا جواب

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طریقہ سے یعنی طریق اصلاح اختیار کرنے سے معتقد کم ہو جائے گا میں کہتا ہوں اول تو یہ خیال غلط ہے گو ظاہر میں تمہارے پاس آدمی کم آئیں۔ مگر دل میں معتقد زیادہ ہوں گے۔ اور مان لو معتقد کم ہوئے تو کیا فوج بھرتی کر کے کہیں لام رکھیں جو اگر زیادہ معتقد بھی ہوئے اور کام نہ کئے تو ان کو لے کر کیا کر دے۔ اس سے تو یہ اچھا ہے کہ معتقد مقرر ہوئے ہوں اور کام کے ہوں اس میں تو زیادہ راحت ہے کہ جو خلق زیادہ نہ ہو گا۔ کیونکہ ہجوم سے اوقات میں خلل پڑتا ہے۔

یہ جواب تو بطور اخراج عنان کے ہے در نہ میرا اصلی مذاق یہ ہے کہ مجھے تو لوگوں کے

اعتقاد ہی سے وحشت ہوتی ہے۔ مگر جسے ہجوم خلافت سے محبت ہو جو ہر وقت اپنے گرد مجمع چاہتا ہو وہ تو بیشک معتقدین کی قلت سے گھبرائے گا اور وہ طریق اصلاح کو اختیار نہ کرے گا۔ اسی واسطے میں بیعت میں جلدی نہیں کرتا بلکہ بہت سے شرائط کے بعد کرتا ہوں۔ اس میں ہمارے بعض احباب کی رائے یہ ہے کہ اتنی سختی نہ کرنی چاہیے بلکہ جہاں تک ہو سکے لوگوں کو اپنے سے وابستہ کرنا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ وابستہ کر کے اصلاح کرو تب تو فائدہ بھی ہے ورنہ وہ تو وابستہ ہو کر طریق سے بیکار اور پابستہ ہو جائے گا۔ کیونکہ جلدی بیعت کر لینے سے وہ سمجھے گا کہ اس طریق میں عمل کے انتہام کی ضرورت نہیں۔ اب بتلاؤ وہ طریق سے پابستہ ہو گیا یا نہیں۔ اور جب اس سے شرطیں کی جائیں گی تو عمل کی ضرورت ابتداء ہی سے اس کے ذہن نشین ہو جائے گی۔ پھر وہ عمل کا انتہام کرے گا اور بار بار روک ٹوک کرنے سے اس میں ترقی ہوگی۔ اگر وہ روک ٹوک کا تحمل نہ کرے گا۔ تو انشائاً اللہ بہت جلد اصلاح پذیر ہو جائے گا۔ اور بدوں اس کے تو فضول بھرتی کرنا ہے۔ غرض اخلاق باطنہ کی حقیقت یہ ہے کہ اعمال باطنہ درست ہوں۔ (المجمعین بین النفعین ص ۲۷)

(۸۶) طاعون سے بھاگنا تدبیر کے خلاف ہے

میں کہتا ہوں کہ بھاگنا دراصل تدبیر ہی نہیں۔ بلکہ سورتدبیر ہے کیونکہ بھاگنا جیسا ضعف قلب سے ناشی ہے اسی طرح وہ ضعف کا منشا بھی ہے۔ یعنی بھاگنے والا اس نفل سے ضعف کو اپنے قلب پر غالب کر لیتا ہے۔ طبی قاعدے سے ایسے امراض ضعیف القلب پر سب سے پہلے قبضہ کر لیتے ہیں۔ تو بھاگنے والے نے تو اسی وقت اپنے اوپر طاعون کو قبضہ دیدیا۔ اگر وہ یہاں نہیں مرا تو دوسری جگہ جا کر مرے گا۔ اب بتلائیے بھاگنا تدبیر کس طرح ہے۔

دوسرے میں کہتا ہوں، اگر بھاگنا مفید بھی ہو۔ اور بھاننے والا طاعون سے بچتا بھی ہو تو تب بھی شریعت کو حق ہے کہ اس مفید نفل سے منع کر دے کیونکہ بعض مفید

افعال سے آپ بھی تو منع کرتے ہیں۔ مثلاً رطائی میں سے بھاگنا تمام عقلا کے نزدیک جرم ہے حالانکہ یقیناً بھاگنے والے کو تو بھاگنا ہی مفید ہے۔ اس کی جان بچتی ہے مگر اس کو آپ کے لیڈر بھی تدبیر نہیں کہتے۔ بلکہ بے تدبیری کہتے ہیں۔ اسی طرح ہم طاعون سے بھاگنے کو بے تدبیری کہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک دلیل شرعی سے طاعون سے بھاگنا ایسا ہی ہے جیسا جنگ سے بھاگنا اور جہاد سے بھاگنا۔ کیونکہ طاعون کی نسبت حدیث میں وارد ہے۔ والفسار منہد الفار من الرجف اور ایک حدیث میں طاعون کی حقیقت میں وخزاعا نکم الجن وارد ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس وقت جنات کا اور انسانوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ جنات انسانوں کے اندرون جسم میں زخم لگاتے ہیں۔ جس سے طاعون ہوتا ہے۔ اور مقابلہ سے بھاگنا عقلاً بھی بے تدبیری ہے اس لئے شریعت نے فرار کو حرام کر دیا۔ تو اس حقیقت میں اظہار اور ڈاکڑوں کا اختلاف ہے۔ ڈاکڑ جراثیم کو سبب بتلاتے ہیں۔ مگر اس سے مضمون حدیث کی نفی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ممکن ہے کہ یہ سبب بھی اور وہ بھی۔ مگر اصل سبب و خرج ہو اور ظاہری سبب وہ ہو جو تم کہتے۔ پھر ایک اور بات بھی ہے کہ یہاں سے بھاگ کر جو لوگ دوسری جگہ جاتے ہیں۔ وہ وہاں کے آدمیوں کی نگاہ میں ذلیل ہوتے ہیں۔ اور خصوصاً اگر تم طاعون کی جگہ سے بھاگ کر کسی شہر میں ایسے کسی دوست یا عزیز کے گھر میں بھڑے ہو۔ اور اتفاقاً تمہارے جانے کے بعد اس کے گھر کوئی بیمار پڑ گیا تو اس وقت اس کی نگاہ میں تمہاری ہمت ذلت ہوگی جس کو قرآن سے تم خود بھی سمجھ جاؤ گے کیونکہ وہ یہ سمجھے گا کہ میرے گھر میں تو بیماری نہ تھی۔ یہ کجخت میرے گھر بیماری لے آیا اور اگر وہ بیمار مر گیا تو اسکی موت گھر والوں کے خیال میں تمہارے نامہ اعمال میں درج ہوگی پس ہے ۷

عزیز کے اذدگشس سر تنافت بہر در کہ شدیچ عزت نیانت
پھر اس طرح یہ لوگ دوسری جگہ بھی طاعون پھیلاتے ہیں نہ بطریق عدوی کے بلکہ اسی قاعدہ سے کہ یہ وہاں جا کر لوگوں کے قلوب میں وہم پھیلاتے ہیں۔ تو دوسری بستی کے لوگ ان بھاگنے والوں سے یوں کہتے ہیں کہ خدا خیر کرے۔ کہیں ہماری بستی میں بھی

لے رطائی۔ لے اس سے بھاگنے والا میدان کا زرار سے بھاگنے والے کی طرح ہے۔ مگر جن کا زخم لگاؤ

طاعون نہ ہو جائے۔ جس سے ان میں بھی قبول طاعون کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیسی رحمت ہے کہ آپ نے بھاگنے سے، منع نہ فرمادیا۔
(الجمعین بین النفعین ص ۴)

۸۷) منافقین کے نماز جنازہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے افضل ہونیکا شبہ اور اس کا جواب!

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رائے تھی۔ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیض تھا کیونکہ کفار و منافقین پر غیظ اور ان سے نفرت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ہی کی برکت سے نصیب ہوئی۔ ورنہ آپ کی صحبت سے پہلے تو وہ خود ہی خالی تھے اور قتل رسول کا منصوبہ باندھ کر آئے تھے۔ حضور ص پر ایمان لانے کے بعد حق تعالیٰ نے ان کو کفار و منافقین سے نفرت اور غیظ عطا فرمایا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ صرف عمر ہی تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم رسول بھی تھے اور عمر بھی تھے۔ بلکہ یوں کہو کہ آپ آدم علیہ السلام بھی تھے۔ نوح علیہ السلام بھی تھے۔ ابراہیم علیہ السلام بھی تھے۔ موسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام شانیں جمع تھیں غیظ و غضب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام شانیں جمع تھیں غیظ و غضب علی الکفار بھی آپ کے اندر تھا اور رحمت و رأفت بھی اعلیٰ درجہ کی آپ میں تھی مگر آپ میں غلبہ رحمت ہی کو تھا۔ اس لئے جب کوئی بہانہ بھی رحمت کا ملتا تھا آپ رحمت ہی کا برتاؤ کرتے تھے جب رحمت کا کوئی بہانہ نہ ہوتا اس وقت غضب فرماتے تھے۔ عبد اللہ بن ابی گو منافق تھا مگر کھلم کھلا کافر نہ تھا۔ اور منافقوں کے احکام کفار معینین کے احکام سے جدا تھے ان کے ساتھ احکام حیات میں وہی تھا و

ہوتا تھا جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا اور موت کے احکام ہنوز نازل نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے بوجہ غلبت رحمت کے آپ نے احکام حیات پر قیاس کر کے اس کے ساتھ اموات مسلمین جیسا برتاؤ کیا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوجہ غلبہ غیظ و شدت کے احکام حیات کو ضرورت و مصلحت پر مبنی سمجھ کر احکامات میں منافقین کو کفار معینین پر قیاس کیا اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیض تھا اور یہ قیاس بھی آپ سے مخفی نہ تھا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غلبہ رحمت کی وجہ سے پہلے قیاس کو ترجیح دی کیونکہ جب تک آپ کو موقع ملتا تھا۔ آپ رحمت ہی کے پہلو کو اختیار فرماتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان ہم مسلمانوں کے لئے مسہبت کچھ موجب تھی ہے کیونکہ وہ دوستاں را کجا کنی محرم تو کہہ باد شمتاں نظر داری۔

اور

چشم دیوار امت را کہ با شد چوں تو پشتیان
چہ برباک از موج بحران را کہ دارد لوح کشتی بان

اب میں اس مقام پر ایک سوال علماء سے ظاہر کرتا ہوں وہ یہ کہ اَسْتَغْفِرُ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرُ لَهُمْ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تخریر کس طرح سمجھی۔ یہ تردید تو سویر کے لئے ہے کہ ان کے واسطے استغفار کرنا اور نہ کرنا برابر ہے ان کو دعا سے استغفار سے کوئی نفع نہ ہوگا۔ چنانچہ اہل عربیت پر یہ بات مخفی نہیں۔ اسی طرح اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً میں عدد کا ذکر تحدید کے لئے محفوظ رہی ہے۔ اگر شتر دنفہ استغفار کر و گے تو مغفرت نہ ہوگی۔ اس سے زیادہ کرو گے تو ہو جائے گی۔ بلکہ یہاں عدد کا ذکر ایسا ہے جیسا محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ سو دفعہ بھی کہے گا جب بھی نہ مانوں گا۔ ہزار دفعہ کہے گا جب بھی کچھ نہ ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہزار دفعہ سے زیادہ کہا جائے تو مان لیں گے بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ بات ہرگز نہ مانی جائے گی اور عدد کا ذکر صرف بیان کثرت کے لئے ہوتا ہے نہ تحدید کے لئے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر ت فاختوت و سازید علی

لہ تم ان کے لئے مسفرت چا ہو یا نہ چا ہو۔

لہ اگرچہ آپ ان کے لئے شتر مر تہ مغفرت چاہیں۔

السبعین کیسے فرمایا۔ علماء ظاہر اس کا شافی جواب نہیں دے سکتے۔ اور جو لوگ محض ترجمہ قرآن پڑھ کر اجتہاد کے مدعی ہیں وہ تو کیا ہی جواب دیں گے۔ لیکن اب میں علماء باطن کا جواب عرض کرتا ہوں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حالت رحمت کے غلبہ کی وجہ سے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معافی کی طرف التفات نہیں فرمایا بلکہ محض نفس الفاظ سے متسلک فرمانے لگے اور نفس الفاظ میں تخیر و حصر کی گنجائش ضرور ہے گو محاورہ کے اعتبار سے گنجائش نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ غلبہ حال کا ملین پر کبھی ہو جاتا ہے۔ (المربط ص ۳)

۱۸۸) تکمیل نماز کا طریقہ

تکمیل نماز کے لئے مراقبہ موت و مراقبہ تقارر اللہ کا عادی ہونا چاہیے اور میزاق یہ کہتا ہے کہ آیت میں یہ مراد ہے کہ عین نماز کے اندر بھی اس مراقبہ میں قلب کو مشغول کیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ نماز کی ہیئت میں غور کرے کہ میں جو تمام دنیا سے رُخ پھر کر ہاتھ باندھ کر اس طرح کھڑا ہوں کہ نہ کسی سے بات کر سکتا ہوں نہ کسی کی طرف دیکھ سکتا ہوں نہ کھا پی سکتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں اور ان سے عرض معروض کر رہا ہوں۔ پھر قیام کی حالت میں سوچے کہ خدا تعالیٰ کے مجھ پر کس قدر احسانات و انعامات ہیں جن کا شکر یہ میرے ذمہ واجب ہے اور سورہ فاتحہ پڑھتے ہوئے یہ سوچے کہ میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکر یہ ادا کر رہا ہوں اور اس کی ربوبیت کا اقرار اور اپنی عبدیت کا اعتراف کر رہا ہوں اور اسی ۔۔۔ عبدیت پر قائم رہنے اور اہل عبدیت کے طریقہ پر چلنے کی دعا کر رہا ہوں اور جو لوگ طریقہ عبدیت سے بہک گئے اور لعنت و غضب کے مستحل ہوں گے ہیں ان کے طریقہ سے بیزاری کا اظہار کر رہا ہوں اور جو قانون الہی تکمیل طاق عبدیت کے لئے نازل ہوا ہے اس پر ہمیشہ کے لئے چلنے کا عہد کر رہا ہوں فاتحہ کے بعد سورت پڑھنے کا یہی مطلب ہے۔

سجدہ و رکوع میں سوچ | پھر جب رکوع میں جائے تو یہ سوچے کہ میری پیدائش اسی مٹی اور زمین سے ہے جو میرے پاؤں تلے ہے

زمین کی خاک سے جیتا جاگتا۔ سمیع و بصیر انسان پیدا ہو جانا محض خالق جل و علی کی قدرت ہے اور جس کی پیدائش زمین کی خاک اور اس کی بنائات وغیرہ سے ہو اس کو عبدیت اور بندگی کے سوا کچھ زیبا نہیں، بڑائی اور بزرگی صرف خالق جل و علا کو زیبا ہے جو تمام عیوب سے بری ہے۔ اسی لئے نمازیں بار بار اللہ کر کہا جاتا ہے کہ اے خدا ہم نے آپ کی عظمت کے سامنے اپنی خیالی عزت کو قربان کر دیا۔ پھر سجدہ میں جاتے ہوئے یہ سوچے کہ مجھے ایک دن زمین کے اندر پیوند ہونا ہے اور اس وقت خدا کے سوا میرا ساتھ دیسے والا کوئی نہ ہوگا۔ دنیا سے میرا نام بھی مٹ جائے گا۔ اور نشان بھی، اس کے بعد دو سجدے میں یہ تصور کر لے کہ گویا میں مرجھا اور خدا سے مل گیا ہوں اب خدا کے سوا میرے ساتھ کوئی نہیں۔

پھر حالت شہد میں سوچے کہ مرنے کے بعد پھر ایک زندگی ہوگی جہاں اسلام اور اعمال و اقوال و احوال صالحہ ہی کام آئیں گے جو اللہ تعالیٰ کے واسطے کئے گئے ہوں اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء و حضرات ملائکہ اور تمام نیک بندوں کی عزت ظاہر ہوگی۔ اور وہ گنہ گاروں کی شفاعت کریں گے لہذا ان پر سلام بھیج کر ان سے تعلق پیدا کرنا چاہیے پھر چونکہ امت محمدیہ کو سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق ہے اس لئے اخیر رکعت میں آپ پر خصوصیت کے ساتھ درود پڑھنا چاہیے۔ جب یہ تصور جم جائے تو اس کے بعد جلسہ میں یوں تصور کرے کہ گویا مرنے کے بعد میدان قیامت میں حاضر ہوا ہے۔ اور تمام اعمال و افعال و اقوال جو دنیا میں کئے ہیں اس کے سامنے ہیں جن میں سے وہی کام آئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے واسطے کئے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء و صلحاء و ملائکہ کی جماعت سامنے ہے جو دربار الہی میں حاضر ہیں۔ ادین ان سب پر درود شریف و سلام بھیج رہا ہوں۔

اور آخر میں اپنے لئے کامیابی و نجات و فلاح کی دعا کر رہا ہوں اور اسی واسطے آیت میں لفظ یظنون اختیار کیا گیا ہے حالانکہ تقارر اللہ کا تو اعتقاد لازم فرض ہے محض ظن کا فی نہیں

مگر چونکہ مقصود یہ ہے کہ نماز میں لقا را شر و رجوع الی اللہ کا استحضار کیا جائے اور یہ استحضار درجہ وقوع میں لازم نہیں بلکہ اس کا ظن اور تصور بھی نمازیں کافی ہے کہ گویا میں اس وقت خدا کے سامنے حاضر ہوں اور مریا ہوں یا مرنے والا ہوں اور گویا میں اس وقت عالم آخرت میں حاضر ہوں اسی واسطے لفظ ظن اختیار کیا گیا۔ اس طرح نماز پڑھنے سے خشوع حاصل ہو جائے گا اور تمام خیالات و وسوسے قلب سے نکل جائیں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

ہذا کلہا من سیدی و مرشدی حضرت مولانا خضر احمد صاحب دام فیوضہم۔

(انج ص ۱۸)

(۸۹) چندہ وصول کرنے کے مفاسد۔

لوگوں کو سکرٹری وغیرہ صرف اس لئے بنایا جاتا ہے کہ وہ چندہ خوب وصول کرتے ہیں۔ عزبار کے اوپر ٹیکس کی طرح چندہ مقرر کرتے ہیں اور اپنے دباؤ اور اثر سے جبراً وصول کرتے ہیں اس کام میں ان کی مدح کی جاتی ہے کہ فلاں صاحب دین کے کاموں میں بڑی دیکھی لیتے ہیں سبحان اللہ یہ بڑا دین کا کام کیا کہ عزبار کے گلے پر چھری رکھ کر چندہ وصول کر لیا۔ ان سے اچھے تو وہ لوگ ہیں جو کھلم کھلا ڈاکو ہیں۔ کیونکہ وہ لوگوں سے مال چھین کر اپنے بال بچوں کو تو کھلاتے ہیں جن کا نان و نفقہ ان کے ذمہ واجب ہے تو گوان کا یہ ذریعہ معاش تو حرام ہے مگر صرف ایسا ہے جس میں خرچ کرنا ان کے ذمہ واجب تھا۔ تو وہ حرام کا ارتکاب کر کے ایک واجب سے توسل و تشویش ہوئے اور یہ سکرٹری صاحب حرام طریقہ سے چندہ وصول کر کے ایسی جگہ صرف کرتے ہیں جس کی خدمت ان کے ذمہ واجب بھی نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ انجن کی خدمت ان کے ذمہ واجب نہیں اور ڈاکو کی سزا معلوم ہے تو لوگ اس کے واسطے تیار رہیں۔ انسو اس آج کل چندہ میں اس کا اصل لحاظ نہیں کیا جاتا یہ مال خوشی سے دیا گیا ہے یا جبر سے۔

حق تعالیٰ شانہ نے بیوی کے مال کے بارہ میں بھی فرمایا۔ فَإِنْ طَلَبَ

لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْكُمْ نَفْسًا تَكُونُ هِنًا مَرِيئًا کہ اگر بیوی اپنے دل کی خوشی سے اپنے

مہر میں سے مرد کو کچھ دیدے تو اس کا کھانا جائز ہے یہاں بھی طیفیس کی قید ہے حالانکہ میاں بیوی کا تعلق عاشقی معشوقی کا تعلق ہوتا ہے۔ اور ایسے تعلق میں ناگواری بھی بہت ہی کم ہوتی ہے تو پھر عزبار کا روپیہ بد و ن طیب قلب کے کیونکر جائز ہوگا۔ بیوی کے معاملہ میں ایک مقام پر اس سے بڑھ کر ارشاد فرمایا ہے وَإِنْ طَلَّقَتْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَسُوهُنَّ وَكَدَّ خُصْمَتُهُنَّ لَمْ يَكُنْ فَرْصَتَهُنَّ فَخَصْمٌ مَا خُصِمَتْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بَيْنَهُ عَقْدُ الْكَفَّاحِ وَإِنْ تَعَفَوْا آخِرُ بَلٍّ لِلتَّقْوَى۔ کہ اگر تم نے اپنی بیوی کو ذنوب سے پہلے طلاق دے دی ہو اور مہر مقرر ہو چکا ہو تو بیوی کے لئے نصف مہر ہے مگر یہ کہ وہ اپنا حق معاف کر دے (تو کچھ نہ رہے گا) یا جس کے ہاتھ میں نکاح کی ڈور ہے (یعنی شوہر) وہ معاف کر دے (تو پورا مہر رہے گا) اور اے مرد تم معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے یعنی مرد کے لئے زیادہ بہتر ہے کہ عورت کی معافی کا منتظر نہ رہے بلکہ خود اپنا حق معاف کر دے۔ تو دیکھئے کہ باوجودیکہ عورت اگر خوشی سے مہر معاف کر دے تو اس کا قبول کرنا جائز ہے اور اس کی اجازت دیدی گئی تھی مگر اس مقام پر دو مسئلہ ادب کھلا دیا گیا ہے کہ غیرت کا متقاضی یہی ہے کہ عورت کی معافی قبول نہ کر دیکلکہ تم اس کے ساتھ احسان کرو۔

جب بیوی کے ساتھ لین دین کرنے اور اس کا عطیہ قبول کرنے کے لئے یہ آداب ہیں تو کھلا چندہ کے لئے آداب نہ ہوں گے۔ ضرور ہیں اور ان کا لحاظ کرنا واجب ہے۔ شریعت مقدسہ نے تو ہدیہ کے لئے بھی آداب مقرر کئے ہیں چنانچہ ایک ادب یہ ہے مَا تَأْتِيكَ مِنْ غَيْرِ اشْرَافِ نَفْسٍ فَخْذًا، وما لا فلا تتبعہ ففست۔ کہ جو چیز ہدیہ وغیرہ بد و ن انتظار کے آجائے لے لو۔ اور جو انتظار سے آئے اپنے نفس کو اس کے پیچھے مت ڈالو۔ (اصل العبادہ ص ۱۸)

مگر چندہ میں تو قصداً یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ مجمع میں تحریک کی جائے تاکہ جو شخص ایک روپیہ دیتا وہ شرمناشرمی (پانچ) روپے تو دے گا۔ یاد رکھو یہ صورت بالکل ناجائز ہے مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ میں کہتا ہوں یہ تباہ و مقصود بالذات کیا ہے کام مقصود ہے یا دین؟ اگر صرف کام ہی مقصود ہے تو منافقین درک اسفل میں کیوں ہوں گے۔ کیونکہ وہ بھی توجہ و وسعت وغیرہ کرتے تھے معلوم ہوا کہ جس کام

میں رضاء حق نہ ہو وہ کام ہی نہیں مسلمان کا اصل مقصود رضاء حق ہے چاہے کام تھوڑا ہو مگر رضاء حق کے موافق ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر یتیم خانہ بہت بڑا ہو مگر رضاء حق نہ ہو تو اس کو لے کر کیا کرنا ہے۔

ایک انجمن کا واقعہ | چنانچہ آجکل جو ایک بہت بڑی انجمن ہے میں اس کا نام بیان کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا ایک واقعہ عجیب ہے جس سے حیرت ہو گئی وہ یہ کہ لکھنؤ میں کسی نے بہت جائے داد ایک

متوکل عالم تنگ دست کے سامنے پیش کی کہ اس کو قبول فرما کر اپنے تصرف میں لائیے انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے انجمن والوں کے سامنے پیش کیا کہ میری طرف سے اس کو انجمن کے واسطے وقف کر دو انہوں نے قبول کر لیا۔ لکھنؤ کے عوام نے اس پر عجیب فقرہ کسا کہ میاں وہ بزرگ تو اکیلے تھے ان کو گناہوں کے انبار کا تحمل نہ تھا اور انجمن میں تو بہت موٹے موٹے ہیں وہ سب مل کر تھوڑا تھوڑا اٹھالیں گے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو صرف انجمن کا چلانا مقصود ہے رضاء حق مقصود نہیں ورنہ حلال و حرام کی ضرور رعایت کرتے۔

حب جاہ | اور یہ ساری خرابی حب جاہ کی ہے کہ ان لوگوں کو کام سے مقصود جاہ مطلوب ہے۔ چنانچہ ڈیگ میں ایک نجمن کے سکریٹری مجھ سے ملے اور انجمن سے لوگوں کی بے توجہی کی شکایت کرنے لگے میں نے کہا کہ دوسروں کو کام میں لگانے کی اور ان کی شکایت کی آپ کو کیا ضرورت ہے آپ پہلے خود کام کرنا شروع کر دیں جتنا کبھی آپ سے ہو سکے۔ دوسروں کو آپ تنگ نہ کریں پھر کام میں خود کش ہوتی ہے لوگوں کو خود بخود توجہ ہو جائے گی۔ جب وہ چلے گئے تو لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تم نے ان کے مرض کو خوب سمجھا۔ واقعی بات یہی ہے کہ یہ خود تو کچھ کام نہیں کرتے اور دوسروں سے چندہ وصول کرنا اور کام لینا جانتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے سیکریٹری بننے کا شوق ہے اور کام کے نام صفر ہے۔ غرض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آجکل جو لوگ دین کی خدمت کرتے محض جاہ کے لئے کرتے ہیں دین اور رضاء حق مطلوب نہیں۔

(ایضاً صفحہ ۹)

(۹۰) حق تعالیٰ بدون ابتلا و امتحان کے

جنت کیوں عطا نہیں فرماتے

اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک حق تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ بدون ابتلا و امتحان کے سب کچھ عطا فرمادیتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ انسان کو ابتلا و تکلیف کے بعد ہی دولت قرب عطا فرما دیتے ہیں اور قرب ہی کا نام نجات ہے اور ہلاکت فراق و بُد کا نام ہے۔

شہیدہ ام کہ سخن خوش کہ بر کنال گفت فراق باز نہ آں می کند کہ بتوان گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر کنا بیست کہ از روزگار پھر گفت
چنان ایک مقام پر ارشاد ہے۔ أَحَبُّ النَّاسِ أَنْ يَبْرُكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ۔ راہ یہ کہ اس کی کیا وجہ ہے سوا اس کے بارہ میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے کہ حکم کی تفصیل میں گفتگو نہیں فرماتے۔ ان کا طریقہ یہ ہے۔ اٰیہو واما ابہم صا ابلہ۔ کہ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو۔

امتحان و ابتلا کی حکمت | پس اجمالا ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ابتلا میں حکمت ضرور ہے گو ہم کو معلوم نہ ہو اور اس باب میں ایک بات جو بے ساختہ دل میں آتی ہے وہ یہ ہے

کہ اگر انسان سے طاعت بدون ابتلا مقصود ہو تو اس کے لئے ملائکہ پہلے سے موجود تھے انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ ملائکہ طاعت بدون ابتلا ہی کرتے ہیں ان میں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں اور انسان کے اندر منقاومت و منازعت احکام کا مادہ رکھا گیا ہے مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ بھی تکمیل اجر کے لئے اس میں رکھا گیا ہے کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت منازعت افضل ہے بوجہ مجاہدہ کے

لوگ کیا خیال کرتے ہیں کہ وہ اس کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہر ایمان لے کے اور وہ امتحان میں مبتلا نہیں کئے جائیں گے؟
نہ مقابلہ نہ لڑائی

وہ درجہ خاص کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ اگر منازعت خاص درجہ پر نہ ہوتی تو الدین کیسے کے خلاف ہوتا۔ اس لئے میں نے یہ قید لگا دی اور یہ منازعت کبھی ابتداء ہی میں ہوتی ہے بعد رسوخ کے یہ منازعت کبھی باقی نہیں رہتی بلکہ احکام الہیہ امور طبعیہ بن جاتے ہیں حق تعالیٰ نے افعال حسیہ میں کبھی ہی قاعدہ رکھا ہے چنانچہ ششی و عیزہ میں ابتداء ہی میں ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے پھر ہر قدم پر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ وہی پہلا ارادہ ستر قرار دیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو فصل اختیاری کہا جاتا ہے اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ شاید پھر ثواب کم ہو جاتا ہو گا کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہے کہ ابتداء سے منازعت کا مقابلہ کرنے کے بعد ثواب منازعت ہی کا ہمیشہ ملتا ہے کیونکہ اس نے تو اپنی طرف سے مقاومت منازعت کے دوام کا مقصد کر کے عمل شروع کیا ہے چنانچہ ہر مسلمان جو روزہ نماز کا پابند ہے اس کا ارادہ یہی ہے کہ ہمیشہ نماز پڑھوں گا۔ ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔ خواہ نفس کو کتنا ہی گراں ہو اب یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ بعد میں منازعت کو باقی نہیں رکھتے مگر چونکہ بندہ نے ہمیشہ کے لئے اس منازعت کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اس واسطے اس کو زوال نماز کے بعد بھی بوجہ نیت دوام کے وہی ثواب ملتا ہے جو منازعت کے ساتھ ثواب ملتا ہے۔ تو جیسے ششی کو فصل اختیاری اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں اختیار و ارادہ کی ضرورت ہے گو بعد میں ضرورت نہیں رہتی اسی طرح یہاں بھی گو بعد میں منازعت نہیں رہتی مگر چونکہ ابتدا میں منازعت کی مخالفت کی ضرورت تھی اس لئے انتہا تک اس مخالفت منازعت کو کھینچا ستر قرار دیا جائے گا۔ اور یہاں سے پتہ لگتا ہے حق تعالیٰ کی رحمت کا۔

عبادت میں لذت کے باوجود ثواب

ورنہ عقل کا مقتضایہ ہے کہ جب منازعت ختم ہو جاوے اور عبادت میں لذت و حظ پیدا ہو جائے تو اس شخص کو اجر نہ ملے کیونکہ اب طاعت مع الابتلاء نہیں ہے اس وقت

عقل کہتی ہے کہ یہ شخص اجر کا مستحق نہیں۔ مگر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تجھے ہمارے بندہ

سے محبت نہیں ہے ہم اس کو منازعت ہی کا اجرا دیں گے گو اب محنت کچھ نہیں رہی مگر اب ہم اس کو پیش دیں گے لیکن عقل پیش کو جائز نہیں کرتی۔ جیسے معتزلہ نے کہا ہے کہ گناہوں پر سزا دینا ضروری ہے عفو و مغفرت خلاف عقل ہے پس یوں کہئے کہ رسوخ کے بعد بندہ کی وہ حالت ہو جاتی ہے جو بعض پیروں کی وہ حالت سنی گئی ہے کہ جب کوئی مرید ان کی دعوت کرتا ہے تو وہ دعوت کے بعد نڈرا بھی لیتے ہیں۔ جس کو دانت گھسائی کہنا چاہیے تو حق تعالیٰ نے یہ کر کے دکھلادیا کہ وہ بندہ کو دانت گھسائی بھی دیتے ہیں کیونکہ انتہا میں طاعت کا بجا لانا کچھ کمال نہیں رہتا بلکہ اس کے ترک میں تکلف ہوتا ہے۔ اخیر میں وہ حالت ہو جاتی ہے جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں وارد ہے کہ کان خلقہ القرآن کہ قرآن پر عمل کرنا آپ کی طبیعت تھی آپ کی تو فطرت ہی سے طبیعت تھی۔ مگر کاملین کی بھی اخیر میں اسی کے قریب حالت ہو جاتی ہے اور اس وقت اس کے حق میں وعیدات کی ایسی شان ہو جاتی ہے جیسے مان کچہ کو بعض دفعہ دو دھ پلانا چاہتی ہے اور وہ کھیل کے شوق میں بھاگتا ہے تو وہ اس کے چپٹ لگاتی ہے ایسے ہی شہتی کے لئے یہ وعیدات بغرض اظہار شفقت و رحمت ہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ مبتدی کے لئے بھی وعید محض اظہار شفقت و رحمت کے لئے ہے کیونکہ بات یہ ہے کہ انسان کو فطرۃ حق تعالیٰ سے محبت ہے اور مبتدی کو جو احکام میں منازعت ہوتی ہے یہ خلاف محبت نہیں بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ محبت کی وجہ سے اس کو حق تعالیٰ پر ناز ہے یہ یوں کہتا ہے کہ جب مجھے محبت ہے تو مجھے آرام دینا چاہیے میرے اذیتہ کا لیف اور قیود کیوں ہیں اور زبان حال یوں کہتا ہے ۷

ہم نے الفت کی نایں دیکھیں جانیں کیا چشم غضبناک کو ہم
(سبیل السعید ص ۷)

(۹۱) اختلاف رویت قمر کی صورت میں لیلۃ القدر کے متعدد ہونے کا شبہ اور اس کا جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو خبر بھی ہے کہ وہاں رات دن نہیں ہیں اور یہ تو خود سائنس دان

بھی تسلیم کرتے ہیں کہ لیل و نہار کرۃ النسیم سے نیچے ہی نیچے ہیں۔ کرۃ النسیم کے اوپر رات دن نہیں بلکہ یکساں حالت ہے یہ جواب جب میرے دل میں آیا بڑی خوشی ہوئی اور اس سے ایک بات ابھی اور دل میں آئی ہے وہ یہ کہ معراج کے ذکر میں اللہ تعالیٰ نے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر بیان فرمائی ہے۔ سیر سموات کا ذکر نہیں فرمایا۔ جس سے بعض اہل باطن نے سموات کی نفی پر استدلال کیا ہے تو وہاں سیر سموات کا ذکر اس واسطے نہیں کیا کہ وہاں لیلہ کی قید بھی مذکور ہے پس ضروری ہوا کہ اسی قدر سیر بیان کی جائے جو لیل کے اندر واقع ہوئی اور ظاہر کرے کہ سیر سموات لیل و نہار سے باہر ہوئی ہے سموات میں لیل و نہار کا تحقق ہی نہیں تو اس سے سیر سموات کی نفی پر استدلال محض لغو ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیر سموات رات میں نہیں ہوئی۔ سو یہ سلم ہے بلکہ ہم تو یوں کہتے ہیں کہ وہ تو نہ دن میں ہوئی نہ رات میں وہ تو ایسے مقام پر ہوئی ہے جہاں رات ہے نہ دن۔ بہر حال وہاں لیل و نہار نہیں ہے اس واسطے لیلۃ القدر کی جوشان و برکات ہیں وہ لیل و نہار کے ساتھ مقید نہیں۔ بلکہ ارادہ حق کے تابع ہیں۔ تو اس کی مثال بارش کی طرح ہے کہ یہاں کے کرۃ النسیم کے نیچے آج بارش ہے اور کلکتہ کے کرۃ النسیم کے نیچے کل بارش ہے اگر شب قدر بھی ایسی ہی ہو کہ آج یہاں ہے اور کلکتہ میں کل ہے تو اس میں اشکال کی کیا بات ہے۔ آخر بارش میں کیا ایسا اختلاف نہیں ہوتا۔ پھر معنوی بارش کے برکات میں ایسا اختلاف ہو تو کیا تعجب ہے اس لئے بے فکر ہو کر آپ اپنی ہی تائیدوں کے حساب سے کام کیجئے۔ اللہ تعالیٰ تو سب کی نیتوں اور کام کو دیکھتے ہیں۔ وہ سب کو ان کے حساب کے موافق لیلۃ القدر کی برکات عطا فرمادیں گے۔ (الکمال العدۃ ص ۲)

(۹۲) محض کتابیں دیکھ کر ہی اپنی اصلاح نہیں ہو سکتی

میں کتابوں کو بیکار نہیں کہتا۔ وہ بیشک کام کی ہیں مگر طبیب کے کام کی ہیں مریض کے کام کی نہیں۔ کتب طب سے کوئی مریض اپنا معالجہ نہیں کر سکتا حالانکہ کتابوں میں سب کچھ موجود ہے اور طبیب ان ہی سے علاج کرتا ہے مگر تم نہیں کر سکتے اگر معمولی مرض کا علاج کر بھی لیا تو شدید امراض کا علاج تو کبھی نہیں کر سکتے چنانچہ بحران کی بحث گو طب کی کتابوں

میں مذکور ہے مگر اس کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا یہ بحث اس قدر لطیف اور دقیق ہے کہ اطباء حال نے یعنی ڈاکٹروں نے تو گھبرا کر اس کا انکار ہی کر دیا کہ بحران کوئی چیز نہیں۔ مگر اطباء قدامت نے اس بحث کو بڑی خوبی سے ضبط کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس بحث کا الہام ہوا ہے چنانچہ انہوں نے بحار کے ایام کی تقسیم کی ہے کہ بعض ایام میں طبیعت و مرض میں مقابلہ ہوتا ہے طبیعت ان ایام میں مرض کو دفع کرنا چاہتی ہے اور مرض طبیعت کو دبا چاہتا ہے۔ اس کیفیت و مقادمت کا نام بحران ہے پھر ان ایام میں بعض دن تو سخت بحران کے ہیں اور بعض دن ہلکے بحران کے ہیں۔ اس لئے مریض کو اور اس کے تیمار داروں کو چاہیے کہ جب کسی کو بحار آوے اس کا دن اور وقت یاد رکھیں تاکہ طبیب سے بیان کر سکیں اور طبیب کو ایام بحران کی رعایت آسان ہو۔ کھلا محض کتاب دیکھ کر ان امور کی رعایت مریض سے کیونکر ہو سکتی ہے ہرگز نہیں ہو سکتی۔

حضرت کا اپنا واقعہ

بلکہ میں تو تجربہ سے کہتا ہوں کہ مریض اپنے معالجہ میں معمولی امراض کے اندر بھی غلطی کھائے گا۔ چنانچہ مجھے پہلے سال برسات کے اخیر میں میں بخار آیا کرتا تھا۔ اب تو الحمد للہ

بہت سالوں سے نہیں آیا۔ اور ہمیشہ صغریٰ بخار ہوتا تھا۔ میں نے ایک دفعہ خیال کیا کہ مجھے غلبہ صغریٰ سے بخار ہوتا ہے اور حکیم صاحب ہر سال قریب ایک ہی نسخہ لکھتے ہیں لاؤ اس کو نقل کر لیں۔ جب بخار آیا کرے گا اس کو استعمال کر لیا کرے گا حکیم صاحب تو تکلیف دینے کی ضرورت نہ ہوگی چنانچہ ایک سال ایسا ہی کیا کہ پچھلے سال کا لکھا ہوا نسخہ خود ہی استعمال کر لیا مگر چند روز استعمال کرنے سے بھی خاک نفع ہوا۔ آخر کار حکیم صاحب کو بلایا انہوں نے نسخہ لکھا اس کے پینے سے آرام ہو گیا پھر تحقیق ہوئی کہ اس سال صغریٰ کے ساتھ بلغم صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں کیوں کہ اب بڑھاپے کا سن شروع ہو گیا۔

اب اگر میں اس نسخہ کی بھی نقل کر لیتا کہ چلو اس میں صغریٰ اور بلغم دونوں کی رعایت ہے تو یقیناً اس سے بھی اگلے سال نفع نہ ہوتا بلغم ہی بڑھتا۔ (یعنی بلکہ تکلیف و غم ہی زیادہ ہوتا۔ یہ "بل غم" مرکب ہے مفرد نہیں) کیونکہ اس کا مجھے اندازہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس سال بلغم صغریٰ سے زیادہ ہے یا مسادی ہے یا کم ہے اس کا اندازہ تو طبیب

ہی کر سکتا ہے جو بنفس کی حالت کو پہچانتا ہے اس لئے کتب طب سے معالجہ کرنا طیب ہی کا کام ہے اسی طرح احیاء العلوم و فنون میں جو تصوف کی کتابیں ہیں بیکار نہیں بلکہ کارآمد ہیں مگر شیخ کے کام کی یہیں طالب کے کام کی نہیں طالب کو تو اپنے معالجہ کے لئے کسی محقق کا اتباع لازم ہے۔ (الرغبۃ المغربۃ ص ۲۱)

(۹۳) نفع متعدی کا علی الاطلاق نفع لازمی

سے افضل ہونا درست نہیں

اصل یہی ہے کہ نفع لازمی نفع متعدی سے افضل ہے کیونکہ آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امر ہے کہ جب آپ نفع متعدی سے فارغ ہو جائیں یعنی تبلیغ سے تو نفع لازمی میں مشغول ہوں یعنی توجہ الی اللہ میں یہ سیاق صاف بتلا رہا ہے کہ نفع لازمی متعدی سے افضل ہے کیونکہ متعدی سے فارغ کو طلب کیا گیا ہے نہ کہ لازمی سے پھر اس کے بعد نفع لازمی میں اشتغال کلی کا حکم ہے کہ اس میں توجہ رکھئے۔ اس وقت دوسری طرف التفات نہ ہو جیسا الیٰ ربک کی تقدیم کا مقصد مضیٰ ہے اور ظاہر ہے کہ اگر نفع متعدی افضل ہوتا تو اس سے فراع مطلوب نہ ہوتا بلکہ یوں ارشاد ہوتا۔ فاذا حسرت من ذکر ربک فا نصب فی التبلیغ والیہ فارغب نیز نفع لازمی میں مشغول ہونے کے وقت نفع متعدی سے قطع نظر کا امر ہوتا جیسا تقدیم معمول کا مدلول ہے کیونکہ مقصود بالذات سے کسی وقت قطع نظر نہیں ہوا کرتی۔ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ نفع متعدی مقصود بالعرض اور نفع لازمی مقصود بالذات ہے۔ اور گویہ مشہور کے حلال ہے مگر حقیقت یہی ہے اور قول مشہور کا منشا یہ قویہ ہوا ہے کہ بعض جگہ نفع متعدی نفع لازمی سے اولیٰ و اقدام ہو گیا۔ مگر اس سے فضیلت بالذات لازم نہیں آتی۔ بلکہ اذمیت

لے دوسرے کو نفع پہنچانا۔ لے خود اپنے لئے نفع حاصل کرنا۔ سہ۔ زیادہ تاکید والا۔

لے سب سے مقدم (پہلے)

واو کہ بیت ایک عارض کی وجہ سے ہوئی ہے کہ وہ نفع متعدی پھر نفع لازمی کی طرف مضیٰ ہوگا کہ دوسرا شخص بھی رغبت الی اللہ کرے گا۔ اور ذکر و صلوٰۃ میں مشغول ہوگا اور اگر اس پر کوئی یثرب کرے کہ شاید نفع متعدی اس لئے مشروع ہوا ہے کہ وہ نفع لازمی کے بعد پھر متعدی کی طرف مضیٰ ہو۔ اس طرح کہ دوسرا شخص بھی اپنی اصلاح کر کے تبلیغ کے قابل ہو گا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو تبلیغ کے قابل بھی وہ نفع لازمی حاصل کرنے کے بعد ہوگا کیونکہ جسکی

خود اصلاح نہ ہوئی ہو وہ دوسروں کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ پھر دوسرے کا تبلیغ کے قابل ہونا یقینی نہیں کیونکہ بعض لوگ اصلاح و تکمیل و غیرہ کے اہل نہیں ہوتے اور نفع لازمی کا اہل ہر شخص ہے۔ پس نفع متعدی پر نفع لازمی کا ترتیب یقینی ہے کہ آج ہی سے اس کا ترتیب شروع ہو جاتا ہے نفع متعدی کا ترتیب مہوم ہے کہ نہ معلوم یہ دوسروں کی اصلاح کے قابل ہوگا یا نہیں اور تجربہ یہ ہے کہ دوسروں کی اصلاح کے قابل سو میں سے ایک دو ہوتے ہیں۔

پھر قابل ہو ابھی۔ تو نہ معلوم کب ہوگا اور ہو گیا بھی تو نہ معلوم اس کو اصلاح غیر کی نوبت آئے گی یا نہیں کیونکہ بہت سے سالک نفع متعدی کے قابل ہوتے ہیں مگر ان کو اس کی نوبت ہی نہیں آتی یا کم آتی ہے تو ایسے نفع مہوم کے لئے کسی شی کا ایسا مشروع ہونا کہ وہ مقصود بالذات ہو جائے۔ از بس بعید ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ بالعرض یہ بھی مقصود ہو جائے لیکن مقصود بالذات وہی نفع ہو سکتا ہے جس کا ترتیب یقینی ہو اور اس کا ظہور بھی مہوم نہ ہو اور وہ نفع لازمی ہے جو نفع متعدی پر فوراً ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے دوسرے اگر نفع سے مقصود نفع متعدی ہوگا تو طالب کو اس مقصودیت کی اطلاع کے بعد اس کے قصد کی اجازت بھی ہوگی۔ کیونکہ مقصود کا ارادہ بھی مقصود ہوتا ہے اور مقصود کی نیت مرض تو ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر شیوخ محققین سے جو کہ مجتہدین فن ہیں جن کا فتویٰ قواعد فن سے حجت ہے ان سے پوچھئے کہ وہ طالب کو نفع متعدی کی نیت کی اجازت بھی دیتے ہیں یا نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر طالب ذکر و شغل سے مخلوق کو نفع پہنچانے کا قصد کرے گا تو اس کو کبھی فتیائے ہوگا یہ ارادہ راہ زن طریق ہے اپنی اصلاح کے زمانہ میں اس کو صرف اپنی اصلاح کا قصد کرنا چاہیے دوسروں کی اصلاح کا خیال

مانع طریق بلکہ قاطع طریق ہے اس سے اپنی اصلاح کے لئے بڑجاتے ہیں تو یہ اچھا مقصود بالذات ہوا۔ جس کا قصد کرنا راہِ زن طریق ہے۔ اب بتلائیے اس حالت میں نفع متعدی کو افضل اور مقصود بالذات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ پھر اپنی اصلاح کو تکمیل کے بعد بھی ہر شخص کو نفع متعدی کی اجازت نہیں۔ بلکہ اس کا اہل صرف وہی ہے جس کو مشائخ نے اجازت دی ہو اگر نفع متعدی اصل ہے اور یہی مقصود بالذات ہے تو تکمیل کے بعد اس کو از خود نفع متعدی میں مشغول ہونے سے کیوں روکا جاتا ہے اور اجازت شیخ کی قید کیوں لگائی جاتی ہے یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ، نفع متعدی مقصود بالذات نہیں ورنہ لازم آتا ہے کہ جن لوگوں کو نفع متعدی کی اجازت نہ دی گئی ہو وہ سب کے سب ناقص ہی ہوں حالانکہ مشائخ کے نزدیک یہ بالکل غلط ہے۔ وہ تقریر کرتے ہیں کہ کمال مقصود کا حصول اس امر پر موقوف نہیں۔

اجازت کی قید کی وجہ اور قید اجازت کا یہ راز ہے کہ امر بالمعروف کے لئے کچھ آداب ہیں جن کے قابل ہر ایک نہیں ہوتا۔ مثلاً بعضوں کو سیاست و تدبیر کا مملکہ نہیں ہوتا جس کے بغیر امر بالمعروف بجائے مفید ہونے کے موجب فتنہ و فساد ہو جاتا ہے۔ اس لئے بعض لوگوں کو گودہ درجہ کمال کو پہنچ چکے ہوں ارشاد و تلقین و نفع متعدی کی اجازت نہیں دی جاتی مگر اس سے ان کے کمال کی نفی نہیں ہوتی۔ حالانکہ نفع متعدی کا مقصود بالذات ہونا اس صورت میں نفی کمال کو مستلزم ہے جو اجماع محققین کے خلاف ہے دوسرے میں پوچھتا ہوں کہ اگر نفع متعدی مقصود بالذات ہے تو حربی دار الحرب میں اسلام لائے اور نفع متعدی پر قادر نہ ہو تو بتلائیے وہ کیا کرے نفع لازمی کو لازم بکڑے یا نفع متعدی کو۔ اگر نفع متعدی میں مشغول ہونا لازم کیا گیا تو تکلیف مالایطاق، اور اگر نفع لازمی کا اس کو امر کیا گیا تو ثابت ہوا کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں کیونکہ مقصود بالذات سے کوئی مسلمان محروم نہیں ہو سکتا یہ سب اس امر کے دلائل ہیں کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالعرض ہے۔ اور مقصود بالذات مقصود بالعرض سے افضل ہوا کرتا ہے۔

(الرغبة المرغوبہ ص ۶۷)

(۹۴) جبریل کا فرعون کے ڈوبنے کے وقت اس کے منہ میں میٹھی ٹھونسنا

اس کا علمائے نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو معلوم تھا کہ عذابِ یکتہ کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **لَكُمْ يَكْتُبُ يَنْفَعُهُمْ اَيْتَانَهُمْ** لَيْتَا رَاَوْ بَاْسًا۔ تو وہ اسلام سے نہ روکتے تھے صورت اسلام سے روکتے تھے جس پر گورحمت فی الآخرت مرتب نہیں ہوتی مگر رحمت فی الدنیا متوجہ ہو سکتی ہے جیسے منافقین صورت اسلام کے سبب قتل اور قید ہونے سے محفوظ رہے۔ اسی طرح احتمال تھا کہ وہ بھی غرق و ہلاک سے بچ جاتا۔ پھر اس پر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس وقت آیت میں بآسنا سے مراد عذاب دینا تو ہے نہیں کیونکہ عذاب دینا کی رویت قبل انکشاف آخرت قبول ایمان سے مانع نہیں۔ اور ظاہر ایہاں عذاب آخرت کا انکشاف نہ ہوا تھا ورنہ دنیا کی طرف کا احساس بالکل باطل ہو جاتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سلم نہیں بلکہ انکشاف آخرت کے بعد بھی ادھر کا احساس باقی رہنا ممکن ہے۔ چنانچہ بعض مختصرین کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو بھی دیکھا۔ اور اس کے ساتھ اپنے گھر کی عورتوں کو بھی بچانا۔ چنانچہ گھر والوں سے کہا کہ فرشتے بیٹھے ہیں تم ان سے پردہ کر دو۔ تو ابتداء انکشاف کے ساتھ ادھر کا ہوش رہ سکتا ہے۔

اور فرعون کے واقعہ سے ظاہر بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جس وقت ایمان ظاہر کیا ہے اس وقت اس کو انکشاف آخرت کے ساتھ دنیا کے بھی ہوش تھے چنانچہ اس کا قول **اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ اٰمَنْتُ بِہٖ** بَنُوْا مِمْلُکَیْکَ بَلَّار ہا ہے کہ اس وقت اسرائیل کا

لے جب وہ ہمارا عذاب دیکھیں گے تو ان کا ایمان لانان کے لئے نافع نہ ہوگا۔ لہٰذا میں اس ذات پر ایمان لایا جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے۔

حق پر ہونا اور ان کاموں ہونا اس کے خیال میں تھا اور یہ دنیا کا واقعہ ہے تو اس کو ادھر کے ہوش ضرور تھے لیکن اور معلوم ہو چکا کہ یہ انکشاف عذاب آخرت کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے بس اس دلیل سے عذاب آخرت کی نفی نہیں ہو سکتی اور یہ انکشاف مانع ہے قبول ایمان سے۔ پس اشکال رفع ہو گیا۔ اب ایک سوال رہ گیا کہ جب یہ حالت مانع ہے قبول ایمان اور ایمان نام ہے تصدیق کا اور وہ بعد انکشاف آخرت کے مقبول نہ ہتی اگرچہ زبان سے تلفظ کیا جاوے تو پھر تلفظ سے روکنے سے کیا فائدہ ہوا۔ اور اگر زبان سے اقرار کرنا کسی درجہ میں مفید بھی مان لیا جاوے تو اقرار کا قصد بھی کافی ہونا چاہیے اگرچہ کسی عذر سے عجز ہو گیا ہو۔ اور یہاں عجز ہو گیا کچھ کی وجہ سے تو وہ اقرار مفید نہ ہو گیا۔ پھر کچھ ٹھونسے سے کیا فائدہ ہوا۔

فرعون کی لغش کا محفوظ رہنا
سو اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گذر کر جبریل علیہ السلام نے ظاہری رحمت کو بھی اس کے لئے گوارا نہیں کیا اگرچہ رحمت ظاہری کا ایک گونہ ظہور لغش کو محفوظ رکھنے سے ہو گیا جیسا کہ ارشاد ہے۔ فَلْيَوْمَ مُنْجِيَةً مِّنْكَ (الایات) مگر اس پر بھی ایک سوال ہے کہ اس ظاہری رحمت میں ان کا کیا حرج تھا۔ اس کا جواب وہی ہے جس کو میں ذکر کر رہا ہوں کہ اس فعل کا منشا غلبہ بغض فی اللہ تھا۔ اس میں یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ اور بغض حق ہے ایسا بغض بدو ن غلبہ عشق حق کے ہو نہیں سکتا۔
(العیس والوعید رضا)

(۹۵) خدا تعالیٰ کی پیشین گوئی کسی مر کے متعلق
اس کو لازم نہیں کہ وہ غیر اختیاری ہو جائے

میرے پاس اس کی دلیل موجود ہے جو چند مقدمات پر مبنی ہے۔ ایک مقدمہ

۱۔ پس میں نے تجھے آج تیرے بدن کے ساتھ بجات دی۔

تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ فعل عبث سے پاک ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محقق طبیب بعد مایوسی کے دوا نہیں دیا کرتا اور اگر دیتا ہے بھی تو مرہض کو مجبور نہیں کرتا بلکہ بعض توصات کہہ دیتے ہیں کہ مرہض بچے گا نہیں اس کو دوامت دوا اور اگر کوئی محقق اس حالت میں بھی جبرا دوا دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو علم غیب نہیں۔ وہ اپنے قواعد طبیب سے اس مرض کو لاعلاج سمجھتا ہے۔ مگر سمجھنا غلطی ہے قطعاً نہیں وہ قدرت خدا پر نظر کر کے امیدوار ہے عقل در اسباب میدار دنظر عشق می گوید مسبب را نگر

مگر حق تعالیٰ تو علم غیب ہے اگر ختم اللہ علی قلوبہم سے ان لوگوں کے لاعلاج ہونے اور علاج کے غیر اختیاری ہونے پر دلالت ہوتی۔ تو یہ دلالت قطعی ہوتی کیونکہ عالم الغیب کا کلام ہے اور نفی اختیار کے ہوتے ہوئے یہ محال ہے کہ دوا پر جبر کیا جاوے کیونکہ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا دُسْعًا کے خلاف ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو دوا پر مجبور کیا ہے یا اَيْتُهَا النَّاسُ اَعْبُدُوا رَبَّكُمْ میں خطاب عام ہے اور یہ آیت مکی ہے پھر لفظ یا اَيْتُهَا النَّاسُ خود عموم کو بتلا رہا ہے جس میں تمام کفار کو توحید و ایمان اختیار کرنے کے متعلق خطاب ہے جن میں وہ لوگ بھی تھے جن کے بارہ میں ختم اللہ علی قلوبہم فرمایا گیا ہے پھر اس پر اجماع ہے کہ ابوجہل ابولہب و عیزہ ایمان کے مکلف نہ ہوں اور اس حکم سے مستثنیٰ ہوں تو پھر ان کو عذاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ یہ کہہ سکیں گے کہ حضور ہم کو جو ترک ایمان اور کفر کی وجہ سے جو ہم کو عذاب ہو رہا ہے تو اخیر زمانہ میں ہم تو حکم ایمان سے مستثنیٰ ہو گئے تھے آپ نے ختم اللہ علی قلوبہم نازل فرمایا تھا حالانکہ ان کا معذب ہونا منصوص ہے کیونکہ ختم اللہ علی قلوبہم کے ساتھ ہی ولہم عذاب عظیم بھی وارد ہے پس یہ ماننا پڑے گا کہ جن کے بارہ میں ختم اللہ علی قلوبہم فرمایا گیا ہے ایمان کے مکلف وہ بھی تھے اس لئے مستثنیٰ نہ تھے۔ اب میرا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ جن لوگوں کے متعلق ختم اللہ علی قلوبہم نازل ہوا ہے ان کا مرض روحانی لاعلاج نہ تھا۔ اگر روحانی مطلب میں کوئی مایوس العلاج ہوتا تو یہ لوگ ہوتے مگر وہ بھی مایوس العلاج نہیں تو ثابت ہو گیا کہ مرض روحانی کسی کا بھی لاعلاج نہیں۔ رہا یہ سوال کہ پھر پیشین گوئی کی کیا ضرورت تھی۔ جواب یہ ہے کہ ایک راز تھا جو حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلادیا۔ مگر اس کا بھی مطلب یہ ہے۔ لایومن ابوجہل و نحوہ مع بقاء اختیار ۵۔ کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے مگر یہ ایمان نہ لانا

ان کے اختیار سے ہوگا یہ مطلب نہیں کہ ان کو ایمان بر تقدیر اختیار ہی باقی نہیں رہا۔ خوب سمجھ لو اس سے زیادہ کلام کرنا۔ فعل فی القدر ہے جس کی اجازت نہیں۔ غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ نصوص میں کسی امر کی پیشین گوئی وارد ہونے سے اس کا خارج از اختیار ہونا لازم نہیں آتا۔ اور جب وہ اختیار ۔۔۔ سے خارج نہیں تو اس کی تدبیر کرنا فضول نہیں ورنہ اگر پیشین گوئی مانع تدبیر ہو تو چلیے کہ آج سے قرآن کے حفظ کو ترک کر دیا جائے کیونکہ قرآن میں پیشین گوئی ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لعلیٰ ان نخلو جبین حفاظت قرآن کا وعدہ ہے تو پھر نوح بالشر قرآن کا پڑھنا بھی چھوڑ دو لکھنا بھی چھوڑ دو چھاپنا بھی چھوڑ دو۔ اور جو لکھے ہوئے رکھے ہیں ان کو دفن کر دو اور کہہ دو کہ بس قرآن کا حافظ اشرہی کافی ہے ایک ہی حافظ بہت ہے اور وہ حافظ بھی کیسا جو محافظ بھی ہے جسے طریقے حفاظت کے ہیں وہ سب خود ہی کر لیں گے کیونکہ انا لعلیٰ فظون میں سب طریقے آگئے۔ مگر مسلمانوں نے آج تک ایسا نہیں کیا حالانکہ یہاں بھی تو پیشین گوئی ہو چکی ہے پھر اس کی وجہ یہاں تو آپ نے یہ تجویز کیا کہ قرآن کو حفظ بھی کیا اور لکھا بھی اور چھاپا بھی اور ان سب باتوں کو اپنے اوپر فرض بھی سمجھا۔ اور نا اتفاقی کے متعلق پیشین گوئی ہو چکی ہے تو اب علاج کی کیا ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب حفاظت قرآن کا وعدہ ہو چکا ہے تو پھر آپ کی حفاظت کی کیا ضرورت ہے۔ آپ پر بھی وہی اعتراض پڑتا ہے جو آپ اس مسئلہ میں ہمارے اوپر کر رہے ہیں۔ اس کا جواب دیجئے۔ آخر دونوں باتوں میں ماہ الفرق کیا ہے۔ فرق کا مبنی بتلائے۔ اگر آپ نہیں بتلاتے تو لیجئے میں بتلاتا ہوں آپ اس اعتراض کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ "انا لعلیٰ فظون" کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا کرتے رہیں گے جو اس کی حفاظت میں سہمی کرتے رہیں گے اور ہم حفاظت کے طریقے ان کے قلوب میں ڈال دیں گے کہ وہ اس کو یاد بھی کریں گے لکھیں گے بھی پڑھیں گے بھی جیسا کہ حفاظت قرآن کی پیشین گوئی کے بعد اپنی آپ کی حفاظت کو بھی اس میں دخل ہے۔ اسی طرح نا اتفاقی کی پیشین گوئی کے بعد بھی آپ کی تدبیر ہیزی کو اس میں دخل ہے اور پیشین گوئی کے بھی یہ معنی ہیں کہ چونکہ یہ لوگ باختیار خود بد پر ہیزی کریں گے اس لئے نا اتفاقی رہے گی۔ پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ خدا اور رسول کا کسی چیز کے متعلق پیشین گوئی کرنا اس کو مستلزم نہیں کہ وہ دائرہ تکلیف سے باہر ہو جاوے اور اس کی تدبیر نہ کی جاوے اور اس کا راز وہی ہے۔ جو

میں نے شروع میں کہا تھا کہ پیشین گوئی کبھی مرض کے لاعلاج ہونے سے کی جاتی ہے اور کبھی مر یض کے بد پر ہیزی ہونے کی وجہ سے اور امراض روحانیہ میں لاعلاج کوئی مرض نہیں یہاں جو پیشین گوئی ہوتی ہے مر یض کے بد پر ہیزی ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ (الانداد ص ۵)

(۹۶) خلافت فاروقیہ کو خلافت صدیقیہ سے کثرت فتوحات کی وجہ سے افضل سمجھنا غلط ہے

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جدید فتوحات کچھ زیادہ نہ ہوئی تھیں بلکہ ان کی خلافت کا زیادہ زمانہ خود مسلمانوں کو سنبھالنے میں صرف ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعض قبائل مرتد ہو گئے تھے کچھ لوگوں نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کر دیا تھا۔ تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت اس فتنہ از تدارک کے فرو کرنے اور مسلمانوں کی حالت سنبھالنے میں صرف ہوا۔ مخالفین کے ملک فتح کرنے کی زیادہ نوبت نہ آئی اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں شاید کوئی دن بھی جدید فتوحات سے خالی نہیں رہا۔ روزانہ یہی خبریں آتی تھیں کہ آج فلاں شہر فتح ہو گیا۔ اور کل فلاں شہر پر حملہ ہے، یہاں تک کہ دس سال کے عرصہ میں حکومت اسلامیہ شرقاً و غرباً پھیل گئی اس لئے بعض کم فہم خلافت عمریہ کو خلافت صدیقیہ سے افضل شمار کرتے ہیں مگر عقلمند خوب جانتے ہیں کہ مکان کی خوبصورتی میں زیادہ کمال اس شخص کا ہے جس نے کہ اول نقشہ تیار کیا تھا اور بنیادیں قائم کی تھیں کیونکہ اس کو بہت دماغ سوزی سے کام کرنا پڑا ہے۔ مکان کا خوبصورت نقشہ بنانا اور بنیاد کا مستحکم کرنا یہ بڑا کام ہے دیواریں قائم کرنا بوائے کا اتنا بڑا کمال نہیں کیونکہ وہ تو اینٹ پرائیڈ رکھتا چلا گیا اس کو کونسی دماغ سوزی کرنی پڑی ظاہر میں لوگ دوسرے معمار کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ مکان کو اس نے مکمل کیا۔ مگر حقیقت شناس سمجھتا ہے کہ اس مکان کی خوبصورتی بڑا کمال نہیں بڑا کمال نقشہ بنانا ہے

اور بنیاد قائم کر نیوالے کا ہے۔ اسی طرح جو اسرار شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ خلافتِ صدیقیہ سے خلافتِ عمریہ کو کوئی کبھی نسبت نہیں۔ کیونکہ حضرت صدیق اکبر کو حکومت اسلامیہ اور خلافت کی بنیاد قائم کرنے میں جو تعب برداشت کرنا پڑا ہے اس کا عشرِ عشر بھی حضرت عمرؓ کو نہیں پیش آیا۔ یہ کام اسی عالی حوصلہ خلیفہ کا تھا کہ ایسے فتنے کے زمانہ میں جب کہ خود اپنی ہی جماعت قبضہ سے باہر ہونا چاہتی تھی تمام فتنوں کا مقابلہ کر کے اور ان کو ایک دم نیست و نابود کر کے ڈھائی سال کے عرصہ میں خلافتِ اسلامیہ کے کھونٹے گاڑ دیئے اور نظامِ حکومت کو ایسے محکم اصول پر قائم کر دیا کہ بعد کے خلیفہ کو کوئی پریشانی ہی نہ پیش آسکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلافت میں وہ اصول جاری ہو گئے اور نظامِ صدیقی شائع ہو گیا۔ تو بڑا کمال حضرت صدیقؓ کا ہے۔ اور جس قدر فتوحات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہوئی ہیں ان سب کا ثواب حضرت صدیقؓ کے صحیفہ اعمال میں اخل ہو گا اہل تمدن و سیاست اس کو خوب سمجھتے ہیں کہ قانون جاری کرنے سے زیادہ مشکل قانون بنانا ہے۔ قانون بنانے والے کو جس مشقت کا سامنا ہوتا ہے جاری کرنے والے کو اس کا دسواں حصہ بھی پیش نہیں آتا۔ (الجلال والابتنار ص ۹)

(۹۷) کیا چار سو برس کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا؟

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چار سو برس کے بعد کسی کو اجتہاد کے قابل دماغ نہیں ملا کیونکہ اس پر کوئی دلیل قائم نہیں، علاوہ ازیں یہ مطلقاً صحیح بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر زمانہ میں ہزاروں ایسی جزئیات نئی نئی پیش آتی ہیں جن کا کوئی حکم ائمہ مجتہدین سے منقول نہیں اور علماء خود اجتہاد کر کے ان کا جواب بتلاتے ہیں پس اگر اجتہاد کا باب بالکل بند ہو گیا ہے اور اب کسی کا دماغ اجتہاد کے قابل نہیں ہو سکتا تو کیا ایسے نئے نئے مسائل کا جواب شریعت سے نہیں ملے گا۔ یا ان مسائل کے جواب کے لئے کوئی نیابنی آسمان سے اترے گا۔ اگر یہی بات ہے تو خدا خیر کرے کہیں قیامت، دن والے نہ سن لیں۔ کہیں یہ بات ان کے کافوں میں پڑ گئی تو مسیح موعود کے دلائل نبوت کی فہرست میں ایک اور دلیل کا اضافہ کر لیں گے پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی تکمیل ہو چکی۔ کہ دروازہ اجتہاد اگر بالکل بند کر دیا جائے تو پھر شریعت کی تکمیل کس طرح مانی جائے گی

کیونکہ ظاہر ہے کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ ان کا جواب کتب فقہ میں مذکور نہیں نہ ائمہ مجتہدین سے کہیں منقول۔

پچھلے دنوں میں ایک سوال آیا تھا کہ ہوائی جہاز نے مسائل کے جوابات میں نماز ہو سکتی ہے یا نہیں اب بتلائیے کہ اگر

اجتہاد بعد چار سو برس کے بالکل جائز نہیں تو اس مسئلہ کا شریعت میں کوئی کبھی جواب نہیں پہلے زمانہ میں نہ ہوائی جہاز تھا نہ فقہاء اس کو جانتے تھے۔ نہ کوئی محکم لکھا۔ اب ہم لوگ خود اجتہاد کرتے ہیں۔ اور ایسے نئے مسائل کا جواب دیتے ہیں تو فقہاء رحمہم اللہ کے اس قول کا یہ مطلب نہیں کہ چار سو برس کے بعد اجتہاد بالکل بند ہو گیا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اجتہاد فی الاصول کا دروازہ بند ہو گیا اور اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا اگر اجتہاد فی الفروع بھی نہ ہو سکے تو شریعت کے نامکمل ہونے کا شبہ ہو گا جو کہ بالکل غلط ہے شریعت میں کسی قسم کی کمی نہیں قیامت تک جس قدر صورتیں پیش آتی رہیں گی سب کا جواب علماء ہر زمانہ کی شریعت سے نکالتے رہیں گے کیونکہ یہ جزئیات اگر کتب فقہ میں نہیں تو اصول و قواعد سب سے پہلے مجتہدین بیان کر چکے ہیں جن سے قیامت تک کے واقعات کا حکم معلوم ہو سکتا ہے۔

المبتد قرآن و حدیث سے اصول مستنبط کرنا یہ اب اجتہاد فی الاصول کی بندش نہیں ہو سکتا یہ خاص اجتہاد فی الاصول بعد چار سو برس کے ختم ہو گیا کیونکہ ادل تو جس قدر

اصول و قواعد شریعت کے تھے وہ سب ائمہ مجتہدین بیان کر چکے انہوں نے کوئی قاعدہ چھوڑ نہیں دیا۔ دوسرے ان کے بعد اگر کسی نے اصول مستنبط بھی کئے تو وہ مستحکم نہیں۔ کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد فی الاصول کے لئے اب مایہ قابل ہی نہیں رہے یہ حضرات مجتہدین ہی کا خاص حصہ تھا کہ انہوں نے نصوص سے اس خوبی سے اصول مستنبط کئے جو کہیں نہیں ٹوٹ سکتے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ ہدایہ کے اصول مسلم نہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہدایہ غیر معتبر کتاب ہے اس میں اصول غلط نقل کر دیئے گئے ہیں۔ بلکہ شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ صاحب ہدایہ نے بعض اصول خود شریعت سے مستنبط کئے ہیں جن میں وہ ناقل نہیں ہیں سو وہ معتبر

نہیں باقی جزئیات اس کی سب معتبر ہیں۔ تو اب دیکھ لیجئے کہ صاحب ہدایہ باوجودیکہ بہت ہی بڑے شخص ہیں ان کی علمی شان ہدایہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ واقعی اس کتاب میں بھی انہوں نے کمال کر دیا ہر مسئلہ کی دو دلیلیں بیان کرتے ہیں ایک عقلی۔ ایک نقلی۔ کیا ٹھکانا ہے وسعت نظر کا کہ جزئیات تک کو حدیث سے ثابت کرتے ہیں پھر حدیثیں گوبلا سند بیان کرتے ہیں مگر تقشیش کرنے سے کہیں نہ کہیں ضرور ملتی ہیں چاہے سند بڑا زین ہوں یا مسند عبد الرزاق میں۔ یہی ہیں ہوں یا مصنف ابن ابی شیبہ میں۔ کہیں ضرور ملیں گی ایک دو اگر نہیں تو ممکن ہے مگر جس شخص کی نظر اس قدر وسیع ہو تو ایک دو حدیث جو ہم کو نہ ملی ہو اس سے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی اصل ہی نہیں۔ یہ تو وسعت نظر کا حال ہے فہم کا تو کیا ٹھکانا ہے مخالفین کے دلائل کو بیان کرنا ان کا جواب دینا پھر اپنے مذہب کی دلیل بیان کرنا یہ ان کا خاص حصہ ہے مگر بایں ہمہ جو اصول کو خود حدیث و قرآن سے نکالتے ہیں ان کی بابت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فیصلہ فرمادیا کہ وہ معتبر اور مسلم نہیں ہیں کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹے ہیں تو اجمال جن لوگوں کی وسعت نظر و فہم کو صاحب ہدایہ سے کچھ بھی مناسبت نہیں وہ کیا حدیث و قرآن سے اصول مستنبط کریں گے۔

اجتہاد فی الفروع بانی ہے

ہاں البتہ اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آسکتا کہ ہم بھی امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی طرح مجتہد ہو گئے کیونکہ اصحاب

سیاست خوب جانتے ہیں کہ قانون بنانا قانون جاری کرنے سے بہت زیادہ دشوار ہے ہم لوگ سوائے اس کے کہ ان حضرات کے استنباط کردہ اصول کو حوادث الفتاویٰ میں جاری کر دیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ کمال انہیں حضرات کا تھا کہ انہوں نے حدیث و قرآن میں غور کر کے ایسے اصول و قواعد سمجھے جو قیامت تک کے جزئیات کے لئے کافی ہیں کوئی مسئلہ ایسا پیش نہیں آسکتا جس کا حکم جواز و عدم جواز ان اصول سے نہ نکلتا ہو بلکہ ان حضرات نے صرف اصول و قواعد ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ جزئیات بھی اس قدر نکال کر بیان کر گئے ہیں کہ بہت ہی کم کوئی مسئلہ ہوتا ہے جس کو وہ صراحت یا دلائل بیان نہ کر گئے ہوں اور اگر کوئی شاذ و نادر ایسا مسئلہ معلوم ہوتا ہے جو فقہاء نے نہیں بیان کیا تو کبھی توفیق کی نظر کی کوتاہی ہوتی ہے کہ اس کو سب مواقع پر عبور نہیں ہوتا۔ یا فہم کی کمی ہوتی ہے کہ وہ مسئلہ عبارت سے نکل سکتا ہے مگر مفتی صاحب

کی سمجھ میں نہیں آیا اور اگر بالفرض جرئیہ انہوں نے نہیں بیان کیا تو اصول سے تو وہ ضرور ہی مستنبط ہوتا ہو گا پس آجکل یہ کسی کا منہ نہیں کہ اپنے کو ائمہ مجتہدین کے برابر کر سکے۔
(الجلار لارجلار صلا)

(۹۸) علم الاعتبار نکات و لطائف کے درمیں ہے

اور علوم جو بزرگوں نے قرآن سے نکالے ہیں ان کو یہ کہیں گے کہ منطبق علی القرآن ہیں مدلول قرآن نہیں ہیں یوں کہیں گے ثابت القرآن ہیں ہاں منطبق موافق کہیں گے۔ اور مدلول اور منطبق میں بڑا فرق ہے ایک مثال سے آپ کو اس کا فرق ظاہر ہو گا فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس حجام آیا اور اس نے کہا کہ خط بنوایں مجھے اس نے جواب دیا کہ بڑھنے دو اتفاق سے جس وقت اس نے یہ جواب دیا تھا لڑکے والوں کی طرف سے دُوم بھی انکی لڑکی کی شادی کا خط لیکر آیا۔ وہ بھی اتفاق سے اس جواب سے اپنا مطلب نکال لے تو یہ جواب بڑھنے دو، دونوں سوالوں کا ہو سکتا ہے اول اس سوال کا اس طور پر کہ خط بڑھنے دو جب بڑھ جائے گا بنوایں گے دوسرے سوال کا اس طور پر کہ لڑکی ابھی چھوٹی ہے اس کو بڑھنے دو۔ پہلے معنی کو تو مدلول کہیں گے اور دوسرے کے مدعا پر اس کو صرف منطبق کہیں گے۔ قصہ تو یہ تھا کہ نالی کو جواب دیں لیکن یہ کلام کی لطافت ہے کہ وہ دُوم کا بھی جواب ہو گیا بس اس کو نکتہ اور لطیفہ کہہ سکتے ہیں یہاں سے ایک بات اور کام کی سمجھ میں آئی وہ یہ کہ صوفیہ کرام نے آیات کے متعلق کچھ بصورت تفسیر کے کہا ہے مثلاً اِذْهَبْ إِلَىٰ ذِي الْعَرْسِ الْمُنْتَهَىٰ کے متعلق لکھا ہے۔ اِذْهَبْ اِيهَا الرِّجَالُ إِلَىٰ النَّفْسِ الْمُنْتَطَفِیَّةِ وَادْبَحُوا بِقِرَةِ النَّفْسِ تَوَانِ تَادِيلُوهَا كَوْدِيْكُمْ كَرْدُ جَاعَتِيں ہو گئی ہیں ایک تو جو صوفیہ کی محبت سے خالی ہیں اور بحاصل النصوص علیٰ ظواہرہا کے پورے پابند ہیں انہوں نے تو ان تادیلات کا بالکل انکار کر دیا کہ کہاں فرعون کہاں نفس۔ کہاں موسیٰ کہاں روح۔ یہ تو ایسا ہے کہ زمین بول کر آسمان مراد لیلیں اور صوفیہ کو اس بنا پر منال و محرف کہہ کر ان کے منکر ہو گئے کہ ان کو تو یہ ضرور ہوا کہ حضرات اہل اللہ کے برکات سے محروم ہوئے۔ دوسرے وہ تھے جو ان حضرات کی محبت میں عرق ہیں وہ یہ کہنے لگے

قرآن کا مدلول اور تفسیر یہی ہے علامہ غلام غفران نے فرمایا کہ اس میں تو سارا قصہ باطن کا ہے پھر اس بات میں غافلین کا یہاں تک غلو بڑھا کہ بعض جگہ تو انہوں نے قرآن مجید کی گت ہی بنا دی ہے۔ وائسرائر یہ لوگ بالکل ہی برباد ہوئے خدا کی قسم ہے کہ قرآن کا یہ مدلول ہرگز نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روزہ نماز سب اٹھ گیا اس لئے کہ تمام نصوص کے مدلولات کو بلکہ تمام شریعت کو ان لوگوں نے بدل دیا۔ لیکن اس وقت کلام ہے صوفیہ محققین کی تاویلات و اشارات میں۔ سو اس میں بعضے تو ان کے ہی منکر ہو گئے اور بعض حشرین کے منکر ہو گئے۔

اب رہ گئے ہم بیچ میں کہ ہم قرآن کو کلام اللہ اور صوفیہ کو اہل اللہ جانتے ہیں۔ تو دونوں کی اعانت و حفاظت کے لئے ضرورت ہوئی کہ ان تاویلات کو ایسے معانی پر محمول کیا جاوے کہ کلام اللہ کی بھی تحریف نہ ہو اور اہل اللہ کا کلام بھی خلل نہ آوے شرعیہ نہ ہو۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ صوفیہ کرام نے جو آیات کے معنی بیان کئے ہیں یہی ان واقعات تفسیر نہیں ہے اور نہ وہ حضرات مدلول ظاہری کے منکر ہیں ان کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ قرآن میں فرعون سے نفیس اور موسیٰ سے روح اور بقرہ سے نفس مراد ہے جو کچھ وہ فرما رہے ہیں یہ علم اعتبار کہلاتا ہے اور علم اعتبار یہ ہے کہ دوسرے کے حال پر اپنے حال کو بھی قیاس کر داس کی اسی مثال ہے جیسے زید نے ایک کام عمر کو دیکھا دیکھی کیا اور اس میں اس کو نا کامی ہوئی۔ تو اس موقع پر کہتے ہیں کہ کو اچلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ تو اس کلام میں کوئے سے مراد زید اور ہنس سے مراد عمر یقیناً نہیں ہے۔ کوئے سے کوئے مراد ہے اور ہنس سے ہنس ہی مراد ہے۔ اور حاصل اس کا یہ ہے کہ دو موقعے ایک حالت کے اندر متطابق ہیں۔ ایک موقع پر جو نظر پڑی تو دوسرا موقع اس کو دیکھ کر یاد آگیا اور ایک کو دوسرے کے ساتھ تشبیہ دیدی۔ مثلاً یہاں زید و عمرو اور ان کے قصے کو کوئے اور ہنس سے تشبیہ دیدی پس اذہب ایہا الروح الخ سے مراد یہ ہے کہ قاری صاحب تو قرآن پڑھے۔ اور یہاں پہونچے تو اس قصے سے یہ سبق لو کہ تمہارے اندر بھی ایک چیز فرعون کے مشابہ اور ایک چیز موسیٰ کے مشابہ ہے قصے کو قصے ہی کے طور پر سمجھو بلکہ قرآن شریف کے ہر موقع سے اپنی حالت پر مطابقت کرتے جاؤ اور اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کرتے جاؤ۔ یہ مطلب ہے صوفیہ کرام کا۔ پس دونوں فرقے غلطی پر ہیں جو ان تاویلات کا بالکل انکار کرتے ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں اور جو ان کو تفسیر اور مدلول قرآنی قرار دیتے ہیں وہ تو بالکل

ہمارا طریقہ کار

ہی گئے گذرے ہیں یہ تاویلات اور لطائف اور نکات کے درجے میں ہیں۔ تفسیر نہیں ہیں اور ان کو علوم قرآنیہ نہیں کہہ سکتے علوم قرآنیہ وہی ہیں جن پر عبارت النص یا اشارۃ النص یا اقتضار النص یا دلالتہ النص سے استدلال ہو سکے ورنہ نکات و لطائف کا درجہ ہے۔

(الاتفاق منہ)

(۹۹) تبلیغ کو سیاسی اغراض کی وجہ سے ترک کرنا جائز نہیں۔

اب دیکھنا چاہئے کہ اس باب میں ہماری کیا حالت ہے اور ہم کو اس طرف توجہ ہے یا نہیں۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ادھر بالکل توجہ نہیں۔ اعتقاداً تو اس کو مامور بہ سمجھتے ہیں بلکہ اگر اس میں غور بھی کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس درجہ کا یہ مامور بہ ہے اس درجہ سے بہت کم سمجھا جاتا ہے اس کو درجہ وجوب میں سمجھنے والے تو بہت ہی کم ہوں گے۔ کوئی مستحب سمجھتا ہے کوئی مستحسن۔ اور غضب یہ کہ مستحسن سمجھنے میں بھی قید لگاتے ہیں کہ مستحسن بھی جب ہے کہ کسی مصلحت سیاسیہ وغیرہ کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ وہ بھی نہ وارد۔ اول تو یہی غضب تھا کہ بعض نے واجب کو مستحب سمجھا۔ پھر یہ دوسرا غضب ہے کہ اس میں یہ قید لگا دی کہ مصلحت کے خلاف نہ ہو۔ وہ کیوں؟ محض اپنے اغراض کے سبب۔ کیونکہ دینی کاموں میں بھی لوگ اول اغراض کی طرف دیکھتے ہیں کہ مسئلہ ان اغراض کے موافق ہے یا مخالف پھر وہ غرض جہاں فوت ہونے لگی کہہ دیا کہ اس وقت یہ کام مصلحت کے خلاف ہے لہذا مستحب بھی نہیں رہا۔ اب اس کو اصلاً مامور بہ نہیں سمجھتے بلکہ عجیب نہیں کہ ایک دن کسی مصلحت کی وجہ سے مامور یہ کو منہی عنہ بتلانے لگیں انہوں نے مسلمانوں سے یہ نہیں ہونا کہ اغراض کو احکام کے تابع بنائیں کہ اصل تو یہی ہے وہ سر انجام پائے پھر اغراض خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں۔ منکر انہوں نے یہ نہیں کرتے۔

بلکہ بعض نے تو اغراض نفسانی کو پورا کرنے کے لئے کہ دعوت الی الاسلام کا نام فتنہ اور فساد رکھا ہے اور یہی وجہ ہے بے رحمی

لوگوں کا حال

کی کہ اس میں انہیں غرض کی وجہ سے بے حد تساہل کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنی آنکھ سے بھی دیکھیں کہ کسی نے نماز میں تعدیل ارکان نہیں کی۔ اور ایسے بہت نکلیں گے تو ہماری یہ بہت نہیں ہوتی کہ اس سے اتنا کہیں کہ صل فانک لم تقبل۔ اور اس کی وجہ صرف اتباع ہوا ہے اس لئے باوجود علم کے محض دقیق تالیس گھر لیتے ہیں مگر خدا کے ساتھ یہ حیلہ و تزویر چل نہیں سکتا۔ بل الانسان علی نفسه بصيرة ولو القى معاذیرہ۔ اگر انصاف سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اصل میں دنیا کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے امر بالمعروف نہ کرنے کی وجہ فقط اتنی ہے کہ اس سے دنیاوی اغراض فوت ہوتے ہیں دوستی نہیں رہے گی میل ملاپ نہ رہے گا ہنسی خوشی جاتی رہے گی اگر ہم نے کسی کو ٹوکا تو وہ ناخوش ہو جائے گا پھر ناخوش ہو کے آزار کے درپے ہو جائے گا پھر آزار سے ہم کو تکلیف ہوگی۔ اور یہ آزار و تکلیف بھی سب دہمی ہے۔ ایسے مواقع کے متعلق ذرا علماء سے تو دریافت کر لو کہ صاحب امر بالمعروف میں اگر ایسی باتیں پیش آئیں تو ایسی حالت میں ہم معذوریں یا نہیں۔ ان سے پوچھو تو کون کون سی چیزیں مسقط وجوب امر ہیں۔

امر بالمعروف کے آداب میں یہ نہیں کہتا کہ اس کا کوئی طریقہ ہی نہیں۔ اس کے لئے کوئی شرط و ضابطہ ہی نہیں ہے۔ برابر ہے اور ضرور ہے

مگر شرائط و ضوابط و آداب و اعذار علماء سے دریافت کرو۔ خود مفتی بن کر کیوں فتویٰ لگالیا کہ ہم تو معذوریں اور سچی بات تو یہ ہے کہ شرائط آداب کا طالب حقیقی بھی وہی ہوگا جس نے پکارا ارادہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کر لیا ہو۔ اس کو البتہ حق ہے شرائط و ضوابط پوچھنے کا۔ وہ اگر آداب و اعذار معلوم کرے تو اس کو سب کچھ بتلا دیا جاوے گا باقی حالت موجود ہیں جبکہ اس کی طرف توجہ اور التفات ہی نہیں اس حالت میں آپ کو اعذار و شرائط پوچھنے کا اور سمجھنے کا بھی حق نہیں جو شخص کام کا ارادہ بھی نہ کرے اس کو نہ شرائط و ضوابط بتلائیے جائیں گے اور نہ اس کو آداب و اعذار پوچھنے کا حق ہے وجہ یہ ہے کہ وہ تو شرائط و اعذار اس لئے تلاش کرے گا تا کہ امر بالمعروف کرنا نہ پڑے بلکہ کسی طرح اس سے مخلصی اور رہائی مل جائے جب اعذار معلوم ہو جائیں گے تو کوئی نہ کوئی بات تراش لے گا کہ مجھ میں یہ عذر موجود ہیں یہ شرطیں مجھ میں نہیں پائی جاتیں ہم کیسے امر بالمعروف کریں اس لئے علماء کو چاہیے کہ قبل از شروع عمل کسی کو اعذار و شرائط

بتلایا ہی نہ کریں جیسے کوئی شخص نماز کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو اور علماء سے پوچھتا ہے کہ نماز کے شرائط و اعذار نہ بتانا چاہیے ورنہ وہ تو مسقط مصلوٰۃ کو ہر حالت میں تلاش کرے گا۔ ہر وقت اسی دھن میں رہے گا کہ کوئی بات ایسی ہو جس سے نماز پڑھنے سے چھٹی مل جائے۔ البتہ جس کا ارادہ ہو پڑھنے کا وہ پوچھے تو اس کو بیشک بتلا دیا جاوے لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ محض مخلصی کا متلاشی ہے تو مفتی کو چاہیے کہ ایسے شخص کو ہرگز جواب نہ دے بلکہ میرے نزدیک ایسوں کو اعذار و موانع کی اطلاع کرنا جائز بھی نہ ہوگا۔ (آداب التبلیغ ص ۶)

(۱۰۰) حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ کے اناکھن کہنے کا راز۔

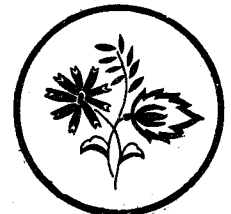
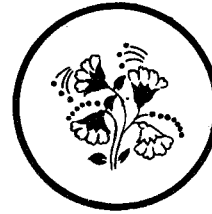
وہ اناکھن خود نہ کہہ رہے تھے بلکہ اس وقت ان کی وہ حالت تھی جیسے شجرہ موسیٰ سے آواز آئی تھی۔ اِنَّا اَنَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ کو آواز شجرہ ہی سے نکل رہی تھی چنانچہ خود رض میں تصریح ہے مُوَدِّیْ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِیْ اَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبَارَکَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یَّامُوْسٰی۔ تو کیا شجرہ خود کہہ رہا تھا۔ اِنَّا اَنَّا اللّٰهُ ہرگز نہیں ورنہ شجرہ کا رب ہونا لازم آئے گا اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ آواز شجرہ میں سے نہیں نکلی تھی بعینہ صوت حق تھی کیونکہ حق تعالیٰ صوت سے پاک ہیں اور یقیناً موسیٰ علیہ السلام کو صوت ہی مسموع ہوئی تھی جو سمت خاص اور مکان خاص کے ساتھ مقید تھی۔ تو اس کو حق تعالیٰ نے وادی ایں اور بقعہ مبارکہ اور من الشجرہ کے ساتھ مقید کیا ہے ورنہ کلام حق بعینہ ہوتا تو ان تیرے مقید نہ ہوتا۔ پس ماننا پڑے گا کہ وہ آواز تو شجرہ ہی کی تھی اور اسی میں سے نکلی تھی مگر وہ حق تعالیٰ کی طرف سے متکلم تھا خود متکلم تھا۔ جیسے قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے فَاذْخُرْنَا فَاَنْتَیْمُ قُرْآنًا کہ جب ہم قرآن پڑھا کریں تو آپ قرأت کا اتباع کیجئے۔ یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی صوت کو سنتے تھے۔ اور خدا کے تعالیٰ صوت سے منزہ ہیں پھر اس قرآن کا کیا مطلب ہے ہی کہا جاتا ہے کہ یہاں قرأت جبریل کو قرأت حق کہا گیا ہے کیونکہ وہ حکم حق قرأت کرتے تھے ایسے ہی

یہاں بھی قول بخیرہ کو قول حق کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے جو کچھ کہا تھا بحکم حق کہا تھا پس یونہی منصور کے انا الحق کو خدا تعالیٰ کا قول کہنا چاہیے کیونکہ غلبہ حال میں کلام حق ان کی زبان سے نکلا تھا وہ بھی منظم بحکم حق تھے خود متکلم نہ تھے۔

ایک بزرگ کا واقعہ چنانچہ ایک بزرگ کے واقعہ سے اس کی تائید ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک بزرگ نے حق تعالیٰ سے سوال کیا کہ منصور نے بھی اپنے خدا کو خدا کہا تھا اور فرعون نے بھی۔ وہ تو مقبول ہو گئے اور یہ مردود ہو گیا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ جواب ارشاد ہوا کہ منصور نے اپنے کو مٹا کر انا الحق کہا تھا اور فرعون نے ہم کو مٹا کر انا ربکم الاعلیٰ کہا تھا اس کا یہی مطلب ہے کہ منصور نے جو کچھ کہا تھا خود نہ کہا تھا کیونکہ وہ خود ہی کو مٹا چکے تھے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۴

گفت فرعون نے انا الحق گشت پست گفت منصور انا الحق گشت مست
لعنت اللہ آں انار اور رفت رحمتہ اللہ ایں انار در و رفت

(المودة الرحمانہ ص ۳)



دستار علی ابن مختار علی۔

مالک مکتبہ تہانوی دیوبند سہارنپور۔

فہرست مضامین حصہ سوم

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۰۳	کافر کو عذاب الٰہی ہونے پر شبہ کا جواب	۲۹۳	آسمان کے وجود پر دلیل
	احکام شریعت کی علتیں دریافت کرنا	۲۹۳	فلاسفہ کے دلائل مخدوش
	اس بات کا ثبوت ہے کہ قلب میں عظمت	۲۹۳	شریعت سائنس متصادم نہیں
۳۰۳	حق نہیں۔	۲۹۳	جدید تعلیم یافتہ کا اسباب علم کو مؤثر
	احکام شریعت کو مصالح دنیوی کی بنا	۲۹۵	حقیقی سمجھنا صحیح نہیں۔
۳۰۵	قرار دینا خطرناک مسلک ہے۔	۲۹۵	ایک مثال
۳۰۶	وضو کا انکار	۲۹۵	مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔
۳۰۶	قربانی پر اعتراض	۲۹۶	باگل کا دعویٰ
۳۰۷	قانون عقل پر حاکم ہے	۲۹۶	خدا کا منکر بھی باگل ہے
۳۰۷	قربانی کا مقصد	۲۹۶	مسلمانوں کی حالت
	کعبہ کا بعض بزرگوں کے استقبال	۲۹۷	کثرت رائے کلیتہً حق ہونے کی دلیل نہیں
	کیلے جانے کی تحقیق، اور اس پر	۲۹۸	کثرت رائے کی کوئی حقیقت نہیں
۳۰۸	شبہات کا جواب۔	۲۹۹	صدیق اکبر رضی عنہ کی عزیمت
	جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اس غلطی کا جواب	۲۹۹	حضرت عمرؓ کو جواب دیا
۳۰۹	کہ اسلام میں سلطنت جمہوری کی تعلیم ہے	۳۰۰	مکہ معظمہ میں ہزاروں جانوروں کا ذبح
۳۱۰	خدا کے یہاں پریس کہاں ہے	۳۰۰	ہو جانا کیا خلاف عقل ہے؟
۳۱۰	قانون کی پابندی	۳۰۱	قربانی کی حقیقت
۳۱۱	پارلیمنٹ کی حیثیت	۳۰۱	جماعت غلام کو نکما سمجھنا صحیح نہیں
۳۱۲	ایک زمانہ میں دونوں	۳۰۱	مضویٰ اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے دیکھنے پر شبہ کا جواب
۳۱۲	قصہ سامری	۳۰۲	

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۲۹	علماء ہند	۳۱۳	تابع اور قبوع
۳۳۰	ایک واقعہ	۳۱۳	شخصی حکومت
۳۳۰	ایک رئیس کا قصہ	۳۱۲	سرسید اور مولانا حمیدین میں مکالمہ
۳۳۱	انسانی کوشش	۳۱۴	کثرت رائے پر
۳۱۵	ہربات کی دلیل قرآن شریف سے طلب	۳۱۵	شخصی سلطنت
۳۳۲	کرنا غلطی ہے۔	۳۱۵	حضرت بریرہ رض کا واقعہ
۳۳۲	ایک عام غلطی	۳۱۶	مشورہ کا درجہ
۳۳۲	ایک مثال	۳۱۶	مشورہ پر عمل ضروری نہیں
۳۳۳	شریعت کے دلائل	۳۱۶	امن عام مکمل طور پر دین پر قائم ہونے سے
۳۳۳	حدیث رسول ص	۳۱۶	ہی حاصل ہو سکتا ہے۔
۳۳۳	اجماع امت	۳۱۸	عقائد
۳۳۴	قیاس	۳۱۹	مذہبی طاقت کی مثال
۳۳۴	صحیح دلیل	۳۱۹	خوف خدا کا اثر
۳۳۴	آزادی کے معنی	۳۲۰	اعمال کا دخل
۳۲۵	اس اعتراض کا جواب کہ علماء کو لیکچر دینا نہیں آتا۔	۳۲۰	خدا کی خدائی پر اعتقاد کا نتیجہ
۳۳۶	سادگی	۳۲۰	اعمال دین کے اثرات
۳۳۶	سادگی کے ساتھ صفائی	۳۲۲	عقائد و اعمال کی خاصیت
۳۳۶	اردو زبان کی خصوصیت	۳۲۳	دین میں تنگی اور دشواری نہیں ہے
۳۳۶	اصل اردو	۳۲۳	ایک حکایت
۳۲۵	ہم تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج نہیں ہیں	۳۲۳	دشواریوں کی قسمیں
۳۲۶	حضور صلی اللہ علیہ وسلم امریکہ تشریف نہیں لے گئے تو پھر حضور ص کی بعثت عام کیسے ہوئی؟	۳۲۵	ایک مثال
۳۲۸		۳۲۶	ایک اشکال اور اس کا حل
۳۲۸		۳۲۸	بندگی سے قوت آتی ہے
۳۲۹		۳۲۸	چاندی کا مسئلہ

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۲۸	انسان محتاج محض ہے	۳۲۰	جب انسان کی تقدیر میں یہ لکھ دیا گیا
۳۲۹	محتاجی کی وجہ	۳۲۰	کہ وہ فلاں گناہ کرے گا تو پھر انسان مجرم کیوں؟
۳۲۹	اللہ تعالیٰ محتاج نہیں	۳۲۱	اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے سلطنت
۳۲۹	شام ہزارہ ایران کا واقعہ	۳۲۱	چھین کر کفار کو کس لئے دیدی۔
۳۵۰	اس حکایت کا خلاصہ	۳۲۲	اس اعتراض کا جواب کہ سود کے بند
۳۵۰	پردہ مروجہ پر اعتراض کا جواب	۳۲۲	کر دینے سے ہماری قوم پر تباہی
۳۵۱	عورت کا پردہ	۳۲۲	اگرگی۔
۳۵۱	پردہ تعلیم کیلئے مضر نہیں	۳۲۲	ترقی خوش معاہدگی میں ہے
۳۵۲	پردہ کی وجہ	۳۲۲	بد معاہدگی کا انجام
۳۵۲	پردہ کی اہمیت	۳۲۳	کیا تمام علوم قرآن شریف میں ہیں
۳۵۳	خود سرور کائنات کا عمل	۳۲۳	ہر تحقیق کی جستجو قرآن میں
۳۵۳	حضرت یوسف علیہ السلام کا قول	۳۲۳	درست نہیں۔
۳۵۴	نفس کی پاکی کا دعویٰ	۳۲۴	اس شبہ کا جواب کہ زکوٰۃ دینے
۳۵۴	ازواج مطہرات کا پردہ	۳۲۴	سے مال کم ہوتا ہے بڑھتا کہاں ہے۔
۳۵۴	علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں	۳۲۴	اس شبہ کا جواب کہ دیندار لوگ
۳۵۵	ترقی محمود مطلوب ہے	۳۲۴	مصائب میں زیادہ مبتلا رہتے
۳۵۶	علماء پر غلط الزام	۳۲۴	ہیں۔
۳۵۶	ریل کا ایک واقعہ	۳	اہل اللہ کا حال
۳۵۶	علماء بتانے والے ہیں	۳۲۶	ناول بینی کی مضرتیں
۳۵۸	انسان کا مقصد	۳۲۶	ناول زیادہ نقصان دہ ہے
۳۵۸	عزت و مال مطلوب ہیں	۳۲۸	اس شبہ کا جواب کہ قرآن مجید میں
۳۵۹	حکایت وزیر بھوپال	۳۲۸	نکار مضامین کیوں ہے
۳۵۹	دین سے بے رغبتی	۳۲۸	نکار مضامین کی وجہ
۳۶۰	اس تکیہ کلام اور مشہور اعتراض کا جواب کہ فلاں بات خلاف عقل ہے		

آسمان کے وجود پر دلیل

اہل سائنس کا دعویٰ ہے کہ آسمان کا وجود نہیں، ستارے سب فضا میں گھوم رہے ہیں، تو دیکھو یہ مسئلہ طنی ہے یا یقینی، تو سائنس کی رو سے علم قطعی طور سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ آج تک جتنی دلیلیں نفی آسمان پر قائم کی گئیں ان سب کا خلاصہ عدم العلم ہے جو کہ عدم وجود کو مستلزم نہیں اور وجود آسمان دلیل قطعی سے ثابت ہے کیونکہ وجود آسمان فی نفسہ ممکن ہے یعنی آسمان کا وجود عدم دونوں عقلاً برابر ہیں اور یہ عقلی مقدمہ ہے کہ جس ممکن کے وجود کی خبر کوئی تجربہ قطعاً صادق ہو، دیتا ہو تو اس ممکن کا وجود ثابت قطعی ہوتا ہے۔ اور اس کے وجود کی خبر ایک تجربہ صادق یعنی قرآن شریف نے دی ہے۔ پس ان تینوں مقدموں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی کہ آسمان موجود ہے۔ اور آسمان کے ممکن الوجود ہونے کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ جب یہ عقلاً ممکن ہے یعنی نہ واجب ہے اور نہ ممنوع، پس نہ ضروری الوجود ہوا نہ ضروری العدم تو عقل اس کے وجود یا عدم کی بابت کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اگر کہا جاسکتا ہے تو صرف اس قدر کہ ہم کو از روئے عقل وجود کا پتہ نہیں چلا اور معلوم ہے کہ عدم ثبوت اور ثبوت العدم میں زمین اور آسمان کا فرق ہے امریکہ کا وجود جس وقت تک ہم لوگوں کو ثابت نہ تھا اس وقت تک بھی ہم یوں نہیں کہہ سکتے تھے کہ امریکہ موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا تھا کہ ہم کو وجود امریکہ کا علم نہیں ہے۔ پس اہل سائنس یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو آسمان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا اور یہ ہم کو مضر نہیں کیونکہ ہم تقریر سابق سے آن کو وجود آسمان تسلیم کرادیں گے۔ البتہ اس کے ضروری الوجود نہ ہونے پر شبہ ہوتا ہے کہ اہل یونان نے وجود آسمان پر عقلی دلائل قائم کئے ہیں۔

لے نہ ہونا آسمان کے نہ ہونے سے علم کا نہ ہونا بلکہ خبر دینے والا

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۶۰	اس رائے کا جواب کہ مولوی سب	۳۶۰	اسلئے قابل قبول نہیں۔
۳۶۱	باہم متفق ہو جائیں تو سارا باہمی نزاع	۳۶۱	انسان کی پیدائش
۳۶۲	دور ہو جائے۔	۳۶۲	خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق
۳۶۳	اختلاف کی وجہ	۳۶۳	خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق
۳۶۳	دو عورت میں مساوات اور اس	۳۶۳	لوگوں کا موجودہ ذوق
۳۶۴	کا فیصلہ۔	۳۶۴	دینی اموری کی دلیل
۳۶۴	مرد و عورت کی خلقت میں فرق	۳۶۴	پل صراط پر چلنا
۳۶۸	تعلیم یافتوں کا حال	۳۶۴	کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر
۳۶۸	انتظام کا تقاضا	۳۶۵	موقوف نہیں۔
۳۶۹	عورتوں کو حاکم بنانا	۳۶۵	پل صراط کیا ہے
۳۸۰	اس شبہ کا جواب کہ غیر مسلم اگر مہذب	۳۶۶	دنیا میں اختلاف حالات
۳۸۱	ہوں تو ناجی کیوں نہیں۔	۳۶۶	ایک حدیث کی تشریح
۳۸۱	غیر مسلم کے ناجی نہ ہونے کی وجہ	۳۶۸	شریعت پر عمل
۳۴۹	حصہ سوم ختم شد	۳۴۹	عقل کی مثال
۳۴۹		۳۴۹	قانون سلطنت کیوں مانتے ہیں
۳۵۰		۳۵۰	کہیں عقل کو چھوڑنا بھی چاہیے
۳۵۱		۳۵۱	رسول ماننے کا حاصل
۳۵۱		۳۵۱	عقل کو چھوڑنا پڑتا ہے
۳۵۲		۳۵۲	محض عقل کافی نہیں ہے
۳۵۲		۳۵۲	افراط عقل کا نتیجہ
۳۵۳		۳۵۳	قوت شہوانیہ
۳۵۳		۳۵۳	قوت غضبیہ
۳۵۳		۳۵۳	اخلاق پسندیدہ
۳۵۴		۳۵۴	شریعت کی نزاکت

فلاسفہ کے دلائل مخدوش | اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ یونان کے دلائل قریب قریب سب مخدوش ہیں

جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں، واقعیت یہی ہے کہ عقل سے نہ آسمان کا وجود ثابت ہوتا ہے نہ عدم، رہی یہ بات کہ علی العموم اس نیلگوں رنگ کو جو جانب فوق میں نظر آتا ہے آسمان سمجھا جاتا ہے۔ اور آج یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ نیلگوں رنگ آسمان نہیں ہے۔

اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ اول تو جن دلائل سے یہ ثابت ہوا ہے۔ وہ خود ابھی مخدوش ہیں اور بنا بر الفاسد علی الفاسد ہے۔ دوسرے اگر ثابت ہو چکے ہوں گے کہ یہ رنگ آسمان نہیں ہے تب بھی اس سے عدم وجود آسمان نہیں ثابت ہوتا۔ ممکن ہے کہ آسمان اس سے آگے ہو۔

شریعت سے سائنس متصادم نہیں | پس یہ کہنا کہ آسمان کا وجود جو کہ شریعت سے ثابت ہے

ہے دلائل سائنس سے متصادم ہے سخت غلطی ہے کیونکہ سائنس اس میں بالکل ساکت ہے اور قرآن شریف ناطق، اور تضادم و تعارض ناطقین میں ہوتا ہے۔ ساکت و ناطق میں نہیں ہو سکتا۔ اور جب تعارض نہیں ہے تو سمار کی تفسیر کو اکب یا ما فوتنا وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں اور یہ تفسیر یقیناً تحریف ہوگی۔ اور ایسے تحریفین کی بابت یہ کہنا صحیح ہے کہ انھوں نے وحی کو معیار نہیں بنایا کیونکہ باوجود وحی کو ماننے کے اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی۔

(تقویم الزیغ ص ۱۱)

(۲) جدید تعلیم یافتہ کا اسباب علم کو موثر حقیقی سمجھنا صحیح نہیں

جواب :- فرمایا، نئے خیال کے لوگ اسباب علم پر ایسے جمع ہیں کہ مسبب الاسباب کو چھوڑ ہی دیا۔ اسباب طبعیہ کے آثار کو لازم سمجھ کر تصرفات حق تعالیٰ کے منکر ہو گئے اور غلطی ان کی یہ ہوئی کہ کسی اثر کے دوام سے اس کا ضروری ہونا اعتقاد کر لیا مثلاً آگ کا اثر ہے جلانا۔ اس کے دوام سے یہ سمجھنا کہ یہ اس کا ذاتی اثر ہے انفکاک تصور نہیں اور سخت غلطی ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے قصہ ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق آیت قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَاسًا۔ میں تاویلات بعیدہ کیس یہ سمجھ کر کہ آگ کیونکر جھنڈی ہو سکتی ہے۔

اس غلطی کی ایسی مثال ہے کہ ریل دواؤں کی اصطلاح میں گاڑی روکنے کے لئے ٹرک جھنڈی ہوتی ہے ایک نادان بار بار اس کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگے کہ خود اس جھنڈی میں یہ اثر ہے کہ اس سے گاڑی ٹرک جاتی ہے کیونکہ جب دیکھا تو ایسا ہی نظر آیا۔ اور جو لوگ حقیقت جانتے ہیں وہ کہیں گے کہ روکنے والا اصل میں ڈرائیور ہے باقی یہ جھنڈی محض علامت ہے اس میں کوئی اثر ذاتی نہیں۔ ایسے ہی بغیر حکم حق ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ زبان سے جو الفاظ نکلے ہیں ہر حرف پر حکم جدید ہوتا ہے تو زبان حرکت کرتی ہے تمام عالم میں ایسا ہی تصرف جاری ہے۔ انیسویں منکرین نے دوام سے ضروری ہونا اعتقاد کر لیا اور تصرف حق کے منکر ہو گئے۔

(ملفوظ نمبر ۲۵ دعوات عہدیت حصہ ۲)

موثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے

بعض لوگ ایسے گھڑے والے ہیں جو مشیت حق ہی کے معتقد نہیں۔ بلکہ اسباب پر ہی ہر چیز

کا مدار رکھتے ہیں حالانکہ حق تعالیٰ نے تعطیل اسباب فی بعض الاوقات کو جائزاً بظاہر نہ فرمایا ہے۔ اور اگر اسباب کی حقیقت پر غور کیا جائے تو عقلاً بھی خدا تعالیٰ کی مشیت کو موثر ماننا ضروری ہے۔ کیونکہ میں کہتا ہوں کہ جس حادثہ کے لئے آپ نے ایک دوسری شئی کو سبب مانا ہو وہ سبب بھی تو ایک حادثہ ہے اس کے لئے کون سبب ہوا۔ اگر اس کے لئے آپ نے تیسری چیز کو سبب بنایا ہم اس میں بھی کلام کریں گے تو اس سلسلہ ممکنات کو لامحالہ واجب پر منتہی کیا جائے گا ورنہ تسلسل لازم آئے گا اور لامتناہی کے ابطال پر متکین دلائل قائم کر چکے ہیں۔ اور یہ حکما کی حماقت ہے کہ وہ اجزاء عالم کو حادث بالمشخص اور قدیم بالنوع کہتے ہیں کہ ہر فرد تو حادث ہے مگر نوع قدیم ہے حالانکہ وہ خود اس کے بھی قائل ہیں کہ نوع کا وجود بدوین شخص کے نہیں ہو سکتا۔ پھر جب ہر شخص حادث ہے تو نوع قدیم کا تحقق کیسے ہوگا۔ غرض دلائل عقلیہ سے بھی اور تقلید سے بھی مشیت حق کا موثر اصلی ہونا ہر طرح ثابت ہے۔ اور جو شخص ہر بات میں تسلیم ہی کا سبق پڑھے اس کا علاج متکین نے احراراً بالنار بتلایا ہے۔ نیز فطرۃ حق تعالیٰ کی ہستی اور قدرت ماننے کی چیز ہے۔ اور ماننے کی چیز کو نہ ماننا محکم ہے اور محکم کا تو کوئی بھی جواب نہیں۔ جیسے ایک مجنون پاخانہ کھارہا تھا کسی نے ملامت کی۔ تو کہا اس میں حرج ہی کیا ہے یہ وہی تو ہے جو تھوڑی دیر پہلے ہم نے داخل کیا تھا اب وہ ہمارے اندر سے نکل کر برائیوں ہو گیا۔ ذرا عقلاً کسی عقلی دلیل سے اس کا جواب دیں مگر عروت اور طبیعت سے کام نہ لیں محض عقلی دلیل سے اس کے دعوے کو باطل کریں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس کے ابطال پر وہ کوئی دلیل قائم نہ کر سکیں گے۔ مگر کیا اس سے کوئی یہ کہے گا کہ اس مجنون کی بات صحیح ہے؟ ہرگز نہیں، سببوں ہی کہیں گے کہ وہ نالائق یا گل ہے جو نہ ماننے کی چیز کو بھی نہیں مانتا جو اجماعاً ماننے کی چیز ہے۔

خدا کا منکر بھی یا گل ہے

اسی طرح ہم منکر صانع کو یا گل سمجھتے ہیں کیونکہ وہ بھی ایسی ماننے کی چیز کو نہیں مانتا جس کے

ماننے پر اجماع عقلاً و اتفاق مذاہب ہے اور ضرورت فطرت اس پر مزید، یہ تو کامل درجے کی دہریت ہے کہ خدا ہی کو نہ مانے اور ایک قسم کی دہریت یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کو تو مانے اور اس کی قدرت و مشیت کو کامل نہ مانے بلکہ یہ پہلی قسم سے بھی بدتر ہے کیونکہ یہ شخص خدا کا قائل ہے اور محض برائے نام قائل ہے۔ جیسے کوئی یوں کہے کہ فلاں بادشاہ تو ہے مگر پیشن یافتہ ہے کہ اسے اختیارات کچھ نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ خدا تعالیٰ کو ایسا قادر مانتے ہیں جیسے گھڑی کا کوکنے والا کوک بھر دیئے کے بعد گھڑی کے چلنے میں اس کے اختیار کو کچھ دخل نہیں بلکہ وہ خود بخود چلی رہے گی چاہے کوک دینے والا زندہ ہو یا نہ ہو جب تک کوک بھری ہوئی ہے اس وقت تک گھڑی کو اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کام اتنا ہے کہ اسباب کو پیدا کر دیا اب اسباب سے مسبات اور علل سے معلولات کا وجود خود بخود ہوتا رہے گا۔ نعوذ باللہ اس تناؤ و تاثیر میں حق تعالیٰ کا کچھ بھی اختیار نہیں وہ اسباب سے سبب کو مختلف نہیں کر سکتے۔ بس ان لوگوں کا خدا کو ماننا ایسا ہے جیسے بعض لوگ۔ من تشبہ بقوم فهو منہم، سے بچنے کیلئے کوٹ پتلون اور بوٹ سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتے ہیں کہ ساری ہیئت کو کفار کی سی ہے صرف ٹوپی سے آپ مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ حق تعالیٰ کے لئے قدرت و اختیار تو ایسا ضعیف مانتے ہیں جیسا کہ دہری منکر صانع مانتا ہے کیونکہ جیسا اختیار یہ مان رہے ہیں وہ بھی ماننے کے مثل ہے مگر الزام دہریت سے بچنے کیلئے برائے نام یوں کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے۔ اور بعض لوگ خدا تعالیٰ کو بھی مانتے ہیں اور انکی قدرت و اختیار کو کامل بھی مانتے ہیں جیسے عامہ مسلمین۔

مسلمانوں کی حالت

مگر سچ یہ ہے کہ یہ بھی محض زبان ہی سے خدا تعالیٰ کی قدرت کو کامل کہتے ہیں دل سے یہ بھی کامل نہیں مانتے چنانچہ مصائب و حوادث میں ہم اپنے قلب میں وہی ضعف پاتے ہیں جو قائل دہریت کے قلب میں ہوتا ہے ہم نے مانا کہ طبیعت کا بھی ایک اقتدار ہوتا ہے مگر پھر بھی طبیعت کے اقتدار میں اعتقاد کی وجہ سے کچھ توفیق ہونا چاہئے۔ جیسے گرم پانی جو بہت گرم ہو جس کی حرارت ناگوار ہو اس میں ٹھنڈا پانی مل جانے سے کچھ توفیق ضرور ہوتا ہے اب حرارت ناگوار نہیں ہوتی اسی طرح اعتقاد قدرت الہیہ کی برودت سے طبعی قلبان میں کچھ تو کمی ہونا چاہئے۔ ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ فرق تو ہے مگر جو کچھ ہمارا اقرار ضعیف ہے اس لئے اس فرق کا ظہور نہیں ہوا جیسے گرم پانی کے ایک ٹکے میں لوٹا بھر ٹھنڈا پانی ملا جائے تو پہلے سے گرمی میں کمی تو ضرور ہوگی مگر اس کا احساس بھی نہ ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں کہ

جوشے اپنے اثر سے خالی ہو وہ معتبر نہیں جس چیز پر غایت مرتب نہ ہو وہ غیر معتبر ہے۔ اسلئے یہ اعتقاد جس کا اثر کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا معتبر نہیں دنیا میں تو اس سے کچھ نفع نہیں ہوگا گو آخرت میں کسی مدت کے بعد کام آجائے۔
(خیر الحیات و خیر الممات ص ۵)

(۳) کثرت رائے کیلئے حق ہونے کی دلیل نہیں

جواب (۱) :- آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے۔ صا جو! یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے کسی کی رائے مراد ہے۔ کیا ان عوام کا لانا نام کی؟ اگر انھیں کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا۔ ساری قوم ایک طرف رہی اور ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر انھوں نے توحید کو چھوڑ کر کیوں بت پرستی اختیار نہ کی، کیوں تقریق قوم کا الزام نہ لیا۔ اسی لئے کہ وہ قوم جاہل تھی اس کی رائے جاہلانہ تھی۔ آج کل علماء پر یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے قوم میں پھوٹ ڈال دی یہ اتفاق نہیں ہونے دیتے۔ (فضائل العلم و الخشہ ص ۳)

جواب (۲) :- (غزوہ اہد میں) ان پچاس آدمیوں میں دو پہاڑ کی گھاٹی پر متعین کر دیئے گئے تھے، اختلاف ہوا۔ بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کیلئے ہم کو یہاں متعین کیا تھا وہ غرض حاصل ہو چکی اسلئے حکم قرار بھی ختم ہو گیا۔ اب یہاں سے ہٹنے میں حضور کے مقصود کی مخالفت نہ ہوگی اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ حصہ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہئے ہمارے بھائی کفار کا قتل کر رہے ہیں ہم کو مال غنیمت جمع کر لینا چاہئے۔ بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا حضور نے صاف فرما دیا تھا کہ بدوں میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا۔ اسلئے ہم کو بدوں آپ کی اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا چاہئے۔

مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ ان سے اجتہاد غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک افسران کے رہ گئے۔

(اس واقعہ میں کثرت رائے پر غلطی اور تقلید رائے صواب پر تھی)

جو لوگ کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں۔ (ذم النبیان ص ۱۲)

جواب (۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے وصال کے بعد کچھ قبائل مرتد ہو گئے تھے جن میں بعض تو مسیلہ کذاب وغیرہ مدعیان نبوت کے ساتھ ہو گئے تھے۔ اور بعض لوگ کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئے بلکہ ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتے رہے۔ توحید و رسالت کے مقرر ہے۔ کعبہ کو قبلہ مانتے رہے۔ نماز کی فرضیت کے قائل رہے۔ مگر زکوٰۃ کی فرضیت سے منکر ہو گئے اور یہ کہا کہ فرضیت زکوٰۃ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے مخصوص تھی، اب فرض نہیں اور علت یہ بتلائی کہ حضور کے زمانے میں مسلمانوں پر فقر زیادہ تھا۔ اسلئے اس وقت زکوٰۃ کی ضرورت تھی۔ اب وہ حالت نہیں رہی اسلئے فرضیت بھی باقی نہیں رہی۔ جیسے آج کل بھی بہت سے لوگ اس قسم کی تاویلین کیا کرتے ہیں۔

پہلی جماعت کے بارہ میں سب صحابہ کی بالاتفاق یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ جہاد کیا جائے مگر دوسری جماعت کے حق میں سب کی رائے نرم تھی۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے اور جو کھلے کافر ہیں صرف ان سے لڑائی کی جائے۔ ان لوگوں پر جہاد نہ کیا جائے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے اس دوسری جماعت کے متعلق بھی وہی تھی جو اور مرتدین کے متعلق تھی وہ ان لوگوں کو کافر کہتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ یہ لوگ تو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہیں۔ ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں ان پر کیونکر جہاد ہو سکتا ہے۔ اور ان کو کفار کی طرح کیسے قتل کیا جاسکتا ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ فرمایا کہ یہ سب کچھ سہی مگر یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں کہ نماز تو فرض مانتے ہیں اور زکوٰۃ کو فرض نہیں مانتے حالانکہ شریعت نے دونوں کو فرض کیا ہے تو یہ لوگ فرض قطعی کے منکر ہیں اور ان لوگوں نے دین کو بدل دیا ہے اور حضور کا ارشاد ہے من بدل دینہ فاقتلوا، اس لئے میں ان کے ساتھ قتال کروں گا۔

حضرت عمرؓ کو جواب دیا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر کہا کہ آپ کلمہ گو آدمیوں سے کیسے قتال کریں گے؟ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اِجْبَارِیَ الْمَاجَہِلِیۃَ الْخَوَارِیَ الْاِسْلَامَ، وَاللّٰہُ یُؤْمِنُ عِقَالًا وَفِی رَوَایَۃٍ عَنَاقَا کَا نُوَاوِدَ وَنَہْ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لَا قَاتِلَ لَہُمْ عَلَیْہِ۔

ترجمہ :- اے عمر! یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو زبردست تھے اور اسلام میں اتنے بدمعاش ہو گئے۔ بخدا اگر یہ لوگ ایک رسی کو یا بکری کے بچہ کو بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس پر بھی ان سے قتال کروں گا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت میں بھی تھا۔ تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ بھی ہیں اگر میں تنہا بھی جہاد کو نکل کھڑا ہوں گا تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ ہیں انشاء اللہ میں تمام دنیا پر غالب آؤں گا۔ کیا انتہا ہے اس قوت قلب کی۔

چنانچہ پھر سب صحابہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے پر متفق ہو گئے۔ اس واقعہ کو بھی ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے جو کثرت رائے کو علامت حق سمجھتے ہوئے ہیں۔ (ذم النبیان ص ۳)

۴) مکہ معظمہ میں ہزاروں جانوروں کا ذبح ہو جانا کیا خلافِ عقل ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ جناب من ہے تو بخش بات لیکن تفہیم کے لئے عرض ہے کہ اگر تمہاری عقل میں کسی شے کا نہ آنا خلافِ عقل ہونے کی دلیل ہے تو ہمارا آپ کا پیدا ہونا جس طریقہ سے ہے وہ بھی عقل کے خلاف ہے اور اس کا امتحان یہ ہے کہ ایک بچہ ایسا جو زکریا جانشین کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہ تہہ خانے میں پرورش کیا جائے اور اس کے سامنے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا جائے کہ آدمی

کس طرح پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ جب بیس برس کا ہو جائے تو اس سے دفعہ کہا جائے کہ آدمی اس طور سے پیدا ہوتا ہے تو ہرگز اس کی عقل میں نہ آئے گا اور ہم چونکہ رات دن دیکھتے ہیں کہ جناب ہم تو جب سے پیدا ہوئے ہیں ہمارے تمام حالات ہی خلافِ عقل ہیں۔ ہماری عقل تو بس کھانے کمنے کی ہے۔ ایسے ہی جیسے کسی بھوکے سے پوچھا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں کہا چار روٹیاں ایسے ہی ہماری عقل صرف اس قدر ہے کہ کھالو اور پی لو، اور باتیں بناو۔ جب اتنی عقل ہے تو اسرارِ شریعت کہاں تک سمجھ میں آئیں۔

ایسے ہی نفس الضعیف بلا تقسیم لحم کے بھی حکمت ہے۔ اگر ہماری عقل میں نہ آئے تو قابلِ انکار کیسے ہوگی۔ اور اس لئے ہمارے ذمہ ضروری نہیں ہے کہ اس حکمت دراز کو بیان کریں لیکن تبرعاً بتائے دیتے ہیں۔

قربانی کی حقیقت

وہ یہ ہے کہ اصل میں یہ سنتِ ابراہیمی کا اتباع ہے۔ اور شے محبوب کا انفاق مقصود ہے اور وہ صرف جانور ذبح کر دینے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ گوشت خواہ رکھیں یا تقسیم کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اصل عمل تو یہ تھا کہ بیٹے کو ذبح کریں لیکن اول تو سب کے بیٹا ہوتا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ حکم ہوتا تو بہت کم ایسے نکلے جو بیدل کرتے۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ جانور کو قائم مقام ذبح و لد کے کر دیا۔ اس لئے یہ کہنا کہ قربانی میں مال ضائع کرنا ہے جیسے آجکل تو تعلیم یافتہ اصحاب کا خیال ہے سراسر غلط ہے اور قربانی کا مقصود اظہارِ محبت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور وہ اس میں حاصل ہے پھر مال کہاں ضائع ہوا۔ (ترغیب الاضعی ص ۱۲)

۵) جماعت علماء کو نکما سمجھنا صحیح نہیں

برسبیلِ معظ بیان فرمایا کہ آج کل لوگوں نے علماء کی جماعت کو کم ہمت بیکا رونکی پلٹن اور کیا کیا خطاب دے رکھے ہیں۔ حالانکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ عربی پڑھنے سے دماغ میں ایک خاص انجلا ہو جاتا ہے۔ فرض کیجئے اگر دو شخص یکساں دماغ کے انگریزی پڑھیں اور ایک ان میں عربی بھی پڑھا ہوا ہو صرف انگریزی پڑھے ہوئے سے تقریر و تحریر دہن میں

طرف لڑتی ہے اسلئے صورت نظر پڑتی ہے جب نگاہ نہ کی تو شعاع نہ نکلی۔ تو پھر نظر آنے کا کوئی سبب نہیں۔ غرض آئینہ میں جو نظر آتا ہے وہ کوئی مابین چیز نہیں بلکہ اس چہرہ پر نگاہ لوٹ کر پڑتی ہے جب مٹی سے اپنی شعاعوں کا تعلق علت ہے رویت کی، پس اگر کسی شخص کو یہ قوت حاصل ہو کہ سیدھی شعاعوں کو مقوس کر کے تو اس کو پیچھے سے بھی مثل سامنے کے نظر آئے گا۔ چنانچہ صوفیہ کے بعض اشغال میں سرف نظر آنے لگتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے سے بھی دیکھتے تھے۔ اور اس کی وجہ میں بعض علما کہتے ہیں کہ آپ کے سر میں پیچھے کی جانب دو سوراخ تھے ان سے نظر آتا تھا تو اس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ممکن ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے شعاعوں کے مقوس بنانے کی قوت مرحمت فرمائی تھی۔ جب آپ قصد فرماتے آگے دیکھ لیتے اور پیچھے کا قصد کرتے تو پیچھے نظر فرمایا لیتے ہر شخص میں یہ قوت نہیں اسلئے نظر نہیں آتا۔ اور اس توجیہ کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ نقل فرماتے ہیں۔ (ملفوظ نمبر ۷۵ ایضاً)

۴) کافر کو عذاب دائمی ہونے پر شبہ کا جواب

جواب ۱) :- بر سبیل وعظ فرمایا کہ کافر کو جو ابدی عذاب ہے اس میں کوئی ظلم نہیں کیونکہ کافر اللہ کے ہر ہر صفت کے حقوق ضائع کرتا ہے اور اس کی صفات لامتناہی ہیں اور خود ہر صفت کے حقوق بھی غیر متناہی ہیں تو چاہئے تو یہ تھا کہ ہر صفت کے انکار پر لامتناہی سزا ہوتی اور پھر ہر صفت کے حقوق پر اسی طرح غیر متناہی سزا ہوتی پھر زیادتی کہاں ہوئی۔ بلکہ ایک معنی کر کے کہی ہے۔ بغاوت کی سزا قید دائمی ہی ہوتی ہے جس کا دوام حکام ظاہری کے اختیاریں ہے یعنی تاحیات وہ اپنے باغیوں کے لئے مقرر کرتے ہیں۔ اور جس قسم کا دوام احکام الحاکمین کے اختیار میں ہے یعنی اصلی، وہ اپنے باغیوں کے واسطے تجر زفر مائیں گے اس میں ظلم اور زیادتی کچھ بھی نہیں بلکہ عین عدل ہے۔ (مجادلات معطل نمبر ۲ حصہ ایضاً)

جواب ۲) :- سزا مناسب جنایت ہونی چاہئے اور یہاں جنایت متناہی ہے کیونکہ عمر کافر کی متناہی ہے تو سزا بھی متناہی ہونی چاہئے اس کا جواب حصہ اول میں گذر چکا۔

مقابلہ ضرور زیادہ ہوگا۔ چنانچہ ایک عربی پڑھے ہوئے تھے ان کے فیصلے نہایت مدلل اور پر زور ہوتے تھے ہم لوگ عربی پڑھے ہوئے اگر دنیا کمانے پر آئیں تو آپ لوگوں سے اچھی کما دکھائیں تو ہم کے متعلق تو یہ گفتگو تھی۔ رہی کم ہمتی، اس کا شبہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ لوگ بہت روپے نہیں کمانے قلیل پرتناعت کرتے ہیں تو اس کا جواب ایک سے سمجھ لیجئے۔

اگر کوئی شخص آپ کے یہاں لوکر ہو اور صرف پانچ روپے کما ہو اور پاتا ہو اور کوئی دوسرا شخص اس کو بیس روپے دینے لگے لیکن وہ یہ کہدے کہ مجھ کو تو یہ پانچ روپے ہی اچھے ہیں آپ نے آقا کو نہ چھوڑوں گا تو بیچ کہئے کیا آپ اس کو کم ہمت اور بیکار کا خطاب دیں گے؟ نہیں بلکہ آپ اس کو کہیں گے کہ بڑا عالی ہمت اور وفادار شخص ہے کہ بیس روپیہ پر ملازمت ماردی اور اپنے آقا کو نہ چھوڑا۔ اور اس کے پانچ ہی روپیوں پر قناعت کی۔ پھر تعجب ہے کہ ان لوگوں کو جو علم دین کی خدمت میں رہتے ہیں کیونکہ کم ہمت اور بیکاروں کی پلٹن دینے کے خطاب ملتے ہیں حالانکہ جیسا اوپر کہا گیا اگر یہ مولوی لوگ دنیا کمانے پر آجائیں تو آپ لوگوں سے اچھی کما دکھائیں لیکن پھر باوجود قدرت کے دنیاوی منافع کو چھوڑ کر دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور رکھے ہوئے ٹکڑوں میں خوش ہیں تو ان کو کیوں عالی ہمت اور وفادار اپنے آقا یعنی خداوند کریم کا نہیں کہا جاتا۔ آپ لوگ خدمت علماء اور اہل دین کی کرتے ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ ہمارا احسان ہے۔ آپ تو محض خزانچی ہیں اور خزانچی جو بڑے بڑے عہدہ داروں اور اہل کاروں کی تنخواہیں تقسیم کرتے ہیں یہ ان کا کوئی احسان نہیں ہے بلکہ خزانہ سرکاری ہے۔ خزانچی تو ایک چھوٹی سی تنخواہ کا ملازم ہے اس کے سپرد ہی یہ خدمت ہے اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجتا ہے اور گردن دبا کر آپ کے ذریعہ سے ان بزرگوں کو اپنا عطیہ پہنچاتا ہے آپ کا کوئی احسان نہیں۔ (ملفوظ نمبر ۱۴ دعوات عبدیت حصہ سوم)

۵) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے دیکھنے

پر شبہ کا جواب

فرمایا۔ آئینہ میں صورت جب تک نظر آتی ہے جب تک کہ آنکھ کسی دیکھنے والے کی کھلی ہوئی ہو کیونکہ نظر آنے کی حقیقت یہ ہے کہ شعاع آنکھ سے نکل کر آئینہ پر پڑ کر پھر رائی کی

(۸) احکام شریعت کی علتیں دریافت کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ قلب میں عظمت حق نہیں

صاحبو! دین کو لوگوں نے تحفہ مشق بنا لیا ہے کہ لوگ اپنی رایوں کا احکام میں دخل دیتے ہیں اور ان کی علتیں گھڑتے ہیں اور علماء سے بھی اس طرح سوال کرتے ہیں کہ امر اس طرح کیوں ہے سو دینا کیوں حرام ہے، فلاں بات کس لئے منع ہے۔ پھر فرمایا کہ میں نے ایک موقع پر اس کے متعلق یہ بیان کیا تھا کہ یہ بات تو مسلم ہے کہ اگر کسی مکان میں ماہرین علوم جدیدہ بیٹھے ہوں اور انجمن صاحب آن کریں کہیں کہ فوراً اٹھو، یہ مکان گرا چاہتا ہے تو کچھ بھی تامل ٹھننے میں نہ کریں گے اور علت نہ پوچھی جائے گی اس وجہ سے کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ ایسے فن سے واقف ہیں جو ہم نہیں جانتے اسلئے انکے حکم کی قدر کی جاتی ہے اور اس لئے ان کے کہنے کے موافق عمل کرنے میں تامل نہیں کرتے، نہ علت تلاش کرتے ہیں نہ اس سے علت پوچھتے ہیں بلکہ حکم کی تعمیل کے واسطے تیار ہو جاتے ہیں۔ یا رسول سرجن صاحب اگر اگر کوئی دوا بتائیں تو اس میں کچھ بھی چون و چرا نہیں کرتے۔ جانتے ہیں کہ یہ اس فن کا ماہر ہے۔ سمجھنے کی بات ہے کہ جس فن سے یہ لوگ واقف نہیں اس میں لم اور کیف سے کس لئے دخل دیتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کی عظمت مانع ہوتی ہے اس کے احکام کی علت ڈھونڈنے سے۔ اس کی نظیر ایسی سمجھ لیجئے کہ ایک تو کوئی دوست برابر کے مرتبہ کا حکم کرے تو اس کی علت پوچھتے ہیں کہ تم نے یہ حکم کس لئے دیا۔ اور ایک حاکم کی طرف سے کوئی حکم صادر ہو تو ہرگز علت نہیں پوچھتے۔ وجہ یہ ہے کہ دوست کی عظمت اتنی طلب میں نہیں۔ ایک معمولی چیز ہے۔ اور احکام کی عظمت ہے اس لئے حجت نہیں کرتے۔ سو جب خدا تعالیٰ کے احکام کی علل دریافت کی جاتی ہے اس سے پوشیدہ پڑتا ہے کہ ان کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت نہیں ہے۔ بغرض محکوم ہونے کی حیثیت سے علل دریافت کرنا عقلاً بیہودہ امر ہے۔ ہاں طالب علمی کی حیثیت سے بغرض تحقیق فن مضائقہ نہیں۔ مگر وہ منصب صرف طالب علموں کا ہے۔ چنانچہ طلبہ اور شاگرد اساتذہ سے بڑی بڑی جتیں کرتے ہیں۔ سنو! اس کیلئے تعلیم فن کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس اگر ترتیب وار پڑھو۔ پھر اپنے وقت جو امر سمجھنے کا ہے وہ سمجھ لیں اور خود جائے گا۔ دریافت کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔

خیال تو کیجئے، کلکٹر کا منادی اگر جب حکم سے اطلاع کرتا ہے تو کوئی علت نہیں پوچھتا، افسوس ہے علماء کو بھنگی سے بھی زیادہ ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ علماء درحقیقت منادی کرنے والے اور ناسل احکام ہیں خود موجود احکام نہیں اس لئے ان سے علتیں پوچھنا حماقت نہیں تو کیا ہے۔ پھر جب آپ نے ایک فن سیکھا نہیں اور آپ اس سے محض ناقت ہیں تو آپ کو سمجھانا بھی تو ایسا ہی ہو گا جیسے ایک سائیس کو اقلیدس کی اشکال سمجھانے لگیں۔ تودہ کیا سمجھے گا؟ اس کی تدبیر تو یہی ہے کہ پہلے اسکو اقلیدس کے مبادی سمجھا دو۔ جو اشکال کی موقوف علیہ ہیں پھر اشکال سمجھاؤ تو خوب سمجھے گا۔ علماء آجکل اپنے کی وجہ سے لوگوں کی رائے پر چلنے لگے ہیں جس سے عوام کی جرأت بڑھ گئی ہے۔ ایسا نہیں چاہئے۔ علماء کیا نوکر ہیں کہ بے فائدہ دماغ خالی کریں۔

(مجادلات معدلت نمبہ حصہ سوم دعواتِ عبدیت)

(۱۹) احکام شریعت کو مصلح دنیوی کی بنا قرار دینا خطرناک مسلک ہے۔

اس طرز تقریر میں زہر بھرا ہوا ہے جو اس کو جان لے گا وہ سمجھ جائے گا۔ یہ لوگ ایسے اسرار بیان کر کے اسلام کے ساتھ دوستی نہیں کرتے بلکہ دشمنی کرتے ہیں اور یہ حائے اسلام نہیں بلکہ اسلام کے ناوان دوست ہیں۔ ع

”دوستی بے خرد چوں دشمنی ست“

اب میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ اس تقریر میں زہر کیا ہے۔ اس میں مضمون کا حاصل یہ ہے کہ اس اصل چیز تو اتفاق ہے اور جماعت پنجگانہ اور جموعہ دین دین دج اسی اتفاق کے پیدا کرنے کے واسطے ذرائع و وسائل ہیں۔ تو عجب نہیں کہ بعض لوگوں پر اس کا یہ اثر ہو کہ وہ ان احکام کو مقصود بالذات نہ سمجھیں اور اگر کبھی کسی دوسرے طریق سے اتفاق ممکن ہوا تو وہ سب آسان سے جماعت اور نماز دونوں کے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کے خیال میں تو یہ سب احکام حصول اتفاق کیلئے مقرر ہوئے ہیں۔ اور انکو کلاب جانے اور تھیر میں مل کر شریک ہونے سے بھی یہ بات حاصل ہو سکتی جہاں راحت ہے آرام کسی اور گدے تیگوں پر جگہ ملتی ہے تودہ خواہ مخواہ

مسجد میں کیوں آنے لگے اور وضو اور نماز کی مشقت کیوں برداشت کرنے لگے۔

وضو کا انکار چنانچہ اس وقت ان تقریروں کا یہ ضرر نمایاں ہو رہا ہے اخباروں میں ایک شخص کا قول شائع ہوا تھا کہ وضو کی ضرورت ابتدائے اسلام میں تھی آج کل نہیں ہے کیونکہ اس وقت بددی لوگ پاک صاف نہ رہتے تھے۔ جنگل کے کاروبار سے غبار آلودہ آتے تھے اسلئے ان کو وضو کا حکم کیا گیا۔ اور ہم لوگ آج کل ہم لوگ صفائی کا بہت اہتمام رکھتے ہیں ہر وقت موزے اور دستانے چڑھائے رہتے ہیں جن کی وجہ سے ہاتھ بیکر گر دے محفوظ رہتے ہیں ہم کو وضو کی ضرورت نہیں۔

یہ نتیجہ ہے ایسے اسرائیلیان کرنے کا کہ اب ہر شخص اس قسم کی مصلحتوں ہی کو مقصود سمجھنے لگا اور اس شخص سے کچھ بھی تعجب نہیں کہ وہ نماز کو بھی چھوڑ دے اور یہ کہے کہ نماز کی ضرورت ابتدائے اسلام میں اسلئے تھی کہ اس زمانے کے لوگ جاہلیت کی وجہ سے بڑے متکبر و مکرش ہوتے تھے اور ان کو مہذب بنانے کے لئے یہ افعال تواضع و خشوع کے تعلیم فرمائے گئے تھے۔ اور ہم لوگ تعلیم یافتہ ہیں ہمارے اندر تعلیم سے تہذیب پیدا ہو گئی ہے ہم کو نماز کی کیا ضرورت ہے۔

قربانی پر اعتراض اسی طرح قربانی کے متعلق ایک شخص نے جو کہ مسلمان ہیں منکلسان سے مجھ کو لکھا تھا کہ قربانی شریعت کو مقصود نہیں اور یہ بالکل خلاف عقل ہے کہ ایک دن میں اتنے جانوروں کو ذبح کیا جاوے جن کا گوشت آدمیوں سے کھایا بھی نہ جائے۔ چنانچہ اس لئے منیٰ میں قربانی کرتے ہی جانوروں کو کھیتوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ غضب یہ ہے کہ آج کل خدا پر بھی عقل کی حکومت ہوئے لگی۔ خدا فسوس ہے۔

لے ان حضرات نے منیٰ میں کھیتوں کے اندر جانوروں کے دبانے کی جو یہ وجہ بتلائی کہ اتنا گوشت آدمیوں سے کھایا نہیں جاتا یہ بالکل غلط ہے کیونکہ موسم حج پر جتنے آدمی جمع ہوتے ہیں سب کے سب مالدار نہیں ہوتے اور نہ سب قربانی کرتے ہیں بلکہ حجاج میں زیادہ تر غریب ہوتے ہیں۔ ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اگر منیٰ کے قربانی کا سارا گوشت حجاج میں اور بدویوں میں تقسیم کر دیا جائے تو وہ ہرگز سب کو کافی نہ ہوگا بلکہ بہت لوگ پھر بھی مجرم رہ جائیں بلکہ منیٰ میں قربانی کے جانوروں کو محض ڈاکٹروں کی رائے سے دبا جاتا ہے۔

بس اس خلاف عقل حرکت کے جواب وہ ڈاکٹر ہیں جن کی رائے سے ایسا کیا جاتا ہے۔

قانون عقل حاکم ہے

میں کہتا ہوں کہ ایک جگہ اگر کسی مجرم کو سزا دے اور مجرم یہ کہے کہ یہ سزا تو عقل کے خلاف ہے تو کیا وہ اس بات کی سماعت کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ صاف یہ کہے گا کہ قانون پر تمہاری عقل کی حکومت نہیں بلکہ قانون عقل پر حاکم ہے۔ اور اس کے اس جواب کو سب عقلا تسلیم کرتے ہیں۔ مگر حجت یہ ہے کہ قانون الہی کو آج کل کے مسلمان اپنی عقل پر حاکم نہیں مانتے بلکہ اس کو اپنی عقل کے تابع کرنا چاہتے ہیں اور یہ جواب علی سبیل التمثیل ہے۔ ورنہ قانون الہی تو بالکل عقل کے مطابق ہے بشرطیکہ عقل سلیم ہو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص کی عقل میں اس کی حکمتیں آجایا کریں۔ آخر پارلیمنٹ کے عقلا جو قوانین تجویز کرتے ہیں کیا ہر عامی کی عقل اس کے مصالح تک پہنچ جاتی ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ اس کے مصالح و حکم کو خاص خاص حکام ہی سمجھتے ہیں۔ پھر قانون الہی کی حکمتوں اور مصالح کو ہر شخص اپنی عقل سے کیوں معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اور یہاں یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ قانون الہی عقل کے مطابق ضرور ہے مگر ہماری عقلیں اس کے مصالح سمجھنے سے قاصر ہیں۔ خاص خاص لوگ ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں اور بالفرض اگر کسی قانون کی حکمت خاص لوگوں کی عقل میں بھی نہ آئے تو قانون کے بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں کیونکہ قانون پر عقل حاکم نہیں بلکہ اس کی ماتحت اور اس کی تابع ہے۔

قربانی کا مقصد

غرض ان حضرات نے مجھے لکھا کہ قربانی خود شریعت کو مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود غریب کی امداد ہے اور ابتدائے اسلام میں لوگوں کے پاس نقد کم تھا۔ مولیشی زیادہ تھے۔ اسلئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جانور ذبح کر کے غریب کو گوشت دیدو۔ اور اس زمانہ میں نقد بھی بہت موجود ہے۔ غلہ بھی موجود ہے۔ پس آج کل بجائے قربانی کرنے کے نقد روپے سے غریب کی امداد کرنا چاہئے۔ تو اس شخص نے قربانی کی حکمت امداد غریب سمجھ کر جب یہ دیکھا کہ یہ حکمت دوسرے طریقہ سے بھی آسانی حاصل ہو سکتی ہے۔ قربانی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا حالانکہ یہ حکمت مقصود ہی نہیں بلکہ مقصود تو تعمیل حکم ہے۔ اگر یہ حکمت مقصود نہ ہوتی تو اس کی کیا وجہ کہ غریب کو زندہ جانور دینے سے واجب ادا نہیں ہوتا۔ اگر اس زمانے میں نقد اور غلہ کم تھا اور مولیشی زیادہ تھے۔ اسلئے جانوروں کے ذریعہ غریب کی امداد کا طریقہ مقرر ہوا تھا۔ تو اس کے منیٰ کہ جانور کو ذبح کر کے غریب کو گوشت ہی دیا جائے تو واجب ادا ہو اور زندہ جانور کسی غریب کو دیدیں تو واجب ادا نہ ہو۔

پھر کیا پہلے مسلمانوں پر نقد کی وسعت کبھی نہ ہوئی تھی؟ بالکل غلط ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو کہ صحابہ نے جس وقت کسریٰ و قیصر کے خزانے فتح کئے ہیں تو مسلمانوں کے پاس نقد سونا اور چاندی اس قدر تھا کہ آج کل تو اس کا عشر عشر بھی نہ ہوگا۔ پھر اس وقت صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات کیوں نہ سوجھی جو اس شخص کو انگلستان میں بیٹھکر سوجھی اور صحابہ نے بجائے قربانی کے نقد امداد کو کیوں نہ اختیار کیا۔

دوسرے اگر یہ حکمت قربانی سے مقصود بالذات ہوتی تو اس کا مقصد یہ تھا کہ قربانی کے گوشت میں سے کسی حصہ کا تصدق ضرور واجب ہوتا حالانکہ شریعت میں یہ بھی حکم نہیں بلکہ اگر کوئی شخص سارا گوشت خود ہی کھالے اور غریب کو کھوجہ برابر بھی نہ دے تو قربانی میں کچھ قصور نہیں آتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امداد غریبہ قربانی سے مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود کچھ اور ہے۔ مگر آپ نے دیکھ لیا کہ اس قسم کے اسرار بیان کرنے کا نتیجہ کہاں تک پہنچا ہے کہ ہر شخص اپنی مختصر حکمتوں پر احکام سمجھنے لگا۔ (رسائل النجاشی ص ۱۵)

۱۰) کعبہ کا بعض بزرگوں کے استقبال کیلئے جائیکی تحقیق، اور اس پر شبہات کا جواب

بعض بزرگوں کی نسبت یہ مشہور ہے کہ وہ مکہ معظمہ پہنچے تو جا کر دیکھا کہ کعبہ نہیں ہے سخت حیرت ہوئی اور باری تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ اس وقت کعبہ کہاں ہے چنانچہ ارشاد ہوا کہ ہم منکشف کئے دیتے ہیں۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بزرگ آ رہے ہیں۔ کعبہ ان کے استقبال کو گیا ہوا تھا۔

اور یہ حکایت تین فرقوں کو مضر ہوئی ایک تو ان کو جنہیں دین سے کچھ بھی تعلق اور واسطہ نہیں۔ ایسے لوگوں نے تو اس کی تکذیب کی۔ اور کہنے والوں پر ہنسنا اور دہم پرست کہنا شروع کیا۔ دوسرے ان دینداروں کو جو کہ محض ظاہر پرست ہیں۔ ایسے لوگوں نے انکو صوفیہ کے دھوکے کہہ کر اڑا دیا۔ تیسرے ان لوگوں کو جو فلسفی دماغ کے ہیں اور تاریخ ان کا نصب العین ہے۔ انھوں نے

اس کو خلاف عقل بتلایا۔ اور یہ اعتراض اس پر کیا کہ اگر ایسا ہوتا تو تاریخوں میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا۔ سو ہم نے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا۔ حالانکہ ان تینوں کی حالت یہ ہے۔ ج۔
” بچوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند “

تو سمجھو کہ ایک کعبہ کی صورت ہے اور ایک کعبہ کی روح ہے۔ روح کعبہ ایک خاص تجلی ہے کہ کعبہ ظاہری اس کا منظر ہے۔ پس جن بزرگوں نے یہ دیکھا کہ کعبہ اپنی جگہ نہیں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ روح کعبہ زائرین کی طرف متوجہ نہیں ہے بلکہ ان بزرگ کی طرف متوجہ ہے۔ غرض بعض بزرگ ایسے بھی ہوئے ہیں کہ جن کی طرف کعبہ نے خود توجہ کی۔ لیکن حج کیلئے انکو بھی خود کعبہ ہی میں آنا پڑا۔ (اصلاح النفس ص ۱۲)

۱۱) جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اس غلطی کا جواب کہ اسلام میں سلطنت جمہوری کی تعلیم ہے

نظام عالم تابعیت و متبوعیت کو چاہتا ہے اس لئے متبوع کو تابع کی مساوات گوارا نہیں اسی وجہ سے سلطنت کی ضرورت ہے تاکہ ایک تابع ہو ایک متبوع ہو۔ سب کے سب آزادانہ ہوں بلکہ متبوع کے سامنے تابع کی آزادی سلب ہو جائے۔ یہ حقیقت ہے سلطنت کی۔ اگر سلطنت نہ ہو تو ہر شخص آزاد ہوگا اور آزادی مطلق انتظام کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ اور نہ کسی نے آج تک اسکو گوارا کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلطنت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ آج کل ایک فرقہ نکلا ہے جو سلطنت کا مخالف ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ بدولت سلطنت کے انتظام نزاعات کا فیصلہ کیونکر ہوگا۔ اگر کہو کہ کثرت رائے سے فیصلہ ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ جن کثیرین کی رائے پر فیصلہ ہوگا وہی سلطنت کے مصلحت ہو گئے۔ کیونکہ ان کے سامنے دوسروں کی آزادی سلب ہو گئی۔ اور یہی حقیقت ہے سلطنت کی کہ بعض کی آزادی بعض کی رائے کے سامنے سلب ہو جائے۔ کثرت رائے پر فیصلہ ہونے کے بعد بھی آزادی مطلق کہاں رہی۔ اس فیصلہ کی پابندی سے بھی تو آزادی سلب ہوگی۔ تو یہ لوگ جس چیز کو مٹاتے ہیں اخیر میں اس کو ثابت کرتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے بھی آزادی مطلق کو گوارا نہیں کیا بلکہ

ایک کو تابع ایک کو متبوع بنا یا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنے احکام نبی کے واسطے سے بھیجے ہیں اور تمام مخلوق پر نبی کا اتباع فرض کیا ہے تاکہ مخلوق کو کسی ایک کا تابع کیا جائے۔ ورنہ بہت سہل تھا کہ انبیاء علیہم السلام کو نہ بھیجتے بلکہ آسمان سے چھپے ہوئے کاغذ ہر ایک کے پاس آگرتے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر کام کرتا نہ نبی کا اتباع ضروری ہوتا، نہ خلیفہ کا نہ علماء کا نہ مجتہدین کا۔

خدا کے یہاں پریس کہاں ہے

یہاں پریس کہاں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب ہم نے پریس ایجاد کر لے، ہیں تو خدا تعالیٰ کو پریس بنالینا کیا مشکل ہے۔ بلکہ تم جو کچھ ایجاد کرتے ہو یہ عقل سے ایجاد کرتے ہو، اور عقل خدا کی دی ہوئی ہے تو یہ ایجاد بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ کی ایجاد ہے۔ تمہارا تو محض نام ہی نام ہے۔ اس لئے یہ شبہ محض لغو ہے۔

دوسرے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس وقت بھی پریس موجود ہیں۔ کیونکہ کاتبین اعمال کا لکھا ہوا قیامت تک نہ مٹے گا۔ ایسی سیاہی اور ایسا کاغذ تو کسی پریس کو نصیب نہیں جو قیامت تک باقی رہے تو پھر کاتبین اعمال آپ کے کاموں کو ایسی سیاہی سے روزانہ لکھتے ہیں وہی اگر احکام کو لکھ کر ہر شخص کے پاس طوالت دیا کریں تو کیا مشکل ہے۔ مگر حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ حکام کو نبی پر نازل کیا اور مخلوق کو نبی کا تابع کیا تاکہ آزادی سلب ہو جائے۔

قانون کی پابندی

جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں اور حریت و مساوات کے مدعی ہیں وہ بھی آزادی کا ہونا گوارا نہیں کرتے۔ کیونکہ جمہوری سلطنت کے بعد بھی وہ کوئی قانون ہوگا جس کی پابندی عام رعایا پر لازم ہوگی تو اس قانون کے سامنے سب کی آزادی سلب ہو جائے گی ہم تو آزادی کا دعویٰ جب مانیں جب کسی شخص کو بھی قانون کا پابند نہ کیا جائے بلکہ جس کے جوجی میں آئے کرنے دیا جائے کسی سے کچھ مزاحمت نہ کیجاوے کیونکہ تم تو آزادی کے حامی ہو۔ تو آزادی تو اسی کا نام ہے کہ کوئی کسی بات کا پابند نہ ہو۔

پھر تو لوگوں کو قانون کا پابند کیوں بناتے ہو اور ان کی آزادی کو قانون کا تابع کیوں بناتے ہو۔ کم از کم یہی کہ وہ قانون بنانے میں ساری رعایا کی رائے لے لیا کرو۔ قانون سازی کے لئے پارلیمنٹ کی مختصر جماعت کو کیوں خاص کر رکھا ہے۔ اور تمام رعایا کو چند آدمیوں کی رائے کا

تابع کیوں بنا رکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں مگر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے کبھی حکمی۔ فلسفہ کا مسئلہ یہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے مگر وہ واحد حکمی ہے حقیقی نہیں۔ تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں اس میں گونبظا ہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں مگر مجموعہ عمل کر پھر شخص واحد ہے کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے۔

پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو رائے دیدے وہی پاس ہو جایا کرے۔ اگر ایسا بھی ہوتا جب بھی کسی قدر آزادی کا دعویٰ اٹھتا ہو تا مگر وہاں تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں بلکہ انجائی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہے کیونکہ مجموعہ عمل کر واحد حکمی ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص واحد حقیقی کے حامی ہیں اور ہم شخص واحد حکمی کے حامی ہو۔ جمہوریت کے حامی تو تم بھی نہ رہے۔ جمہوریت اور آزادی کامل تو جب ہوتی جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا۔ نہ ایک بادشاہ کا، نہ پارلیمنٹ کے دس ممبروں کا۔ اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنادیا۔ ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے تو نے دس کا غلام بنادیا۔ تمہیں فیصلہ کر لو کہ ایک کا غلام ہونا اچھا ہے یا دس بیگل کا غلام ہونا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو اس سے بہتر ہے جس پر دس بیگل کی حکومت ہو۔ یہ حاصل ہے جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اس کو بھی انکار نہیں مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیگل کی غلامی کرو۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔

شریعت میں یہ خاص بات ہے کہ اس کے دعاوی کہیں نہیں ٹوٹتے۔ شریعت نے آزادی کا ایسے زور سے دعویٰ ہی نہیں کیا جو اس پر نقص وارد ہو اور جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں کسی وقت ان کو اپنے دعویٰ سے ہٹنا پڑتا ہے۔ آخر کیوں ہٹتے ہو؟ اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلہ کو نہ مانے تو اس کو مجبور کیوں کرتے ہو۔ اسے پارلیمنٹ کا غلام کیوں بناتے ہو۔ آزادیوں نہیں رہتے دیتے مگر کیونکہ آزادی دہنے دیں۔ نظام عالم بدوں اس کے قائم نہیں ہو سکتا کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں بعض متبوع ہوں آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں اگر ان کو اپنے دعویٰ آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے۔ اور شریعت کو کبھی اپنے دعویٰ سے ہٹنا نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی

تابعیت و متبوعیت کی حامی ہے وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کر دیا۔ بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالیٰ نے ایک زمانے میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں تو ان میں بھی ایک تابع تھے۔ دوسرے متبوع تھے۔

ایک زمانہ میں دہلی

ایک زمانہ میں دہلی چنانچہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام ایک زمانہ میں دہلی تھے جو نبی اسرائیل و قوم قبطہ کی طرف مبعوث ہوئے تھے مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے، حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے، دونوں برابر درجہ میں تھے اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے وہ ان کی مخالفت نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک واقعہ ایسا پیدا کر دیا جس سے اس حقیقت کا ظہور ہو گیا۔

جب موسیٰ علیہ السلام تو رات لیٹنے کے لئے کوہ طور پر شریف لے گئے تو ہار دن علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنا کر چھوڑ گئے تھے کہ میرے پیچھے بنی اسرائیل کا خیال رکھنا اور انکی اصلاح کرتے رہنا۔

قصہ سامری

قصہ سامری یہاں پیچھے یہ قصہ ہوگا سامری نے ایک سونے کا بچھڑا بنایا اور اس میں قدم جبرئیل علیہ السلام کی مٹی ڈال دی جس سے اس میں حیات پیدا ہوگئی

فَقَاتُوا هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَىٰ فَتَنِي، جاہل لوگ کہنے لگے کہ ہمارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا تو ہے وہ بھول کر نہ معلوم کہاں چلے گئے۔ بس بیوقوف لگے اس کی عبادت کرنے۔ موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اس واقعہ کی اطلاع دی وہ غصہ میں بھرے ہوئے تشریف لائے۔ اور قوم کی حالت دیکھ کر انوس ہوا۔ اسی وقت انھوں نے ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ جب تک بخت گمراہ ہو گئے تھے تو تم یہاں کیوں رہے میرے پاس باقی ماندہ جماعت لو لے کر کیوں نہ چلے آئے اور غصہ میں ان کا سردار ڈاڑھی کیڑ کر کھینچنے لگے قَالَ يَا ابْنُ اُمَّمَ لَا تَأْخُذْ بِالْحَيِیَّتِ وَلَا بِرَأْسِیْ ہارون علیہ السلام نے کہاے بھائی میری ڈاڑھی اور سر نہ پکڑو۔ میری بات سنو بچھے یہ اندیشہ ہوگا اگر میں انکو چھوڑ کر چل دوں گا تو آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے وہاں رہ کر انکو سمجھایا کیوں نہیں انکی اصلاح کیوں نہ کی اسلئے میں یہیں رہ کر ان کو سمجھاتا رہا حالانکہ ہارون علیہ السلام عمر میں موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے مگر نبوت میں ان کے تابع تھے اسلئے موسیٰ نے بے تکلف اپنی مقبوعیت اور ان کی تابعتیت کے مقتضی پر عمل کیا اور وہ برتاؤ جو حاکم حکوم کے ساتھ کرتا ہے۔ سچ ایک سب انسپکٹر باجوہ کی

انسپیٹر کا تاج اور ماتحت ہوتا ہے۔ مگر انسپیٹر اپنے ماتحت کے ساتھ ایسا کر کے تو دیکھیں۔

تاج اور متبوع | معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی تابعیت محض ضابطہ کی نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی، جس کا اس واقعہ سے ظہور ہو گیا۔ اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ دونوں رسولوں میں ایک تاج ہیں ایک متبوع ہیں اور دونوں یکساں مرتبے میں نہیں ہیں۔

اس واقعہ سے بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہو گا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل میں کیا حکمت تھی۔ لیکن ایک حکمت تو میرے قلب پر اسی وقت آگئی کہ حق تعالیٰ کو مبنیہیت اور تالیفیت کا ظاہر کرنا تھا اسلئے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ سے ایسا بیتاب کر دیا جس سے انھوں نے اپنی حکومت مبنیہیت کے مقصدی پر بے تکلف عمل کیا اور نہ معلوم کتنی حکمتیں ہوں گی۔

تخصی حکومت

شخصی حکومت

غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں۔ اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں لوجھلک ہی ہیں اور جمہوری میں متیقن ہیں۔ شخصی سلطنت میں خرابیاں بیان کی جاتی ہیں کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے۔ حالانکہ ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی رائے غلط ہو۔ اس لئے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑنا چاہئے بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہو کرے۔ اور دوسری رائے ہمیشہ صحیح ہو کرے۔ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا۔ ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کیونکہ جتنی ایجادات ہیں ان میں سے ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا۔ ایک نے تاریکی کو ایجاد کیا۔ ایک نے آگ کو ایجاد کیا۔ تو موجود اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے۔ جہاں صد ہا ہزار آدمی کا ذہن نہیں پہنچتا۔ علوم میں بھی یہ امر مشاہدہ ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ تمام تشریح و تفسیر کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہیں۔ تو جماعت کی رائے کا ہونا بھی محتمل ہے۔ اب بتلائے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہو تو عمل کس پر ہوگا۔ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے تو بادشاہ اپنی رائے پر

کرتے ہیں۔ کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تنہا رائے قابل اعتبار نہیں اور وہ نااہل ہے۔ تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہیں ہم ان سے گفتگو نہیں کرے انکو جمہوریت مبارک ہو۔ ایسا نااہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنالیا جائے۔ اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اہل حل و عقد اور لے جماعت عقلاء بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صاحب الرائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو۔ اور جس کی رائے میں اتنی زراعت نہ ہو اسکو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ۔ اب بتلاؤ کہ جس کی رائے اتنی زریں ہو کہ سارے عالم کے مقابلہ میں بھی اسکی رائے کے صاحب ہونے کا احتمال ہو وہ حکومت شخصی کے قابل ہے یا نہیں؟ یقیناً قابل ہے بشرطیکہ اہل حل و عقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔

شخصی سلطنت بس ہم شخصی سلطنت کے اس لئے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو زرین العقل صاحب الرائے سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لئے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نااہل سمجھتے ہو۔ تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے جس کے لئے ضم غمیمہ کی ضرورت ہو بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بنا دینا جو ضم غمیمہ کا محتاج نہ ہو۔ مستقل الرائے ہو۔ اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے صاحب العقل زریں سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور کامل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا مناقہ ہونا بدیہی ہے۔

بعض لوگوں کو یہ حقاقت سوجھی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنے چاہتے ہیں اور اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ **وَشَاوَرَهُمْ فِي الْأُمُورِ** مگر یہ بالکل غلط ہے۔ ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کر دیا اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا۔

حضرت بریدہؓ کا واقعہ | اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ قصہ یہ ہوا کہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہا پہلے باندی تھیں اور

۱۴۔ اور تم معاملات میں ان سے مشورہ کرو۔

عمل نہیں کر سکتا بلکہ یکشرت رائے سے مغلوب ہو کر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کر سکتا ہے۔ اور جمہوری میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں سب مجبور ہیں غلط رائے کی موافقت پر۔ اور یہ کتاب بڑا ظلم ہے۔ اس لئے یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہئے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جاوے خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو۔

مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی

سرسید اور مولانا محمد حسین میں مکالمہ

جو کثرتِ رائے پر فیصلہ کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو کیونکہ قانونِ فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاً کم ہیں اور بیوقوف زیادہ۔ تو اس قاعدہ کی بنا پر کثرتِ رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہو گا۔ سید احمد خاں نے جواب دیا کہ دنیا میں جو عقلاً کی قلت اور بیوقوفوں کی کثرت ہے یہ اس صورت میں ہے جب کہ بہت سے آدمیوں کو کیفِ مآلِ تقویٰ جمع کر لیا جا دے تو ان میں واقعی بیوقوف زیادہ ہوں گے لیکن جن لوگوں کی کثرتِ رائے پر فیصلہ کرتے ہیں وہ کیفِ مآلِ تقویٰ جمع نہیں کئے جاتے بلکہ انتخاب کر کے خاص خاص آدمیوں کی کمیٹی بنا لی جاتی ہے جس میں سب عقلاً رہی ہوتے ہیں تو ان میں جس طرف کثرت ہوگی وہ بیوقوفوں کی کثرت نہ ہوگی بلکہ عقلاً کی کثرت ہوگی مولانا نے جواب دیا کہ بہت اچھا۔ لیکن عقلاً میں بھی قانونِ فطرت یہ ہے کہ کامل عقل تھوڑے ہیں اور ناقص العقل زیادہ۔ چنانچہ تجربہ کر لیا جائے کہ ہزار عاقلوں میں کامل العقل ایک دو ہی ہوتے ہیں تو عقلاً میں بھی کثرت انھیں لوگوں کی ہے جو ناقص العقل ہیں۔ پس کثرتِ رائے پر فیصلہ اگر حماقت کا فیصلہ نہیں تو کم عقلی کا فیصلہ تو ضرور ہی ہو گا۔ سید احمد خاں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بالکل خاموش ہی ہو گئے

کثرتِ رائے | غرض صحیح رائے پر عمل کرنا بدون شخصی حکومت کے ممکن نہیں جمہوری میں تو کثرتِ رائے کا اتباع لازم ہے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح ہو بلکہ مولانا محمد حسین صاحب کے موافق کثرتِ رائے اکثر غلط ہی ہوگی تو گویا جمہوری میں اکثر غلط رائے پر عمل ہوتا ہے اور اور ظاہر ہے کہ جب تک صحیح رائے پر عمل نہ ہوگا اس وقت تک انتظام درست نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہو گیا کہ انتظام بدون شخصی حکومت کے نہیں ہو سکتا۔ دوسرے جو لوگ کثرتِ رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں۔ وہ بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے۔ وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم

اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا ان کے آقا نے کر دیا تھا۔ جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں اگر چاہیں فسخ کر دیں۔ اصطلاح شریعت میں اس کو اختیار عتق کہتے ہیں اس اختیار کی بنا پر حضرت بریرہ رضی اللہ عنہ نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا لیکن ان کے شوہر کو ان سے محبت تھی۔ وہ صدمہ فراق میں مدینہ کی گلی کوچوں میں روتے پھرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر رحم آیا اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے آپ نے فرمایا کہ اے بریرہ کیا اچھا ہو اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو۔ تو وہ دریافت فرماتی ہیں کہ یا رسول اللہ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ کی ایک فرد ہے۔ اگر حکم ہے تو بسر و چشم منظور ہے گو مجھ کو تکلیف ہی ہو آپ نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے۔ تو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے صاف عرض کر دیا کہ اگر مشورہ ہے تو میں اس کو قبول نہیں کرتی۔

مشورہ کا درجہ

یعنی اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ تو بدرجہ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے چنانچہ جب حضرت بریرہؓ نے حضور کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضور نے ان سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوئے نہ حضرت بریرہ کو کچھ گناہ ہوا نہ ان پر کچھ عتاب آیا۔ سو جب امت یا رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکہ مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے اس کی خلاف کبھی نہ کرے پس شاد وہم فی الامور سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کیلئے مجبور ہے۔ اور جب تک یہ بات ثابت نہ ہو اس وقت تک شاد وہم فی الامور جمہوریت پر گزرتا ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو ہم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیوں کہ مجبور کرتے ہو۔ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اور ہمارے پاس حدیث بریرہ رضی اللہ عنہا سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورہ پر عمل نہ کرنا ضروری نہیں خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو۔

مشورہ پر عمل ضروری نہیں

اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورے پر عمل کرنے کیلئے مجبور ہرگز نہیں ہیں بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ کے مشورے کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل کریں یہاں إِذَا عَزَمْتَ صیغہ واحد ہے۔ معلوم ہوا کہ عزم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرت رائے پر ہوتا تو إِذَا عَزَمْتَ نہ فرماتے بلکہ اس کی بجائے اِذَا عَزَمْنَا لَکُمْ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فرماتے۔ پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جزو خود ان کے دعویٰ کی تردید کر رہا ہے مگر انکی حالت شبہ حفظت شیعاً و غایت عنک اشیاء کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا۔ کہ از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کہ چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں اہل مشورہ انکو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں چنانچہ شریعت میں انشیراداً المحکام دھو حاکم علیہم، کہیں نہیں کہا گیا۔ جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ لازم نہیں تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی۔ کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے چاہے بادشاہ ان سے رائے مان لے یا نہ لے۔ یہاں تک کہ اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لئے کوئی حکم نافذ کر دے تو اس پر چاروں طرف سے دے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدوں مشورہ لئے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا۔ بھلا رعایا کو یہ حکم میں اسلام میں کہاں دیا گیا ہے ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں۔ پس یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تسلیم ہے۔ (تفصیل الاختلاط مع الانام ص ۱۸)

(۱۲) امن عامہ کامل طور پر دین پر قائم ہونے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے

مولوی اسی کو روتے ہیں کہ آپ کے گھر میں آگ لگی ہے۔ لیکن آپ کو خبر نہیں، صابو! غضب ہے کہ غیر تو میں تو اسلام کی تعریف کرتی چلی آرہی ہیں اور ہم اسلام کو چھوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ غرض چونکہ ہم لوگوں نے دین کا ست نکال لیا ہے اس لئے میں بتلاتا ہوں کہ دین واقع میں چند چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے اور وہ پانچ چیزیں ہیں عقائد، عبادات، معاملات، آداب، معاشرت باطنی، یعنی یہ کہ تکبر نہ ہو ریاء نہ ہو، تواضع ہو، اخلاص ہو۔

قناعت ہو، شکر ہو، صبر ہو، وعلیٰ ہذا۔ پس ان پانچ چیزوں کا نام دین ہے اس وقت کسی نے کسی کو کسی نے کسی کو چھوڑ رکھا ہے۔ کسی نے اعمال کو چھوڑا، کسی نے معاملات کو، کسی نے معاشرت کو، اسی طرح اپنی معاشرت کو چھوڑ کر غیروں کی معاشرت کو اختیار کر لیا ہے۔ اور بعض نے اخلاق باطنی کو چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ ان اخیر کے دو جزوں کو تو قریب قریب سب ہی نے چھوڑ دیا ہے۔ اس تفصیل کے بعد حاصل آیت شریف کا یہ ہوا کہ دین کو یعنی ان پانچ چیزوں کو اصلاح فی الارض میں اور ان پانچوں کے اخلاق کو انسانی الارض میں دخل ہے۔ بس اب کو دیکھ دیے۔

مشاہدہ کہ اصلاح فی الارض میں جدا جدا ہر ایک کا کیا دخل ہے۔ سنو! بعض کا دخل تو بین ہے۔ مثلاً اخلاق ان اثر امن عام میں ہیں اور درمی غور سے معاملات کا اثر بھی امن عام میں ظاہر ہو جائے گا۔ کیونکہ محکم معاملہ کا اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی کا حق ضائع نہ کیا جائے۔ پس معاملات کو بھی اتفاق میں بڑا اثر ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے موافق ہوں۔ کیونکہ آپ کی رائے ان مصالح کی رعایت نہیں کر سکتی جیسی کہ شریعت نے کی ہے۔ جیسے پھل فروخت کرنا کہ آپ نے قبل از وقت پھل فروخت کئے تو اس صورت کو شریعت نے حرام کیا ہے۔ کیونکہ پھل آئے سے پہلے فروخت کرنے میں معدوم کی بیع ہے اور بیع معدوم میں کسی نہ کسی کا ضرر ضرور ہوتا ہے۔ اور شریعت کے موافق کرنے میں کسی کا ضرر نہیں۔ تو امن قائم ہوگا۔ تو ان دونوں کا اثر تو دنیا کے انتظام میں صاف معلوم ہوتا ہے باقی اور تین چیزوں امن عام میں دخیل ہونا سو یہ ظاہر ہے اس لئے اس کو بھی ثابت کرنا ضروری ہے کہ یہ تین چیزیں بھی امن عام میں دخیل ہیں۔

عقائد

سوا دل یعنی عقائد کو تو لیوں سمجھو کہ توحید اور رسالت اور معاد، ام العقائد ہیں اور ان سب کو امن عام میں دخیل مان لیا ہے اس کی تسلیم سے یہ دعویٰ بھی ثابت ہو جائیگا ایک مثال بطور نمونہ کے عرض کرتا ہوں کہ مثلاً اخلاق میں جھوٹ نہ بولنا، سچ بولنا، ہمدردی کرنا، خود غرضی نہ کرنا داخل ہے اور یہ اصول تمدن میں سے بہت بڑی چیزیں ہیں جن پر تمام دنیا کا مدار ہے لیکن واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ اخلاق و دشمنوں میں پائے جائیں جنہیں ایک تو توحید و رسالت کا قائل ہے۔ اور دوسرا قائل نہ ہو تو یقیناً دونوں میں بہت بڑا فرق ہوگا۔ یعنی منکر توحید میں تو یہ اخلاق محدود العمر ہوں گے، اس طرح سے کہ جب تک ان اخلاق پر عمل کرنے میں اس کے دنیاوی منافع فوت نہ ہوں یا اس کے خلاف عمل کرنے سے دوسروں کو خبر ہو کر رسوائی کا اندیشہ ہو اس وقت تو ان اخلاق پر عمل کیا جائے گا اور اگر کوئی ایسا موقع آ پڑے گا کہ ان اخلاق

عمل کرنے سے دنیوی ضرر ہوتا ہو اور ان کے خلاف کرنے میں کسی کو خبر بھی نہ ہو جس میں اندیشہ بدنامی نہ ہو تو اس منکر توحید و رسالت کو کبھی ان اخلاق کے ترک کی پروا نہ ہوگی۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بے دین سلطنتوں میں آپس میں معاہدہ ہوتا ہے تو اس کی پابندی اسی وقت تک کیجاتی ہے جب تک اپنے منافع حاصل ہوتے ہیں یا خلاف کرنے میں اپنا ضرر ہوتا ہے اور اگر خلاف کرنے میں اپنا ضرر نہ ہوتا ہو تو عہد شکنی میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوتا۔

ندہی طاقت کی مثال

یا قرض کر دکھ دو شخص ہم سفر ہوں جن میں ایک کے پاس ایک لاکھ روپے کے نوٹ ہوں اور دوسرا ایسا ہو کہ اس پر فائدے گزرتے ہوں اور اتفاق سے وہ متمول انتقال کر جائے۔ اور دوسرا رقیق سفر کو ان نوٹوں کے لئے لینے کا موقع ملے اور عاقل بھی اتنا بڑا ہو کہ بلا تکلف انکو فروخت کر کے اور اس مرحوم کے ورثہ میں بھی صرف ایک نابالغ بچہ ہو اور ان نوٹوں کی کسی اور کو خبر بھی نہ ہو کہ اس شخص کے پاس یہ ذخیرہ ہے اس صورت میں اخلاق اور نفس میں کشاکش ہوگی۔ اخلاق کا فتویٰ تو یہ ہوگا کہ یہ روپیہ اس وارث کو دینا چاہئے اور نفس کا فتویٰ یہ ہوگا کہ جب اس روپے کے رکھ لینے میں کوئی بدنامی نہیں۔ کسی قسم کا اندیشہ نہیں تو پھر اس کو کیوں نہ رکھ لیا جاوے۔ اس کشاکش میں میں نہیں سمجھتا کہ نری اخلاقی قوت انسان کو اس عظیم بہکے سے بچالے پس جس شخص کو نری اخلاقی تعلیم ہوئی ہے وہ ہرگز اس خیانت سے نہیں بچ سکتا، البتہ جو اخلاقی تعلیم کے ساتھ خدا اور قیامت کا بھی قائل ہے وہ اس سے بچ سکتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں یہاں بچ گیا اور مجھے دنیا میں خمیازہ بھگتنا نہ پڑا تو قیامت میں تو ضرور ہی بھگتنا پڑے گا۔

خوف خدا کا اثر

اسی طرح ایک اور جزئی یاد آگئی کہ میرے پاس اکثر ایسے ٹکٹ آجاتے ہیں کہ ڈاک خانے کی ہر سے بالکل بچے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر میں ان کو استعمال کو لوں تو کوئی بھی باز پرس نہیں کر سکتا کیونکہ ٹکٹ میرے پاس ڈاک خانے والے ہوتے ہیں نہ کوئی دوسرا دیکھنے والا ہوتا ہے لیکن محض خدا کے خوف سے اکثر میں سب سے اول ان ہی کو چاک کر کے پھینک دیتا ہوں۔ اس کے بعد خط پڑھتا ہوں علیٰ ہذا اگر روز مرہ کے واقعات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسروں کے حقوق کی پوری حفاظت جب ہی ہو سکتی ہے جب دل میں خدا کا خوف ہو۔ یہ مثال نمونہ کے طور پر بیان کی ورنہ غور سے معلوم ہوگا کہ تمام مسائل تمدن میں اس کی ضرورت ہے کہ مبدأ اور معاد کا معتقد ہو۔ اس کی تفصیل کے لئے رسالہ مآل التہذیب

دیکھنے کے قابل ہے اس میں دکھلایا ہے کہ اس مخرج تہذیب کا مال دنیا ہی میں ہونے والا ہے۔ انھوں نے ایک مفسدہ کو نکھایا ہے۔ اور ختم پر ہر جگہ یہ کہہ دیتے ہیں فویل یومئذ للمعدن بین غرض امن عام اور تمدن اس وقت باقی رہ سکتا ہے جب اخلاق درست ہوں اور اخلاق کی کامل درستی جیب ہی ہو سکتی ہے کہ عقائد درست ہوں۔

اعمال کا دخل اب اعمال کا دخل لیجئے۔ یہ بھی انشاء اللہ اخلاق کی ضرورت تسلیم کر لینے سے ثابت ہو جائے گا۔ نسب کو معلوم ہے کہ اخلاق میں بڑی چیز تواضع ہے۔ اس کے نہ ہونے سے تمام عالم میں فساد پھیلتا ہے کیونکہ فساد کا مبنی ہے نا اتفاقی اور نا اتفاقی تکبر سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ اگر تکبر نہ ہو اور آپ مجھ کو بڑا مانیں اور میں آپ کو بڑا مانوں تو نا اتفاقی کی کوئی وجہ نہیں۔

تو اتفاق کے لئے تواضع کے پیدا کرنے اور تکبر کے مٹانے کی ضرورت ہے۔ اور اس تواضع کی عادت نماز سے خوب ہوتی ہے۔ نفس کا یہ خاصہ ہے کہ اگر کہیں اس کو ذلت سکھائی جائے تو اس میں فروغیت پیدا ہوتی اور نماز میں تو اول سے اللہ اکبر کی تعلیم ہے۔ تو جو شخص پانچ وقت زبان سے اور دل سے اللہ اکبر کہے گا اور جو ارجح سے رکوع اور سجدہ کرے گا۔ زمین پر پیشانی رکھے گا وہ کیونکر اپنے کو بڑا سمجھے گا۔

خدا کی خدائی پر اعتقاد کا نتیجہ اگر کہو اس سے تو یہ ہو گا کہ اپنے کو خدا سے بڑا سمجھے گا لیکن دوسروں سے تو بڑا نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہ نا تجربہ کاری کا اثر ہے۔ دیکھو اگر تحصیلدار اپنے جوش حکومت میں تحصیلداری کر رہا ہو اور جانتک لفٹنگ گورنر آجائے تو خود اس کے ذہن میں بھی وجداناً سب اختیارات منسوب ہونے لگتے ہیں اس وقت اگر کوئی حضور بھی کہہ دیتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے گولی مار دی تو جس کے دل میں خدا کی عظمت ہوگی وہ اپنے کو جیونٹی سے بھی مغلوب و ناتواں سمجھے گا کیونکہ بڑوں کے سامنے ہوتے ہوئے جھوٹوں پر بھی حکومت نہیں رہتی۔ تو اللہ اکبر کی وہ تعلیم ہے کہ اس سے تکبر کی بالکل جڑ کٹ جاتی ہے اور پھر اس سے نا اتفاقی کا جاتا رہنا لازمی ہے۔

اعمال دین کے اثرات علیٰ انہذا قوت بہیمہ سے سینکڑوں فساد لڑائی بجھ کر طے دنیا میں ہوتے ہیں اور روزہ سے قوت بہیمہ ٹوٹی ہے

اسی طرح زکوٰۃ لینے والے کے علاوہ دوسروں کو بھی زکوٰۃ دینے والے کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔

دیکھو حاتم طائی بوجہ سخاوت کے سب کو محبت ہے اور اتفاق کا مبنی یہی محبت ہے تو دیکھو زکوٰۃ کو اتفاق میں کتنا بڑا دخل ہے۔

علیٰ ہذا ج پر غور کیجئے کہ اس میں ساری دنیا کے آدمی ایک شغل میں، ایک زمانہ میں ایک مکان میں جمع ہوتے ہیں اور تمام سامان تکبر سے خالی ہو کر ایک عظیم الشان دربار میں حاضر ہوتے ہیں جس کو اتفاق و اتحاد میں بہت دخل ہے جیسا اور پر مذکور ہوا۔ اور اسی اتفاق فی الخیال کا اثر ہے کہ دوسرے مجموعوں میں جن کو مجمع حجاج سے کچھ بھی نسبت نہیں ہوتی بہت سی واردات ہو جاتی ہیں اور وہاں بہت کم حادثے پیش آتے ہیں۔

البتہ اگر لوگ شاید بدوؤں کے شاکی ہوں گے۔ سواصل میں ان کا مقصود سلب قتل نہیں ہے بلکہ وہ ایک درجہ میں حجاج کی بے پروائی کا انتقام لیتے ہیں ان کی حالت بالکل یہاں کے گاریباؤں کی سی ہے کہ اگر گھاس دانہ زیادہ دے دیا تو خوش ہیں ورنہ پھر دیکھئے کیسے پیر پھیلاتے ہیں۔ ویسے ہی اگر بدوؤں کی مدارات کیجائے انکو انعام کے طور پر کچھ زیادہ دیدیا جائے تو وہ بہت آرام پہنچاتے ہیں۔

اور یہ جو سننے میں آتا ہے بدو پتھر مار کر مال چھین لیتے ہیں۔ تو اول تو بہت کم ایسا ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو ویسے بدوؤں کے ہاتھ سے جو اس مجمع کے نہیں بلکہ وادیوں میں دیہات کے لوگ پھیلے رہتے ہیں۔ وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب کہ خود اپنی حفاظت نہ کر کے کہیں قافلے سے آگے پیچھے رہ جائے۔

غرض حجاج کو اتفاق دامن میں بہت بڑا دخل ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اعمال از سر تاپا تواضع سے پُر ہیں۔

اب رہی معاشرت۔ سوائس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جتنے طریقے ناجائز ہیں وہ سب کے سب وہی ہیں جن سے تکبر ٹپکتا ہے۔ مثلاً ناجائز دفع سے شریعت نے منع کیا۔ سو جتنی ناجائز اوضاع ہیں ان سب میں تکبر ہے۔ جو لوگ خلاف شریعت وضع رکھتے ہیں وہ غور کریں کہ

اس وقت ان کے دل کی کیا حالت ہے اور اس حالت کو یاد رکھیں اور پھر ایک ہفتہ شریعت کے موافق وضع لباس اختیار کر کے اس کا اثر دیکھیں تو ان کو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ یہ تو سمجھ میں آنے والی تقریر ہے۔

عقائد و اعمال کی خاصیت ایک دوسری تقریر اور ہے جو ان تینوں میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہر چیز میں ایک خاصیت ہوتی ہے۔ پس اس طرح اعمال میں بھی ایک خاصیت ہے اور عقائد میں بھی اور معاشرہ میں بھی اور وہ یہ کہ ان سب سے قلب میں ایک سوز پیدا ہوتا ہے اور اس سوز سے اس کی وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ۔

اب میں ایک اور بات کہتا ہوں جو تمام اجزاء دین کو عام ہے وہ یہ کہ دین کی ہر غرض ہی نہیں کہ دنیاوی نفع ہو بلکہ مقصود اس سے رضائے حق ہے اور جب خدا تعالیٰ راضی ہوں گے تو وہ خود ہی اس کی تمام مصالح دنیویہ کی رعایت فرمائیں گے۔ من یقن الله یجعل لہ فخر جہاد یومزقہ من حیث لا یحسب ۷

پس دین کی درستی کو اس طرح دنیا کی درستی میں دخل ہو مگر دین کے کام اس نیت سے بھی نہ کرنا کہ خدا راضی ہو گا تو دنیا کے کام بنیں گے بلکہ صرف اس لئے کہ

دلارامی کہ داری دل درو بند :۔ وگر چشم از ہمہ عالم فرو بند اور جو مصلحتیں ملنے آئیں بھی تو یہ پڑھ دو کہ

مصلحت دیدن آست کہ یاں ہر کار :۔ بگزاردن خم طرہ یارے گیرند زند عالم سوز را با مصلحت بین چہ کار :۔ کار ملک است آنکہ تدبیر تجل بایش

ہمیں مصلحتوں سے کیا لینا مگر حاصل ضرور ہوگی۔ وفا دار نوکر وہ ہے کہ آقا کی رضامندی کو اپنی مصلحت پر مقدم رکھے۔ اور کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ کرے ورنہ اس کو غرض اور خود کام کہا جائے گا۔ پھر آقا اپنے کرم سے خود ہی اس کی مصلحتوں کی رعایت فرمائے گا۔ اور اگر دیکھا جائے تو راحت بھی اسی میں ہے کہ کسی کے حکم کے تابع رہے چاہے مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور اگر ہر کام میں مصلحت سوچا رہے تو کام کچھ نہ کر سکے گا۔

میں نے تین تقریریں کیں۔ ہر تقریر سے یہ ثابت ہو گیا کہ دین کو، طاعت کو امن عام میں بہت دخل ہے اور یہ تین تقریریں اس لئے کیں کہ مذاق مختلف ہیں۔ یہ تو اعداد دینیہ کی

خوبی ہے کہ ان سے ہر مذاق کے پسند پر دین کا حسن ثابت ہو گیا تو دین گویا اس شعر کا مصلحت ہی ہے

بہار عالم حشش دل دجاں تازہ می دارد

برنگ اصحاب صورت را بہوار باب معنی را

غرض جس پہلو سے چاہو پرکھو، الحمد للہ یہ بات ثابت ہو گئی کہ امن کی صورت ہے تو احکام خداوندی کی پابندی سے ہے۔ (ضرورۃ العلماء ص ۱۲)

۱۳۔ دین میں تنگی اور دشواری نہیں ہے

اس کے دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ قانون کی پابندی کرنا پڑتی ہے اور یہ دشوار ہے۔ اور ایک یہ کہ خود قانون ہی سخت ہے۔ تو اسلام میں کون سی دشواری ہے آیا یہ کہ خود قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے تو تسلیم ہے کیونکہ اس میں ضرور دشواری ہوتی ہے خواہ کتنا ہی سہل قانون ہو۔ مثلاً جو لوگ کہ عدالت میں نوکر ہیں اور ان کا وقت دس بجے سے ہے تو کیا کبھی یہ پابندی دشوار نہیں ہوتی۔ ضرور ہوتی ہے اور اس وقت کہتے ہیں کہ نوکری بڑی ذلت کی چیز ہے مگر اتنی ہی بات پر اس کو کبھی نہ چھوڑ دیا۔ تو جب قانون کی پابندی ہوگی اس میں دشواری ضرور ہوگی تو اگر اسلام میں یہ دشواری ہے تو تسلیم ہے بلکہ اس کو تو خود ہی ثابت کرتے ہیں لا تبغوا الہویٰ اور اس سے صاف انہا لکبیرۃ الاعلیٰ الخاشعین۔

غرض یہ دشواری تو تسلیم ہے مگر اس میں اسلام کی کیا تخصیص ہے تو سبھی کام میں بلکہ کھانے میں بھی ہے۔ کوئی اپاہجوں سے پوچھے خاص کر واجد علی شاہ کے احادیث سے کہ کھانا کتنا مشکل کام ہے۔

ایک حکایت مشہور ہے کہ داجد علی شاہ کے یہاں دو اہدی تھے ان میں باری اس طرح تھی کہ ایک لیٹا ہوا آرام کرے دوسرا بیٹھا ہوا اس کی حفاظت کرے اسی طرح ایک لیٹا ہوا تھا ایک بیٹھا ہوا، ایک سوارا دھر سے گذرا۔ لیٹے ہوئے نے پکارا کہ میاں سوارا ذرا یہ بیرو میرے سینہ پر رکھا ہے میرے من میں ڈل دو۔ اس کو آرام طلبی سے سخت

حیرت ہوئی۔ اور اس سے زیادہ حیرت یہ ہوئی کہ اس کا رفیق جو پاس بیٹھا ہے اس سے اتنا کام نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بیٹھے ہوئے سے کہا کہ بھائی تو ہی اس کے منہ میں ڈال دے۔ وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ جناب میری آپ کی لڑائی ہو جائے گی۔ آپ کو کیا خبر میرے ساتھ کیسا ہے۔ کل میں لیٹا تھا یہ بیٹھا تھا مجھ کو جو جمائی آئی اس سے منہ کھل گیا۔ ایک کتا اگر منہ میں موتنے لگا، یہ بیٹھا ہوا کھٹکا رہا اور اس سے اتنا نہ ہوا کہ کتے کو ہٹا دے، میں ضرور اس کے منہ میں پیرد دگا۔ یہ سوار حیرت میں غرق ہو گیا اور لا حول پڑھتا ہوا چل دیا۔

تو حضرت اگر کوئی احادیث سے پوچھے تو ان کو کھانا بھی مشکل ہے۔ ہمارے عزیز و بھائی ہیں ایک چھوٹے ایک بڑے۔ بڑے صاحب ہاتھ پاؤں لپیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور چھوٹے سے کہتے ہیں کہ میرے منہ میں لقمے دے کر مجھ کو کھانا کھلا۔

دشوازیوں کی قسمیں
تو ایسی نظریں بھی موجود ہیں اور رہیں گی تو اس طرح تو کھائے میں بھی دشواری ہے اور اس میں شرعی اور قانونی پابندیاں بھی ہیں مثلاً یہ کہ دوسرے کی چیز نہ کھاؤ اور ڈکیتی نہ ڈالو مگر اس کو کسی نے کہا کہ بڑا سخت قانون ہے۔ وجہ یہ کہ آپ کو ڈکیتی ڈالنا ہی نہیں ہے۔ اس لئے آپ کو اس کی ممانعت کا قانون سخت معلوم نہیں ہوتا۔ اور رشوت لینا مقصود ہے اس لئے اس کی ممانعت سخت معلوم ہوتی ہے لیکن جو دیکتی ہمیشہ ہیں ان سے کوئی پوچھے اس ممانعت کے قانون کو کتنا سخت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایک عجات بے ہودوں کی ایسی بھی ہے کہ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی سلطنت نہ ہو حالانکہ ضرورت سلطنت کا قانون امر فطری ہے مگر یہ ان کو گراں ہے۔ تو ایسے لوگ تو انسانیت ہی سے خارج ہیں۔ تو محض پابندی سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا پھر اسلام ہی پر کون اعتراض ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ پابندی کی ضرورت کو تسلیم اور یہ سختی نہیں مگر خود قانون ہی بڑا سخت ہے تو واقعی یہ دشواری ہے مگر دین میں ایسی دشواری ہی نہیں کہ قانون سخت ہو۔

اب سب شبہ ہو گا کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے تو حقیقت میں اس میں تبلیہیں ہوئی ہے قانون کی سختی تو وہ ہے کہ اگر اس کو سب بھی مان لیں تب بھی دشواری پیش آوے۔ مثلاً یہ قانون ہو جائے کہ اگر چھٹا تک بھر سے زیادہ کوئی کھا دے تو پھانسی ہوگی۔ یہ ایسی سخت بات ہے کہ اگر سب عمل کرنے کا ارادہ کریں تب بھی کیفت ہو۔

اور ایک دشواری اس طرح کی ہے کہ قانون تو نرم ہے۔ اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر

سب اس پر عمل کرنے لگیں تو کسی کو بھی دشواری پیش نہ آوے لیکن اس میں ایک خاص عارض سے سختی پیش آجائے، وہ عارض یہ ہے کہ زیادہ آدمی اس پر عمل نہیں کرتے پس جب تھوڑے آدمی عمل کریں گے تو ان کو دوسروں کی وجہ سے ضرورت تگی ہوگی کیونکہ تعلق معاملات کا ان ہی دوسروں سے ہے۔ تو اس کو قانون کی سختی نہ کہیں گے بلکہ اس سختی کا منشا ان باغیوں کی بغاوت ہے۔

ایک مثال

پہونچ کر کوئی چیز خریدے اور دام دیدے پھر اس سے کہا جائے کہ قانون سلطنت یہ ہے کہ پورے دام لے کر پوری چیز دے دو مگر ہم اس قانون کو نہیں مانتے اسلئے تم کو آدھی چیز ملے گی۔ تو ایمان سے کہتے کہ یہ دشواری قانون کی ہے یا ان بد معاشوں کی بد معاشی۔ قانون کا منشا تو یہ ہے کہ سیر بھر کی سیر بھر دو مگر ان بد معاش لوگوں نے بد معاشی کی اور سیر بھر کی آدھ سیر دی۔ تو اس دشواری سے اگر کوئی گورنمنٹ کو برا کہنے لگے تو وہ احمق ہے یا نہیں۔ تو جو دشواری اس وقت پیش آرہی ہے وہ دشواری یہ ہے جس کو اسلام پر تقویا جاتا ہے۔ کوئی شخص اسلام کا کوئی ایسا قانون بتلائے کہ سب مسلمانوں کے مان لینے اور عمل کرنے کے بعد بھی اس میں دشواری پیش آوے۔ اگر پچاس قباحتیں بھی آجاویں جب بھی شریعت کا کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں بتلا سکتے۔ صرف موجودہ دشواری کی وجہ یہ ہے کہ نافرمانیوں سے سابقہ پڑ رہا ہے۔

مثلاً قرض کی ضرورت ہوئی اب جس کے پاس جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ سود لاؤ۔ تو سود کی حرمت کا الزام شریعت پر دینا اور اپنے کئے کا اسلام پر تقویا ایسا ہے کہ سہ

حملہ بر خودی کنی اے سادہ مرد : ہچوں آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد
مشوئی میں شیر کی ایک لمبی چوڑی حکایت لکھی ہے کہ ایک شیر کو ایک خرگوش نے دھوکا دیا اور کہا کہ میں تمہارے راتب کیلئے ایک موٹا خرگوش لاتا تھا راستہ میں ایک دوسرا شیر ملا اور مجھ سے چھین لیا شیر کو غصہ آیا کہ بتلا وہ کہاں ہے اس نے ایک کنوئیں پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ واقعی اس میں شیر کا عکس نظر آیا پس شیر اس کنوئیں میں جاگودا۔ اندر پہونچ کر معلوم ہوا کہ میں نے اپنے ہی اوپر حملہ کیا تھا مولانا اس کو فرماتے ہیں سہ

حملہ بر خودی کنی اے سادہ مرد : ہچوں آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد
اسی طرح ہم کو بھی اپنی دشواری کی صورت شریعت میں نظر آتی ہے مگر حقیقت میں یہ اپنے اوپر اعتراض ہے۔

اس پر ایک حکایت اور یاد آئی کہ ایک حبشی نے آئینہ دیکھا۔ اس میں اپنی صورت نظر پڑی آئینہ کو بڑے زور سے پتھر پر پھینک مارا کہ ایسا ہی بد شکل تھا تب ہی تو کوئی تجھ کو راستہ میں پھینک گیا۔

ایک اور احمق کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا لوٹے میں ایک ٹکڑا گر پڑا اچانک سے اپنی صورت نظر آئی سمجھا کہ اس میں کوئی کچھ ہے باپ سے کہا۔ ابا اس نے یہ میرا ٹکڑا لے لیا۔ آپ چھینے اٹھے جھانک کر دیکھا تو اپنی شکل نظر پڑی۔ بولے کہ لعنت ہو خدا کی بدھا ہو کہ بچہ کا ٹکڑا اچھین لیا۔ تفت ہے تیری اوقات پر۔ سو وہ تفت کس کو کہہ رہے تھے۔

اسی طرح ہم لوگوں نے آئینہ شریعت میں اپنی شکل کو دیکھا۔ اور وہ تنگی اپنی صفت تھی اس کو شریعت کی تنگی سمجھا۔ حضرت یہ ہے حقیقت سخی کی۔ اور میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک طبیب علاج کر رہا ہے اور بہت شفیق بھی ہے مگر نہ ایسا آراؤ کہ خاک پتھر سب کی اجازت دیدے۔ ظاہر ہے کہ جب غذا میں کھائی جاوے گی تو کسی چیز کی تو ضرور ہی مانع ہوگی اتفاق سے ایک دیہاتی پہونچا۔ کہ صاحب کھاؤں کیا۔ جواب دیا کہ بکری کا گوشت پالک، وہ بولایا تو ملتا نہیں۔ کہا مونگ کی دال۔ کہا یہ بھی نہیں ملتا۔ کہا فیربنی۔ کہنے لگا یہ بھی نہیں۔ پھر خود پوچھا بینگن کھالوں۔ کہا ہرگز نہیں کھانا۔ کر ملا کو پوچھا اس کو بھی منع کر دیا۔ آؤسے بھی روک دیا۔ تو دیہاتی نے کہا کہ صاحب ہمارے یہاں تو یہی چیزیں ملتی ہیں۔ طبیب نے کہا کہ فتویٰ طب کا یہی ہے۔ دیہاتی نے باہر آکر کہا کہ صاحب یہ تو بڑے سخت ہیں کہ یہ بھی نہ کھاؤ وہ بھی نہ کھاؤ۔

تو کیا طبیب پر یہ الزام صحیح ہے یا یہ کہا جاوے گا کہ وسعت تو یہ ہے کہ متعدد چیزوں سب کی اجازت دے دی لیکن وہ مقام ایسا کہ وہ ہے کہ بجز مضر چیزوں کے وہاں کچھ ملتا ہی نہیں تو یہ طب کی تنگی تو نہیں اس شخص کے گھاؤں والوں کی معاشرت کی تنگی ہے۔ اسی طرح حاجت ضروریہ پر نظر کر کے دیکھئے کہ معاش کی ضروری سیبیلوں کو جو کہ قریب الوقوع ہیں اگر تجھیں آپ نکالیں گے تو میں کو شریعت بجز کہے گی اور پانچ کو لایو جو لیکن آپ کے ملک والے ہمیشہ ان ہی پانچ کو استعمال کریں اور میں کو مٹروک کر دیں تو تنگی معاشرت کی ہوئی یا قانون شریعت کی۔ پس یہ الزام تو بھلائیہ و جہ احسن و اکمل رفع ہو گیا۔ اور اگر اس کی تصدیق میں شبہ ہو تو علم دین پر رہے اس سے معلوم ہو گا کہ

شریعت نے ابواب معاش میں کس قدر توسیع کی ہے۔

اب صرف ایک فرما رہی گئی ہے اس میں ہی چاہتا ہے
ایک اشکال اور اس کا حل

میں آگیا کہ شریعت میں تو دشواری نہیں مگر حالت موجود ہیں اس عارض کے سبب کہ ہم کو سابقہ ایسوں سے پڑا ہے جو شریعت پر عمل نہیں کرتے۔ عارضی دشواری تو ہوگی۔ تو ہم پر تو دشواری کا اثر آخر پہونچ گیا البتہ اعتقاد درست ہو گیا کہ شریعت میں دشواری نہیں مگر عمل کس طرح سے کریں کیا لین دین چھوڑ دیں۔ کیونکہ نوکریاں اکثر ناجائز معاملات اکثر ناجائز تجارت اکثر ناجائز تو یہ ایک فرمایہ قابل استماع ہے تو اس کے متعلق بھی سن لیجئے۔

اس میں قدرے تفصیل ہے وہ یہ کہ آپ نے جو چند معاملات کو دیکھا کہ اس عارضی دشواری کے اعتبار سے عام حکم کر دیا کہ سب ہی دشوار ہے۔ غیر مسلم ہے۔ سمجھئے کہ ایسے اعمال دوسم کے ہیں ایک وہ کران کی اصلاح کرنے سے معاش کی گاڑی کچھ آگئی ہے اور ایک وہ کران کی اصلاح سے معاش کا کچھ بھی نقصان نہیں مثلاً وضع شریعت کے موافق بنائے نماز روزہ کرے۔ تنکیر نہ کرے باجا گا جھوڑ دے تو بتلائیے اس میں معاش کا کیا نقصان ہے؟ تو آج ہی سے اصلاح کر لیجئے پس زیادہ اعمال تو آپ کے آج ہی سے درست ہو جائیں گے کیونکہ پچاس عمل میں چالیس ایسے نکلیں گے کہ محض گناہ بے لذت ہیں کہ خواہ مخواہ آپ نے انکو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ آگے دس ہی رہ جاویں گے اس میں اگر آپ کی اصلاح نہ بھی ہوئی تو چونکہ غالب درجہ اعمال ہلالہ کا موجود ہو چکا ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ سے امید ہے کہ بقیہ اعمال کو جو کہ مغلوب و قلیل ہیں درست فرمادیں گے۔

جیسے ایک شعلہ جو الہ کے دیکھنے میں پورا دائرہ شعلہ نظر آتا ہے حالانکہ اس میں بہت چھوٹی قوس نورانی ہے اور بڑی قوس ظلمانی مگر جب نور و ظلمت جمع ہوتے ہیں تو نور ہی غالب آتا ہے اور اس درستی میں گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی خاصیت ہی یہ ہے جیسے مقناطیس کہ بالخاصہ جاذب حدید ہے پس اگر ہم یہ کہیں کہ اعمال ہلالہ میں بھی خاصیت یہی ہے کہ بقیہ اعمال کو درست کر دیتا ہے تو اس کا دعویٰ ہو سکتا ہے مگر میں اس کا راز بھی بتلاتا ہوں کہ اعمال ہلالہ میں ایک اثر ہے کہ اس سے قلب میں قوت ہوتی ہے اور صحابہ کی ترقی کا راز یہی ہے ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ بیماری میں اٹھا نہیں

جاننا مگر نماز کے وقت بلا تکلف کھڑے ہو کر نماز ادا کر لیتے ہیں۔ خوب کہا ہے

ہر چند کہ پیر خستہ دلبس نا توں شدم
ہر گز نظر بردے تو کرم جواں شدم

ان کی خدمت میں جب جی چاہے جا کر دیکھ لیجئے
بندگی سے قوت آتی ہے

کا صرف یہی سبب تھا کہ ہمت نہیں ہوتی تھی مگر جب قوت ہوگی تو تمام موانع مضمحل ہو جائیں گے اور اگر کوئی اس ڈر سے کہ کبھی اصلاح ہو جائے یہ تدبیر بھی نہ کرے تو دوسری بات ہے جیسے کسی نے یہ سن کر کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے کہا تھا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں۔ غرض اس طرح قوت پیدا ہو جاتی ہے اور ضعف جاتا رہتا ہے۔

یہ ہے وہ راز اور اگر بالفرض اصلاح بھی ہوئی تو ایک اور بات تو ضرور پیدا ہو جاوے گی کہ اس معصیت کی مذمت آپ کے قلب میں جمی چلی جاوے گی اور اس سے نفرت پیدا ہو جاوے گی اور یہ مذمت و نفرت آپ کی اصلاح کر دے گی اور آخری بات یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی اصلاح نہ ہوئی تو جرائم تو گھٹ گئے اگر ایک شخص پر چار جرم قائم ہوئے اور وکیل نے کہا کہ تین تو مل سکتے ہیں مگر ایک نہیں مل سکتا۔ تو کیا کوئی یہ کہے گا۔

کہ جوں آب از سرگندشت چہ یک نیزہ، چہ یک دست

ہر گز نہیں بلکہ تخفیف ہی کو غنیمت سمجھیں گے۔ تو اس طرح آپ بھی پچاس جرائم میں سے صرف دس ہی کے جرم رہ گئے۔

اب وہ حصہ رہ گیا جس میں تغیر کرنے سے معاش کا حرج ہے تو ادا تو چونکہ آپ کو شریعت کے احکام نہیں معلوم ہیں اس وجہ سے بہت سے افعال ناجائز صادر ہو جاتے ہیں اگر آپ احکام کی تحقیق کیجئے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تھوڑے تغیر سے وہ جائز ہو جاوے گا۔

چاندی کا مسئلہ مثلاً اگر آپ نے چاندی خریدی تو اس میں مسئلہ یہ ہے کہ چاندی کا مقابلہ اگر چاندی سے ہو تو زیادتی کمی حرام ہے۔ اگر اب کہئے کہ

صاحب اچھا مسئلہ سا کر نرخ کے حساب سے تو سو روپیہ کی چاندی ایک سو بیس بھرتی کر اب سو روپے کی سو بیس روپے بھر ملی۔ اچھا عمل کیا کہ بیس روپے کا خسارہ ہوا۔ اب ساری عمر کیلئے مولویوں کو خیر باد کہہ دیں گے۔

تو سنئے بات یہ ہے کہ اگر مولوی صاحب سے یوں پوچھتے کہ مولوی صاحب جب چاندی

میں زیادتی حرام ہے تو اب اگر اس پر اس خاص صورت میں عمل کریں تو بڑا نقصان ہوگا کیا کوئی جائز شکل بھی معاملہ کی ہے تو مولوی صاحب یوں کہتے کہ ان روپیوں میں ایک گنی بھی ملا تو ایک سو بیس بھر چاندی جو آدگے کی تو پچاس روپے بھر تو پچاس روپیہ کی آدے گی اور باقی کی اس گنی میں شریعت محسوب کرے گی۔ تم کو نیت کرنے کی بھی ضرورت نہیں شریعت خود فیصلہ کر چکی ہے۔ تو اب بتلائیے کیا نقصان ہوا اب مشکل تو یہ ہے کہ علماء سے پوچھتے بھی نہیں۔

صاحبو! پوچھتے رہو، اور میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب کو مولوی صاحب جائز ہی کہہ دیں گے۔ کیونکہ شریعت ان کے گھر کی تو ہے نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہیں جائز کر دیں جیسا کہ ایک مطوف سے ایک بڑھیا نے صفامروہ کی سعی میں تھک کر کہا تھا کہ مولوی صاحب اب تو معاف کر دو۔ اسی طرح بعض لوگ یوں چاہتے ہیں کہ علماء ہند مثل بعض علماء مصر کے کرنے

علماء ہند

لگیں ان بعض علماء نے ایسا کر رکھا ہے کہ جو دنیا میں ہو رہا ہے سب جائز ہے۔ تو یہاں کے لوگ بھی یہی کرنا چاہتے ہیں علماء سے۔ جیسے ایک رئیس نے ایک نوکر سے یہ کام لیا تھا کہ جو ہماری زبان سے نکلے تم اس کی تصدیق کر کے توجہ کر دیا کرو۔ چنانچہ ایک بار اس رئیس کے منہ سے کہ ہم شکار کو گئے ایک ہرن پر گولی چلائی وہ اس کے سم کو توڑ کر مارتھے کو چھوڑ کر نکل گئی۔ سب اہل مجلس ہنسنے لگے کہ سم اور مارتھے کا کیا جوڑ۔ نوکر بولا سچ ہے حضور، وہ اس وقت سم سے پیشانی کھلارہا تھا۔

تو حضور علماء سے تو ایسی تو کری ہوتی نہیں۔ نہ ہم اتنے ذہین ہیں اور نہ خدا کرے کہ ہوں۔ تو حاصل یہ کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سب کو جائز کہہ دیں۔ مگر پوچھ کر دیکھو تو بہت سے اشکالات کا جواب مل جاوے گا۔ تو بہت بڑا حصہ اس عارضی دشواری کا اس طرح ختم ہو جاوے گا۔

ہاں بعض امور پھر بھی ایسے رہ جاویں گے کہ وہ بالکل ناجائز ہوں گے مگر اس میں بھی دو درجے ہیں ایک تو وہ کہ اس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ سکتے ہیں پس اسکو تو چھوڑ دیا جاوے۔ کیونکہ اس کا چھوڑنا مضروع ضروریہ نہیں۔ اور ایک وہ درجہ ہے کہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ دوسرے کام اس کے حوائج ضروریہ کو کافی نہیں۔ تو بادل کا رہ اس کو کرتے رہو اور گویہ جائز تو نہ ہوں گے مگر اس کے متعلق ایک دستور العمل ایسا بتلاتا ہوں کہ اس سے ایسے جرائم خفیف ہو جاویں گے۔ اور یہ کہ اس میں دو برتاؤ کرنا چاہئیں ایک تو یہ کہ ہر روز تو یہ کیا کرے۔ اب تو یہ غضب ہے کہ لوگ تو یہ کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ تو یہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کیا اس پر پڑ پڑنا ہے اور دماغی کچھ کہ

اے اللہ مجھے معاف فرمائیے مواخذہ نہ کیجئے۔

تو یہ کیوں نہیں کرے کیا ایسا کرنے سے نوکری سے موقوف ہو جاوے۔ ہرگز نہیں بلکہ بلکہ تم نوکر ہی رہو گے۔ دوسرے یہ دعا کیا کر دے اللہ کوئی دوسری سبیل نہ نکلی تو یہ شخص شرمندہ گنہگاروں کی فہرست میں تو کھاجا دے گا جرمی گنہگاروں کی فہرست میں نہیں لکھا جاوے گا۔ اور یہ تو وسیع آپ میری ہی زبان سے سنیں گے اور توسیع میں راز شرعی رہے کہ اگر چھوڑنے پر مجبور کیا جاوے تو شاید اس کو چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ کسی گناہ شدید میں مبتلا ہو جاوے مثلاً یہی کہ چلو آریہ بنیں تو یہ توسیع "اے بلا دفع بلا ہائے بزرگ" کا مصداق ہے اور میں کفر سے بچا رہوں کیونکہ جب آدمی نادار ہوتا ہے تو خدا جانے کیا کیا اسکو سوچتا ہے۔

ایک واقعہ

ہمارے حضرت حاجی صاحب جب تھانہ بھون میں رہتے تھے ایک پٹھان حضرت کی خدمت میں دعا کرانے آیا کرتے تھے کہ بھو پر ایک شخص نے جائداد کے معاملہ میں بڑا ظلم کر رکھا ہے۔ حضرت دعا فرمادیتے۔ ایک بار آکر کہنے لگے کہ اب تو اس نے حد ہی کر دی اور جائداد غصب ہی کرتے کو ہے۔ حضرت نے فرمایا بھائی صبر کرو۔ اس نے کہا بہت اچھا دفعۃً حافظ محمد ضامن صاحب حجرہ میں سے نکل آئے اور اس پٹھان سے فرمایا۔ ہرگز موت صبر کرنا جاؤ نانش کرو اور ہم دعا کریں گے۔ اور حضرت نے فرمایا آپ تو صاحبہر شاکر تھے سب چھوڑ کر بیٹھ رہے اس میں واقعی قوت نہیں یہ اگر اسباب معاش کو چھوڑ دے گا تو جب حاجت ستائے گی یہ جھوٹی گواہی دے گا۔ چوری کرے گا تو ایسوں کو صبر نہیں کرایا کرتے۔

تو یہ ہے اصل راز اس توسیع کا۔ تو آپ کسی سے اتنی گنجائش نہ بنیں گے مگر یہ اسلئے ظاہر کر دیا گیا کہ کفر سے بچنا ہے۔ لیکن خدا کے لئے اس کو آپ تمام معامی میں آڑ نہ بنالیں کہ یہ جزو بہت اچھا ہاتھ آیا۔

بات یہ ہے کہ اول تو یہ بہت تھوڑا حصہ ہے سب معامی میں اس کا توڑ یہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اس میں یہ بھی قید لگی ہوئی ہے کہ اس سے نکلنے کی ہر وقت فکر کرتے رہو جیسے کوئی پاخانہ میں بیٹھا ہوا ہو اور تقاضا نکلنے کا رہتا ہے۔

ایک نیک قصہ

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک ایس صاحب ریل میں بیٹھے ہوئے تھے اور کہیں جگہ نہ تھی مگر انھوں نے کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی اور کوئی کچھ کہتا تو دھمکاتے۔ آخر ضرورت سے پانچانہ میں گئے تو چٹنی لگ گئی اور ان کے کھولنے

سے نہ کھلی پڑے پریشان ہوئے لوگوں سے التجا کی سب نے انکار کر دیا۔ آخر بڑی سماجت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو تنگ نہ کرنے کی قسم کھلائی یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ پانچانہ میں ہے اس میں قسم کھلانا جائز نہیں ہے تو جس طرح وہ پانچانہ سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اسی طرح حرام نوکری میں ایسے ہی رہو کیا کوئی پانچانہ میں جا کر غر کرنا ہے۔ بلکہ قید سمجھتے ہیں مگر مجبوری میں کیا کریں۔ بس اس کی یہ حالت ہو گی۔

چونکہ برمیخت بہ بند و بستہ باش :- چوں کشاید چابک و جرستہ باش
تو نکلنے کی فکر کرو۔ کوشش تو کرو، گو کچھ امید نہ بھی ہو اسی کو
انسانی کوشش | فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید :- خیرہ یوسف داری باید دودید
یوسف علیہ السلام کا قصہ ہوا کہ جب زلیخانے دروازہ بند اور قفل کر لیا اور آپ نکلنے کیلئے دوڑے ہیں۔ عجیب توکل اور ہمت تھی کہ باوجود قفل لگے رہنے کے دوڑے اور آخر قفل ٹوٹ کر سب دروازے کھل گئے۔ اس کو فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید :- خیرہ یوسف داری باید دودید
اور اگر نہ بھی کھلے گا تو حق تعالیٰ یہ تو دیکھیں گے کہ یہ تو دوڑا مگر بھی لگ گئی اتنے پر بھی فضل ہو جاوے گا۔

اب بتلائیے اس میں کون سی چیز مشکل ہے میں تو نوکری نہیں چھڑاتا۔ مگر نفور رہیں۔ سو یہ کیا مشکل ہے اب تو یہ بھی نہیں بلکہ معصیت پر ناز ہے۔ بیباکی ہے۔ سو یہ فخر کیسا۔ اور تکبر کیسا۔ اور اہل دین کو ذلیل کیوں کہا جاتا ہے۔ سوال اسباب کا علماء کے ساتھ بڑا اختلاف معاش کے باب میں تھا۔ مگر اس سے زیادہ معاش کے متعلق کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔

تو اب کوں نامرتبہ اختلاف کا رہ گیا اثر قانون تو دشوائے نہیں اور قانون سخت نہیں۔ صرف بات یہ تھی کہ لوگوں کی طرف سے دشواری ہو جاتی ہے۔ تو اس میں بہت بڑی فہرست اصلاح کی تو معاش میں نخل ہی نہیں اور جو نخل ہے اس کا بڑا حصہ تدبیر سے جائز ہو سکتا ہے اور جو تدبیر سے بھی جائز نہ ہو سکے وہ اولاً بہت مختصر ثانیاً اس میں اس طرح رہنے کی اجازت کہ اس سے نکلنے کی کوشش اور کئے پر پھٹنا اور توبہ کرتے رہنا تو اب وہ کون سا جزو ہے جس پر یہ اشکال ہے کہ شریعت کی پابندی بہت سخت ہے۔ تو بحمد اللہ بے غبار یہ ثابت ہو گیا کہ وہا جعل اللہ علیکم

فی الدین من مخرج، (طریقہ) (لفی المخرج ص ۱۵)

۱۴) ہر بات کی دلیل قرآن شریف سے طلب کرنا غلطی ہے

دلائل شرعیہ چار ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع، قیاس۔ جو امران دلائل چار گانہ میں سے کسی ایک سے بھی ثابت ہو وہ دین میں معتبر ہوگا ورنہ رد ہے۔ پس یہ بھی غلطی ہوگی کہ ان چاروں سے حجاج کیا جاوے۔

ایک عام غلطی آج کل ایک عام غلطی یہ بھی ہو رہی ہے کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسئلے کو قرآن شریف سے ثابت کریں، حالانکہ دلائل شریعت کے چار ہیں اگر ان میں سے ایک سے بھی کوئی مسئلہ ثابت ہو جائے گا تو وہ شرعاً ثابت ہو جائے گا۔ چنانچہ ڈاڑھی رکھنے کی نسبت بعضہ کہتے ہیں کہ قرآن شریف سے دلیل لاؤ کہ ڈاڑھی رکھنا فرض ہے۔ اور یہ دلائل کا مطالبہ کرنے والے ایسے حضرات ہیں کہ جن کو خود تحقیق و استدلال ہی سے اصلاً مس نہیں ان کو تو چاہئے تھا کہ محض تقلید کرتے۔ علماء کی۔ قاعدہ عقلی ہے کہ جس فن کا جو جاننے والا ہوتا ہے وہی اس میں دخل دے سکتا ہے اور نہ جاننے والا اگر دخل دے تو اس کو سب ہنستے ہیں۔ یہ قاعدہ ہر جگہ تو جاری کرتے ہیں لیکن دین کے اندر ہر شخص مجتہد ہونے کا مدعی ہے اور ہر کس و ناکس اس میں دخل دینے کے لئے تیار ہے۔ فن ذراعت کو مثلاً میں نہیں جانتا۔ تو اگر میں گیسوں بونے کا طریقہ بیان کروں تو جاننے والے یہ کہیں گے کہ تم کیا جانتے۔ اور تمام عقلا کے نزدیک جواب کا فی سمجھا جائے گا مگر حیرت ہے کہ دین کے بارے میں اگر علماء بعینہ یہی جواب دیتے ہیں تو ناکافی شمار ہوتا ہے۔

ایک مثال یاد رکھو فن کے جاننے والوں کے سامنے تمہارے مطالبہ دلائل کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کے پاس گھڑی ہے اور وہ بڑی معتبر ہے۔ تار گھر سے ملی ہوئی ہے اور ایک شخص قباب کی طرف رخ کئے ہوئے کھڑا ہے۔ گھڑی والا کہتا ہے کہ گھڑی کے اعتبار سے آفتاب چھپ گیا اور اس میں ہرگز غلطی کا احتمال نہیں۔ دوسرا شخص کو دیکھنے والا کہتا ہے کہ آفتاب

میرے سامنے ہے چھپا نہیں اور گھڑی والا اس سے دلیل طلب کرتا ہے اور وہ ہنستا ہے کہ یہ تو کھلی بات ہے۔ آفتاب نظر کے سامنے ہے تم اس طرف منہ کر کے دیکھو۔ آفتاب موجود ہے۔ دلیل کی حاجت نہیں ہے۔

پس جن لوگوں نے دین کے باب میں اپنی عمریں کھپا دی ہیں ان کا قول معتبر ہوگا یا ایک لڑکے کا جو آج ہی بالغ ہوا ہے۔ لیکن دین کا بالغ نہیں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ خلق اطفال اند جز مست خدا۔ نیست بالغ جز ہمدہ از ہوا بہر حال حسیا بالغ ہو یا نہ ہو، روحاً بالغ نہیں ہے۔ بلکہ حسیاً بھی ہم کو تو ایسے لوگ بالغ نہیں معلوم ہوتے اس لئے کہ ظاہری علامت بلوغ کی ڈاڑھی تھی اور وہی صفا چٹ ہے۔ معلوم بھی نہیں ہوتی کہ نکلی ہے یا نہیں۔

شریعت کے دلائل بہر حال ایسے لوگ جن کی یہ حالت ہے کہ علوم دین کی ان کو ہوا تک نہیں لگی وہ دلائل کا مطالبہ کرتے ہیں کہ قرآن شریف سے دلیل لاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ اس سوال کے اندر ایک عوی مضر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اس کے مدعی ہیں کہ شریعت میں قرآن شریف کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے ہم اس دعویٰ پر اول ان سے دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں ہم کو یہ سمجھا دو کہ شریعت میں قرآن شریف ہی دلیل ہے اور کوئی دلیل نہیں۔ خود قرآن شریف سے ثابت ہے کہ علاوہ قرآن شریف کے اور بھی دلائل ہیں۔ فرماتے ہیں۔ دَعَا أَتُكَلِّمُ الرَّسُولَ فَنُفِذْهُمَا وَمَا نَهَكَهُمْ عَنْهُ فَاتَّبَعُوهُ۔ (جو رسول خدا تم کو دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں ان سے ٹک جاؤ)

حدیث رسول اس سے صاف معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اگرچہ وہ قرآن نہ ہو مثل قرآن شریف کے حجت ہے اور کیوں نہ ہو دما ینطق عن الہوی آپ کی شان ہے۔

اجماع امت گفتہ اد گفتہ اللہ بود۔ گرچہ از حلقوم عقبہ اللہ بود اور فرماتے ہیں وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ۔ اس آیت شریف سے اجماع امت کا حجت ہونا معلوم ہوا۔

اور فرماتے ہیں دَعْوَاؤُا إِلَى التَّوْحِيدِ وَإِلَى أَوَّلِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلَّهُمَّ الْذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ

قیاس

اور فرماتے ہیں نَاعَتُ بَرِّدٍ أَوَّلِي الْأَبْصَارِ، یہ آیتیں بتلا رہی ہیں کہ قیاس بھی حجت ہے۔ پس اگر آپ قرآن شریف کو حجت مطلقہ مانتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے بعض عادی مسموع اور حجت اور بعض نامسموع۔ غرض یہ سخت غلطی ہے۔ دیکھئے عدالت میں دعویٰ کی سماعت کے لئے شہادت مطلقہ کی ضرورت ہے۔ مدعی اگر دو با دجاہت آدمیوں کو پیش کر دے تو مدعا علیہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں حج صاحب اور فلاں مولوی صاحب گواہی دیں گے تو مانوں گا اور اگر وہ ایسا کہے تو حاکم ہرگز نہ سنے گا۔ اور یہ کہے گا کہ تم ان گواہوں جرح کرو۔ تو اس کی طرف التفات ہوگا لیکن اگر یہ جرح نہیں تو تمہاری یہ تخصیص کہ فلاں فلاں اشخاص گواہی دیں ایک نوبات ہوگی۔

اسی طرح مسئلہ عقلیہ ہے کہ دعویٰ کے اثبات کے لئے مطلق دلیل صحیح کی ضرورت ہے مستدل جس دلیل کو چاہے اختیار کرے مخاطب کو یہ اختیار ہے کہ اس میں جرح کرے۔ اس کا جواب بذمہ مدعی ہوگا لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے یہ دلیل کیوں اختیار نہ کی۔ اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ کسی مسئلہ شرعی کے اثبات کیلئے مطلق دلیل صحیح کی ضرورت ہے جو ادلہ اربعہ میں سے ہو کسی خاص دلیل کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا البتہ اس کا لحاظ ضروری ہے کہ قطعی دعویٰ کیلئے قطعی دلیل اور ظنی دعویٰ کے لئے ظنی دلیل ہونا چاہئے جس کی تفصیل اپنے مقام پر مذکور ہے۔

غرض ایک تو غلطی یہ ہے اور دوسرے اس کے مقابل یہ ہے کہ ان چاروں سے گذر کر نرے ظن کو ہی حجت سمجھا جائے کہ نرا گمان بھی کسی مسئلہ کا مثبت نہیں ہے بلکہ دلیل صحیح ادلہ اربعہ میں سے ہونا ضروری ہے۔ (حصہ ششم دعوات عبدیت وعظا الفار المجاوزہ ص ۱۲)

آزادی کے معنی

(۱۵)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ آپ رات کے وقت گشت لگا رہے تھے کہ ایک گھر سے گانے کی آواز آئی۔ آپ نے دروازہ کھلوانا چاہا مگر وہ لوگ اس قدر منہمک تھے کہ آپ کی آواز بھی نہ سن سکے آخر آپ مکان کی پشت پر سے اندر تشریف لے گئے حضرت عمر

کی صورت دیکھ کر وہ سب لوگ سہم گئے لیکن چونکہ جانتے تھے کہ حضرت عمرؓ کو ہرگز غصہ نہ آئے گا اسلئے ایک شخص نے جرأت کر کے عرض کیا کہ اے امیر المومنین ہم لوگوں نے صرف ایک ہی گناہ کیا لیکن آپ نے تین گناہ کئے۔ ایک تو یہ کہ آپ بغیر اجازت ہمارے گھر میں چلے آئے حالانکہ قرآن شریف میں صاف حکم ہے۔ لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ مَبْرُورَةٍ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتَسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا۔ دوسرا یہ کہ آپ نے تجسس کیا اور قرآن شریف میں تجسس کی ممانعت ہے۔ لَا تَجَسَّسُوا۔ تیسرے یہ کہ آپ مکان کی پشت پر سے تشریف لائے حالانکہ قرآن شریف میں ارشاد ہے لَيْسَ الْبِرَّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہوں تم بھی اپنے گناہ سے توبہ کر لو۔

آزادی کا دم بھرنے والوں کو اس حکایت سے عبرت حاصل کرنی چاہئے کہ آزادی ان حضرات میں تھی یا آج کے مدعیان آزادی میں یہاں کی طرح نہ نماز کے نہ روزے کے۔ کھا لیا اور ہلایا سب میں عمر گزاری۔ صاحبو! واللہ یہ آزادی نہیں۔ یہ نفس کی شرارت اور اتباع ہوا اور مطلق العنانی ہے۔ یہ آزادی سانڈ کی سی آزادی ہے کہ جس کھیت میں چاہا نہ مار دیا جھڑ چاہا پھل دیا جو چاہا کر لیا۔ تو کیا کوئی آزاد صاحب سانڈ صاحب کو پسند کرتے ہیں۔ اگر اس کا جواب نعم ہے تو آج سے آپ بھی ہماری طرف سے یہی لقب لیجئے، اور اگر لا میں جواب ہے تو پھر ذرا ہربانی کر کے اپنے اور سانڈ میں کچھ فرق بتائیے۔ (نسیان النفس ص ۱۸)

اس اعتراض کا جواب کے علماء کو لیکر دینا نہیں آتا

اہل حق اور جدید طرز کے لوگوں کی تقریر میں جو فرق میں دیکھا وہ یہ ہے کہ جدید طرز کی تقریریں پہلی نظر میں نہایت دقیق اور مؤثر ہوتی ہیں اور حق انھیں میں منحصر معلوم ہوتا ہے لیکن جب ان میں غور کیا جائے تو انکی حقیقت کھلتی جاتی ہے اور ان کا لچر اور کمزور اور خلاف واقع ہونا اور

لے گھروں میں داخل نہ ہو۔ جو تمہارا گھر نہیں۔ یہاں تک کہ اجازت حاصل کر لو اور گھر والوں کو سلام کر لو لے کسی کے پیچھے ٹوہن نہ پڑو۔ تب یہ نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں اس کی پشت کی طرف سے آؤ۔ لے خواہشات نفس سے ہاں لے نہیں۔

پر تلمیح ہونا معلوم ہوتا جاتا ہے اور اہل حق کی تقریریں نظر اول میں بے رنگ اور پھیککی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جتنا ان میں غور کیا جائے تو انکی قوت اور مطابق واقع ہونا معلوم ہو جاتا ہے اور قلب پر نہایت گہرا اثر ان کا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے تمام تعلیمات قلب سے دھن جاتی ہیں۔ یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی نکل آیا جو آج کل کے علما پر مغلہ دوسرے اعتراضات کے وہ بھی کیا جاتا ہے کہ انکو کیچر دینا نہیں آتا وہ جواب یہ ہے کہ جب ہمارے پاس قرآن شریف اور حدیث شریف ہے اور اس کی تعلیمات کا سرمایہ موجود ہے تو ہم کو کسی ظاہری آب و تاب کی کیا ضرورت ہے، خوب کہا ہے

ز عشق تا تمام ما جمال یار مستغنی ست

باب درنگ خال و خطا چ حاجت روئے زیار

سادگی لیکن لکچروں کا طرز سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور ہم تو صاف کہتے ہیں کہ جو شخص لکچر کے طرز کو اختیار کرتا ہے وہ اول ہمارے دل میں ناپسندیدگی کا بیج بوتا ہے ہم کو تو وہی طرز پسند ہے جس کی طرف حدیث شریف میں اشارہ ہے مخی امۃ امیتہ ائمہ کے معنی سادگی کے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل مرضی یہ ہے کہ آپ کی امت نہایت سادہ رہے۔ اسی لئے آپ نے لفظ سخن فرما کر ساری امت کو شامل فرمایا۔ یہی روح ہے اتباع نبوی کی، کہ ہر بات میں بالکل سادگی ہو امیتہ ام کی طرف منسوب ہے مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی ایسی رہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد بچہ کی زندگی ہوتی ہے کہ اس کو کوئی حرکت بھی تصنع اور بناوٹ کی نہیں ہوتی بلکہ ہر حرکت میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ اور بچوں کی یہی صفت ہے جس کی وجہ سے ہر شخص کو ان سے محبت ہوتی ہے ورنہ طبعاً بچوں سے جو کہ نجاست کی پوٹ ہوتے ہیں بہت نفرت ہونی چاہئے تھی اور یہی بے ساختگی ہے کہ جن بوڑھوں میں یہ پانی جاتی ہے آج ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے حسین ان پر جان فدا کرتے ہیں۔ تو اصلی مفہوم امیتہ کا یہی بے ساختگی ہے اور نہ لکھنا پڑھنا جو امیت کا مشہور مفہوم ہے یہ بھی اس کا ایک شعبہ ہے۔

تو بیان میں بھی بناوٹ اور تکلف بالکل نہ ہونا چاہئے اور تبلیس اور تلمیح سے بالکل پاک ہونا چاہئے۔ البتہ بیان

میں سادگی کے ساتھ صفائی ہونی ضروری ہے۔ لیکن اب یہ طرز بالکل چھوٹا جاتا ہے ہم اہل علم کو دیکھتے ہیں کہ ان میں ایک تو رواج زبان کا طرز آ جاتا ہے۔ حالانکہ قطع نظر شریعت کے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ہماری مادری زبان اردو ہے اور اس میں کچھ خصوصیات ہیں جیسا کہ ہر زبان کے لئے کچھ خصوصیات ہوا کرتی ہیں۔ اب اس طرز جدید کو اختیار کر کے انگریزی کی خصوصیات کو زبان اردو میں لے لیا گیا ہے اور وہ روز بروز زیادتی کے ساتھ آتی جاتی ہیں حالانکہ انگریزی کی خصوصیات اس میں بالکل نہیں کھپتی۔

اردو زبان کی خصوصیت ان کی بدولت زبان بالکل بھدی اور خراب ہوتی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں میں اس وقت ایک بڑی جماعت اپنے کو اردو کا حامی کہتی ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ لوگ اردو کے حامی نہیں کیونکہ ہر زبان میں ایک مادہ ہوتا ہے اور ہیئت۔ اور زبان ان دونوں کے مجموعے کا نام ہوتا ہے دیکھ صرف مادہ کا۔ تو جن زبان اردو کی ہیئت باقی نہ رہے گی تو وہ زبان اردو کیونکر رہے گی پس اگر ہم اردو کے حامی ہیں تو ہم کو چاہئے کہ ہم اس کی خصوصیات کو باقی رکھیں۔ اور ہماری گفتگو ایسی ہو کہ اگر کوئی اجنبی سنے تو یہ سمجھے کہ ہم ایک حرف بھی انگریزی کا نہیں جانتے اور نہ انگریزی طرز سے ہم کو مناسبت ہے اور اس سے بھی بڑا تعجب یہ ہے کہ اس وقت عربی طلبہ کی تقریروں میں کثرت سے انگریزی الفاظ آنے لگے ہیں حالانکہ ان کی تقریر میں اگر دوسری زبان کے الفاظ آتے تو عربی کے الفاظ آتے۔ کیونکہ اول تو یہ لوگ عربی زبان کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے عربی ہماری مذہبی زبان ہے اور اس اعتبار سے ان کی اصلی زبان وہی ہے اور اردو زبان تو بہت تھوڑے دنوں سے ہماری زبان ہوئی ہے ورنہ ہماری اصلی زبان اور پیری زبان عربی ہی ہے کیونکہ ہمارے آباء و اجداد عرب ہی سے آئے ہیں اور ہندوستان میں بودو باشس اختیار کر لی ہے۔

اصل اردو غرض جب ہماری اصلی زبان عربی ہے تو اگر ہم کو اردو میں آمیزش ہی کرنا تھا تو اس بنا پر زیادہ سے زیادہ ہم یہ کرتے کہ اردو زبان کو عربی کے تابع کر دیے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ ہم نے انگریزی کے تابع کیا کہ جس کی بدولت اردو زبان قریب قریب اردو ہونے ہی سے نکل گئی۔ اصل زبان اردو وہ ہے جیسے چار درویش یا اردو معنی غالب کی۔ اگر اس میں آمیزش ہو تو عربی کی آمیزش ہونا چاہئے۔ کہ عربی کی آمیزش لطف کو

دوبالا کر دیتی ہے۔ دیکھو فارسی کی عبارت میں اگر کہیں ایک جملہ عربی کا آجاتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گلفشانی ہوگئی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں جو انگریزی کے غلط سے ایک جدت پیدا ہوگئی ہے وہ ضرور قابل ترک ہے اور اس جدید طرز میں علاوہ نقص مذکور کے ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ تلبیس زیادہ ہو سکتی ہے اور پرانے طرز میں یہ بات نہیں ہے۔ اور ایک شرعی پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ اس کو اختیار کرنا ایک فاسق قوم کے مشابہ ہے اور یہ مشابہت خود حرام ہے حدیث میں ہے۔ من تشبہ بقوم فهو منهم کیونکہ تشبہ عام ہے لباس اور طرز سب چیزوں کا اور لوگوں نے اس پر کوئی شخص مولویوں کو متعصب کہے لیکن ہم کو اس کی اصلاح دانا نہیں کیونکہ ہم ایک موقع پر ان کے مسلم دلائل سے اس کا برا ہونا ثابت کر چکے ہیں۔ باقی حدیث تو اپنے ماننے والوں کے لئے پڑھی ہے اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حدیث آپ پر بھی حجت ہے کیونکہ مسلمان تو آپ بھی ہیں۔

غرض اس وقت تقریرات میں تمام خرابیاں پیدا کی گئی ہیں جن سے بسبب قواعد شرعیہ کے چھوڑ دینے کے ان تقریروں کا وجود کا عدم سمجھا جائے گا۔ پس ثابت ہو گیا کہ جس طرح بیان کا وجود حسی موقوف ہے خلق انسان پر اسی طرح اس کا وجود شرعی موقوف ہے تعلیم قرآن پر اور یہی حاصل ہے ان آیات کا اور چونکہ تقاریر میں آج کل یہ نقص عام طور سے پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ جی بھی چاہتا تھا کہ طریقہ بیان کے متعلق ایسی آیت اختیار کی جائے کہ قرآن شریف ہی سے اس کی خرابیوں کا ناجائز ہونا بھی ثابت ہو جاوے۔ سو بحمد اللہ یہ آیت الرحمن، علم القرآن خلق الانسان، علمہ البیان، کہ اس میں تعلیم بیان کی شرط شرعی بھی مذکور ہے کہ قرآن شریف سکھایا۔ کیونکہ غایت اس کی عمل ہے اور بیان اگر حدود شرعی کا لحاظ رہا تو قرآن پر عمل نہ ہوا کیونکہ عمل بالقرآن کے فوت ہونے کے معنی یہی شریعت کا فوت ہونا ہے (تعلیم البیان ص ۱)

لے جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو وہ اسی میں کا ہو گیا۔

(۱۷) ہم لوگ تہذیب میں دوسری قوموں کے

محتاج نہیں ہیں

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج ہیں اور غربت اسلام کو تہذیب سے معزاً سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک ایک چشم کی نسبت مشہور ہے کہ وہ دہلی میں گیا سیر کیلئے چاندنی چوک میں نکلا۔ اتفاق سے آپ کی گردن بھی نہڑ سکی تھی اسلئے جاتے وقت صرف ایک طرف کی دوکانیں نظر آئیں۔ دوسرے جانب کی نظر نہ آئیں۔ جب وہاں سے واپس ہونے لگا تو دوسری جانب کی دوکانیں نظر آئیں۔ انکو دیکھ کر آپ فرماتے ہیں کہ دلی کے لوگ بھی کیا تم کے لوگ ہیں۔ ابھی یہ دوکانیں دائیں جانب تھیں ابھی ہمارے لوٹنے سے پہلے ان کو بائیں جانب اٹھا کر رکھ دیا۔

تو ہمارے بھائیوں نے بھی شریعت کو صرف ایک طرف سے دیکھا اسلئے وہ محتاج سمجھتے ہیں ورنہ شریعت اسلام میں وہ تہذیب ہے کہ دنیا میں کسی قوم کے اندر بھی اتنی تہذیب نہیں ہے چند روز اگر ہمارے پاس رہو اور پھر دیکھو کہ وہ شریعت جس کو آج خوشنوار بتلایا جا رہا ہے۔ وہ کیسی دلفریب ہے۔ جب اس کی حقیقت سے واقف ہو گئے تو اس پر عاشق ہو جاؤ گے اور یہ کہو گے کہ

زفرن تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کہ مشہ دامن دل میکشد کہ جای نجاست

کہ سر سے پیر تک جہاں نظر کر ددل کھنچا چلا جاتا ہے۔ (مفاز المعیشت ص ۱۱)

(۱۸) حضور صلی اللہ علیہ وسلم امریکہ تشریف نہیں لیگے

تو پھر حضور کی بعثت عالم کیسے ہوئی؟

ایک صاحب نے ایک مرتبہ یہ سوال کیا کہ یہ تو میرا اعتقاد ہے کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

بعثت عام ہے۔ لیکن یہ ظہان ہوتا ہے کہ امریکہ میں نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں بھیجا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور کہیں ایسا منقول ہوتا حالانکہ منقول نہیں۔ نیز امریکہ کا حال بہت بعد میں معلوم ہوا ہے کہ ایک جہاز غلط رستے پر ہولیا تھا اور وہ وہاں پہنچ گیا۔ اور اس کو معلوم ہوا کہ یہاں بھی کچھ لوگ رہتے ہیں۔

جب وہاں آپ کی دعوت نہیں پہنچی تو نبوت عام کیسے ہوئی جواب میں فرمایا کہ بعثت عامہ کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ بعثت کے عام ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جب کبھی جس کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر پہنچی اور وہ آپ پر ایمان نہ لائے اور احکام قبول نہ کرے تو وہ کافر ہے اور یعنی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضور کی بعثت کی خبر ساری دنیا کو ہو گئی تھی۔

اس تقریر کے بعد اب کوئی شبہ نہیں ہے۔ پس امریکہ میں جس وقت خبر پہنچی اسی وقت سے وہاں کے لوگ مکلف ہوں گے (مجاہدلت معدلت و دعوات عبدیت حصہ پنجم ملفوظ ۲۱)

(۱۹) جب انسان کی تقدیر میں یہ لکھ دیا گیا کہ وہ

فلاں گناہ کرے گا تو پھر انسان مجرم کیوں؟

فرمایا کہ یہ مجبوری عمل کے بعد معلوم ہوتی ہے یعنی جب گناہ کر چکا اس وقت خبر ہوئی کہ یہ گناہ میری قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ اس کے قبل جب گناہ کیا ہے تو اس کی خبر نہ تھی۔ اور اگر کہا جائے کہ گو اس کو علم تقدیر کا نہ تھا مگر واقع میں تو علم الہی اس کے متعلق تھا اور اس کا خلاف محال ہے تو اس طرح واقع میں مجبور ہوا۔

اب جواب یہ ہے کہ علم الہی اس طرح تھا کہ یہ شخص اپنے اختیار سے ایسا کرے گا تو اختیار منفعی ہوا۔ یا اور مؤکد ہو گیا۔ پھر سوال کیا گیا کہ اگرچہ انسان کا مجبور ہو نا لازم نہیں آتا لیکن خداے تعالیٰ رحیم ہیں اس لئے اگر اپنی رحمت سے ہوائے نفسانی کو پیدا ہی نہ کرتے۔ تو انسان کے لئے بہتر ہوتا۔ اس پر فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی متعدد صفات ہیں، ازاں جلد ایک صفت حکیم ہونا

بھی ہے اور ہر صفت کا ایک خاص ظہور ہے پس جس طرح ہوائے نفسانی وغیرہ کا پیدا ہونا مقضیٰ رحمت ہے اسی طرح ان کا پیدا ہونا مقضیٰ حکمت ہے۔

رہا سوال کہ وہ کیا حکمت ہے؟ اس کا اصل جواب یہ ہے کہ ہم کو اس حکمت کی اطلاع نہیں ہے۔ اور فرمایا کہ یہ جواب کم انہوں کے نزدیک زبردستی کا جواب معلوم ہوتا ہے لیکن اصل جواب یہی ہے۔ البتہ اس جواب کی حقیقت سمجھنے کے لئے اس کے قبل چند مقدمات سمجھنے کی ضرورت ہے جب تک کہ وہ سمجھ میں نہ آئیں اس وقت تک اس کی حقیقت سمجھنی مشکل ہے اور اس وقت تک یہ زبردستی کا جواب نظر آتا ہے۔

پھر فرمایا کہ جب انسان کے ہر عمل میں اختیار کا سلسلہ امور غیر اختیاریہ تک پہنچتا ہے جس سے اہل سائنس بھی انکار نہیں کرتے اور بنا بر تقدیر یہی امر ہے جیسا اوپر بیان ہوا تو اہل طبعیات کو تو تقدیر کا ضرور ہی قائل ہونا چاہئے کیونکہ وہ لوگ اس مسئلہ انتہا الاختیاریہ غیر الاختیار کو اس حد تک مانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے افعال اختیاری کو بھی اس قاعدہ کا پابند کرتے ہیں۔ چنانچہ تخلیق اختیاری کو موقوف مانتے ہیں۔ وجود مادہ قدیم پر، جس کو اختیار خداوندی سے خارج کہتے ہیں۔ گو اہل حق اس کے قائل نہیں پس اس تسلیم کردہ مسئلہ کی بنا پر ان طبعیین کو تو ہم سے زیادہ قائل تقدیر ہونا چاہئے۔

(مجاہدلت معدلت، دعوات عبدیت حصہ دوم ملفوظ ۲۲)

(۲۰) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے سلطنت چھین کر کفار کو کس لئے دیدی

فرمایا کہ جو چیز نہایت صاف شفاف ہو اس پر دھبہ ہونا نہایت ناگوار ہوتا ہے اور جو چیز خود سیلی ہو اس پر ناگوار نہیں ہوتا جیسے ٹوپی چھینٹ لگ جانے سے اتار کر پھینک دیتے ہیں اور جوتے میں لگ جانے سے کوئی ناگواری نہیں ہوتی۔ ایسے ہی مسلمان دعویٰ محبت کرتے ہیں۔ ان سے ذرا سی بے احتیاطی ناگوار ہوتی ہے بخلاف اعداء کے کہ وہ جیتے بھی لے دشمن

لیں گے وہ ترقی نہیں کریں گے بلکہ جو دیں گے وہ تباہ ہوں گے پس یہ طریقہ ترقی کا نہیں ہو سکتا ترقی کا صریح طریقہ خوش معاملگی اور اعتبار ہے۔ مسلمانوں میں خدا کے فضل سے افلاس نہیں۔ مسلمانوں میں ساجر، اہل ملک، رئیس سب طرح کی مخلوق ہے مگر بات کیا ہے کہ دوسری قوموں کو سود دیتے ہیں۔ اس وجہ سے تباہی آتی ہے۔ تو ایسی صورت ہونی چاہئے کہ سود نہ دینا پڑے اور وہ طریقہ صرف خوش معاملگی ہے۔

بد معاملگی کا انجام تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مسلمانوں کو روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور اپنے بھائیوں سے بلا سودی ملتا نہیں اس لئے غیر قوم سے سودی قرض لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور تباہ ہوتے ہیں۔ اور بے سود قرض نہ ملنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دوسرے مسلمانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ ابھی میں عرض کر چکاں کہ مسلمانوں میں بہت مالدار ہیں۔ لیکن وہ بوجہ خوف بد معاملگی کے قرض نہیں دیتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ خود چاہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی امداد کریں اور انکو قرض دیں مگر ڈرتے ہیں کہ دیکر کیا لیں گے اگر خوش معاملگی مسلمانوں میں شائع ہو جائے تو خود آپس ہی ایک دوسرے کی حاجت پوری ہوتی رہے اور سود دینے کی ضرورت نہ پڑے تو جو تباہی کا سبب ہے رفع ہو جائے۔

پس ثابت ہوا کہ بد معاملگی تنزل کا سبب ہے۔ ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ کسی کا روپیہ لیکر دینا نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ اگر کسی غریب کے چار پیسے ہوں گے تو وہ بھی ٹال کر دیں گے اور اس کو لازمہ ریاست سمجھتے ہیں کہ ہم سے تقاضہ کرنے کی مجال نہ ہوئی۔ اسی طرح قرض خواہ کو نہ دیں گے اور بہانہ کر دیں گے کہ بھائی ابھی خرچ نہیں آیا۔ اور اسی حالت میں اگر بچہ کی ہفتہ درپیش ہو جائے یا کوئی شادی کرنا ہو تو بہتر راہ روپیہ اگل دیں گے غرض بد معاملگی کا مرض عام ہے۔

(تعلیم الشرائع ص ۱۱)

کیا تمام علما قرآن شریف میں ہیں (۲۲)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمام علما قرآن شریف میں ہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹروں نے تحقیق کر لیا کہ مادہ منویہ میں کیڑے ہوتے ہیں۔ سو قرآن مجید میں بھی یہ مسئلہ مذکور ہے اس لئے کہ فرمایا ہے خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ،

اصول پر عمل کر لیں تو اللہ میاں ان کو دیدیتے ہیں اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کے دشمن ہی ہیں۔
(مجادلات مودلت حصہ سوم دعواتِ مجددیت محفوظ ص ۲)

اس اعتراض کا جواب کہ سود کے بند کر دینے سے ہماری قوم پر تباہی آگئی

عقلاً ہر وقت اس میں مختلف ہیں کہ تباہی قوم کا کیا سبب ہے میرے نزدیک تو اصل سبب تباہی کا بد معاملگی ہے۔ بعض قوم کے ریفارمر کہتے ہیں کہ سود کے بند کرنے سے تباہی آئی۔ جو قومیں سود لیتی ہیں وہ خوب ترقی کرتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں میں بھی بہت سے سود لیتے ہیں۔ لیکن ان کے کچھ بھی کام نہیں آتا۔ کیوں کہ مال سے مقصود جمع و بقی ہے۔ اور سود خوار جمع کرتے کرتے مرجاتے ہیں اور بسا اوقات جن کے لئے جمع کرتے ہیں انکو بھی نہیں ملتا ہے اور فرض کر دے اگر مجتمع بھی ہوئے تو روحانی ضرر سے تو خالی رہتے ہی نہیں یعنی سخت دل ہو جاتے ہیں۔ کسی پر انکو رحم نہیں آتا کسی کی مصیبت سے ان کا دل نہیں دکھتا اور اپنے رشتہ دار سے بھی سود نہیں چھوڑتے۔ جیسے بیسٹروں کا حال ہے کہ وہ اپنوں کو بھی نہیں چھوڑتے سمجھتے ہیں کہ اگر ان سے نہ لیا تو نرخ بکڑ جائے گا۔ اور اکثر سود خواروں کو ترقی دینی بھی نہیں ہوتی۔ اکثر سود خواروں کا مال ضائع ہوتے ہی دیکھا ہے۔ اور فرض کر دے اگر ترقی بھی ہوئی تو جب دین برباد ہوا تو اس ترقی کو لیکر کیا کریں گے

مباد اول آں فرد مایہ شاد
کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد
یہ تو دینی غلطی تھی کہ سود کو ترقی کا سبب قرار دیا۔
دوسرے ایک دنیاوی غلطی بھی ہے وہ یہ ہے
کہ ترقی کا سبب وہ شئی ہو سکتی ہے جس سے عام لوگ منتفع ہوں۔ اس لئے کہ ترقی یافتہ وہی قوم ہوگی جس کے سب افراد کو ترقی ہو اور عام طور سے ان میں غنی پیدا ہوں اور سودی لاشے ہے کہ ساری قوم میں شائع نہیں ہو سکتا۔ اول تو سب کے پاس مال نہیں۔ دوسرے آخر لے گا کون۔ اس لئے کہ محال بعض لیں گے اور بعض نہیں۔ تو جو لیں گے وہ تو ترقی کریں گے اور جو نہیں

اور علق کے معنی چونک کے ہیں۔ حالانکہ یہاں علق کے یہ معنی نہیں ہیں بلکہ خون بستہ کے ہیں و زبردستی ان تحقیق کو قرآن شریف کا مدلول بناتے ہیں۔

ایک اور سائنس دان کہتے تھے کہ جیسے حیوانات میں نرمادہ ہیں اسی طرح نباتات میں بھی ہیں اور قرآن شریف میں اس کا بھی ذکر ہے خلق الانما داج کلھا اس عقلمند نے ازدواج کا ترجمہ میاں بیوی سے کیا حالانکہ زوج کے یہاں یہ معنی نہیں ہے بلکہ معنی اصفافے صاحبو! یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا ہے یہ سخت مضر ہے۔

دستی بے خرد چوں دشمنی ست

اس میں بڑی دشمنی ہے اسلام کے ساتھ
ہر تحقیق کی جستجو قرآن میں درست نہیں

کے مسائل منفع نہیں ہوئے اور اس کو اہل سائنس بھی مانتے ہیں کہ ہم کو اب تک اس دریا کا قطرہ بھی حاصل نہیں ہوا پس جب کہ مسائل منفع نہیں ہوئے تو اگر آج آپ نے کسی جدید تحقیق کو قرآن شریف کا مدلول بنایا مثلاً یہی کہ تخم درخت میں نرمادہ ہوتے ہیں اور سو برس بعد یہ تحقیق غلط ثابت ہو گئی اور دوسری تحقیق نئی ہوئی تو اس میں تکذیب کلام الہی کی بھی لازم آئے گی پس یہ لوگ یصلون عن سبیل اللہ کے مصداق بن رہے ہیں غرض یہ کوشش کرنا کہ سب چیز قرآن شریف سے ثابت ہو سخت حماقت ہے۔ بلکہ قرآن شریف کا کمال یہ ہے کہ جس فن کی وہ کتاب ہے وہ فن اس میں ہو اور دیگر خرافات سے خالی ہو۔ قرآن شریف ایک طب روحانی ہے اور اس فن میں وہ لکھا ہے اور موٹی بات ہے۔ کہ جب مسائل دینیہ فرعیہ بھی سب کے سب قرآن شریف میں نہیں ہیں۔ تو فنون و تجربے کے مسائل تو اس میں کل کیسے ہوں گے۔ (اطاعت الاحکام ص ۷۱)

(۲۳) اس شبہ کا جواب کہ زکوٰۃ دینے سے مال کم

ہوتا ہے بڑھتا کہاں ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو گن کر روپے رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دینے کے بعد پھر گنتے ہیں تو کم ہو جاتے ہیں۔ بڑھنا تو درکنار برابر بھی نہیں رہتے۔ بات یہ ہے کہ بڑھنے کی حقیقت

اور غرض پر اگر نظر ہوتی تو یہ شبہ نہ ہوتا مال کے بڑھنے سے غرض یہ ہے کہ وہ بڑھتا ہوا مال اپنے کام آئے۔ چنانچہ اگر کسی کے پاس کروڑوں روپیہ ہو۔ اور اس کے کام نہ آئے بلکہ فضولیات میں ضائع ہو جائے۔ اور ایک شخص کے پاس دس روپے ہوں لیکن دس کے دس اس کے کام آئے یہ شخص اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ سو ہم کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہ شخص ہیں اور ان کی برابر آمدنی ہے مگر فرق اتنا ہے کہ ایک زکوٰۃ دیتا ہے اور تمام حقوق واجبات ادا کرتا ہے۔ سو اس کی چین و آرام سے زندگی گذرتی ہے۔ اور دوسرا شخص جو حقوق ادا نہیں کرتا وہ ہمیشہ پریشانی میں رہتا ہے۔ آج چوری ہو گئی کل کوئی مقدمہ قائم ہو گیا۔ خود بیمار ہو گئے، بچے بیمار ہو گئے۔ عطار کے یہاں روپیہ جارہا ہے۔ طبیب کی فیس میں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ بخلاف پہلے شخص کے کہ جس قدر آمدنی ہے وہ سب اس کے کام آ رہی ہے جو مال بڑھنے سے غرض ہے وہ اس کا حاصل ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ جس قدر لیتے ہیں اس سے زیادہ دیتے ہیں اور پھر جو لیتے ہیں وہ بھی ہمارے ہی لئے ہیں۔ (ذکر الموت ص ۹۸)

(۲۴) اس شبہ کا جواب کہ دیندار لوگ مصائب میں

زیادہ مبتلا رہتے ہیں

آپ کہیں کہ ہم تو کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں کہ فرمانبرداروں کے زیادہ کام آ سکتے ہیں کوئی تنگدست ہے کوئی بیمار ہے، غرض فرمانبرداروں پر زیادہ مصائب آتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ کامیابی کی ایک تصویریت ہوتی ہے اور ایک اس کی حقیقت و روح ہوتی ہے مال اور صحت اور جاہ یہ کامیابی کی صورت ہے اور حقیقت اور روح اس کی راحت و جمعیت قلب ہے مال و جاہ اور صحت سب مقصود اطمینان اور راحت ہے۔ اگر سب کچھ ہو لیکن قلب پریشان ہو تو اس کو اہل دنیا بھی کامیابی شمار نہیں کرتے۔ چنانچہ اگر ایک شخص کے یہاں مال و دولت و شہرت و شوکت سب کچھ ہو اور اس کو پھانسی کا حکم ہو جائے اور اس کے مقابلہ میں ایک شخص فرض کیا جاوے کہ جس کے پاس ایک پیسہ نہیں ہے اور

مزدوری کر کے اطمینان کے ساتھ اپنا پیٹ پالتا ہے۔ اس سے اگر یہ کہا جاوے کہ فلا شخص کی تمام دولت تم کو ملے گی اگر بجائے اس کے تم پھانسی پر چڑھ جاؤ اور یہ اقرار کر لو کہ قاتل میں ہوں، وہ ہرگز منظور نہ کرے گا۔ اور کہے گا کہ میں دولت کو لے کر کیا چوٹھے میں ڈالوں گا جب میری جان ہی نہ ہوگی تو ایسی دولت کو کیا کروں گا اور اس دولت مند سے اگر پوچھا جائے کہ تم کو خلاص ہو جائے مگر اس شرط سے کہ اس کا فرقہ فاقہ تم کو ملے گا تو وہ خوشی سے راضی ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ کامیابی کی حقیقت مال و جاہ و صحت نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کی اطمینان اور راحت قلب ہے۔

اہل اللہ کا حال

پس ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اگر اہل اللہ پر فقر و فاقہ خواہ کسی قدر ہوں ان کا قلب پریشان نہیں ہوتا اور نافرمان کو کتنی ہی عیش و عشرت ہو لیکن اس کا قلب ہمیشہ پریشان ہے۔ خاص کر مسلمان کو تو نافرمانی میں آرام ملتا ہی نہیں کیونکہ اس کو دباں زبانی کا بھی کھٹکا لگا ہے۔ تو اس کا گناہ اور بھی بے لذت ہے۔ اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ فرائض و عبادت سے روح کو عیش میسر ہوتی ہے ظاہری ناداری اور تنگ دستی اس کو پریشان نہیں کرتی ہے۔ کیا اگرچہ مفلس ہو لیکن وہ ہر وقت خوش ہے کہ جب چاہوں گا سونا بنا لوں گا۔ اس واسطے بڑے بڑے والیان ملک اور حکام وقت اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔

پس صاحبو! جب کہ وہ کیا جوتانے کو سونا بنا دیتی ہے یہ اثر رکھتی ہے تو حقیقی کیا یعنی حق تعالیٰ کی محبت اور اطاعت میں کیا یہ اثر نہ ہو گا۔ پس یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ شریعت پر عمل کرنے سے کامیابی نہیں ہوتی اور یہ ثابت ہو گیا کہ حقیقی کامیابی اتباع شریعت میں ہی مضمر ہے۔ (شرط الایمان ص ۲۲)

ناول بینی کی مفرتیں

(۲۵)

اس میں اس قدر مشغولی ہوتی ہے کہ سوائے اس کے قلب میں کچھ نہیں ہوتا اگر کوئی کہے

کہ غفلت تو کچھ ہی میں کام کرنے اور ردی کھانے پکانے سب میں ہوتی ہے تو چاہئے کہ سب چھوڑ دیں۔

بات یہ ہے کہ کام دو قسم کے ہیں، ایک ضروری اور ایک غیر ضروری اشتغال کا یوں تجربہ ہوا ہے کہ ضرر نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کو ضروری سمجھ کر آدمی اس میں پھنستا ہے اور جب اس کو ضروری سمجھا تو اصلی کام دوسری شئی کو سمجھے گا تو دل اسی اصلی کام کی طرف رہے گا کہ اس کام سے فارغ ہو کر اپنا اصلی کام کریں گے۔ اور جو تھوڑی غفلت اس میں ہو جاتی ہے اس کیلئے استغفار کا حکم فرمایا ہے کہ استغفار سے وہ جمل دھلا جاوے گی۔ اور غیر ضروری کی نسبت یہ تو خیال ہے نہیں کہ یہ ضروری ہے اس لئے اس کو ہی مقصود سمجھے گا اور وہ ضرر ہے اور مورث غفلت ہے، اور یہ غفلت بڑھتے بڑھتے معنی الی الکبائر بلکہ الی الکفر ہو جاتی ہے۔ بالخصوص ناول سے ایک بڑی سخت مرض پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اس کے دیکھنے سے بد معاشی کے

ناول دیکھنا نقصان دہ ہے

طریقے خوب یاد ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ناول کے شہیدانی پرانے قصوں پر اعتراض کرتے ہیں اور تاریکی اور خلاف تہذیب سمجھتے ہیں لیکن اس تاریکی اور اس روشنی میں اس قدر فرق ہے کہ اس تاریکی میں وقت تو ضائع ہو جاتا ہے لیکن اخلاق پر برا اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ وہ قصے مریح کذب اور عادت مستحیل ہیں مثلاً گل بکا دلی کا قصہ۔ بکا دلی کی تصویر اور جنوں کی عمل داری وغیرہ من الخرافات، ان قصوں سے کوئی ترکیب بد معاشی کی نہیں سیکھ سکتا۔ کیونکہ اس میں وصال بکا دلی کا طریقہ ایک جن کا مہربان ہو کر پیو پچا دینا ہے تو اس کو کوئی کس طرح حاصل کریگا۔ بخلاف ناولوں کے کہ اس میں لکھا ہے کہ ماما کے ہاتھ رقعہ بھیج دیا جس کو شخص کر سکتا ہے۔ ناول کا طرز جو نکم لیا دکھلایا جاتا ہے جیسے واقعات ہوتے ہیں اس لئے اس کا ایک ترغیب پڑتا ہے کہ اکثر آدمی اس کے دیکھنے سے عشق نسا دیا اطفال میں مبتلا ہوتا ہے اور قلب سوزش کی سی کیفیت ہو جاتی ہے اور یہ سخت مضر ہوتا ہے۔ (الصوم ص ۹۷)

اس شبہ کا جواب قرآن مجید میں تکرار مضامین کیوں ہے

اللہ تعالیٰ نے تمام احکام کو صاف صاف بیان فرمادیا۔ اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ مکرر سے کر بیان فرمایا کہ کوئی اشتباہ ہی نہیں رہا، ہم نے کیا کیا کہ اس کی قدر تو کی نہیں برعکس اس میں شبہات نکالنے لگے، کہ حق تعالیٰ نے اس مضمون کو تکرار کیوں بیان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے اس تکرار کی حکمت یہی ارشاد فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں وَلَقَدْ صَوَّفْنَا الْقُرْآنَ لِلنَّاسِ لِيَذُكَّرُوا یعنی ہم نے لوگوں کے لئے طرح طرح سے اس لئے بیان کیا ہے تاکہ نصیحت قبول کریں۔

اس کی قدر اس کو ہوگی جو باپ کی شفقت کو پیش نظر رکھے دیکھو باپ بیٹے کو کس طرح سے سمجھاتا ہے صرف ایک مرتبہ کہ سمجھا لے پراکتفا نہیں کرتا اور نہ ایک مرتبہ سمجھانے کے بعد مواخذہ کرتا ہے بلکہ ایک مرتبہ سمجھاتا ہے دوسری تیسری چوتھی مرتبہ بار بار سمجھاتا ہے جب تک کہ بیٹے کی اصلاح نہ ہو اسکو چہین نہیں آتا۔ جب بالکل لاچار ہو جاتا ہے مجبوری زبرد تو فین سے کام لیتا ہے پھر اس میں بھی ایلام اور ایذا مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی درستی اور تہذیب مد نظر ہوتی ہے حق تعالیٰ کو تو باپ سے بدرجہا زیادہ شفقت ہے اور اس کو باپ سے زیادہ اسکے مصالح کی رعایت ہے۔ اسی وجہ سے ایک ہی مضمون کو مختلف عنوانوں نوع بنوع کے طرز سے بیان فرمایا ہے۔ اور پھر باپ کے احسان اور حق تعالیٰ کے احسانات میں فرق عظیم یہ ہے کہ باپ کو بیٹے کے حال پر جو عنایت ہے اس کا منشا تو غرض ہے، کہ باپ کو یہ امید ہوتی ہے کہ بیٹا میرے کام آوے گا۔ یا یہ کہ اس سے میرا نام چلے گا۔ اور کچھ نہیں یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ساتھ ایسا علاقہ پیدا کر دیا ہے کہ اس سے وہ اس کی تربیت و صلاح کی طرف مضطرب ہوتا ہے اور اسی سے اس کو راحت ہوتی ہے۔

بہر حال کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کو انسان کی کوئی احتیاج نہیں ہے غنی بالذات ہے اور نہ ہماری طرح کسی شئی سے وہ متاثر ہوتے ہیں، ہم تو محبت سے یا کسی دوسری عرض سے مجبور بھی ہو جاتے ہیں

اور وہاں چونکہ غنی ذاتی ہے اسلئے کسی شئی کی احتیاج نہیں اور ما سوا اس کے سب محتاج ہیں بلکہ انسان احتیاج میں تمام مخلوقات سے اول نمبر ہے۔ اسلئے کہ اگر عالم میں انسان نہ رہے تو کسی شئی میں کوئی خلل نہ آوے سب اپنے حال پر رہیں اور اگر عالم میں سے ایک شئی بھی نہ رہے تو انسان کی بقا دشواری ہو جائے۔ مثلاً پانی نہ رہے یا آگ نہ رہے تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر انسان ایک بھی نہ رہے تو ان چیزوں میں سے کسی کا کچھ بھی نقصان نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ انسان ہر شئی کا محتاج ہے۔

اور یہ بات کہ باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے یہ اتنا محتاج کیوں ہوا۔ سو **تحتاجی کی وجہ** را از اس میں یہ ہے کہ اس کو اپنی اشرفیت پر نظر کر کے عجب ہو جائے اس لئے اتنی حاجتیں اس کے پیچھے لگا دی گئی ہیں کہ جب نازا در فر ہو تو فوراً اس طرف بھی نظر کرے کہ میں کیا نازا کر دوں میں تو ایک ایک جزو عالم کا محتاج ہوں۔ اس کے سوا اور بھی حکمتیں ہونگی۔

اللہ تعالیٰ محتاج نہیں بہر حال انسان سب چیزوں کا محتاج ہے اور کوئی شئی انسان کی محتاج نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو انسان کی کیا احتیاج ہوئی۔ جن چیزوں کا انسان خود محتاج ہے اللہ تعالیٰ کو ان کی بھی احتیاج نہیں بلکہ یہ امر عقلاً و نقلاً ثابت ہے کہ ہر شئی اپنے وجود اور بقا میں حق تعالیٰ کی محتاج ہے۔ پس حق تعالیٰ کے اس استغناء اور انسان کے احوج ترین مخلوقات ہونے کا افتقار تو یہ تھا کہ انسان کی بات بھی نہ پوچھتے اور احکام کا مخالف نہ بناتے لیکن اس سے یہ لازم نہ آتا کہ حقوق بھی نہ ہوتے، حقوق تو ضرور ہی ہوتے ہیں۔ پس جب حقوق ہوتے اور ان کے ادا کا طریقہ بتلایا نہ جاتا تو سخت مصیبت ہوتی جو آقا اشاروں اور رموز پر خادموں کو چلاتے ہیں خادموں کو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے اور ایک دہری کوئی ایسا نکل آتا ہے جو اتمام مزاج شناس ہو کہ اشارہ کو سمجھے۔

شاہزادہ ایران کا واقعہ علی حزیں شاہزادہ ایران کو اتفاق سے ایک خادم رمضان نام ایسا مل گیا تھا کہ اشاروں کو سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ علی حزیں نے شاہ دہلی سے درخواست کی کہ ہم کو ایک سلیقہ دار خادم کی ضرورت ہے بادشاہ نے ایک بڑے ہوشیار شخص کو بھیج دیا۔

علی حزیں باغ میں بیٹھے تھے اور نیاز خدمت گار باغ کے دروازے پر تھا۔ ایک شخص آیا اور اس نے ایک رقعہ دیا۔ اس خادم نے وہ رقعہ پھونچا دیا اس میں درخواست تھی کہ لیوں غائب

فرمائیے۔ علیٰ خزینے چہرہ پر بل ڈال کر وہ رقعہ واپس دیدیا۔ یہ خادم سخت پریشان ہوا کہ زبان کو توبہ کر لیا اور چہرہ سے ناگواری کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کس بات پر بگڑے ہیں۔ اتفاق سے وہاں رمضان بھی آنکلا اس سے خدمت گارنے سارا قصہ بیان کیا۔ رمضان نے کہا چہرہ پر بل ڈال کر رقعہ دیے کا مطلب یہ ہے کہ لیویدو، لیویدو ترش ہوتا ہے انھوں نے چہرہ ترش کر کے بتلادیا وہ خادم یہ سنکر بھاگا۔ اور سوچا کہ میں یہاں ہوں گا تو سخت مصیبت میں رہوں گا۔ یہ حکایت صحیح ہے یا غلط ہے بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ بھی اشاروں سے کام لیتے توحق تھا لیکن مصیبت ہوتی۔ اور ان اشاروں کو سمجھنے والا کون تھا سو ایسا نہیں کیا بلکہ ایک مضمون کو خوب کھول کر دودو مرتبہ تین تین مرتبہ بیان فرمایا اور بیان بھی اس طور سے نہیں فرمایا کہ کوئی پرچہ بھیج دے کہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے یا عمل کرنے میں دقت ہوئی بلکہ ایک عجیب اور فطرت کے موافق طریقہ اختیار فرمایا۔ وہ یہ ہے کہ ایسی ذات مقدس کو بھیجا جن کی شان یہ ہے لقد جاءکم رسول من انفسکم یعنی تمہارے پاس ایک رسول آئے ہیں تمہاری جنس سے پس حضورؐ کا ہماری جنس سے ہونا ایک نعمت تو ہے اسلئے اگر کسی فرشتہ یا جن کو بھیج دیتے تو سب ہیبت ہی کے مارے مرجاتے اور آپس میں کچھ مناسبت نہ ہوتی۔

آج کل لوگ اس فکر میں ہیں کہ پیغمبر کو عبدیت اور بشریت کے مرتبے سے گذار کر الٰہ تک پہنچادیں، گویا اس صفت کو مٹانا چاہتے ہیں کہ جو ہمارے اور ذات حق میں واسطہ اضافت ہوئی ہے حالانکہ عین رحمت الٰہی اور عین کمال نبویؐ بھی ہے کہ بشر ہو کر قرب کے ایسے درجہ پر پہنچے یہ تو کمال تھا اور رحمت اسلئے ہے کہ بشریت کی مناسبت سے بے راہوں کو راہ پر لادیں (اشکرمہ ۱۵)

۲۷) پردہ مروجہ پر اعتراض کا جواب

جواب (۱) حق تعالیٰ نے بنوں کو زینت حیوۃ الدنیا بتلایا ہے نبات کو میان نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ نبات کو خود تم نے بھی بے حقیقت سمجھ رکھا ہے کیونکہ لوگوں کو لڑکوں سے

زیادہ خوشی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو تو عموماً وبال سمجھتے ہیں۔ تو تمہارے نزدیک وہ کیا خاک زینت دنیا ہو گئی۔ دوسرا نکتہ نبات کے ذکر نہ کرنے میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ بتلادیا کہ نبات زینت دنیا بھی نہیں ہیں بلکہ محض زینت خاد ہیں۔ اگر وہ بھی زینت دنیا ہوتیں توحق تعالیٰ ان کو بھی یہاں ذکر فرماتے پس صرف بنوں کو زینت دنیا فرمایا اور نبات کو ذکر نہ فرمایا اس کی دلیل یہ ہے کہ لڑکیاں دنیا کی زینت نہیں ہیں کیونکہ عرفاً زینت دنیا وہ سمجھی جاتی ہیں جو منظر عام پر زینت بخش ہو اور وہ ایسی زینت نہیں ہیں کہ تم ان کو ساتھ لئے پھر دو اور سب دیکھیں کہ انکی اتنی لڑکیاں ہیں اور ایسی آراستہ و پیراستہ ہیں بلکہ وہ محض گھر کی زینت ہیں یہاں سے پردہ کی دلیل کی طرف اشارہ نکل آیا۔

عورت کا پردہ دوسرے نکتے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کا پردہ کرایا جائے کیونکہ اردو میں عورت کو عورت کہتے جس کے معنی لغت میں چھپانے کی چیز کے ہیں تو اس کے ساتھ یہ کہنا کہ عورت کو پردہ نہ کراؤ ایسا ہے جیسا یوں کہا جائے کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ پھنکے کی چیز کو نہ پیو اور اس کا لغو ہو نا ظاہر ہے کہ عورتوں کا پردہ نہ کراؤ انکو عورت کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیزیں ہیں۔ ایک ترقی یافتہ کہتے تھے کہ عورتیں پردہ کی وجہ سے ترقی علم سے رکی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں سی واسطے تو ان چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں بہت تعلیم یافتہ ہو گئی ہیں۔ یہ جواب سن کر وہ خاموش ہی تو رہ گئے۔

پردہ تعلیم کیلئے مضر نہیں اصل بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ یا بے پردگی کو کوئی دخل نہیں بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے۔ اگر کسی قوم کی عورتوں کی تعلیم پر توجہ ہو تو وہ پردہ میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں درنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہو سکتا، بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہو سکتی ہے، کیونکہ تعلیم کے لئے ایکسوئی اور اجتماع خیال کی ضرورت ہے اور وہ گوشہ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ اس واسطے مرد بھی مطالعہ کے لئے گوشہ تنہائی تلاش کیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ طلباء کو اسکا اچھی طرح اندازہ ہے۔

عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ أَنْ يَضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِينَةٍ یعنی جو عورتیں بوڑھی ہوں وہ اگر اپنے زائد کپڑے اتار کر رکھیں۔ جیسے اوپر تلے کپڑے ہوں اور اوپر کا کپڑا اتار دیں بشرطیکہ بدن ظاہر نہ ہو تو کچھ حرج نہیں، لیکن اس حالت میں بھی اپنے مواقعِ زینت کو ظاہر نہ کریں مثلاً گردن کان کران میں زیور پہنا جاتا ہے۔ اور آگے ارشاد ہے دَأْنُ يَسْتَعْفِفْنَ خِيَرَتَهُنَّ یعنی یہ زائد کپڑے اتار کر رکھنے سے بچیں تو ان کیلئے زیادہ بہتر ہے۔

پس جب بوڑھیوں تک کیلئے یہ حکم ہے تو اے لڑکیو! اور اے جوان عورتو! تم کو کہاں اجازت ہوگی کہ دور دور کے رشتہ داروں کے سامنے بے عجاآباد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ٹوکونی نہ ہو نہ ہو گا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سے عورتوں کو پردہ کراتے تھے۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آجکل جو بعضے تو تعلیم یافتہ کہتے ہیں کہ پردہ ضروری نہیں ہے اور ایسا پردہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں محض غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے قرآن و حدیث کو دیکھا ہی نہیں بس دیکھا کیا ہے کوئی اخبار دیکھ لیا کچھ عربی پڑھی ہے تو مہری اخبار دیکھ لیا سو سمجھ لو کہ یہ پردہ جو آج کل مروج ہے یہ قرآن سے بھی ثابت ہے اور حدیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پردہ کے پیچھے سے خط دیا۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سامنے عورتوں کو نہ آنے دیتے تھے اور قرآن اوپر گزرا ہے! پھر جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود سے پردہ کرادیں، تو کون سا پر ہے اور کون سا رشتہ دار ہے جس سے بے حجابی جائز ہوگی خواہ کوئی خالو ہو یا بھوپھا، دادا گھٹا ہو یا چچا اگر وہ محرم نہ ہو اجنبی ہے پڑا ظلم و ستم ہے کہ عورتوں کو اس کی کچھ پردہ نہیں ہے۔

ہم نے مانا کہ تمہارا دل پاک ہے لیکن تم کو دوسرے کی کیا خبر، اگر کہو کہ دوسرا بھی پاک ہے تو توبہ توبہ خدا اور رسول کو تم نے ظالم قرار دیا کہ باوجودیکہ یہ پاک تھا پھر بھی اس سے پردہ کا حکم دیا۔ اگر یہ پاک صاف ہوتے تو حق تعالیٰ ضرور ان کا نام لکھ دیتے کہ فلاں شخص پاک ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا قول یاد رکھو اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے کہ کون پاک ہے اور کون نہیں ہے انبیاء سے زیادہ ٹوکونی نہیں ہو سکتا۔ یوسف علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے فرماتے ہیں وَمَا أُبْرِيءُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ

پس عورتوں کا پردہ میں رہنا تو علوم کے لئے معین ہے نہ کہ مانع نہ معلوم لوگوں کی عقلیں کیا ہوئیں جو پردہ کو تسلیم کا منافی سمجھتے ہیں ہاں علوم تجارت کے لئے سیر و سیاحت کی البدھ ضرورت ہے مگر عورتیں ناقص العقل اور کم حوصلہ ہیں ان کے لئے سیر و سیاحت سے تجربے میں حقیقی یعنی اخلاقی ترقی نہ ہوگی۔ بلکہ آزادی اور شرارت بڑھے گی اس لئے شریعت نے عورتوں کے ہاتھ میں طلاق نہیں دی۔ کیونکہ یہ ایسی کم حوصلہ ہیں کہ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ مرد تو برسوں میں کسی بہت بڑی بات پر طلاق کا قصد کرتا ہے۔ وہ بھی ہزار بار میں سے ایک درز زیادہ تو ایسے ہی مرد ہیں جو عورت کی بدتمیزیوں پر صبر کرتے ہیں۔ اور اگر عورتوں کے ہاتھ میں طلاق ہوتی تو ہر ہمینہ شوہر کو طلاق دے کر نئی شادیاں کیا کرتیں۔

پس عورتوں کے لئے مہی سیر و سیاحت کا کافی ہے کہ اپنے گھر میں جل پھر لیا کریں۔ جن تجربوں کی انکو ضرورت ہے وہ گھر میں رہ کر ہی انکو حاصل ہو سکتے ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ نظر حقیقت میں سے دیکھئے تو مردوں کو بھی اس کی ضرورت نہیں۔ اگر سیر و تماشا چاہتے ہو تو وہ بھی آپ کے اندر موجود ہے دل کی آنکھوں سے دیکھ لو۔ تم کو اپنے ہی اندر ایسا تماشا نظر آئے گا کہ دنیا کے پھول پھلواڑیوں سے استغناء ہو جائے گا۔

ستم است گر پے کشد کہ میر سرو من درآ
توز غنچم کند میدہ در دل کشا بچمن درآ
چوں کوئے دوست ہست بھرا چہ حاجت ست
خلوت گزیدہ را بمتا شا چہ حاجت ست

(مظاہر الآمال ص ۱۳)

پردہ کی اہمیت جو اہل مردوں کو توبہ حکم فرمایا قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَعْصُوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا أَرْوَاحَهُمْ یعنی آپ مومنین سے کہدیتے کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اور عورتوں کے لئے یہ بھی حکم فرمایا اور اس پر اضا فرمایا وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ یعنی بناؤ سنگار کا موقع ظاہر نہ کریں۔ اور ظاہر ہے کہ بناؤ سنگار کا موقع وہ ہے کہ اکثر کھلا رہتا ہے جب اس کا اظہار بھی اجانب کے سامنے جائز نہیں تو باقی تمام بدن کا تو کیسے جائز ہو گا۔

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ الَّتِي لَا يَرْجُونَ نِكَاحًا فَلَيْسَ

لَا مَارَکَ بِالسُّوءِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبِّیْ یعنی میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ہوں، نفس تو بری بات کا حکم کرنے والا ہی ہے، مگر جس پر میرا رب رحمت فرمائے کہ وہ مستثنیٰ ہے۔

نفس کی پاکی کا دعویٰ

اب بتلانے کے کس کا منہ ہے جو کہے کہ میرا نفس پاک ہے۔ مجھ کو برا دوسرے نہیں آتا اور اگر ایسا اتفاق ہوتا ہے تو وہ عارضی حالت ہے چنانچہ بعض بزرگوں کو اس میں دھوکا بھی ہوا ہے کہ انھوں نے جب دیکھا کہ انکو دوسرے نہیں آتا تو یوں سمجھے کہ ہمارا نفس مزکی ہو گیا ہے اسلئے انھوں نے غیر محرم کے اختلاط میں کوئی باک نہیں کیا اور پھر کسی فتنہ میں مبتلا ہو گئے خواہ وہ فتنہ قلبی کا ہو۔ اور یہ کارگذاری شیطان کی ہے کہ اس ترکیب سے کہاں سے کہاں تک لایا۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے اول یہ تدبیر بتلائی کہ نگاہ بچی رکھو۔ اگر بھڑکتی تم کو کسی غیر کے سامنے آتا پڑے تو نگاہ بچی اور کپڑوں میں لپیٹ کر آؤ۔ یہ نگاہ بظاہر ہے بہت خفیف لیکن اصل تمام پھول پھیل کی یہی ہے جیسے زکام ہے کہ بظاہر بہت ہلکی بیماری ہے لیکن سیکڑوں بیماریوں کا منشا ہو جاتا ہے اسی طرح نظر بھی ہے کہ اگر یہ بگڑ گئی تو پھر آئندہ امن اٹھ گیا اسی واسطے دل اسی کو روکا ہے۔

ازواج مطہرات کا پردہ

دیکھو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں سے تو زیادہ کوئی عورت نہیں ہو سکتی ہیں تم کو قصہ سناتا ہوں جس سے تم کو اندازہ ہو گا کہ پردہ کس درجہ ضروری ہے۔

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ایک نابینا صحابی ہیں اور ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے ازواج مطہرات میں سے غالباً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیٹھی تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پردہ میں ہو جاؤ۔ انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ تو نابینا ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں افعیبتما دان انتما لستم تبصرون۔ یعنی کیا تم بھی اندھی ہو اسکو دیکھتی نہیں ہو۔

دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں امہات المؤمنین دوسری طرف نابینا صحابی، بھلا یہاں کون سے دوسرے کا احتمال ہو سکتا ہے، مگر پھر بھی کس درجہ اہتمام کرایا۔ (العصۃ ص ۷)

علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں

(۲۸)

جواب (۱)۔ لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں۔ آج میں اس الزام کو دفع کرنا

چاہتا ہوں اور اس وقت میں ترقی کی ضرورت ہی پر بیان کروں گا اس پر جنہاں چوٹ لگے کہ یہ ملا آدمی اور ترقی کا بیان۔ میں نے کہا کہ آپ تو ترقی کو صرف عقلی ضروری ہی کہتے اور میں اسے شرعی فرض کہتا ہوں۔ اس پر اور بھی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَکَلَّ وَجْهَهُ اَهُمُوْا لَهَا فَاَسْتَبَقُوا الْخَيْرَاتِ یعنی ہر قوم کے لئے ایک جہت قبلہ مقرر ہے جس کی طرف وہ منہ کرتی ہے۔ پس ایک دوسرے پر سبقت کرو۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہم کو استباق کا حکم دیا جس کے معنی ایک دوسرے پر سبقت کرنے کے ہیں۔

تو اب جو لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں وہ ان پر کتنا بڑا افتراء کرتے ہیں۔ بھلا جس چیز کا قرآن میں امر ہے علماء کی مجال ہے کہ اس سے منع کر سکیں۔ پس ترقی کا ضروری ہونا تو متفق علیہ ہے البتہ اس کے طریقہ میں اختلاف ہے۔ جنہاں کہتے ہیں کہ جس طرح ہم کہیں اسی طرح ترقی کرو اور علماء کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کہے۔ اسی طرح ترقی کرو۔ سو قرآن میں فاستبقوا کے ساتھ الخیرات کی بھی قید ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ نیک کاموں میں ترقی کرو۔

اب اس اختلاف کا فیصلہ بہت جلد ہو سکتا ہے۔ آپ یہ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ خواہاں ہیں وہ ترقی فی الخیر ہے تو میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ علماء آپ کو اس ترقی سے منع نہ کریں گے اور اگر ترقی فی الشرع ہے تو اس کا مطلوب نہ ہونا بلکہ مذموم ہونا تمام عقلاء کے نزدیک مسلم ہے ورنہ پھر ایک ڈاکو کو بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ مجھے ڈاکہ سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔ میں تو ترقی کا طالب ہوں، بتلائیے اسے کیا جواب دیں گے؟

ترقی محمود مطلوب ہے

ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ تیری یہ ترقی محمود نہیں بلکہ ترقی مذموم ہے جو کہ برے طریقے سے حاصل کی جاتی ہے معلوم ہوا کہ ترقی مطلقاً مطلوب نہیں بلکہ وہی مطلوب ہے جو محمود ہو مذموم نہ ہو۔ بس اب یا تو آپ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ طالب ہیں وہ محمود ہے، مذموم نہیں، یا ہم ثابت کر دیں کہ ترقی محمود وہی ہے جس کی ہم تعلیم دے رہے ہیں۔ اور یہ ترقی مذموم ہے جس کی تعلیم آپ دے رہے ہیں۔

اس تقریر سے بہت جلد سمجھ گئے اور اقرار کر لیا کہ واقعی علماء کو ترقی سے اختلاف نہیں بلکہ اس کے طریقہ میں تفصیل سے اختلاف ہے، کیونکہ ان طریقہ نے خلاف شرع ہونے کی

وجہ سے اس ترقی کو ترقی فی الشرکامصدق بنادیا ہے۔

غرض دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور وہ انکی ہر حالت کو ترقی میں دخیل سمجھ کر اختیار کرتے جاتے ہیں۔ کبھی ان کی صورت و وضع کو اختیار کرتے ہیں کہ شاید اس کو ترقی میں دخل ہو، کبھی عورتوں کے پردہ کو اٹھانا چاہتے ہیں کہ یہی ترقی سے مانع ہے۔ اگر عورتیں آزاد ہوں گی تو علوم صنعت و حرفت سیکھ کر خود بھی ترقی کریں گی اور اولاد کو بھی ترقی یافتہ بنائیں گی۔

ایک صاحب نے میرے سامنے یہی دلیل بیان کی تھی۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں میں صرف شرفار کی عورتیں پردہ نشین ہیں جن کی تعداد ہندوستان میں بہت کم ہے زیادہ تعداد تو چھوٹی قوموں کی ہے اور ان میں پردہ کا ہمیشہ سے رواج نہیں ہے۔ اگر بے پردگی کو ترقی میں کچھ دخل ہے تو ان قوموں نے کیوں نہ کر لی۔ پس اس کا جواب کچھ نہ تھا، وہ میرے منہ کو ٹکے لگے۔ (العبرة بذبح البقرة ص ۴۵)

جواب (۲)۔ یہ سب کہتے ہیں کہ عزت و ترقی حاصل کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی علماء پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ علماء ترقی کے مانع ہیں، میں کہتا ہوں کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ عزت حاصل کرنا چاہئے اور علماء اس کے مانع نہیں ہیں۔ اور علماء کیسے مانع ہوتے جس شئی کو قرآن و حدیث ثابت کرتے ہیں اس کو کون سا مولوی مٹانے والا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لِرَسُوْلٍہٗ وَ لِمُؤْمِنٍہٗ** یعنی اللہ ہی کے لئے عزت اور اس کے رسول کے لئے اور مؤمنین کے لئے، بھلا جس شخص کا اس آیت پر ایمان ہو گا وہ کیسے اس کی نفی کرے گا۔ پھر علماء پر الزام کیسا؟ بات یہ ہے کہ ان کی بات پوری طرح سستے تو ہیں نہیں بے سوچے سمجھے ہانک دیا کہ علماء ترقی سے روکتے ہیں۔

صباحو! علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں علماء جو طالبان ترقی پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ نفس ترقی کی طلب پر نہیں بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ لوگ اس کو غیر طریق سے حاصل کر رہے ہیں طریق یہ نہیں ہے اگر کوئی پشاور جانا چاہے اور ٹکٹ لے لے کلکتہ کا اور اس کو کوئی اسکی غلطی پر آگاہ کرے تو وہ پشاور جانے کا اور ریل میں سوار ہونے کا مخالفت نہیں بلکہ طریق کے اندر مخالفت کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ رستہ یہ نہیں ہے۔ پشاور کو دوسری گاڑی جاوے گی۔ اس کا

ٹکٹ لے لو وہ تم کو پشاور پہنچا دے گی۔

ریل کا ایک واقعہ میرے ایک ہموطن اسٹیشن سہارنپور سے میرٹھ جانے والے کھنؤ جانے والی گاڑی میں غلطی سے سوار ہو گئے۔ اتفاق سے میں بھی کھنؤ جا رہا تھا۔ عین روانگی کے وقت تو ان سے کوئی بات ہوئی نہیں اس لئے کہ خیال ہوا کہ یہ تو گاڑی میں موجود ہیں ہی۔ ان سے باطلیمان بات کر دیں گا۔ جو لوگ مجھ کو پہنچانے کے لئے آئے تھے ان سے باتیں کرتا رہا۔ جب ریل چھوٹ گئی تو انکی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جاتیں گے۔ کہنے لگے کہ میرٹھ، میں نے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جائیں مگر یہ گاڑی میرٹھ نہ جائے گی یہ تو روڑ کی ہوتی ہوئی سیدھی کھنؤ پہنچے گی۔ یہ سن کر تو بہت چکر لائے اور سردی کا موسم تھا۔ ان جنٹلمینوں کو یہ بھی مرض ہے کہ کپڑا ساتھ نہیں لیتے اور رضائی اور ردی دارانگہ کپڑے پہننے کو خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔ بیک بینی و دو گوش ہی سہ کر تے ہیں ایسے ہی وہ بھی تھے، خیر وہ روڑ کی اترے پھر وہاں سے اخیر شب میں میرٹھ پہنچے۔ پس دیکھے میں ان کے ریل میں سوار ہونے کا اور میرٹھ جانے کا مخالفت نہیں تھا بلکہ گفتگو یہ بھی کہ آپ نے طریق میں غلطی کی۔

پس علماء کو اگر کہیں طالبان ترقی پر اعتراض کرتے ہوئے سنا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ترقی کے مخالفت ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ جس طریق سے آپ ترقی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ طریق اس کا نہیں ہے۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ راے اعزانی : کیس راہ کہ تو میر دی بہ ترکستان ست طریق اس کا وہ ہے جو مولوی بتاتے ہیں، خدا اور رسول نے جو بتایا ہے وہ طریقہ ہے۔ مولوی بیچارے تو سرکاری حکم کے منادی کرنے والے ہیں۔ منادی کرنے والے سے اگر کوئی معارضہ اور مناظرہ کرے تو وہ یہی کہے گا کہ میں تو منادی کرنے والا ہوں مجھ سے گنجب نہ کر۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے چیرا سی سمن لایا اور اس سے مباحثہ کرنے لگے تو ایسے شخص پر دوجرم قائم ہوں گے ایک تو تعمیل نہ کرنے کا، دوسرے سرکاری آدمی سے مقابلہ کرنے کا۔ پس یاد رکھو کہ یہ علماء سرکاری آدمی ہیں ان سے منازعت کرنا جرم ہے۔

غرض طریق ترقی کا وہ نہیں جو آپ لوگوں نے اختیار کیا ہے ترقی اور عزت حاصل

کرنے کی ضرورت تو مسلم ہے لیکن طریق یہ نہیں ہے۔

اب میں اس کو بیان کرتا ہوں مگر اس کی تحقیق کے لئے اول یہ سمجھنے کی عزت حاصل کرنے کی غرض کیا ہے اور وہ کیوں ضروری ہے۔ سو لوگ تو ترقی اور عزت کے طالب ہیں کہ اس کی غرض محض بڑا بننا ہے۔ مگر میں اس کی اصل وجہ بیان کرتا ہوں کہ اس کی کس لئے ضرورت ہے۔

انسان کا مقصد

اصل یہ ہے کہ عقلی طور پر انسان کو دو چیزوں کی ضرورت ہے منافع کو حاصل کرنا اور مضمرات سے بچنا۔ آدمی جو کچھ کرتا ہے اس کی غایت صرف یہی ہوتی ہے کہ یا تو نفع کی تحصیل ہو یا مضمرات کا دفع۔ مثلاً کھانا کھانا ہے تاکہ بھوک کے ضرر سے بچے اور قوت کی منفعت حاصل ہو۔ دوا کرتا ہے تاکہ مرض دور ہو اور صحت حاصل ہو۔ غرض جو کچھ کرتا ہے یا تو جلب منفعت کیلئے یا دفع مضرت کیلئے، اور دوسرا قاعدہ عقلی یہ سمجھو کہ ضروری چیزوں کے طریقے بھی ضروری ہوتے ہیں۔ پس جلب منفعت اور دفع مضرت جس طریقے سے حاصل ہو وہ بھی ضروری ٹھہرا۔ سو طریقہ اس کا یہ ہے مال و جاہ کا حاصل ہونا۔ مال تو اصل میں منافع کی تحصیل کے واسطے ہے اور جاہ اصل میں دفع مضرت کے واسطے ہے، گو کبھی کبھی جاہ سے خطرہ میں بھی پڑنے کا احتمال ہے، لیکن وہ بحیثیت جاہ ہونے کے خطرہ کا سبب نہیں ہوتی اس لئے کہ جاہ فی حد ذاتہ خطرات سے بچانے والی ہے بلکہ سبب وقوع فی الخطرہ کا قلت جاہ ہوتی ہے۔ مثلاً بھینٹے بھینٹے لوگوں کے کچھ دشمن ہو گئے اور آزار پہنچایا تو یہ ایذا جاہ کے سبب سے نہیں ہوتی جاہ کے محدود ہونے کی وجہ سے ہے اگر غلبہ پورا ہوتا تو اس کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکتا اسی واسطے حق تعالیٰ کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ غلبہ اور عزت غیر محدود اور کامل درجہ میں ہے۔ لیکن تاہم جاہ ہی ایسی شئی ہے جو بہت سے مصائب اور خطرات سے آدمی کو بچاتی ہے۔ مثلاً اب ہم اطمینان سے بیٹھے ہیں، کوئی ہم کو ذلیل نہیں کر سکتا۔ بیگار میں نہیں پکڑ سکتا۔ تو اس کا سبب کیا ہے۔ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزت عطا فرمائی ہے۔ بخلاف ان لوگوں کے جن کو عزت حاصل نہیں ہے۔ پولیس نے حکم دیدیا کہ دس چاروں کو بیگار میں پکڑ لاؤ، بیچارے چاروں جا چار آتے ہیں۔ پس جاہ اور عزت کی غرض محض ہوتی ہے۔

عزت و مال مطلوب ہیں

اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ عزت اور مال دونوں مطلوب اور محدود ہیں ہر وہ عہدہ اور مذموم نہیں ہیں اور جو مال و جاہ کی مذمت کرتے ہیں ان کا عنوان تعمیری مختصر ہوتا ہے۔ مقصود و مذمت کرتا جب

مال اور حب جاہ کا ہے اور حب بھی وہ جو حق تعالیٰ کی محبت سے بڑھی ہوئی ہو کہ ان کی ہوس میں اللہ تعالیٰ کے حکم بھی پس پشت ڈال دے چنانچہ ارشاد ہے قُلْ اِنَّ كَاتِبًا كُنتُمْ وَابْنًا كُنتُمْ وَاَحْوَانًا كُنتُمْ وَاَنْتُمْ دَاخِلُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَاَمْوَالٌ اَقْتَرَقْتُمُوهَا وَتَحَا رَةً تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنَ تَرْمُوْنَهَا احَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَجِهًا دِفِيْ سَبِيْلِهَا فَاتَرْتَصَوْنَ حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرٍ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ مذموم اور مذمبی عہدہ نہ مال ہے نہ جاہ اور نہ حب مال اور حب جاہ، بلکہ مال اور جاہ کی حب مضرت ہے۔ جو اللہ کی یاد سے غافل کر دے اور اس کے مقابلہ میں دین کی بھی پروا نہ رہے عزت اور آبرو کی ایسی حفاظت کرے کہ دین رہے یا جائے۔ منکرات نہ جائے۔

جیسے ایک شخص ریل میں سوار تھے انھوں نے نماز پڑھی اور کہتے تھے کہ میں نے نماز اس لئے نہ پڑھی کہ ہندوؤں کا مجمع تھا اگر ان کے سامنے نماز پڑھتا تو وہ یوں کہتے کہ کیا اٹھک بیٹھک کرتا ہے اور اس سے اسلام کی اہانت ہوتی۔ استغفر اللہ یہ اس شخص کا گمان فاسد تھا اگر وہ نماز پڑھتا تو زیادہ عزت ہوتی

حکایت وزیر بھوپال

ایک وزیر عظیم ریاست بھوپال کی حکایت ہے کہ کسی بڑے حاکم کا لکچر ہو رہا تھا نماز کا وقت آ گیا۔ بڑے بڑے امراء و وزراء شریک تھے ان میں نمازی بے نمازی سب قسم کے تھے سب یہ سمجھ کر یہاں سے اٹھنا بڑی سبکی کی بات ہے اس لئے سب ساکت بیٹھ رہے۔ وزیر صاحب کھڑے ہو کر کہا کہ حضور نماز کا وقت آ گیا ہے ہم نماز پڑھیں گے۔ حاکم نے بہت خوشی سے کہا کہ ضرور پڑھ لیجئے وزیر صاحب کھڑے ہوئے اور لوگ بھی نماز کیلئے کھڑے ہو گئے و بارہی میں بڑی شان و شوکت سے نماز باجماعت ہوئی۔

دین سے بے رغبتی

دیکھئے عزت یہ ہے، آج کل یہ حالت ہے کہ گو دین جاتا رہے مگر ہماری آبرو و عزت مزموں میں فرق نہ آنے پائے۔ ہماری آمدنی میں فرق نہ آنے پاوے، چنانچہ مختلف تدبیروں سے خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز۔ کوئی مال بڑھا رہا ہے، کوئی جائیداد کی فکر میں ہے، عورتیں زیور کے بڑھانے کی فکر میں، اسی طرح جاہ و مختلف تدبیروں سے حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کو ریاست سمجھتے ہیں۔ آج کل ریاست کا حاصل کیا ہے کہ اپنے دباؤ اور زور سے غریبوں پر ظلم کرنا کسی کی گھاس چھین لی کسی کی زمین دبا لی وغیرہ غرض

عزت کے مقابلہ میں جب دین کی پروا نہ کی تو کیا عزت ہے۔ ہاں یہ بھیڑیے کی عزت ہے، اگر بھی بھیڑیا آجاوے تو سب کھڑے ہو جاویں خواہ وہ یہ سمجھے کہ میری تعظیم کو کھڑے ہوئے حالانکہ لوگ اپنی حفاظت کے لئے کھڑے ہوں (علی محمد) واللہ ان امارادار ظالموں کو ایسی ہی عزت ہے کہ لوگ اپنے بچاؤ کی وجہ سے ان سے ڈرتے ہیں۔ ورنہ ویسے تو کوستے اور گالیاں ہی دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اسکو غارت کرے۔

عزت ہے اللہ والوں کی کہ ان کے لئے جان تک فدا کرنے کے واسطے لوگ حاضر ہیں پس حقیقی عزت یہ ہے کہ دلوں پر قبضہ کرے اور دلوں پر سکھ جائے۔ سو ایسی عزت اللہ والوں کی ہے۔ (العزۃ ص ۱۲)

(۲۸) اس تکیہ کلام اور مشہور اعتراض کا جواب کہ فلاں بات خلاف عقل ہے اسلئے قابل قبول نہیں

ہمارے بھائیوں نے ایک سبق پڑھ لیا ہے کہ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئے کہہ دیا کہ یہ خلاف عقل ہے اس لئے قابل قبول نہیں اور لگے نصوص میں تحریف و تاویل کرنے۔ چنانچہ ان کے نزدیک صراط پر چلنا بھی خلاف عقل ہے۔ اور ساری معادیات اور معجزات خلاف عقل ہیں، تو اس طرح انھوں نے عقائد میں بھی اختصار و انتخاب کرنا شروع کیا اب ایمان کے معنی وہ نہ رہے جو پہلے تھے یعنی تصدیق بما جاء به النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ معنی یہ ہو گئے کہ تصدیق بما اذفق عقل مما جاء به النبی صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی ان کے نزدیک ایمان کہتے ہیں اس چیز کے ماننے کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ باتوں میں سے ان کی عقل کے مطابق ہو۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں دو مقدمہ ہیں ایک تو یہ کہ جو بات شریعت میں عقل کے خلاف ہے تمہاری عقل کے یا سب عقلاء کی عقل کے۔ دوسری شق تو مسلم نہیں کیونکہ علماء راسخین جن کی عقل کے سامنے اہل دنیا کی عقل کچھ حقیقت نہیں رکھتی وہ انکو خلاف عقل نہیں کہتے اور ہر زمانہ میں ان مسائل کو ایسی صورت پر تسلیم کرتے آئے ہیں جس صورت سے شریعت میں تعلیم دی گئی ہے۔

چنانچہ حضرات صحابہ و تابعین و علماء و صلحا ارامت سب ان کا اعتقاد ظاہر کے مطابق رکھتے آئے ہیں۔ اگر یہ کہو کہ تمہاری عقل کے خلاف ہے تو اس صورت میں صغریٰ تو مسلم مگر کبریٰ مسلم نہیں کہ جو تمہاری عقل کے خلاف ہو وہ غلط اور ناقابل قبول ہے کیونکہ قوانین سلطنت میں بہت سی باتیں تمہاری عقل میں نہیں آتی مگر تم قانون دانوں کی عقل پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کرتے ہو۔ اس کو بھی جانے دو۔ میں تمہیں سے پوچھتا ہوں کہ ماں کے پیٹ سے تم جس طرح پیدا ہوئے ہو کیا تمہاری عقل میں آتا ہے۔ واللہ ہم کو اس پر حریت رائے نہیں ہوتی کہ رات دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے اگر اس کا مشاہدہ نہ ہوتا، اور صرف بیان سے یہ طریقہ معلوم ہوتا تو ہرگز عقل میں نہ آتا۔

انسان کی پیدائش اس کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ایک نوزائیدہ بچے کی اس طرح نگہ رانی کرو کہ وہ یہ بات سننے یا دیکھنے نہ پائے کہ بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ اس کو فلسفہ اور سائنس اور طب سب کچھ پڑھائیں مگر یہ نہ پڑھائیں جس میں طرز تولد کا ذکر ہو پھر جب وہ بی، اے، اور ایم، اے اور ایل، ایل، بی ہو جائے اس وقت اس سے کہو کہ خبر بھی ہے تو کیونکر پیدا ہوا تھا اور اس سے بیان کرو کہ اول تیرا باپ تیری ماں کے پاس گیا تھا جس سے منی کے کچھ قطرے تیری ماں کے پیٹ کے اندر جو رحم ہے اس میں گرے تھے پھر رحم کے اندر اس کی پرورش ہوئی کہ خون بنا اور خون سے علقہ پھر مضغہ پھر گوشت میں ہڈیاں بنیں پھر جسم کامل تیار ہو گیا تو اس میں روح پڑی جس کی پرورش عرصہ تک خون رحم سے ہوتی رہی پھر نوزاد کے بعد تو شرمگاہ مادر سے نکلا اور اب وہی خون رحم دودھ کی شکل میں ماں کے پستان میں آگیا جس سے دوسرے تک پرورش پاتا رہا۔ (والی آخرہ) تو میں سچ کہتا ہوں کہ واللہ العظیم وہ نہایت سختی سے آپ کی مخالفت کرے گا اور کہیگا ایک قطرہ سے ایسے حسین جسم کا بننا پھر اس کا شرمگاہ سے جو نہایت تنگ راستہ ہے نکل آنا عقل کے بالکل خلاف ہے۔

اب بتلائیے کہ اگر یہ قاعدہ مان لیا جائے کہ جو بات جس کی عقل میں نہ آئے وہ غلط ہو اگرے تو پھر آپکا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا بھی غلط ہے بات یہ ہے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں جیسے نوزائیدہ بچہ جس کی ایسی نگہ رانی کی گئی ہو جس کا اد پر ذکر ہوا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کو خلاف عقل کہے گا۔ کیونکہ اس نے یہ بات کبھی دیکھی یا سنی نہ تھی اور آپ اس کو خلاف عقل اس لئے نہیں کہتے کہ آپ کو اس کی عادت ہو گئی، ورنہ آپ بھی کہتے ہو وہ کہتا ہے اور ظاہر ہے کہ

خلاف عقل کا وقوع نہیں ہو سکتا۔

تو معلوم ہوا کہ آپ خلاف عقل ایسی باتوں کو بھی کہتے ہیں جن کا وقوع مشاہدہ ہو جاتا ہے

خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق

تو وہ خلاف عقل نہ رہیں معلوم ہوا کہ آپ دراصل خلاف عادت کو خلاف عقل کہہ رہے ہیں اور کسی بات کے صحیح ہونے کے لئے خلاف عادت ہونا مضر نہیں اور نہ یہ غلط ہونے کی دلیل ہے۔ ورنہ پھر اس کے رٹکے کے قول کو بھی مان لینا چاہئے جو ماں کے پیٹ سے انسان کے پیدا ہونے کو غلط کہتا تھا۔

اور نیز بہت سی باتوں کو جنہیں آپ چار دن پہلے مستبعد اور محال سمجھتے تھے اور آج ان کا مشاہدہ ہو رہا ہے غلط کہنا چاہئے جیسے ریل کا ایک ٹکڑہ ۶۰ میل طے کر لینا اور ۵ منٹ میں لندن سے تار کے ذریعے خبر آ جانا وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ دنیا میں بہت سے امور عادت کے خلاف ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے مرغی کا ایک بچہ دیکھا ہے جس کے چار پیر تھے۔ اور آجکل دہلی میں دلوگیاں جڑی ہوئی نائش میں آئی تھیں جن کے تمام اعضاء جدا جدا تھے مگر کمر جڑی ہوئی تھی اور پیشاب گاہ الگ الگ تھی مگر پیشاب نکلنا ایک کے رستے سے تھا۔

تو بتلائیے کیا خلاف عادت کیلئے بھی کوئی ضابطہ ہو سکتا ہے جس کے اوپر بنا کر کے بعض امور کو مانا جائے اور کسی کے متعلق یہ کہا جا دے جو نکلے یہ خلاف عادت ہے اسلئے ہم نہیں مانتے۔ صابو! آپ کا عدم سے وجود میں آنا ہی خلاف عادت ہے۔ کیونکہ عادت کا مقصدی تو یہ ہے کہ ہر شئی اپنی حالت پر رہے جو معدوم ہے معدوم رہے اور جو موجود ہے وہ بھی فنا نہ ہو۔ مگر رات دن اس کے خلاف مشاہدہ ہو رہا ہے، ہزار ہا معدوم وجود میں آتے اور لاکھوں موجود معدوم ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی بات کا خلاف عادت ہونا اس کے غلط ہونے کو مستلزم نہیں۔

اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں اور ان دونوں

خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق

میں فرق نہیں کرتے حالانکہ یہ بڑی سخت غلطی ہے۔ سنے میں اس کا فرق بتلاتا ہوں۔ خلاف عادت تو وہ ہے جو عقلاً ممکن ہو مگر مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے دشوار و مستبعد معلوم ہوتا ہے اور خلاف عقل وہ ہے جو عقلاً ناممکن ہے یعنی عقل کے استحصال پر دلیل قائم کر سکے اور استحصال کہتے ہیں

اجتماع نقیضین کو، تو خلاف عقل وہ ہے جس کے ماننے نقیضین کا ایک محل میں ایک آن میں ایک جہت سے مجتمع ہونا لازم آجائے۔ اب جو لوگ معادیات کو اور صراط کو ورن اعمال وغیرہ کو خلاف عقل سمجھتے ہیں وہ مہربانی کر کے ان کے استحصال پر دلیل قائم کریں اور بتلائیں کہ ان کے ماننے سے اجتماع نقیضین کیونکر لازم آتا ہے۔ یقیناً وہ ہرگز کوئی دلیل عقلی ان کے استحصال پر قائم نہیں کر سکے۔ لیکن سب سے بہت سی کہیں گے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیونکر ہو جائے گا۔ اس کی نظیر دکھلاؤ۔ بس آج کل تمام شبہات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اسلئے یہ محال ہے اور جو دعویٰ امکان کا کرتا ہے وہ اس کی نظیر دکھلائے۔ عجب اندھیر ہے کہ نظیر پر ثبوت شئی کو موقوف بتلایا جاتا ہے اور جس چیز کی نظیر نہ ملے اس کو خلاف عقل اور محال کہا جاتا ہے۔ لوگوں کو ثبوت کی حقیقت ہی معلوم نہیں۔ نظیر پر ثبوت کو موقوف سمجھتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ جو صنائع اور عجائبات اس زمانہ میں ایجاد یا مشاہدہ ہوئے ہیں کیا اس زمانہ سے پہلے کسی کے پاس ان کی نظیر تھی اور اگر نہ تھی تو کیا اس وقت یہ خلاف عقل اور محال تھیں۔ اگر محال تھیں تو پھر آج ان کا وقوع کیونکر ہوا۔ معلوم ہوا کہ کسی شئی کا امکان نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں تو خوب سمجھئے کہ کسی دعویٰ کا ثبوت نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں بلکہ نظیر تو محض توضیح اور تزیین کے لئے ہوا کرتی ہے مدعی ثبوت کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ہرگز لازم نہیں خصوصاً ایسے مدعی کے ذمہ جو کسی امر کا ثبوت یہ کہہ کر کرتا ہو کہ یہ امر خلاف عادت بطور معجزہ کے واقع ہوا یا قیامت میں خلاف عادت یوں ہو گا اس ذمہ تو کسی قاعدہ سے بھی نظیر کا پیش کرنا لازم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تو اپنے دعویٰ میں تصریح کر رہا ہے کہ مدعا بے نظیری کی صفت کے ساتھ تصدق ہے اگر نظیر کا پیش کرنا مدعی کے ذمہ کسی درجہ میں لازم بھی ہو سکتا ہے تو صرف اس مدعی کے ذمہ ہو سکتا ہے جو اپنے دعویٰ کو موافق عادت بتلائے اور جو غرق عادت کا مدعی ہو اس سے نظیر کا مطالبہ کرنا عجیب ہے۔

لوگوں کا موجودہ ذوق

اب میں آپ کو ثبوت کی حقیقت بتلاتا ہوں جس کے نہ ملنے کی وجہ سے لوگوں کا مذاق ایسا بگڑ گیا ہے کہ آج علماء سے معراج کی نظیر کا سوال ہوتا ہے۔ شوق القہر کی نظیر کا مطالبہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ عقلی مسئلہ ہے کہ کسی خبر کا صحیح ہونا یا کسی امر کا واقع ہونا نظیر پر ہرگز موقوف نہیں چنانچہ جن کو عقلیات سے کچھ بھی مس ہے وہ اس کو جانتے ہیں مدعی اگر نظیر بیان کر دے تو یہ اس کا تبرع ہے بلکہ ثبوت خبر کے لئے دلیلی و دیکھی ضرورت ہے ایک خبر بکا ممکن ہونا دوسرے خبر کا محال ہونا۔ پس ہمارے ذمہ تمام معجزات اور

معادیات کے متعلق دو باتوں کا ثابت کرنا ہے ایک یہ کہ وہ فی نفسہ ممکن ہوں، دوسرے خبر صادقانے اس کے وقوع کی خبر دی ہو۔ ان دو باتوں کے ثابت کرنے کے بعد کسی کو انکار کا حق نہ ہوگا۔

دینی امور کی دلیل

اب ہم معراج وغیرہ اور صراط و وزن اعمال وغیرہ کے ثبوت پر دلیل قائم کرتے ہیں کہ یہ معجزات اور معادیات فی نفسہ ممکن ہیں۔ یہ تو دلیل کا پہلا مقدمہ ہے اگر کسی کو اس مقدمہ میں کلام ہو تو اس پر لازم ہے کہ ان کے امتناع پر دلیل قائم کرے اور ہم کو امکان پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ امکان کی کوئی علت نہیں ہوتی بلکہ امتناع پر دلیل نہ ہونا ہی امکان کی دلیل ہے اور اوپر معلوم ہو چکا ہے، کہ امتناع کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو کہ محل واحد میں آن واحد میں جہت واحدہ سے ہو تو جس کو ان امور کے امکان میں کلام ہو وہ ثابت کرے کہ ان میں اجتماع نقیضین کس طرح لازم آتا ہے۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس امر ممکن کے وقوع کی خبر کوئی خبر صادقانہ دے وہ ثابت ہے اور ان معجزات و معادیات کے وقوع کی خبر خبر صادقانہ نے دی ہے۔ پس یہ امور واقع و ثابت ہیں۔ ان مقدمات میں اگر کوئی کلام کرے تو اس کا جواب ہمارے ذمہ ہے۔ بقیہ نظیر کا پیش کرنا ہمارے ذمہ نہیں

پل صراط پر چلنا

مثلاً اگر کوئی کہے کہ پل صراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے سمجھ میں نہیں آتا تو میں کہوں کہ بھلا وہ کیوں سمجھ میں نہیں آتا اس میں کیا استحالة ہے کہ ایک تاریک چیز پر پیر آجائے۔ جب یہ محال نہیں اور خبر صادقانہ اس کے وقوع کی خبر دے رہا ہے تو پھر انکار کی کیا وجہ، اگر کوئی انکار کرے تو اس کو یہ حق تو ہے کہ امکان کو رد کرے اور امتناع کو ثابت کرے یا دوسرے مقدمہ میں کلام کرے کہ یہ خبر صادقانہ کی خبر نہیں۔ تو ہم دلیل امتناع سننے کیلئے تیار ہیں اور کلام اللہ کو کلام اللہ ثابت کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے اور جب یہ دونوں باتیں ثابت ہو جائیں پھر ہم نظیر پیش کرنے کے ذمہ دار نہیں اور اگر نظیر ہم کو معلوم بھی ہو تب بھی نہ بتلائیں گے کیونکہ یہ ہمارے ذمہ نہیں کہ ہم اپنی سب معلومات آپ کو بتلا دیں۔ ہاں اگر تم یہ ثابت کر دو کہ مستدل کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ضروری ہے تو جب ثابت کر دو گے اس وقت دیکھا جائے گا۔ بدو ان اس کے ہم زماند کے ساتھ جواب نہ دیں گے۔ یہ عوام کو زیادہ تر جواب دینے والوں ہی نے خراب کیا ہے کہ وہ ہر بات میں تبرعاً نظیریں بیان کرنے لگے عوام سمجھے کہ یہ بھی عجیب کے ذمہ ہے تو میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں کہ مستدل کے ذمہ یہ ہرگز نہیں اور جو دعویٰ لازم کا کرے وہ دلیل قائم کرے یہ ہے دلیل مطرد جو تمام معجزات و معادیات میں برابر چل سکتی ہے، اور جو دلیلیں آجکل بیان کی جاتی ہیں جن میں زیادہ

ترنظیر سے جواب دیا جاتا ہے وہ مطرد نہیں ہیں۔

اب میں عقلاً یہ بات ثابت کرتا ہوں کہ کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف نہیں

نہیں۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ نظیر بھی ایک واقعہ ہے میں پوچھتا ہوں کہ اس کیلئے بھی نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں۔ وعلیٰ ہذا۔ اگر ہر نظیر کے لئے نظیر کی ضرورت رہی تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا اور نظیر سے ایک دعویٰ بھی ثابت نہ ہو سکے گا اور اگر جاکر ٹھیکہ دگے کہ اس نظیر کیلئے کسی نظیر کی ضرورت نہیں تو معلوم ہوا کہ کسی واقعہ کا ثبوت بدو ان نظیر کے بھی ہو گیا تو پہلے ہی کیلئے نظیر کی کیوں ضرورت ہے۔ اور جس طرح تم نے اخیر میں ایک واقعہ کو بلا نظیر مان لیا تو پہلے ہی کو بلا نظیر کیوں نہیں مان لیتے۔ غرض کسی دلیل سے مستدل کے ذمے نظیر کا بیان کرنا نہیں ہے ہاں اگر بیان کر دے تو یہ اس کی شفقت ہے اور اس کا موقع اس وقت ہے جب کہ سائل دلیل کے مقدمات پر کلام کرنے سے عاجز ہو جائے اور تسلیم کر لے کہ واقعی دلیل سے یہ دعویٰ ثابت ہو گیا اور مجھے اب انکار کا کوئی حق نہیں۔ اس وقت اگر عجیب تقریباً فہم کے لئے کوئی نظیر دیدے تو اس کا احسان ہے اور اگر وہ نظیر پر ثبوت دعویٰ کو موقوف بتلاتا ہے تو مستدل نظیر ہرگز نہ بتلائے بلکہ اس وقت علیٰ النظر کی دلیل مانگے۔

پل صراط کیا ہے

چنانچہ اس وقت میں ثبوت پل صراط پر دلیل قائم کر کے اس کی ایک نظیر تبرعاً بتلاتا ہوں۔ اول پل صراط کی حقیقت سمجھئے مگر یہ کہے دیتا ہوں کہ یہ مضمون ظنی ہے اس طور پر پل صراط کو سمجھنا واجب نہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ آدمی بجلائے ہوئے عقیدہ رکھے باقی بعض طبائع ضعیف ہوتی ہیں۔ ان کے لئے میں یہ مضمون بیان کرتا ہوں اگر وہ اس طرح بھی پل صراط کو سمجھ لیں تو حرج کچھ نہیں مگر لازم بھی نہیں، لازم تو وہی اجمالاً مان لینا ہے۔ اس تنبیہ کے بعد کہتا ہوں کہ اول اس کی حقیقت سمجھو جس کے لئے اول یہ مقدمہ سنو کہ اس عالم کے سوا ایک عالم اور بھی ہے مسلمان تو اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ اور مخالفین اگر انکار کریں تو ہمارے پاس ان کے جواب کے لئے وہی دلیل مطرد ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ دوسرے عالم کا ہونا ممکن ہے کسی کو امکان پر کلام ہو تو دلیل امتناع قائم کرے اور جس ممکن کی خبر خبر صادقانہ نے دی ہو وہ ثابت ہے۔ پس دوسرا عالم ثابت ہے اور خبر کے صادقانہ ہونے کو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں۔

دنیا میں اختلاف حالات

دوسرا مقدمہ سنئے کہ عالم کے اختلاف سے بعض احکام اور حالات بدل جاتے ہیں، اس کی بھی دلیل تو دی ہے جو مذکور ہوئی اور تقریب فہم کے لئے ایک نظیر بھی بتلاتا ہوں جیسے اقلیم کے بدلنے سے بھی دنیا ہی میں حالات بدل جاتے ہیں مثلاً یہاں اس وقت رات ہے اور ایک اقلیم میں اس وقت دن ہے یہاں آج کل گرمی ہے اور کسی اقلیم میں اس وقت سردی ہے اور علیٰ ہذا جو بیس گھنٹے کا دن رات ہے اور بعض اقلیم میں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہے، اور یہیں سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن میں آج آیا ہے کہ عالم آخرت کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہے اور اس پر بعض لوگ ہنستے ہیں تو یہ انکی حماقت ہے اس میں استبعاد کیا ہے جب عالم دنیا ہی میں اقلیم کے بدلنے سے یہ بات مشاہدہ ہے کہ بعض جگہ چھ ماہ کا دن ہوتا ہے تو اختلاف عالم کے بعد عالم آخرت میں اگر ہزار برس کے برابر ایک دن ہو تو کیا تعجب ہے۔

تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ اختلاف کی کوئی حد نہیں ہے نہ یہ منضبط ہو سکتا ہے۔ یہ مقدمہ بدیہی ہے محتاج دلیل نہیں۔ اور جو شخص کسی حد پر انتہا اختلاف کا دعویٰ کرے اور اس سے آگے اختلاف ہونے کو متنع کہے وہ اس پر دلیل قائم کرے۔

چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ جو چیز یہاں عرض ہو اس عالم میں جا کر جو ہر ہو جائے اس کا ممکن ہونا بھی ظاہر ہے یہ تو مسلم ہے کہ ایک آن اور ایک محل میں شے واحد عرض ہو نہیں سکتی مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شے یہاں عرض ہو اور دوسری جگہ جو ہر ہو جائے اس کے امتناع پر کوئی دلیل قائم نہیں۔ اگر کسی کے پاس دلیل پیش کرے اور استیناس کے طور پر اس کو یوں سمجھے کہ اس زمانہ میں بعض آلات کے ذریعہ سے حرارت و برودت وغیرہ کا وزن ہوتا ہے حالانکہ پہلے حکام ان کو مقولہ کیفیت سے سمجھتے تھے جس کے لئے وزن اور مقدار نہیں ہو سکتی مگر اس زمانہ میں ان کے لئے وزن ہونا ثابت ہو گیا۔ اس لئے میں تو کہتا ہوں کہ جتنی یہ نئی ایجادات ہیں سب معادیات کے سمجھنے کیلئے معین و مدد ہیں چنانچہ گراموفون ہاتھ پیر کے بولنے پر بڑی دلیل ہے کیونکہ گراموفون میں تو روح بھی نہیں اور کلام کرتا ہے تو عظام انسانی کے بولنے میں کیا تعجب جن میں حیات کا تلبس ہے۔

ایک حدیث کی تشریح

اسی طرح ایک حدیث میں ہے جو نسانی میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف کے موقع پر فرمایا کہ میں نے مسجد کی دیوار کے قریب جنت و دوزخ کو دیکھا۔ بعض لوگ اس پر ہنستے تھے کہ جنت و دوزخ تو آسمان

وزمین سے بڑی بتلائی جاتی ہے حضور نے انکو دیوار پر کیونکر دیکھ لیا اور اصلی حالت پر کیسے دیکھ لیا۔ مگر خدا تعالیٰ نے فوٹو اور خوردبین کو ایجاد کر کے اس استبعاد کو دور کر لیا۔ فوٹو میں بڑی سے بڑی شے کو چھوٹا کر کے دکھایا جاسکتا ہے اور خوردبین سے چھوٹی چیز پہاڑ بنا کر دکھائی جاسکتی ہے تو خدا تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ اس نے جنت و دوزخ کا فوٹو مسجد کی دیوار پر اتار دیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت میں خوردبین کی قوت رکھ دی ہو جس سے فوٹو کی چھوٹی چیزیں آپ کی اصلی حالت پر نظر آگئی ہوں اور حدیث میں یہی لفظ وارد ہے امتثلت لی الجنة والنار، فرمایا کہ جنت و دوزخ زمین میں اتر آئی تھیں بلکہ آپ نے یہ فرمایا کہ وہ میرے لئے مثل ہو گئیں۔ اسی لئے جب کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں۔ کیونکہ ان سے شرعیات کا استبعاد دور ہوتا جاتا ہے چنانچہ ایک عجیب بات اس زمانہ میں یہ ہے کہ آج کل حرارت و برودت کا بھی وزن ہونے لگا ہے کہ اس مکان میں کس قدر وزن کی حرارت موجود ہے اور کس درجہ کی برودت ہے اور بخار میں تھرما میٹر سے مریض کی حرارت کا وزن کیا جاتا ہے۔ اب اگر کسی گنوار سے کہئے کہ گرمی بھی تلی ہے تو اسکو کتنا تعجب ہوگا۔

تو جب دنیا ہی میں بعض اعراض کا وزن ہونے لگا جس کی حقیقت ہے بلکہ وزن کے انحصار اور ارتقاع سے مقدار کا معلوم ہو جانا جو کہ سرسری نظر میں خواص جوہر سے ہے تو اگر دوسرے عالم میں جا کر وہ جوہر ہی بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔ اور لیجئے۔ اگر ایک برتن ٹھنڈا پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا اور اسی میں گرم پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا۔ آخر کی بیشی کیوں ہے پانی کی مقدار دونوں حالتوں میں یکساں تھی۔ معلوم ہوا کہ برودت و حرارت کا بھی کچھ وزن ہے۔ اب خواہ اس کو یوں تعبیر کر لیجئے کہ وزن پانی ہی کا ہے مگر بشرط برودت و حرارت کے آفران کو وزن میں دخل تو ہوا۔ تو اس عالم میں اگر یہی دخل درجہ موزونیت میں اس طرح ہو جائے کہ یہ عرض جوہر بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔ اور سنئے! اطباء کہتے ہیں کہ جس شخص میں صفراء کا غلبہ زیادہ ہو وہ خواب میں آگ بہت دیکھتا ہے۔ دیکھئے جو چیز یہاں عرض تھی یعنی حرارت صفراء وہ عالم خیال میں آگ بن گئی جو کہ جوہر ہے پس اس عالم میں عرض کا جوہر بن جانا کچھ بعید نہیں۔

اب پل صراط کی حقیقت سمجھئے کہ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مسلمان کا مذاق تو یہ ہونا چاہئے۔

حدیث مطرب دے گو داز دہر کم تر جو : کہ کس نہ کو نہ کشاید بہ حکمت این معمّار

اور میں کہہ چکا ہوں کہ میرے ذمہ اس کا بیان کرنا لازم نہیں، میرے ذمہ تو وہی تھا جو میں بیان کر چکا ہوں مگر اس میں حط نہ آیا تھا، اس لئے تبرئاً بیان کرتا ہوں کہ خیر جس طرح بھی کام چلے اچھا ہے۔

تو سنے! پہل صراط کی حقیقت شریعت ہے دیکھا قال اصحاب الکشف من العرفاء، پس دنیا میں پہل صراط کی نظیر شریعت موجود ہے اتنا فرق

شریعت پر عمل

ہے کہ یہاں یہ عرض ہے اور وہاں جا کر جو ہر بن جائے گی، باقی ان تمام صفات میں یہ اس کی نظیر ہے جیسے وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے جس پر چلنا دشوار ہے۔ اسی طرح طریق شریعت تھا باریک اور نازک ہے جس پر استقامت کے ساتھ چل لینا ہر ایک کا کام نہیں کیونکہ شریعت مقدسہ مرکب ہے علم و عمل سے تو اس پر چلنے کیلئے دو قوتوں کی ضرورت ہے ایک قوت علمیہ کی، دوسری قوت علمیہ کی۔ قوت علمیہ کا تعلق عقل سے ہے اور قوت علمیہ کا ارادہ سے۔ پھر عمل بعض مفید ہیں اور بعض مضر تو اس میں کہیں تو جلب منفعت کی ضرورت ہے اور کہیں دفع مضرت کی اور جو ارادہ جلب منفعت سے متعلق ہو اس کو قوت شہویہ کہتے ہیں اور جو دفع مضرت کے متعلق ہو اس کو قوت غضبیہ کہتے ہیں تو شریعت پر چلنے کیلئے تین قوتوں کی ضرورت ہوئی۔ قوت عقلیہ، قوت شہویہ، قوت غضبیہ۔

یہی اصول اخلاق کہلاتے ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے تین درجے ہیں۔ افراط، تقریط اور توسط۔ اور شریعت نام ہے توسط کا۔ شریعت میں افراط عقل سے کام نہیں چلنا تقریط سے کام چلنا ہے بلکہ توسط کی ضرورت ہے جس کا نام حکمت ہے اور قوت عقلیہ کا نام جزیرہ ہے یہ نہایت مضر ہے۔ جب عقل بہت بڑھ جاتی ہے تو ہر چیز میں احتمالات عقلیہ پیدا ہونے لگتے ہیں جس سے آدمی وہمی ہو جاتا ہے جیسے اہل فلسفہ میں ایک فرقہ لااوریث شہور ہے کہ وہ کسی حقیقت کا وجود تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک چیز کو دو سے دیکھ کر آدمی سمجھتے ہیں اور وہ گدھا نکلتا ہے۔ بہت لوگ ایک شخص کو حسین سمجھتے ہیں اور بہت سے اس کو بد صورت سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ ایک چیز کو میٹھا بتلاتے ہیں اور بخار والا اس کو کڑوی بتلاتا ہے اسی طرح مسائل عقلیہ میں کوئی ایک دلیل کو صحیح کہتا ہے کوئی غلط۔ تو جب ہمارے حواس ظاہرہ اور باطنہ میں اتنا اختلاف ہے اور کبھی ان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے، تو کیا اطمینان ہے کہ جس کو ہم نے آدمی سمجھا ہے وہ آدمی ہی ہے گدھا نہیں اور جس کو ہم زمین سمجھتے ہیں وہ زمین ہی ہے آسمان نہیں۔ ممکن ہے ہماری نظر نے غلطی کی ہو۔

بس ان کا یہ حال ہو گیا کہ ہر بات میں ان کو شک ہے اور شک میں بھی شک ہے

فہو شاک و شاک فی اتما شاک۔

عقل کی مثال

تو حضرت یہ عقل جب بڑھتی ہے تو اتنا پریشان کرتی ہے کہ زندگی تباہ کر دیتی ہے اور یہی وجہ ہے بہت سے عقلاء کے تباہ ہونے کی، کہ انھوں نے عقل سے وہ کام لیا جو اس کی حد سے آگے تھا اور ہر چیز کا اپنی حد سے آگے نکل جانا مضر ہے۔ میں نے عقل کے متعلق ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسی ہے جیسے گھوڑا پہاڑ پر چڑھنے والے کے لئے۔ اب تین قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑ تک پہنچے اور پھر پہاڑ پر بھی اس پر سوار ہو کر چڑھنے لگے یہ غلطی پر ہیں۔ ضرور کسی سیدی اور چڑھائی پر سوار اور گھوڑا دونوں گریں گے، اور ایک وہ ہیں جو یہ سمجھ کر کہ گھوڑا پہاڑ پر تو کام دیتا ہی نہیں تو اس سے صاف نترک کر بھی کام لینے کی کیا ضرورت ہے وہ گھوڑے سے پیدل چل پڑے، نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ تک پہنچ کر تھک گئے یہ بھی نہ چڑھ سکے تو ان دونوں کی رائے غلط تھی۔ پہلی جماعت نے گھوڑے کو ایسا باکار سمجھا کہ اخیر تک اسی سے راستہ طے کرنا چاہا اور دوسرے ایسا بیکار سمجھا کہ پہاڑ تک بھی اس سے کام نہ لیا۔ صحیح بات یہ ہے کہ گھوڑا پہاڑ تک تو کارآمد ہے اور پہاڑ پر چڑھنے کے لئے بے کار ہے اس کے لئے کسی اور سواری کی ضرورت ہے۔ یہی عقل کا حال ہے کہ عقل سے بالکل کام نہ لینا بھی حماقت ہے اور اخیر تک کام لینا بھی غلطی ہے۔

پس عقل سے اتنا کام تو لو کہ تو حید و رسالت کو سمجھو اور کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم کر لو۔ اس سے آگے فردع میں عقل سے کام نہ لینا چاہئے، بلکہ اب خدا اور رسول کے احکام کے آگے گردن جھکا دینی چاہئے، بلکہ اب خدا اور رسول کے احکام کے آگے گردن جھکا دینی چاہئے چاہے انکی حکمت عقل میں آوے یا نہ آوے۔

قانون سلطنت کیوں بنتے ہیں

دیکھئے قانون سلطنت کے منوالے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ پہلے یہ سمجھا دیا جاوے کہ جابر بنجہم بادشاہ ہے۔ اس کے بعد تمام احکام کے متعلق یہ کہہ دیا جاوے کہ یہ بادشاہ کے احکام ہیں اسلئے ماننا پڑے گا تو یہ صورت آسان ہے اور تمام عقلاء ریا سا ہی کرتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص جابر بنجہم کو بادشاہ مان کر پھر بھی ہر قانون میں الجھنے لگے کہ میں اس دفعہ کو نہیں مانتا۔ تو بتلائیے اس شخص کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ہر جگہ ذیل ہوگا اور عقلاء کہیں گے کہ جب بادشاہ کا بادشاہ ہونا مسلم اور اس قانون کا قانون سلطنت

ہونا معلوم تو پھر انکار کی کیا وجہ۔ ضرور ماننا پڑے گا چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے، معلوم ہوا کہ صاحب سلطنت کے پہچانے کیلئے تو عقل سے کام لینے کی اجازت ہے اس کے بعد عقل سے کام لینے کی اجازت نہیں پھر کیا وجہ کہ آپ دین کے معاملہ میں آخر تک عقل سے کام لینا چاہتے ہیں، یہ سخت غلطی ہے جس سے بجز ذلت کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جب خدا کا خدا ہونا مسلم۔ رسول کا رسول ہونا مسلم، کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم، پھر ہر حکم میں الجھنے کا آپ کو کیا حق ہے، اور ہر شخص آپ کو بیوقوف بنائے گا اور تمام عقلا کی نظروں میں آپ ذلیل ہوں گے سچ یہ ہے۔

عزیزے کا زور گمشدہ سر تباخت بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

کہیں عقل کو چھوڑنا بھی چاہئے غرض عقل سے اس وقت تک کام لوجہ تک وہ کام دے سکے جہاں اس کا کام نہیں وہاں اس کو چھوڑ دو اور حکم کا اتباع کرو تو عقل کی بھی ایک حد ہوئی اور کیوں نہ ہو وہ بھی تو ایک قوت ہے جیسے آنکھ کی ایک قوت ہے اور اس کی ایک حد ہے اس سے آگے دوڑین لگانے کی ضرورت ہے ایسے ہی شریعت کے معاملہ میں اصول تک تو عقل کام دیتی ہے اور فروع میں یہ تنہا بے کار ہے بلکہ دوڑین دچی سے کام لینا ضروری ہے ایسے ہی کان کی ایک قوت ہے جس کیلئے ایک حد ہے کہ اس سے آگے ٹیلیفون سے مدد لینے کی ضرورت ہے، پیردوں کی ایک قوت ہے جس سے آگے سواری سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔

تو جب ہر قوت محدود ہے تو عقل کیسے محدود نہ ہوگی؟ ضرور ہوگی اس کے آگے دچی سے کام لو ورنہ یاد رکھو کہ عمر بھر سستہ نہ ملے گا کیونکہ سمعیات میں عقل کام نہیں۔ وہاں تو اتباع رسول کی ضرورت ہے۔

خلافت پیغمبر کے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواستہ رسید

صاحبو! دنیا میں بھی تو آپ بہت جگہ عقل کو چھوڑ کر کسی نہ کسی کا اتباع کرتے ہیں۔ دیکھئے جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو عقل سے اتنا کام تو لیتے ہیں کہ اطباء موجود ہیں اس سے کون زیادہ حاذق و تجربہ کار ہے اور جب ایک طبیب کا حاذق ہونا معلوم ہو گیا تو پھر آپ اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہے پھر آپ اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ اس نسخہ میں فلاں دوا کیوں لکھی اور فلاں کیوں نہیں لکھی اور اس دوا کا وزن چار ماشہ کیوں لکھا چھ ماشہ کیوں نہ لکھا۔ ہم نے

کسی کو طبیب سے ان باتوں میں الجھتا ہوا نہیں دیکھا۔ اور اگر کوئی اس سے الجھنے لگے تو عقلاً اس کو بیوقوف بناتے ہیں اور طبیب بھی صاف کہہ دیتا ہے کہ اگر تم میرے پاس مجھ کو طبیب سمجھ کر آئے ہو تو جو نسخہ میں تجویز کروں ان میں تم کو چون دچرا کا کوئی حق نہیں اور اگر چون دچرا کرتے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم مجھ کو طبیب نہیں سمجھتے پھر میرے پاس کیوں آئے تھے اور اس کے اس جواب کو تمام عقلا صریح کہتے ہیں۔ پھر حیرت ہے کہ رسول کو رسول تسلیم کرنے اور کلام اللہ کو کلام اللہ مان لینے کے بعد عقل کو ان کے تابع نہ کیا جائے اور بات بات میں الجھا جاوے کہ یہ تو خلافت عقل ہے ہم اسے کیوں مان لیں۔

رسولانے کا حاصل صاحبو! اگر تم نے رسول کو رسول مان لیا ہے تو ہر بات کو بلا چون و چرا مان لینا پڑے گا اور یہ کہنے کا حق نہ ہوگا کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آئی، ورنہ اس کے معنی میں کہ تم نے اب تک رسول کو رسول ہی نہیں سمجھا اور کلام اللہ کو کلام اللہ ہی نہیں مانا۔ انفس دنیا کے کاموں میں تو عقل کی ایک حد ہو اور طبیب کو طبیب مان لینے کے بعد اس کی تجویز میں عقل کو دخل نہ دیا جاوے اور امور آخرت میں اس کی کوئی بھی حد نہ ہو۔

عقل کو چھوڑنا پڑتا ہے صاحبو! جب دنیا کے کام بدون اس کے نہیں چل سکتے کہ عقل کو ایک حد پر چھوڑ دیا جائے اور بلا چون و چرا دوسرے کا اتباع کیا جائے تو آخرت کا کام بدون اس کے کیونکر چلے گا، کیونکہ دنیا کی چیزیں تو دیکھی ہوئی بھی ہیں، ان میں کسی قدر عقل چل بھی سکتی ہے پھر بھی انکو چھوڑ کر کالمین و ماہرین کی تقلید کی جاتی ہے اور آخرت سے تو ہم سب اندھے ہیں، وہاں بدون تقلید دچی کے کیسے کام چلے گا۔ اور اگر آپ عقل سے کام لیا گیا تو وہی مثال ہوگی جیسے ایک اندھے نے کہا تھا کہ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ شان درد اس کا یہ ہے کہ ایک لڑکا اپنے اندھے حافظ کیلئے گھر سے کھیر کی دعوت کرتے آیا۔ پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے کہا سفید ہوتی ہے۔ حافظ جی نے سیاہ و سفید میں کیوں فرق کیا تھا ان کے نزدیک تو نہ کوئی چیز سفید تھی نہ سیاہ کیونکہ آنکھیں ہی نہ تھیں تو آپ پوچھتے ہیں سفید کیسا ہوتا ہے۔ اس نے کہا جیسے بگلا۔ حافظ جی نے پوچھا کہ بگلا کیسا ہوتا ہے۔ لڑکے نے ہاتھ کو (ح) کی طرح موڑ کر کہا کہ ایسا ہوتا ہے حافظ جی نے جو اپنا ہاتھ پھر کر اس شکل سے تصور کیا تو کہنے لگے بھائی یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ میرے گلے سے کیونکر اترے گی۔

تو دیکھئے جو چیز آنکھ سے نہ دیکھی ہو اس میں عقل سے کام لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ معمولی سی کھیر کا کیا سے کیا بن گیا جس میں جبالے اور ننگھنے کی بھی مشقت نہ تھی اب وہ گلے میں پھنسنے لگی۔

محض عقل کافی نہیں

تو واقعی اندھے کو کوئی کیونکر سمجھائے کہ سفید رنگ کیسا ہوتا ہے اگر حافظہ ساری عمر بھی اسی سبق میں ہیں تب بھی نہیں سمجھ سکتے بس اس کا طریقہ تو یہ ہے کہ کسی غیر خواہ سوانگھے کی تقلید کر لی جائے۔

اسی طرح اگر تم کسی ولایتی کو جس نے کبھی آم نہ کھایا ہو تم کامزہ سمجھا ناچا ہو تو کیا وہ سمجھ جائیگا ہرگز نہیں۔ تم کہو گے کہ آم میٹھا ہوتا ہے وہ ہیکہ کہ ہم تو روز گڑ کھاتے ہیں بس آم ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ صاحب! اس کو سمجھانے کا طریقہ یہ ہے کہ آم لا کر اسے کھلا دو۔ اور اگر یہ نہیں تو پھر اس کو تقلید مان لینا چاہئے اور اپنی عقل سے اس کی نظیریں نہ نکالنا چاہئیں۔ اسی طرح امور آخرت کو اگر پوری طرح سمجھنے کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ موت کے منتظر ہو۔ مرنے کے بعد صراط اور وزن اعمال وغیرہ کی سب حقیقت سامنے آجائے گی اور اگر دنیا ہی میں سمجھنا چاہتے ہو تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ قرآن اور رسول نے جو کھدیا ہے اس کی تقلید کرو اور ان کی نظیریں دریافت کرنے کے درپے نہ ہو۔ مثالوں سے تم آخرت کی حقیقت ایسی ہی سمجھو گے جیسے حافظ نے کبیر کو ٹیڑھا بتلایا تھا۔

بس خوب سمجھ لو کہ عقل کی ایک حد ہے جس سے بڑھ جانا مضر ہے اطار نے بھی تو اس کو مضر لکھا ہے اور امراض میں شمار کیا ہے کیونکہ افراط عقل کا نتیجہ اودام و شکوک میں ابتلا ہے جس سے قلب و دماغ دونوں ضعیف ہو جاتے ہیں۔ فارابی کی حکایت ہے کہ ایک شخص حلوہ بیچتا پھرتا تھا۔ اس سے پوچھا، کیف تبیع الحلوۃ، تو حلوہ کس طرح بیچا ہے، اس نے جواب دیا کہ ذابدانق کہ ایک دانگ میں اتنا دیتا ہوں، تو آپ کہتے ہیں اسئلک من الذکیفۃ و تجیبہ عنی الکمیۃ میں تو کیفیت سے سوال کرتا ہوں اور تو کمیت سے جواب دیتا ہے۔ آپ حلوئی سے الجھ گئے۔ اس کو عقل کا ہیضہ کہتے ہیں ہر وقت اسی کے چکر میں رہے۔

افراط عقل کا نتیجہ

چنانچہ افراط عقل کا یہ نتیجہ تھا کہ فلاسفہ نے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کیا اور جب عاجز ہو گئے تو ان کی نبوت کا تو اقرار کیا مگر کہنے لگے کہ جاہلوں کے واسطے نبی ہیں ہم کو نبی کی ضرورت نہیں محض ہذا بنا نفوسنا بالاحکمة ہم نے تو اپنے کو حکمت سے مزین بنا لیا ہے۔ حق تعالیٰ ایسے لوگوں کے حق میں فرماتے ہیں فحوا ینا عندہم من العلم یہ لوگ اپنے علم پر نازاں ہو گئے اور یہ نہ سمجھے کہ علوم نبوت عقل سے باہر ہیں چنانچہ الہیات میں فلاسفہ نے تحقیقات بیان کی ہیں ان میں اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ آج مسلمانوں کا ایک دینی طالب علم بھی ان پر ہنستا ہے یہ تو افراط فی العقل ہے اور ایک ہے تفریط کا درجہ یعنی عقل

کی کمی۔ اس کو حماقت کہتے ہیں۔ شریعت میں یہ دونوں درجے بیکار اور مذموم ہیں بلکہ مطلوب تو وسط ہے جس کو حکمت کہتے ہیں۔

قوت شہوانیہ

دوسری قوت شہویہ ہے اس میں بھی تین درجے ہیں۔ ایک افراط جس کا نام فحور ہے۔ شریعت میں یہ بھی مطلوب نہیں کیونکہ اس کا انجام فسق ہے۔ اور ایک تفریط ہے کہ آدمی نامرد بن جائے کہ ضروری انتفاعات سے بھی محروم ہو یہ بھی مطلوب نہیں، کیونکہ اس سے ہمت اور حوصلہ پست ہو جاتا ہے اور اولوالعزمی اور اخلاق عالیہ مفقود ہو جاتے ہیں جو بڑا نقص ہے۔ اور ایک ہے توسط جس کا نام عفت ہے یہ مطلوب ہے۔

قوت غضبیہ

تیسری چیز قوت غضبیہ ہے اس میں بھی تین درجے ہیں ایک افراط جس کو تہور کہتے ہیں کہ موقع بے موقع کچھ نہ دیکھے اندھا دھند جوش دکھلانے لگے۔ جیسا آج کل ہورہا ہے کہ جس طرف چلتے ہیں جوش میں اندھے بن کر چلتے، یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اس جوش سے نفع ہو گا یا نقصان۔ یہ بھی شریعت میں مطلوب نہیں۔ اور ایک ہے تفریط جس کو جن اور بزدلی کہتے ہیں کہ موقع اور ضرورت کے وقت بھی ہمت سے کام نہ لیا جاوے، جیسے بعض لوگ ایسے ڈر لوگ ہوتے ہیں کہ حکام کے سامنے ادب اور تہذیب سے بھی اپنی حاجات ظاہر نہیں کر سکتے۔ یہ بھی مطلوب نہیں۔ اور ایک درجہ توسط کا ہے جس کا نام شجاعت ہے۔ یہ مطلوب۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت اور موقع پر جوش ظاہر کیا جائے جہاں نفع کا ظن غالب ہو۔ اور بے موقع جوش سے کام نہ لیا جائے جہاں نفع کی کچھ امید نہیں محض نقصان ہی نقصان ہے۔

اخلاق پسندیدہ

غرض اخلاق پسندیدہ کے اصول تین ہیں۔ حکمت، عفت، شجاعت اور ان کے مجموعہ کا نام عدل ہے اور یہی شریعت کا حاصل ہے اور قرآن میں فرمایا ہے وکذلک جعلناکم امتا وسطا اس سے بھی عدل مراد ہے مطلب یہ ہے کہ ہم نے ایک ایسی شریعت دے کر جو کہ مرابا عدل ہے، امت و وسط یعنی امت عادل بنایا۔

ایک مقدمہ اور سن لیجئے کہ وسط دو قسم کا ہوتا ہے ایک وسط حقیقی ایک وسط عرفی۔ وسط حقیقی وہ خط ہے جو بیچوں بیچ ہو وہ قابل تقسیم نہیں سوتا۔ اور ایک وسط عرفی ہے جیسے کہا کرتے ہیں کہ یہ ستون مکان کا وسط ہے تو وہ وسط حقیقی نہیں کیونکہ وہ تو منقسم ہے اس کے اندر بھی ایک جزو دائیں اور ایک بائیں اور ایک بیچ میں نکل سکتا ہے۔ پھر وہ وسط حقیقی کہاں ہوا۔ حقیقی وسط تو وہ ہے جس میں دایاں بائیں کچھ نہ نکل سکے سو ایسا وسط ہمیشہ غیر منقسم ہوگا۔

پس سمجھ لو کہ شریعت اس وسط کا نام ہے جس میں افراط و تفریط کا ذرا بھی نام نہ ہو بلکہ عین توسط ہو۔ یہی وسط حقیقی روح شریعت ہے۔ اور یہی کمال ہے۔ اور یہ پر معلوم ہو چکا کہ وسط حقیقی ہمیشہ غیر منقسم ہوتا ہے تو شریعت کی روح بھی غیر منقسم ہے۔ چنانچہ جس اصول اخلاق کو میں نے بیان کیا ہے ان میں افراط و تفریط کو چھوڑ کر جو ایک وسط ننگے کا جس کو نہ افراط کی طرف میلان ہوگا، نہ تفریط کی طرف وہ ہمیشہ غیر منقسم ہوگا اور ایسے وسط پر رہنا ضرور دشوار ہے۔

شریعت کی نزاکت پس شریعت ان دونوں جانوں پر نظر کر کے اپنی دشواری کی وجہ سے تلوار سے تیز اور بوجہ غیر منقسم ہونے کے بال سے باریک ہوگی کیونکہ بال بھی منقسم ہے اور وسط حقیقی غیر منقسم ہے پس قیامت میں روح شریعت یعنی وسط حقیقی جو ہر بن کر پل صراط کی شکل میں ظاہر ہوگا جس پر سے مسلمانوں کو چلایا جاوے گا پس جو شخص دنیا میں شریعت پر تیزی و سہولت کے ساتھ چلا ہوگا وہ وہاں بھی تیزی کے ساتھ چلے گا کیونکہ وہ بھی تو شریعت ہوگی جس پر دنیا میں چل چکا ہے اور جو یہاں نہیں چلایا کم چلا ہے وہ پل صراط پر بھی نہ چل سکے گا یا سستی کے ساتھ چلے گا۔ لیجئے میں نے آپ کو پل صراط کی سیہ بھی دکھلا دی۔ اب تو کوئی اشکال نہیں رہا۔ اسی طرح ہمارے پاس تمام شریعات کیلئے عقلی نظام موجود ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ پل صراط ہی کی خصوصیت ہے لیکن ہم ان تحقیقات کو مقصود نہیں سمجھتے، ہمارا اصلی مذہب تو یہ ہے کہ

ما قصہ سکندر و دارا خواندہ ایم : از ما بجز حکایت ہر دو فنا پیرس

باقی میں نے نمونہ کے طور پر یہ تحقیق اس لئے بیان کر دی تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے پاس ہر مسئلہ میں ایسی ہی تحقیقات موجود ہیں اور سمجھ میں آجائے کہ علم شریعت کے سامنے علوم فلسفہ کی کچھ بھی حقیقت نہیں جس سے نمونہ کے طور پر اس وقت میں نے کچھ بیان کر دیا ہے تاکہ آپ علماء اسلام کو تحقیقات سے خالی نہ سمجھیں، بجز اندر ہمارے پاس ان تحقیقات کا ذخیرہ بھی بہت زیادہ ہے۔ لیکن

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در مجلس رندان خبر نیست کہ نیست

(تفصیل الدین ص ۳۵ تا ۵۲)

(۳۰) اس رائے کا جواب کہ مولوی سب باہم متفق ہو جائیں

تو سارا باہمی نزاع دور ہو جائے

واقعی یہ ایک قیمتی رائے ہے مگر اس میں ایک دھوکا ان صاحبوں کو ہو رہا ہے جس کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں مگر اول اس کی ایک نظیر پیش کرنا ہوں کیونکہ آج کل بدوں اس کے لوگ کچھ نہیں سمجھتے۔

اس وقت یہ بات سب کو مسلم ہے کہ اہل یورپ آج کل سب سے زیادہ متمدن ہیں، بالخصوص انگریز دنیاوی امور میں ان کی عقل و فہم سب سے زیادہ جست بھیجی جاتی ہے۔ ان کا ایک قانون ہے کہ جب کوئی عدالت میں جا کر ناش کرے تو حاکم کو اس کی تصدیق کرنی چاہئے شہادت اور ثبوت طلب کرے اور دیکھا رطوفین میں گفتگو ہو اور آخر تک حاکم سب کی گفتگو سننا رہے پھر اپنی رائے کے موافق کسی ایک کو ترجیح دیکر ڈگری دیتا ہے اور اس درمیان میں ظاہر ہے کہ ہر ایک ایک دلیل اپنے مؤکل کو غالب کرنے کی کوشش کرتا ہے اور طرفین میں اچھی طرح مباحثہ قائم ہوتا ہے۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ کوئی تسلیم یافتہ اس طریقہ تصدیق میں اس حاکم کو ظالم کہے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ ہر ایک شخص اس کو عدل کے موافق سمجھتا ہے، پس اگر نا اتفاقی بری چیز ہے تو ان دیکھا رطوفین کو کیوں نہیں ملا مت کیجاتی اور سب سے زیادہ اس حاکم کو ملا مت کرنی چاہئے جس نے اپنی کجبری میں نزاع اور بحث قائم ہونے دی اور اسی پر اپنے فیصلہ کی بنیاد ڈالی۔ مگر جب اس مناہت کو قابل ملا مت نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کو عین عدل کہا جاتا ہے تو اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ مناہت اور نا اتفاقی مطلقاً بری نہیں بلکہ طریقہ یہ ہے کہ اول معاملہ کی تصدیق کیجاتی اور قبل تصدیق کے دونوں میں سے کسی کو ملا مت نہیں کیجا سکتی اور تصدیق کے بعد جو حق معلوم ہو اس کا ساتھ دو اور جو ناحق ہو اس کو ملا مت کر دینا کیا کہ دونوں کو ملا مت کیجاتی ہے اور دونوں کو اس اختلاف چھوڑنے اور اتفاق کر لینے کی ترغیب دی جاتی ہے ہر معاملہ میں ایسا اتفاق ممکن نہیں ہوا کرتا۔ اگر حاکم بھی ایسا ہی کرے کہ دونوں فریق کو ملا مت کرنے لگے تو کیسے ہو مگر دنیاوی معاملات میں یہ تو تسلیم یافتہ بھی اس قاعدہ پر عمل نہیں کرتے اور ہمیشہ ایک فریق کا جو حق پر معلوم ہو ساتھ دیا کرتے ہیں پھر دین کے بارہ میں یہ قاعدہ کیوں نہیں برتنا جاتا اس سے ایک راز معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے دلوں میں دین کی وقعت و عظمت

کوئی چیز نہیں اسلئے اس کی کچھ فکر بھی نہیں۔

میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر حاکم کے برابر بھی ان کے نزدیک مذہب کی ضرورت ہوتی تو یہ ہمیشہ صاحب حق کی مدد کرتے یہ کیا کہ زید کو بھی ملا

عمر کو بھی ملا، اس کو اتفاق کی ترغیب اس کو بھی۔ آخر کس بات میں دونوں متفق ہوں، کس بات کو قبول کریں۔ اگر کوئی ایسی بات ہو جس میں اتفاق ہو سکے تو خیر۔ جب اعتقاد کا اختلاف ہے، ایک فریق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی سمجھتا ہے دوسرا فریق ایسا نہیں سمجھتا۔ ایک فریق ابو حنیفہ کو فقہیہ مجتہد سمجھتا ہے دوسرا ان کو مخالف خدا اور رسول جانتا ہے۔ تو اب بتلاؤ کہ اتفاق کی کیا صورت ہے۔ دونوں کے عقائد میں تضاد ہے اب سوا اس کے کہ فریق اپنا عقیدہ بدلے اس کے سوا کوئی صورت اتفاق کی نہیں اپنے اپنے عقیدے قائم رہ کر اتفاق ہرگز مقصور نہیں، البتہ اگر مذہب عقیدہ کوئی ضروری چیز نہ ہو تو پھر واقعی ہو سکتا ہے مگر اس کو بجز ان تعلیم یافتہ حضرات کے کوئی عاقل بھی تسلیم نہیں کر سکتا اور زبان سے تو یہ بھی تسلیم نہیں کر سکتے اگرچہ دلوں میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔

دوسرا اس طریقہ پر دنیاوی امور میں بھی عمل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک شخص نے جلس میں ایک بات نکالی تو اس میں بھی دوچار اختلاف کرنے والے ہو جائیں گے اب اگر دونوں فریق کو ملامت کی جائے اور اتفاق کی ترغیب کی جائے تو ساقی امتیں آجائیں گی مگر اتفاق ناممکن ہوگا۔

پس آپ کا طریقہ تو ایسا نامتام ہے کہ مذہب میں کار آمد اور نہ دنیا میں۔ اب میں بتلاتا ہوں کہ اتفاق کیونکر ہو، پہلے آپ خود تحقیق کیجئے کہ صورت معاملہ کیا ہے پھر جو حق بجانب ہو اس کا ساتھ دیجئے اور دوسرے کو ملامت کیجئے اور پہلے کا تابع بنائیے یہ جو دونوں کو ملامت کیجاتی ہے سخت غلطی ہے۔ اس زمانہ کے نوجوانوں کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ وہ اتفاق کو محمود اور اختلاف کو مذموم سمجھ کر علماء کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ آپس میں اتفاق کر لو۔ پس ان کی اتنی بات تو قابل تسلیم ہے کہ نزاع و اختلاف واقعی بری چیز ہے اس کے زائل کرنے کا جو طریقہ بتلایا جاتا ہے کہ دونوں کی ملامت کر کے اتفاق کی دونوں کو ترغیب دیجائیے یہ بالکل سراسر عقل کے اور فطرت کے خلاف ہے، کیونکہ اسکے تو یہ معنی ہوئے کہ صاحب باطل کچھ صاحب حق کا اتباع کرے اور صاحب حق کچھ صاحب باطل کا اتباع کرے کہ پہلے ایک فریق جو خالص حق پر تھا تو اب وہ بھی باطل کا پیرو ہو جائے، اس کو فطرت انسانہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتی۔

عجب بات ہے کہ یہ لوگ خلافت فطرت کی تعلیم کو ہمیشہ ناقابل اشاعت سمجھتے ہیں اور سب سے

زیادہ مدعی فطرت ہیں مگر دین میں نہ معلوم وہ فطرت کیا ہو جاتی ہے جو خلافت فطرت کی تعلیم دیتے ہیں۔ (روحۃ المحب ص ۲۲)

(۳۱) دو عورت میں مساوات اور اس کا فیصلہ

آج کل کے نوجوانوں کا یہ دعویٰ مساوات محض زبان سے ہی ہے عمل میں وہ بھی برابری نہیں کر سکتے۔ ایک متمدن قوم کو دیکھ لیا کہ وہ عورتوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں تو خود بھی اس کا اتباع کرنے لگے مگر یہ نہ دیکھا کہ وہ لوگ کسی مذہب کے پابند نہیں ایسے لوگوں کی تقلید پابند مذہب قوم کیسے کر سکتی ہے پھر اس کے اس طرز و انداز کے نتائج پر نظر نہ کی کہ اس مساوات کا اثر ان کے حق میں مفید ہوا یا مضر غرض بالکل کورانہ تقلید کر کے مساوات سارے قائل ہونے لگے۔

جب خدا ہی نے عورت کو تشریفاً و تمکیناً محکوم بنایا ہے تو اس کو برابر کوں کر سکتا ہے، کیونکہ خدا کا عورتوں کو محکوم بنانا جیسا کہ آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے دلیل عقلی سے بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس بات پر سارا عالم متفق ہے کہ عورتیں مرد سے کم ہیں بہت سی باتوں میں اس کا کسی کو انکار نہیں، اور جس بات پر ساری دنیا کا اجماع ہو وہ عین تقاضا اور فطری قانون ہوتا ہے، عقلی دلیل کے علاوہ حسی دلیل بھی اس بات پر قائم ہے کہ عورتیں مرد سے کم ہیں۔

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ خدا نے عورت و مرد کی خلقت مرد و عورت میں فرق رکھا ہے۔ مرد جسمانی قوت میں

عورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ عقل مرد کی زیادہ ہوتی ہے۔ آواز مرد کی بلند ہوتی ہے۔ مرد عورت سے رائے میں زیادہ پختہ ہوتا ہے اور عورت کو دیکھا جائے تو اس کی ہر چیز مرد سے کم نظر آتی ہے، ظاہری اعضاء کی بناوٹ میں بھی اور عقل و رائے میں بھی،

قرآن میں حق تعالیٰ کفار کی خرابی عقیدہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ام اتخذہما یخلق بذات و احصکم بالبنین یعنی کیا خدا تعالیٰ نے اپنے لئے مخلوقات میں سے لڑکیاں تجویز کی ہیں اور تم کو لڑکوں کے ساتھ منتخب کیا ہے۔

پھر فرماتے ہیں او من یشئ فی الخلیۃ دھوی الخصام غیر مصین کہ خدا تعالیٰ کے لئے تجویز بھی کیں تو لڑکیاں جو ابتداء سے زہر دار کہنے میں پرورش پاتی ہیں۔

یہی مصلحت ہے کہ کسی کے تاج ہو کر رہے اگر کسی بیوقوف کو حاکم بنا دیا جائے تو دیکھو انجام کیا ہوگا خود بھی ہلاک ہوگا دوسروں کو بھی تباہ کرے گا۔ اگر چھوٹے بچے کو اس بابل تاج نہ کیا جائے تو وہ یقیناً ہلاک ہوگا۔ کیونکہ اس کو اپنے نفع اور ضرر کی کچھ خبر نہیں۔

تو بیوقوف کیلئے کسی کا ماتحت ہونا بھی مصلحت ہے تاکہ دوسرا اس کو روک لوٹ کر سکے اور یہی راز ہے اس حدیث کا جو حضور سے مروی ہے کہ وہ قوم بھی فلاح نہ پائے گی جس کی حاکم عورت ہو کسری شاہ فارس کی بیٹی جب بادشاہ ہوئی تھی اس پر آپ نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔

یہ ہیں سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ آج کل ہماری خرابی و خستگی کا باعث عورتوں کو حاکم بنانا

یہ چھوٹی سی حکومت ہے مگر اس کا نتیجہ بھی خراب ہی ہے مثلاً شادی بیاہ کی ساری رسمیں عورتوں ہی کی خواہش سے پوری کی جاتی ہیں جس کا انجام ظاہر ہے کہ کیا ہوتا ہے کس قدر خاندان ان رسوم شادی میں تباہ ہو گئے یہ سارا فساد عورتوں کے حاکم بنانے کا ہے، عورتوں کی دلجوئی گونا قدری ہے مگر ان کے تاج بننا برا ہے۔ اس وقت سارا مال و اولاد عورتوں کے قبضہ میں ہم نے کر دیا ہے پھر دیکھ لیجئے ردیم کیسے بجا مواضع میں صرف ہوتا ہے اور بچوں کی صحت خراب اور اخلاق تباہ ہو رہے ہیں، عورتیں بچوں کو جو چاہیں کھلا دیتی ہیں جس سے انکی زندگی بھاری میں کٹتی ہیں محبت و پیار صد سے زیادہ کرتی ہیں جس سے لڑکے شوق ہو جاتے ہیں۔

تو اپنے مال و اولاد کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہئے عورتوں کو حاکم کر دینا سخت باعث تنزل ہے جس کو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے فرما گئے ہیں۔

اس حدیث پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ بعض تمدن قوموں میں عورتیں حاکم ہوتی ہیں اور بعض جگہ اب بھی ہیں اور پھر ان کو ترقی ہے اول تو مال و مادیات کی ترقی فلاح نہیں، فلاح قومی کی اصل ترقی اخلاقی و علمی و روحانی ہے تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ جن قوموں میں عورت بادشاہ ہے انکو یہ ترقی نصیب ہوئی۔ دوسرے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان کی ترقی حقیقی ترقی ہے تو ہم کہیں گے کہ اس کا اثر ہے کہ ان میں عورتیں خود مختار حاکم نہیں محض ضابط کی حاکم ہیں۔ اصل بادشاہ پارلیمنٹ ہے تو ایسی حکومت کوئی حکومت نہیں نام کی بادشاہت ہے اس سے مضمون حدیث پر غبار بالکی نہیں آ سکتا، میں نے اس حدیث کو اس وقت اسی نے بڑھ دیا کہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت جو ہم نے نظروں کو حاکم عورتوں کو بنا رکھا ہے اسکو بھی ہماری پستی اور تنزل میں مل ہے اور اچکل ہم پر یہ ایسی تباہی آرہی ہے کہ بجا

اور دوسرے کہ کوتہ بیانیہ میں نہایت ضعیف ہیں۔ یہ دڑ باتیں عورتوں میں نقص کی ایسی ہیں کہ آنکھوں سے دیکھ لو، واقعی لڑکیوں میں ابتدائی سے ہی سے زیور کا شوق ہوتا ہے اور یہ دلیل ہے، ان کی محدودیت نظر کی چنانچہ خود مردوں ہی میں دیکھ لو جس کو زینت کا شوق ہوگا، اس کے خیالات پست اور محدود ہوں گے اور جو سادہ ہوگا اس کے خیالات عالی ہوں گے اور اس کا راز یہ ہے کہ لباس و غیر ضرورت کی چیزیں ہیں اصل مقصود نہیں۔ اب سمجھ لیجئے کہ ضرورت کی چیزوں سے کتنا تعلق ہونا چاہئے سو فہم ہے کہ ہر عاقل ضرورت کی چیزوں سے بقدر ضرورت تعلق رکھے گا اور زیادہ کوشش اصل مقصود دین کرے گا وہ شخص نہایت پست خیال ہے جو غیر مقصود چیزوں کی دھن میں لگا رہا ہو۔ پس لڑکیوں کو زیور اور زینت سے زنجبت ہونا ان کے پستی خیالات کی دلیل ہے مرد اکثر سادہ ہوتے ہیں ہاں جن مردوں پر زنا نہ بین غالب ہو یہاں انکا ذکر نہیں۔

تعلیم یافتہ عورتوں کا حال

ہیں۔ ایک شخص کہتے تھے کہ اگر ان میں کسی عورت کو کچھ بیان کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو وہ چند جملے کہہ کر بیٹھ جاتی ہیں، مردوں کی طرح اس کی گفتگو میں کبھی وسعت نہیں ہوتی۔ تو یورپ کی عورتیں بھی قیامت علی میں مردوں کے برابر ہر گز نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ دستکاری میں یا کسی خاص سیلفے میں برابر یا زیادہ ہوں۔

غرض جس کو قدرت نے محکوم بنایا ہو اس کو مساوی کون کر سکتا ہے۔ اور یہ حکومت عورتوں کے لئے خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے اور یہ اس لئے کیا گیا تاکہ عورتیں اس تقریر کو سن کر دل گیر نہ ہوں نعمت اس لئے ہے کہ اگر دنیا میں سب برابر درجے کے ہوتے تو انتظام قائم نہ رہ سکتا تو یہ ضروری بات تھی کہ ایک گھٹا ہوا ہو اور دوسرا بڑھا ہوا ہو۔ اگر سارے حاکم ہی ہوتے تو کاشٹکاری کون کرتا عمارت کون بناتا، آٹا کون پیستا۔

انتظام کا تقاضا

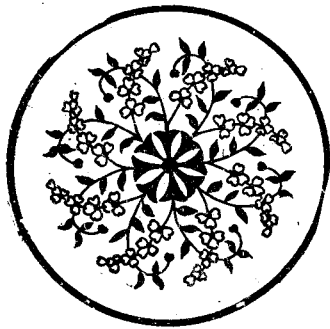
غرض دنیا کا انتظام اس کو چاہتا ہے کہ سب ایک درجے کے نہ ہوں بلکہ ایک بادشاہ ہو، ایک وزیر، کوئی حاکم، کوئی رعیت، کوئی تاجر، کوئی مزدور، یہ فرق مراتب ضروری تھا ہاں اس فرق مراتب کی یہ بھی ایک صورت تھی کہ عورتیں پڑھی ہوئی ہوتیں وہ گھٹے ہوتے۔ مگر چونکہ ان کی عقل و رائے ضعیف ہے اسلئے تمدن خراب ہو جاتا وہ خود اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکتیں دوسروں پر حاکم بن کر ان کی نگہبانی تو کیا کریں، بیوقوف کیلئے

مگر یہاں پر بعض شبہ کیا کرتے ہیں کہ جب کسی غیر مسلم کی ناجی نہ ہونے کی وجہ سے کہ وہ ناجی نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ گورنمنٹ پر بھی اعتراض کیا ہوتا کہ کیا وجہ ہے کہ جب ایک باغی مہذب ہے بقیہ جرائم قانونی سے بھی محفوظ ہے پھر کیوں اس کو سزا ہوئی ہے اس کے سزا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ باغی ہے تو اس کے سارے کمالات بیچ در بیچ ہیں پس اسلامی قانون بھی ایسا ہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جتنے شبہ اسلام پر ہیں اپنے معاملات میں غور کریں تو سب کا جواب نکل آئے گا۔ مگر غور کون کرے۔ دین تو آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔

افسوس کیسی آفت ہے کیسا طوفان ہے تیزی برپا ہے اور پھر اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ (الوقت ص ۱۲۹)

تتمتہ بالحدیث



مکتبہ المکتبہ الفی دیوبند

ضلع سہارنپور دیوبند

متبوع بننے کے عورتوں کے بالکل تاج ہو گئے اور غضب یہ ہے کہ عذر کے موقع میں کہا جاتا ہے کہ صاحب کیا کریں عورتیں نہیں اتنی سو یہ کہنا کتنی کم ہمتی کی بات ہے اگرچہ یہ بھی ایک بہانہ ہے جس بات کو ان کا خود جی چاہتا ہے اس میں عورتوں کے کہنے سے مجبور ہو جاتے ہیں ورنہ جس بات کو ان کا جی نہ چاہے مثلاً بعض لوگ اپنی عورتوں کو باپ کے گھر نہیں جانے دیتے اس میں عورتیں لاکھ تقاضہ کریں کبھی نہیں مانتے پسراں تو یہ عذر بالکل غلط ہے اور اگر سچ ہے تو اور بھی برا ہے کہ مرد ہو کر بیوی کے غلام بن گئے۔

غرض عورت کیلئے یہی مصلحت ہے کہ مرد کے تابع ہو کر رہے اور شریعت نے بھی عورتوں کو محکوم ہی بنایا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ الرَّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ یعنی مردوں کو عورتوں کا نگران بنایا گیا ہے۔ (شعب الایمان ص ۱۸)

(۳۲) اس شبہ کا جواب کہ غیر مسلم اگر مہذب ہو تو ناجی کیوں نہیں

ایک شخص ہے کہ وہ گورنمنٹ کے شاہانہ اقتدار کو مانتا ہے، مگر ہمیشہ قانون کے خلاف عمل کرتا ہے چوری بھی کرتا ہے جو ابھی کھیلتا ہے اور بد تہذیب بھی ہے تو ایسے شخص کے قلب میں چونکہ گورنمنٹ کا اقتدار ہے اس لئے اسے بغاوت کی سزا نہ ہوگی اور ہمیشہ کے لئے مردود نظر نہ ہوگا بلکہ صرف اختتام سزائے معین تک، اور اسکے بعد پھر وہ گورنمنٹ کی محبوب رعایا میں داخل ہو جائیگا۔ برخلاف اس شخص کے جو کہ نہایت مہذب و متین ہو اور افعال قبیح خلاف قانون سے بھی بچتا ہو مگر گورنمنٹ کے اقتدار شاہانہ کو تسلیم نہیں کرتا ہو تو اس کو بغاوت کی یہ سزا ہوگی کہ عبور دریائے شور کر دیا جائے گا یا پھانسی دے دیا جائے گا اور ہمیشہ کیلئے معتبور رہے گا۔

اے صاحبو! سمجھ لیجئے کہ اسی طرح اسلامی قانون بھی ہے کہ جس کے عقائد اچھے نہیں وہ باغی ہے اگرچہ نماز روزہ کرے اور کیسا ہی شائستہ ہو ہمیشہ کے لئے مردود بارگاہ ایزدی ہوگا اگر توبہ نہ کرے برخلاف اس شخص کے کہ جو نماز روزہ کچھ نہیں کرتا اور ہر قسم کے معاصی میں مبتلا رہتا ہے مگر عقائد اچھے ہوں تو اس کو وہی میعاد سزا خلاف قانون عمل کرنے کی ہوگی اگر توبہ نہ کرے لیکن باغیوں میں شمار نہ ہوگا۔ اور اختتام سزائے بعد پھر وہی حق تعالیٰ کی محبوب رعایا یعنی جنتیوں میں داخل ہو جائے گا۔

فہرست مضامین حصہ چہارم

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۸۸	دارون کے اس کہنے کی تردید کہ اصل انسان بند رہے۔	۲۰۳	بیدار ہو جانا
۳۸۸	یہ مشاہدہ نہیں ہے	۲۰۳	قرآن بعد حفظ ہوتا ہے
۳۸۸	زمین کی حرکت کا مسئلہ	۲۰۲	تلاوت قرآن کی برکت
۳۸۹	آفتاب کا طلوع و غروب ہونا	۲۰۵	عارفین کا حال
۳۹۰	آدمی علم دین پڑھ کر کم عقل نہیں ہوتا	۲۰۵	قوت و اعضا و انسانی کا اقرار
۳۹۰	قرآن پڑھنے سے فائدہ ہے اگرچہ معنی نہ سمجھتا ہو۔	۲۰۶	ایک واقعہ
۳۹۱	ایک شبہ کا جواب	۲۰۶	بے معنی سمجھے قرآن کا فائدہ
۳۹۲	عام مسلمان بہتر ہیں	۲۰۷	ایک دوسرا عالم بھی ہے
۳۹۳	قرآن کا سمجھنا	۲۰۸	تلاوت قرآن پر توجہ
۳۹۴	قرآن کا معجزہ	۲۰۸	اللہ تعالیٰ کی محبت
۳۹۸	قرآن کی یاد کرنے کو بیکار رکھنے والے	۲۰۹	ایک واقعہ
۳۹۹	اللہ کا نور مٹ نہیں سکتا	۲۱۰	قرآن میں معجزہ
۴۰۰	قرآن کی حفاظت	۲۱۱	حضرت موسیٰ کا واقعہ
۴۰۰	اسباب محبت	۴۱۲	کلام اللہ پڑھنا
۴۰۰	الفاظ قرآن کی حفاظت کا اہتمام	۴۱۳	الفاظ بھی مقصود ہیں
۴۰۱	قرآن کی رسم خط کی حفاظت	۴۱۳	دریا کی سیر
۴۰۲	خلیفۃ اللہ کا خطاب	۴۱۳	الفاظ قرآن
۴۰۳	ارشاد خداوندی	۴۱۵	سیر کیساتھ صورت پر نظر
		۴۱۶	صورت کی اہمیت
		۴۱۶	حروف مقطعات کی نکات

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۳۳	ایک مثال	۲۱۷	قرآن سے معنی کیساتھ الفاظ بھی مقصود ہیں
۲۳۴	انبیاء کرام پر مصائب	۲۱۸	فرشتوں سے سوال کہ میرے بندے کیا کر رہے ہیں۔
۲۳۶	طاغوتوں سے بھاگنے والا	۲۱۹	روح محفوظ کی وسعت پر شبہ کا جواب
۲۳۷	خوشی بوقت موت	۲۱۹	مر جانے کے بعد عذاب قبر روح پر ہوتا ہے یا جسم پر۔
۲۳۷	بعد موت کا حال	۲۱۹	بارہ بروج کا ثبوت قرآن مجید سے دینا صحیح نہیں۔
۲۳۸	بد دینی کا اثر	۲۲۰	آیات کی تفسیر قواعد ہیئت پر ہے۔
۲۳۹	مالدار کی کا مشاہدہ	۲۲۱	قرآن وحدیث کا جو مطلب علماء بیان کرتے ہیں وہی درست ہے
۲۴۰	صورت وحقیقت	۲۲۲	مجتہدین کی شان
۲۴۰	مصیبت کی قسمیں	۲۲۳	علماء کی بیروی
۲۴۱	بچے کے ختنہ کی مثال	۲۲۵	طاغوتوں میں اعمال کی خرابی
۲۴۱	حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہی۔	۲۲۶	ایک حکایت
۲۴۲	احکام شرعیہ کی حکمت	۲۲۸	مصیبت اگر گناہ ہونے کی وجہ آتی ہے تو کفار پر آنی چاہیے
۲۴۴	ترقی مطلوبہ کی شریعت نے تعلیم نہیں فرمائی	۲۲۹	انبیاء پر مصائب
۲۴۷	محدثین پر اعتراض کا جواب	۲۳۰	درجات کی بلندی
۲۴۷	محتاج اصلاح دوسروں کی اصلاح	۲۳۱	خوشحالی و بد حالی
۲۴۸	کیا کریں گے۔	۲۳۱	ایک واقعہ
۲۴۹	آج کل کے جلسے	۲۳۲	عقل کا تبادلہ دولت سے
۲۴۹	علماء کا استیصال اسلام کا استیصال ہے	۲۳۲	امام غزالی کا قول
۲۵۰	حجرہ نشینوں کا جواب	۲۳۲	مصیبت کیوں آتی ہے
۲۵۱	لیڈران قوم کے طریقے شریعت کی نظر میں	۲۳۳	
۲۵۳	غیر قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے		
۲۵۴	مسلمانوں کی حالت		
۲۵۵	جلسے کے آداب		

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۵۱۶	عربی گھوڑے	۲۹۵	ہوا ہے -	۲۵۶	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور	۲۵۷	کفار کا قول
۵۱۶	اہل عرب کا حال	۲۹۵	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غنائے قلب کا حال -	۲۵۸	نظافت کا قول	۲۵۹	ہندو مسلم اتحاد کی خرابی
۵۱۷	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج	۲۹۷	جنت میں شہداء کی ارواح کا سبب	۲۵۹	غیروں کی تعریف	۲۶۱	قومیت کی حفاظت
۵۱۷	فرمانے کی حکمت -	۲۹۷	پرندوں میں ہونا -	۲۶۲	غیر مسلموں کی حمایت	۲۶۲	قتال کی اجازت
۵۱۸	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ	۲۹۷	اہل دنیا کے آخرت کا نفع دینا کے نفع سے بڑھا ہوا ہے -	۲۶۲	اخلاق کا رسوخ	۲۶۳	انصار مدینہ
۵۱۹	حضرت گنگوہیؒ کا دبدبہ	۲۹۹	دنیا کی وجہ سے آخرت چھوڑنا	۲۶۳	قانون میں حکمت	۲۶۴	واقعہ ہجرت سے امتحان
۵۲۰	اس شبہ کا جواب کہ تقدیر کس طرح بدل سکتی ہے -	۲۹۹	آخرت کا نفع یقینی ہے	۲۶۴	ایک مثال	۲۶۵	مسائل سے اجتناب
۵۲۱	فلسفہ اور تعلیم انبیاء علیہم السلام میں فرق -	۵۰۰	حسن یوسف علیہ السلام و جمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق	۲۶۵	غیر ملکی ایک حکایت	۲۶۵	ایک فتویٰ
۵۲۲	علم معقول	۵۰۲	علماء کرام میں غیر خدا سے طبعی خوف کی وجہ -	۲۶۶	شریعت کا اتباع	۲۶۶	اسلام میں تنازع
۵۲۳	تعلیم انبیاء	۵۰۳	جٹلینوں کا انگریزی کو علم میں شمار کرنا غلطی ہے -	۲۶۶	اتباع شریعت	۲۶۷	تبلیغ دین کی ممانعت
۵۲۳	نو تعلیم یافتہ کو ظاہری اصلاح کے ساتھ باطن کی صفائی بھی ضروری ہے -	۵۰۴	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا سے طلب کرنا محبت الہی کا نتیجہ ہے -	۲۶۷	آفتاب کی مثال	۲۶۸	مقصود بالذات رضا و حق ہے نہ کہ سلطنت -
۵۲۴	دین کے اجزاء	۵۰۴	انبیاء علیہم السلام پر نزع کی کیفیت کیوں ہوتی ہے -	۲۶۸	اتباع شریعت کا فائدہ	۲۶۹	علماء لیڈروں کے ساتھ
۵۲۵	باطن کی اصلاح	۵۰۷	تفاضل تفصیلی بین الانبیاء منوع ہے	۲۶۹	عذاب قبر پر اعتراض کا جواب	۲۷۰	رضا و حق
۵۲۶	تاویل کی خرابی	۵۱۰	حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اعتراض	۲۷۱	اسلام درحقیقت اللہ کا راستہ ہے	۲۷۱	تشبہ بالکفار مذہبی کاموں میں حرام ہے -
۵۲۸	باطنی بیماری کا علاج	۵۱۲	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال بیان کرنے میں اعتدال -	۲۷۲	حق تعالیٰ کی امداد	۲۷۲	مشتبہ صورت
۵۲۹	ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح ضروری ہے -	۵۱۳	بعض عامی کی مغفرت بدون عذاب بھی ہوگی -	۲۷۳	بعض عامی کی مغفرت بدون عذاب بھی ہوگی -	۲۷۳	اسلام کی تعلیم
۵۳۰	دین سے بے رغبتی	۵۱۵	مرتبہ بغاوت میں کافر اصلی سے بڑھا	۲۷۴	مرتبہ بغاوت میں کافر اصلی سے بڑھا		
۵۳۱	دین کی اہمیت						
۵۳۲	امراء کا حال						

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۵۹۸	کفار سے اتحاد	۵۷۷	بے تکلفی	۵۵۴	مجنون کا حال	۵۳۴	ایک لطیفہ
۶۰۰	ترقی متعارف کا رد	۵۷۷	ایک واقعہ		روح کو موت نہیں آتی جسم غصری	۵۳۵	بے غیرتی کی انتہا
۶۰۰	آج کل کی ترقی کا حال	۵۷۸	علماء پر ایک اعتراض کا جواب	۵۵۶	کو آتی ہے -	۵۳۵	ایک صاحب کا حال
۶۰۱	توجہ الی اللہ کے معنی	۵۷۹	ایک بھٹیاری کا قصہ		حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت	۵۳۶	بعض لیڈروں کی حالت
۶۰۲	پردہ کا عقلی ثبوت		اس اعتراض کا جواب کہ شریعت	۵۵۸	آخرت میں کفار کیلئے -	۵۳۷	نماز پر اعتراض
	کیا وجہ ہے کہ اعمال آخرت میں	۵۷۹	قید محض ہے -	۵۵۹	کفار کے حق میں سفارش کی نوعیت	۵۳۸	ایک بڑھیا اور شاہی باز
۶۰۳	رغبت نہیں ہوتی -		حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج		مطیع اور غیر مطیع پر مصائب آنے	۵۴۰	ظاہر و باطن
	عالم مثال اور عذاب و ثواب قبر کا	۵۸۲	جسمانی پر شبہات کا جواب -	۵۶۱	میں فرق ہے -	۵۴۰	عمل کی ضرورت
۶۰۶	اثبات -	۵۸۲	معراج کا واقعہ	۵۶۳	قرآن کریم میں ہر پہلو کی رعایت ہے		طبیعت بے شعور کو فاعل ماننا سراسر
	اس اعتراض کا جواب کہ عالم آخرت		تبلیغ کیلئے چندہ جمع کرنے کا کام علماء	۵۶۳	قیامت کا حال	۵۴۱	حماقت ہے -
۶۱۱	محض خیال ہی ہے -	۵۸۶	کے سپرد نہیں کرنا چاہیئے -		قرآن پاک کی آیتوں میں باہم ربط ہے	۵۴۳	صرف عقل پر اعتماد کا انجام
۶۱۳	حقیقت پل صراط		نسب نامے نہ تو محض بے کار ہیں،	۵۶۶	اور مفسرین کا بیان درست ہے -	۵۴۴	خدا کے منکر
۶۱۵	عقل کے معنی اور تشریح	۵۸۷	اور نہ ہی مدارِ فخر ہیں -	۵۶۷	تفسیر بالرائے تحریف معنوی ہے	۵۴۵	سائنس دانوں کا حال
	حصہ چہارم ختم شد		نماز کی برکتیں اور اس کے نہ پڑھنے		قرآن کریم سے متعلق شبہات دور	۵۴۶	ایک صاحب علم کا قصہ
		۵۹۰	پر ترمیم -	۵۶۸	کرنیکا کا طریقہ -	۵۴۷	موحد کا حال
		۵۹۱	نماز میں مساوات	۵۷۰	وجودِ صنائع کی عقلی دلیل	۵۴۹	مولوی لوگوں کو کافر بتاتے ہیں
		۵۹۲	جماعت کی اہمیت	۵۷۱	ایک اعتراض کا جواب		عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں ہے جتنی
		۵۹۳	اتحاد و اتفاق میں حدود کی رعایت	۵۷۱	عہدِ میثاق پر شبہ کا جواب	۵۵۰	شریعت خیر خواہ ہے -
		۵۹۴	اصلاح کا طریقہ		مال تدبیر سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ	۵۵۱	کفار کا مال دالینا حلال نہیں ہے
		۵۹۵	اتحاد کیلئے حدود	۵۷۳	تقدیر سے حاصل ہوتا ہے -		تقدیر پر اعتقاد رکھنے سے دنیا میں
		۵۹۶	اصلاح کا حاصل	۵۷۴	سائنس کی ایجاد		راحت رہتی ہے اور انکار سے
		۵۹۷	دین پر ڈاکہ	۵۷۵	اسلام نے سادگی سکھائی ہے	۵۵۳	پریشانی بڑھتی ہے -
		۵۹۵	اتحاد غلط طور پر	۵۷۶	مولانا گنج مراد آبادی	۵۵۴	ایک بزرگ کی حکایت

ڈارون کے اس کہنے کی تردید کہ اصل انسان بندر ہے

کتنے افسوس کی بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو فرمائیں کہ انسان کی اصل انسان ہے اور ڈارون جو ایک ملحد ہے وہ کہے کہ سب سے پہلے ایک مادہ مطلقہ موجود تھا اور پھر متحرک سے اس میں حرارت پیدا ہوئی، اور شمس وغیرہ بنا اور اس کے بعد پھر نباتات بنے پھر حیوانات بنے، ان میں بندر بنا اور بندر کا ایک جست کر کے انسان بن گیا۔ اسی طور پر وہ تمام حیوانات و نباتات میں اسی کا قائل ہے کہ ایک دوسرے سے نکلتے چلے آئے ہیں۔ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر شبہ کیا جاتا ہے اور ڈارون کے کہنے پر یقین کر لیا جاتا ہے۔ یہی ایمان ہے۔ ڈارون تو صانع کا قائل نہیں تھا اس لئے ایسی بعید اور یہودہ تاویلیں کرتا تھا۔ مگر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ صانع کو مانتے ہیں اور پھر ایسی مہمل تاویلوں سے قرآن پر شبہ کرتے ہیں۔ شاید کوئی یہاں یہ کہے کہ ہم کو تحقیقات جدیدہ سے قرآن پر شبہ اس سے ہوتا ہے کہ حکماء کا مشاہدہ ہے اور اسی بنا پر ہم کو قرآن پر شبہ ہے کہ مشاہدہ کے خلاف کیوں ہے۔ یہ پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات ہے۔

یہ مشاہدہ نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ آپ تو مشاہدہ کی حقیقت کو ہی نہیں جانتے، میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ ماہ خود بخود متحرک ہو کر اس سے ایک صورت پیدا ہو گئی۔ پھر شمس و کوکب ہوئے۔ نباتات ہو گئی، اور نباتات سے حیوانات، اور حیوانات میں ایک خاص نوع بند بھی تھی، پھر بندر کا ایک جست کر کے انسان ہو گیا۔ یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ خود ان مقرین بالقرویۃ کو بھی بندر نہ بننے دیں آدمی ہی بنائیں۔ یہی مشاہدات ان ہی ڈھکوسلوں اور مہمل اور وہمی باتوں کو مشاہدات قرار دے کر خدا اور رسول پر شبہات اور رائے کو مسلمان کہتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کیا یہ مشاہدات ہے کہ آفتاب کو سکون ہے زمین کو حرکت ہے۔ خیر ہمیں اس سے

بحث نہیں کہ کس سکون ہے اور کس کو حرکت، کیونکہ یہ قرآن کے مخالف نہیں۔ مگر سوچ لو کہ اتنا بڑا دعویٰ کس بنا پر ہے دلیل کچھ بھی نہیں۔ مگر ہم کہیں گے کہ الشمس یجری چونکہ قرآن میں وارد ہوا ہے۔ اسلئے آفتاب کو ساکن محض ماننے سے گنہ گار ہوں گے زمین کو چاہے آپ ساکن نہ مانے متحرک محض مانے مگر آفتاب کو بھی متحرک ماننا بڑے گناہ۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ وَجَعَلْنَاهُ الْاَرْضَ زَمِينًا كَمَا سَوَّيْنَا لَكَ اَرْضًا سے تو زمین کا سکون ثابت ہوتا ہے پھر یہ کہتے ہو کہ حرکت ارض کا ماننا قرآن کے خلاف نہیں۔ جواب یہ ہے کہ اس سے نفی حرکت اضطراریہ مراد ہے۔ غیر اضطراریہ کی نفی مراد نہیں۔ غرض اس کی آپ کو اجازت ہے کہ زمین کو اگر جی چاہے متحرک مانیں، کچھ حرج نہیں۔ اسی طرح اس کی خبر دی گئی ہے کہ آسمان موجود ہے۔ یہ کون سے مشاہدہ کے خلاف ہے گویا اس نظام طلوع و غروب کے لئے سموات کی ضرورت نہ ہو۔ لیکن نظام خاص میں ضرورت نہ ہونا نفی کی تو دلیل نہیں ہو سکتی۔ آسمان دوسری مستقل دلیل سے ثابت ہے اس کی نفی کرنا جائز نہیں۔ کیس مشاہدہ سے ثابت ہے کہ آسمان نہیں ہے بلکہ ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے اس نیلگوں صورت کو حد نظر مان کر آسمان کی نفی کا ہمیں جواب سکھا دیا کیونکہ قرآن مجید میں کہیں یہ نہیں آیا کہ یہ نیلا نیلا جو نظر آتا ہے یہی آسمان ہے پس اگر آپ کہیں گے کہ اگر آسمان کوئی چیز ہے تو نظر کیوں نہیں آتا ہم یہ کہیں گے کہ نظر اس لئے نہیں آتا کہ آپ نے اسی سقف نیلی کو حد نظر مان لیا ہے۔ پس جب یہ حد نظر ہے تو آسمان اس کے آگے ہے اور چونکہ نظر کی یہاں تک انتہا ہو جاتی ہے اسلئے آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ اب آپ کو آسمان کے نفی کرنے کی بالکل گنجائش نہیں رہی کہ ہم حکماء کے قول پر قرآن کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ مشاہدہ کی بنا پر۔

جس کی مثال میں یہ پیش کیا کرتے ہیں کہ مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے کہ غروب کے وقت آفتاب زمین کے اندر نہیں جاتا۔ اور قرآن مجید میں سکندرا و قنین

آفتاب کا طلوع و غروب ہونا

جس کی مثال میں یہ پیش کیا کرتے ہیں کہ مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے کہ غروب کے وقت آفتاب زمین کے اندر نہیں جاتا۔ اور قرآن مجید میں سکندرا و قنین

کے قصہ میں مذکور ہے کہ آفتاب کو کچھ اور دلدل میں غروب ہوتے پایا۔ بھلا دیکھو کتنا مشاہدہ کے خلاف ہے۔ آفتاب ایک جرم عظیم ہے زمین سے کتنا ہی حصہ بڑا ہے کہیں زمین کی دلدل اور کچھ میں غروب ہو سکتا ہے لیکن اگر عقل ہوگی تو اس میں جواب نظر آئے گا، یعنی قرآن مجید میں وَجَدَ بَاۤلِغًا وَّارِدًا ہوا ہے۔ یعنی اس کو بادی النظر میں ایسا پایا یعنی اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ میں دھنس رہا ہے یہ نہیں فرمایا، غَرْبَتْ فِي حِمَاۃٍ جہاز پر سوار ہو کر دیکھتے تو معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب سمندر میں سے نکلتا ہے اور اسی میں ڈوب رہا ہے اسی طور پر ہم روزانہ مشاہدہ کرتے ہیں آفتاب کے طلوع و غروب کا یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین ہی سے نکلا زمین ہی میں گھس گیا۔ پھر مشاہدہ کے خلاف کیا ہوا۔ اب فرمائیے مشاہدے سے کہاں تعرض ہے۔ کہیں بھی نہیں۔ پھر افسوس ہے کہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور قرآن اگر فیثا غورث کے قول کے مخالف ہو تو قرآن پر خلاف مشاہدہ کا شبہ کرتے ہیں۔ فیثا غورث کے قول پر خلاف واقعہ ہونے کا شبہ نہیں ہوتا۔ اسلام کی عظمت قلوب سے جاتی رہی۔ غرض یہ ہے کہ نئے مذاق میں یہ خرابی پیدا ہو گئی ہے کہ سائنس والے جو کہہ دیں اس پر تو آمنا و صدقنا اور قرآن پر شبہات۔ (الوقت ص ۱۲)

(۲) آدمی علم دین پڑھ کر کم عقل نہیں ہوتا ہے

فرمایا میں اکثر وعظ میں بیان کیا کرتا ہوں کہ فی زمانہ جو اہل علم کم عقل مشہور ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر علم دین پڑھانے میں یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ عربی پڑھ کر آدمی بیوقوف ہو جاتا ہے۔ یہ عذر کر نیوالے ذرا غور تو کریں کہ یہ بیوقوفی انہیں کی مہول تجویز کا ثمرہ ہے۔ کسی چیز کے پڑھنے سے عقل نہیں بڑھا کرتی ہے۔ ہاں علم بڑھتا ہے عقل ایک فطری شے ہے۔ اب اہل علم کے بیوقوف ہونے کی وجہ ذرا ملاحظہ فرمائیے عادت یوں ہو گئی ہے کہ سب اولاد میں جو بیوقوف گنجا اندھا لنگا یعنی جس میں سب عیب ہوں اور جو کسی طرح انگریزی میں کام نہ دے سکے جس کو انگریزی والے درجہ میں بھی نہ گھسنے دیں اس کے واسطے عربی تجویز کی جاتی ہے۔

کہ اس کو ملنا بنائیں گے اب وہ احمق نہ ہوگا تو ادھر کیا ہوگا۔ اور جو اولاد تیز ذہن ذکی ہے، وہ انگریزی کے واسطے چھانٹی جاتی ہے۔ آپ ہی تو احمقوں اور بیوقوفوں کے لئے عربی تجویز کرتے ہیں اور آپ ہی کہتے ہیں کہ عربی پڑھ کر بیوقوف ہو گیا یہ بیوقوفی انہیں نامعلوم تجویزوں کا ثمرہ ہے اور اگر ایسا شخص مقتداے دین ہو گیا تو طرح طرح کی خرابیوں کا اندیشہ اس سے ہے۔ اور اگر کہیں ایسا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے کسی نے اپنے تیز ذہن لڑکے کے واسطے ہی عربی تجویز کی اور پھر بھی اس سے کوئی فساد ظاہر ہوا تو اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اول درجہ کے طماع ہیں تو وہ بھی بیوقوفی میں داخل ہے کیونکہ طمع بھی تو حماقت ہے بلکہ طمع رأس الحماقت ہے۔ پس عربی پڑھنے کے واسطے دو چیزیں اگر ہوں تو اس کا مزہ معلوم ہو۔ اول ذہن و کاوت، عقل کی تیزی۔ دوم چشیرمی، استغناء پھر دیکھو اہل علم کیسے عقل مند ہوتے ہیں۔ انہیں بیوقوف کہنا اپنی حماقت کا اظہار ہے۔

(مقالات حکمت حصہ ہشتم، دعوات عبدیت لفظ نمبر ۷)

(۳) قرآن پڑھنے سے فائدہ ہے اگر چہ عربی نہ سمجھتا ہو

بات یہ ہے کہ قرآن کے پڑھنے میں جو فائدہ ہے اس سے یہ لوگ واقف نہیں اگر فائدے سے واقف ہو جاتے تو اسکے لئے کوشش کرتے جیسا کہ تجارت کر نیوالے ایک مقام سے دوسرے مقام پر جا کر مال تجارت لاتے ہیں، اور اس میں بڑی بڑی مشقتیں برداشت کرتے ہیں، کیونکہ اس کے نفع سے واقف ہیں کہ ایک روپیے کے دو ہو جائیں گے۔ دنیا کے کاموں میں تو لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جب کسی تجربہ کار سے معلوم کر لیا کہ فلاں چیز کی تجارت میں بہت نفع ہے تو اس کے قول پر اعتماد کر کے وہ تجارت شروع کر دیتے ہیں اور اگر ایک دو بار نقصان بھی ہو جائے تو ہمت نہیں ہارتے۔ بلکہ وہی کام کرتے ہیں۔ چنانچہ آم والوں کو بعض دفعہ خسارہ بھی ہوتا ہے مگر خسارہ والا پھر بھی کام کرتا ہے اور اگر خسارہ نہ بھی ہو بلکہ برا بر معاملہ رہتا ہو کہ نہ نفع ہے نہ نقصان، جب تو اس تجارت کو

چھوڑ کر ہی نہیں سکتے اور یوں کہتے ہیں کہ تجارت میں یہ بھی ایک قسم کی کامیابی ہے کہ نقصان نہ ہو۔ دوسرے اب نفع نہیں ہوا تو آئندہ امید ہے۔ بلکہ خسارہ ہوتا ہے۔ ایک امید نفع کو نفع سمجھا جاتا ہے۔ مگر افسوس دین میں معلوم نہیں یہ اصول کہاں گئے۔ صاحبو! کیا حیرت نہیں کہ دنیا کے کاروبار میں تو نقصان ہونے کو بھی کامیابی سمجھا جاتا ہے اور دین کے کام میں نفع کی تاخیر کو بھی کامیابی نہیں سمجھا جاتا۔ زراعت تجارت، ملازمت سب میں کبھی نفع ہوتا ہے کبھی نہیں۔ اور بعض دفعہ نقصان بھی ہو جاتا ہے مگر ان کو کیونکر چھوڑ دیں وہاں تو تجربہ کاروں کا قول ہے کہ ان کاموں میں فائدہ ہے گو ہمیشہ اکثر ہی ہو، اور گو عاجل نہ ہو مگر آخر ہی ہو۔ مگر افسوس کیا خدا اور رسول کا قول ان تجربہ کاروں کے قول سے بھی کم ہو گیا جو صاف صاف قرآن کے منافع بیان کر چکے ہیں پھر وہ بھی ہر حالت میں خواہ سمجھ کر پڑھو یا بدو سمجھے پڑھو۔

اور میں دانشور کہتا ہوں کہ جو لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ ہم سمجھتے نہیں تو قرآن کے پڑھنے سے کیا فائدہ، یہ محض حفظ نفس کے بندے ہیں۔ ان کو عقل سے ذرا مس نہیں گو دعویٰ بہت کرتے ہیں اگر یہ عقل کے بندے ہوتے تو ایسی بے عقلی کی بات نہ کہتے کیونکہ عقلی قواعد میں یہ نہیں ہوتا کہ ایک دلیل سے ضدی اور عین شئی دونوں پر استدلال ہو سکے۔ اگر شبہ عقلی ہوتا کہ جب معانی نہ سمجھے تو الفاظ سے کیا فائدہ، تو بتلائیے اس قاعدہ عقلیہ سے کیا ثابت ہوتا آیا کہ الفاظ کو چھوڑ دیا کہ محض الفاظ پر اکتفا نہ کرو بلکہ معانی بھی حاصل کرو۔ ظاہر ہے کہ اس کی الفاظ تھے چھوڑنے پر دلالت نہیں۔ کیونکہ جب معانی کی ضرورت اس قاعدہ میں مسلم ہے اور معانی الفاظ کے تابع ہیں۔ اور ضروری کاموں قوت علیہ ضروری ہوتا ہے تو اس سے تو خود علم الفاظ کی ضرورت پر دلالت ہو رہی ہے۔ اگر وہ کہیں کہ ہاں ہم الفاظ کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں مگر ان کو اس وقت حاصل کرنا چاہیے جب کہ معانی کی فہم بھی ساتھ ساتھ حاصل ہو سکے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ آپ کی یہ تاویل اس وقت چل سکتی تھی جب کہ ہم دیکھتے کہ تم اپنے بچوں کو بچپن میں تو قرآن نہ پڑھاتے کیونکہ اس وقت سمجھیں گے نہیں بلکہ بڑے ہو کر بڑھاپے کے وقت سمجھیں گے۔ مگر تمہاری حالت تو یہ ہے کہ تم نہ بچپن میں

پڑھاتے ہو نہ جوانی میں، تو معلوم ہوا کہ تم اس قاعدہ سے علی الاطلاق خود عدم ضرورت الفاظ پر بھی استدلال کرنا چاہتے ہو اور یہ وہی بات ہے کہ دلیل سے ضدی پر استدلال کیا گیا ہے حالانکہ وہ عین شئی کو بھی مثبت ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ قاعدہ عقلیہ نہیں ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس کا نشانہ محض نفس پرستی ہے ان لوگوں نے اس قضیہ کو عرض نفس کا ایک بہانہ بنا لیا ہے اور دل میں ان کے یہ ہے کہ نہ قرآن کے الفاظ کی ضرورت ہے نہ معانی کی، گویا ان سے معافی کی ضرورت ظاہر کرتے ہیں مگر ان کا عمل بتلاتا ہے کہ وہ کسی کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے ورنہ کسی وقت تو قرآن کو معافی ہی کے ساتھ حاصل کرتے، اور اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دلاتے۔ جب عمل یہ ہے تو اب زبان سے معافی کی اہمیت ظاہر کرنا مخلوق کو دھوکہ دینا ہے۔ مگر خدا کو کس طرح دھوکہ دے لو گے جو علیم بذات الصدور ہے، وہ تو تمہارے دل کی حالت خوب جانتا ہے کہ تم خود قرآن کی تعلیم ہی کو مطلقاً بے فائدہ سمجھتے ہو خواہ محض الفاظ ہوں یا معانی کے ساتھ ہوں۔

خلق را گیرم کہ بقدری تمام
د ر غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کار ہا با خلق آری جملہ راست
با خدا تزویر و حیلہ کے رواست
کار ہا اور راست باید داشتن
رایت اخلاص و صدق افزاشتن
خدا کے ساتھ دھوکہ نہیں چل سکتا، عارف شیرازی فرماتے ہیں کہ
ترسم کہ صرف نہ بردور باز خواست
نان حلال شیخ زاک حرام ما
یعنی مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارا آب حرام شیخ کے ناں حلال سے قیامت میں
بڑھ نہ جائے، کیونکہ وہ مخلوق دھوکہ دینے کے لئے تقویٰ اور بزرگی کی صورت بنانا
ہے اور ہم اپنے کو قصور وار سمجھ کر گناہ میں مبتلا ہیں اور خدا کے یہاں دھوکہ چل نہیں
سکتا۔ اس لئے اندیشہ ہے کہ کہیں ریاکار مشائخ کا تقویٰ ہماری زندگی سے گھٹ
نہ جائے۔

اسی طرح میں کہتا ہوں کہ فاسق مسلمان جو اپنے کو
عام مسلمان بہتر ہیں گنہگار سمجھتا ہے ان مہذب لوگوں سے اچھے پڑے
ریں گے جو عقائد اسلام میں شبہات نکالتے ہیں اور عقل سے شریعت کا

مقابلہ کرتے ہیں چونکہ یہ لوگ ظاہر میں مسلمان ہیں اس لئے زبان سے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن پڑھنے کو مطلقاً ہمارا جی نہیں چاہتا ورنہ کفر کا فتویٰ لگ جائے گا اس لئے یہ قاعدہ غرض نفس کے موافق گھڑ لیا کہ جب معانی نہیں سمجھتے تو الفاظ سے کیا نفع اس کا جواب بس یہی ہے کہ بہت اچھا آپ اپنے بچوں کو معانی ہی کے ساتھ قرآن پڑھائیے اور ان کو ابتدا ہی سے عربی کی تعلیم صرف و نحو کی تعلیم دیجئے مگر اس سے تو اور بھی خون خشک ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ تو الفاظ کو طال کر معانی سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے یہ ایسی الٹی پڑ گئی کہ صرف و نحو بھی گلے پڑ گئی مگر جو شخص الفاظ کو بدون معنی کے لئے فائدہ کہے، اور صرف معانی ہی کی ضرورت کا قائل ہو اس کو یقیناً ضروری کی تحصیل پر مجبور کیا جائے گا۔ صاحبو! ظاہر میں یہ قضیہ کہ بدون سمجھے الفاظ سے کیا فائدہ پر مغز معلوم ہوتا ہے۔ مگر دراصل ان لوگوں نے مغز اسلام نکال دیا ہے ان میں سے بعض نے تحصیل معانی کی بھی کوشش کی مگر وہ اس کا مصداق تھی ۛ

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی انہوں نے معانی حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ترجمہ قرآن کا مطالعہ کر لیا، مگر یہ ایسا ہے کہ جسے کوئی خوان نعمت سے گلے لگے پچانا سیکھے کیونکہ اس میں سب کھانوں کی ترکیب لکھ دی ہے مگر اس سے آگاہوں دھنے کا طریقہ اور پانی کھانے کی ترکیب اور آبیج کا انداز کیسے معلوم ہوگا۔ نیز اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک صاحب نے ضاد کے بارہ میں مجھ سے تحریراً سوال کیا تھا کہ ضاد کا خرچ کہاں سے ہے اور اس میں اور ظار میں فرق کیونکر ہوتا ہے میں نے لکھ دیا کہ یہ بات خط سے نہیں معلوم ہو سکتی۔ کیونکہ ۛ

گر مصور صورت آں داستاں خواہد کشید

لیک جیرا تم کہ نازش را چیاں خواہد کشید

اس کو کسی ماہر تجوید سے زبانی سن کر سمجھ سکتے ہو تو حضرت بعض باتیں ایسی ہیں جو مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتیں بلکہ ان کے لئے استاد کی ضرورت ہے کیونکہ بعض باتیں سینہ بسینہ ہوتی ہیں اور اس میں کچھ تصوف اور سلوک ہی

کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر علم میں ایک بات ایسی ہوتی ہے جو سینہ بسینہ ہے کہ صرف استاد سے حاصل ہوتی ہے، ۛ

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست

بسیار شیوہ ہاست تباں را کہ نام نیست

پھر قرآن ہی اتنا سستا کیوں ہو گیا کہ اس کا مطلب بدون استاد کے سمجھ میں آجائے گا۔ آج کل تفریبات

ہند کا ترجمہ اردو میں ہو گیا ہے ذرا کوئی اس ترجمہ کو دیکھ کر مطلب صحیح تو بیان کر دے

یقیناً بہت جگہ غلطی کرے گا۔ اسی طرح کیمیا کی کتابیں اردو میں ہو گئی ہیں کوئی ان کو دیکھ

کر کیمیا تو بن لے، کبھی نہیں بنا سکتا۔ پس معانی قرآن کے حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ

ترجمہ دیکھ لیا جائے۔ ترجمہ قرآن اگر دیکھو تو صرف و نحو اور قدرے فقہ کے بعد دیکھو اگر

یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اردو ترجمہ کسی عالم سے تو سبقاً سبقاً پڑھلو۔ سو ایک جماعت تو یہ

تھی کہ جس کے عقائد تعلیم جدید کی دہر سے خراب ہو گئے ہیں اور ایک جماعت عوام کی

ہے۔ ان کا عقیدہ یہ تو نہیں کہ بدون معانی کے قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ مگر اس کا اثر

لئے ہوئے ہے کہ قرآن کے پڑھنے میں کوشش نہیں کرتے۔ سو یہ لوگ دوسرے

رنگ میں اس غلطی میں مبتلا ہیں اس لئے اس وقت میں اس غلطی کو رفع کرنا چاہتا ہوں

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اول ”الکر“ فرمایا ہے یہ تو حروف مقطعات ہیں، جن کے

معنی ہم کو معلوم نہیں گو بقول محققین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھے۔ لیکن امت

نہیں بتلائے گئے مگر میں ان سے بھی اپنے مقصود میں کام لوں گا۔ سامعین کو تعجب

ہو گا کہ جب معنی ہی معلوم نہیں تو اس سے مضمون کو کس طرح ثابت کیا جائے گا لیکن

یہ عجیب میری تقریر کے بعد مرتفع ہو جائے گا۔ ابھی میں آیت کا ترجمہ بیان کر دوں اس

کے بعد ان حروف سے ثابت کر دوں گا تو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ

وَقُرْآنُ الْهُدَىٰ، یہ آیات کتاب اور قرآن میں ہیں۔ یہی ترجمہ دوسری آیات کا ہے صرف

کتاب قرآن کا تقدیم و تاخیر میں فرق ہے تو اس جگہ آیات کے دو لقب بیان کئے گئے ہیں، ایک قرآن دوسرا کتاب قرآن کے

معنی میں مایقلاً یعنی پڑھنے کی چیز، اور کتاب کے معنی ہیں مایکتب یعنی لکھنے کی چیز اور مظاہر ہے کہ پڑھنے اور لکھنے کی چیز کیا ہے؟ الفاظ ہی تو ہیں۔ معانی کو کون پڑھ سکتا ہے

یا کون لکھ سکتا ہے۔ اور ایک مضمون ابھی ذہن میں آیا ہے جو شروع میں نہ آیا تھا۔ اب تک تو ذہن میں یہ بات تھی کہ الفاظ ہی پڑھنے لکھنے کی چیز ہیں، معانی کچھ پڑھ لکھ نہیں سکتے اس پر ایک لطیف یاد آیا کہ بخوبی نہ کہ اسے کہ ضرب میں ہو مستتر ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ظاہر میں ضمیر مذکور نہیں سمجھنے میں آتی ہے۔ مگر ایک طالب علم یہ سمجھے کہ ضرب کے اندر ضمیر ہو سچھی ہوتی بیٹھی ہے تو آپ نے ضرب کو چھیلنا شروع کیا یہاں تک کہ کاغذ پھٹ گیا اور اتفاق سے دوسرے ورق میں اس جگہ ہو لکھا ہوا تھا یہ بڑے خوش ہوئے کہ واقعی استاد نے ٹھیک کہا تھا کہ اس کے اندر ہو پوشیدہ ہے دیکھو چھیلنے سے نکل آیا پھر دوڑے استاد کے پاس آئے کہ دیکھئے میں نے ضرب کو چھیل لیا تھا یہ ہو نکل آیا جو اس میں چھپا ہوا تھا اور اس کا مطلب دوبارہ سمجھایا۔ غرض یہ طالب علم یوں سمجھا تھا کہ معانی بھی کتابت میں آسکتے ہیں مگر یہ اس کی غلطی ہے۔ معانی قرأت و کتابت میں نہیں آسکتے ان کا محل صرف ذہن ہے۔ لوگ بے تار کی خبر تعجب کرتے ہیں۔ مگر خدا نے تعالیٰ نے اس کو پہلے سے پیدا کر رکھا ہے کیونکہ الفاظ سے معانی کا سمجھنا بے تار کی ہی خبر ہے کیونکہ معانی کا مرکز قلب ہے اور جہاں الفاظ کسی کی زبان سے نکلے۔ معاد ہاں معانی سمجھے گئے غرض ان آیتوں میں اشارہ کیا بلکہ صراحت ہے کہ قرآن کے ساتھ پڑھنے کا تعلق رکھو کیونکہ لفظ قرآن کے معنی یہی ہیں اور ظاہر ہے کہ قرأت الفاظ ہی کی ہوتی ہے نہ کہ معانی کی۔ دوسری صفت اس جگہ کتاب ہے جس کے معنی لکھنے کی چیز ہے، اس سے معلوم ہوا کہ الفاظ قرآن کے ساتھ قرأت کے علاوہ ضبط و کتابت کا بھی تعلق رکھنا چاہیے سو اب تک تو صرف یہی بات ذہن میں تھی اور دوسری بات جو اسی وقت ذہن میں آئی وہ یہ ہے کہ کتابت کا مصداق حقیقتاً الفاظ ہیں نہ معانی کیونکہ الفاظ تو زبان سے ادا ہوتے ہیں ان کا محل زبان ہے لفظ کے معنی لغت میں پھینکنے کے ہیں چونکہ الفاظ زبان سے پھینکے جاتے ہیں یعنی نکلے جاتے ہیں اس لئے ان کو الفاظ کہا جاتا ہے۔ اور معانی کا محل صرف ذہن ہے وہ تو کتابت کا مصداق کسی طرح ہے ہی نہیں بلکہ اس کا مصداق دوسری چیز ہے یعنی نقوش جن کو عوام کرم کاٹے کہتے ہیں کیونکہ ان پڑھ آدمی لکھا ہوا پڑھ نہیں سکتا نہ سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے وہ ان کو کرم کاٹے کہتے ہیں مگر کتاب کا مصداق مطلق نقوش نہیں بلکہ

وضعی نقوش ہیں جیسا کہ الفاظ کی دلالت معانی پر وضعی ہے اس لئے پڑھے ہوئے آدمی ان کو سمجھتے ہیں ان پڑھ نہیں سمجھتے۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ کتاب کا حقیقی مصداق نقوش ہیں تو آپ تو الفاظ ہی کو غیر مقصود بتلاتے تھے اور قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ نقوش قرآن بھی قابل حفاظت و مستحق تعظیم ہیں یہ تو لٹی پٹی کہہ گئے تھے، ناز و خشوانے روز بھی گلے پڑ گئے۔ مگر صاحبو! یہ گلے نہیں پڑے کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی بادشاہ کسی شخص کو اشرفیاں اور جواہرات دے کر اس سے کہے کہ اس کو حفاظت سے رکھو، قفل اور تالا لگاؤ اگر اس شخص کو رو پیسے اور جواہرات کی قدر معلوم ہے تو اس حکم کی قدر کرے گا اور کہے گا کہ

جزاک اللہ کہ چشم باز کر دی

مرا با جان جاں ہمسرا ز کر دی

اور جس کو رو پیسے کی قدر نہ ہوگی وہ کہے گا کہ یہ اچھی بلا میرے سر پڑی کہ حفاظت کر دو قفل لگاؤ اسی طرح جو لوگ معانی کی قدر کرتے ہیں، وہ ان الفاظ و نقوش کی بھی قدر کریں گے کیونکہ یہ ان ہی کی حفاظت کا سامان ہے اور جو قدر نہیں کرتے وہ اس کو سر پڑی بلا سمجھیں گے پس معلوم ہوا کہ تو تعلیم یافتہ الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بے فائدہ سمجھتے ہیں درحقیقت وہ معنی قرآن کی قدر نہیں کرتے ورنہ اس کی حفاظت کے ہر سامان کی ان کو قدر ہوتی۔

صاحبو! الفاظ قرآن کو اس کی حفاظت میں بڑا دخل ہے **قرآن کا معجزہ** کیونکہ الفاظ قرآن کا یہ معجزہ ہے کہ وہ نہایت سہولت سے حفظ ہو جاتے ہیں کہ اگر خدا نہ خواستہ خدا نخواستہ یہ لکھے ہوئے مصاحف گم ہو جائیں تو ایک بچہ حافظ قرآن اپنی یاد سے اس کو دوبارہ لکھوا سکتا ہے۔ بڑوں کا تو ذکر ہی کیا۔ منظر نگار کا واقعہ ہے کہ وہاں ایک داعظ نے قرآن کے اس معجزہ کو ظاہر کرنا چاہا تو درمیان داعظ میں ایک آیت پڑھ کر اٹک گئے اور مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ اس مجمع میں جس قدر حافظ موجود ہوں چھوٹے بڑے سب کھڑے ہو جائیں مجھے ایک آیت میں شبہ ہو گیا ہے۔ اس کو حل کرنا چاہتا ہوں تو چاروں طرف سے بہت آدمی کھڑے ہو گئے جس میں بچے بھی تھے جوان بھی اور بوڑھے بھی تھے اور ادھیڑ

بھی۔ یہ دیکھ کر داعظ نے کہا، (عجیب دعو) صاحبو! مجھ کو آیت میں شبہ نہیں رہتا۔
مجھے صرف یہ دکھلانا تھا کہ اس مجمع میں جس کے اندر حفاظ کو بالقصد جمع نہیں کیا گیا۔
یوں ہی کیف مآتفق یہ سب مجمع آگیا ہے اس قدر حفاظ قرآن موجود ہیں۔ اب قیاس
کر وہ سارے شہر میں کتنے حفاظ ہوں گے پھر یہ اندازہ کر دو کہ پورے مصلح میں کتنے
ہوں گے پھر سوچو سارے ہندوستان میں کتنے ہوں گے اور دنیا بھر میں کتنے ہوں گے
صاحبو! یہ قرآن کا مجرہ نہیں تو اور کیا ہے کہ اس زمانے میں جب کہ قرآن کی طرف
رغبت کا کوئی سامان نہیں نہ اس کے حفظ کرنے والوں کو کوئی بڑا عہدہ ملتا ہے
بلکہ زیادہ تر امر کی توجہ انگریزی پڑھنے کی طرف ہے اور کفار قرآن مٹانے کی
کوشش کرتے ہیں۔ اس قدر حفاظ موجود ہیں کہ بچے بھی حافظ ہیں اور مرد بھی،
اور بعض قصبات میں عورتیں بھی حافظ ہیں۔ چنانچہ قصبہ پانی پت میں بہت عورتیں
حافظ ہیں۔ اور بعض تو سب سے قرأت کی حافظ ہیں۔

قرآن کے یاد کرنے کو بیکار کہنے والے
صاحبو! میں نہایت
آزادی سے صاف صاف
کہوں گا کہ جو لوگ بدوں معانی سمجھے الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بیکار کہتے ہیں واللہ
وہ حضرات حق تعالیٰ کا مقابلہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو قرآن کے حافظ پیدا کرنا چاہتے
ہیں تاکہ یہ محفوظ رہے، اور یہ لوگ دنیا سے حفظ قرآن کو مٹانا چاہتے ہیں، کیونکہ
تجربہ شاہد ہے کہ حفظ قرآن بچپن ہی میں اچھا ہوتا ہے بڑے ہو کر ویسا حفظ نہیں ہوتا
نواب اگر ان لوگوں کے مشورہ پر بچوں کو قرآن نہ پڑھایا جائے تو اس کا انجام یہی ہے
کہ حفظ کا دروازہ بند ہو جائے مگر یُرِیدُ وَاَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ یَاْ خُوْا اَھِمْ
وِیَا بَیُّ اَھِمْ اِلَّا اَنْ یُّنْفِذُوْا کُلَّ کَاْفِرٍ فِیْ یَہِ خَدَاکَ لَوْ کُوْنَا نَاجِیْنَ
یَعْنٰی یہ خود ہی مٹ جائیں گے، اور خدا کا نور ان کے مٹانے سے ہرگز نہ مٹے گا
یہ لوگ اپنے ایمان کی خیر منائیں یہ ہیں کس ہوا میں خدا کی قسم ان کا نام و نشان تک
نہ رہے گا۔ یہ بالکل تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

چراغ را کہ ایزد بر سر روز
ہر آنکوتف زندارشش بسوزد۔

اور

اگر گیتی سراسر باد گیسو چراغ مقبلاں ہرگز نہیں
اس عارف نے یہ بات اہل اللہ کے انوار کے متعلق فرمائی ہے توجیب اہل اللہ
کے انوار کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتے تو خود اللہ کا نور کس طرح مٹ سکتا ہے
بعض اہل اللہ بظالموں نے ستم کیا اور ان کو ذلیل کرنا چاہا ان کی قبر پر گوہ ڈلوایا مگر
ان کا نام اور ان کے انوار اب تک تاباں و درخشاں ہیں اور وہ ظالم گنہگار اور ناپید
ہو گئے، کوئی ان کے نام سے بھی واقف نہیں نہ ان کی قبر کا نشان باقی ہے اور اہل اللہ
کے مزارات اس وقت تک مرجع الاخلاق بنے ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ مشاہدے ہیں کہ
اہل اللہ اپنے کو خود مٹانا امید کرنا گنہگار کرنا چاہتے ہیں، اور اہل ظاہر اپنے کو ظاہر
کرنا مشہور کرنا چاہتے ہیں مگر اہل اللہ یعنی اہل باطن ہی چمکتے ہیں اور اہل ظاہر کی شہرت
چند روزہ ہو کر خاک میں مل جاتی ہے۔ بعض مصنفین نے ایسے کتابوں کے نام تک
ظاہر نہیں کیا مگر کتابیں ان کی مقبول و متداول ہیں اور اہل ظاہر بڑے اہتمام سے اپنا نام
ظاہر کرتے ہیں مگر ان کی کتابوں کو کوئی بھی نہیں پوچھتا۔

اللہ کا نور مٹ نہیں سکتا ہے
میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب اہل اللہ کے
انوار کسی کے مٹاتے نہیں مٹ سکتے
تو خود اللہ تعالیٰ کا نور کیوں کر مٹ سکتا ہے بس یہ خدا کی حفاظت ہے کہ قرآن
کے اس قدر حفاظ ہر زمانے میں ہوتے رہے ہیں کہ ان کا شمار و احصار دشوار ہے
اس پر بعض لوگ یوں کہہ دیا کرتے ہیں کہ خدا قرآن کا حافظ نگہبان ہے تو ہم اس کے
اہتمام کی کیا ضرورت ہے۔ اے صاحبو! یہ بات ایسے دل سے نکلی ہے جس میں
خدا سے ذرا بھی علاقت اور لگاؤ نہیں کیا، اگر جارج پنچم آپ کو کوئی تحفہ دیں آپ
اس کی بے قدری کر سکتے ہیں اور خصوصاً ان کی نگاہ کے سامنے ہرگز نہیں، بلکہ اس کو
سراور آنکھوں پر رکھا جائے گا اور اس کی جان سے زیادہ حفاظت کی جائے گی،
اور اگر وہ کوئی تحفہ کھائے کیو اسطے آپ کو دیں اور ان کے سامنے آپ اسے
کھاتیں تو کیا زمین پر آپ اس کا کوئی ریزہ کرنے دیں گے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس طرح
شوق سے کھاتیں گے کہ گویا کبھی یہ نعمت آپ کو ملی ہی نہیں تھی، اور اگر اس میں سے

ذرا سا بھی زمین پر گر گیا تو فوراً اٹھا کر سر پر رکھیں گے۔

یہیں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی حقیقت قرآن کی حفاظت سمجھ تو کہ اگر کھانا کھاتے ہوئے لقمہ زمین پر گر جائے تو اسکو اٹھا کر صاف کر کے کھا لو کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں تو انکی نعمت کی ان کے سامنے بے قدری کرنا بڑی بے حیائی ہے، تو صاحبو! خدا تعالیٰ نے آپ کے ہاتھوں میں قرآن دیدیا ہے تو اب تو یہ آپ کا ہو گیا تو کیا اپنی ایسی قیمتی چیز کی جو سلطان السلاطین کے دربار سے ملی ہے آپ کو حفاظت نہ کرنا چاہیے؟ یقیناً کرنا چاہیے خصوصاً جب کہ خدا کی مرضی اس کی حفاظت میں ہے اور وہ اس کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی مرضی حق پر چلنا چاہیے اس کی حقیقت اولیاء اللہ سے پوچھو۔

صاحبو! محبت کا سبب کمال و جمال و نوال ہے اور یہ سب اسباب محبت باتیں حق تعالیٰ شانہ کے اندر کامل طور پر موجود ہیں ان سے بھی اگر محبت نہ ہو تو پھر کس سے ہوگی۔ خبر بھی ہے حق تعالیٰ کون ہیں تمام حسن و جمال کا مبداء و منتہا ہیں تو جب خدا تعالیٰ اسے محبوب ہیں تو ہم کو انکی مرضی کی رعایت کرنا چاہیے اور خدا تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ قرآن محفوظ رہے تو آپ کو اس کی طرف جھکنا چاہیے اور اس کے الفاظ کا پورا اہتمام کرنا چاہیے، کیونکہ الفاظ و معانی دونوں قابل اہتمام ہیں مگر الفاظ میں اتنی بات زیادہ ہے کہ معانی کی حفاظت الفاظ کی حفاظت پر موقوف ہے کیونکہ معانی کا ضبط بدون الفاظ کے نہیں ہو سکتا۔

دیکھئے سب سے پہلے معانی کا نزول الفاظ قرآن کی حفاظت کا اہتمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر ہوا ہے مگر وہاں بھی بواسطہ الفاظ کے ہوا ہے اور حضور کو الفاظ کا اس قدر اہتمام تھا کہ جب وحی نازل ہوتی تو آپ جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے تھے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حافظہ بہت قوی تھا بلکہ سارے ہی قوی مضبوط تھے کہ تریسٹھ سال کی عمر میں بھی آپ کے بال کچھ ہی سفید ہوئے تھے۔ اور حضور کی قوت کا کیا پوچھنا۔ آج کل سے تو اس زمانے کے سب ہی لوگ قوی

تھے حضرات صحابہ کا حافظہ بھی ہم لوگوں سے زیادہ قوی تھا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو سب ہی سے زیادہ قوی تھا، لیکن بایں ہمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الفاظ قرآن کا اس درجہ اہتمام تھا کہ فرشتہ کے ساتھ قرآن پڑھتے جاتے تھے۔ کیونکہ

۳۰۰ باسایت نرانی پندم عشق است و ہزار بدگمانی
آپ کو ان محبوب الفاظ کے نکلنے کا اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی لفظ میری یاد سے نکل نہ جائے اس لئے ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے تھے۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ قرآن سے کس درجہ عشق تھا یہاں تک کہ حق تعالیٰ کے منع کرنے کی نوبت آئی کہ آپ ساتھ ساتھ پڑھنے کی مشقت برداشت نہ کیا کریں، لَا تَحْمِلْ بِهٖ سِتْرًا لَّتَعْمَلَ بِهٖ ہم ذمہ لیتے ہیں کہ قرآن کو آپ کے دل پر جمادیں گے، اس تسلی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرشتے کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔ جب حضور کو الفاظ قرآن کا اس درجہ اہتمام تھا تو ہم کو بھی ان کا اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ بدون الفاظ کے معانی کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ لہذا معانی کی نگہبانی یہی ہے کہ الفاظ کو یاد کیا جائے حضرات سلف صالحین نے تو قرآن کے نقوش اور رسم خط کی بھی یہاں تک حفاظت کی ہے کہ رسم خط قرآن میں متقل رسائل تصنیف کئے اور اس کو علیحدہ فن قرار دیا ہے اور اس میں تغیر و تبدل کو ناجائز فرمایا ہے۔

قرآن کے رسم خط کی حفاظت صاحبو! آج کل تو یادگار قدیم کی اس قدر حفاظت کی جاتی ہے کہ اس کے تغیر کے بعد بھی اس کا فوٹو لیا جاتا ہے تو خدا نخواستہ اگر رسم خط قدیم متغیر بھی ہو تا جب بھی یادگار قدیم ہونے کی وجہ سے اس کی حفاظت ضروری تھی چہ جائیکہ وہ بالکل محفوظ صحیح ہے بلکہ اس میں نکات ہیں چنانچہ ایک جگہ بقادریں الف نہیں لکھا گیا کیونکہ وہاں دوسری قرأت بقدر ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم اس جگہ بقادریں الف نہیں لکھا۔ تاکہ دوسری قرأت پر بھی رسم خط دال رہے۔ اسی طرح سورہ فاتحہ میں مالک یوم الدین میں الف نہیں لکھا کیونکہ ایک قرأت میں ملک ہے پس رسم خط قرآن میں اس کا تبدل لحاظ کیا گیا ہے کہ سب قرأتوں کو جامع رہے اس لئے اس کا بدلنا حرام ہے۔ صاحبو! جب قرآن کی ہر چیز کی حفاظت کی گئی ہے اور یہ لمحوں کے لئے بڑا خرچہ ہے

ہے کہ ان کے برابر کسی قوم اور کسی امت نے آسمانی کتاب کی حفاظت نہیں کی۔ تو آپ کو بھی اس کی ہر چیز کی ویسی ہی حفاظت کرنا چاہیے جیسا کہ اب تک امت نے کی ہے اور یہ امت کہو کہ خدا تو اس کا خود نگہبان ہے پھر ہم کو کیا ضرورت ہے کیونکہ اس کی محافظت کی یہ بھی ایک صورت ہے کہ اس نے حفاظت کا حکم اپنے بندوں کو دیدیا اور یہ ان کا احسان ہے اور انعام ہے کہ اس نے یہ خدمت ہم سے لے لی اگر تم یہ کام نہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم سے یہ کام لے لیں گے چاہے چھوڑ کر دیکھ لو، تمہاری تان گاڑی نہیں چل رہی ہے اللہ تعالیٰ کو تو ہمارے پیدا کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی یہ بھی ان کا انعام محض ہے کہ ہم کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا اور پیدا کرنے سے پہلے ملائکہ سے فرمایا اِنِّیْ جَاعِلٌ فِیْ الْاَرْضِ خَلِیْفَہٗ ثُمَّ کہ زمین کے اندر اپنا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں، کس قدر عنایت ہے کہ

ما نبودیم و تقاضائے مانبود لطف تو ناگفتہ نامی شنود

ہمارا پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے ہم کو خلیفۃ اللہ کا خطاب دیا تو کیا خلافت کا یہی حق ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں کہ زبان پر یہ بات آ رہی ہے کہ خدا قرآن کا خود نگہبان ہے ہم کو کیا ضرورت ہے۔ خدا تعالیٰ کی عنایت تو دیکھئے کہ ہم کو ایسی حالت میں خلیفہ بنا یا کہ دو کے لوگ اس منصب سے طالب موجود تھے ملائکہ نے اسی وقت جب کہ اللہ تعالیٰ نے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِیْ الْاَرْضِ خَلِیْفَہٗ فرمایا یہ عرض کیا تھا کہ ہمارے ہوتے ہوئے انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ قرآن میں ملائکہ کا یہ سوال اور اس کا جواب مفصل مذکور ہے میں اس وقت اس کی تفصیل بیان کرنا نہیں چاہتا صرف یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کو ہماری ضرورت نہ تھی بلکہ جس کام کے لئے ہم پیدا کیا گیا ہے اس کے انجام دینے کے لئے اللہ تعالیٰ کی دوسری مخلوق اپنی خدمات کو پیش کرنے موجود تھی مگر اللہ تعالیٰ کا یہ ہمارے حال پر غایت کریم ہے کہ دوسری جماعت کے ہوتے ہوئے پھر بھی ہم کو منصب خلافت عطا کیا اور ہم کو اس خدمت کے لئے پیدا کیا اسی طرح خدمت قرآن کے لئے بھی خدا تعالیٰ کی ہماری کیا ضرورت ہو سکتی ہے اگر ہم خدمت دین میں کوتاہی کریں گے تو دوسری

قوم کو اس کی خدمت کے لئے پیدا کر دیں گے۔

چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس خیال کا بھی جواب صاف ارشاد خداوندی صاف دیا ہے وَ اِنْ تَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ لَیْ قَوْمٌ لَّعَلَّکُمْ تَنْتَبِہُوْنَ لَایُکُوْنُوْا اٰمَنًا لَّکُمْ اِغْرَمْتُ دِیْنَ سَے اعراض کر دو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے عوض تمہاری جگہ دوسری قوم کو کر دیگا پھر تمہاری طرح سست و کاہل اور دین سے جان چرانے والے نہ ہوں گے، صاحبو! تمہاری تان گاڑی نہیں چل رہی تم آج چھوڑ کر دیکھ لو گاڑی ویسی ہی چلتی رہے گی ہاں تم خود ہی گر پڑو گے اللہ تعالیٰ اس دین کی خدمت اور قرآن کی حفاظت کے لئے ایسی قومیں پیدا کر دیں گے جو تمہاری جیسی نہ ہوں گی۔

صاحبو! میں آپ کو خبردار و بیدار کرنا چاہتا ہوں کہ جلدی سنبھلو، بیدار ہو جاؤ کہیں اس وعید کا ظہور نہ ہو جائے کیونکہ مجھے اس کے آثار نظر آ رہے ہیں اس وقت میں ایک خوفناک منظر دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کی تحریروں تو کفر امیر شائع ہوتی ہیں اور اہل یورپ کی تحریروں اسلام کی مدح میں شائع ہو رہی ہیں گویا بعض مسلمان کفر کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بعض کفار اسلام کی طرف، تو اس حالت کو دیکھ کر مجھ کو سخت اندیشہ ہوتا ہے کہ جب دونوں جماعتیں سرحد پر پہنچیں ہوں گی تو ایسا نہ ہو کہ وہ تو کفر سے نکل کر مسلمان ہو جائیں اور یہ اسلام سے نکل کر کافر ہو جائیں۔ صاحبو! دوسری قوموں کو اسلام کی مدح و ثنا کی طرف مائل کر کے ہم کو متنبہ فرما رہے ہیں کہ یہ امت سمجھنا کہ خدا کو یا اسلام کو تمہاری ضرورت ہے بلکہ تم ہی کو اسلام کی ضرورت ہے وَ اِنْ تَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ لَیْ قَوْمٌ لَّعَلَّکُمْ تَنْتَبِہُوْنَ اٰمَنًا لَّکُمْ اِغْرَمْتُ دِیْنَ اگر تم اعراض کر دو گے تو ہم تمہاری جگہ دوسری قوم کو کر دیں گے جو اس وقت باوجود کفر کے اسلام کی مدح کر رہی ہے۔ اور تم ان کی جگہ ہو جاؤ گے کہ باوجود علم ہونے کے اسلام کی توہین کرتے ہو اور اگر تم اعراض نہ کرو بلکہ بدستور اسلام کی خدمت انجام دیتے رہو اس صورت میں تم بھی مسلمان رہو گے اور شاید دوسری قومیں بھی مسلمان ہو جائیں اور اسلام کی خدمت یا قرآن کی حفاظت جو کچھ آپ کرتے ہیں یہ محض برائے نام ہے جس سے صرف آپ کا نام ہو جاتا ہے ورنہ اب بھی قرآن کے محافظ دراصل حق تعالیٰ ہی ہیں۔

قرآن بعد حفظ ہوتا ہے

تم اپنے حفظ پر کیا ناز کرتے ہو ذرا کافیہ کوئی اور نظم و نشر کی کتاب تو حفظ کر لو آپ کو اسی وقت اپنے حفظ کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ یہ خدا تعالیٰ ہی کی تو حفاظت ہے کہ قرآن جیسی ضخیم کتاب کا حفظ کرنا ایسا آسان کر دیا ہے کہ بچے تک حفظ کر لیتے ہیں حالانکہ قرآن میں تنشا بہات بھی کثرت سے ہیں۔ اس بات پر بھی کہنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا محض نام کرنا مقصود ہے کہ وہ ہم کو حافظان قرآن کی فہرست میں داخل کئے انعام دیتے ہیں ورنہ اصل حافظ وہی ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے

کار زلف تسیت مشک افشانی اما عاشقاں -
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند -

واللہ اس انعام پر جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر فرمایا ہے، یوں کہنا چاہیے

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل -
نسیم صبح تیری مہربانی ! -

اور عارفین کی نظر تو اس سے بھی آگے بڑھتی ہے، عارفین توجہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تو ان کو یہ بات مشکوٰۃ ہوتی ہے کہ ہم خود نہیں پڑھ رہے بلکہ اکٹھا بابے کی طرح بول رہے جس میں کسی اور کا کلام بند کر دیا گیا ہے اور بانجھ سے وہی نکلتا ہے جو اس میں بند کیا گیا ہے مگر ظاہر میں یہ سمجھتا ہے کہ باہم بول رہا ہے یا اس وقت وہ مثل شجرہ طور کے ہوتے ہیں کہ ظاہر میں یہ درخت کہہ رہا تھا یا مٹوسی اِنِّیْ اَنَا اِلٰہٌ دَدِیْتُ الْعَالَمِیْنَ مگر درخت کی کیا مجال تھی کہ وہ اس طرح خود بولتا بلکہ کوئی دوسرا بول رہا تھا اور درخت محض اس کا ناقل و حاکی تھا

ہے چرخ کو کب یہ سلیقہ سے ستم گاری میں کوئی معشوق ہے اس پر وہ نگاری میں

اے موسیٰ میں ہی اللہ ہوں جو سارے جہاں کا پالنے والا ہے۔

ایک عارف اس کو فرماتے ہیں

سہ درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند -
آینچا استاد ازل گفت بگوئی گویم -

عارفین کا حال

عارفین کو جب اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے تو کچھ نہ پوچھے کہ تلاوت قرآن کے وقت ان کی کیا حالت ہوتی ہے اور تلاوت قرآن میں تو اس حالت کا غلبہ ایک خاص وجہ سے زائد ہوتا ہے کہ قرآن میں اللہ صاف صاف اپنی شوکت و عظمت و جلال کو ظاہر فرماتے ہیں۔ کہیں عتاب سکے ہیں شکایت ہے کہیں تسلی ہے کہیں بشارت ہے کہیں حکم ہے، کہیں خطاب ہے، ورنہ ایک تلاوت قرآن ہی کیا انسان کے تو سارے ہی افعال ایسے ہیں کہ ان میں انسان محض برائے نام فاعل ہے ورنہ اصل کو کئے والے وہی ہیں، یہ کیا ناز کرتا ہے اپنے علم و کمال پر کہ میں نے یہ کام کیا ہے میں نے فلاں مسئلہ حل کیا ہے واللہ اس مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص دوسرے کے کھیت پر دعویٰ کرے کہ یہ کھیتی میری ہے مگر ساکھ میں یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ زمین بھی دوسرے کی اور بیج اور پیل بھی دوسرے کا اس نے اس کو پانی دیا کھا ڈالا، اور کھیت کو پرورش کیا ہے ظاہر ہے کہ ہر شخص اس مدعی کو احمق بنائے گا کہ جب ساری چیز دوسرے کی ہیں تو کھیتی تیری کدھر سے ہوتی۔

صاحبو! مگر اس حاکت میں ہم سب مبتلا ہیں قوت و اعضا انسان کا اقرار کیونکہ جس دماغ اور جن ہا تقیروں سے ہم کرتے ہیں ہر ایک کو اقرار ہے کہ یہ سب سامان خدا کا عطا کیا ہوا ہے۔ عقل و فہم اور قوت ارادہ اور قوت عمل بھی انہی کی دی ہوئی ہے۔ اب فرمائیے کہ ان سب قویٰ اور جوارح سے جو افعال و کمالات ظاہر ہوں گے وہ ہمارے کدھر سے ہوں گے

ہے بیاد دم از خانہ چیزے نخست
تو دادی ہم چیزے من چیزے تست

حیرت ہے اگر ہم اب بھی یہ دعویٰ کریں کہ ہم خود قرآن کی حفاظت کرتے ہیں جب ہمارا پڑھنا اور یاد کرنا ہمارے قبضہ کا نہیں تو ہم حفاظت کر نیوالے کون ہیں بلکہ وہی محافظ ہیں جنہوں نے ہم سے یہ کام لیا اور اس کے اسباب عطا کئے اور حفاظت کا دھر

ہے ہونا بہت ہی ظاہر ہے حقیقت میں تو ہمارا پڑھنا اور تلاوت کرنا بھی ادھر ہی سے ہے اگر ادھر سے توفیق نہ ہو تو کسی کی مجال نہیں، کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے۔

کاپور کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے جہانی لی تھی اس کے بعد منہ بند **ایک واقعہ** نہ ہوا کھلا کھلا رہ گیا بڑی مصیبت ہوئی نہ کھلانے کا رہا نہ بات کرنے کا، پھر بڑی دقت سے کئی دن میں منہ بند ہوا۔ شاید کوئی کہے کہ دوا دروسے منہ بند تو ہو گیا، یہ کام تو انسان کی تدبیر سے ہوا، میں کہتا ہوں کہ اس میں بھی تدبیر کا محض نام ہی ہے خدا کو منظور نہ ہوتا تو قیامت تک منہ بند نہ ہو سکتا آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض دفعہ تمام اطباء اور ڈاکٹر عاجز ہو جاتے ہیں اور بیمار کو شفا نہیں ہوتی بلکہ جون میں دوا کرتے ہیں مرض کو ترقی ہی ہوتی ہے اور یہ حال ہوتا ہے کہ سہ

از قضا نہ کر نکلیں صفر افزہ دد روغن بادام خشکی نمی نمود۔ ہر تدبیر الٹا کام کرتی ہے جس دوا کو تریاق سمجھا جاتا ہے وہی زہر کا اثر کرتی ہے اگر شفا طبیوں، ڈاکٹروں کے قبضہ میں ہے تو ان کی بیوی بچے تو ہمیشہ مرض کے بعد ضرورت صحت یاب ہو جایا کریں کیونکہ اس موقع پر طبییہ ڈاکٹر کبھی تدبیر میں کمی نہیں کر سکتا مگر مشاہدہ اس کے خلاف ہے پس مجبوراً ماننا پڑے گا کہ سہ

درد از بار است و در ماں نیز ہم دل فدائے او شد و جان نیز ہم ہر چہ می گویند آں بہتر ز حسن یار ماں دارد و آں نیز ہم اب تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ قرآن پڑھنا بھی مستقلاً ہمارا کام نہیں، اس کے محافظ تو ہم کیا ہوتے، تو اب یہ محض حق تعالیٰ کا انعام ہے کہ وہ ہمارا نام ہی کرنا چاہتے ہیں ورنہ دراصل سب تفورات وہ خود کرتے ہیں اگر اب بھی اس انعام کی طرف رغبت نہ ہو تو سخت محمدی کی علامت ہے، یہ مضمون درمیان میں استطراداً ہو گیا اس امر پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ قرآن کی حفاظت جو آپ کے سپرد کی گئی ہے تو آپ اس پر ناز نہ کریں خدا کو آپ کی ضرورت نہیں بلکہ آپ ہی کو خدا کی ضرورت ہے۔

اب میں پھر مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ **بے معنی سمجھے قرآن کا فائدہ** یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں، کہ بدون معنی کے سمجھے قرآن پڑھنے کی فائدہ، کیونکہ ایک فائدہ تو یہی ہے کہ معانی کی حفاظت بدو دل خطا

الفاظ کے نہیں ہو سکتی، اور حفظ معانی کی ضرورت آپ کو بھی مسلم ہے۔ یہ جو اقب سائنس و عقل کے موافق ہے اور اچکل عقل و سائنس کی پرستش زیادہ ہے اس لئے یہ جواب تو تعلیم یافتہ جماعت پر زیادہ حجت ہے اور ایک جواب نقلی ہے جو دینداروں پر حجت ہے، جو نقل کے سامنے عقل کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرآن کے ہر لفظ پر دس نیکیاں ملتی ہیں جس نے ایک بار زبان سے اچھا کہا اس کے نامہ اعمال میں اسی دقت پچاس نیکیاں لکھی گئیں۔ شاید عقل پرستوں کو یہ جواب پھیکا معلوم ہوا ہو، مگر صاحبو حقیقت میں بڑا قیمتی نفع ہے جس کی قدر کرنے کے بعد معلوم ہوگی جبکہ نیکیوں ہی کی پوچھ ہوگی اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کے پاس مکہ کے ہلالے اور نجدیاں بہت سی جمع ہوں اور ہندوستان والے اس کا مضحکہ اڑائیں کہ اس سنے کو جمع کرنے سے تجھے کیا نفع؟ وہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ ہاں ابھی تو کچھ نفع معلوم ہوتا لیکن ایک خاص دن معلوم ہو جائیگا پھر شخص اور اس کا مضحکہ اڑانے والے دونوں حج کو جائیں تو وہاں پہنچ کر مسالہ برعکس ہوگا کہ اب وہ شخص جس کے پاس ہلالے اور نجدیاں جمع تھیں ان لوگوں کا مضحکہ اڑائے گا جن کے پاس ہندوستانی تانبے کے پیسے بہت ہیں مگر مکہ کا سکھ کچھ نہیں تھا اور اب یہ لوگ اس کے سامنے شرمندہ ہوں گے۔

صاحبو! اسی طرح ایک اور عالم آنے والا ہے **ایک دوسرا عالم بھی ہے** جس کے بازار میں آپ کے ان سکوں کی کچھ قدر نہیں جو آپ آجکل جمع کر رہے ہیں نہ وہاں روپے کی قدر ہے نہ اشرفی کی نہ انظرس کی قدر ہے نہ بنی، اے کی نہ ایل، ایل، بنی کی نہ سی، ایس، آئی کی، وہاں کا سکھ یہی نیکیاں ہیں جن کی آپ اس دقت قدر کر رہے ہیں، پس قرآن کے الفاظ کا دوسرا نفع یہ ہے کہ یہ آخرت کا سکھ ہے جس کی ایک سورت سے آخرت کے بشمار خزانے جمع ہو جائیں گے ہیں جب آپ وہاں جا کر دیکھیں گے کہ ایک سورۃ فاتحہ اور قل ہو اللہ سے اتنا بے شمار ثواب مل گیا تو بے ساختہ یوں کہیں گے سہ خود کہ باید ایں چنین بازار را کہ بیک گل می خرمی گلزار را مگر ابھی اس واسطے قدر نہیں کہ یہ بازار اس سکھ کا نہیں ہے یہاں یہ سکھ راج

نہیں لیکن آخر آپسے لمان ہیں اور آخرت و قیامت کے آنے کا اعتقاد رکھتے ہیں پھر اس نفع کی بے قدری کس لئے ہے واللہ وہاں جا کر آپ افسوس کریں گے کہ ہائے ہم نے رات دن قرآن کی تلاوت کیوں نہ کی جو آج بالامال ہو جاتے اور اس وقت اپنے ان عذروں اور بہانوں پر افسوس ہو گا جو آج کل تحصیل قرآن میں کئے جاتے ہیں۔

مجھے دیندار طبقہ کی بھی شکایت ہے کہ یہ طبقہ بھی تلاوت تلاوت قرآن کا پوری طرح اہتمام نہیں کرتا۔ بعض یہ عذر کرتے ہیں کہ ہم کو فرصت نہیں ملتی طلبہ و مدرسین کو زیادہ تر یہی عذر ہے مگر یہ محض انوہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ دوستوں سے باتیں کرنے میں بہت وقت ضائع کر دیتے ہیں اس وقت ان کو کہاں سے فرصت مل جاتی ہے پھر افسوس ہے تلاوت قرآن کے لئے تھوڑا سا وقت نہیں دیا جاتا ہے

سہ قلق از سوزش پروانہ داری و لے از سوزیا پروانہ داری۔ دوستوں کے راضی کرنے کا تو اتنا اہتمام اور خدا کے راضی کرنے کا مطلق اہتمام نہیں بتلائیے اگر خدا تعالیٰ آخرت میں یہ سوال فرمائیں کہ تم نے فلاں دن فلاں دوست سے ایک گھنٹہ تک باتیں بنائیں مجھ سے آدھ گھنٹہ بھی باتیں نہ کیں تو اس کا جواب کیا دو گے، بس سچا جواب تو یہ ہو گا کہ یوں کہہ دو کہ ہم کو (معاذ اللہ) خدا سے محبت نہیں اگر یہ کہہ دو تو پھر ہم آپ سے خطاب ہی نہ کریں گے لیکن آپ یہ کبھی نہیں کہہ سکتے۔

کیونکہ آپ کو خدا تعالیٰ سے محبت ہے اس لئے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی محبت مومن ہیں اور مومن کی شان یہ ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا اللّٰهُ جَسَّاءٌ کہ جو لوگ ایماندار ہیں ان کو اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت ہے پس آپ کو اللہ تعالیٰ سے ضرور محبت ہے، اور ایسی محبت ہے کہ کسی سے بھی اتنی محبت نہیں بعض لوگوں کو شاید اس میں خلیان ہو کہ ہم کو تو بظاہر اپنی اولاد اور بیوی کے ساتھ محبت زیادہ معلوم ہوتی ہے، مگر یہ خیال صحیح نہیں اولاد اور بیوی کے ساتھ طبعی محبت ہے عقلی محبت نہیں اور طبعی محبت تو جانوروں کو بھی اپنی اولاد وغیرہ سے ہوتی ہے یہ کچھ کمال نہیں اور نہ خدا رسول کے ساتھ ایسی محبت مامور بہا ہے بلکہ محبت عقلیہ مامور بہا ہے جس کا منشا محبوب کا کمال ہوتا ہے، سو یہ محبت اللہ و رسول کیساتھ

زیادہ ہے اور کسی کے ساتھ ان کے برابر نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے برابر صاحب کمال کوئی نہیں اور خدا تعالیٰ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کوئی صاحب کمال نہیں اس لئے آپ کے ساتھ بھی یقیناً بہ نسبت سب کے زیادہ محبت ہے مگر عقلی اور غور کر کے دیکھا جائے تو طبعی بھی مسلمانوں کو اللہ و رسول ہی سے زیادہ ہے، اور کسی کے ساتھ اتنی محبت نہیں مگر اس کا نظروں کی طرح حرکت کے وقت پر ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک قصہ سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی ہمارے اطراف ایک واقعہ میں ایک بزرگ مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ گذرے ہیں جو تقویٰ کے اندر ہمارے اکابر میں مسلم و ممتاز تھے وہ ایک بار موضع گوتھی پختہ میں تشریف لے گئے وہاں کے رئیس نے مولانا سے سوال کیا کہ حدیث میں آیا ہے لایحی من احد کہ حتی یکون اللہ و رسول ما احب الیہ من نفسہ ما لا ولی لہ اجمعین کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہ ہو گا جب اللہ و رسول اس کی جان و مال وغیرہ سب سے زیادہ اس کو محبوب نہ ہو جائیں مگر میں۔

دیکھتا ہوں کہ مجھے اپنے والد صاحب سے محبت زیادہ ہے۔ مولانا نے اس وقت تو اس کا ایک مناسب جواب دیدیا۔ پھر یہ چاہا کہ ان کے اس شبہ کو علمی طور پر دفع کر دیا جائے تو زیادہ اطمینان کا باعث ہو گا۔ چنانچہ آپ نے علمی طور پر اس کا جواب اس طرح دیا کہ تھوڑی دیر میں باتوں باتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ شروع کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ایسا ہے جس میں ہر مسلمان کو لطف آتا ہے، سب لوگ شوق سے سننے لگے، اور وہ رئیس بھی بہت مزے لے لے کر سن رہے تھے جب مولانا نے دیکھا کہ رئیس صاحب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں بہت مزہ آ رہا ہے تو درمیان میں حضور کا ذکر قطع کر کے فرمانے لگے کہ اچھا خاں صاحب اس ذکر کو تو رہے دست بکھے اب میں کچھ آپ کے والد ماجد کے کمالات و مناقب بیان کرتا ہوں کہ وہ بھی بڑے اچھے آدمی تھے وہ رئیس بولے، حضرت توبہ تو یہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ میں میرے والد صاحب کا تذکرہ کہاں سے ٹھونس دیا۔ نہیں نہیں آپ حضور ہی کا تذکرہ کیجئے میرے والد صاحب کے کمالات کو حضور ص سے کیا نسبت جو آپ درمیان میں خواہ مخواہ

ان کا ذکر کرنے لگے۔ میرے قلب کو اس سے بہت گرانی ہوئی۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا کیوں غافل صاحب، تم تو یہ کہتے تھے کہ مجھے اپنے والد کے ساتھ محبت زیادہ معلوم ہوتی ہے پھر حضور کے تذکرہ میں والد صاحب کا تذکرہ گراں کیوں ہوا غافل صاحب سمجھ گئے کہ مولانا میرے شبہ کا علمی جواب دیا ہے۔ کہنے لگے۔ مولانا جبرائیل اللہ اب میرا شبہ جاتا رہا اور معلوم ہو گیا کہ الحمد للہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسی محبت ہے کہ والد کی محبت کو اس سے کچھ بھی محبت نہیں ہے۔

سہ جزاک اللہ کہ چشم باز کردی مرا با جانِ جاں ہمارا کر دی۔
تو صاحبو! موازنہ کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ واقعی اللہ و رسول کے برابر مسلمان کو کسی سے بھی محبت نہیں اور موازنہ ہوتا ہے کسی محرک کے پاس جانے پر، مثلاً فرض کرو کہ ایک شخص تمہارے ماں باپ کو گالی دے اور ایک شخص اللہ و رسول کی شان میں دغا دے (گستاخی کرے تو بتلاؤ کہ تم کو کس پر غصہ زیادہ آئیگا۔ یقیناً جس نے اللہ تعالیٰ اور رسول علیہ السلام کی شان میں گستاخی کی ہے اس پر زیادہ غصہ آئے گا اور تم آپ سے باہر ہو کر اس کی زبان نکلنے پر آمادہ ہو جاؤ۔ جب ہر مسلمان کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنی ذلت اور ماں باپ کی ذلت کو ادا کر سکتا ہے مگر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ذرا سی گستاخی کا تحمل نہیں کر سکتا تو اب مطمئن رہو کہ بجز اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے زیادہ ہے۔ مگر اس کا ظہور کسی محرک کے پاس جانے پر ہوتا ہے۔ اور جب آپ کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبت ہے تو اب اس کے کیا معنی کہ بدو نہ سمجھے قرآن پڑھنے سے کیا فائدہ؟ صاحبو! اگر کوئی محبوب ایک مہل زبان تصنیف کر کے عاشق سے اس میں باتیں کرے تو عاشق اگر سچا عاشق ہے تو یقیناً اس کی قدر کرے گا اور وہ مہل زبان ہی اس نظریں فصیح زبان سے زیادہ پیاری ہوگی۔ کیونکہ محبوب کی زبان ہے۔ اور قرآن تو مہل بھی نہیں بلکہ نہایت فصیح و بلیغ و عجیب شیریں زبان ہے۔ جو لوگ سمجھتے ہیں وہ تو اس کی فصاحت اور بلاغت اور شیرینی کو سمجھتے ہیں۔

قرآن میں مزہ مگر جو کہ نہیں سمجھتے ان کو بھی اس میں بہت مزہ آتا ہے

تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اور جو لوگ تلاوت قرآن کے عادی ہیں وہ اس کا خوب تجربہ کئے ہوئے ہیں اور اگر کسی وقت کوئی خوش الحان قاری مل جائے تو ذرا اس سے قرآن سن کر دیکھ لو کہ بدو نہ معنی سمجھ تم کو مزہ آتا ہے یا نہیں۔ واللہ بعض دفعہ نہ سمجھنے والوں کو بھی ایسا مزہ آتا ہے کہ دل پھٹ جاتا ہے۔ بس قرآن کی یہ حالت ہے سہ بہارِ عالم حشر دل و جاں تازہ می دارد۔
برنگ اصحاب صورت را بوار باب معنی را۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن پڑھنا گویا اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنا ہے پھر حیرت ہے کہ آپ عاشق ہو کر اپنے محبوب سے باتیں کرنا نہیں چاہتے حالانکہ محبت وہ چیز ہے کہ عاشق طرح طرح اس کے بہانے ڈھونڈا کرتا ہے کہ محبوب سے باتیں کرنے کا موقع ملے۔

حضرت موسیٰ کا واقعہ
حضرت سیدنا موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے سوال ہوا تھا۔ وَمَا تِلْكَ بِبَيْنِكَ يَا مُوسَى اے موسیٰ تمہارے دلہنے ہاتھ میں کیلے اس کے جواب میں صرف اتنا کافی تھا کہ عصا کہہ دے مگر نہیں چونکہ ان کو محبت تھی تو اس وقت کو غنیمت سمجھا کہ محبوب سے باتیں کرنے کا موقع ملا ہے انہوں نے تفصیل کے ساتھ جواب دیا یٰ عَصَا اِنْفِخْ عَلَیْهَا وَاهْبِشْ بِهَا عَلٰی غَنَمِیْ۔ یہ میری لائٹھی ہے میں اس پر سہارا لگا لیتا ہوں اور اس سے بکریوں کے لئے پے تھاتا ہوں کتنی طویل بات کی کہ یہی بڑھایا اول میں اور بار تکلم کا اضافہ کیا آخر میں۔ پھر اس لائٹھی کے منافع و جملوں میں بیان کئے اور اس کے بعد فرمایا وَ اِنْفِخْ عَلَیْهَا رِبِّ اَخْرِیْ کہ اس میں میرے اور بھی مقاصد ہیں یہ اس واسطے بڑھایا تاکہ آئندہ بھی کلام کی گنجائش رہے کہ شاید حضرت حق دریافت فرمادیں کہ ہاں صاحب وہ اور مقاصد کیا ہیں ذرا وہ بھی بیان کیجئے تو پھر اور باتیں کیونگا یا خود ہی عرض کریں کہ حضور اس وقت اس کی شرح نہ ہوتی تھی میں اب عرض کرنا چاہتا ہوں۔ عرض آئندہ باتیں کرنے کی گنجائش رکھ لی، یہ بات ابھی ذہن میں آئی غرض عشاق کو محبوب سے باتیں کرنے میں عجیب مزہ آتا ہے اور یہ دولت مسلمانوں کو گھر بیٹھے ہر وقت نصیب ہے کہ وہ جب چاہیں اللہ تعالیٰ سے باتیں کر لیں یعنی

قرآن کی تلاوت کرنے لگیں۔

کلام اللہ پڑھنا

پھر یہ حیرت ہے کہ قرآن کے بدون سمجھے پڑھنے کو بے فائدہ بتلایا جائے کیا یہ فائدہ کچھ کم ہے۔ صاحبو! یہ بڑی دولت ہے مگر اس کی قدر محبت والے جانتے ہیں پس محبت کی ضرورت ہے عشاق کی تو یہ حالت ہے کہ محبوب کا نام سننے میں بھی ان کو مزہ آتا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے ۵

۵ الاخاسقنی خمرا و قتل لی ہی الخمر

ولا تحسقنی سرامی امکن الجمر

کہ مجھ کو شراب پلا اور زبان سے یہ بھی کہتا رہ کہ شراب ہے شراب ہے آخر شراب منہ سے لگ جانے کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے کہ نام لیا جائے اس کا یہی راز ہے کہ محبوب کا نام سننے میں مزہ آتا ہے۔ پھر غضب ہے کہ مسلمانوں کو خدا تعالیٰ کا نام سننے میں مزہ نہ آئے اور قرآن سے زیادہ خدا کا نام کس کتاب میں ہوگا ہر آیت میں قریب قریب بار بار خدا کا نام آتا ہے اور جابجا خدا کی حمد و ثنا اس طرح کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ کوئی گز نہیں سکتا اور گود کر اللہ کے اور طریقے بھی ہیں مگر نماز اور تلاوت سے زیادہ کوئی طریقہ بہتر نہیں۔ حدیث سے یہ بات تصریح کے ساتھ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے الفاظ کا اس قدر عشق تھا کہ آپ خود تلاوت کرتے ہی تھے ایک دفعہ آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ قرآن سناؤ انہوں نے عرض کیا اعلیک اقل اعلیک انزل او کما قال، کیا حضور کو میں سناؤں حالانکہ آپ ہی پڑھتا رہے فرمایا ہاں میں دوسرے کی زبان سے سنا چاہتا ہوں۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی رضی اللہ عنہ سے یہ درخواست کیوں کی۔ حالانکہ سارا قرآن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حفظ تھا اور اس کے معنی بھی آپ کے ذہن میں حاضر تھے صرف اسی لئے کہ قرآن کے الفاظ سے آپ کو عشق تھا اور دوسرے کی زبان سے سننے میں بوجہ یکسوئی کے مزہ زیادہ آتا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ صرف الفاظ قرآن بھی بدون لحاظ معنی کے مطلوب و مقصود ہیں صاحبو! اس سے بڑھ کر الفاظ قرآن کا نفع اور کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ قرآن پڑھنے والے کی

قرأت کی طرف بہت توجہ فرماتے اور نہایت توجہ سے سنتے ہیں۔ اب غور کیجئے کہ اگر عاشق کو کسی مخبر سے یہ معلوم ہو جائے کہ محبوب تیرا گانا سن رہی ہے تو بتلائیے وہ کیسے مزے لے لیکر گائیگا اور کس طرح بنا سوار کر پڑھے گا پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل اور اصدق کون مخبر ہوگا سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خبر دی ہے کہ حق تعالیٰ قرآن پڑھنے والے پر بہت متوجہ ہوتے ہیں اور نہایت توجہ سے اس کی قرأت سنتے ہیں اس سے بھی الفاظ کا مشہور ہونا ظاہر ہے کیونکہ قرأت اور استماع الفاظ ہی کے متعلق ہے نہ کہ معانی کے۔ اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہم کو قرآن پڑھتے ہوئے اس امر کا استحضار کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہماری قرأت کو سن رہے ہیں۔ اس مراقبہ کا یہ اثر ہوگا کہ نہایت احتیاط اور اہتمام کے ساتھ صحت کا لحاظ کر کے قرأت کی جائے گی اور بے پروائی کے ساتھ نہ پڑھا جائے گا۔

الفاظ بھی مقصود ہیں

دوسرے اچھا میں نے مانا کہ معنی ہی اصل مقصود ہیں مگر یہ سمجھی نہ مانا کہ معانی ہر وقت مقصود ہوتے ہیں بلکہ ایک وقت ایسا بھی ضرور ہونا چاہیے جس میں صرف الفاظ ہی مد نظر ہوں اور معانی پر التفات نہ ہو جیسا کہ ریاضی میں پہاڑے یاد کئے جاتے ہیں اس وقت مقصود پر اصلاً نظر نہیں ہو بلکہ صرف الفاظ ہی کو دیکھا جاتا ہے اور جیسے کھانا کھانے سے مقصود قوت ہے مگر کھانے کے وقت لذت پر بھی نظر ہوتی ہے صورت پر بھی نظر ہوتی ہے کہ روٹی چلی سوئی سیاہ نہ ہو، سالن میں نمک مریچ بہت تیز یا کم نہ ہو اس وقت کوئی یہ نہیں کہتا کہ مقصود تو قوت ہے صورت اور لذت پر نظر کرنا بے فائدہ ہے۔ افسوس دنیا کی چیزوں میں تو صورت اور لذت پر نظر کرنا بے فائدہ ہے۔ افسوس دنیا حیرت ہے اور تلاوت قرآن میں لذت اسی وقت حاصل ہوتی ہے نجب کہ تلاوت کے وقت معانی کی طرف توجہ نہ ہو صرف الفاظ ہی پر توجہ ہو کیوں کہ وہ مراقبہ جو ابھی بیان ہوا کہ تلاوت کے وقت اپنے کو پڑھنے والا سمجھے اور حق تعالیٰ کو تسلیم سمجھے اور اپنے کو مثل شجرہ طور کے حاکی اور ناقل سمجھے یہ مراقبہ صرف الفاظ ہی پر توجہ کرنے میں حاصل ہو سکتا ہے معانی پر توجہ کے ساتھ یہ مراقبہ نہیں ہو سکتا چاہے تجربہ کر کے دیکھ لو، اسی طرح یہ مراقبہ بھی کہ اللہ تعالیٰ ہماری تلاوت کو سن رہے

ہیں صرف توجہ علی الفاظ سے حاصل ہوتا ہے۔ بدون اس کے نہیں ہو سکتا پھر الفاظ بدون فہم معانی کے بیکار کیوں ہوئے۔

دریائی سیر صاحبو! دریائی سطح کی سیر میں جولت ہے وہ سیر عرق میں نہیں ہے گو سیر عرق سے موتی ہاتھ لگتے ہیں جو سطح کی سیر سے حاصل نہیں ہوتے مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ سطح دریائی سیر بیکار ہے۔ ہرگز نہیں ابھارے پوچھو وہ سطح دریائی سیر کو فرحت بخش بتلاتے اور کہتے ہیں کہ اس سے دل و دماغ کو سرور اور نگاہ کو تازگی و نور حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ مدقوق کے لئے سیر دریا اسی واسطے تجویز کی جاتی ہے کہ اس کو فرحت ہو اور فرحت سے طبیعت کو قوت حاصل ہو جس سے مرض کو وہ از خود دفع کر دے تو کیا سطح دریائی سیر کو تو بیکار نہ کہا جائے اور سطح قرآن کی سیر کو بیکار کہا جاوے، کتنا بڑا ظلم ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ اصل مقصود تمام طاعات سے قرب حق ہے۔ حق تعالیٰ کے یہاں سے اولاً الفاظ آئے ہیں۔ اور معانی ان کے تابع ہو کر آئے ہیں۔

الفاظ قرآن پس الفاظ کو اللہ تعالیٰ سے قرب زیادہ ہوا اگر یہ الفاظ قرآن بے معنی بھی ہوتے تو عاشق کے لئے یہی کافی تھے کیونکہ محبوب اگر عاشق کو کوئی چیز دے تو وہاں دو لذتیں ہیں ایک لذت محبوب کے ہاتھ سے ملنے کی دوسری لذت اس چیز کے کھانے کی، اور ظاہر ہے کہ عاشق کے رقص کے لئے تو یہی لذت کافی ہے کہ اس کو محبوب کے ہاتھ سے یہ چیز ملی ہے چنانچہ بعض دفع اس چیز کو صرف بھی نہیں کیا جاتا بلکہ محبوب کی یاد کا سمجھ کر بطور تبرک کے رکھ لیا جاتا ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو ایک قیراط دیا تھا انہوں نے اس کو خرچ نہیں کیا بلکہ اس کو ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھا۔ پس عشاق کے لئے تو الفاظ قرآن ہی رقص کے واسطے کافی تھے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاً بالذات ہم کو ملے ہیں گوان میں معنی بھی نہ ہوتے۔ مگر معنی کے دو لذتیں جمع ہو گئیں تو اب کیونکر ہو سکتا ہے کہ لذت معانی سے لذت الفاظ کو چھوڑ دیا جائے بلکہ دونوں لذتیں قابل لحاظ ہیں اور الفاظ کی لذت اس جہت سے زیادہ قابل لحاظ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاً آئے ہیں گو باعتبار قصد کے معانی اصل ہیں۔ اور الفاظ ان کے تابع بغرض

بعض جہات سے ان الفاظ کو زیادہ قرب ہے اور بعض جہات سے معانی کو زیادہ قرب ہے اور کوئی ایک دوسرے سے مخفی نہیں یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ نہیں حفاظ خوش نہ ہوں کہ ہم سب سے افضل ہو گئے کیونکہ الفاظ کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ قرب ہے تو وہ ایک طرف فیصلہ کر کے خوش نہ ہوں میں ایک طرف فیصلہ کر کے ڈگری نہیں دیتا بلکہ دونوں جماعتوں کے لئے فیصلہ کرتا ہوں کہ بعض جہات سے اہل الفاظ افضل ہیں اور بعض جہات سے اہل معنی اور قرآن کی دونوں چیزیں قابل اہتمام ہیں صورت بھی اور معنی بھی کیونکہ ہر چیز کی طرف صورت و معنی دونوں ہی کی وجہ سے رغبت ہوتی ہے۔

سیر کے ساتھ صورت پر نظر صورت کو کوئی بیکار نہیں کہہ سکتا دیکھئے صورت بحری کے برابر ہے مگر صورت اور صفائی کی وجہ سے لوگ منگاتے ہیں کیونکہ صورت خوش دیکھ کر کسی چیز کا کھانا عجیب لطف دیتا ہے، اسی طرح کپڑوں میں ایک صورت ہے ایک معنی مقصود تو ستر عورت ہے اور گرمی و سردی سے بچنا اس میں ہر قسم کا کپڑا یکساں ہے، اور ایک صورت ہے یعنی کپڑے کی باریکی، نراکت اور نقش و نگار وغیرہ، ظاہر ہے کہ صورت محض بیکار نہیں بلکہ اس کے لئے بھی بڑی کوشش کی جاتی ہے۔ اور دیکھئے عورت کی ایک صورت ہے اور ایک معنی، معنی تو ہمبستری اور خانہ داری کا کام لینا ہے اس مقصود کے لئے ہر عاقل بالغ عورت کافی ہے۔ اور ایک صورت ہے کہ رنگ بھی اجلا ہونا کہ نقشہ بھی خوب صورت ہونا ان کی بڑی ہو اگر صورت بیکار ہے تو یہاں صورت پر کیوں مرتے ہو اور کیوں اس کے لئے خاک چھانی جاتی ہے اور اسی طرح ادویہ میں بہت چیزیں ایسی ہیں جو باہم یکساں خاصیت رکھتی ہیں مگر بعض دفعہ ادویہ کو صورت نوعیہ کی وجہ سے اختیار کیا جاتا ہے کیونکہ دوائیں بعض مؤثر یا خاصہ بھی ہوتی ہیں جیسے تملیق کہہ رہا خفقان کو نافع ہے تو ایسی ادویہ صورت نوعیہ کی وجہ سے مؤثر ہوتی ہیں یہاں صورت کا لحاظ کیوں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بہت سے الفاظ باہم متحد المعانی ہوتے ہیں مگر صورت کی وجہ سے ان میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ اس لئے بعض الفاظ ان کا آداب

ہے کہ محض الفاظ مقصود سمجھو اور معانی کو بیکار نہ محض معنی کو مقصود سمجھو اور الفاظ کو بیکار بلکہ قرآن کے الفاظ و معانی دونوں مقصود ہیں۔ (دیانۃ ۷)

(۴) فرشتوں سے سوال کہ میرے بندے کیا کر رہے ہیں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک دفعہ ہمارے متعلق ایک بات کہی تھی جس سے اب تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑا سواں سے پوچھ کر یہ جتلاتے ہیں کہ دیکھو یہ وہی تو ہیں جن کے بارے میں تم نے ایسا کہا تھا فرشتوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا فرشتوں نے کہا تھا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ مَا مَنَّ یُفْسِدُ فِیْہَا کہ آپ زمین میں ایسے کو خلیفہ بناتے ہیں جو اس میں فساد کرے ”مَن“ سے مراد عام تھا کہ وہ سب ایسے ہی ہوں گے سو وہ موجبہ کلیہ کے مدعی تھے۔ پس سالیہ جزئیہ ان کے مقابلے میں کافی ہو گیا یعنی ایک ایسے شخص کا پیش کر دینا جو مطیع کامل ہو ان کے موجبہ کلیہ توڑنے کے لئے کافی ہے۔ یہ نہیں کہ سارے مطیع کا ہوں تب ہی ان کا جواب ہو سکے سو فرشتے ایک دفعہ ہم پر اعتراض کرنے سے پکڑے گئے آج تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑا جب کوئی موقع ہوتا ہے تو حق تعالیٰ اجتلا دیتے ہیں اسی طرح فرشتوں کی بدلی ہوتی ہے عصر اور صبح میں، جو فرشتے عصر کے وقت آتے تھے وہ صبح کے وقت رخصت ہوتے ہیں اور ان بجائے دوسرے فرشتے آتے ہیں پھر وہ عصر کے وقت چلے جاتے ہیں اور دوسرے آجاتے ہیں جب واپس ہو کر جاتے ہیں تو ان سے پوچھا جاتا ہے کہ ہمارے بندے کیا کر رہے تھے وہ عرض کرتے ہیں یا الہی جب ہم تھے تھے جب بھی نماز پڑھ رہے تھے اور واپسی کے وقت بھی نماز پڑھتے چھوڑا۔ اللہ میاں دونوں وقت فرشتوں کو جتلا دیتے ہیں اور بدلی بھی خاص اس وقت کرتے ہیں جو ہرگز کا وقت ہے اور اسی وقت کی حالت پوچھتے ہیں کہ میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو حالانکہ فرشتے دیکھتے سب ہیں جو پھر بندے کرتے ہیں کیونکہ ان کی شان ہے یَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ مگر ان سے صرف اسی وقت کی حالت پوچھتے ہیں اور بلا پوچھے خود وہ کہہ نہیں سکتے۔ (الصلوۃ ۷۵)

(۵) لوح محفوظ کی وسعت پر شبہ کا جواب

ایک دفعہ ایک منکر غیبیات مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ لوح محفوظ کتنی بڑی مان لیجئے منکر کتنی تو ختم ہو جائے گی۔ ہزاروں لاکھوں برس ہو چکے بشمار چرب پیدا ہوئیں اور فنا ہوئیں کہاں تک لوح محفوظ میں لکھا گیا ہو گا۔ مولانا نے فرمایا کہ تمہارا ذہن ہے یہ کبھی ختم نہیں ہوتا اس میں تم نے کتنی چیزیں بھری ہونگی مگر وہ ابھی تک خالی ہے تو لوح محفوظ تو ذہن سے بہت بڑی ہے۔ ہاں واقعی اتنے سے ذہن میں کس قدر گنجائش ہے کہ دلی، ملکوتہ، زمین و آسمان سب کچھ سمایا ہوا ہے اگر حصول الاشیاء بافہسہار نہ مانئے تو باشباہہا کے قائل ہو جائے۔ تب بھی شبہ دلی کی دلی کے برابر تو ہوگی جیسا سوچنے سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ اسی ذہن چھٹانہ سہی کہ اشیاء یا اشباہ لطیف ہیں تب بھی اتنا بڑا آسمان اتنی بڑی زمین اتنی بڑی دلی، ذہن اتنا بڑا کہاں سے ہو گیا۔ تو لوح محفوظ میں تمام چیزوں کا سما جانا کیا مشکل ہے تو ذہن محض اس وسعت میں تو سب کا مشابہ لوح محفوظ کے ہے مگر علم صحیح سے خاص باعتبار علوم عالیہ کے بھی بالکل سہا منونہ لوح محفوظ کا ہو جاتا ہے۔ (روح البحار ص ۹)

(۶) مرجانی کے بعد عذاب قبر روح پر ہوتا ہے یا جسم پر

بات یہ ہے کہ وہ روح ہے جس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا ہے رہا یہ کہ روح مجرد ہے یا مادی ہے بعض اہل کشف کا قول ہے کہ مجرد ہے اور بعض متکلمین اس طرف گئے ہیں کہ مادی ہے اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ مجرد و خواص واجب سے ہے لیکن یہ دعویٰ خود بلا دلیل ہے بلکہ خواص واجب سے قدم اور وجوب ہے سو جو حکما مجردات کے قائل ہوئے ہیں وہ مجردات میں قدم بھی مانتے ہیں۔ یہ بیشک باطل ہے باقی اگر روح کو مجرد کہا جائے اور حادث بالذات و بالزمان بھی مان لیا دے تو کون سی دلیل عقلی کے خلاف ہے عرض بعض متکلمین تو سوائے واجب کسی چیز کے مجرد ہونے کے قائل نہیں۔ اور صوفیہ کرام کئی چیزوں کے مجرد کے قائل ہوئے ان کو لفظ کہتے ہیں۔ جیسے روح، قلب، سیرخی و اخفی۔ اور کہتے ہیں کہ انسان جس طرح

عنصر مرکب ہے اسی طرح ان اجزاء مجروحہ سے بھی ہے اور اس پر یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ ہم نے غلوات اور مراقبات میں مجردات کا مشاہدہ کیا ہے سو جب تک قرآن حدیث کے خلاف نہ ہو کیونکہ اس کا انکار کر سکتے ہیں تو اگر روح مجرد ہے تو اس پر البتہ بیٹھا صادق نہیں آتا۔ مگر صوفیہ اس کے قائل ہوئے ہیں کہ دوسرا بدن جو مشابہ اسی بدن عنصری کے ہوتا ہے عالم برزخ میں دیا جاتا ہے تو جس طرح یہ حی تھا وہ بھی حی ہے سب عذاب و ثواب اس پر ہوتا ہے اور اس بدن کی طرح اسے بھی حس ہوتی ہے کیونکہ اس کا مادہ لطیف ہوتا ہے۔ (روح المعانی ج ۱ ص ۱۳)

۱) بارہ روح کا ثبوت قرآن مجید سے دینا صحیح نہیں

فرمایا منجمن با حکما نہیں کسی شخص نے ان کو زمرہ حکماء میں نہیں شمار کیا، حکماء وہ لوگ ہیں جنہیں حقائق و اصول اشیاء معلوم کر کے دلائل عقلی و براہین قطعی سے ثبوت دیا اور اہل نجوم محض تخمینات و قہمات و خرافات سے کام لیتے ہیں کسی دعویٰ پر دلیل قائم نہیں کر سکتے، محض دہیات و خرافات سے کام لیتے ہیں۔ دلائل تو دلائل عبادی بھی نور علی نور ہیں اور ہمارے بعض مفسر نے غضب ہی کیا ہے کہ بعض آیات کی تفسیر ان کے اقوال پر مبنی کر دی بعض اصطلاحات ایسے مشہور و معروف ہو جاتے ہیں کہ ان سے اصغر و اکبر کوئی نہیں بچتا۔ الا ماشاء اللہ چنانچہ بعض مفسرین نے تو قرآن شریف میں بروح سے بارہ روح اہل ریاضی کے مراد لئے ہیں۔ حالانکہ وہ خود اجزاء تھیں جو حقیقی نہیں۔ اور متبادر قرآن سے ان کا وجود حقیقی ہے پس بحیثیت تفسیر صحیح نہیں۔ سیدھی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے فرماتے ہیں کہ بروح سے مراد کواکب عظام ہیں۔ نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال کو چھوڑ کر اہل ریاضی کی تقلید قرآن مجید میں کی خود قرآن مجید میں دو کے مقام پر ہے ولو کنتم فی سبر و روح مشیدۃ اس سے مراد تانید ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہوتی ہے۔ اور بعض نے ہینات و نجوم دونوں کو مخلوط کر دیا یعنی ان بروح کے ساتھ خاص خاص کواکب کو نقص بھی کر دیا ہے جس کی بنا محض خرافات نجومیہ ہیں ورنہ اہل ہیئت بعض کواکب کو بعض بروح سے مختص نہیں سمجھتے۔ بلکہ ہر کواکب ہر برج

میں گردش کرتا ہے البتہ نجوم کہتے ہیں کہ بعض کواکب بعض بروح کے ساتھ مختص ہیں اور دلیل وہ پھر یوح کہ ناگفتہ بہ، کہتے ہیں کہ مثلاً ایک برج ہے جس میں کچھ کواکب ثابت جمع ہو کر بشکل اسد و ہوم ہو گئے۔ اس طور سے اپنے خیال میں سوچا اس کا نام اصطلاحاً اسد رکھ دیا تھا۔ ان عقل کے دشمنوں نے یہ گھڑ لیا کہ اسد حار المزاج ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کواکب حار کو شمس سے مناسبت ہے۔ بھلا کیا محض نام سے اس برج میں حرارت آگئی، ان کی عقل کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ اس دلیل سے اسد کے ساتھ شمس کو مختص کر دیا۔ (از ملفوظات ہفت اختر ملفوظ نمبر ۱۲)

۸) آیات کی تفسیر قواعد ہیئت پر ہے۔

فرمایا علماء اسلام کے کلام جو بعض نصوص متعلقہ کو ان کے قواعد ہیئت پر تطبیق پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے بعضے۔۔۔ اقوال مشہورہ ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور ان الفاظ کے سننے ہی بتا دیتے ہیں کہ ان معانی اصطلاح کی جانب ہو جائے گا وہ لفظ مراد نہ ہوں اس سے عام قلوب میں ان امور غیر ثابت بالدلیل کی وقعت ہو جاتی ہے پس نصوص کو بھی ان پر منطبق کرنے لگتے ہیں حالانکہ ان کے دعویٰ کی خود ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ کتب ہیئت میں مصرح ہے کہ شمس کو سہارایع بر مانا جاتا ہے لیکن خود ہمارے پاس اس کی کوئی حجت نہیں۔ اسی طرح بعض نے ثوابت کو ہر ایک کو ہر ایک آسمان میں مانا ہے۔ ان احتمالات کے ہوتے ہوئے ان پر تفسیر قرآن کو مبنی کرنا محض غیر موجب ہے بلکہ ان سب کے خلاف ان نصوص کی تفسیر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سب کواکب و ثوابت و سیارہ و شمس و قمر سہار دنیا میں ہیں اور سب متحرک بالذات ہیں اور ہر ایک کی حرکت علیحدہ ہے اور ثوابت کی حرکت خواہ ذاتیہ اور متشابہ ہو یا آسمان دنیا کے اندر کوئی جزو ایسا ہو جو ان سب کو لے کر حرکت کرتا ہو اور سہار خواہ متحرک ہو یا نہ ہو۔ البتہ جن کواکب کی چند حرکتیں محسوس ہوتی ہیں ان میں سے کسی ایک حرکت کو بالعرض کہیں۔

قرآن شریف سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کواکب سہار دنیا پر ہیں اور یہ متحرک بالذات نہیں وَلَقَدْ دَرَّيْنَا السَّمَاءَ الدُّنْيَا مَصَابِجَ وَحَوِّلْنَاهَا لَآلِئًا وَهِيَ

خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ط۔ اور کل فی فلک سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ہر کوکب جدا آسمان میں ہے کیونکہ فلک اور سماں مترادف نہیں ہیں۔ فلک کہتے ہیں دائرہ کو اور بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوکب کی حرکت سے دائرہ ضرور پیدا ہوتا ہے خواہ تحقیق یا تقریبی اور شریعت سے حرکت سماں ثابت نہیں بلکہ آسمان میں کوکب کی حرکت مثل مچھلیوں کی حرکت کے پانی میں ہے اور جو حکماء نے جو فلک کو بہت سخت صعب مان کر امتناع عرق والتیام کا حکم کیا ہے محض اپنے خیال سے گھڑ گھڑ کر باوجود عدم ثبوت مقدمات کے پھر حکم جازم کر دیا۔ چنانچہ متکلمین نے کتب کلامیہ میں ان مقدمات کا جواب دیا ہے۔ (ایضاً ملفوظ نمبر ۱)

(۹) قرآن وحدیث کا جو مطلب کے علماء بیان کرتے ہیں

وہی درست ہے

اس شبہ کے اٹھانے کے لئے دوسری نظیر دیتا ہوں کہ قانون وہ ہے جو کو پارلیمنٹ نے تجویز کیا ہے اور اس کے معنی وہ ہیں جو کنج سمجھتے ہیں کیونکہ آپ سے براہ راست تو خط و کتابت ہی نہیں جو وہ خود آپ سے اس کے معنی بیان کرتے بس جن لوگوں کو انہوں نے قانون فہمی کا اہل سمجھ کر عہدہ دیا ہے وہ جو معنی قانون کے بیان کریں اس کو ماننا پڑے گا کہ قانون کے درحقیقت یہی معنی ہیں۔

دیکھئے جب ایک ہائی کورٹ کا جج ایک فیصلہ دیتا ہے تو کیا اس وقت آپکا یہ کہنا قابل سماعت ہوگا کہ قانون کے یہ معنی نہیں جو تم نے سمجھے۔ ہرگز نہیں۔ اور اگر کوئی ایسا کرے کہ اس کے ساتھ کلنچ ہو اور حکم نہ مانے تو اس کو قانون کی مخالفت قرار دیا جائے گا اور اس کے لئے سزائے جیل تجویز ہوگی اگر اس وقت آپ کہیں کہ صاحب آپ حکم ہی نہیں سمجھتے قانون کے یہی معنی ہیں جو میں سمجھتا ہوں تو کیا آپ کے اس کہنے کی سماعت ہوگی؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ جواب ملے گا کہ تم اپیل کرو، ماسود دیکھئے کہ ہائی کورٹ کے جج قانون سمجھنے والے تسلیم کر لئے گئے ہیں اور جو یہ قانون کے معنی بیان کریں اس کی مخالفت قانون ہی کی مخالفت قرار دی گئی ہے کیونکہ پارلیمنٹ

کے حکام ہر مقدمہ کا فیصلہ خود تو کرتے نہیں بلکہ وہ اصول کلیہ بنا دیتے ہیں اس لئے قانون کے سمجھنے والے ہائی کورٹ کے جج قرار دیے گئے ہیں تو ہر جج کہ ہائی کورٹ کی مخالفت کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ میں پارلیمنٹ کا خلاف نہیں کرتا۔ بلکہ جو یہ اس قانون کا معنی بیان کرتے ہیں اس کا خلاف کرتا ہوں۔ مگر اس کا یہ عذر نہ سنا جائے گا اور اس کو پارلیمنٹ ہی کا مخالف سمجھا جائے گا بس ایسے ہی حضرات ائمہ مجتہدین چونکہ قرآن وحدیث کے سمجھنے والے مان لئے گئے ہیں اسلئے ان کی مخالفت خدا اور رسول کی مخالفت ہے گو حدیثیں کسی شخص کو ان سے زیادہ معلوم ہوں مگر کثرت معلومات سے مجتہد نہیں ہو سکتا۔

شاہد اُن نیست کہ موئے ویمانے دارد
بسنده طلعت آں باش کہ آنے دارد

مجتہدین کی شان
مجتہدین کو حق تعالیٰ نے ایک خاص شان عطا فرمائی ہے۔ اب کوئی اللہ میاں سے لڑے کہ ان کے اندر یہ قابلیت کیوں رکھی اور ہمارے اندر کیوں نہیں رکھی تو یہ بات ہم سے پوچھنے کی نہیں خدا سے تعالیٰ سے پوچھئے، پھر یہ بھی پوچھ لینا کہ انبیاء کو نبوت دی مجھے کیوں نہیں دی ایک وہ نظم ہے کہ فلاں کو دوی پیغمبری:۔

”میری باریکیوں دیر انتہی کری“

اول نظم سے آخر تک خدا کی شکایت ہے تو اگر ایسی ترقی ہے تو خدا خیر کرے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ
آئیں کہ تو نگرمت نمی گرداند
او مصلحت تو از تو بہتر داند۔

غرض یہ کہ خدا تعالیٰ نے مجتہدین میں ایک کمال پیدا کیا ہے، جو ہم لوگوں میں نہیں ہے اور اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اس وقت قرآن سے تم چند ایسی جہیزات استنباط کرو جن کا حکم فقہاء کے کلام میں نہ دیکھا ہو پھر اول معاملات میں فقہاء کا قول دیکھو اور اپنے استنباط کو ان کے استنباط کے ساتھ موازنہ کر دو تب معلوم ہوگا کہ فقہاء اور مجتہدین کی شان کیا ہے مگر اس کے لئے بھی ضرورت ہے کی۔ سو ایسا کرنے پر بہت آسانی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم میں اور ائمہ مجتہدین میں کتنا بڑا فرق ہے پس اس تفادیت کی وجہ سے عوام کی تو ایسی مثال ہے جیسے عام رعیت اور علماء

کی ایسی مثال ہے جیسے وکلاء اور ائمہ مجتہدین، جیسے ہائی کورٹ کے جج پس جب ایک رعیت کو ہائی کورٹ کے جج بلکہ ایک معمولی جج کی مخالفت جائز نہیں تو عوام کو علماء کی مخالفت کب جائز ہوگی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مولویوں سے غلطی نہیں ہوتی بلکہ موجدانی ہے مگر اس کا پکڑنا عوام کا کام نہیں ہے بلکہ علماء ہی کا کام ہے اور جب تک کہ ایک متدین عالم کا فتویٰ بلا تعاون موجود ہے۔ عامی کے ذمہ واجب ہے کہ اس کا اتباع کرے تو اب اس کے کہنے کی کہاں گنجائش رہی کہ میں تو علماء کی مخالفت کرتا ہوں خدا اور رسول کی مخالفت نہیں کرتا۔ پس معلوم ہوا کہ علماء کی مخالفت کسی طرح جائز نہیں حتیٰ کہ اگر آپ کے سامنے ترجمہ حدیث کا موجود ہو جب بھی آپ کو علماء کی مخالفت جائز نہیں کیونکہ ترجمہ سمجھنے کے لئے بھی علم کی ضرورت ہے جسے کہ قانون کا ترجمہ ہو گیا ہے مگر پھر بھی کوئی شخص جج کی مخالفت میں اپنی رائے نہیں پیش کر سکتا گو وہ کسی کتاب کے پیش کرنے کے ساتھ ہو اور اگر کرے تو اب بھی اس کا وہی حال ہوگا جو قانون کے ترجمہ ہونے کی حالت میں ہوتا یعنی قانون کا مخالفت قرار دیا جائے گا۔ تو اسی طرح اگرچہ حدیث کا ترجمہ ہو گیا ہے مگر پھر بھی آپ کو اجتہاد کرنا اور علماء سے مزاحمت جائز نہیں اور جس طرح حکام کی مخالفت کرنا اولاد میں گورنمنٹ کی مخالفت کرنا اولاد ہے اسی طرح علماء کی مخالفت کرنا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مخالفت کرنا ہے اور علماء کی مخالفت کر کے یہ عذر کرنا کہ ہم خدا اور رسول کے خلاف نہیں کرتے، نہایت نازیبا اور پھر عذر ہے۔

الحمد للہ امر بہت خوبی کے ساتھ طے ہو گیا اور آپ کو معلوم ہو گیا **علماء کی پیروی** کہ آپ کو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ علماء کا اتباع کریں میں کہتا ہوں کہ آپ کو علم دین سے اتنی بھی مناسبت نہیں جتنی کہ ہر شخص کو طب کے ساتھ ہوتی ہے۔ چونکہ طب سے تو ہر ایک شخص کو کم و بیش مناسبت ہوتی ہے اور تجربہ بھی ہوتا ہے۔ برخلاف علم دین کے کہ وہاں کسی تجربہ کام نہیں دیتا تو جتنی طب کے ساتھ مناسبت ہے اتنی بھی دینیات کے ساتھ نہیں مگر باوجود اس کے کتنا بڑا کوئی شخص ہو۔ مگر جب بیمار ہوگا طبیب ہی سے رائے لے گا۔ کبھی طب کی کتابیں دیکھ کر سہل نہ لے گا اگر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ صفر کا فساد ہے جب بھی اپنی

رائے سے علاج نہیں کرے گا۔ لیکن کسی نے ایسا کیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کی ہمت نہیں ہوتی اگر کوئی یہ رائے دے بھی کہ طبیب کی کیا ضرورت ہے تو نہ کہیں گے کہ بغیر طبیب کے علاج نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنی عقل اور رائے سے خدا جانے کیا خرابی پیدا ہو۔ اس کے راز سے طبیب ہی واقف ہیں۔ پس طب میں تو باوجود مناسبت ہونے کے اپنی رائے کا اعتبار نہیں ہوتا۔ مگر علم دین میں باوجود مناسبت نہ ہونے کے ہر شخص اجتہاد کرنے لگتا ہے تو گویا شریعت کوئی راز ہی نہیں ہے اور وہ ایسی یا مال اور معمولی شے ہے کہ اس کے لئے علم کی ضرورت ہی نہیں کہ ہر شخص خود اس کو سمجھ سکتا ہے حالانکہ جیسے وہاں کوئی کیسا ہی عاقل سے عاقل ہو۔ مگر بدو و اتباع طبیب کے چارہ نہیں اسی طرح امور شریعت میں سوائے اتباع علماء دین کے چارہ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ غیر ماہر کو ماہر کا اتباع کرنا ضروری ہے پس عقلی طور پر ثابت ہو گیا کہ علماء کا اتباع آپ کو ضروری ہے اور وہ جو احکام بتلاتے ہیں۔ وہ درحقیقت خدا اور رسول کے احکام ہیں پس جب یہ خدا اور رسول کے احکام ہیں تو ہر مسلمان کو ان کا اتباع کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے خدا اور رسول کا اتباع کرنا ضروری ہے۔ (اتباع المنیب ص ۱۴)

طاعون میں اعمال کی خرابی

آج کل تو اس مذاق ہی کے لوگ کم ہیں جو ان مصائب کو اعمال کی خرابی کی منسوب کریں، بلکہ بہت لوگ ان کو اسباب مادیہ کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ ہوا بگڑ گئی اس سے طاعون ہو گیا۔ میں اس کا انکار نہیں کرتا کہ طاعون میں ہوا بگڑنے کو دخل نہیں ممکن ہے کہ اس کو بھی دخل ہو مگر میں یہ کہتا ہوں کہ آپ شریعت کے بتلائے ہوئے سبب کا کیوں انکار کرتے ہیں کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک چیز کے متعدد اسباب ہوں۔ ایک سبب قریب ہو ایک سبب بعید۔ ایک سبب ظاہری ہو ایک سبب حقیقی ہو آپ کہتے ہیں ہوا بگڑنے سے طاعون ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ظاہری سبب ہے۔ حقیقی سبب اس کا یہ ہے کہ آپ نے گناہوں کی کثرت کی اس کا انکار آپ کس دلیل سے کرتے ہیں۔ میں اس مقصود کے واضح کرنے کے لئے ایک مثال بیان کرتا ہوں اس سے آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ ظاہری سبب اور حقیقی سبب میں کیا فرق ہے۔

مثلاً ایک شخص کو پھانسی ہوگئی اور وہ مر گیا اب دو شخصوں میں گفتگو ہوئی کہ اس کی پھانسی کا سبب کیا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ صرف اس کا سبب یہ ہے کہ وہ کسی طرح سے تختہ کے اوپر پہنچ گیا اور شبی پھندا اس کے گلے میں پڑ گیا پھر کسی طرح تختہ اس کے نیچے سے الگ ہو گیا تو اس کا گلا گھٹ گیا اور مر گیا۔ ایک دوسرے شخص نے کہا کہ اس پھانسی کا سبب یہ ہے کہ اس نے ایک جرم کیا تھا۔ اس وجہ سے اس پر حاکم نے ناراض ہو کر پھانسی دلا دی۔ تو کیا اس پر وہ پہلا شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ تم سائنس کے منکر ہو کہ اس کی موت کا سبب تو اخلاق (یعنی گلا گھٹ جانا) اور تم جرم کو اس کا سبب بتلاتے ہو کیا اس جرم نے اگر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ اعتراض کبھی نہیں کر سکتا اور اگر کوئی احمق یہ اعتراض کرے بھی تو تمام مخلوق اس کو پاگل بنا دے گی اور یہ کہنے کی تیرا یہ کہنا صحیح ہے کہ موت کا سبب اخلاق ہے مگر اس کا اصلی سبب تو حاکم کا حکم ہے اور اس حکم کا سبب اس کا جرم ہے۔

غرض اس اختلاف میں ہر عاقل یہی کہے گا کہ وہ شخص سچا حق پر ہے جو یہ کہتا ہے کہ اس سبب طبعی کا سبب خود اس کا فعل ہے ورنہ پھانسی تو پہلے سے بھی موجود تھی۔ پہلے سے وہ کیوں نہ مر گیا۔ اور اب بھی موجود ہے پھر اس سے روزانہ موتیں کیوں نہیں ہوتیں۔ تو صاحبو! غضب کی بات ہے کہ اس شخص کو تو محقق سمجھا جاوے کہ علماء کو جو کہ طاعون کا سبب آپ کے گناہوں اور افعال کی خرابی کو بتلاتے ہیں۔ غیر محقق کہا جاوے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جس کو کوتاہ نظر کہا جاتا ہے اسی کی نظر کو دوسری جگہ عالی نظر کہا جاتا ہے۔ غضب ہے کہ دین ہی کے موقع پر سب لوگ بیہوش ہو جاتے ہیں۔

اس پر مجھے ایک دوست کی بیان کی ہوئی حکایت یاد آئی۔

ایک حکایت

ہے کہ انہوں نے لاہور کے پاگل خانے میں ایک مجنون کو دیکھا کہ وہ سبب باتیں ٹھکانے کی کرتا تھا جس سے کسی کو بھی نہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ پاگل ہے مگر جہاں اس کا نام اس کے سامنے لیا گیا اس پر جنون سوار ہوا۔ یہی حالت آجکل ہمارے بھائیوں کی ہے کہ جب تک ان کے سامنے دین کا نام نہ لو تو عاقل بھی سمجھدار بھی سب کچھ ہیں مگر جہاں دین کا نام کسی نے لیا اور وہ کوتاہ نظر ہوا۔ صاحبو!

آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جو شخص پھانسی کا سبب دیکھتی بتلاتا ہے اس کو تو تم عاقل کہتے ہو اور اسی کی نظر وہ عالم شریعت ہے جو طاعون کا سبب آپ کی بد عملی کو بتاتا ہے یہ شخص عالی نظر کیوں نہیں چونکہ یہ دین کا معاملہ ہے اس لئے اس میں علماء کو کوتاہ نظر سمجھا جاتا ہے اور اس شخص کو عالی نظر سمجھا جاتا ہے جو جراثیم و طاعون کا سبب بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اچھا ہم نے مانا کہ طاعون کا سبب آب و ہوا کا خراب ہونا ہی سہی لیکن یہ تو بتاؤ کہ آب و ہوا کے خراب ہونے کا سبب کیا ہے اگر اس کا کوئی بھی سبب ہے تو پھر اس کا کیا سبب ہے کیونکہ ہر حادثہ کی انتہا ایک قدم پر ضروری ہے تو اس کی انتہا بھی قدیم ہوگی اور قدیم پر انتہا نہ مانو تو تسلسل لازم آئے گا کیونکہ ہر حادثہ علت اور سبب کا محتاج ہوتا ہے اور تسلسل محال ہے تو منتہا ہونا ضروری ہے اور منتہا ہونے کے قابل سوائے مشیت الہی کے اور کوئی چیز نہیں تو جس طرح حاکم نے پھانسی کا حکم دیا تھا جس سے مجرم ملاک ہوا اسی طرح حق تعالیٰ نے کارکنانِ قصار و قدر کو حکم دیا کہ اب دہو کہو خراب کر دو۔ انہوں نے آب و ہوا خراب کر دی جس سے جو ہے مرنے لگے اور طاعون پھیل گیا۔ اب جیسا کہ دہاں ایک سے مجرم کی ضرورت ہے جو یہ بتلا دے کہ چونکہ اس شخص نے جرم کیا تھا۔ اس وجہ سے حاکم نے پھانسی کا حکم دیا اسی طرح یہاں بھی ایک سے مجرم کی ضرورت ہے جو یہ بتلا دے کہ گناہوں کی وجہ سے یہ بلائیں نازل ہوئی ہیں۔ تو سنو! وہ سچا صرف قرآن ہے جس میں حق تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے۔ وَمَا آصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فِيمَا كَسَبَتْ وَيعُوْنُ كَثِيْرٌ کہ تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تمہارے ہاتھوں کی گرفت سے پہنچتی ہے اور حق تعالیٰ بہت سے گناہوں سے درگزر بھی کرتا ہے ہیں پس یہ کیوں نہ کہا جاوے کہ سبب اس طاعون کا ہماری بد عملی اور سیہ کاری ہے (الاسراف ص ۱)

(۱۱) مصیبت اگر گناہوں کی وجہ سے آتی ہے تو کفار پر آنی چاہیے

مصائب کا سبب جیسا کہ گناہ ہے اسی طرح رفع درجات بھی اس کا سبب ہے بعض دفعہ امتحان اور آزمائش کے لئے اور درجات بلند کرنے کے لئے بھی بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ سنئے! حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اَمْحَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِي خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ النَّارُ وَالضَّلَاءُ وَكَرِهُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ اَلَا اَنْ نَصْرُ اللَّهِ قَرِيبٌ ط (۱۱)

ترجمہ: کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ جنت میں دیسے ہی داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک اس کی وہ حالت پیش نہیں آئی ہے جو پہلے لوگوں کو پیش آچکی ہے کہ ان کو طوائف اور تکلیف پہنچی اور وہ یہاں تک جھڑ جھڑائے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ والے مسلمان کہنے لگے کہ دیکھئے اللہ کی مدد کب آتی ہے تو سن لو اللہ کی مدد قریب ہی ہے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں۔ حتیٰ اذا استنيس الرسول وظنوا انهم قد كذبوا جاءهم نصرنا فنجي من نشاء ولا يرد بأسنا عن القوم المجرمين۔

ترجمہ: یہاں تک کہ جب رسول ناامید ہو گئے اور کفار نے گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا اس وقت ہماری مدد آئی تو جن کو ہم نے جن کو چاہا ان کو نجات دی گئی اور باقی لوگ ہلاک کئے گئے اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ٹل نہیں سکتا۔

ان آیتوں سے حاصل مشترک اتنا ثابت ہوا کہ پہلے زمانے میں حضرات مقبولین پر اور ان سے بڑھ کر رسولوں کا طبقہ ہے جن میں معصیت کا احتمال ہی نہیں ان پر ایسے ایسے مصائب آئے کہ رسول گھبرا کر کہنے لگے مٹی نصر اللہ کہ خدا کی مدد کب آئے گی حتیٰ اذا استنيس الرسول ای من ایمان قوم مہم۔ یہاں تک کہ رسول اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو گئے اور انبیاء علیہم السلام کی یہ حالت نہ تھی کہ ایک وعظ کہہ کر جو دیکھا کہ لوگ جنید نفاذی نہیں ہوئے تو ان کی اصلاح سے ناامید ہو جائیں بلکہ حالت یہ تھی کہ ایک مدت مدید تک وعظ کہہ کر بھی ناامید نہ ہوتے تھے۔ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو نصیحت کی اور ناامید نہ ہوئے۔ جب اتنی مدت میں بھی ان پر

کچھ اثر نہ ہوا تب ان کے ایمان سے مایوس ہوئے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کتنی مدت دراز تک اپنی قوم سے مایوس نہ ہوتے تھے تو اتنی طویل مدت کے بعد نصرت خداوندی نازل ہوتی تھی اور اس وقت تک انبیاء اور مومنین مصیبتیں ہی جھیلنے لگے وظنوا انهم قد كذبوا کی تفسیر میں بہت اقوال ہیں اور بعض سخت اور مشکل ہیں۔ مگر سہل یہ ہے کہ ظنوا کی ضمیر کفار کی طرف راجع ہے مطلب یہ ہے کہ کفار نے یہ کہا کہ ہم مکذوب ہیں یعنی رسولوں نے جو ہم کو عذاب کی دھمکی دی ہے وہ جھوٹ بات ہے اگر سچی ہوتی تو اس مدت دراز میں عذاب کے کچھ تو آتا معلوم ہوتے۔

غرض ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور پہلے انبیاء پر مصائب مقبولین ایک مدت تک دستہم الباسار والضرار کی حالت میں اور ایسی ایسی بڑی مصیبتوں میں رہے کہ ایسی مصیبتیں ہم لوگوں کو کبھی پیش بھی نہیں آتیں مگر آج ترکوں کی ذرا سی حالت میں لوگوں کو خدا تعالیٰ سے بدگمانی ہونے لگی۔ یاد رکھو! خدا تعالیٰ پر کبھی کسی کو بدگمانی کا حق نہیں۔ ان کی حکمتوں کے راز کسی کو کیا معلوم۔ آپ اپنے خاندان کی معاملات کے راز اپنے نوکر وں کو نہیں بتلاتے تھے حالانکہ آپ میں اور ان میں بہت تقارب ہے مگر اس کے باوجود بھی اپنا بھید آپ نوکر وں کو نہیں بتلاتے تو خدا کیوں آپ کو اپنے معاملات کے راز بتلا دیں آپ میں اور خدا میں تو کچھ بھی مناسبت نہیں ہے چہ نسبت خاک را با عالم پاک، اسی کو حافظ فرماتے ہیں۔

۱۔ حدیث مطرب دی گو دراز دہر کمتری جو کہ کس نکشود نکشاید حکمت این مہمار

بہر حال حق تعالیٰ کی حکمتیں ہیں جن کی وجہ سے مقبولین پر بھی وہ مصائب نازل کرتے ہیں۔

جان صدیق ازیں حسرت برخت کا سماں برفرق ایشان خاک بخت
زاں بلاہا کا نبیاء برداشتند سز پرخ ہفتیں افراشتند۔

۲۔ جس زمانے میں یہ وعظ ہوا تھا اس زمانے میں ترکی جگ کفار سے جاری تھی۔ بعض دفعہ بہت متوحش خبریں آتی تھیں کہ ترک مغلوب ہو گئے۔ ۳۔ محمد علی

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال مرع زیرک چوں بدام افتد تحمل بایش
اے اسی کی تمیم کے لئے کہتے ہیں

تیکہ بر تقویٰ و دانش در طریقت کافریت

راہ و گمراہ ہندو دار و توکل بایش

یہ اسی لئے کہا ہے کہ کبھی ذکر کو یہ خیال ہو جاتا ہے کہ میں اتنا کام کرتا ہوں اتنا جاہل
کرتا ہوں پھر یہ پریشانی کیوں ہے تو کہتے ہیں

”راہ و گمراہ ہندو دار و توکل بایش“ (الاسراف ص ۱۶)

خلاصہ یہ ہے کہ مقبولین پر بھی کلفتیں آتی ہیں ظاہر پرستوں کو اس سے شبہ
ہو جاتا ہے کہ اگر گناہوں کی وجہ سے مصیبتیں آتی ہیں تو انہوں نے کیا گناہ تھا بلکہ دنیا میں
دیکھا جاتا ہے کہ نیک بندے اور مقبولین کو فقر و فاقہ وغیرہ کی تکلیف زیادہ رہتی ہے اور
زندہ بازاری لوگ ہر طرح عیش اور مزے میں زندگی گزارتے ہیں۔ یعنی ظاہری عیش ان
کو زیادہ ہوتا ہے کھانے پینے میں تنگی نہیں ہوتی مگر یہ شبہ لغو ہے کیونکہ دنیا میں عادیۃ اللہ
یہ ہے کہ سب نعمتیں ایک شخص کو نہیں دی جاتی کسی کو ظاہری عیش نصیب ہوتا ہے
کسی کو باطنی عیش عطا فرماتے ہیں ایسے بندے بہت کم ہیں جن کو دونوں عیش نصیب
ہوں اسی کو ایک نحق کہتے ہیں

ہ کم عاقل عاقل اعیت مذاہب : و جاہل جاہل تلقاہم زوقا

ہذا الذی تزک الاوہام حائرۃ : و صیر العالم الغیر ذندیقہ

خوشحالی و بدحالی یعنی دنیا میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض عاقل کامل تنگی میں ہیں کہ
ان کو کوئی ذریعہ معاش میسر نہیں، اور جاہل کامل صاحب
نصیب اور وسعت رزق سے مالا مال ہے۔ اس بات نے عقلوں کو حیران کر دیا۔
اور بعض متبحر عالم اس سے زندیق ہو گئے۔ نعوذ باللہ من ذلک

ایک واقعہ سویملا ایسا باریک ہے کہ اس سے ہزاروں عالم بدین ہو گئے
مگر جس کو خدا بچائے وہ بچ سکتا ہے۔ اس بچنے پر مجھے ایک
حکایت یاد آگئی کہ ایک درویش تھے جو چلے جا رہے تھے۔ ایک ہریں پہنچے تو
وہاں پھاٹک بند دیکھا۔ پوچھا کہ بھائی پھاٹک بند کیوں ہے۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ کا

درجات کی بلندی یہ گویا رفع درجات ہے ان بلاؤں سے مقبولین کے درجے بلند
ہوتے ہیں، نیز اس میں مجاہدہ اضطراب بھی ہے کہ صاحب اخلاق

درست ہو جاتے ہیں نفس کی اصلاح بہت کچھ ہو جاتی ہے۔ جب ہم لوگوں کو اپنے نفس
کی اصلاح اور درستگی اخلاق کی خود فکر نہیں ہوتی تو حق تعالیٰ مجاہدہ اضطراب سے ہماری
اصلاح فرماتے ہیں۔ آپ ان شکستوں کی خبروں سے یہ سمجھتے ہیں کہ ترک مغلوب ہو گئے
مگر آپ کو کیا معلوم ہے کہ اس سے جو ان کی نفس کی اصلاح ہوتی ہوگی وہ کتنی فتوحات
کا پیش خیمہ ہوگی ہی حال طاعون میں سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں میں طاعون کا زیادہ پھیلنا اس کی
دلیل نہیں ہو سکتا ہے کہ معاذ اللہ مسلمانانہ خدا تعالیٰ کے نزدیک ان کافروں سے بھی زیادہ
ذلیل ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ کبھی مسلمانوں کے درجے بلند کرنے اور ان کو شہادت کے
مرتبے دینے منظور ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں طاعون زیادہ پھیلتا ہے۔ حدیث
میں صاف تصریح ہے المطعون مشہد یعنی طاعون میں مرنے والا شہید ہے
اسی لئے جو لوگ اس راز کو سمجھتے ہیں وہ ہر بلا سے خوش ہوتے ہیں نہ وہ شکست
و ہزیمت سے گھبراتے ہیں نہ طاعون سے پریشان ہوتے ہیں اور یوں کہتے ہیں
ناخوش تو خوش بود بر جان من۔

دل ندائے یار دل رنجان من۔

اور دوسروں کو بھی اسی کی وصیت کرتے ہیں کہ محبوب حقیقی سے راحت میں اور
رنج میں غرض ہر حال میں خوش رہنا چاہیے

سے بس زبون و سوسہ باشی ولا : گر طرب را باز دانی از بلا۔

یعنی دونوں حالتوں میں کچھ فرق نہ ہونا چاہیے یہ سمجھ کر کہ ہر حالت محبوب ہی کی
طرف سے ہے دونوں پر راضی رہنا چاہیے تو خواہ کلفت ظاہری ہو یا باطنی وہ ہر ایک
پر راضی رہتے ہیں اور باطنی کلفت پر راضی رہنا بہت بڑا صبر ہے کیونکہ ظاہری کلفت
میں صرف جسم کو تکلیف ہوتی ہے روح کو بشارت رہتی ہے اور باطنی کلفت میں یہ دم
ہو جاتا ہے کہ میں مردود ہو گیا جیسا کہ حالت قبض میں ایسا ہوتا ہے اور یہ خیال سالک
کے لئے سخت سہانہ روح ہے مگر وہ اس پر بھی راضی رہتے ہیں

باغبان گر پنج روزے بخت گل بایش بر جھائے خار ہجران صبر بلبل بایش

باز چھوٹ گیا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ شہر بڑا ہ کے دروازے بند کر دیے جائیں تاکہ باز باہر نہ چلا جائے۔ درویش کو بادشاہ کی حماقت پر بہت تعجب ہوا۔ یہ نازیں آکر کہنے لگے کہ واہ اشرمیاں نے اچھے کو بادشاہی دے رکھی ہے۔ ایک ہم ہیں کہ پاؤں میں جھٹیاں تکسالم نہیں۔ بعض اہل اللہ بر ناز کی شان غالب ہوتی ہے۔ وہاں سے ارشاد ہوا کہ کیا تم اسیر راضی ہو کہ اس کی سلطنت مع اس کی حماقت کے تم کو دیں، اور تمہاری صلاحیت اور عقل مع تمہارے فقر و فاقہ کے اس کو دیدیں۔ درویش ڈر گیا اور کانپ گیا کہ کہیں ۔۔۔ ساری عمر کی کمائی سلب نہ ہو جائے۔ اللہ میں اس پر راضی نہیں ہوں میں اپنی حماقت سے توبہ کرتا ہوں۔

سو واقعی عقل وہ دولت ہے جس کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت گر دے اگر ایک عاقل تنگدست ہو اور ایک بیوقوف مالدار ہو تو عاقل کو غور کرنا چاہیے کہ میرے پاس عقل کی کتنی بڑی دولت ہے۔ (ایضاً ص ۱۶۷)

عقل کا تبادلہ دولت ہے۔ الغرض ان درویش کو یہ کہا گیا تھا کہ کیا تم راضی ہو کہ تمہارا فقر و فاقہ اور صلاحیت اور علم بادشاہ کو دیدیا جائے اور اس کی سلطنت اور حماقت تم کو دیدی جائے اسی طرح جو لوگ کفار کی ثروت اور عیش کو دیکھ کر اور اپنی مصیبت و تکلیف پر نظر کر کے لہجائے اور خدا تعالیٰ کی شکایتیں کرتے ہیں ان کو سمجھنا چاہیے کہ اگر حق تعالیٰ کفار کا کفر اور ثروت و عیش ان کو دیدیں اور ان کا فقر و فاقہ و ایمان ان کو دیدیں تو کیا تو اسیر راضی ہوں گے، اگر اس پر راضی نہیں ہو سکتے اور یقیناً کوئی مسلمان اس پر راضی نہ ہوگا تو ان کو خدا تعالیٰ کی شکایت کرتے ہوئے ڈرنا چاہیے۔ اور اپنے ایمان کی دولت پر خدا کا شک کرنا چاہیے۔

ام غزالی کا قول۔ صحت و عزت دیکھتے ہیں کہ جس عالم کو یہ تمنا ہوتی ہے کہ مجھے مال کیوں نہیں ملا تو گویا وہ یہ کہتا ہے کہ بادشاہ نے مجھے گھوڑا تو دیدیا گدھا کیوں نہیں دیا۔ گدھا بھی مجھے دو۔ تو اس کا یہ کہنا غلط ہے بلکہ جب تمہیں گھوڑا مل گیا تو گدھا کسی دوسرے کو دیدیا جائے گا۔ اسی طرح یہ استدلال ہے کہ میں علم ملا تبیر ملی تو مال بھی ملنا چاہیے سو اس کو جانا چاہیے کہ یہ اس کی غلطی ہے

جب تم کو علم دیا گیا ہے تو مال کسی دوسرے کو ملے گا پس جو لوگ اس راز کو سمجھ گئے وہ اسی تمنائے بڑے گئے در نہ زندیق ہونے میں کوئی تعجب ہی نہیں۔

مصیبت کیوں آتی ہے۔ غرض یہ شبہ اس لئے واقع ہوا تھا کہ آپ نے سمجھ لیا تھا کہ مصیبت ہمیشہ گناہ ہی سے آتی ہے حالانکہ کبھی رفق و دجا کے لئے بھی آتی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کو کوئی تاویل سمجھے۔ تو بات یہ ہے کہ محبت میں سب باتیں ظاہر ہے ورنہ کچھ بھی نہیں اگر خدا تعالیٰ سے تعلق اور لگاؤ ہو تو ہر مسئلہ میں انسان کی تسلی ہو سکتی ہے طبیعت خود بخود راہ نکال لیتی ہے اور اگر تعلق نہ ہو تو پہلی بات بھی تاویل معلوم ہوتی ہے۔ اگر اس تقریر سے کسی کی تسلی نہ ہوئی ہو تو وہ یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ حکیم ہیں اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں اور حکمت کا مقتضی یہ ہے کہ اس عالم میں ہر چیز کسی سبب اور علت کے ساتھ وابستہ ہے پس لامحالہ مصائب اور تکالیف کا بھی کوئی سبب ہونا چاہیے۔ مگر کبھی تو ایسا ہوتا ہے۔۔۔ کہ ایک مسبب کے لئے ایک ہی سبب ہوتا ہے اور کبھی ایک مسبب کے لئے کئی سبب ہوتے ہیں جسے چلنا کہ اس کے کئی سبب ہوتے ہیں کبھی ناز کیلئے چلتے ہیں کبھی قضا حاجت کے لئے کبھی کسی ظلم کرنے کے لئے اور جسے غصہ کہ کبھی دشمن پر آتا ہے جس کا سبب عداوت ہے اور کبھی کسی وجہ سے دوست پر بھی آتا ہے غرض ایک مسبب کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں اب بعض دفعہ ان اسباب میں سے ایک سبب ظاہر ہوتا ہے اور بقیہ اسباب ذرا خفی ہوتے ہیں تو کوتاہ نظر آدمی اسی ظاہری سبب کو سبب سمجھ لیتا ہے اور باطنی اسباب پر اس کی نظر نہیں ہوتی تو اس لئے وہاں ضرورت ہوتی ہے جمیع اسباب کے احاطہ کی۔ لیجئے میں اس کی ایک اور مثال بیان کرتا ہوں کہ مسبب واحد کے لئے کئی اسباب بھی ہوتے ہیں۔

ایک مثال۔ مثلاً آپ کو ایک شخص نے بڑے زور سے دبا یا اور ایسا دبا یا کہ آپ کی ہڈی پسلی ٹوٹنے لگی، تو دیکھئے وہاں کے اسباب جدا ہیں ایک تو یہ کہ راستہ میں آپ کا کوئی دشمن ملا اس نے آپ کو کوئی تکلیف پہنچانے کے لئے دبا یا۔ اور ایک تو صورت یہ ہے کہ آپ کوئی ایسا شخص ملا جس کے دیکھنے کو آپ ترستے تھے اور یہ امید بھی نہ تھی کہ آپ کو وہ ہاتھ بھی لگائے گا۔ دفعہ

وہ شخص بخیر میں آپ کو دبا لے اور بہت زور سے دبوچے ممکن ہے کہ جب تک آپ کو یہ علم نہیں کہ دبانے والا کون ہے اس وقت آپ کو تکلیف اور پریشانی رہے مگر جب یہ معلوم ہو جائے کہ دبانے والا کون ہے اس وقت آپ کیا کہیں گے

۱۔ استرخوا ہر ہائی زمین ۲۔ شکار ت نہ جوید غلاص از کند

اگر تھوڑی دیر کے بعد آپ کی جان پر ترس کھا کر خود چھوڑنا بھی چاہے کہ مبادا کہیں آپ مر نہ جائیں تو آپ یہ کہیں گے

۳۔ نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغ

۴۔ سردستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اور یہ کہیں گے

۵۔ نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے

یہی دل کی حشر یہی آرزو ہے

تو دیکھئے مسبب واحد ہے اور سبب مختلف ہے مگر ہر ایک کا اثر جدا ہے جو بدادعات کی وجہ بڑا اس کا دوسرا اثر ہے اور جو محبت کی وجہ سے ہے اس کا دوسرا اثر ہے جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ایک مسبب کے لئے مختلف اسباب بھی ہو کرتے ہیں تو اب سنئے کہ آپ نے اب تک صرف ایک سبب کو سنا ہے مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مَّصِيبَةٍ فِيمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ کہ جو مصیبت آتی ہے وہ انسان کی بد اعمالی کی وجہ سے آتی ہے۔

دوسرا سبب بھی تو سنئے احادیث میں ہے اشد الناس بلاء الانبياء ثم الامثل فالامثل کہ سب سے زیادہ سخت بلاء انبیاء علیہم السلام پر آتی ہے پھر ان لوگوں پر جو ان کے بعد دوسروں سے افضل ہوں و علیٰ ہذا معلوم ہو کہ کلفت کا سبب فقط ایک ہی نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام یقیناً گناہوں سے معصوم ہیں تو ان پر گناہوں کی وجہ سے کلفت و رنج کا آنا ممکن نہیں لاجہالہ یہی کہنا پڑے گا کہ بھی رفع درجات کے لئے بھی کلفت پیش آتی ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصیبت گناہ ہی کی وجہ سے آتی ہے کیونکہ مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مَّصِيبَةٍ سَعَوْا مَسْتَفَادِہٖ ہوتا ہے اور فَمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ سے ظاہر ہوا کہ معلوم ہوتا ہے اب اس آیت اس حدیث سے تعارض ہو گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلا رنج

درجات کے لئے بھی آتی ہے اور ظاہر ہے کہ حدیث و قرآن میں تعارض کے وقت قرآن ہی کو ترجیح ہوگی پس یہی ثابت ہوا کہ گناہ کی وجہ سے مصیبت آتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ تعارض کچھ نہیں اور اس شبہ تعارض کا جواب خود اس آیت میں موجود ہے چنانچہ ارشاد ہے مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مَّصِيبَةٍ فَاِنْ كُنْتُمْ كُفَّيْتُمْ کہ جو کچھ تم کو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے کفو سے آتی ہے تو یہاں مصیبت کا لفظ ہے اور حدیث میں مصیبت کا لفظ نہیں ہے وہاں بلا کا لفظ ہے پس آیت کا حصر بالکل صحیح ہے کیونکہ مصیبت مذہب ہی کو آتی ہے اور اہل مصیبت گناہ ہی لوگ ہیں ان پر جب مصیبت آتی ہے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے اور مقبولین اہل مصیبت نہیں ہیں، وہ اہل بلا ہیں ان پر جب بلا آتی ہے رفع درجات اور ازادیا و محبت کے لئے آتی ہے اور مصیبت اور بلا میں صورت فرق ہوتا ہے۔ ظاہر میں دونوں ایک ہی معلوم ہوتے ہیں مگر آثار میں دونوں کے بڑا فرق ہوتا ہے جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں کی حقیقت بھی الگ الگ ہے پس مصیبت کی حقیقت ہے سزا اور انتقام اور بلا کی حقیقت ہے محبوبانہ چھپر چھاڑ اور امتحان، محبوب کے دبانے اور بچھنے کو مصیبت کوئی نہیں کہا کرتا پس انبیاء اور مقبولین پر بلا آیا کرتی ہے مصیبت نہیں آیا کرتی اور بلا کے معنی لغت عربی میں آزمائش اور امتحان کے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے دو شخصوں کے برابر بخار آنا ہے آخر اس کی کیا وجہ ہے۔ کیا نوز بائند حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گناہ صادر ہوتے تھے ہرگز نہیں آپ گناہوں سے بالکل معصوم تھے اور اگر کوئی لغزش اپنے درجہ کے مناسب ہو بھی گئی تو پہلے ہی سے اگلی پچھلی سبب خطائیں معاف ہو جانے کی خوشخبری آچکی تھی۔ اس لئے آپ میں تو یہ احتمال کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا پس وجہ وہی ہے کہ بیماری میں ذرا انسان پر عجز و انکسار اور راہ کرنا، کراہنا غالب ہوتا ہے اور یہ ادا حق تعالیٰ کو پسند ہے اس ادا کے دیکھنے کے لئے مقبولین پر بلا بھیجتے ہیں اور کبھی صبر کا امتحان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ تو جب یہ بات ہے کہ کلفت کے اسباب مختلف ہوں۔ تو لازمی طور پر آثار بھی مختلف ہونگے اہل مصیبت یعنی اہل مصیبت ذرا سی تکلیف سے بہت زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں چنانچہ ایسے ہی لوگ طاعون سے بھاگتے ہیں اور کوئی شخص طاعون کی جگہ سے آیا ہو اس سے بھی بھاگتے ہیں کہ یہ طاعون کی جگہ سے آیا ہے شاید اس کو طاعون لپٹ رہا ہو اور اس کے پاس جلنے سے ہمارے اوپر بھی اثر نہ ہو جائے۔ بھلا اس وہم کا کچھ

ٹھکانا ہے بات یہ ہے کہ معاصی کا یہ خلاصہ ہے کہ اس سے دل کمزور ہو جاتا ہے اس لئے اہل مصیبت کا دل بہت کمزور ہو جاتا ہے۔

طاعون سے بھاگنے والا ایک شخص طاعون سے بھاگ کر ایک گاؤں ایک شخص کے مکان پر بٹھرا اور بخانا نمازی مسجد میں نماز کے لئے جاتا تو اس مسجد میں بعض پرانے نمازیوں نے نماز کے لئے آنا چھوڑ دیا۔ اس شخص کی کتنی بڑی ذلت ہے تو بات یہ ہے کہ طاعون سے بھاگنے والا کسی جگہ جا کر عزت نہیں ہوتی جس میں راز یہ ہے کہ یہ شخص خدا تعالیٰ سے بھاگتا ہے اس پر مجھے شعر یاد آیا کرتا ہے۔

عزیزے کہ از در بخش سر تنافت

بہر در کہ شد بیخ عزت نیافت

اور جو لوگ کہ اپنے گھر میں پڑے رہتے ہیں ان کی آخرت میں تو عزت ہوتی ہی ہے کہ طاعون کی جگہ ایمان اور ثواب کی نیت سے جمے رہے پر شہادت کا ثواب ملتا ہے چنانچہ احادیث میں اس کی تصریح ہے مگر اس کے علاوہ ان لوگوں کی دنیا میں بھی عزت ہوتی ہے کہ لوگ ان کو قوی القلب اور مستقل المزاج سمجھتے ہیں بہر حال اہل ذنوب کو پریشانی ہوتی ہے اور جہاں کلفت کا سبب رفع درجات ہوتا ہے وہاں آثار بھی دوسرے ہوتے ہیں کہ مذہ پریشان ہوتے ہیں نہ گھبراتے ہیں چاہے ان کے جسم میں تکلیف ہو مگر روح خوش رہتی ہے۔ روح کے لئے ایک عید ہوتی ہے کیونکہ ”از تجت تلہنا شیریں شود“ اور اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ اس مسرت کو بیساختہ ظاہر کر دیتے ہیں تو روح کو تکلیف دینے کی حالت میں متکرب ظاہر ہوتی ہے۔ پھر سب سے بڑی مصیبت جس کو ام المصائب کہنا چاہیے۔ موت ہے کہ اس پر کوئی راضی نہیں ہوتا چنانچہ اگر کسی سے یہ کہا جاوے کہ تمہارے لئے دو صورتیں ہیں یا تو اسی وقت مر جاؤ یا ایک برس تک بیمار رہو۔ ان دونوں میں سے جس کو چاہا ہو اختیار کر لو تو غالباً ہر شخص اتنی مدت مدید تک مریض رہے پر راضی ہو جائے گا۔ مگر موت پر ہرگز راضی نہ ہوگا مگر اہل اللہ کی یہ حالت ہے کہ وہ خود موت کے مشتاق رہتے ہیں۔ وہ حضرات یوں کہتے ہیں۔

خرم آں روز کوں منزل ویراں بروم۔

راحت جاں طلبم در پلے جاناں بروم۔

نذر کردم گر آید بسراں، عمر روزے تادریکدہ شاداں وغزل خوان بروم

وہ نوموت کے وقت کے لئے نذریں مانتے ہیں۔ اس پر **خوشی بوقت موت** شاید کوئی پریشہ کرے کہ حجرہ میں بیٹھ کر ایسا کہہ دیا ہو گا مگر جب نزع کا وقت آیا ہوگا۔ اس وقت ساری حقیقت معلوم ہوگئی ہوگی۔ اس وقت یہ سب باتیں بھول گئے ہوں گے۔ تو حضرت یہ بات نہیں واقعات سے ان حضرات کی حالت سچی معلوم ہوتی ہے۔ اور یقیناً وہ موت کے وقت بھی ایسے ہی خوش تھے۔ دہیہ ہے کہ وہ ہمیشہ اسی کی تعلیم کرتے آئے ہیں کہ زندگی ایسی اختیار کر دے کہ مرنے کے وقت سب لوگ تمہاری فرقت میں رو رہے ہوں اور تم فصال خداوندی کے سرور میں ہنس رہے ہو چنانچہ ایک قطعہ اس مضمون کا مجھے یاد آیا۔ فرماتے ہیں۔

یاد داری کہ وقت زادن تو ہمہ خنداں بدند تو گریاں۔

یعنی پیدائش کے۔۔۔۔۔ وقت تم روتے ہوئے آئے تھے اور اعزاز و اتقارب ہنس رہے تھے خوشیاں منا رہے تھے۔

آنچنان زی کہ وقت مردن تو ہمہ گریاں شونہ تو خندان

زندگی ایسی ہی اختیار کر دے کہ مرنے کے وقت اور سب تو ر دیں اور تم ہنس رہے جاؤ چنانچہ ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں کہ بعض اہل اللہ مرنے کے وقت بالکل شاد و خرم نظر آتے ہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کے نزع کے وقت سب تو رو رہے تھے اور ان کی یہ حالت تھی کہ وہ بیساختہ یہ اشعار پڑھ رہے تھے۔

وقت آں آند کہ من عریاں شوم جسم بجز ارم سر اسر جان شوم۔

اب وہ وقت آگیا کہ میں قید جسم سے آزاد ہو جاؤں گا۔ بدن کو چھوڑ کر سر تپا رہے روح بجز وصال حق سے سرفراز ہو جاؤں گا۔ تو صاحبو! نزع کے یہی بناوٹ سے نہیں ہو سکتی اور اگر ہو سکتی ہے تو کوئی کر کے دکھلا دے اور فرماتے ہیں۔

چہیست تو جیلا آنکہ از غیر خدا فسر د آئی در خلا و در بلا۔

یہ تو آپ نے موت کے وقت کا حال سنا اور اس سے بھی زیادہ سخت وقت موت کے بعد کا ہے کہ وہی وقت **بعد موت کا حال**

ہے مصیبت کا جو کچھ ثواب و عذاب ہو گا موت کے بعد ہی تو ہو گا۔ مگر اہل اللہ کی حالت اس وقت بھی عجیب ہوتی ہے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں وہ اور بھی زیادہ خوش رہتے ہیں۔

حضرت سلطان الاولیاء کی حکایت ہے کہ جب ان کا جنازہ چلا تو ان کے ایک مرید پر حالت طاری تھی۔ کیونکہ شیخ کے انتقال کا صدمہ مریدوں سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے غرض جنازہ جا رہا تھا کہ اس مرید نے جنازہ کو مخاطب کر کے بشعر پڑھا

سروسمینا بصیرتے می رودی سخت بے مہری کہ بے مایروی
اے تماشاکار عالم روئے تو تو کجا بہر تماشای روی۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ کفن میں سے آپ کا ہاتھ اوجھڑا ہوا گیا لوگوں نے کہا کہ کیا غضب کرتے ہو چپ رہو۔ اس واقعہ سے کچھ تعجب نہ کرنا چاہیے کیونکہ مرنے کے بعد انسان کو دوسری حیات عطا ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ سب کچھ احساس کر سکتا ہے اور یہ حیات اولیاء میں عوام سے زیادہ ہوتی ہے تو کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ اس حیات کا اثر بطور کرامت کے جسم پر بھی ظاہر ہو جاوے مگر کبھی کبھی ہوتا ہے۔

غرض خدا نے ظاہر کر دیا کہ اب یہ لوگ اس قدر مطمئن ہیں کہ ان کو مرنے کے بعد بھی وجد آتا ہے چنانچہ ارشاد ہے اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰهِ لَآخِرُوْنَ عَلٰی ہِمِّمْ وَلَا اَھَمِّمْ یَحْرُجُوْنَ تو صاحبو! ان حضرات کو مصیبت کہاں ہوتی جن باتوں کو آپ مصیبت سمجھتے ہیں ان میں تو ان کو لذت آتی ہے۔ (ایضاً ص ۲۳۸)

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں آج کل اخلاص ہے اس لئے ان کی بددینی کا اثر حالت خراب ہے۔ میں کہتا ہوں کہ صاحبو! افلاس کا دور نہیں۔ اصل میں اس خرابی کا سبب بددینی ہے۔ آپ یورپ کو دولت مند سمجھتے ہیں مگر کیا اس میں سب ہی دولت مند ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ان میں بھی کتنے آدمی سردی سے مر جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی قوم کی حالت اچھی ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ان میں ہر شخص دولت مند ہو بلکہ حالت درست ہوتی ہے افعال حسنہ اور اخلاق حمیدہ سے جس قوم میں یہ باتیں ہونگی اس کی حالت درست ہوگی چاہے وہ کسی ہی مفلس قوم ہو شاید آپ یہ کہیں کہ اہل یورپ تو کافر ہیں وہ تو دیندار نہیں ہیں پھر ان کی حالت ترقی پر کیوں ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ

چونکہ وہ کافر ہیں خدا کے دشمن ہیں اس لئے اگر وہ تھوڑے سے کام بھی اچھے کریں گے تو انکی حالت دنیوی درست ہو جائے گی۔ ان میں اتفاق اور اتحاد اور قومی ہمدردی بہت زیادہ ہے۔ دوسرے ان میں ہر کام کا ایک انتظام اور قاعدہ ہے اور یہ باتیں فی نفسہ اصلاح حال میں مؤثر ہیں جو اصل میں مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیے تھیں کیونکہ ان کو مذہباً اس کی بہت تاکید کے ساتھ تعلیم کی گئی ہے مگر مسلمانوں نے ان باتوں کو چھوڑ دیا دوسری قوموں نے ان سے فائدہ اٹھایا مگر یہ یاد رہے کہ مسلمانوں کی حالت صرف اتفاق و اتحاد سے درست نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ان کو پوری طرح احکام اسلام کی پابندی اور وقعت کرنا لازم ہے کیونکہ حق تعالیٰ کے خاص بندے ہیں اگر یہ تھوڑی سی بھی نافرمانی کریں گے تو ان پر عرصہ زیادہ ہو گا تو صاحبو! اگر اپنی بھلائی چاہتے ہو تو دینداری اختیار کرو۔ ابھی تک مسلمانوں میں اتنی فلاکت کسی میں نہیں ہوئی کہ تباہ ہو جاوے اور اگر ان میں اتفاق ہو تو ایک کی امارت سے دس آدمی کھا سکتے ہیں مگر آج ہمدردی تو کیا ہوتی مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ غریبی کو جرم قرار دیتے ہیں حالانکہ غریبی اور امیری کسی کے اختیار میں نہیں آج ایک شخص امیر ہے کل کو غریب ہو جاتا ہے۔ آج ایک آدمی غریب ہے چند روز میں حق تعالیٰ اس کو غنی کر دیتے ہیں۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا ہے کہ وہ چھ پیسے روز کی مالدار کا مشاہدہ کندھے اٹھانے کی مزدوری کما لے تھے پھر وہ لاکھوں روپے کے آدمی ہو گئے اب بھلا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ تدبیر سے اس درجہ کو پہنچ گئے ہرگز نہیں بلکہ یہ محض مشیت الہی کی وجہ سے ہوا۔ میں کہتا ہوں، جو لوگ تدبیر پر مرتے ہیں وہ ایک آدمی کو بجائے چھ پیسے روز کے تین آنے دیں اور وہ تمام تدبیریں بتلا دیں جن سے بظاہر پہلے شخص کو ترقی ہوتی پھر ہم دیکھیں کہ دوسرا شخص ہر دن سے کتنی ترقی کرتا ہے اگر اس طرح ترقی ہو اگر ترقی تو ہر شخص دوسروں کی تدبیروں کو دیکھ کر امیر ہو جائے کہ تا درحقیقت فراخی اور تنگی کا مدار ان اسباب پر نہیں ہے مشیت الہی پر ہے دوسرے کسی قوم میں افلاس اتنا عام نہیں ہوتا کہ سبھی مفلس ہوں بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ ہر قوم میں کچھ غنی ہوتے ہیں کچھ مفلس ہوتے ہیں۔ جب یہ بات ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں ہی کی حالت خراب ہے سو بات یہ ہے کہ ان میں فعال

اور اخلاق حمیدہ کی کمی ہے پس اصل شکایت ان کی بددیہی کی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۹)

صورت و حقیقت ہے ہرگز نہیں۔ ہاں مصیبت کی صورت ہے حقیقت میں تو ان حضرات پر اگر مصیبت آوے گی تو یہ کوئی مصیبت وہ ہرگز مصیبت نہیں میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص میٹھائی کا کریلا بنا دے اور اس کے متعلق دو شخصوں میں اختلاف ہوا ایک تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ کریلا ہے اور دوسرا سمجھتا ہے کہ یہ میٹھائی ہے اب دوسرے نے اس کو توڑ کر کھانا شروع کیا تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ یہ کریلا کھا رہا ہے۔ ہرگز نہیں درحقیقت وہ میٹھائی کھا رہا ہے ہاں صورت کریلا کی ہے جس سے نادان کو شبہ ہوتا ہے کہ اس کا منہ کڑوا ہو گیا ہوگا۔ مگر اس کھانے والے سے کوئی اس کے مزے کو پوچھے۔ بس یہی مثال اہل اللہ کی مصیبت اور عوام کی مصیبت کی ہے اہل اللہ جو مصیبت آتی ہے وہ کریلے کی صورت میں میٹھائی ہے جس سے ان کو لذت حاصل ہوتی ہے اور عوام کی مصیبت حقیقت میں کریلا ہے جس سے ان کو تلخی اور پریشانی حاصل ہوتی ہے۔

میں نے اس مثال میں ایک باریک سکہ کو بالکل واضح کر دیا۔ آپ رات دن دیکھتے ہیں کہ میٹھائی کے کھلونے اور مختلف پھل بنائے جاتے ہیں۔ مگر وہ محض صورت ہی صورت ہوتی ہے حقیقت میں وہ خاص شکر ہے۔ میں نے سنا ہے کہ محمود آباد میں ایک باورچی نے میٹھائی کا انار بنایا تھا جو ڈیڑھ سو روپے میں تیار ہوا تھا اس کے اندر دھجلی اور دانوں میں سرخ شربت تک تھا۔ اور یہ تو میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک دعوت میں باورچیوں نے میٹھائی کا پان بنایا تھا۔ تو کسی نے اگر ایسا ہی کر لیا بنایا ہو اور ایک شخص اس کو کھانے لگے اور دوسرا سپر رحم کرنے لگے تو یہ اس کی حماقت ہے یا نہیں۔ یقیناً حماقت ہے تو جس طرح کریلے کی دوستیں ہیں۔

مصیبت کی قسمیں اسی طرح مصیبت کی بھی دو قسمیں ہیں ایک صورتاً ایک حقیقتاً۔ اور نعمت کی بھی دو قسمیں ہیں ایک صورتاً اور ایک حقیقتاً۔ کفار کو جو لذت دنیوی اور عیش و آرام دیا گیا ہے یہ ظاہری نعمت ہے حقیقت میں یہ سب وبال جان ہے اور مسلمانوں کو جو مصیبت پیش آتی ہے وہ ظاہری مصیبت ہے۔

حقیقت میں وہ بڑی نعمت ہے۔ صاحبو! اس کو وہ سمجھے گا جو اس مزہ کو پہلے چکھ چکا ہو اور جس نے باطنی دولت کا مزہ نہیں چکھا وہ اس کو نہیں سمجھ سکتا۔

پرسید کے کہ عاشقی چیست گفتم کہ چو ناشوی بدانی !

بچہ کے ختنہ کی مثال کیا آپ نے ختنہ کے وقت یا فصد کراتے وقت بچوں کو رو دتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سوچنے کے دل سے پوچھئے وہ اس کو کیا سمجھتا ہے وہ تو اس کو سخت مصیبت کہے گا مگر آپ کے نزدیک وہ مصیبت نہیں راحت ہے۔

طفل می لرزد ز نیش احتجام مادر مشفق ازاں غم شاد کام

کیا آپ نے کبھی اپنے یا اپنے کسی عزیز کے نشتر نہیں لگوایا اور کیا پھر نشتر دینے والے کو انعام نہیں دیا۔ ضرور دیا ہے تو کیا نشتر دینے کے وقت کی تکلیف دیکھ کر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے انعام کا کام نہیں کیا؟ ہرگز نہیں آپ کا دل جانتا ہے کہ اس نے بڑا احسان کیا اور بہت راحت پہنچائی مگر آئندہ کی تکلیف سے نجات دیدی کہ نشتر دینے کے وقت آپ کے آنسو بھی نکلے ہوں گے تب بھی دل اندر سے راضی ہوگا۔

معلوم ہوا کہ بعض مصائب ایسے بھی ہیں جو صورت میں مصیبت ہیں اور حقیقت میں راحت معلوم ہوتے ہیں پس اہل اللہ کے مصائب کو بھی ایسا ہی سمجھتے وہ خوب جانتے ہیں کہ ان تکالیف کی وجہ سے ہماری آخرت درست ہو رہی ہے جتنی ہم کو یہاں کلفت ہوتی ہے اسی قدر عذاب جہنم سے ہم کو نجات نصیب ہوتی ہے تو وہ ان تکالیف کو بالکل ویسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ آپ شتر کی تکلیف سمجھتے ہیں آپ شتر کی تکلیف پر دل سے راضی ہیں وہ فقہ فاقہ اور طاعون وغیرہ کی تکلیف سے دل سے راضی ہیں۔ اب یہ شبہ زائل ہو گیا کہ انبیاء و اولیاء تو گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں ان پر یہ مصیبتیں کیوں آتی ہیں معلوم ہو گیا کہ ان حضرات پر واقع میں مصیبت ہی نہیں اور جو واقع میں مصیبت ہے وہ بد اعمالیوں ہی سے آتی ہے۔

۱۲۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہی

جو طبائع زمانے کے جدید رنگ میں رنگے ہوئے ہیں ان میں تو یہ کوتاہی شاہد ہے کہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر کج چپی رکھتے ہیں کہ دوسرے اقوام یا مذاہب سے مقابلہ کی گفتگو کے موقع پر آپ کی سوانح عمری میں سے یا آپ کے بعض اقوال یا افعال کی حکمتوں میں سے (خواہ ان کی حقیقت تک ان کے ذہن کی رسائی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو) صرف وہ حصہ جس کو تمدن سے تعلق ہے محض اس غرض سے بیان کر دیتے ہیں کہ آپ کی عظمت اور آپ کے قانون کی عزت ظاہر ہو جائے اور کسی کو اسلام کی خدمت اور آپ کے اداء حقوق کے لئے کافی سمجھتے ہیں باقی نثار و اتباع کو ضروری سمجھتے ہیں نہ محبت کا کوئی اثر پایا جاتا ہے بلکہ اتباع کو تعصب اور محبت کو وحشت سمجھتے ہیں۔ اور سبب یہی اس کا یہ ہے کہ اس زمانے میں سب سے بڑا مقصد جاہ و عزت کو قرار دیا گیا ہے جس کے مطلوب ہونے کا ہم کو بھی انکار نہیں مگر کلام اس میں ہے کہ آیا وہ مطلوب بالغرض ہے یا خود مطلوب بالذات ہے بہر حال چونکہ اس کو کمال بالذات سمجھا جاتا ہے اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لاقدور و لا تحصى کمالات حقیقت عظیم الشان میں سے ان کی نظر اسی کا انتخاب کرتی ہے اور دوسرے کمالات کا مثل محبت الہی و خشیت الہی و زہد و صبر و تربیت روحانی و مجاہدہ و شغل حق و دیگر فضائل علیہ و علیہ کبھی انکی زبان پر نام بھی نہیں آتا جس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ گویا آپ خاص اسی غرض کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے کہ ایک جماعت کو قوم بنا کر اس کو دنیوی ترقی کے وسائل کی تعلیم فرمادیں تاکہ وہ دوسری قوموں پر سابق و فائق رہ کر دنیا میں شوکت کے ساتھ زندگی بسر کریں کیا قرآن مجید و حدیث شریف میں گہری نظر کرنے والا آپ کی تعلیم کا یہ خلاصہ نکال سکتا ہے ان صاحبوں کو اپنی اصلاح کرنے کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ علماء تحقیق و عرفاء تحقیق کی طول صحبت و ملازمت کا التزام کریں اور انکی خدمت میں کچھ عرصہ تک بالکل سکوت اختیار کر کے رہیں خود ان کے اقوال متفرقہ و ارشادات مختلفہ سے انشاء اللہ تعالیٰ ایک بڑی فہرست خیالات کی درست ہو جائے گی اس کے بعد جو شبهات رہ جائیں ان کو ادب کے ساتھ ان کے حضور میں پیش کریں۔ اور توجہ و انصاف کے ساتھ

جواب سنیں۔ ان کو اس زمانہ سکوت میں جو اصول و قواعد سنئے اور ذہن نشین کرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اصول ان جوابوں کے سمجھنے میں نہایت معین ہوں گے اور اطمینان و شفا رکلی میسر ہوگی۔ اس طریق اصلاح کو جو تجرب ہے سرسری خیال نہ فرمائیں۔ اور نیز حدیث میں کتاب الرقاق و کتاب الزہد کا بار بار مطالعہ فرمائیں۔

(الشذوذ فی حقوق بدر البد و درص ۳ تا ۴)

ایسے لوگ درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے تینوں حقوق میں تقصیر کئے ہوئے ہیں متابعت و محبت کا موجود نہ ہونا تو ظاہر ہے اور اوپر اس کو صراحت سے بیان کر دیا گیا ہے البتہ ان کے اس عمل سے کہ ان کی زبان یا قلم سے بعض ایسے مضامین صادر ہوتے ہیں کہ ان سے آپ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید وہ آپ کا حق عظمت ادا کرتے ہیں لیکن اگر ذرا نظر کو عمیق کیا جاوے تو ثابت ہوگا کہ یہ احتمال بھی واقفیت نہیں رکھتا حقیقت یہ ہے کہ آپ کی جس عظمت میں گفتگو ہو رہی ہے وہ وہ عظمت ہے جس کے ساتھ آپ حامل وحی ہونے کی حیثیت سے متصف ہیں اور ان لوگوں کی تحریر و تقریر میں نظر کرنے سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلوب میں جو آپ کی عظمت ہے وہ اس حیثیت سے نہیں بلکہ ایک حکیم تمدن ہونے کی حیثیت سے ہے کیونکہ ان دونوں عظمتوں کے آثار کا موجود نہ ہونا ہمارے دعویٰ کی دلیل ہے چنانچہ اعتقاد عظمت نبوی کے آثار یہ ہیں کہ آپ کے احکام سنئے ہی یہ معلوم ہو کہ گویا حق تعالیٰ نے ہم سے خود فرما دیا ہے اور یہ کہ اس حکم کے قبول کرنے میں حکمت و مصلحت سمجھنے کا ہرگز انتظار نہ ہو بلکہ اگر بادی النظر میں کسی حکمت کے خلاف بھی معلوم ہو تب بھی اسی خوشی سے قبول کرے جیسا حکمت معلوم ہونے کے وقت کرتا اور نہ..... بدون حکمت سمجھے ہی اس حکم کی وقعت میں کچھ کمی ہو بلکہ جس طرح ادنیٰ خدشا کا رشائے حکم سن کر مغلوب و دالہ ہو کر دیوانہ وار اس کی بجا آوری کے لئے دوڑتا ہے اسی طرح اس کی کیفیت ہو جاوے اور یہ کہ اس کے خلاف کا مستحسن ہونا خیال میں بھی نہ آوے بلکہ اجمالیوں سمجھے کہ بس تمام خیر و برکت اور حکمت و مصلحت اور فلاح و صلاح اسی میں منحصر ہے خواہ ہمارا ذہن کتنا اس کی تفصیل تک پہنچے یا نہ پہنچے۔ بقول حضرت عارف مہنوی رحمۃ اللہ علیہ دل تازہ کر دن بات راز تو بینایتی علت از کار تو!

اور صرف حکیم تمدن ہونے کے لحاظ سے جو اعتقاد و عظمت ہوتا ہے اس کے آثار یہ ہیں کہ حکم سن کر اتنا ہی اثر ہو جو ایک مخلوق ذی رائے کی رائے کو سن کر ہوتا ہے۔ اور یہ اس لئے قبول کرنے میں یا اس کو بنظر وقعت دیکھنے میں اس کا بھی انتظار ہو کر اس میں عقلی (اور عقلی بھی دنیوی) مصلحت کیا ہے۔ جب تک مصلحت معلوم نہ ہو اس میں سخت تردد و غلبان رہے اور ہرگز اس پر عمل کرنے میں شرح صدر نہ ہو خود بھی ایک قسم کی تنگی اور جبر و حکم کا سا اثر رہے اور دوسروں کے سامنے بھی اس کا دعویٰ کرتے ہوئے ایک گونہ تجلّت اور بے وقتی کی ہی کیفیت رہے اور بار بار اس حکم کی جانب مخالف کی ترجیح کا ہجوم اور اس کی تنہا کا قلب پر غلبہ رہے اور ہرگز اس کے صحیح ہونے کا دل کھول کر حکم نہ کر سکے بلکہ اس فکر میں رہے کہ کسی طرح اس کا شرعی ہونا ثابت نہ ہو اور جب ادب کچھ نہ ہو سکے تو بعض تاویلات سے اس حکم کے شرعی ہونے کا انکار کر دے سمجھی اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے میں شبہات پیدا کرے بلکہ اس کو راویوں کی نقل کی غلطی یا ان کی رائے کی آمیزش کا اثر بتلا دے اور کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے کو تسلیم کر کے خود آپ کی نسبت کسی ضرورت و مصلحت کے وقت کے اتباع کا دعویٰ کرے اور چونکہ وہ مصلحت باقی نہیں رہی لہذا اس حکم کو بھی موجود نہ سمجھے بغرض ہزاروں حیلے نکالے مگر اس حکم کو نہ مانے (اور یہ ان میں سب سے زیادہ سلیم و صانع کا حال ہے) اور یہ وہ مراتب ہیں جو کم و بیش کفر سے سب لے ہوئے ہیں کوئی مرتزق کفر کوئی تخی کفر ہے۔ کوئی کفر سننے کو ہے کمالاً حتمی علی المتفقین المسلمین جب دونوں اعتقادوں کے آثار مجدّد اجداد معلوم ہو گئے۔ آگے ہر شخص کو مشاہدہ سے اپنے اندر بھی اور غیر کے اندر بھی ان کے آثار کا وجود و عدم معلوم ہو سکتا ہے اور اس سے ہمارے دعویٰ سابقہ کا صدق بخوبی واضح ہو جاوے گا اس مضمون کی شرح زیادہ تحقیق کے ساتھ مطلوب ہو تو مضمون عظمت وحی و رقرہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دامت فیوضہم جو (الحقاسم) کے نمونہ میں شائع ہوا ہے ملاحظہ فرمایا جاوے) ہماری اس تقریر کے یہ معنی نہ سمجھے جائیں کہ احکام احکامہ شرعیہ کی حکمت شرعیہ حکمت سے خالی اور عاری ہیں۔ حاشا و کلا بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان کا اتباع اور ان کی خاص عظمت کا اعتقاد فہم حکمت پر موقوف

نہ ہونا چاہیے۔ ہاں وہ خود ایک مستقل علم ہے کہ اس کو اسرار شریعت کا لقب دیا جاتا ہے مگر اس کے اہل خواص عارفین ہیں عوام الناس کو اس سے بجائے نفع کے ضرر کا احتمال غالب ہے کسی وجہ سے ایک اس لئے کہ ان میں سب تو منصوب ہیں نہیں۔ اجتہادی بکثرت ہیں جن میں احتمال بھی ہے۔ سو اگر کبھی اس کا غیر صحیح ہونا ظاہر ہو گیا اور عامی کے خیال میں اس حکم کی وہی حکمت یقینی تھی تو اسکے صحیح نہ ہونے سے اس حکم کو غیر صحیح سمجھ بیٹھے گا۔ وکلا خواص کے کہ وہ اس کو یقینی علت اور بڑی حکم کا نہ سمجھیں گے اس لئے حکم میں ان کو کبھی کوئی خدشہ نہ ہوگا۔

دوئم اس لئے کہ کبھی کوئی مبنی اور حکمت صحیح معلوم ہوگی لیکن بعض اوقات وہ وجہ اور حکمت اس عامی کی نظریں باوقفت نہ ہوگی تو اس حکم کو بھی بے وقعت سمجھنے لگے گا۔

سوم اس لئے کہ ہر حکمت علت نہیں ہوتی۔ بعض اوقات عامی اس کو علت اور اصلی سبب سمجھ کر کسی موقع میں اس کے موجود نہ ہونے سے حکم ہی کے غیر موجود ہونے کا حکم لگا دے۔

چہارم یہ کہ ہر حکمت مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ بعض اوقات عامی اس کو مقصود بالذات سمجھ کر کسی موقع و محل میں حکمت کے حاصل ہو جانے کو کافی سمجھ کر تحصیل حکم ضرورت نہ سمجھے گا اور ان دونوں صورتوں (سوم و چہارم) میں اجتہاد باطل کا باب وسیع ہو جائیگا مثلاً سفر میں مشقت پر نظر کر کے قصر کا حکم لگا دیا گیا ہے۔ لیکن یہ علت نہیں حتیٰ کہ اگر سفر میں مشقت بھی نہ ہو تب بھی قصر ہے اور اسی طرح وضو مشروع ہوا ہے حکمت نظافت و طہارت سے لیکن اگر طہارت و نظافت حاصل ہو تب بھی وضو سے استغناء نہ ہوگا۔

پنجم یہ کہ عامی مخالف دین کے مناظرہ میں اس کو بیان کرے گا اور اگر وہ یقینی نہیں تو اس میں مخالفت نے اگر خدشہ نکال دیا۔ تو یہ محبوب ہو جائے گا اور اس میں اسلام کو اور حق کو صد مہر پہونچے گا۔ مثلاً کسی نے کتابا لسنے کی مانعت کی یہ حکمت بیان کی کہ اس میں صفت سبعیت کی ہوتی ہے۔ تو اگر کسی نے اس میں یہ خدشہ پیدا کیا کہ تعلیم کے بعد سبعیت نہیں رہتی پھر کیوں ممنوع ہے تو یہ شخص بزبان حال اس حاکم کو بیہنوار

کہے گا۔ بخلاف راسخ فی العلم کے کہ وہ بجائے حکمت کے یہ کہے گا کہ ہمارے آقاؐ عظیم الشان کا یہ حکم ہے کہ ہم نہیں جاننے کیا مصلحت ہے۔ تو اس شخص پر کوئی خدشہ ہی نہیں ہو سکتا۔
(ایضاً ص ۲۸۷)

۱۳۔ ترقی مطلوبہ کی شریعت نے تعلیم نہیں فرمائی۔

ترقی نہایت خوبصورت لفظ ہے لیکن اس وقت اس کا حاصل محض طول اہل جہنم ہے جسکی شریعت مطہرہ نے جڑ کاٹ دی ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے نمونے تھے انہوں نے اس کو اپنے خیال میں کبھی جگہ نہیں دی۔ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کی تعلیم نہیں فرمائی حضورؐ کی سیرت جس کا ایک ایک واقعہ احادیث میں مدون ہے اس کو دیکھ جائیے ابتداء سے انتہا تک کہیں بھی آپ کو تعلیم نہ ملے گی۔ رہے تاریخی واقعات سوان کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ احادیث کے مطابق ہوں تو قابل اخذ ہیں ورنہ بیج محض۔ (تجارت آخرت ص ۷)

غرض حدیث کو دیکھئے تو اس سے معلوم ہوگا کہ آپ کا طرز زندگی کیا تھا اور وہی طرز صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا۔ تو صحابہ کے یہاں طول حرص اور طول اہل کا انسان بھی تھا ان کی ترقی ترقی دین تھی اگرچہ اس کے تابع ہو کر ان حضرات کو دنیا کی بھی وہ ترقی حاصل ہوئی کہ آج لوگوں کو خواب میں نصیب نہیں لیکن مطمح نظر صرف ترقی دین تھی چنانچہ ان حضرات کی اسی شان کو خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ اَلَّذِينَ اِنْ مَنَّاهُمْ فِى الدُّنْيَا اَتَاَهُمُ الصَّلٰوةَ وَاَتَوْا النَّسَاةَ وَاَبَا الْمَعْرُوفِ وَهَمُّوا عَنِ الْمُسَبِّحِ کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دے دیں تو یہ لوگ اس وقت بھی نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اچھی باتوں کی ترغیب دیں اور بری باتوں سے روکیں۔ یہ ہے ان کے خیالات کا نقشہ جس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اب ان کو یاد رکھئے اور پھر ان کے ساتھ اپنے خیالات کو دیکھئے اور انطباق کیجئے۔ واللہ اساد شوار انطباق ہے جیسے

خط مستقیم پر خط منحنی کو منطبق کرنے لگے کہ جب تک اس میں استقامت اور اغیار باقی رہے گا۔ کبھی انطباق ممکن ہی نہیں تو ہمارے خیالات خط منحنی کی طرح ہیں۔ اور ان حضرات کے خیالات کی مثال خط مستقیم ہے۔ بحمد اللہ مثال ایک خاص اعتبار سے بھی بہت ہی اچھی خیال میں آئی کیونکہ خط منحنی کے انطباق علی المستقیم کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے بعض اجزاء تو خط مستقیم پر سے گزرے ہوئے ہوتے ہیں اور بعض اجزاء اس سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں یہی حالت ان خیالات مختصرہ کی ہے کہ ان میں اگر ایک قدم تو شریعت پر ہے تو دوسرے اس سے بالکل الگ جس کا کسی تاویل سے بھی جادۂ شریعت پر ہے انطباق نہیں ہو سکتا۔ بس ایسے حالات و خیالات کس طرح قابل مدح ہو سکتے ہیں۔ (انطباق ص ۴۸)

۱۴۔ محدثین پر اعتراض کا جواب

بعض خود رو مصنفین پر انھوں نے کہ وہ محدثین پر اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے واقعات میں اپنی رائے کو شامل کیا ہے۔ لیکن جو شخص محدثین کے حالات سے واقف ہے وہ خوب جانتا ہے کہ محدثین علیہم الرحمۃ نے کس تہ میں سے کام لیا ہے البتہ اعتراض مطابق واقع کے مؤرخین پر ضرور ہو سکتا ہے۔ صاحبو! محدثین کا تہین اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ ایک باب کی حدیث سے ایک بات کو ثابت کرتے ہیں تو اس کے بعد دوسرے باب اس کا معارضہ صوری بیان کرتے ہیں اور اس میں بھی حدیث پیش کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ان حضرات کا مقصود محض بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا جمع کرنا ہے نہ کہ اپنی رائے کو ثابت کرنا، یا اس پر زور دینا۔ کیونکہ جب ایک حدیث کے ساتھ دوسری حدیث جو اس پہلی سے معارضہ ہے موجود ہے اور ظاہر ہے کہ اس محدث کی رائے کسی ایک جانب ہوگی تو بصورت ایہ ادمعارضہ کوئی خاص رائے کیونکہ مقصود ثابت ہو سکتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان کو اپنی اغراض کی تائید مقصود نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود تمام احادیث کا لوگوں کے سامنے پیش کر دینا ہے کہ دیکھیں اور خوب سمجھ لیں۔ ہاں تاریخ میں اس قسم کے واقعات پائے جاتے ہیں کہ ایک مؤرخ نے اپنے خیال کے مؤید واقعات کو لیا اور دوسرے نے اپنے خیالات کے مؤیدات کو، پس جب حدیث و تاریخ میں یہ تفاوت ہے تو حدیث قابل وثوق ہو اور اس کے مقابل تاریخ قابل وثوق نہ ہوئی۔ تو جو واقعات

تاریخ میں حدیث کے خلاف ہوں گے اور حدیث ان کو باطل کرتی ہوگی تو وہ محض بیچ ہیں ہر قابل قبول نہیں۔ (ایضاً ص ۲)

۱۵۔ محتاج اصلاح دوسروں کی اصلاح کیا کرتے؟

آج دیکھ لیجئے کہ ان مدعیان طبابت اخلاق کا کیا برتاؤ قوم کے ساتھ ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اپنے ساتھ بھی ان کو ہمدردی نہیں اور اپنے امراض کے علاج پر بھی توجہ نہیں۔ اور یہی سبب ہے قوم سے ہمدردی نہ کرنے کا کیونکہ طبعاً اپنا خیر خواہ انسان زیادہ ہوتا ہے بلکہ دوسروں کی جو خیر خواہی کرتا ہے اس میں اپنی خیر خواہی مضمر ہوتی ہے پس جو شخص اپنا ہمدرد نہ ہو گا وہ دوسروں کا کیسے ہمدرد ہوگا۔ یہ لوگ اول تو اپنی اصلاح کر لیں پھر دوسروں کی اصلاح حقیقی کی نہ کر لیں آج یہ حالت ہے کہ انہار ہمدردی اسلام میں بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں انجمنیں قائم ہوتی ہیں مگر نہ نازی فکر ہے نہ روزے کا خیال ہے۔ مال کی اتنی افراط ہے کہ دس آدمیوں کو اور بھی لے جا سکیں لیکن محبت اسلام کا یہ عالم ہے کہ خود بھی حج کر نیکی تو فیق نہیں ہوتی۔ وضع کو دیکھئے سر سے پاؤں تک اسلام کے بالکل خلاف گفتگو کو دیکھئے وہ مذہب سے بالکل جدا تو جب ان کو اپنے امراض کے ازالہ کی فکر نہیں تو پھر دوسروں کے امراض کے ساتھ ان کو کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر زمانے کی ایک رسم ہوتی ہے کہ اہل زمانہ اسی پر چلنے لگتے ہیں۔ آجکل یہ رسم ہے کہ ہر شہر یا غیر مشہور تحصیل شہر یا تکمیل شہر کی کوشش کرتا ہے اور اس کے ذرائع ہم ہو جاتا ہے۔ منجملہ ان ذرائع کے ایک یہ بھی ہے کہ انجمنیں قائم کی جائیں اور جلسے کے جائیں کوئی ان انجمنوں کا گورنر ہو جائے کوئی سکریٹری۔ کوئی کچھ کوئی کچھ اور اس سے عام و خاص میں ان کو امتیاز ہو جائے پھر رسم بھی اگر شریعت پر منطبق ہوتی تو بھی نفع سے خالی نہ ہوتی کیونکہ وہ انطباق کی برکت سے ایک دن مبدل حقیقت ہو سکتی تھی اور جب ظاہری انطباق علی الشریعت بھی نہ ہو تو سر اسر مضمر اور رسم قاتل ہے اور یہی وجہ ہے کہ حکماء امت نے عوام الناس سے اسی قدر کو کافی سمجھا ہے کہ وہ اپنی صورت ظاہری شریعت کے موافق بنالیں اور صورت عبادت کے پابند ہو جائیں کیونکہ وہ حضرات جانتے ہیں کہ یہ صورت ہی انشاء اللہ

ایک دن مبدل حقیقت ہو جائے گی (تجارت آخرت ص ۲۹)

آجکل کے جلسے

غلام یہ ہوا کہ آجکل کے جلسے اور انجمنیں بالکل رسم بلامعنی ہیں اور صورت بھی ٹھیک نہیں اور لوگوں نے ان کو محض رسم سمجھ کر اختیار کیا ہے نفع پہنچانا ہرگز مقصود نہیں ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ یہ جب اپنا ہی دین برباد کر رہے ہیں تو دوسروں کو دینی نفع پہنچانے کا کب قصد کر سکتے ہیں۔ اور اگر کہیں کہ یہ ایثار ہے کہ اپنے دین سے دوسروں کے دین کو مقدم کر رکھا ہے اس لئے باوجود اپنے دین کے قائم نہ کرنے کے دوسروں کے دین کی درستی کرتے ہیں تو سمجھو کہ ایثار کی اجازت دنیاوی منافع میں ہے دینی منافع میں نہیں یعنی اگر ہمارا کوئی دنیاوی نفع فوت ہو کر دوسرے کا نفع ہو جائے تو اس کو ایثار کہیں گے اور اگر دین تباہ ہو کر دوسروں کو نفع پہنچے تو یہ ایثار نہیں کہلائے گا۔ ورنہ اگر دین کو تباہ کر کے بھی ایثار ہوتا تو باقی سب سے زیادہ صاحب ایثار ہونے چاہئیں اور ان کو سب سے زیادہ خیر خواہ سرکار کہنا چاہیے کیونکہ ان میں اتنی بڑی ہمدردی و ایثار ہے کہ انہوں نے اپنی جان بھی دیدی اور تمام منافع جو طاعت سے ان کو پہنچتے وہ دوسری رعایا کے لئے پھوڑ دیئے صاحبو ایہ وہی ایثار ہے جو فرعون میں تھا دین چھوڑ کر دنیا پر قناعت کی۔ (ایضاً ص ۲۹)

غرض جیسے فرعون کی ہمت تھی ویسی ہی آج کل کے ایثار والوں کی ہمت بھی ہے اور فرعون کی وہ ہمت ہمت کہلانے کے قابل نہیں۔ تو ہمارا یہ ایثار بھی ایثار نہیں ہے بس معلوم ہوا کہ جو اپنا خیر خواہ نہیں، وہ دوسروں کا بھی خیر خواہ نہیں۔ تو ہم جو کچھ کر رہے ہیں محض رسم کے لئے کر رہے ہیں۔ (ایضاً ص ۲۹)

۱۶۔ علماء کا استیصال اسلام

کا استیصال ہے،

آجکل ایک جماعت علماء کے استیصال کی فکر میں ہے اور طرح طرح کی تدبیریں ان کے اثر کے مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے برا بھلا بھی ان کو کہا جا رہا ہے مگر علماء اس بارے میں خاموش ہیں وہ بہت احتیاط کرتے ہیں۔ وہ کسی کو بلا ضرورت برا نہیں

کہتے۔ مگر اب ضرورت ہے کہ ان لوگوں کی رعایت نہ کی جائے جبکہ وہ ہماری رعایت نہیں کرتے اور وہ ضرورت یہ ہے کہ عوام ان کی باتوں سے گمراہ ہو رہے ہیں یہ لیڈر دین کے دخل دیتے اور اپنی رائے سے جس طرح چاہتے ہیں، احکام میں تحریف کر دیتے ہیں اور عوام الناس میں صاف کہتا ہوں کہ یہ لوگ گمراہ ہیں مسلمانوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ دین کا مدار اعتقاد پر ہے کہ مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتقاد ہو اور رسول اعتقاد جمعی ہو گا جبکہ حاملان شریعت سے اعتقاد ہو کیونکہ عوام کو رسول کی معرفت علماء ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے جس نے علماء کو نہیں پہچایا وہ رسول کو نہیں پہچان سکتا۔ پس جو لوگ علماء کے استیصال کی فکر میں ہیں وہ خود مسلمانوں کی بلکہ عالم کے استیصال کی فکر میں ہیں۔

(المربطہ ص ۱۳، ۱۴)

بعض لوگ ان حجرہ نشینوں سے کہتے ہیں کہ تم بھی حجرہ نشینوں کا جواب میدان میں نکلو حجرہ میں کیوں بیٹھے ہو۔ مگر ان سے کوئی پوچھے کہ حجرہ والوں کو میدان میں آنے کون دیتا ہے ان سے کام کون لیتا ہے اگر میدان میں نکلیں گے تو شریعت کے اتباع کا حکم کریں جو آجکل لوگوں کے نزدیک تعصب اور تنگی خیالی ہے پھر تم خود ہی یہ کہو گے کہ یہ مولوی ہمارے کام میں روڑے اٹھاتے ہیں ان کو حلال و حرام جاننا اور ناجائز ہی کی پڑی رہتی ہے اب میدان میں نکل کر نہ ان سے میدان کا کام ہو گا نہ خلوت کا دونوں سے گئے گزرے ہوئے۔ اس سے تو ان کا خلوت ہی میں رہنا اچھا اور ہم کو بھی خبر ہے جو لوگ میدان میں نکلے ہوئے ہیں وہ بھی ان حجرہ نشینوں ہی کی برکت سے کام کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ حجرہ والے ہر وقت مسلمانوں کی کامیابی اور صلاح و فلاح کی دعا کرتے رہتے ہیں مولانا فرماتے ہیں :-

سہ ہر کہ تہنا نادراں راہ را برید
ہم بون ہمت مراں رسید
صاحبو! دین کا سمجھنا ان لیڈروں کا کام نہیں ہے بلکہ یہ انہیں لوگوں کا کام ہے جنہوں نے حجرہ میں بیٹھ کر چراغوں کا دھواں پھانکتا ہے۔ اور پانی کی جگہ تیل پی لیا ہے۔ بعض طلباء کو ایسا واقعہ پیش آیا ہے کہ مذاق میں ان کو کبھی نے پانی کی جگہ تیل دیدیا۔ اور وہ مطالعہ میں اسے مصروف رکھتے کہ ان کو اصلاً اس کی خبر نہ ہوتی۔ (ایضاً ص ۲۲)

تو تحقیق اور تحقیق احکام ان علماء کا کام ہے لیڈروں کا کام نہیں غضب یہ کہ لیڈر علماء کا

کلام بھی تو نقل نہیں کرتے بلکہ اپنا کلام بیان کرتے ہیں اور اپنے کلام سے علماء کے کلام کو رد کرتے ہیں حالانکہ وہ اس بات کی بھی لیاقت نہیں رکھتے کہ علماء کے کلام کو سمجھ سکیں اس پر ان کا حوصلہ یہ ہے کہ علماء کو میدان میں نکلنے کی تاکید کرتے اور ان کو اپنی تقلید پر مجبور کرنا چاہتے ہیں صاحبو! میرے نزدیک اس وقت میدان میں نکلنے کا نہیں کیونکہ حدیث میں ہے ان راہیت شحامطاعا و دینا موثرۃ وہی متبعوا و اعجاب کل ذی رای برأیہ مغلیہ بخامتہ ففسد و اھل العامة۔

اور میرے نزدیک آجکل یہ سب علامات موجود ہیں اس لئے آجکل گوشہ نشینی لازم ہے مگر میں اپنی رائے پر اصرار نہیں کرتا اگر کسی عالی ہمت کے نزدیک ابھی ان علامات کے ظہور کا وقت نہ ہو تو بسم اللہ وہ میدان میں نکلے مگر اپنا ہجوں کو کیوں اپنے ساتھ کھینچتے ہیں آخر ایک کام یہ بھی تو ہے کہ خدا سے دعا کریں۔ تو ان کو اس کام کے واسطے رہنے دیں ایک جماعت اس کے واسطے بھی رہنا چاہیے۔ تقسیم عمل اچھی ہے مگر اسوس آجکل دعا کو لوگ عمل ہی نہیں سمجھتے۔ (ایضاً ص ۲۳ تا ۲۴)

۱۴۔ لیڈران قوم کے طریقہ شریعت کی نظر میں

آج لیڈروں نے فلاح دنیا کے طریقے کچھ اور سوچے ہیں۔ یہ وہ صورت اختیار کرتے ہیں جو یورپ نے اور غیر اقوام نے اختیار کی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ تدبیریں فلاح دنیا میں موثر نہیں مگر یہ ضرور کہوں گا کہ مسلمانوں کے واسطے مفید نہیں کیونکہ مسلمانوں میں ان تدبیر کی تاثیر سے ایک مانع موجود ہے وہ کیا؟ معصیت، خدا کی نافرمانی، اور یہ مانع کفار میں نہیں ہے کیونکہ وہ مکلف بالفروع نہیں وہ تو صرف ایمان کے مکلف ہیں ان کو کفر ہی کا عذاب ایسا سخت ہو گا کہ جس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں۔ بقیہ اعمال کی بابت نہ ان سے باز پرس ہے نہ ان پر کوئی نرا ہے۔ اور مسلمانوں سے کفر کا عذاب تو ہٹا ہوا ہے کیونکہ وہ محمد اللہ و ملت ایمان سے مشرف ہیں اس لئے ان کے اعمال پر باز پرس و گرفت ہوتی ہے جب یہ ایسے طریقے فلاح دنیا کے لئے اختیار کرتے ہیں جو خدا کے حکم کے خلاف ہیں تو ان کو کامیابی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ان تدبیر کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں تاکہ

۱۸۔ غیر قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے؟

اچھل ترقی کی پکار بہت ہے ہر شخص ترقی کا طالب ہے اور دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر بھرتا ہے اور ان کے لیڈر بار بار اس میں غور کرتے ہیں کہ دوسری قوموں کی ترقی کا راز کیا ہے مگر اب تک حقیقت تک کوئی نہیں پہنچا کسی نے کہا کہ یہ لوگ سود لیتے ہیں اس وجہ سے ترقی ہو رہی ہے مگر یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اگر اس میں یہ خاصیت ہوتی تو چاہے سب کے جو مسلمانوں لیتے ہیں ان کو بھی ترقی ہوتی حالانکہ دوسری قوموں کے مقابلہ وہ کچھ ترقی یافتہ نہیں ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ شریعت میں چونکہ تجارت کی بعض صورتوں کو ناجائز قرار دیا ہے اسلئے مسلمان ترقی نہیں کر سکتے مگر یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ معاملات میں حدود شریعہ کے پابند کتنے تاجر ہیں ذرا مجھے تو بتلاؤ ان اثراء و دواچار کے سوا کوئی نہ ملے گا۔ پھر ان مسلمان تاجروں کو ترقی کیوں نہیں ہوتی یہ کون سے ناجائز معاملات کو چھوڑ دیتے ہیں غرض سب کی مشق اسلام پر ہے کہ مذہب ہی ترقی سے مانع ہے۔ (العبرة بذل البقرة ص ۷۷)

غیر قوموں کی جو باتیں ترقی میں ذمیل ہیں وہ دوسری ہیں وہ ان کی خاص صفات ہیں جو انہوں نے آپ ہی کے گھر سے ہیں۔ مثلاً منتظم ہونا مستقل مزاج ہونا۔ پابند وقت ہونا۔ متعل ہونا، انجام کو سوچ کر کام کرنا صرف خوش سے نہ کام کرنا، ہوش سے کام لینا۔ آپس میں اتفاق و اتحاد کرنا۔ ایک دوسرے کے راز کو چھپانا۔ یہ سب باتیں وہ ہیں جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ اور ان احکام میں یہ خاصیت ہے کہ ان کے اختیار کرنے سے ترقی ہوتی ہے خواہ کوئی بھی اختیار کرے اب مسلمانوں نے تو ان احکام پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ نہ ان میں اتفاق و اتحاد ہے نہ رازداری کا مادہ ہے نہ انتظام ہے نہ وقت کی پابندی ہے نہ انجام دہی ہے جو کام کرتے ہیں جو شش سے کرتے ہیں ہوش سے نہیں کرتے، اسلئے ان کو تنزل ہے اور غیر قوموں کے ان کے گھر سے چرا کر ان باتوں پر عمل شروع کر دیا تو ان احکام کی خاصیت ظاہر ہوتی کہ ان کو ترقی ہونے لگی۔ پھر یہ سترہ ناقص ہے کیونکہ چور کو گھر کے اندر کی سب چیزیں معلوم نہیں ہوا کرتیں۔ اس کو وہی چیزیں ہاتھ لگتی ہیں جو ظاہر ہوں (یا تالے کھنچی میں ہوں) دبے ہوئے خزانے کی اطلاع اسے نہیں ہوا کرتی۔ اسلئے وہ پارس کی پتھری

دنیا میں مخالفت کی سزا بھگت لیں پس ان کی اور کفار کی ایسی مثال ہے جیسے ٹوٹی اور جوتا کہ ٹوٹی میں نجاست لگ جائے تو فوراً پھینک دی جاتی ہے اور اچھی طرح پاگ کرنے کے بعد اس کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اور جو تے میں ناپاکی لگ جائے تو اس کو پھینکتے نہیں ہیں بلکہ گردہ کر کام میں لے آتے ہیں۔ تو جس طرح ہر چیز کے پاک کرنے کا طریقہ مختلف ہے اسی طرح ہر قوم کی فلاح و ترقی کا طریقہ الگ ہے یہ ضروری نہیں کہ جو طریقہ ایک قوم کو نافع ہو وہ سب ہی کو نافع ہو۔ اور اگر ہم ان بھی لیں کہ یہ تدابیر ہم کو بھی نافع ہیں تب بھی ہم کو احکام الہیہ کا اتباع لازم ہے اور ان تدابیر غیر مشرورہ کا اختیار کرنا جائز نہیں۔ کیا شراب اور قمار و سود میں نفع نہیں، ضرور ہے خود نقص میں ارشاد ہے۔ قتل فیہما اشھد کبیر و منافع للناس (۱۱۱) مگر اس نفع کو لے کر کیا کریں جس کے ساتھ خدا کا غضب بھی ملا ہو اسلئے مسلمانوں کو وہی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں جو شریعت کے موافق ہوں اس کی یہی صورت ہے کہ عمل کا اہتمام کیا جاوے۔ اب لیڈر تدابیر تو خلاف شرع کرتے ہیں اور علماء کی شکایت کرتے ہیں کہ یہ ہمارے ساتھ مل کر کام نہیں کرتے میں کہتا ہوں کہ اعمال غیہ مشرورہ میں تو شرکت کر ہی نہیں سکتے اگر یہ اعمال مشرورہ تھی ہوں تب بھی یہ شکایت صحیح نہیں تھی کیونکہ مل کر کام کرنے کے معنی نہیں ہیں کہ سب کے سب ایک ہی کام کو لپٹ جائیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کام کر دیے جائیں جیسے لوہار، بڑھئی، معمار، مزدور سب مل کر مکان بناتے ہیں اس کے معنی تھوڑا ہی ہیں کہ ہر اینٹ کو لوہار بھی ہاتھ لگائے بڑھئی بھی ہاتھ لگائے۔ بلکہ اپنے اپنے کام پر ایک الگ کر رہا ہے پھر نتیجہ مجموعہ پر مرتب ہوتا ہے۔ اسی طرح لیڈر اگر شریعت کے موافق بھی تدبیر کریں تب بھی علماء کا یہ کام نہیں کہ وہ ان تدابیر میں عملی حصہ لیں بلکہ یہ کام عوام کا ہے یا لیڈروں کا علماء کا کام یہ ہے کہ جو تدبیر کرنا چاہا و اہل علماء سے استفتاء کر لو کہ جائز بھی ہے یا نہیں اور وہ اس کے متعلق حکم شرعی بتلا دیں گے تم اس پر عمل کرو۔ تمام متدن اقوام کا یہی طریقہ ہے کہ ان کے یہاں عملی محکمہ لگ ہوتا ہے یہ نہیں کیا جاتا کہ ایک کام کے لئے طلباء اور اساتذہ بھی اپنے پڑھنے میں بدستور لگے رہتے ہیں کام کرنے والی جماعت دوسری ہوتی ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ہر قسم کی فلاح اطاعت و عمل ہی سے حاصل ہوگی دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ اب چونکہ مسلمانوں نے عمل صالح ترک کر رکھا ہے تو دیکھ نتیجہ کیسی فلاح ہو رہی ہے ہر روز پہلے سے بدتر ہے (المراط ص ۱۵۸)۔

جو آپ کے گھر میں تھی اس کی انہیں خبر نہیں ہوئی مگر انہوں نے سبکا سمجھ کر اس کو چھوڑ دیا کیونکہ یارس کی پتھری دیکھنے میں تو پتھری ہی ہوتی ہے۔ اس کی خاصیت جسے معلوم ہو وہی اس کی قدر جان سکتا ہے نا واقف کے نزدیک کاپچ کا ٹکڑا اور بلور کا پتھر برابر ہے وہ یارس کی پتھری آپ کے گھر میں کیا ہے؟ ایمان و توحید و اعتقاد و رسالت نماز و روزہ وغیرہ۔ انھوں نے آپ کو اپنے گھر کی قدر نہیں اگر آپ میں وہ صفات ہوتیں جو دوسری قومیں آپ سے لے لی ہیں تو یارس کی پتھری کیسا سمجھ لے کر آپ کو وہ ترقی ہوتی جو غیر قوموں کے خواب میں بھی نہ آتی ہوگی۔ آپ کو وہ عروج حاصل ہوتا جو آپ کے اسلاف کو حاصل تھا کوئی ان کے ساتھ آنکھ نہ ملا سکتا تھا۔ مگر آج کل مسلمانوں کو اس اشاد الہی پر نظر نہیں۔ وعدا اللہ الذین آمنوا وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض ولیمکن لہم دینہم الذی اردتضی لہم ولیبدلنہم من بعد خوفہم امنًا ط یعبدونی ولا یشعرون بی شیئًا (الہکیت) اور یہ سمجھتے ہی نہیں کہ ان کاموں کو بھی ترقی میں کچھ دخل ہے حالانکہ اس آیت میں ایمان و عمل صالح پر صاف صاف وعدہ ہے استخلاف فی الارض اور تمکین کا۔ مگر مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ نماز روزہ اور ایمان میں بھی کچھ قوت ہے اور اس سے بھی ترقی ہوتی ہے۔ انھوں جس خزانے کو چور نے ناواقف ہو کر یا بیکار سمجھ کر چھوڑا تھا اس کی قیمت و قوت سے خود گھر والے بھی آج ناواقف ہیں یا بعض اعتبار سے بول کہتے کہ بیکار ہی سمجھتے ہیں۔

مگر ایسوں کو تو مسلمان بھی نہ کہنا چاہیے۔ یہ کاہے کے مسلمان جو روزہ کو بیکار سمجھیں مگر ایسے تو دوچار ہی نکلیں گے زیادہ وہی ہیں جو اپنے خزانے کی قیمت سے ناواقف اور اس کی طاقت سے بیخبر ہیں اسلئے ان اعمال کی بقدری کرتے ہیں۔ کوئی مسلمانوں کی حالت کا متبع کرے تو ان میں ہزاروں ایسے نکلیں گے جن کو کلمہ بھی نہیں آتا۔ اور لاکھوں ایسے ملیں گے جو نماز کو جانتے بھی نہیں کہ کس چیز کا نام ہے اور بہت سے ملیں گے جو کبھی سال میں ایک دو دفعہ پڑھ لیتے ہیں کبھی جی چاہا جمعہ کو بھی مسجد میں آجاتے ہیں اور جو تھوڑے سے اہلہ کے بندے یا بچوں وقت کی نمازوں کے پابند ہیں ان میں بھی قاعدے کے ساتھ صحیح طور پر ادا کرنے والے بہت کم ہیں کسی کار کو غلط ہے کسی کا سجدہ کسی کا قیوم فقود ہے کسی کا جلسہ، ایک گڑ بڑ کر رکھی ہے۔ تو اب آخر یہ کیا ہے؟ بقدری ہے یا نہیں۔ اور بخدا یہ بقدری اسی واسطے ہے کہ نماز کو صرف ثواب کا

کام سمجھ رکھا ہے اس کے دنیوی منافع کی ان کو خبر نہیں۔ بلکہ بعض جاہل تو نماز روزہ کو دنیوی ترقی سے مانع سمجھتے ہیں اور اگر ان کو حقیقت معلوم ہو جائے تو یہ خبر ہو جاتی کہ ان اعمال کو ترقی اور تمکین فی الارض میں بھی دخل ہے تو پھر دیکھئے کہ مسلمان کس شوق سے ان اعمال کو بجا لاتے ہیں گو اس نیت سے عمل کرنا اچھا نہیں خلوص کے خلاف طاعات سے ثمرات دنیا کا قصد نہ ہونا چاہیے۔ وہ تو مانع ہیں خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں الغرض ترقی کے اسباب تو آپ کے گھر میں موجود ہیں۔ اور آپ ہی کے گھر سے لوگوں نے چرا لے ہیں اور آپ کی یہ حالت ہے کہ دوسروں سے لیتے اور در بدر گدائی کرتے پھرتے ہیں پس وہ حال ہے۔

یکسید پر نان ترا بر فرق سر تو ہمیں جوئی لب ناں در بدر
تا بزانوی میمان قمر آب وز عطش و ز جوع کششی خراب

ردیوں کا فوکر تو سر پر رکھا ہوا ہے اور در بدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں دریا کے اندر کھڑے ہوئے ہیں اور پیاس کے مارے برہال ہے اب دیکھئے اسلام میں ایک تعلیم یہ ہے کہ جو شخص خاص مجلس میں ہو، مجلس عام میں نہ ہو تو اس کے پاس بدون اجازت کے نہ جاؤ۔ اور یہیں زنا نہ مکان ہی کی تخصیص نہیں بلکہ مردانہ مکان میں بھی اگر کوئی پردے چھوڑ کر بیٹھا ہے اس کے پاس بھی بدون اجازت کے نہ جانا چاہیے اور زنا نہ مکان میں جس طرح دوسروں کو استیذان کا حکم ہے خود گھر والے کو بھی حکم ہے کہ اپنے گھر میں بدون اطلاع کے نہ جائے ممکن ہے کہ کوئی پردہ دار عورت آتی ہو اگر تم بلا اطلاع چلے جاؤ اس کا سامنا ہو جائے گا۔ یاں ممکن ہے تمہاری ماں بہن ہی کسی وجہ سے تنگی بیٹھی ہو اپنے گھر میں کسی دفعہ عورتوں کو ایسا اتفاق پیش آتا ہے۔ اسلئے مردوں کو حکم ہے کہ اپنے گھر میں بھی بدون اطلاع کے نہ جائیں پھر اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ جب تم کسی کے پاس جانا چاہو اور وہ اجازت نہ دے بلکہ یہ کہہ دے کہ میں اس وقت نہیں مل سکتا پھر کسی وقت ملوں گا تو اس بات کو برا نہ مانو، بلکہ لوٹ آؤ وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا ہواذکر لکم اور اس میں حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ برتاؤ تمہارے دلوں کو زیادہ صاف رکھنے والا ہے کیونکہ ایسے وقت میں شر ماشرائے گھر کسی نے بلا بھی لیا تو انشراح و انبساط کے ساتھ وہ تم سے نہ ملے گا اسلئے کہ دل تو ملنے کو چاہتا ہی نہ تھا۔ تو یقیناً اس کے قلب پر تمہاری ملاقات سے گرائی ہوگی پھر ممکن ہے کہ اس گرائی کا احساس تم کو بھی ہو جائے تو اس سے

تم کو بھی دل میں شکایت ہوگی کہ کیسا روکھا آدمی ہے کیسا بدخلق ہے جس پر میرا اتنا گراں ہوا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ جب کوئی تہمدے کہ اس وقت نہیں مل سکتا۔ فوراً لوٹ آؤ۔ اب اس مسئلہ میں ہم لوگ کتنی کوتاہی کرتے ہیں استیذان کا سبق ہم لوگوں نے بالکل ہی بھلا دیا۔ مگر دوسری قویں اس پر عامل ہیں کوئی شخص کے کمرے میں بدون اجازت کے نہیں جا سکتا سو دیکھ لیجئے جو قویں اس پر عمل کر رہی ہیں ان میں باہم کیسا اتفاق ہے۔ آگے یہ ان کے تکلفات ہیں کہ استیذان کے لئے اپنے پیٹ کا کارڈ بھیجتے ہیں ہم کو ان تکلفات کی ضرورت نہیں بس زبانی اجازت لینا کافی ہے مگر ہماری نویہ حالت ہے کوئی پردے چھوڑ کر بیٹھا ہو جائے کوئی سو ہی رہا ہو مگر ان کا سلام اور صاف فضا ہوا لائیکہ شریعت میں سونے والے کی اس قدر رعایت ہے کہ حدیث میں آتا ہے۔

الْحَضْرَةُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَادَسْتَوَدُ

حضرت مقداد راوی ہیں کہ ایک بار یہ اور چند شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مہمان تھے۔ آپ جب رات کو ذرا دیر سے گھر میں تشریف لاتے اور یہ مہمان لیٹے ہوئے تو آپ بہت آہستہ آہستہ تشریف لاتے اور ایسی آواز سے سلام فرماتے کہ جانکنے والا تو سن لے، اور سونے والے کی نیند خراب نہ ہو، حالانکہ یہ وہ ذات ہے کہ اگر آپ قتل بھی کر دیں تو صحابہ کرام کو انکار نہ ہوتا۔ بلکہ آپ کے ہاتھ سے خوشی خوشی جان دینا ان کے نزدیک فخر تھا مگر پھر بھی آپ صحابہ رضی اللہ عنہم کی نیند کی اتنی رعایت فرماتے تھے مگر یہاں یہ حالت ہے کہ ہر وقت سلام اور ہر وقت مصافحہ ہے چاہے کسی کو تکلیف ہوتی ہو چنانچہ میرے یہاں اس قسم کی باتوں پر روک ٹوک اور انتظام بہت ہے جس پر رعایت فرماؤں اس نے مجھے بہت کچھ خطاب دے رکھے ہیں ایک صاحب نے تو میرے منہ پر کہا کہ ہم کو یہ طریقہ پسند نہیں۔ انگریزوں کا سا قانون، ہر بات میں انتظام ہر بات میں انتظام۔ افسوس گویا اسلام میں انتظام ہی نہیں۔ بس اسلام تو ان کے نزدیک بے انتظامی کا نام ہے۔ حالانکہ اسلام سے زیادہ انتظام کسی نے بھی نہیں کیا۔ ہر کام کا وقت مقرر ہے۔ نماز کا بھی روزہ کا بھی حج کا بھی، اور اتنا بڑا انتظام ہے ذرا ایک تاریخ سے حج موخر ہو جائے تو پھر سال بھر سے دے نہیں ہو سکتا تو کیا اس کو بھی انگریزی قانون کہو گے عیادت اور بیمار پر کسی کے لئے یہ قانون ہے وَاِذَا عَادَ اِحْدٰىكُمْ الْمَرِيضَ فَلْيَخْفِ الْجُلُوسَ۔ حدیث میں ہے کہ جب بیمار کی عیادت

کیا کرو تو اس کے پاس تھوڑی دیر بیٹھا کرو۔ کیونکہ بیمار کو زیادہ ہجوم سے تکلیف ہوتی ہے حضرات فقہار نے اس حکم کی حقیقت کو سمجھا دہ فرماتے ہیں کہ جس چیز سے خوش ہو وہ کام نہ کرو جس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ مثلاً کسی کو بدھ کے دن عیادت کرنے سے اعتقاد شرا ہوگا تو اس دن عیادت کر کے اس عقیدہ کی اصلاح کرو۔ کوئی زائد خشک ہوتا تو یوں کہتا کہ نہیں ایسے شخص کی عیادت بدھ ہی کے دن کرنا چاہیے تاکہ اس عقیدہ باطل کی مخالفت ہو تو اے صاحب پھر وہ عیادت ہی کیا ہوتی مناظرہ ہو گیا عیادت سے مقصود تو مریض کی دلجوئی ہے آپ کی اس مخالفت سے یہ مقصود کہاں حاصل ہوا بلکہ اس کو تو آپ کی صورت دیکھ کر دینی وحشت ہوگی کہ کجبت بدھ کے دن کہاں آؤ۔ دیکھئے اس کا کیا منحوس اثر ہوتا ہے تو وہ اس سے گھبراؤ گا بات چیت کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتظام فرمایا ہے۔ لاینت اُجی انتنان دون الثالث حتی یأتی رابع (دو حکم) یعنی جہاں تین آدمی بیٹھے ہوں وہاں دو شخص آہستہ آہستہ باتیں کریں اس سے تیسرے کی دلچسپی ہوگی کہ مجھ کو غیر سمجھا یہاں تک کہ چوتھا آجاوے تو اب دو شخص باتیں کر سکتے ہیں کیونکہ تیسرے کو باتوں کا شوق ہوگا تو وہ چوتھے سے کرنے لگے گا۔ پھر اس کو وہ بدگمانی نہ ہوگی۔ احتمال ہوگا کہ شاید اس چوتھے سے انخفا مقصود ہو اور کو اس تیسرے پر بھی احتمال ہوگا۔ سبحان اللہ نے کیسی ذرا ذرا سی باتوں کی رعایت فرمائی ہے اور میرے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ باوجود اتنے مشاغل کثیرہ کے کہ پھر بھی آپ نے معاشرت کے دقیق سے دقیق امور کو بھی نظر انداز نہیں فرمایا۔ کیا بدون نبوت کے ایسا ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔

کفار کا قول

اسی جامعیت کی تعلیم کو دیکھ کر تو کفار کہا کرتے تھے حضرات صحابہ رضے کہ تمہارے نبی نے تم کو ہر بات سکھلائی تھی کہ گناہ مومن بھی سکھلا دیا کفار نے تو یہ بات طعن سے کہی تھی مگر صحابہ نے فرمایا کہ ہاں بیشک ہم کو حضور نے سکھلایا ہے کہ بول و براز کے وقت قبلہ کی طرف منہ پائشت نہ کریں اور داہنے ہاتھ سے اپنے عضو کو نہ چھوئیں اور تین ڈھیلوں سے کم استنجے کے واسطے لئے جائیں اور ہڈی اور کوتلہ سے استنجہ نہ کریں تعلیم سن کر کفار کی آنکھیں کھل گئیں کہ واقعی بول و براز کے یہ آداب تو بدون تعلیم کے معلوم ہو ہی نہیں سکتے۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے انتظام کا کہ پیشاب پانچا نہ کے لئے بھی آداب مقرر ہیں پاک اور صفائی کا یہ قانون ہے کہ آپ فرماتے ہیں اِذَا اسْتَقِظَ اَحَدُكُمْ مِنْ مَنَامٍ

فلا یغسین یدہ فی اناضہ لانہ لایدری این باتت یدہ - جب کوئی سوکر اٹھے تو برتن میں ہاتھ نہ ڈالے کیا خراس کا ہاتھ کہاں کہاں پہونچا ہوگا بھلا یہ انتظام ہی نہیں تو اور کیا ہے نیز ارشاد ہے - خَلِّفُوا اَفْنِیتَکُمْ لَا تَشْبَثُوا بِالْیَمَنِ - اپنے گھر کے سامنے کامیدان صاف رکھا کرو یہود کی طرح نہ بنو۔ وہ صفائی کا اہتمام نہیں کرتے۔ سبحان اللہ! جب فساد و اربا کا اتنا اہتمام ہے تو خود گھر کی صفائی کا اہتمام کیا ہوگا اور جب گھر کا اتنا اہتمام ہے تو لباس کی صفائی کا کیا کچھ اہتمام نہ ہوگا۔ پھر بدن اور روح کی نظافت کا امر تو کیا کچھ ہوگا۔

ع "قیاس کن رنگستان من بہار مرا"

اسی سے عاقل سمجھ سکتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہر کی نظافت کا قول نظافت کا اتنا خیال ہے تو نظافت باطنی کا تو کس درجہ اہتمام ہوگا مگر آجکل مسلمانوں اپنے گھر کے اس سبق کو ایسا بھولے ہیں کہ اگر کوئی اس زمانے میں نظافت مکان و نظافت لباس و بدن کا اہتمام کرنے لگے تو اس کو عیسائی اور انگریز کہنے لگیں چنانچہ مدراس میں ایک انگریز اسلام لایا ایک روز وہ جامع مسجد میں تو گیا حوض کی نالی میں اس قدر رینٹ جما ہوا تھا جسے دیکھ کر گھن آتی تھی اس سے نہ رہا گیا اس نے ایک دو لوٹے پانی سے سب دھویا اور لوگوں سے کہا کہ صاحبو! ذرا نالی میں سے کچھ بھی رینٹ تو صاف کر دیا کرو۔ دیکھو کیسا برا معلوم ہوتا ہے تو لوگ کیا کہتے ہیں، معلوم ہوتا ہے تجھ میں ابھی عیسائیت کا اثر باقی ہے (ان اللہ وانا الیہ راجعون) بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ نظافت اسلامی کو کوئی دوسری قوم اختیار کر لے تو وہ اسلام سے نکل جائے اور انگریزوں کا کام ہو جائے۔ میں کہاں تک گناؤں، شریعت کے انتظام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتظام فرمایا ہے کہ ارشاد فرماتے ہیں - لایقولن احدکم خبثت نفسی و لایقولن قلست نفسی (او کہنا قتال) یعنی اگر جی متلائے تو خبثت نفسی نہ کہو کیونکہ مسلمان کا نفس خبثت نہیں ہوا کرتا بلکہ یوں کہو میرا جی مالتس کرتا ہے۔ متلا تہ ہے۔ سبحان اللہ آپ نے تو ہم کو بات کرنے کے بھی طریقے بتلائے ہیں۔ تو صاحب دوسری قوموں کی ترقی کا راز یہ ہے کہ انہوں نے آپ کے گھر سے یہ چند باتیں چرائی ہیں۔ انتظام، پابندی وقت و رازداری، اتحاد و اتفاق وغیرہ، اور ان اعمال کی خاصیت یہ ہے کہ جوان کو اختیار کرتا ہے اسے ترقی ہو جاتی ہے اسلئے دوسری قوموں کو ترقی ہو رہی ہے۔ اور آپ نے ان اعمال

کو ترک کر دیا ہے اسلئے آپ تنزل میں ہیں۔ پھر دوسری قوموں نے جوان اعمال کو اختیار کیا ہے وہ اختیار ناقص ہے اگر اختیار کامل ہوتا تو وہ نتیجہ ہوتا جو آپ کے اسلاف کو حاصل تھا۔ جرم و خاک آمیز چوں مجنوں کسند صاف گر باشد ندامت چوں کسند ایک خاک آمیز گھونٹ نے تو پنا دیا ہے اگر خالص جام پیئے تو نہ معلوم کہاں پہونچتے - (العبرة بذک البقرة ص ۲۹۵، ۵ ملخصاً)

۱۹۔ ہندو مسلم اتحاد کی خرابی

آجکل اتحاد و اتفاق کا بہت شوق ہے اسی جوش میں ایسے عالی مضامین اور باریک نکات سوچتے ہیں کہ (کیا کہنے) چنانچہ منصف ریگمیں ایک ہندو نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ جب تک ہم میں اتفاق نہ ہو کامیابی نہیں ہو سکتی پھر کہا، جانتے بھی ہو کہ ہم کے کیا معنی ہیں، ہم کے معنی ہیں ہندو اور مسلمان "ہا" سے مراد ہندو اور "میم" سے مراد مسلمان۔ پھر کہا کہ ہمارے ہندو بھائی ناخوش نہ ہوں کہ "ہا" ذرا سی ہے اور "میم" لمبا ہے بات یہ ہے کہ ہندو تو ہندوستان ہی کے اندر اندر ہیں یکہیں باہر سے نہیں آئے اور مسلمان عرب و ایران وغیرہ بہت دور سے آئے ہیں تو ان کی مسافت بہت لمبی ہے اس لئے ان کے واسطے "میم" اختیار کیا گیا۔ اور اس کو لمبا لکھا گیا ہے مگر اس شخص نے مسلمانوں کی بابت یہ خیال نہ کیا کہ شاید وہ یہ شبہ کرنے لگیں کہ "ہا" پہلے لکھا گیا اور "میم" کو پیچھے اور "ہا" کو میم کے سر پر سوار کیا گیا اس کی وجہ شاید اس کا جواب یہ دیا جائے کہ ہندو یہاں پہلے سے رہتے ہیں اور مسلمان بعد میں آئے ہیں اسلئے "ہا" کو پہلے اور میم کو پیچھے لایا گیا۔ مگر یہ شبہ پھر بھی باقی رہا کہ "ہا" کو "میم" کے سر پر سوار کیوں کیا گیا۔ اس کو پہلے ہی لکھا ہوتا۔ مگر "میم" سے "ہا" الگ لکھا ہوتا۔ مگر شاید اتفاق و اتحاد ظاہر کرنے کے لئے خلط کی ضرورت پڑی ہو اسلئے ایسا کیا گیا۔

واہیات خرافات یہ آجکل کے نکات ہیں جن کے سر نہ پاؤں غیروں کی تعریف مگر لوگ ہیں کہ ان مضامین پر لٹو ہیں اور ستم یہ کہ مسلمان بھی اس تقریر کے مداح تھے۔ جن کے یہاں نکات و معارف ایسے ایسے عالی ہیں کہ دوسری قوموں کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اسلامی علوم و نکات کے ہوتے ہوئے یہ واہیات باتیں

اس قابل ہیں کہ مسلمان ان کی تعریف کریں؟ مگر ہماری قوم میں ایک خاص مرض یہ بھی ہے کہ دوسری قوموں کے افعال کی مدح کرتے ہیں اور اپنے گھر کی چیزوں پر ان کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ ایک زمانہ انگریزوں کی پرستش کا تھا۔ اس وقت تک ان کے افعال اور معاشرت کی مدح سرائی ہوتی تھی اور مسلمانوں کے طرز معاشرت پر ان کے طرز معاشرت کو ترجیح دی جاتی تھی اب ہندوؤں کی پرستش کا دور ہے اب ان کی باتوں کی مدح دینا ہوتی ہے غرض یہ ہمیشہ دوسروں ہی کی پرستش میں رہیں گے ان میں یہ حوصلہ نہیں رہا کہ اپنی دولت کے سامنے کسی کی چیز کو بھی منہ نہ لگائیں بلکہ سب کو اسی کے سامنے جھکانے کی کوشش کریں۔ افسوس ایسے مسلمان اب زمین کے اندر پہنچ گئے اب تو ایسے مسلمان رہ گئے ہیں کہ ایک صاحب کا مقولہ اخبار میں شائع ہوا تھا کہ اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی تو فلاں شخص (یعنی گاندھی) نبوت کا مستحق تھا۔ افسوس اس شخص کو مسلمانوں میں کوئی اس قابل نہ ملا تھا ایک ہندو ہی اس قابل ملا تھا اے صاحبو! میں پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کون سا اسلام ہے جس میں بھی ہونے کے لئے ایمان کی بھی شرط نہیں۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد کی مخالفت نہ کرو۔ جس اتحاد کا نتیجہ ہو کہ مسلمان اس سے اتحاد کی طرف جائیں اس اتحاد پر صد نفریں ہے۔

پھر کوئی ان لیڈر صاحب سے پوچھے کہ جب تمہارے نزدیک ہندو بھی قابل نبوت ہو سکتا ہے تو تم نے اس قضیہ بشرطہ کو کیوں... تکلیف دی کہ اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی کیونکہ ایسی نبوت تو ختم نہیں ہوئی اس لئے کہ ختم تو وہ چیز ہوتی ہے جو پہلے شروع بھی ہو چکی ہو اور ایسی نبوت تو آج تک شروع ہی نہیں ہوئی جس میں اسلام و ایمان کی قید نہ ہو جب وہ شروع نہیں ہوئی تو ختم بھی نہیں ہوتی بلکہ یہ تو تم نے نبوت کی قسم نکالی ہے اس کے لئے یہ شرط بڑھانا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی محض حماقت ہے تم کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ نبوت اسلام تو ختم ہو چکی اب میں نبوت کی ایک دوسری قسم ایجاد کرتا ہوں جس میں ایمان و اسلام کی بھی قید نہیں اور اس قسم کا پہلا نبی فلاں شخص ہے۔ غرض عیب کرنے کے لئے بھی ہنر چاہیے کفر یہ کلمہ بھی زبان سے نکالا اور وہ بھی بے تکا۔ جس کے سر نہ پاؤں اور کمال یہ کہ ایسے کلمات کو سننا بھی نہ کر سکے یہ لوگ لیڈر اور مسلمانوں کے مقتدا بنے ہوئے ہیں کوئی عالم یا جاہل اس شخص کو متنبہ نہیں کرتا کہ ان کلمات ناشائستہ سے ایمان میں فرق آگیا تو اپنے ایمان کی سلائی

کی فکر کر۔ اگر وہ اس سے توبہ نہ کرے تب تو ظاہر ہے اور اگر توبہ کرے جب بھی یہ لوگ لیڈر اور مقتدا بننے کے قابل نہیں کیونکہ ایسے کلمات سے معلوم ہو گیا کہ اسلام کی تعلیم سے بالکل کورے اور نرے جاہل ہیں۔ سو توبہ کر کے گناہ تو معاف ہو جائے گا مگر ایک منٹ کی توبہ سے علم تو حاصل نہ ہو گا۔

غرض مسلمانوں کے اندر یہ بڑا مرض پیدا ہو گیا ہے کہ ان کو دوسری قوموں کی باتیں زیادہ وقیع معلوم ہوتی ہیں اور اپنے علماء کو چھوڑ کر یہ دوسری قوموں کے افراد کی عظمت کرنے لگتے ہیں اور پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قومیت اسلامی کے حامی و محافظ ہیں ڈلے پتھر کیا قومیت اسلامی کی ہی حمایت ہے کہ تم اسلامی تعلیم کو دوسرے مذاہب کی تعلیم کے آگے اسلامی علماء اور دوسری قوموں کے افراد کے سامنے ذلیل و پست کر دو واللہ یہی لوگ اسلام اور مسلمانوں کو ذلیل کرتے ہیں اور یہی قومیت اسلامی کو برباد کرتے ہیں۔ ان تحریکات سے خدا توان کو مطلوب ہے ہی نہیں مگر جس قومیت کا یہ رات دن رونار دتے ہیں اس کی بھی جسطیں اکھاڑ رہے ہیں۔

قومیت کی حفاظت کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی قوم کو دوسروں قومیت کی حفاظت سے مستغنی ثابت کر دو۔ خود محتاج نہ بنو دوسروں کو اپنا محتاج بناؤ۔ اپنی تعلیم کے مقابلے میں کسی کی تعلیم کو ترجیح نہ دو۔ اور ثابت کر دکھاؤ کہ اسلامی تعلیم سے بہتر کوئی تعلیم نہیں۔ نیز اپنے علماء کے سامنے دنیا بھر کے عقلا کو پست اور نیچا دکھا دو اور اس کے لئے تم کو کچھ کرنا نہیں پڑے گا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ احمدیہ اسلام میں وہ لوگ موجود ہیں جن کے سامنے دنیا بھر کے سیاستدان طفل مکتب ہیں قرآن و حدیث کے برابر سیاسی اور تمدنی تعلیم کون سی کتاب میں ہے ذرا کوئی لاکر تو دکھائے پھر جو لوگ قرآن و حدیث کے حقیقی طور پر سمجھنے والے ہیں ان کے برابر کوئی بھی عاقل یا سیاستدان ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، بخدا ہرگز نہیں۔ مگر یہ ساری خرابی ان علماء کی ہے جو ہر بات میں ان لیڈروں کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ اور لیڈروں کی طرح خود بھی کافروں کی سیاستی کے معتقد ہیں ان کی علانیہ مدح کرتے اور مبر پر بیٹھ کر وعظوں میں توہم سے ان کا نام لیتے ہیں اور یہ وہ علماء ہیں جنہوں نے کسی صاحب دل کی جوتیاں سیدھی نہیں کیں۔ محض کتاب پر ٹھکر عالم ہو گئے ہیں۔ مگر

نہ کہہ کر چہرہ برفروخت رہی داند
نہ کہہ کر سر بتر اشد قلف دری داند
(محاسن اسلام ص ۳۴ تا ۳۷)

چنانچہ بعض نام نہاد علماء ہندوؤں کے ساتھ ان تحریکات
غیر مسلم کی حمایت میں شریک ہوئے ہیں اور یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اپنی روش
پر چلنے سے تو کچھ زیادہ قدر نہیں ہوتی نہ زیادہ دولت ملتی ہے لاؤ وہی طریقہ اختیار کریں، جو
ہندوؤں نے اختیار کیا ہے شاید اس طرح کچھ زیادہ وقعت مل جائے۔ اور اگر انہوں نے
سوراج لے لیا تو اس میں ہمارا بھی حصہ رہے گا۔ اگر ہم الگ رہے تو بالکل محروم رہیں گے،
افسوس مسلمان ہو کر غیر بریظ، بڑی شرم کی بات ہے۔ ان لوگوں نے یہ خیال نہ کیا
کہ جو طریقہ کفار کے لئے حصول عزت کا ہے مسلمان کے لئے وہ طریقہ نہیں ہے۔ مسلمان
کبھی دوسری قوموں کی اتباع کر کے ترقی نہیں کر سکتا اگر وہ مسلمان ہے۔ مسلمان کی ساری
عزت اسی میں ہے کہ وہ اپنے طریقے پر قائم رہے اور کسی حال میں احکام شریعت سے
تجاوز نہ کرے اسی سے فلاح ہوتی ہے گوساماں کم ہو اور اس کے خلاف میں فلاح نہیں
گوساماں زیادہ ہو۔

دیکھئے اس کی تائید میں ایک باریک نکتہ بتلاتا ہوں۔ وہ
قتال کی اجازت یہ کہ مسلمانوں کو مکہ میں رہتے ہوئے قتال کی اجازت نہیں
ہوتی۔ مدینے میں پہونچ کر اجازت ہوتی اس کی کیا وجہ ہے۔ ظاہر میں سمجھتے ہیں کہ قلت
جماعت و قلت اسباب اس کا سبب تھا یہ خلاف تحقیق ہے کیونکہ مدینہ ہی پہونچ کر کیا
جماعت بڑھ گئی تھی کفار کا پھر بھی غلبہ تھا۔ مدینہ کی جماعت تمام عرب کے مقابلہ میں کیا چیز
تھی بلکہ اگر یہ دیکھا جائے کہ تمام کفار عالم کے مقابلہ میں یہ اجازت ہوتی تھی۔ تب تو مدینہ
کیا سارا عرب بھی قلیل تھا۔ اسی طرح مدینہ پہونچ کر سامان میں کیا زیادتی ہو گئی تھی۔ کفار
ہمیشہ نہایت ساز و سامان سے مقابلہ کرتے تھے اور مسلمانان مدینہ کی یہ حالت تھی کہ
بعض مواقع میں ایک ایک سواری میں سات آٹھ آدمی شریک ہوتے تھے بعض دفعہ
چند آدمیوں میں ایک ہتھیار مشترک ہوتا تھا پس یہ کہنا بالکل واقع کے خلاف ہے
کہ مدینہ میں جا کر جماعت و سامان کی زیادات اس اجازت کا سبب ہوئی انھوں سے خود

معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کفار کے مقابلہ میں اکثر مواقع میں اس قدر کم ہوتی تھی کہ
ملائکہ کا جوڑ لگایا جاتا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وانزل جنود الم تر وھا۔ اور ارشاد ہے۔
بلی ان تصبروا و تتقوا و یا تو کھر من خور ہم ہذا ایمد د کھر د بکم بخمستہ الآف
من الملائکۃ مسومین ط۔

اور یہ صورت نزول ملائکہ کی مکہ میں رہتے ہوئے بھی ممکن تھی، مگر
اخلاق کا رسوخ پھر بھی اس صورت کو اختیار کر کے وہاں۔۔۔ اجازت نہ دی
گئی تو اس کی کوئی وجہ بتلانی چاہیے اہل ظاہر اس کی شافی وجہ نہیں بتلا سکتے محققین نے فرمایا
ہے کہ اصل بات یہ تھی کہ مکہ میں مسلمانوں کے اندر اخلاق حمیدہ اخلاص و صبر و تقویٰ وغیرہ
کامل طور پر راسخ نہ ہوئے تھے اس وقت اگر اجازت قتل کی ہو جاتی تو سارا مقابلہ جو شش
غضب و انتقام للنفس کے لئے ہوتا محض اخلاص و اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے نہ ہوتا اور اس
حالت میں وہ اس قابل نہ ہوتے کہ ملائکہ کی جماعت سے ان کی امداد کی جائے اور حمایت الہی
ان کے شامل حال ہو۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں بلی ان تصبروا و تتقوا ۱۔ کی شرط بتلا رہی
ہے کہ حمایت الہی اس وقت متوجہ ہوتی ہے جبکہ مسلمان صبر و تقویٰ میں راسخ ہوں اور تقویٰ
کے معنی ہیں۔ احتراز عما نہی اللہ عنہ و امثال ما امر بہ
جس میں اخلاص اور احتراز عن الریاء و عن شابۃ النفس بھی داخل ہے اور مدینہ میں پہونچ کر
یہ اخلاق راسخ ہو گئے تھے مہاجرین کو مکہ میں رہنے کی حالت میں کفار کی ایذا پر صبر کرنے
سے نفس کی مقاومت سہل ہو گئی نیز قوت غضب نفسانی ضعیف بلکہ زائل ہو گئی تھی۔ پھر
ہجرت کے وقت جب انہوں نے اپنے وطن و اہل و عیال و مال و دولت سب پر خاک
والدی، توان کی محبت الہی کامل ہو گئی اور محبت دنیا ان کے قلب سے بالکل نکل گئی
انصار مدینہ نے مہاجرین کے ساتھ جو سلوک کیا اس سے ان
انصار مدینہ کے قلوب بھی محبت الہی سے لبریز اور محبت دنیا سے پاک
ہو گئے تھے چنانچہ انصار نے خوش خوش ان حضرات کو اپنے مکانات و اموال میں شریک
کرنا چاہا۔ بلکہ بعض صحابہ نے تو یہاں تک کیا کہ ایک مہاجر صحابی سے کہا کہ تم میرے بھائی
ہو گئے ہو اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنا تمام مال آدھوں آدھوں تقسیم کر کے نصف خود
لوں اور نصف تم کو دیدوں اور میرے پاس دو میبیاں ہیں ان میں سے جوں سی تم کو پسند ہو

میں اسے طلاق دیکر ابھی الگ کر دوں عدت گزرنے کے بعد تم اس سے نکاح کر لینا۔ مہاجر نے انکو دعادی کہ خدا تمہارے مال و عیال میں برکت دے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں تم مجھے بازار کا راستہ بتا دو۔ میں تجارت کر کے اپنا گذر کر دینگا۔

واقعہ ہجرت سے امتحان

غرض واقعہ ہجرت سے مہاجرین و انصار دونوں کا امتحان ہو گیا جس میں وہ کامل اترے اس کے بعد ان کو اجازت قتال دی گئی کہ اب جو کچھ کریں گے محض خدا کے لئے کریں گے اس وقت یہ اس قابل ہوں گے کہ حیات الہی ان کا ساتھ دے اور ملائکہ رحمت ان کی مدد کریں۔ چنانچہ حضرات صحابہؓ کے واقعات اس پر شاہد ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے تھے خدا کے لئے کرتے تھے۔ حتیٰ کہ شنیسی میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کو موکرہ قتال میں پکھاڑا اور ذبح کا ارادہ کیا۔ مزنا کیا نہ کرتا۔ اس کجخت نے آپ کے چہرہ مبارک پر تھوکا۔ اب چاہیے تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو فوراً ہی ذبح کر ڈالتے۔ مگر تھوکنے آپ فوراً اس کے سینہ پر سے کھڑے ہو گئے اور فوراً اسے چھوڑ دیا وہ یہودی بڑا متعجب ہوا کہ میری اس ترکیب کے بعد تو ان کو چاہیے تھا کہ مجھے کسی طرح جیتا نہ چھوڑتے۔ مگر انہوں نے برعکس معاملہ کیا آخر اس سے نذر ہا گیا۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اس کی وجہ پوچھی کہ آپ نے اگر مجھ کو کافر سمجھ کر قتل کرنا چاہا تھا تو تھوکنے کے بعد کیوں رہا کر دیا۔ اس فعل سے نہ میرا کفر زائل ہوا نہ عداوت سابقہ ختم ہوئی بلکہ اور زیادہ ہو گئی تھی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ واقعی اس فعل کے بعد میرا رہا کر دینا بظاہر عجیب ہے مگر بات یہ ہے کہ اول جب میں نے تجھ پر حملہ کیا تو اس وقت بجز رضائے حق کے مجھے کچھ مطلوب نہ تھا۔ اور جب تو نے میرے اوپر تھوکا تو مجھے غصہ اور جوش انتقام پیدا ہوا میں نے دیکھا کہ اب میرا تجھے قتل کرنا محض خدا کے لئے نہ ہوگا بلکہ اس میں نفس کی بھی آمیزش ہوگی اور میں نے نہ چاہا کہ نفس کے لئے کام کر کے اپنے عمل کو ضائع کر دوں اس لئے تجھے رہا کر دیا۔ یہودی یہ سن کر فوراً مسلمان ہو گیا، اور سمجھ گیا کہ واقعی یہی مذہب حق ہے جس میں شرک ہے اس درجہ نفرت و لائی گئی ہے کہ کوئی کام نفس کے لئے نہ کر دے بلکہ محض خدا کے لئے ہر کام کر دے دوستی اور دشمنی میں بھی نفس کی آمیزش سے روکا گیا ہے اب ہماری حالت یہ ہے کہ جو لوگ خدمت اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جو نفس کے واسطے کام کرتے ہیں اپنے ذرا ذرا سے کارناموں کو اچھالتے اور اخباروں میں شائع کرتے ہیں احکام الہی کی پروا نہیں کرتے بس ان کا مقصد یہ ہے کہ کام ہونا چاہیے۔

خواہ شریعت کے موافق ہو۔ یا مخالف۔ چنڈہ میں جائز و ناجائز کی پروا نہیں۔ صرف میں حلال و حرام کا خیال نہیں پھر حمایت الہی ان کے ساتھ کیونکر ہو۔

بلکہ اب تو یہ کہا جاتا ہے کہ مسئلے مسائل کو ابھی رہنے دو، اس مسئلے سے اجتناب وقت تو کام کرنا چاہیے۔ بعد کو مسئلے مسائل دیکھے جاویں گے۔

لنا اللہ وانا لہ راجعون۔ ان صاحبوں کو یہ خبر نہیں کہ مسئلے مسائل کے بغیر تو مسلمان کو نہ دنیوی فلاح ہو سکتی ہے نہ اخروی اور سب سے زیادہ اخلاص نیت کی ضرورت ہے جس کا یہاں صفر ہے ہمارے بزرگان دین جو بحمد اللہ اب بھی موجود ہیں وہ محض خدا کے واسطے کام کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ کسی کام میں شریعت سے ایک ایچ بھی بڑھنا نہیں چاہتے اسی طرح جو ان حضرات کے صحبت یافتہ ہیں وہ بھی نفس کے لئے کام نہیں کرتے۔ (ایضاً صفحہ ۳۷۱ تا ۳۷۲)

اور جن کو خدا کے ساتھ تعلق حاصل نہیں ان کی یہ حالت ہے کہ آج ان کے کچھ فتویٰ ہیں اور کل کو جہاں اغراض بدلیں ساتھ کے ساتھ ان کے فتویٰ بھی بدل گئے۔ ارے یہ کیا تھہرے یہ کیسا اسلام ہے جو اغراض کے تابع ہے۔ مسلمان کو تو ایسا ہونا چاہیے۔ ع۔

”یہ کچھ خزان دیکھ کر ان دیکھ کر گو“

مسلمان کو تو ایسا ہونا چاہیے کہ اس ذات کے ساتھ علاقہ رکھے جو ہمیشہ باقی رہے دلی ہے اور اغراض فانیہ کی نفی کرنی چاہیے اور ان کے متعلق کا لاجب الاقلین کہہ دینا چاہیے۔ خلیل آساد ملک یقین زن صدائے لاجب الاقلین زن

پہلے سب علماء کا فتویٰ تھا کہ ریل میں بدون ٹکٹ سفر کرنا حرام ہے مگر اب حالت یہ ہے کہ اس کو جائز کر دیا ہے۔ بہت لوگ جو علماء و طلباء کہلاتے ہیں بے ٹکٹ سفر کرنے لگے۔

ایک فتویٰ

میرے پاس ایک طالب علم کا خط آیا کہ بدون ٹکٹ کے ریل میں سفر کرنے کو جائز سمجھتا ہوں اور میرے باپ اس سے منع کرتے ہیں ان کے باپ انگریزی خواں دنیا دار تھے اللہ اکبر۔ کبھی وہ زمانہ تھا کہ عربی خواں اس سے منع کرتے تھے اور انگریزی خواں اس کو جائز کہتے، اب یہ حالت ہے کہ عربی خواں جائز کہتا ہے اور انگریزی خواں منع کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ انگریزی داں کسی دانائینی (عارف) کا ذبح کیا ہوا تھا۔ (ایضاً صفحہ ۳۷۴)

اسی طرح اللہ کا ہو رہے تب اسلام کامل ہوتا ہے ورنہ وقت پر سب لکھا پڑھا

غائب ہو جاتا ہے۔ صاحبو! بدون صحبت اہل اللہ کے توحید بھی کامل نہیں ہوتی۔ کیونکہ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی سے خوف و طمع نہ ہو۔

موجودہ برپائے دیریزی و زلزلہ چہ نولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش بنائے کس ہمیں ست بنیاد توحید بس

اسلام میں قناعت کرنے ہیں اس کی تکمیل کی فکر نہیں کرتے۔ نہ نماز کی فکر ہے نہ روزہ کی، بس ہم کو تکمیل اسلام کی فکر کرنا چاہیے۔ اسلام کامل یہ ہے کہ انسان پورا اللہ والا ہو جائے جب اس کا ایک شعبہ یہ ہے کہ دین کو دنیا اور اغراض کے تابع نہ بنایا جاوے۔ اس وقت دین کی فہم حاصل ہوگی۔ اور جس کے اوپر اغراض نفسانی کا غلبہ ہوگا اسے دین کی سمجھ حاصل نہ ہوگی۔ ایسے ہی علماء کا یہ خیال ہے کہ ذبیحہ لگاؤ شعرا اسلام نہیں۔ (ایضاً صفحہ ۴)

تبلیغ دین کی ممانعت آجکل ایسے بھی مسلمان ہیں جو تبلیغ کے کام میں روٹے اٹکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کام چھوڑ دو۔ اس سے ہندو مسلم اتحاد میں فرق آتا ہے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) ان کے یہاں ابھی ہندوؤں سے اتحاد ہی چلا آ رہا ہے۔ مگر مزہ یہ ہے کہ اتحاد تو جانین سے ہوا کرتا ہے مگر ان کا اتحاد ایک طرف ہے کہ ہندو تو ان کی ذرا سی بھی رعایت نہیں کرتے۔ جہاں ان کو موقع ملتا ہے مسلمانوں کو مرتد کر لیتے ہیں۔ آبر و دیریزی باجان و مال کے درپے ہو جاتے ہیں مگر ان حضرات کا اتحاد اب بھی باقی ہے۔ بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ جب مسلمانوں کو ہندو مرتد بنا رہے ہیں تو کیسا مسلمانوں کو مرتد ہونے دیا جائے، ان کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی جائے اگر ان کی یہی رائے ہے تو اس کا یہ مطلب ہو کہ چاہے ایمان جاتا رہے مگر اتحاد نہ جائے تو ایسے اتحاد پر لعنت ہے جس کے واسطے ایمان و اسلام کی بھی پروا نہ رہے۔ جن صاحبوں کی یہ رائے ہو وہ خود تبلیغ نہ کریں مگر جو لوگ یہ کام کرنا چاہتے ہیں ان کو کیس لئے روکتے ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۵)

اور تماشہ یہ ہے کہ آجکل جو یہ تحریک اسنادِ فتنہ ارتداد چل رہی ہے اس کے متعلق ایسے بعض علماء نے ایک اشتہار میں شائع کیا ہے کہ یہ تحریک چونکہ خالص مذہبی تحریک ہے اسلئے اس میں ہر طبقہ کو شریک ہونا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں اس میں غیر مذہب کا بھی دخل تھا۔ دل میں تو ان تحریکات کی حقیقت کو سمجھ ہی رہے تھے۔

مگر احمدیہ برسوں کے بعد اب زبان سے بھی اقرار کر لیا کہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں۔ پھر یہ معلوم ان میں شرکت نہ کرنے والوں کو کافر و فاسق کیوں بنایا گیا۔ یقیناً جو ام مذہب و غیر مذہب سے مرکب ہو گا وہ فرض واجب کبھی نہیں ہو سکتا، مگر قسم یہ ہے کہ ان لوگوں نے تحریکات سابقہ کی شرکت کو فرض واجب بنا رکھا ہے۔

صاحبو! مذہب میں بھی سیاسیات کا بہت بڑا حصہ ہے مگر وہ سب مذہب کے تابع ہے اور وہ سیاسیات خالص مذہبی سیاسیات ہیں ان میں غیر مذہب کا دخل ہرگز نہیں ہو سکتا، اگر ان حضرات کے نزدیک پہلی تحریکات مذہبی سیاسیات میں داخل نہیں تو ان کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ تحریک اسنادِ ارتداد خالص مذہبی تحریک ہے اس میں سب کو شریک ہونا چاہیے اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلی تحریکات خالص مذہبی نہ تھیں تو پھر وہ مذہبی سیاسیات میں داخل نہ تھیں۔ (ایضاً صفحہ ۶)

۲۰۔ مقصود بالذات رضا حق ہے نہ کہ سلطنت

آجکل جو عوام حکومت کے مقابلہ میں بہادر بنے ہوئے ہیں، اس کا راز یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہم کو پوچھنا کون ہے ہاں جو لوگ مشہور ہیں۔ ان کا حکومت سے مقابلہ کرنا بیشک بہادری ہے کیونکہ ان کو ہر وقت اپنے اوپر خطرہ ہے گو اس سے بحث نہیں کہ یہ بہادری جائز ہے یا حرام، اور یہ دینی شجاعت ہے یا نفسانی تہور، اس کو علماء رسے پوچھو، مگر صاف بات یہ ہے کہ علماء بھی سب نہیں ہیں بلکہ علماء بھی حقیقت میں وہ ہیں جو لیڈروں کے تابع نہ ہوں حکم شرعی کے تابع ہوں۔ اور جو علماء لیڈروں کے تابع ہوں ان کی حالت یہ ہے کہ دانش اگر لیڈر آج اپنی رائے کو بدل دیں تو یہ علماء بھی ادھر ہی ہو جائیں مگر ہیں عقلمند کہ فوراً فتویٰ نہ بدلیں گے کیونکہ اس سے عوام کو صاف معلوم ہو جائیگا کہ ان کے فتوے لیڈروں کی رائے کے تابع ہیں بلکہ آہستہ آہستہ اپنی رائے کو بدل کر لیڈروں کے راستے پر آجائیں گے۔

آجکل علماء لیڈروں کے ساتھ دو وجہ سے ہیں یا تو اس لئے کہ ان سے علیحدگی میں زوال جاہ کا اندیشہ ہے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو علماء ان کے ساتھ ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے ان تحریکات

میں شرکت نہ کی تو مد رسہ کا چندہ بند ہو جائے گا کوئی مد رسہ کی اعانت نہ کرے گا ایک عالم نے مجھے لکھا تھا کہ ان تحریکات سے علیحدگی کا نتیجہ ہوگا کہ تم اکیلے رہ جاؤ گے کوئی تمہارے ساتھ نہ ہوگا۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے خدا کا ساتھ کافی ہے اور کسی کے ساتھ ہونے کی ضرورت نہیں لعنت ہے ایسے جاہ و مال پر جس سے مخلوق کی رضا مقصود ہو۔

مسلمانوں کی شان تو یہ ہونا چاہیے کہ رضائے الہی کے سامنے اس کو کسی پروا نہ ہو۔ اگر مخلوق اس کو پاگل بنا کر چھوڑ دے مگر خدا راضی ہو تو وہی اس کے لئے سلطنت ہے اگر وہ پاگل بھی ہے تو کس کا پاگل ہے

ماگر تکلش و گردیوانہ ایم
اس کے نزدیک جو خدا کا دیوانہ نہ ہو وہ خود دیوانہ ہے
اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد
عرش را دید و در خانہ نشد
مگر ان کی دیوانی عقل کی دیوانگی نہیں بلکہ مستی عقل سے ان پر ایک نشہ سوار ہے۔ یہ وہ دیوانگی ہے جس پر ہزار عقلیں تیراں ہیں
او گل سرخ ست تو از خوش مخواں
مست عقل است او تو بخوش مخواں

کوئی تو اسے نیند میں پڑا سو رہا ہے کہ روٹی نہیں ملی، فاقہ گداز رہا ہے اور یہ اسلئے نیند میں ہے کہ کھا بہت گیا ہے۔ بہت کھانے سے بھی نیند آیا کرتی ہے۔ اسی طرح کوئی تو اسلئے بخون ہے کہ اس کے پاس عقل نہیں اور کوئی اس لئے بخون ہے کہ غلبہ عقل سے مست ہو گیا ہے یہ لوگ مصالح کو مصالح کی طرح پیس ڈالتے ہیں۔ ان کی بڑی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ ایک کو راضی کر لیں
مصلحت دیدن آنست کہ یاران ہمہ کار
بگذارند خشم طرہ یاری گیرند

یاد رکھو سلطنت مقصود بالذات نہیں بلکہ اصل مقصود رضائے حق ہے **رضائے حق** اگر ہم سے خدا راضی نہ ہو تو ہم سلطنت کی حالت میں فرعون ہیں۔ اور لعنت ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم فرعون کے مشابہ ہوں اگر سلطنت مقصود بالذات ہوتی تو فرعون و ہامان و مردود و شاد بڑے مقرب ہونے چاہئیں حالانکہ وہ مردود ہیں معلوم ہوا کہ سلطنت وہی مطلوب ہے جس میں رضائے حق بھی ساتھ ساتھ ہو اور جس سلطنت میں رضائے حق نہ ہو وہ

و بال جان ہے اگر ہم سے خدا راضی ہو تو ہم پاخانہ اٹھانے پر بھی راضی ہیں اور اسی حالت میں ہم بادشاہ ہیں۔ آخر حضرت ابراہیم بن ادہم کیا تمہارے نزدیک پاگل تھے۔ ان کو تو سلطنت ملی ہوئی تھی۔ پھر کیوں چھوڑی محض اس لئے کہ مقصود میں خلل واقع ہوتا تھا۔ معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود دوسری چیز ہے کہ اگر اس میں خلل واقع ہونے لگے تو اس وقت ترک سلطنت ہی سلطنت ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم ہر فن کے امام ہیں۔ حدیث میں ثقہ اور محدث ہیں اور فقہاء میں فقیہ اور صوفیہ میں تو امام ہیں۔ ان کو کوئی پاگل نہیں کہہ سکتا جو ان کو پاگل کہے وہ خود پاگل ہے۔ پھر دیکھو تو انہوں نے کیا کیا۔ جب رضائے حق میں سلطنت کو مزاحم دیکھا تو بادشاہت پر لات مار کر الگ ہو گئے۔

حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو سلطنت مضر مقصود نہ تھی، تو ان کو اجازت دی گئی کہ منصب خلافت کو قبول کریں اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کے لئے مضر مقصود تھی تو ان کے لئے محکم ہے لاتین مال یتیم و لا تقضین بین اثنین۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ مقصود رضائے حق ہے اگر سلطنت سے مقصود میں خلل واقع ہو تو اس وقت اس سے منع کیا جائے گا، حضرت ابو ذرؓ تو اتباع احکام کا ارادہ بھی کرتے تھے ان کو جب بھی تضاؤ حکومت کی اجازت نہ دی گئی اور تم تو اتباع احکام کا بھی قصد نہیں کرتے۔ اس حالت کا تم کو کیونکر اجازت دی جاسکتی ہے چنانچہ دیکھ لو کہ جو لوگ ابھی محظوظ ازمانہ ہوا پچائیت میں مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ ان کے کتنے فیصلے شریعت کے موافق ہوتے تھے اور وہ خود اتباع احکام کتنے کرتے تھے حالت یہ تھی کہ وہ خود لوگوں کے دباے ہوئے ہیں اور پچائیت میں فیصلہ کر رہے ہیں جن میں اکثر فیصلے خلاف شریعت ہوتے تھے اگر ان لوگوں کو سلطنت مل جاتی تو مخلوق کو کچا کھا جاتے تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ اس ظلم کی حالت میں تم کو سلطنت دیدیں۔ ارے اگر تم بادشاہ بن جاتے تو نہ معلوم مخلوق کا کیا حال ہوتا۔ بڑی خیر ہوتی کہ خدا نے گنہگار کو ناخن ہی نہ دیئے اتنا ہی فرق دیکھ لو اپنے میں اور ان لوگوں میں جن کو خدا نے سلطنت دے رکھی ہے کہ تم نے اپنے مخالفوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا، اور اہل سلطنت نے تمہارے ساتھ باوجود تمہاری اس مخالفت کے کیا برتاؤ کیا اگر تم بادشاہ ہوتے اور اس وقت تمہاری ساتھ کوئی اس طرح مقابلہ سے پیش آتا جیسا تم اس وقت سلطنت کے ساتھ برتاؤ کر رہے ہو تو نہ

کتنوں کو پھانسی پر لٹکاتے اور ساری خرابی اس کی ہے کہ تم صرف سلطنت کو مقصود سمجھتے ہو
رہنا ہے حق کو مقصود نہیں سمجھتے ہوا سلتے تم کو خلاف شرع اقوال و افعال سے درباک نہیں
(تقلیل الاختلاط مع الانام ص ۶۳ تا ۶۴)

۲۱۔ تشبہ بالکفار مذہبی کاموں میں حرام ہے۔

میں ایجادات یورپ سے انتفاع کو منع نہیں کرتا۔ ہاں تشبہ اور کورانہ تقلید سے منع
کرتا ہوں۔ اور تشبہ بالکفار جو شریعت میں حرام ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ تشبہ بالکفار امور مذہبی
میں تو حرام ہے اور شعار قومی میں مکروہ تحریمی ہے باقی ایجادات و انتظامات میں جائز ہے وہ
درحقیقت تشبہ ہی نہیں۔ بعض لوگ ان احکام کو شریعت سے خارج سمجھتے ہیں اسلئے
میں نے اس مضمون کو بیان کر دیا کہ شعار قومی میں بھی تشبہ حرام ہے گو قسم اول کے درجے میں
نہ ہو مگر پیشاب دیاخانہ میں فرق ہونے سے پیشاب پینا گوارا کر لے گا؟ ہرگز نہیں! بعض لوگ
یہ کہتے ہیں کہ ہم نے کوٹ پتلون پہن کر ٹوپی تو اسلامی پہن لی ہے اب تشبہ کہاں رہا میں کہتا ہوں
تشبہ کامل نہ ہی ناقص تو ہوا اگر آپ ایسا کر سکیں کہ سارا لباس زنانه پہن کر اوپر سے مردانہ ٹوپی
پہن لیں اور اسی حلیہ سے محفل میں جا سکیں تو ہم آپ کو اسلامی ٹوپی اور کفری پانجامہ کی بھی اجازت
دیدیں گے۔

صاحبو! مشتبہ صورت بھی منوع ہے۔ ہمارے یہاں ایک

مشتبہ صورت۔ رعبلم کنویں کے پاس پانجامہ دھو رہے تھے میں نے پوچھا یہ
پانجامہ پاک ہے یا ناپاک۔ کہا مشتبہ ہے۔ میں نے کہا پھر تم اس کو کنویں کے پاس دھوئے
ہو اور یہی ہاتھ ڈول رسی کو لگاتے ہو، جس سے سارا کنواں مشتبہ ہو جائے گا تم انقاہ سے
نکلو ہدایہ پڑھ کر بھی پاکی ناپاکی کا خیال نہیں۔ کہنے لگے مجھے عقل نہیں۔ میں نے کہا۔ اس جواب
سے جرم کی توفی ہو گئی مگر ضرورت اخراج کی نفی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اخراج کے لئے یہ ضرور نہیں کہ
جرم ہی برا اخراج ہو بلکہ کم عقلی بھی موجب اخراج ہے۔ غرض ان کو خانقاہ سے نکال دیا گیا۔ تو آپ
نے دیکھا کہ مشتبہ پانجامہ کو ناپاک ہی کا حکم دیا گیا۔ جیسے ناپاک کپڑوں کا دھونا کنویں کے
پاس جرم ہے ایسے ہی مشتبہ کپڑے کا دھونا بھی جرم ہے اسی طرح آپ اس کو بھی سمجھ لیجئے

کہ اسلامی ٹوپی اور کفری پانجامہ پہننے سے گو آپ بالکل ناپاک نہ ہوں گے مگر مشتبہ تو ہو جائیں گے
اور اسلام نے مشتبہ صورت سے بھی منع کیا ہے۔

صاحبو! کیا حیرت نہیں ہے کہ ایک برطانوی حرنیل کو تو یہ حق ہو کہ وہ جرمنی و روسی کو جرم
قرار دیدے کیونکہ وہ برطانویہ کا دشمن ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق نہ ہو کہ آپ دشمنان
خدا کی وضع کو جرم قرار دیں مگر اسلام میں تعصب نہیں۔ چنانچہ تشبہ بالکفار کے مسئلہ میں شریعت نے
تفصیل کی ہے کہ جو چیز کفار ہی کے پاس ہو اور مسلمانوں کے یہاں اس کا بدل نہ ہو اور وہ شئی کفار
کی شعار قومی یا امر مذہبی نہ ہو تو اس کا اختیار کرنا جائز ہے جیسے بندوق طوپ، ہوائی جہاز، موٹر
وغیرہ چنانچہ ایک بزرگ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ کے دست
مبارک میں بندوق ہے اور آپ اس کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں نغم السلاخ کہ یہ بہت
اچھا ہتھیار ہے۔ میں اس خواب سے استدلال نہیں کرتا صرف تائیداً بیان کر دیا ورنہ اصل
استدلال قواعد فقہیہ ہے۔ اس قاعدہ کی بناء پر نہ ہم ایجادات سے منع کرتے ہیں اور نہ ایجادات
یورپ کے استعمال سے منع کرتے ہیں۔ گو اسلام میں ایجادات کی تعلیم بھی نہیں ہے اور یہ اسلام
کا کمال ہے کہ اس میں صرف مقاصد کی تعلیم ہے غیر مقاصد کی تعلیم نہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے
بی، اے، کے اسکول میں جوتہ بنانے کی تعلیم نہیں ہوتی۔ اور یہ اس کے لئے نقص نہیں بلکہ کمال
ہے اور اگر اسکول میں بی، اے کے ساتھ جوتہ سینے اور پانجامہ کمانے کی بھی تعلیم دی جاتی تو تو یہ
اس کے لئے نقص ہوگا۔ کمال نہ ہوگا۔

اسلام کی تعلیم حکیم محمود خاں کا یہ کمال تھا کہ وہ جوتہ بنانے کی ترکیب نہیں سکھلاتے
تھے ہاں یہ بتلاتے تھے کہ جوتہ اس طرح مت سلواؤ کہ آس کی
میں بھری ہوئی ہوں جس سے پر زخمی ہو جاوے۔ اسی طرح اسلام ایجادات نہیں سکھلاتا
ہاں یہ سکھلاتا ہے کہ کسی ایجاد کو اس طرح نہ اختیار کرو جس سے دین میں خلل ہو یا جان کا خطرہ ہو اسی
طرح یہ بتلاتا ہے کہ بے ضرورت ایجادات کے درپے ہو کر ضروری کاموں کو ضائع نہ کرو اور
ضروری ایجادات میں بھی اس کا لحاظ رکھو کہ موہوم منفعت کے لئے قطرہ توبہ کا تحمل نہ کرو۔
غرض اصول تو ہر ایجاد کے متعلق بتلا دیئے ہیں مگر ان کی ترتیب نہیں بتائی کیونکہ
یہ مقصود اسلام سے الگ ہیں اور کمال اسی کا نام ہے کہ مقصود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ یہ تو
ان ایجادات کا حکم تھا جن کا بدل مسلمانوں کے یہاں نہیں ہے اور جو ایجاد ایسی ہوں جس کا بدل

مسلمانوں کے یہاں بھی موجود ہے اس میں تشبیہ مکروہ ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فارسی کمان کے استعمال سے منع فرمایا ہے کہ اس کا بدل مسلمانوں کے پاس عربی کمان موجود دھتی اور دونوں کی منفعت برابر تھی صرف ساخت کا فرق تھا۔

غرض اسلام میں تعصب نہیں جیسا کہ اس تفصیل سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ ہاں اسلام میں عزت ہے کہ جو چیز مسلمانوں کے پاس بھی ہے۔ اور کفار کے پاس بھی ہے صرف وضع قطع کا فرق ہے اس میں اسلام نے تشبیہ بالکفار سے منع کیا ہے کہ اس میں علاوہ گناہ کے ایک عیبت بھی تو ہے کہ بلا وجہ اپنے کو دوسری قوموں کا محتاج ظاہر کیا جاوے۔ مگر اچکل مسلمانوں میں عزت نہیں رہی کہ یہ اپنے گھر سے بے خبر ہو کر بلکہ یوں کہتے کہ اپنے گھر کو آگ لگا دو دوسروں کی عادات و معاشرت کا اتباع کرنے لگے، بس ان کی مثال ایسی ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں

یک سید پر نان نزار فرق سر تو ہی جوئی لب ناں در بدر
تا بز انوی میان قمر آب وز عطش و ز جوع کشستی خراب

چنانچہ اچکل بے پردگی میں بھی مسلمان یورپ کی تقلید کرنے لگے ہیں حالانکہ یورپ بے پردگی والے عورتوں کی آزادی سے بہت گھبرائے ہیں، اسی طرح بعض لوگ عورتوں کو مردوں کے ساتھ مساوات دینا چاہتے ہیں یہ سبق بھی یورپ ہی سے سیکھا ہے اور یورپ والے اس سے گھبرائے ہیں کیونکہ عورتوں نے ناظمہ بند کر رکھا ہے۔ اخبارات کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اہل یورپ کو عورتوں نے کیا ریشان کر رکھا ہے۔

صاحبو! اسلام کی تعلیم کی قدر کرو۔ اسلام کی تعلیم کی قدر کرو!! اسلام کی تعلیم یہ ہے۔ ولہن مثل الذی علیہن بالمعروف وللرجال علیہن در جتہ یعنی حقوق میں تو عورتیں مردوں کے مساوی ہیں۔ مگر وجہ میں مرد بڑھے ہوئے ہیں جس کو دوسرے مرقام پر صاف طور سے بیان فرمایا ہے۔ الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضہن علی بعضہن بالانفاقا من اموالہم کہ مرد عورتوں پر سردار ہیں کیونکہ خدا نے ان کو فضیلت دی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عورتیں مردوں کی امام نہیں بن سکتیں نہ ان پر حکومت کر سکتی ہیں۔ وللرجال علیہن در جتہ کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔ والحد عنہن حکیم کہ اللہ زبردست ہیں اگر وہ چاہتے تو مرد و عورت دونوں کو برابر کر دیتے۔ مگر وہ حکیم بھی ہیں۔ حکمت کا تقاضہ یہی ہے کہ برابر نہ ہوں اگر عورتوں کو آزادی دے دی جائے تو پھر

ان کی آزادی کی روک تھام بہت دشوار ہوگی جیسا کہ اہل یورپ کو دشواریاں پیش آ رہی ہیں کیونکہ اول تو آزادی کی روک تھام عقل سے ہوتی ہے اور عورتوں سے عقل نہیں ان کا ناقص العقل ہونا مشاہد ہے۔ دوسرے طبعی قاعدہ ہے کہ جو قوت ایک زمانہ تک بند رہی ہو جب اس کو آزادی ملتی ہے تو ایک دم سے ابل پڑتی ہے، جیسے امریکہ والے ایک عرصہ تک جاہل رہے جب ان کو تعلیم حاصل ہوئی تو ایک دم سے ایسے ابل پڑے کہ اپنے استاد سے بھی آگے بڑھ گئے اس قاعدے کی بناء پر ہندوستان کی عورتوں کو بلکہ مسلمانوں کی عورتیں کو تو ہرگز آزادی دینا مناسب نہیں کیونکہ اب تک تو وہ قید میں رہیں اگر ان کو آزادی مل گئی تو یقیناً ایک دم ابل پڑیں گے۔ غرض اسلام میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ مساوات تو نہیں ہے مگر حقوق کی اس قدر رعایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مسابقت کی ہے۔

(الحکود والقیود ص ۱۹ تا ۲۳)

۲۲۔ اچکل کے مسلمانوں کا حال۔

اچکل مسلمانوں کی رال پکیتی ہے دوسری قوموں کے سامان عیش دیکھ کر مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ خیر اور سلامتی اس میں ہے کہ ان کو دنیا زیادہ نہ ملے اگر کم زیادہ مال دیا جاتا تو رات دن دنیا کی فکر میں رہتے، آخرت سے بالکل غافل ہو جاتے۔

کانپوریں دو شخص شب قدر میں ایک بڑا سا ڈھیلا رومال سے ڈھک کر بیٹھے اور رات بھر دعا کرتے رہے کہ اے اللہ اس کو سونا بنادے وغیرہ میں کسی مولوی سے سن گئے تھے کہ شب قدر میں دعا قبول ہوتی ہے، وہ ظالم یہ دعا کرنے بیٹھے صبح کو خوشی خوشی جو رومال کھولا تو وہ ڈھیلا کا ڈھیلا ہی تھا۔ بڑے حیران ہوئے کہ شب قدر میں دعا کیوں نہ قبول ہوئی ایک درزی نے کہا کہ اللہ میاں حکیم ہیں، وہی دعا قبول فرماتے ہیں جو بندے کے لئے مصلحت ہو، خدا کا شکر کر دو کہ یہ سونا نہ بنا دے تم آپس میں ہی مکر ٹ جاتے۔ واقعی سچ کہا۔ بعض لوگوں کیلئے یہی حکمت ہے کہ ان کو سامان عیش زیادہ نہ دیا جائے۔

اس پر شایداں کو یہ شبہ ہو کہ ہماری نیت تو یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ ہم کو سامان زیادہ دیں تو خوب نیک کام کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خوب خرچ کریں۔ تو وہ یاد رکھیں کہ

اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ تم کو کیا خبر ہے کہ اس وقت جو ارادے اور نیتیں ہیں زیادہ مال ملنے کے بعد باقی رہیں گے یا نہیں۔ اس کو تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر خوش نیت کون ہوگا۔ مگر حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ سے فرمایا کہ تمہاری کیا حالت ہوگی۔ جبکہ میرے بعد ممالک و بلاد مفتوح ہوں گے۔ اور تمہارے پاس کثرت سے مال و متاع اور غلام خدام ہوں گے۔ صحابہ نے کہا کہ یا رسول اللہ! اس وقت ہم اللہ کی عبادت کے واسطے فارغ ہو جائیں گے۔ نتفرغ للعبادة وكفى المؤمنة حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، تمہاری یہی حالت اچھی ہے جو آجکل ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے زیادہ مال کو پسند نہیں کیا حالانکہ ان حضرات نے واقعی زیادہ سامان ہونے پر عبادات میں پہلے سے زیادہ ترقی کی۔ اور دنیا میں نہ کم نہیں ہوئے پھر تمہارے لئے کثرت مال کیونکر مفید ہو سکتی ہے۔

بس مسلمانوں کو دوسری قوموں کی حالت دیکھ کر رال نہ ٹپکانا چاہیے۔ ۱۰ اذلث عجلت لہم طغیانہم فی حیاتہم الدنیا۔ ان کو سب راحت نہیں دی گئی اور مسلمانوں کے واسطے راحت جنت میں ہے پس مسلمان کو اتنی دنیا حاصل کرنی چاہئے کہ پیٹ بھر کے روٹی مل جائے اور کستر عورت کے لئے کپڑا اور رہنے کو مختصر مکان۔ اور اتنا بھلا اللہ اکثر مسلمانوں کو آجکل حاصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو صحابہؓ کو اتنا بھی سامان میسر نہ تھا ہم لوگ تو اس زمانے کے اعتبار سے آجکل بادشاہ ہیں کیونکہ حدیث میں ہے من اصبہ معافی فی جسدہ امنانی سر بہ وجعۃ فتوت یومہ۔ نکاحنا حیضت لہ الدنیا بحد اخیوہا۔ کہ جو شخص اس حالت میں صبح کرے کہ بدن میں صحت ہو اور نفس میں بے فکری ہو، ایک دن کا کھانا پاس ہو اس کو تمام دنیا مل گئی۔ جب صحت اور اطمینان کے ساتھ ایک دن کا کھانا گھر میں موجود ہو تو یوں سمجھو کہ تمام دنیا گھر میں آگئی اگلے دن کی فکر نہ کرو۔ ص ۷۔

”مترکس از بلائے کہ شب در میا نیست“

جس مصیبت کے درمیان رات حائل ہو اس سے اندیشہ نہ کرو، جب کل ہوگی دیکھا جاوے گا کیا خبر کل کو تم بھی ہو گے یا نہیں۔ ایک بزرگ اسی کو فرماتے ہیں ۷۷
چوں ترانہ نے دخر قانے بود ہرین موئے تو بیکانے بود۔

غرض حق تعالیٰ کی محبت ہے کہ بعض لوگوں کو عزیز رکھتے ہیں اس کو کیا خبر کہ امیر ہونے کے بعد وہ کیسا ہوتا۔ ایسے شخص کو ثواب دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نیت صالحہ عطا فرمادیتے ہیں۔ اس کیلئے یہ نیت ہی درجات عالیہ حاصل کرنے کے لئے کافی ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو یوں خرچ کرتا۔ حق تعالیٰ کے یہاں عجیب و بار بار ہے وہاں کچھ اتفاق ہی پر دار و مدار نہیں۔ عزیز کے حق میں نیت اتفاق بھی بمنزلہ اتفاق کے ہے خود نص میں ارشاد ہے قول معروف و مغفور خیر من صدقة یتبعھا اذی و احلہ غنیء حمید پس جس کے پاس مال نہ ہو وہ حال اور قال سے ثواب حاصل کرے ۷۸

لا خیل عندک تہدیہا ولھمال

فلیسعد النطق المیسعد الحال۔

اور جس کو خدا نے مال دیا ہو وہ اپنی وسعت و ہمت کے موافق خرچ کر کے خدا کو راضی کرے (مطالعہ الاسوال ص ۷۸)

۲۳۔ جدید تسلیم یافتہ کا غلط استدلال

صحابہ ایسے جاں نثار تھے انہوں نے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ ترک تاہر کی طرف دیکھا اس وقت سب نے تاہر چھوڑ دیا جس کا یہ اثر ہوا کہ اس سے پہلے کم آیات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ کوئی تو طبعاً نہیں بلکہ اس فعل میں طبعی خاصیت ہے اور یہ طبعی تدبیر ہے اس لئے آئندہ کے لئے آپ نے اجازت دیدی اور فرمایا انتم اعلم بامور دنیا کم کہ اپنے دنیاوی کاموں کو تم ہی زیادہ جانتے ہو اس سے نو تعلیم یافتہ نے یہ مضمون نکالا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دنیاوی امور میں بالکل دخل نہیں دیا۔ بلکہ ان کو ہماری رائے پر چھوڑ دیا ہے کہ جو طریقہ مناسب سمجھیں اختیار کریں یہ مولویوں کی زیادتی تھے کہ دنیاوی معاملات میں بھی دخل دیتے تھے کہ فلاں تجارت حرام ہے فلاں جائز ہے اور اس طرح بیع کرنا جائز نہیں۔ اس طرح اجارہ کرنا فاسد ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں کہتا ہوں کہ اگر انتم اعلم بامور دنیا کم کا یہ مطلب ہے تو کیا قرآن کی ان آیتوں کو جن میں ربا، سود اور اکل اسواں بالباطل اور رشوت وغیرہ کو حرام کیا گیا ہے، قرآن سے نکال دو گے؟ اور ہزار احادیث بھی جن میں بیوع و اجارات و نکاح و طلاق و ہبہ و میراث کے احکام مذکور ہیں۔ حدیث کی کتابوں سے نکال

باہر کر دے؟ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو یہ دعویٰ کیونکر صحیح ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیاوی معاملات میں دخل نہیں دیا۔ معلوم ہوا کہ تم نے اس حدیث کا مطلب غلط سمجھا۔ بلکہ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ امور دنیا جو تجربہ کے متعلق ہیں، ان کو تم زیادہ جانتے ہو بانی ان امور کے۔ . . . متعلق جو احکام ہیں ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی زیادہ جانتے ہیں۔ مگر چونکہ واقعہ تاہر کسی کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ نبی کیسے ہیں جن کو حقائق اشیاء کا صحیح علم حاصل نہیں ہو اس شبہ کو رفع کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انتم اعلم ماور دنیا کم جس کا حاصل یہ ہے کہ تجربات کا جاننا نبی کے لئے ضروری نہیں بلکہ ضروری حقائق کا علم ضروری ہے۔ (البسر بالصبر ص ۷)

۲۲۔ ہر اتفاق نہ محمود ہے اور نہ ہر اختلاف مذموم

خوب سمجھ لو کہ اتفاق صرف اسی وقت مطلوب و محمود ہے جبکہ دین کو مفید ہو، اور نا اتفاق جب ہی مذموم ہے کہ دین کو مضر ہو اور اگر اتفاق دین کو مضر اور نا اتفاقی دین کو مفید ہو تو اس وقت وہ نا اتفاقی مطلوب ہوگی۔ اہل دنیا تک اپنے معاملات میں اس کو خوب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی مقدمہ میں مدعی اور مدعی علیہ عدالت سے مرافعہ کرتے ہیں تو اس وقت دونوں کے بھی نہیں کہا جاتا کہ تم دونوں اپنے اپنے دعوے سے دست بردار ہو جاؤ کیونکہ اس دعوے سے تمہارے اندر نا اتفاقی پیدا ہو گئی ہے اور نا اتفاقی مذموم ہے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص خلاف حق پر ہے اس سے کہا جاتا ہے کہ تم حق کی طرف رجوع کرو اور ناحق پر اصرار کو چھوڑ دو۔ بلکہ بعض معاملات میں اگر کبھی صاحب حق دعوے سے دست بردار بھی ہو جاوے تو گورنمنٹ مدعی ہو جاتی ہے اور وہ حق کی حمایت کرتی ہے۔ صاحبو! اگر نا اتفاقی مطلقاً مذموم ہے تو چاہیے کہ کوئی عدالت میں دائر ہو تو نج مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو سزا دیا کرے کیونکہ نا اتفاقی کے جرم دونوں ہیں۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا اور عقلاً کبھی ایسی رائے دے سکتے ہیں۔ مگر یہاں سب یہ کہتے ہیں کہ گو نا اتفاقی دونوں طرف سے ہے مگر ایک طرف سے حمایت حق کے لئے ہے اور دوسری طرف سے حمایت باطل کے لئے۔ پس تفتیش و تحقیق کے بعد جو شخص حق پر ہو اس کی ڈگری ہونا چاہیے اور عدالت کو اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ یہاں تو سب کا اتفاق ہے کہ نا اتفاقی مطلقاً مذموم نہیں مگر انوس دین کے معاملے میں اس قاعدہ سے کام نہیں لیا جاتا۔ بلکہ یہاں دونوں سے کہتے ہیں کہ نا اتفاقی چھوڑ دو۔ اور اتفاق پیدا کرو۔

صاحبو! آخر یہاں پر کیوں نہیں دیکھا جاتا کہ ان دونوں میں سے حق کا ساتھ دینا چاہیے کس کی نا اتفاقی حمایت حق کے لئے ہے۔ اور کس کی حمایت باطل کے لئے پھر جو حق پر ہو اس کا ساتھ دیا جاوے اور جو باطل پر ہو صرف اسی کو دبایا جاوے اور آپ جو دونوں کو اتفاق کا امر کرتے ہیں۔ تو بتلائیے صاحب حق صاحب باطل کے ساتھ کیونکر اتفاق کرے۔ دونوں طرف سے اگر اتفاق ہوگا تو عقلاً اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ صاحب حق کو چھوڑ دے اور دونوں باطل پر ہو جائیں۔ یعنی دین دار کو چھوڑ کر بد دین ہو جائے ایک یہ کہ دین دار تو دین پر قائم رہے اور بد دینی چھوڑ دے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کچھ تو دیندار دین کو چھوڑ دے۔ اور کچھ بد دین بد دینی کو چھوڑ دے اس طرح دونوں طرف سے اتفاق ہو سکتا ہے اب عقلاً خود فیصلہ کر لیں کہ ان میں سے کون سی صورت عقل کے مطابق ہے۔ یقیناً صرف دوسری ہی صورت کو عقل کے مطابق نہ کہا جاوے گا کہ دیندار تو دین پر قائم رہے اور بد دین بد دینی کو چھوڑ دے۔ اور اس کا حاصل یہی ہے کہ دیندار کو تو بد دین سے نا اتفاقی کا حق ہے مگر بد دین دیندار سے نا اتفاقی کا حق نہیں بلکہ اس کو دیندار کے ساتھ اتفاقی کرنا چاہیے۔

صاحبو! یہ وہ افتراق ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیدا کیا ہے۔ کیونکہ آپ کی نبوت سے پہلے سب لوگ کفر پر متفق تھے آپ نے اگر اس نا اتفاقی کو توڑ دیا۔ اور باب بیٹوں کو باہم جدا کر دیا اور یہ وہ افتراق ہے جس کو حق تعالیٰ بشارت کے طور پر بیان فرماتے ہیں۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ تَشَقُّوا لَأَسْخِلَنَّ لَكُمْ فِرْقَانًا وَيَكْفُرُ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ** ط اس آیت میں حق تعالیٰ نے فرقان کو مایہ بشارت بتلایا ہے جس کو تقویٰ پر مرتب فرمایا ہے اور اس لئے قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ قرآن ہمیشہ جوڑتا ہی نہیں بلکہ کہیں جوڑتا ہے اور کہیں توڑتا ہے۔ جو لوگ حق پر ہوں ان کے ساتھ وصل کا حکم ہے اور جو باطل پر ہوں ان کیسیا ساتھ فصل کا حکم ہے۔

پس سخت غلطی ہے جس میں لوگ آجکل مبتلا ہیں کہ جہاں دو جماعتوں میں اختلاف دیکھتے ہیں دونوں کو مور و ملامت بناتے ہیں کہ تم کیسے مسلمان ہو کہ آپس میں اختلاف کرتے ہو! اور دونوں کو باہم اتفاق پر مجبور کرتے ہو جس کا مطلب سوا اس کے اور کیا ہے کہ دیندار کو بد دین ہو نا چاہیے۔ اور صاحب حق حق کو چھوڑ کر باطل طریقہ اختیار کرے

اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے بلکہ مقتضائے عقل یہ ہے کہ جب دو جماعتوں یا شخصوں میں اختلاف ہو تو اول معلوم کیا جاوے کہ حق پر کون ہے، اور ناحق پر کون؟ حق متعین ہو جاوے تو صاحب حق سے کچھ نہ کہا جاوے بلکہ اس کا ساتھ دیا جاوے اور صاحب باطل کو اس کی مخالفت سے روکا جائے۔ قرآن میں اس پر ایک جگہ نص ہے۔ قَتَالُوا الَّتِي تَبِغِي حَتَّى تَفْثِيَ اِلَى الْاَمْرِ اِلَهِ۔ اور اگر آپ کو تحقیق حق کی فرصت مایاقت نہیں تو آپ سے دخل دینے کو کس نے کہا ہے اپنے گھر بیٹھے اور تحقیق سے پہلے کسی کو برا نہ کہئے۔ (الانسداد للفساد ص ۳)

۲۵۔ حقیقت شریعت اعتدال کا نام ہے۔

اعتدال اوروں کے لئے تو فرضی ہے مگر شریعت کے لئے حقیقی ہے کہ اس کی ہر بات افراط و تفریط کے درمیان وسط ہے۔ اور وسط بھی بحرکت سین، یعنی وسط حقیقی کیونکہ ایک تو ہے وسط بسکون السین، یعنی وسط مطلق اور ایک وسط ہے بفتح السین، یہ ہے وسط حقیقی، اسی واسطے مشہور ہے کہ اوسط متحرک یعنی متعین نہیں کہ ادھر ادھر ہو سکتا ہے۔ اوسط ساکن یعنی متعین ہے۔ میں نے اس سے بھی زیادہ لطیف کر دیا کہ الساکن متحرک والمتحرک ساکن اور وسط بسکون السین پر چلنا آسان ہے اور جب اسے بدل دو یعنی سین کا فتح کر دو تو پھر مشکل ہوتا ہے کیونکہ وسط حقیقی ایک غیر منقسم شے ہے کیونکہ اگر اس کی تقسیم ہوگی تو پھر اس میں بھی طرین اور وسط نکلتے گا حالانکہ اس کو وسط حقیقی فرض کیا تھا۔ لہذا غلط، اور ظاہر ہے کہ غیر منقسم پر چلنا جیسا دشوار ہے۔ چنانچہ اگر کوئی کہے کہ بڑک پر اس طرح چلو کہ وہ جو بیچوں بچ کا سیدھا خط ہے۔ اس سے ادھر ادھر نہ ہو تو بہت مشکل ہے۔ ہاں اگر کسی نے وسط حقیقی میں ایک ڈورا کھینچ دیا تو اب اس کی سیدھ پر چلنا آسان ہے اور شریعت کی حقیقت ہے وسط حقیقی چنانچہ شریعت نے ہر چیز میں ایک وسط نکالا۔ جن و تہور میں شجاعت، خود و فوج میں عفت وسط نکالا۔ اسی طرح جزیرہ و بلاہت میں حکمت وسط نکالا ہے۔ یعنی جزیرہ تو یہ ہے جیسا کہ کسی طالب علم نے تیلی سے پوچھا کہ میل کے گلے میں گھنٹی کیوں باندھی۔ اس نے کہا جب تک گھنٹی کی آواز آتی رہے یہ معلوم رہے کہ چل رہا ہے اس نے کہا کہ کھڑا ہو کر خالی گردن ہلایا کرے اور جیسے کسی طالب علم نے اپنے باپ سے کہا کہ میں دو انڈوں کے سوا انڈے بنا سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا اچھا بناؤ، آپ نے کہا، ایک یہ ایک یہ، اور ان کا ایک مجموعہ، یہ تین ہوئے

پھر تین وہ اور ایک ان تینوں کا مجموعہ ہوا۔ دھلم جرائی بالایتنا ہی، باپ نے ان کی مقول کو ماکول کر دیا کہ ان دونوں میں سے ایک تو خود کھالیا۔ ایک دوسرے سے گودیدیا اور ان سے کہا وہ اٹھاؤ گے آپ نوش فرمائیں وہ انڈے کیسے تھے کہ ان سے سوانڈے ہو گئے کہ اب انہیں نظر نہ آئے۔ جیسے کسی استاد نے ایک بھنگے شاگرد سے کہا کہ ذرا فلائی بوتل تو اٹھا لاؤ اس نے کہا وہاں تو دو ہیں، کون سی اٹھا لاؤں۔ بھنگے کو ایک کے دو نظر آیا کرتے ہیں۔ استاد نے کہا نہیں ایک ہی ہے۔ اس نے کہا دو ہیں۔ استاد نے کہا اچھا دوسری بوتل تو ڈو ڈو۔ اس نے ایک توڑی وہ دونوں ٹوٹ گئیں، اسی طرح ان کو بہت سے انڈے نظر آتے تھے کہ دو غائب ہوئے تو سب ہی غائب ہو گئے۔ یہ جزیرہ کہلاتا ہے۔ یہ عقل کا ہیضہ ہے ایک اکل کا ہیضہ ہوتا ہے اس کے مقابل میں ایک بہت ہے کہ کچھ خبر ہی نہ ہو۔ بہت سے بزرگ ایسے ہوتے ہیں مگر یہ کمال نہیں۔ چنانچہ کوئی نبی بھولا نہیں ہوا۔ نہایت دانشمند اور بیدار مقرر ہوئے ہیں۔

میرے ایک دوست نہایت بھولے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تمہاری بیوی عورت ہے یا مرد۔ کہنے لگے بظاہر عورت معلوم ہوتی ہے میں نے کہا کہ کیسے معلوم ہوا کہ عورت ہے کہ وہ ننھے پیپے ہوئی تھی۔ اگر وہ ننھے پیپے ہوئے ہوتی تو شاید اسے مرد سمجھتے، یا ان کو کوئی ننھے پیپا دیتا تو یہ بھی اپنے کو عورت سمجھنے لگتے۔ تو بعض ایسے بھولے ہوتے ہیں مگر کمال یہ ہے کہ نہ جزیرہ ہونے بلاہت ہو۔ دونوں میں وسط ہو جس کا نام حکمت ہے۔ خیر الامور اوسطا طہا اسی طرح باقی امور کو لے لو۔ غرض شریعت نام ہے اعتدال حقیقی کا اور اس کا مقتضی جیسا کہ مذکور ہوا یہ تھا کہ اس پر چلنا نہایت دشوار ہو۔ مگر خدا نے آسان کرنے کے لئے اس وسط پر ایک ڈوری ڈال دی ہے جس کو وہ ڈوری نظر آرہی ہے اس کو چلنا نہایت آسان ہے اور وہ ڈوری کیا ہے۔ علم صحیح۔ صحبت صالحہ یہ وہ چیز ہے کہ اس سے وسط حقیقی نظر آجاتا ہے۔ حَرَجَ الْبَصَرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرَزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ۔

بحسب تلخ بحر شیریں ہمنان در میان شاخ برزخ لایبغیان
تو شریعت بھی افراط و تفریط کے برزخ کا نام ہے میں علم صحیح کی ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک صفت ہے غضب للنفس اور ایک ہے غضب للشران دونوں میں غلط ہے یہاں پر امتیاز کی ضرورت ہے مثلاً ہم نے ایک مسئلہ لکھا اسے کسی نے رد کر دیا ہمیں غصہ آیا اور فی نفس ہم نے وہ مسئلہ صحیح لکھا ہے اس غصہ میں غلط ہے مگر آیا اللہ ہے کہ اس نے حق کو رد کیا یا للنفس

یہ تیار کھیل آنے سے پہلے باغ کی فصل بیجا حرام ہے گویہ فیصلہ مالک باغ کو ناگوار ہے کہ پھل آنے سے پہلے تو باغ پانچ سو کا بکنا تھا اور اب پھل آئے اور کم آئے تو اڑھائی سو کا بیجا پڑا لیکن خریدنے والے سے پوچھو کہ وہ شریعت سے کتنا خوش ہے کہ پانچ سو جس باغ کے دیتا تھا ڈھائی سو میں مل گیا۔ اسی طرح ایک شخص نے ایک بیٹی اور ایک دور کا عصہ چھوڑا ادھی میراث بیٹی کو ملے گی اور ادھی عصہ کو۔ اس میں بیٹی کو ناگوار ہو کہ میں خاص بیٹی اور میرے باپ کا مال یہ دور کا رشتہ دار اسے خواہ مخواہ دیدیا لگتا اس عصہ سے پوچھو تو وہ کہے گا۔ سبحان اللہ! شریعت میں حقوق کی کیا رعایت ہے۔ دور دور کی قربت کو بھی اس قدر مانا ہے۔ تو اب ایک ہی حکم ہے مگر دو آدمیوں میں سے اپنے اپنے اغراض کی وجہ سے ایک کو ناگوار ہے۔ اور ایک دوسرے کو گوارا۔ اب ہم کس کے فیصلہ کو ان دونوں میں سے مانیں گے۔

ترك اللات والعزى جيعا كذا لك يفعل الرجل البصير
یعنی لات اور عزى دونوں کو چھوڑ دیا ہم کسی کا فیصلہ نہیں مانیں گے کیونکہ یہ دونوں خود غرض ہیں ہم تو وحی کا فیصلہ مانیں گے کیونکہ وہاں شاہد بھی غرض کا نہیں ہے اسی لئے وہی قابل اعتبار ہے وحی کا فیصلہ یہ ہے کہ شریعت کا قانون نام ہے جو مصالح عامہ کی رعایت کرتا ہے۔ جیسے سرکاری قانون۔ مثلاً شرک پر پشاپ کرنا حرام ہے۔ اب ایک شخص کو زور کا پشاپ لگا۔ وہ کہاں تو یہ حکم ہے کہ پشاپ مت کر دو اور یہاں موت نکلا جا رہا ہے تو وہ شخص کیا کہے گا کہ بڑی سختی کا قانون ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ پشاپ کی توجازت ہوتی مگر اس کی بدلہ سے بچنے کے لئے کوئی ایسی دوا ڈال دی جاتی کہ دماغ بے حس ہو جاتے، اسلئے کسی کو بدلہ نہ معلوم ہوتی بھلا کون اسے پند کرے گا۔ اس گدھے کو موتے کے واسطے سب کو بے حس بنا دے اسی طرح شریعت نے بھی مصالح عامہ کی رعایت سے قانون بنایا ہے تم اس میں مصالح خاصہ اور وہ نفسانیہ ڈھونڈتے ہو اور شریعت کا اچھا معلوم ہونا مصالح عامہ کی رعایت سے۔

یہ تو حکماء و عقلاء کی نظریں ہے اور ایک نظر بے عشق و محبت ملے
قانون میں حکمت کی۔ اس کو اس وجہ سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ دوست کا قانون ہے یہ حکما کی نظر سے بڑھ کر ہے۔ جیسے کوئی طوائف اپنے کسی خاص عاشق سے یہ کہدے کہ تم تنگوٹی باندھ کے رام نرائن کے بازار میں پھرو یہ اس سے نہیں پوچھے گا کہ اس میں تمہارا کیا نائدہ بلکہ فوراً ادھر ادھر دوڑنے لگے گا۔ اگر کوئی کہے بھی گدھے یہ کیا ہے تو وہ کہے گا۔

ہے کہ اس نے ہم پر روکیا۔ سوائمر طریقت بڑے حاذق طبیب تھے وہ اس کا فیصلہ کرتے ہیں کہ اسے عزیز غور کر کے دیکھ، اگر اسی امر میں تیرے کسی معاصر مولوی پر بھی روکیا جاتا اور خاص کردہ معلم جس کی ذلت سے تمہارا نفس خوش ہوا اگر ایسے شخص پر بھی رو ہوتا تو آیا اس وقت بھی تم کو ایسا ہی غصہ آتا یا نہ آتا۔ اگر سوچنے پر معلوم ہو کہ آتا تب تو یہ غضب اللہ ہے اور اگر غصہ کم آیا تو امیر بشش ہے اور اگر بالکل نہ آیا تو اس وقت کا غصہ محض للنفس ہے، نفس کی شرارت اور بد معاشی ہے اسی طرح دوسرے اخلاق ذلیلہ اور اخلاق حمیدہ میں امتیاز کے واسطے علم صحیح کی ضرورت ہے اور چونکہ شریعت نام ہے وسط حقیقی کا اسی لئے یہی صراط مستقیم بھی ہے کیونکہ خط مستقیم کیلئے اقصر خطوط واصلہ بین النقطتین اور اوسط خطوط واصلہ ہونا ضروری ہے۔ یعنی دونوں نقطوں کے درمیان میں بھی ہوگا اور یہی صراط مستقیم شریعت ہے جو قیامت میں بشکل صراط قائم ہوگا پس وہ شریعت کی صورت مثالیہ ہے اور یہی معنی ہیں اس کے بال سے باریک ہونے کے کیونکہ بال تو پھر تجزی ہے۔ اور شریعت وسط حقیقی ہونے کی وجہ سے غیر تجزی ہے۔ کیونکہ شریعت اتنا وسط ہے کہ اس میں پھر وسط نہیں، اسی واسطے قیامت میں بال سے باریک نظر آدے گی۔ باقی تلوار سے تیز ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ چونکہ شریعت نام ہے وسط حقیقی کا۔ اور وسط حقیقی پر چلنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہے جیسا کہ تلوار کی دھار پر چلنا۔ اس لئے وہ صراط دھار سے زیادہ تیز نظر آدے گا۔

البتہ جن کو یہاں وہ ڈوری امتیازی عطا ہونے سے چلنا آسان ہو گیا تھا چونکہ صراط وہی چیز ہوگی جس پر چلنے کے خوگ تھے اس لئے وہاں بھی اسی درجہ میں اس صراط پر چلنا آسان ہوگا یعنی اگر یہاں برق کی طرح ہے تو وہاں بھی ہے اگر یہاں چلنے میں اٹکا تھا تو وہاں بھی اٹکے گا اور جہنم میں گرے گا۔ (روح البجاء ص ۲۱)

۲۶۔ شریعت سے ناگواری کی وجہ۔

شریعت سے ناگواری کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کی خوبیاں دیکھنے کے لئے آنکھ نہیں ہے اگر آنکھ ہو تو معلوم ہو جائے کہ شریعت میں ہیں حق تعالیٰ نے اپنی غرض پوری نہیں کی ہے من نہ کر دم خلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بند گاں جو دے کنم۔ آپ کے مصالح کی ایسی رعایت کی ہے کہ شاید آپ خود بھی نہ کر سکتے۔ مثلاً شریعت

قال العبد ارلوتد لم تشقنى قال الودتد اخضر الى ما يدقنى

ایک شخص دیوار میں کیل ٹھونک رہا تھا تو دیوار نے کیل سے شکایت کر میں نے کیا کیا جو میرے جگر کو شکافہ کر رہی ہے۔ کیل نے جواب دیا کہ اس سے پوچھو جو مجھے ٹھونک رہا ہے تو حکماء و عقلاء احکام کے لم کے درپے ہونگے اور جو عاشق ہو گا وہ یہ کہے گا کہ حکمت اس سے پوچھو جس نے یہ قانون مقرر کیا ہے مجھ کو کچھ بحث نہیں۔ بس مولوی صاحب کی وہی جواب اختیار کر لینا چاہیے۔

دو پس آئینہ طوطی مصموم داشتہ اند

آنچه استاد ازل گفت گوی گویم۔
غرض یہی علماء کو بھی مناسب ہے میں ان کو وصیت کرتا ہوں کہ اگر حکم داسرا معلوم بھی ہوں تو پوچھنے پر ہرگز مت بتاؤ۔ چاہے یہی گمان کریں کہ انہیں نہیں آیا۔ اور پوچھنے والے بھی خوب سمجھیں کہ جاننے والے بھی بہت ہیں مگر تمہارے غلام نہیں ہیں کہ تمہیں سب بتا دیا کریں جیسے طبیب کہ جانتا سب ہے کہ تین ماشہ گل بنفشہ کیوں لکھا ہے اور چھ ماشہ گل گاؤں زبان کیوں لکھا ہے مگر کوئی مریض پوچھنے لگے تو وہ نہیں بتائے گا اگر وہ کہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں طب نہیں آتی ہاں صاحب نہیں آتی۔ تمہیں پسند ہو پیو ورنہ مت پیو۔ عارف شیرازی کہتے ہیں یہ مصلحت نیست کی از پردہ بردن افتد راز۔

ورنہ در مجلس رندان خبرے نیست کہ نیست۔

یعنی کوئی خیر ایسی نہیں ہے کہ ہمیں معلوم نہ ہو مگر ہم تمہارے کہنے سے نہیں بتاتے اور حقیقت میں مصلحت اور حکمت پوچھنے کی ضرورت ہی کیا؟ محبوب سمجھ کر اس کے حکم کی علت دریافت کرنا عشق کے بانکل ہی اختلاف ہے۔ اگر کوئی کہے کہ جاؤ ہم عاشق ہی نہیں پھر وظائف عشق بھی واجب نہیں، تو صاحب تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے عشق تو قوازم ایمان سے ہے۔ جب تم نے آنا کہا، تو عشقنا کا التزام بھی کر لیا۔ جیسے کوئی شخص کہے مجھ پر نان و نفقہ بی بی کا کیسے واجب ہو گیا۔ میں نے تو اس کا التزام نہیں کیا تھا۔ صرف قبلت سے النکاح کہا جب ہی شوہر کے حقوق ملزم ہو گئے۔ پس اسی طرح جب لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا پس عاشق ہو گئے۔ کیونکہ اس کلمہ سے مومن ہو گئے۔ مومن کے بارے میں ارشاد ہے۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا۔ جو لوگ خدا پر ایمان لائے وہ خدا کیساتھ سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں۔ تو تصدیق ایمانی کے ساتھ ہی سارے کے سارے

عاشق ہو گئے۔ اب آپ عشق سے انکار کریں تو کیا ہوتا ہے جب عاشق ہونا ثابت ہو گیا تو عشق کے حقوق ادا کرو۔ پس کان مت ہلاؤ اور سیدھے محبوب کے حکم پر چلتے رہو اگر کوئی اس انفیاد کا قصد کرے تو اول اول تو تکلف ہوتا ہے پھر اس کی عادت ہو جاتی ہے تو اس کے ترک میں تکلف ہوتا ہے تو جس طرح دو عادت پڑنے سے غذا ہو جاتی ہے اگر کوئی کہے کہ دو کیونکر غذا ہو جاتی ہے تو میرے پاس اسکی لاجواب مثال موجود ہے۔ دیکھئے۔ حضرت تبا کو سلام اللہ تعالیٰ کہ کوئی اس سے مشکل ہے بچا ہو گا۔ کہیں اگلا کہیں شرابا اس کا استعمال ہوا کرتا ہے۔ شروع کرتے وقت کیسی تلی ہوتی ہے کیسی ابکائیاں آتی ہیں۔ چکر آتا ہے مگر جب عادت پڑ جاتی ہے تو پھر یہ غذا سے زیادہ مرغوب ہو جاتا ہے۔ روزے میں سب کو تو پانی اور شربت کی فکر ہوتی ہے مگر انہیں نہ پھلکیوں کی پرداہ نہ مشربت کی پرداہ نہ افطاری سے مطلب۔ ارے بھی حقہ دیدو۔۔۔۔۔ ایک پان دیدو۔ ایسی مکروہ چیز کیسی محبوب ہوئی۔ اے اللہ متب کو کی تو اتنی محبت اور شریعت کی اتنی بھی نہیں۔ ارے بھائی تبا کو ہی سمجھ لیا ہوتا۔ تبا کو تو کیا ہوتا۔ آخر کسی طرح بھدے لوگوں کو۔۔۔۔۔ سمجھاؤں بھی۔ اگر خیرہ گاؤں زبان نہیں سمجھتے تو خیرہ تبا کو ہی سمجھو، بہر حال اب یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ عادت ڈال لو تو دو ابھی غذا ہو جاتی ہے۔

بعض بزرگوں کو کسی تکلیف کے وقت ناک منہ چڑھاتے دیکھ کر اگر پر شبہ ایک مثال ہو کہ عادت پڑ جانے کے بعد ان پر اثر کیوں ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کے دل پر اثر نہیں ہے صرف جسم پر ضعف کی وجہ سے اثر ہے اور دل میں نہایت خوش ہیں۔ اس کی مثال بھی میرے پاس موجود ہے اور وہ نظر حضرت تبا کو کے دوست مرج ہیں کہ ناک بہہ ہی ہے آنسو جاری ہیں۔ سی سی کر رہے ہیں۔ مگر کھائے چلے جاتے ہیں کیوں صاحب اگر تکلیف ہے تو کیوں کھاتے ہو؟ بات یہ ہے کہ تکلیف منہ کو ہے مگر زبان اور حلق کو مزہ آتا ہے۔ اسلئے منہ کی تکلیف گوارہ ہے۔ ثواب سمجھ میں آ گیا کہ لذت والہ دونوں ایک ہی وقت میں جمع ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح امتثال امر محبوب میں گو بدن کو تکلیف ہو۔ مگر دل اور روح شاداں ہیں۔ اور اس عادت کا یہ اثر ہے کہ اگر ایک نماز بھی قضا ہو جائے، گو بدن کو آرام ملا کہ پڑے سوئے رہے مگر قلب کو جو تکلیف ہے اس کے آگے یہ آرام کچھ بھی نہیں۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں یہ بردل سالک ہزاراں غم بود۔ مگر زباغ دل خلا لے کم بود۔

یعنی اگر باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے اس وقت دیکھو ان کے غم کو۔ پھر اس میں بھی دو درجے ہیں۔ زائد کو تو غم ہوتا ہے مطلقاً عمل فوت ہو جانے کا۔ اور عارف کو غم ہوتا ہے باعتبار خود فوت ہو جانے کا۔ اور بلا اختیار فوت ہونے کا کچھ غم نہیں ہوتا۔ کیونکہ دوست نے اس میں یوں ہی تصرف کیا۔ مگر یہ بات عام لوگوں کے سننے کی نہیں کیونکہ اگر یہ قصداً بھی سو گئے اور ناز قضا کر دی۔ توحیلہ نکال لیں گے کہ محبوب کی یوں ہی مرض تھی تو یہ مرضی مرضی والوں کے لئے نہیں۔ کیونکہ وہ خود مرضی بفتح الراء ہیں۔ یعنی مرضی والے۔ بہر حال تکلیف طبعی سے جسم کو پریشانی ہوتی ہے مگر روح کو نہیں ہوتی بلکہ ان اعمال سے ایسی مناسبت ہو جاتی ہے کہ وہ غذائے روح بن جاتے ہیں کہ اگر وہ نہ ملیں تو پریشانی ہوتی ہے صرف شریعت کسی قدر تکلیف ہوتی ہے جیسے مشاہدہ سے پہلے مجاہدہ کی ضرورت ہے یا غذا سے پہلے دوا کی حاجت ہوتی ہے پھر تودوا بھی غذا ہو جاتی ہے۔

تو حضرت ایسی چیز ہے شریعت جس سے ڈرتے ہیں لوگ حالانکہ اس میں ہمارے کل مصالح دینیہ و دنیویہ کی بے حد رعایت کی ہے اور ساری مصلحتوں سے بڑھ کر تو جین ہے جو بدو اتباع احکام شریعت نصیب ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ چین تو بقول ہمارے تعلق مع اللہ سے حاصل ہوتا ہے۔ پس اگر ہم ہر وقت خدا کو یاد کریں اور اتباع شریعت نہ کریں تو تعلق با اللہ تو حاصل ہو گیا پس چین سے رہیں گے تو خوب سمجھ لو کہ مطلق تعلق سے یہ قاعدہ حاصل نہیں ہو سکتا، ایسے تعلق میں چین کا گمان ہے جیسی ہے فی الواقع اس میں بے چینی مضمر ہے جو مرنے کے بعد کھل جائے گی۔

غیر ملکی کی ایک حکایت جیسے ایک صدی گنوار ہندوستان میں آیا ایک حلوائی کی دوکان پر جا کر حلوا لیا۔ اس نے دام مانگے یہ وہاں سے بھاگا وہ حلوائی بھی پیچھے بھاگا جب وہ اتنا بھاگا کہ تریب تھا کہ کچھ ٹپے۔ آپ نے وہ حلوا جھٹ منہ میں رکھ لیا کہ جاؤ اب نہ ہمارا نہ تمہارا۔ وہ پکڑ کر پولیس لے لیا۔ تھا نیدار تو رحم دل تھے انہوں نے بجائے چالان کے یہ سزا دی کہ گدھے پر سوار کر کے اور اعلان کے لئے ڈھول کے ساتھ شہر سے باہر نکال دینے کی سزا دی تو لونڈوں نے اسے گدھے پر سوار دیکھا تو وہ بھی تماشہ کے طور پر ساتھ ہوئے یہ ہندوستان کی کسی نیرغ ہو کر اپنے ملک میں پہنچے، وہاں لوگوں نے پوچھا کہ ”آغا ہندوستان رفتہ بودی چه طور ملک است“ ہندوستان کیسا ملک ہے؟

لے جناب ہندوستان گئے تھے کیسا ملک ہے؟

آپ نے کہا ”خوب ملک است“ بڑا اچھا ملک ہے، پوچھا گیا ”کچھ طور“ تو آپ فرماتے ہیں ”در ہندوستان حلوا خودون مفت است“ حلوا مفت کھانے میں آتا ہے۔ ”سواری مفت است“ گدھے کی سواری مفت ملتی ہے ”دوم دوم مفت است“ باجا مفت ملتا ہے ”فوج طفلان مفت است“ لڑکوں کی فوج مفت ملتی ہے ”ہندوستان خوب ملک است“۔ تو جیسے ان حضرات کو یہ نہ معلوم ہوا کہ چشم و خدم عزت کا سامان تھا یا یہ نہایت ذلت کی سزا تھی اسی طرح ان کو نہیں معلوم کہ یہ چین ہے یا بے چینی لیکن کہاں تک سہ

ضوئ تری اذا انكشف الغبار افرس تحت رجلک احمداد جب حقیقت منکشف ہوگی اس وقت معلوم ہوگا کہ چین تھا یا بے چینی، جیسے اس آغا کو جب ان سب باتوں کی حقیقت معلوم ہوئی ہوگی تو کس قدر شرمندہ ہوا ہوگا۔ اسی طرح انہیں بھی مرتے وقت معلوم ہو جائے گا کہ وہ لذت تھی یا بے لذتی۔

غرض جو تعلق و نسبت مطلوب اور سرمایہ راحت ہے تو وہ جانبین سے شریعت کا اتباع ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہم وہ نسبت ہی نہیں جو ایک طرف سے ہو۔ جیسے کسی شہر میں ایک پریسی طالب علم تھے۔ ان کے دیس کے کوئی آدمی ان سے ملنے گئے۔ انہوں نے پوچھا، میاں طالب علم کس رنگ میں ہو۔ کہنے لگے شہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں، پوچھا کیا سامان ہوا۔ کہنے لگے وہاں آدھا کام تو ہو گیا۔ آدھا باقی ہے پوچھا کس طرح؟ کہنے لگے میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں۔ خوب آدھا ہو گیا۔ تو یہ تو اوپن ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ بزم خود صاحب نسبت ہیں۔ جو بلکہ یادداشت ہم ہو چکا کہ اپنے کو مقبول سمجھتے ہیں مگر اتباع شرع نہ ہونے کے سبب ان کے زعم کا حاصل یہ ہے کہ ہم تو راضی ہیں مگر اللہ میاں راضی نہیں، خوب سمجھ لو کہ ان کے راضی ہونے کا معیار صرف اتباع احکام ہے اگر اس حال میں موت آگئی تو سب کھل جائے گا کہ یہ تعلق ان کو پسند نہ ہونے کے سبب تمہاری نظر کس قدر ہوگا۔ بقول سعدی علیہ الرحمة سہ

چوں در چشم شاہد نیاید ز رت زرد خاک یکساں غابد برت آپ نے ہزار روپیہ محبوب کو بھیجے کہ وہ خوش ہو، مگر معلوم ہوا کہ وہ خوش نہیں ہوا اور اس نے نہیں لئے اور انتہی واپس کر دیے کسی نے کہا کہ گھر میں بھیج دے تو یہی کہو گے کہ چھینکو نہ عنقریب غبار چھٹے کے بعد معلوم ہوگا کہ ترے پاؤں کے نیچے گھوڑا تھا لگا ہوا۔

بھی کیا کر دیا گیا ایسے غوس روپے کو اسی طرح جب معلوم ہوگا کہ حق اس تعلق سے راضی نہیں ہوئے تو اس تعلق کو کیا سمجھو گے۔ تعلق وہی ہے جو کہ دونوں جانب سے ہوا اور تعلق بدون اتباع شریعت کے نہیں ہو سکتا تو دیکھئے! شریعت کتنی بڑی چیز ہوئی۔ حق تعالیٰ اسی کو فرماتے ہیں ثم جعلناك على شريعة من الامر فاتبعها۔ ثم لانے کی وجہ یہ ہے کہ اوپر فرماتے ہیں ولقد اتينا بني اسرائيل الكتاب والحكم والنبوة، "تا" فيما كانوا فيه يختلصون طفرماتے ہیں۔ یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت اور نبوت دی تھی اور ہم نے ان کو نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دی تھیں، اور ہم نے ان کو دنیا والوں پر فوقیت دی تھی اور ہم نے ان کو دین کے بارے میں کھلی کھلی دلیل دیں۔ سوا انہوں نے علم ہی کے آنے کے بعد باہم اختلاف کیا بوجہ آپس کی مندا مندی کے آپ کا رب ان کے آپس میں قیامت کے روز ان امور میں فیصلہ کر دیگا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں "ثم جعلناك" آپ سے پہلے بنی اسرائیل کو کتاب وغیرہ عنایت کی تھی۔ اس کے بعد ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا "من الامر" میں من بیانہ ہے کہ وہ شریعت یا طریقہ خاص کیا ہے وہ امر دین ہے پس اس کا اتباع کیجئے لقب کتنا لطیف ہے۔ شریعت یعنی جس عنوان سے علماء اتباع دین کا امر کرتے ہیں وہی عنوان آیت میں وارد ہو گیا جس سے صریحاً مدعا علماء کا ثابت ہو گیا۔

اتباع شریعت اب یہ سمجھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا اتباع شریعت کا تو اور کسی کا کیا منہ ہے جو اپنے کو اس سے آزاد سمجھے وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ط اور ان جاہلوں کی خواہش کا اتباع نہ کیجئے۔ سبحان اللہ کیا پاکیزہ طرز بیان ہے یہ نہیں فرمایا۔ وَلَا تَتَّبِعْ عَوَیْہَا کہ غیر شریعت کا اتباع نہ کیجئے۔ بلکہ یوں فرمایا کہ جہلا کی خواہش کا اتباع نہ کیجئے۔ اس میں بتا دیا کہ جو شریعت کے مقابلہ میں ہوں وہ خواہشیں ہیں اور ہوائے نفسانی ہیں۔ اس لئے وہ عمل کے قابل نہیں "الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ" سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ قیود احترازی ہے یعنی الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ کی اہوا کا اتباع جائز نہیں۔ بلکہ یہ قیود واقعی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ واقع میں علماء ہی نہیں ہیں جو شریعت کے مقابلہ میں اپنی خواہشیں پیش کرتے ہیں بلکہ وہ توجہدار ہیں جیسے یوں کہتے ہیں کہ مفسدوں کے بہکانے میں آجانا انہیں بلکہ مطلب یہی ہے کہ بہکانے والے سب کے سب مفسد ہوتے ہیں ان سے نیچے رہنا۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھو اور "الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ" کا مفعول

جو یہاں ذکر نہیں فرمایا۔ سبحان اللہ! اس میں عجیب رعایت ہے، اگر مفعول ذکر فرماتے تو وہ امر الدین ہوتا تو ایک گونہ مصادرہ ہو جاتا کیونکہ امر دین ہی میں تو کلام ہو رہا ہے تو اس صورت میں یہ حاصل ہوتا کہ غیر دین اس لئے مذموم ہے کہ وہ دین نہ جاننے والوں کا فعل ہے اس لئے یہاں مطلق علم کی نفی کر دی کہ اہوا اس لئے مذموم ہے کہ وہ ایسوں کا فعل ہے جو بالکل ہی جاہل ہیں یہ دعویٰ کہ جو شخص شریعت کا متبع نہ ہو وہ بالکل جاہل ہے، اتنا بڑا ہے کہ سارا عالم اس میں مقابل ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا یقین ہے کہ یہ ساری دنیا کو جاہل بنانا اتنی بچی بات ہے کہ اس میں ذرا احتمال غلاف کا نہیں، ورنہ آگ کو جھک ضرور ہوتی کہ کوئی مطالبہ نہ کر بیٹھے۔ اور اس وقت کو ظاہر میں آپ نہیں تشریف رکھتے مگر آپ کا علم و فیض تو ہے، جیسے آفتاب پر ابر اکھاوے تو آفتاب نظر سے پوشیدہ ہے مگر اس کی روشنی تو ہے، بلکہ چوندھوں کے لئے تو یہ ابر بھی رحمت ہے کہ براہ راست اس کا تھل نہ کر سکتے اسی طرح بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر حضور کے زمانہ میں ہوتے تو یقیناً یہ حضور کے اتباع سے عار کرتے۔ اور اس سے حد کفر میں بڑجاتے تو اچھا ہوا کہ ابرا کیادہ ان چوندھوں کی بڑی مشکل ہوتی۔

بہر حال اب وہ آفتاب کی روشنی ابر سے بھی چھن رہی ہے۔
آفتاب کی مثال اس موقع پر میں مولانا کا یہ شعر پڑھتے پڑھتے رک گیا۔

وہ شریعت ہے

چونکہ شد خورشید و مار اگر دواغ
چارہ نہ بنود درمقا کش از چرخ

یعنی آفتاب رحمت ہو گیا اور میں اسے اس لئے پسند نہیں کہ آفتاب رحمت نہیں ہوا۔ وہ تو اب بھی درخشاں ہے صرف ابر کے نیچے چھپ گیا ہے بلکہ یہ شعر اس موقع پر مناسب ہے

ہنوز آں ابر رحمت درخشاں است
خم خمنا نہ بامہر و نشان است

اور مولانا نے وہ شعر کسی دوسرے موقع پر فرمایا ہے۔ غرض حضور کے غلام حضور سے فیض لینے والے اب بھی موجود ہیں جواب بھی اس دعویٰ کو ثابت کرنے کو تیار ہے کہ جو متبع شریعت نہ ہو وہ جاہل ہے اور میں خود تو دعویٰ نہیں کرتا۔ مگر دین کے محاسن پر نظر کر کے

کہہ سکتا ہوں کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا عاقل ہو۔ مگر عالم نہ ہو اور نہ کسی عالم محقق کی صحبت میں رہا ہو۔ اس کو کسی محقق کی صحبت میں رہا ہو۔ مہینے کے لئے بھیج دو۔ خدا کی قسم اس چھ مہینے میں وہ محقق یہ ثابت کر دیگا کہ اس عاقل کی زبان سے اقرار کر لے گا کہ میں الحق ہوں۔ اور اس وقت قسم سے زیادہ اور کسی ذریعہ سے یقین نہیں دلا سکتا۔ اگر اس سے زیادہ دلیل کو جی چاہے تو تجربہ کر لو کہ چھ مہینے کی خدمت لو۔ پھر محقق کا پتہ ہم سے پوچھو۔ اس وقت دیکھ لو گے کہ یہ شخص آئے گا تو اپنے کو عاقل کہتا ہوا مگر جائے گا یہ کہتا ہوا کہ میں الحق ہوں۔ نہیں بلکہ پہلے الحق تھا کیونکہ اب تو اس محقق کی برکت سے عقل آجاوے گی تب معلوم ہو گا کہ ”ابوہار الذین لا یعلمون“ کا مدلول کیسا یقینی ہے کہ جو چیز شریعت کے مقابلہ میں ہے وہ جہل ہے، میں حالانکہ کچھ بھی نہیں مگر جو چوہر کے ایک شاہ صاحب میرے یہاں آئے، جو عرفی تہذیب سے آراستہ تھے میں تو ادنیٰ سے ادنیٰ، ادنیٰ سے ادنیٰ ہوں، اس طرح دس بیس دفعہ ادنیٰ کی اصناف ادنیٰ کی طرف کی جائے بہر حال میں کچھ بھی نہیں ہوں مگر چند روز رہنے کے بعد وہ واپس گئے تو وہاں جا کر انہوں نے ایک رسالہ لکھا۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ عمر بھر جسے ہم تہذیب سمجھا کئے وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ وہ تہذیب ہی نہیں تھی خیر وہ تو مر گئے ایک اور دہلی کے طبیب آئے چند روز یہاں رہے سے وہ بھی یہ کہنے لگے کہ جن کو ہم لوگ اب تک کمالات سمجھتے تھے سارے نقائص نیکے اور جنہیں ہنر سمجھتے تھے وہ سب عیوب تھے۔ تو اس وقت اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ اگر شبہ ہو تو تجربہ کر لیجئے۔ اس لئے فرمایا ”ابوہار الذین لا یعلمون“ جاہلوں کا اتباع نہ کیجئے۔

اتباع شریعت کا فائدہ

یہاں اتباع شریعت کے متعلق ایک نکتہ ہے جسے امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ انسان کی سلامتی مقید رہنے میں ہے اور اطلاق مضرب ہے۔ کیونکہ اطمینان اور چین بدن تقلید کے نہیں ہوتا مثلاً ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ جب بیمار ہوں گے ہم فلا نے طبیب کا علاج کریں گے تو اطمینان ہے کہ طبیب موجود ہے بیماری کا خوف نہیں ہو گا۔ اور نہ بیماری کے وقت سوچنا پڑے گا کہ کس کا علاج کریں۔ اور اگر تقلید نہیں ہے مثلاً ہم کسی خاص طبیب کے پابند نہیں۔ اگر آج ذرا سا تغیر پیش آیا ایک طبیب سے رجوع کیا۔ دوسرا تغیر پیش آیا دوسرے سے رجوع کر لیا تیسرا پیش آیا تیسرے سے رجوع کر لیا تو اس میں دل کو چین نہیں ہو گا اور ہر وقت یہ فکر رہے گی کہ اب کے تغیر کس طبیب سے رجوع کریں گے۔ عرض تقلید سے اطمینان حاصل ہوتا ہے چاہے وہ طبیب دانشمند بھی نہ ہو۔ مگر تمہارے نفس کو تو اطمینان ہو جائے گا۔ اور اگر وہ تقلید حقائق کے موافق ہو تو سبحان اللہ! کیا کہنا ہے۔ اگر شریعت علم و حکمت کے

موافق ہونے کا بھی دعویٰ نہ ہوتا جیسا کہ مدلول ہے ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون کا، تب بھی اتباع شریعت کا امر حکیمانہ ہوتا اور اب تو جبکہ شریعت کا علم و حکمت کے موافق ہونا ثابت کر دیا گیا تو اس اتباع کا ضروری و مصلحت و موجب اطمینان ہونا اور بھی ثابت ہو گیا، آگے وعید ہے انھم لن یغنوا عنک من اللہ شیئاً ظاہر لوگ خدا کے مقابلہ میں آپ کے ذرا کام نہیں آ سکتے۔ یعنی گویہ آج مددگار بنے گا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر خدا کے یہاں ذرا کام نہیں آ سکتے۔ اس پر اہل حق کو تردد ہو سکتا تھا کہ اتباع کر کے ہم تو اکیلے رہ گئے۔ اس لئے فرماتے ہیں وان الظالمین بعضهم اولیاء بعض واللہ ولی المتقین اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ اور اللہ دوست ہے اہل تقویٰ کا۔ اس سے تردد رفع ہو گیا کہ اہل ابوا اگر ہم سے الگ ہو گئے تو کچھ پروا نہیں کیونکہ خدا تو ہمارے ساتھ ہے۔ آگے مقصود کی طرف رجوع کرتے ہیں اور شریعت میں جو صفیں ہیں انہیں بتاتے ہیں۔ ہذا بصائر للناس وھدی ورحمت لقوم یوقنون۔ ترکان یا شریعت لوگوں کے لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین لانے والوں کے لئے بڑی رحمت ہے۔ ”ہذا بصائر“ بصائر جمع بصیرت کی ہے۔ بصیرت کہتے ہیں باطنی روشنی کو۔ جیسے بصر کہتے ہیں نگاہ یعنی ظاہری روشنی کو تو شریعت بصائر ہے، یعنی باطن کو روشن کرنیوالی ہے ”وھدی“ اور سربا ہدایت ہے کہ اس سے راستہ نظر آتا ہے اور مقصود تک پہنچا دیتی ہے ”ورحمت“ اور رحمت ہے جو کہ مقصود ہے۔ گویا شریعت تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔

راستہ طے کرنیوالوں کی ضرورت

یہاں پر ایک نکتہ ہے جو چند سال پہلے ذہن میں آیا تھا مگر اسے بھول گیا تھا اس وقت پھر یاد آ گیا۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ رہرو کو انہیں تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ جب آدمی مقصود تک جانا چاہتا ہے تو اسکے لئے ایک مقصود ہوتا ہے اور ایک طریق ہوتا ہے جس کے ذریعہ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں اور ایک بصر یعنی نگاہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے راستہ نظر آوے۔ حق تعالیٰ کے قربان جانے کہ شریعت بتلاتے ہیں کہ ایسا قانون ہے جو تینوں کو جمع کئے ہوئے ہے۔ لہذا بصائر یہ آنکھیں بھی ہیں۔ وھدی اور راستہ بھی اسی کے ذریعہ سے طے ہوتا ہے۔ ورحمت، اور رحمت بھی ہے یعنی مقصود بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ سبحان اللہ! بصیرت، طریق، مقصود، تینوں اسی ایک شریعت میں ہیں۔ اب رہا یہ کہ بصائر کو جمع کیوں لائے اور ہدیٰ ورحمت کو مفرد کیوں لائے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ راستہ چلنے والے تو بہت ہوتے ہیں اور سب کی آنکھیں الگ

الگ ہوتی ہیں، اس لئے اس کو جمع لائے۔ اور راستہ ایک ہی ہوتا ہے اور مقصود بھی سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں مفرد لائے۔ پھر آگے فرماتے ہیں کہ یہ رحمت تو ہے مگر ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ ”لقوم یوقنون“۔ یعنی یقین کرنے والوں کے لئے۔ یقین کے دو درجے ہیں ایک تقلیدی اور ایک تحقیقی تقلیدی تو یہ ہے کہ احکام کو بلا دلیل مان لو، پھر ان احکام کی برکت سے تحقیقی یقین ہو جاوے گا۔ جیسے شروع میں الف، بے کہ محض استاد کی تقلید سے مان لیتے ہو۔ اس کے بعد اسی تقلید کی بدولت بڑے علوم کے محقق بن جاتے ہو۔ اگر شروع ہی میں یہ بوجھا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ الف ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیشہ جاہل رہو گے۔ اس لئے پہلے کسی محقق کی تقلید کرو۔ پہلے ہی محقق بننے کی کوشش مت کرو۔

اے بے خبر کوش کہ صاحب خبر شوی تارہاں میں نہ باشی کے راہبر شوی
اور طریقہ محقق بننے کا یہی ہے کہ پہلے تقلید کرو۔
در مکتب حقائق پیش ادیب عشق ہاں اے پسر کوش کہ روزے پدر شوی
(الشریعت منہ تا ۳۲)

۲۲۔ عذاب قبر پر اعتراض کا جواب

احادیث میں جو عذاب و ثواب قبر کا ذکر ہے یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ ہم نے انسان کے مرجانے کے بعد اس کے جسم عنصری کا مہینوں

مثالی ہے عذاب و ثواب

اسی کو ہوتا ہے لہذا جسد عنصری پر عذاب و ثواب محسوس نہ ہونے سے اس کی مطلقاً نفی نہیں ہو سکتی۔ پھر بعض دفعہ حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ظاہر کرنے کے لئے اس جسم عنصری پر بھی عذاب و ثواب کو ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے واقعات مذکور ہیں کہ بعض لوگوں نے کسی مردے کی قبر میں آگ جلتی ہوئی دیکھی۔ بعض لوگوں کو کسی قبر سے نہایت پاکیزہ خوشبو محسوس ہوئی، لہذا اس حدیث پر کوئی اشکال نہیں، خوب سمجھ لو۔

(ترجیح الآخرۃ ص ۳۶)

۲۸۔ اسلام در حقیقت اللہ کا راستہ ہے۔

بعض جگہ حضورؐ کی طرف اس صراط کو اس لئے مضاف کر دیا گیا تاکہ سامعین کو اس پر عمل کر نیکی ہمت ہو اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اس راستہ کو طے کر سکتے ہیں۔ اگر پہلے ہی یہ فرمایا جاتا کہ یہ خدا کا راستہ ہے اس پر چلو تو لوگ یہ سن کر گھبر جاتے کیونکہ خدا تعالیٰ کی ذات تک ذہن کی رسائی اولاً دشوار ہے۔ ان کی توشان یہ ہے۔

اے برتر از خیال قیاس و گمان و وہم و زہر گفہ اند شنیدہ ایم و خواہد ایم
خدا تعالیٰ کی ذات تک وہم بھی نہیں پہنچ سکتا جو کچھ اس کے متعلق ہمارے ذہن میں آتا ہے خدا تعالیٰ اس سے بھی درار اور ارغم و درار اور ارہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔
در تصور ذات اور گنج کو تادراید در تصور مثل اد۔

یہ لفظ سارے نسخوں میں گنج ہے۔ مثنوی کو جس گنج (اور جس گوشہ) سے نکالو گے سب میں یہی نکلے گا۔ کسی کے پاس اسکی گنجی نہ تھی صرف حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے پاس اسکی گنجی تھی۔ حضرت ہی نے اس کا قفل کھولا۔ حضرت نے مکہ میں ایک دفعہ ایک شخص کو گنج پڑھاتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کے معنی بتانے میں وہ بہت تاویلیں کر رہے تھے مگر کوئی بات بنتی نہ تھی حضرت نے اصلاح دی کہ یہ لفظ گنج ہے۔ بمعنی گنجائش۔ بس اس کو سن کر وہ شیخ پھر طرک ہی تو گئے، اب شو کے معنی بے تکلف ظاہر ہو گئے۔

مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کی کسی کے تصور میں گنجائش نہیں یعنی تصور بالکنہ کی گنجائش نہیں۔ حق تعالیٰ کا بالکنہ ذہن میں آنا محال ہے، جس کی تفصیل کتب معقول میں مذکور ہے حق تعالیٰ کی ذات تک رسائی نہیں تو اگر اندازہ ہی اسلام کو صراط اللہ کہہ دیا جاتا۔ یعنی حق کی طرف اس کی نسبت کی جاتی تو لوگ گھبر جاتے اور سوچ میں پڑ جاتے کہ حق تعالیٰ تو ذہن سے بہت دور ہیں۔ پس اسی طرح ان کا راستہ بھی نہ معلوم کتنا دور و دراز ہوگا۔ اس لئے پہلے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف کیا گیا کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ تو میرا راستہ ہے اس پر چلو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک سب کی رسائی ممکن ہے۔ آپ عیاناً سب کے سامنے ہیں پھر بشریت میں سب کے شریک ہیں اس لئے سن کر ہمت بندھی کہ یہ تو رسول اللہ کا راستہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذہن سے دور نہیں ہیں تو آپ کا راستہ بھی دور نہ ہوگا بلکہ نزدیک ہوگا

۲۹۔ بعض عامی کی مغفرت بدون عذاب کے بھی ہوگی۔

بعض گنہگار بدون عذاب کے ہی بخش دیے جائیں گے مغفرت کے سوا کسی کا اس میں اختلاف نہیں۔ ان کے نزدیک گنہگار کو عذاب ہونا لازم ہے۔ تماشائے نہ معلوم ان لوگوں کی عقلیں کہاں گئیں۔ وہ خدا کے ذمہ عقاب و ثواب کو واجب کہتے ہیں۔ گویا خدا کو نعوذ باللہ قانون کا تابع کرتے ہیں حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ قانون بنانے والا قانون کا تابع نہیں ہوتا بلکہ قانون خود اس کے تابع ہوا کرتا۔ اگر ان کے نزدیک عذاب و ثواب کا وجوب عقلی ہے اس سے واجب کا مضطر ہونا لازم آتا ہے۔ اور اضطرار امارات حدوث سے ہے۔ اور واجب اضطرار سے منزه ہوتا ہے۔ اور اگر یہ وجوب شرعی ہے تو اس کے لئے وجوب شرعی کی ضرورت ہے۔ اگر وہ دلیل میں آیات و وعید پیش کریں تو ہم آیاتِ عفو و مغفرت و شفاعت کو پیش کریں گے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ بہت سے گناہوں کو بدون عذاب کے بھی معاف کر دیئے ہیں اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ۔ ہاں جن آیات میں افعالِ کبیرہ کا عقاب مذکور ہے وہاں استحقاق مراد ہے لزوم وقوع مراد نہیں۔ یعنی کبار سے وہ شخص عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ وقوع عذاب لازم نہیں، ممکن ہے حق تعالیٰ ویسے ہی بخش دیں۔ باقی وقوع کے متعلق آیت اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِاللّٰهِ سے صاف معلوم ہو گیا کہ سب گناہوں پر عذاب لازم نہیں بجز شرک و کفر کے ان پر عذاب لازم ہے یعنی شرعاً۔

غرض گناہ کبیرہ تو بدون عذاب کے معاف ہو سکتا ہے۔ مگر کفر و شرک کا ارتکاب بدون عذاب کے نہیں رہ سکتا۔ اس پر عذاب لازم ہے اور وہ بھی ابدال آباد کے لئے جس کا انقطاع کبھی نہ ہوگا۔ یہ جرم کسی طرح معاف نہ ہوگا۔ نہ عذاب سے۔ نہ بغیر عذاب کے۔

(محاسن الاسلام ص ۹)

یہ فائدہ ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرنے سے کہ راستہ کا سہل و نزدیک ہونا معلوم ہوگا پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی ہوگئی اور اس راستہ پر چلنا شروع کیا۔ اور حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ تو حقیقت میں خدا کا راستہ ہے اور حضور صرف داعی ہیں آپ خود بھی اسی راستہ پر چل رہے ہیں یہ دیکھ کر ڈھارس بندھ گئی کہ حق تعالیٰ اس کے طے کرنے میں بندوں کی امداد فرماتے ہیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راستہ کو طے کر لیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کا طے کرنا انسان کی قدرت سے خارج نہیں تو ہم بھی اس کو طے کر سکتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو واقف طریق ہیں ہمارے معین و رفیق ہیں۔

واقعی اگر حق تعالیٰ کی امداد نہ ہو تو پھر اس راہ کا طے کرنا بہت دشوار ہے کیونکہ خدائی راستہ ہے جس کو وہی طے کر سکتا ہے جس کو حق تعالیٰ طے کرنا چاہیں۔ اس لئے سالک کی جیب اس پر نظر ہوتی ہے کہ یہ راستہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے اس وقت وہ بڑا پریشان ہوتا ہے وہ اس کے طول و لا تنہا ہی کے خیال سے گھبراتا ہے اور یوں کہتا ہے۔

بحرِ مست بحرِ عشق کہ بچش کنارہ می ست

آبِ حجاز: اینکہ جاں بسیار ندچارہ نیست

اور جب اس پر نظر کرتا ہے کہ یہ راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ جس پر آپ چل رہے ہیں تو اسکی ہمت بندھتی ہے اور یوں کہتا ہے۔

تو دست گیر شوالے خضر پے نخستہ کہ من

پیادہ می روم و ہر ماں سورانند!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت و رفاقت اس راستہ میں چلنے کا ارادہ کر لیتا ہے یہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جن کی رسائی حضور تک ہو چکی ہے اور جو حضور تک بھی وصول نہ رکھتے ہوں انہیں اسکی ضرورت ہے کہ ان مشائخ کا دامن پکڑیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی کر چکے ہیں۔ جیسے بادشاہ تک پہنچنے کے لئے وزیر کا واسطہ ضروری ہے۔ مگر جو وزیر تک نہ پہنچا ہو اس کو چاہیے کہ ان لوگوں کی خوشامد کرے جو وزیر تک رسائی رکھتے ہیں۔

(الاسعاد والالباد ص ۴۹)

۳۰۔ مرتد بغاوت میں کافر اصلی سے بڑھا ہوا ہے۔

قوانین سلطنت میں باغی کی سزا ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جو پہلے ہی سے اس سلطنت کی رعایا نہیں ہیں بلکہ کسی مخالف سلطنت کی رعایا ہیں۔ ایسے لوگوں پر اگر کبھی غلبہ ہو جائے تو ان کو غلام بنا لیتے ہیں۔ یا احسان کر کے رہا کر دیتے ہیں۔ یا عزت کے ساتھ نظر بند کر دیتے ہیں۔ مگر باغی کے لئے بجز قتل یا عبور دریا ریشور کے کچھ سزا ہی نہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ رعایا بجز باغی ہو جانے میں سلطنت کی زیادہ توہین ہے اسی طرح اسلام لا کر مرتد ہو جانے میں اسلام کی سخت توہین ہے اور اسکی تعلیم کو دوسروں کی نظروں میں حقیر کرنا ہے۔

دیکھئے ایک وہ شخص ہے جس سے کبھی آپ کی دوستی نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ سے مخالف ہے اسکی مخالفت سے آپ کا اتنا مزہ نہیں ہوتا اور اگر کبھی وہ آپ کی مذمت و بوجھ کرے تو لوگوں کی نظروں میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی۔ سب کہہ دیتے ہیں کہ کیا اس کو تو ہمیشہ سے اس کے ساتھ عداوت ہے۔ دشمنی میں ایسی باتیں کرتا ہے اور ایک وہ شخص ہے جو سالہا سال سے آپ کا دوست رہا۔ پھر کسی وقت مخالف بن گیا اسکی مخالفت سے بہت مزہ پہنچتا ہے۔ اور وہ جو کچھ برائیاں کرتا ہے لوگ ان پر توجہ کرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ وہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا منشا رخصت عداوت نہیں ہے اگر دشمن ہوتا تو سالہا سال تک دوست کیوں بنتا معلوم ہوتا ہے کہ دوستی کے بعد فلاں شخص کے اترے پترے معلوم ہو گئے ہیں اس لئے مخالفت ہو گیا۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص دوستی کے بعد دشمن بنا ہو، وہ اترے پترے معلوم کر نیچے بعد ہی دشمن بنا ہو۔ جتنی ہے اس شخص نے دوستی ہی میں اس نیت سے کی ہو کہ لوگ دوستی کے زمانے میں مجھے اس کا راز دار سمجھ لیں گے تو مخالفت کی حالت میں جو کچھ کہوں گا اس کو یہ سمجھ کر قبول کر لیں گے کہ یہ شخص راز دار ہے چکلا ہے۔ اس کو ضرور کچھ راز دار باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے مخالفت ہو گیا۔ چنانچہ بعض یہود نے اسلام کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ پس ہر چند دوست کی مخالفت میں یہ احتمال بھی ہے مگر عداوت لوگ دوستوں کی مخالفت سے عموماً جلد متاثر ہو جاتے ہیں اور اس احتمال پر نظر نہیں کرتے۔ اس لئے عقلاً و شرعاً قاتل و نادہ شخص بہت بڑا مجرم شمار ہوتا ہے جو موافقت کے بعد مخالفت کرے۔

اس لئے شریعت میں مرتد کے لئے دنیوی سزا بھی سخت ہے اور عذاب آخرت بھی اشد ہے۔
(محاسن الاسلام ص ۱۹)

۳۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غنائے قلب کا حال۔

سمجھ لینا چاہیے کہ اول تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غنائے ظاہری کی ضرورت نہ تھی اور جو اصل غنائے یعنی غنائے قلب، تو وہ آپ کے پاس فطرت سے موجود تھی اور نبوت کے بعد اس میں اس قدر ترقی ہوئی کہ کسی کو بھی آپ کے برابر غنائے قلب حاصل نہ ہو گا۔ کیونکہ اس کا مدار توکل اور تعلق مع اللہ پر ہے اور ان صفات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی کامل نہیں اس لئے آپ کے غنائے قلب کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ بلکہ ظاہری غنائے سے تو اہل قلب کو پریشانی ہوتی ہے اور اس کے حقوق کا خیال کر کے یہ پریشانی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اسی کے ازالہ کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام کو فرمایا ہے۔ **هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ** اس کی دوسری تفسیریں کی گئی ہیں ایک یہ کہ ”لہذا مبتدا“ عطا رہا“ خبر اول ”بغیر حساب“ خبر ثانی، یہ ہماری عطا ہے اور بے حساب یعنی بے شمار ”بغیر حساب“ سے کثرت کا بتلانا مقصود ہے۔ اور ایک تفسیر یہ ہے کہ ”بغیر حساب“ معقول ہے ”وامنن ادا مسک“ کا یعنی یہ ہماری عطا ہے خواہ دو یا نہ دو۔ آپ سے اس کے حقوق کے متعلق کوئی سوال اور باز پرس نہ ہوگی، جس طرح چاہو تصرف کرو کلی اختیار ہے۔ دوسری تفسیر مجھے زیادہ پسند ہے اور واقعی علیہ السلام کے لئے اتنی بڑی سلطنت اور اس کا ساز و سامان خارجاں ہو جاتا، اگر انکی تسلی اس طرح نہ کی جاتی۔ جب ”بغیر حساب“ فرما کر بارغم ہلکا کر دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے بے فکری سے سلطنت کی۔ اس سے ظاہراً سامان کی کثرت کا موجب پریشانی ہونا ثابت ہو گیا تب ہی تو ان کا ازالہ کیا گیا۔ اسی واسطے جب حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا کہ چاہے ملک ہونا اختیار کر لیں یا نبی ہونا اختیار کر لیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ سے نبی عہد ہونا اختیار کیا۔ اگر آپ بھی بنی ملک ہونا چاہتے ہیں تو آپ سے بھی یہی ارشاد ہوتا **هَذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ** اور اس سے آپ کی بھی تسلی کر دی جاتی۔ مگر آپ نے سلطنت پر عبدیت کو ترجیح دی اور غنائے ظاہری اختیار نہیں فرمایا دوسرے اگر غنائے ظاہری ہی ملا دی جائے۔ جیسا مفسرین میں یہی شہور ہے تو کو آپ کے پاس

مال جمع نہ رہتا تھا اور اسی سے شبہ عدم غنائے ظاہری کا ہو سکتا ہے مگر جو مقصود ہے مقصود ظاہری سے کہ کوئی مصلحت انہی نہ رہے وہ مقصود اس طرح حاصل کہ وقتاً فوقتاً اس قدر مال آتا تھا کہ سلاطین و امراء کی طرح آپ خرچ فرماتے تھے جنہیں یہ بھی حکمت تھی کہ آپ مقتدا تھے اور مقتدا کے لئے وقعت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ عرفا متول سے ہوتی ہے بشرطیکہ متول پر متول بھی مسلط ہو (یعنی سخاوت بھی ہو کہ لوگوں کو دیتا دلاتا رہے جس سے مال چلتا پھرتا) چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری غنائے بھی یہ حالت تھی کہ آپ نے حج و دایع میں سو اونٹ قربان کئے جس میں ترسیعہ اپنے دست مبارک سے خر کئے جس کی تفصیل حدیث میں آتی ہے کلمہ یزد لفظ اللہ کہ اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اپنی گردن بڑھاتا تھا گویا ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ پہلے مجھے ذبح کیجئے۔ سبحان احمہ کیا شان محبوبیت تھی سہ

ہم آہوان صحرا سرخو نہادہ رکھتے بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد
یہ شہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شان میں زیادہ چسپاں ہے۔ واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسے ہی تھے کہ جانور اپنی گردنیں خود آگے بڑھاتے تھے اور ہر ایک چاہتا تھا کہ کاش پہلے میں آپ کے ہاتھ میں ذبح ہو جاؤں تو اتنے اونٹوں کا ذبح ہونا بدون ظاہری غنائے کم ممکن ہے۔ اسی طرح آپ کی عطار اور سخاوت کی یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ نے سو سو دو سو اونٹ ایک ایک شخص کو عطا فرمائے۔ ایک اعرابیوں کا بکریوں کا بھر اچکل عنایت فرمادیا۔ بحرین سے جب مال آیا تو وہ اتنا تھا کہ مسجد میں سونے چاندی کا ڈھیر لگ گیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کا سب ایک دم سے بانٹ دیا اور بعض صحابہ کو اتنا دیا جتنا وہ اٹھا سکتے تھے۔ ایسی نظریں تو سلاطین کے یہاں بھی نہیں سی جاتیں۔ اور اس سے آپ کا غنائے ظاہری بھی ظاہر ہے کیونکہ عطاء کی ظاہری کی حقیقت مال کا رکھنا نہیں ہے بلکہ مال کا خرچ کرنا ہے وہ بوجہ اکل ثابت ہو گیا۔

(الوار الیتامی ص ۲۸)

۳۳۔ جنت میں شہد کی ارواح کا سبز پرندہ نہیں ہونا۔

جنت میں وہ جسم طیر شہدار کے لئے مرکب ہوگا۔ ان کا حقیقی جسم وہ نہ ہوگا بلکہ ان کے لئے جسم انسانی دوسرا ہوگا۔ پس ارواح شہدار کا جو اصل طیور خضر میں ہونا ایسا ہے جیسا کہ دنیا میں اہم بہل اور گنجی یا ڈولی اور پالکی میں سوار ہوتے ہیں۔ اگر اور گنجی بند ہو تو دیکھنے والے کو کبھی معلوم ہوگا کہ پالکی اور گنجی آ رہی ہے ہمارا جسم ان کو نظر نہ آئے گا۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائیگا کہ گنجی اور پالکی ہمارا جسم ہے اور ہماری روح اس کے اندر جو آدمی بیٹھا ہے اس کا جسم گنجی اور پالکی کے جسم سے علیحدہ ہے اور یہ محض اس کی سواری ہے اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جنت میں ارواح شہدار کے لئے سبز پرندوں کا جسم بمنزلہ پالکی کے ہوگا اور اس کے اندر روح انسانی اپنے جسم کے ساتھ سوار ہوگی پس اس سے انسان کا پرندہ بن جانا لازم نہیں آتا۔ یہ صورت جب لازم آتی کہ روح انسانی اپنے جسم سے علیحدہ ہو کر جسم میں حلول کرتی۔ اور وہاں یہ بات نہ ہوگی کہ اب رہی یہ بات کہ وہ جسم انسانی کون سا ہے جس کے شہدار کی رو میں حلول کر کے جو اصل طیور خضر میں سوار ہونگی۔ آیا وہ ہی جسم عنفری ہے یا کوئی دوسرا جسم ہے اس کی تحقیق کے لئے کشف کی ضرورت ہے کیونکہ نفس اس سے ساکت ہے اہل کشف کو معلوم ہوا ہے کہ عالم برزخ میں انسان کو جسم مثالی عطا ہوتا ہے جو اسی جسم عنفری کے مشابہ ہے مگر اس سے زیادہ لطیف ہوتا ہے لیکن جسم مثالی صرف برزخ ہی میں انسان کو عطا ہوگا۔ اور جنت و دوزخ میں یہی جسم عنفری پھر مل جائے گا گو برزخ میں جسد عنفری کا ہونا کچھ محال نہیں۔ مگر خلاف مشاہدہ ہے۔ اہل کشف کو معلوم ہوا ہے کہ برزخ میں عذاب و ثواب ارواح کو جسم مثالی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ (ترنج الآخرة ص ۳۲)

۳۴۔ اہل دنیا کے آخرت کا نفع دنیا کے نفع سے

بڑھا ہوا ہے

اس کا جواب بھی سن لو ”وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَجْسَرُ“ اس میں جواب ہے

لہ پرندہ۔

اس عذر کا جس سے اس کا غلط ہونا معلوم ہو گیا۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ کسی منفعت کا محض عاجل ہونا اسکی ترجیح کے لئے کافی نہیں بلکہ ترجیح کے اور اسباب بھی ہوتے ہیں۔ سودنیا میں ہر چیز پر منفعت ہے کہ وہ عاجل ہے مگر آخرت میں اس کے مقابل دو مصفتیں ہیں۔ ایک خیریت، دوسرے بقار یعنی دنیا سے آخرت عمدہ اور کثیر بھی ہے اور پائیدار رہنے والی بھی ہے، دنیا میں نہ وہ عمدگی اور زیادت ہے نہ پائیداری ہے اور ان دونوں میں سے ہر صفت ایسی ہے کہ اس کے مقابل وصف عاجل کو ہرگز کوئی ترجیح نہیں دینا کیونکہ اگر عاجل ہونا ہمیشہ موجب ترجیح ہو تو پھر تجارت کبھی نہ ہو سکے کیونکہ اس سرمایہ عاجل کو اس وقت لگانا پڑتا ہے اور نفع زائد آجمل ہے۔ لیکن تمام عقلا اس وجہ سے تجارت کو موقوف نہیں کرتے کہ اس کا نفع بعد میں حاصل ہوتا ہے اور سرمایہ اس وقت موجود ہے بلکہ سب لوگ خوشی کے ساتھ موجودہ سرمایہ کو تجارت میں لگا دیتے ہیں محض اس امید پر کہ آئندہ نفع زائد ملے گا۔

معلوم ہوا کہ زیادہ و کثرت کے مقابلے میں وصف عاجل نظر انداز کر دیا جاتا ہے پھر تم آخرت پر دنیا کو اس وجہ سے کیوں مقدم کرتے ہو کہ وہ عاجل ہے اور نفع آخرت آجمل ہے۔ تم نے یہ بھی سوچا کہ آخرت دنیا سے کتنی زیادہ اور کتنی عمدہ ہے۔

اسی طرح زراعت بھی دنیا میں نہ ہو سکتی کیونکہ اس میں بھی موجودہ غلہ کو آئندہ کی امید پر مٹی میں ملا دیا جاتا ہے۔ اگر تم منفعت عاجلہ کے ایسے ہی عاشق ہو، پس زراعت کو بھی جواب دیدو، مگر تم ایسا نہیں کرتے بلکہ ہر سال زراعت کرتے ہو، کیونکہ اس میں زیادہ ملنے کی امید ہے۔ پھر آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے اس وصف کو کیوں دیکھتے ہو کہ وہ عاجل ہے (یعنی جلدی ملنے والی ہے) اور یہ آجمل ہے (یعنی دیر سے ملنے والی ہے) ارے وہ آجمل ایسی ہے کہ اس کے سامنے دنیا کسی قابل بھی نہیں اور دوسری صفت آخرت میں یہ ہے کہ وہ ”واقعی“ ہے بہت پائیدار ہے۔ اور پائیداری بھی خود ایسا وصف ہے کہ اس کے مقابلے میں وصف مجتلی کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ دنیا میں اسکی صد ہا نظیر ہیں۔ ایک شخص آب کو مکان دینا چاہتا ہے مگر اس کے پاس دو مکان ہیں ایک نوکچا بنا ہوا ہے، اور چھوٹا بھی ہے اور دوسرا پختہ اور عالیشان ہے اور وسیع بھی ہے۔ وہ آپ سے کہتا ہے کہ اگر تم پختہ مکان لینا چاہتے ہو تو میں یہ بھی دے سکتا ہوں مگر چار سال کے بعد یہ واپس لے لیا جائے گا اور اگر کچا مکان لینا ہو تو وہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ملک کر دوں گا۔ آپ بتلائیے کیا کریں گے؟

یقیناً ہر مائل ہی کہے گا کہ بھائی اس عالیشان محل سے جو عاریتہ ملتا ہے، وہ کچا مکان اچھا ہے جو دائم ملک ہو۔

مگر افسوس تم دنیا و آخرت کے معاملہ میں اس فیصلہ کو نظر انداز کرتے دنیا کی وجہ سے آخرت چھوڑنا ہو کہ آخرت کو جو دوامی ہے۔ دنیا کے لئے چھوڑتے ہو جو چند روزہ ہے۔ انسان کی حیات ہی کیا ہے۔ بعضے لوگ رات کو اچھے خاصے سوئے اور صبح کو مرے ہوئے پائے گئے۔ اس ناپائیدار مدار کے لئے تم اپنا اصلی وطن برباد کرتے ہو جو ہمیشہ کے لئے حق تعالیٰ تمہارے نام کرنا چاہتا ہے۔ پھر مزہ یہ ہے کہ یہاں معاملہ برعکس ہے کہ دنیا سے عاجل کوئی۔۔۔ عالی شان و خوب صورت بھی زیادہ نہیں ہے۔ آخرت اس سے کہیں اور کتنی ہی بڑی ہے اور نہایت خوب صورت و عالی شان ہے۔ تو یہاں تم ایک کچے اور ناپائیدار مکان کے لئے جو عاریتہ مل رہا ہے اور عاریت بھی سال دو سال کے لئے نہیں بلکہ ایک دو لمحہ کے لئے کیونکہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ شاید ہمیں نفس نفس ہو دیا سے عمدہ و عالیشان محل کو چھوڑتے ہو جو دواماً تمہاری ملک کیا جاتا ہے۔ اب بتلاؤ تمہارا وہ عذر کہاں گیا کہ صاحب دنیا تو ابھی مل رہی ہے اور آخرت کا معاملہ ادھار پر ہے صابو! دنیا تو ایک دو لمحہ کے لئے مل رہی ہے جس میں کچھ راحت نہیں، کلفت ہی کلفت ہے اور آخرت ہمیشہ کو مل رہی ہے جہاں رنج و غم کا نام نہیں جس کو دیکھ کر بے ساختہ کہو گے۔ الحمد للہ الذی اذهب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور الذی احلنا داء المقامت من فضله لایمسن فیہا نصب ولا یمسن فیہا الخوب ط۔

رہا یہ شبہ کہ آخرت کا ادھار ایسا ہے کہ نہ معلوم کب ملے گا۔ اس کا آخرت کا نفع یقینی ہے جواب یہ ہے کہ تاخیر زائد کی وجہ سے عاجل کو ترجیح اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ موجد کے ملنے کا پورا یقین نہ ہو۔ اور اگر پورا یقین ہو کہ یہ موجد ضرور ملے گا تو وہاں تاخیر زائد کی بنا پر عاجل کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔ اب یہ دیکھو کہ آخرت کا وقوع محتمل ہے یا یقینی، فرماتے ہیں، ان هذا الفی الصحف الادلی طصحف ابراہیم صوملی یعنی آخرت کا آنا ایسا یقینی ہے کہ خبر متواتر سے ثابت ہے، ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے وقت سے اس کی خبر ہر زمانے میں دی جا رہی ہے۔ لہذا یہ عذر بھی باطل ہوا۔ اور ایک جواب میں پہلے دے چکا ہوں کہ آخرت کے آنے میں صرف تمہاری موت کی دیر ہے۔ مرنے کے بعد ہی سے تم کو آخرت

کی نعمتوں کا مشاہدہ ہو جائے گا۔ اور مرنے میں دیر ہی کیا ہے۔ زندگی کا دامن بھروسہ نہیں لہذا تاخیر زائد کہنا ہی غلط ہے۔

اور تیسرے جواب کی طرف اس آیت میں ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کا نام ذکر کر کے اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اعمال آخرت کا ثمرہ سب ادھار ہی نہیں بلکہ حیات دنیا میں بھی اس کے ثمرات حاصل ہوتے ہیں چنانچہ حضرات ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کے واقعات دنیا کو معلوم ہیں کہ انہوں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی تھی تو خدا نے ان کو دنیا میں بھی کیسی کامیابی اور فلاح و عزت و راحت عطا فرمائی کہ ان کے دشمن مغلوب و مقہور ہوئے اور وہ غالب و قاهر ہوئے دشمنوں کے نام لینے والے بھی ناپید ہو گئے ہیں اور ان حضرات کے نام لینے والے اتباع و تعظیم کرنے والے ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں۔ توخیریت و بقا کا نمونہ دنیا میں اللہ کے بندوں کو عطا ہوتا ہے۔

(ترجیح الآخرت ص ۴۴ تا ۴۷)

۳۴۔ حسن یوسف علیہ السلام و جمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق۔

شاید کسی کو شبہ ہو کہ یوسف علیہ السلام کا حسن تو ایسا تھا کہ زنانِ مصر نے آپ کی صورت دیکھ کر بدحواسی میں ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ بات کہاں تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حسن کی انواع میں جن کی ایک نوع یہ ہے کہ وہ دیکھنے والے کو دفعۃً متحیر کر دے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی سہار ہوتی جائے۔ یوسف علیہ السلام کا حسن ایسا ہی تھا چنانچہ زلیخا کو آپ کے حسن کی سہار ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک دن بھی ہاتھ نہیں کاٹے۔ اور ایک نوع حسن کی یہ ہے کہ دفعۃً تو متحیر نہ کرے مگر جوں جوں اس کو دیکھا جائے تحمل سے باہر ہو جاوے جس قدر غور کیا جائے اسی قدر دلیل میں گھستا جائے۔ اسی کو شاعر بیان کرتا ہے

یزید لک وجه حسنہ اذا ما ذو دستہ نظرا !

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن ایسا ہی تھا کہ اس میں دفعۃً متحیر کرنے کی شان ظاہر نہ تھی۔ کیونکہ آپ میں خدا داد عظمت و جلال کی ایک شان ایسی تھی کہ دیکھنے والے پر سب سے پہلے اس کا اثر پڑتا تھا جس کی وجہ سے دیکھتے ہی نیا آدمی مرعوب ہو جاتا تھا۔ اس کو حسن صورت پر آنکھ بھرنے کا گاہ ڈالنے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی۔ تاکہ تحیر کی نوبت آئے۔ کما فی حدیث من رواہ ابداہتہا ہبدا۔ اخبرہ الترمذی فی الشمائل (جامع) اس پر منکشف ہوتا تھا۔ اور دن

بدن دل میں گھر کر تاجلا جاتا تھا۔ کما فی حدیث علی المد کو دمن خابطہ بشاشۃ احبنا یوسف علیہ السلام کے حسن پر عورتوں کا عاشق ہو جانا منقول ہے مگر فی نفسہ یہ زیادہ بعید نہیں۔ بلکہ ایک فطری امر ہے جو عادت کے مطابق ہے گو کسی درجہ خاص میں خارق عادت بھی ہے۔ اور حضور پر نور پر مرد عاشق تھے جن میں بچے بھی تھے بوڑھے بھی تھے، مردوں کا عاشق ہونا اور وہ بھی بچوں اور بوڑھوں کا فی نفسہ بھی بہت عجیب ہے۔ ایک عاشق صحابی فرماتے ہیں۔ رأیتہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلتہ فی حلۃ حمراء والقمر طالع، وکنت امری القمر صرۃ والی وجہہ صلی اللہ علیہ وسلم صرۃ فواہلہ کان وجہہ احسن منہ۔ (ادکما فتال)۔

یعنی ایک رات میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرخ (دھاریدار) جوڑے میں دیکھا۔ اس وقت چاند نکلا ہوا تھا تو میں کبھی آپ کے چہرہ پر نظر کرتا۔ کبھی چاند کو دیکھتا۔ بخدا آپ کا چہرہ مبارک چاند سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اسی کو کسی شاعر نے عجیب لطیف عنوان سے تعبیر کیا ہے

گہے بسوئے تو گلہ بسوئے مہ می نگرم کد مقابلہ چوں کس کتاب راستہا۔

یعنی کتاب کے مقابلے کے لئے تو ادا آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے میں تنہا کیونکر مقابلہ کر دوں۔

ایک مرتبہ حضرت طلحہ صحابی رضی اللہ عنہ نے لڑائی میں اپنے ہاتھوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سپر بنایا تھا۔ کفار کے جتنے تیرا تے تھے وہ سب کو اپنے ہاتھ پر روکتے تھے۔ تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی تیر نہ لگنے پائے۔ یہ عشق نہ تھا تو اور کیا تھا۔ اس کے علاوہ صحابہ کی محبت کے واقعات کتابوں میں بکثرت سے موجود ہیں۔ بہت سے صحابہ نے آپ کی محبت میں گھر بار چھوڑا۔ بیوی بچے چھوڑے اپنے عزیزوں کو جب کہ وہ حضور کے مخالف ہوئے بے دریغ قتل کیا، حتیٰ کہ خود اپنی جانیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نثار کر دیں اور سرکٹائے۔ اسی حسن کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں

لواحی ذلیخا لورثین جبینہ لاشرون بالقطع القلبی علی المد

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن دل میں گھستا تھا اگر آپ کو زنانِ مصر دیکھ لیتی تو بیلے ہاتھ کے دلوں کو چیر پھاڑ دیتی۔

پس اجمالاً حضور کے حسن کے متعلق میں اپنی گفتگو پر کفایت کرتا ہوں اور حقیقت میں اتنا بھی میرے مذاق کے خلاف ہے۔ باقی اس بات میں تفصیلی گفتگو کرنا تو میرے مذاق کے

بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ اس میں ایہا تم تقیص کا ہو جاتا ہے۔ (الرفع والوضع صلا)

۳۵۔ علمائے کرام میں غیر خدا سے طبعی خوف کی وجہ۔

بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ علماء کو ایسا ہونا چاہیے۔ یخشونہ ولا یخشون احدًا الا اللہ کہ جس خدا ہی سے ڈریں اور کسی سے نہ ڈریں، ان کے نزدیک علماء کو نہ شہرے ڈرنا چاہیے۔ نہ سانپ کچھو سے نہ توپ سے نہ بندوق سے نہ حکام سے نہ ڈاکوؤں سے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو بھی خوف طبعی ہوتا ہے، اگر یہ خوف طبعی توکل کے خلاف ہے تو کیا معاذ اللہ انبیاء کو غیر متوکل کہو گے؟ ہرگز نہیں، کس کا منہ نہ ہو چاہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ متوکل بتائے۔ مگر وہاں یہ حالت تھی کہ نبوت کے بعد ان کے دل میں فرعون سے بھی خوف تھا چنانچہ فرماتے ہیں۔ قال ربنا انتنا نخاف ان یضرب علینا اذان یطغیہ قال لا تخافا اننی معکم اسمع واری ۵ موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو فرعون کی طرف سے یہ خوف ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرنے لگے یا حد سے بڑھ جائے باوجود کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو صریح اور صاف حکم ہو چکا تھا اذہبا الیٰ فرعون انه طغیٰ فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ کشمیری پرکمر باندھ رہا ہے مگر بایں ہمہ موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام نے آجکل کے بہادروں کی طرح اپنی بہادری ظاہر نہیں کی کہ ہم کو نہ قتل کا خوف ہے نہ قید خانے کا اندیشہ ہے ہم بلا خوف و خطر اس خدمت کو انجام دیں گے بلکہ انہوں نے اپنے طبعی خوف کو حق تعالیٰ سے عرض کر دیا کہ ہم کو اس کی زیادتی سے ڈر لگتا ہے۔ اور اس کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ہم کو قتل نہ کر دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ طبعی خوف کا ہونا نبوت و ولایت کے بالکل منافی نہیں۔ ورنہ حق تعالیٰ اس خوف پر انکار فرماتے مگر حق تعالیٰ نے اس پر ان کو ذرا ملامت نہیں کی بلکہ تسلی دے کر فرمایا لا تخافا انی معکم اتم و در نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں اور دوسری جگہ ارشاد ہے یجعل لکم سلطانا فلا یصلون الیکم انتما ومن اتبعکم الغلبون ۵ ہم تم کو رعوب عطا کریں گے جس کی وجہ سے وہ تم تک نہ پہنچ سکیں گے اور تم کو اور متبعین ہی کو غلبہ حاصل ہو گا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے طبعی خوف کے ازالے کا سامان کر لیا اس وقت فرعون کے پاس شریف لے گئے اس سے معلوم ہوا کہ یخشون احدًا الا اللہ میں خوف طبعی کی نفی نہیں بلکہ خوف عقلی

کی نفی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ آیت تبلیغ احکام کے متعلق ہے، اور مقصود یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام میں سوا خدا کے کسی سے ایسا نہیں ڈرتے کہ وہ تبلیغ سے مانع ہو جاوے۔ چنانچہ پوری آیت اس طرح سے الذین یبلغون رسالت اللہ یخشونہ ولا یخشون احدًا الا اللہ کھن با اللہ حبیباً وہ انبیاء ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو پہنچایا کرتے تھے اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے اور اللہ تعالیٰ حساب لینے کے لئے کافی ہے اس میں تبلیغ احکام کے وقت غیر اللہ کے خوف عقلی کی نفی کی گئی ہے۔ رہا یہ ان کو کسی سے خوف طبعی بھی نہیں ہوتا یہ اس آیت کا مفہوم نہیں۔ لوگ قرآن کو ادھورا پڑھتے ہیں اسلئے اشکال ہوتا ہے۔ پورے مضمون پر نظر کرنے کے بعد کچھ اشکال نہیں رہتا غرض تبلیغ احکام کے وقت بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت خوف طبعی کسی درجہ کا لاحق نہیں ہوتا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان کو فرعون سے طبعی خوف تھا اسی لئے انہوں نے حق تعالیٰ سے اپنا خوف ظاہر کر کے اس کا علاج چاہا بلکہ مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام ضرور کرتے ہیں اور تبلیغ کے متعلق خوف عقلی تو ان کو صرف خدا سے ہوتا ہے مخلوق کا خوف عقلی انہیں ذرا نہیں ہوتا جس کے اثر سے خوف طبعی مخلوق کا ان پر ایسا غالب نہیں ہوتا جو تبلیغ سے روک دے۔ بلکہ اگر کسی وقت مخلوق سے ان کو خوف طبعی ہوتا بھی ہے تو وہ خشیت خداوندی سے مغلوب ہو جاتا ہے۔

پس مخلوق کے خوف عقلی کی تو مطلقاً نفی ہے اور خوف طبعی کی مطلقاً نفی نہیں۔ بلکہ اس کے غلبہ کی نفی ہے۔ اب یہ مضمون انشاء اللہ کسی نص سے مستارض نہ ہو گا۔ اشیا بد کوئی یہ کہے کہ پھر علماء کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے کہ مخلوق سے خوف ان کو ذرا نہ ہو اور خوف طبعی اگر ہو تو خوف خداوندی سے مغلوب ہو اس پر غالب نہ ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس جگہ علماء کے ذمے تبلیغ فرض ہوتی ہے وہاں بیشک ان پر خوف خداوندی ہی غالب ہوتا ہے۔ مخلوق کا خوف طبعی غالب نہیں ہوتا مگر جہاں ان پر تبلیغ فرض ہی نہ ہو۔ محض مستحب ہو۔ وہاں اگر ان کو مخلوق سے خوف طبعی ہو تو اس میں کیا حرج ہے۔ بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ ان پر تبلیغ ہر حالت میں فرض ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جن علماء کو تم مخالف کہتے ہو وہ اس خوف کی وجہ سے کسی فرض و واجب کو ترک کر دیتے ہیں یا مباح و مستحب کو۔ اگر تم کو انصاف سے دلائل میں غور کرو گے تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ مخلوق کے خوف سے کسی فرض و واجب کو ہرگز ترک نہیں کرتے۔ بلکہ محض بعض مباحت۔ یا بہت سے بعض مستحبات

کو ترک کر رہے ہیں۔ سو ایسی حالت میں وہ یخشونہ ولا یخشونہ احدثا الا ملک کے خلاف کیونکر ہو سکے۔ بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جن مسائل کی تبلیغ ابجکل کے بہادر لوگ کر رہے ہیں علماء بھی ان سب کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ صرف عنوان کا فرق ہے۔ بہادران قوم مقابلہ اور سب شتم کے ساتھ تبلیغ کرتے اور جن کو تم مخالف کہتے ہو وہ تہذیب اور نرمی کے ساتھ ان مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ اب صرف اس بات کا فیصلہ باقی رہا کہ مخالفین اسلام کے سامنے آیا ہم کو مقابلہ اور سب شتم کے ساتھ احکام کو ظاہر کرنا چاہیے یا نرمی اور تہذیب کے ساتھ سو اس کا فیصلہ خود قرآن نے کر دیا ہے۔

حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا فرما کر جب فرعون کے پاس تبلیغ احکام کے لئے جانا حکم فرمایا تو اس کے ساتھ بھی فرمایا دتوا لہم تولا لہم لیسنا لہم یتن کل یخشی اور فرعون سے نرمی کے ساتھ بات چیت کرنا۔ شاید ان کو نصیحت ہو جائے یا خدا کا خوف اس کے دل میں آجائے۔ دیکھ لیجئے، موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ کون متوکل ہوگا اور فرعون سے زیادہ ظالم و کشر کون، مگر بایں ہمہ یہ حکم ہو رہا ہے کہ اس سے نرمی کے ساتھ گفتگو کیجئے گا۔

صاحبو! قاعدہ یہی ہے کہ جب کسی مخالف پر اپنا زور اور دباؤ نہ ہو وہاں مقابلہ اور سختی نافع نہیں ہوتی۔ بلکہ اکثر ضرر ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع میں اکثر نرمی ہی سے کچھ نفع ہوتا ہے (جامع) (حررات الحدود ص ۳)

۳۶۔ جنٹلمینوں کا انگریزی کو علم میں شمار کرنا غلطی ہے۔

جتنے فضائل احادیث میں علم کے لئے وارد ہیں۔ انگریزی تسلیم پر بھی ان کو جاری کرتے ہیں اور اس کے متعلق یہ حضرات ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں۔ اطلبوا العلم ولو بالصین ترجمہ :- علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں بھی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چین سے طلب علم کی ترغیب دی ہے۔ حالانکہ اس وقت چین میں دین کا علم بالکل نہ تھا، بلکہ محض دنیاوی علم تھا۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطلق علم کی ترغیب دے رہے ہیں۔

خواہ دنیا کا علم ہو یا دین کا۔ پس انگریزی بھی علم ہے اور اس حدیث کے تحت میں داخل ہے۔ ان لوگوں کو اول تو اس حدیث کا ثبوت دینا چاہیے۔ ان الفاظ سے یہ حدیث محدثین کے نزدیک ثابت ہی نہیں۔

قلت ذکرہ للمقاصد طریقین وقال هو ضعیف من الوجہین وقال ابن حبان انه باطل لا اصل لہ واخرجہ ابن المجزی فی الموضوعات قال واخرجہ البیہقی فی الشعب قلت قد التزم ان یخرج موضوعا فلاشبہ الحکم علی الضعیف والضعیف لا یحتج بہ فالاحکام جامع

اور اگر ثابت بھی ہو تب بھی ان لوگوں کا مدعا اس سے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ انہوں نے لفظ ”ولو“ پر نظر نہیں کیا۔ یہ لفظ فرض کے لئے آتا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض چین میں بھی علم ہو تو وہاں سے بھی کوشش کر کے حاصل کرنا چاہیے اور فرض اسی چیز کو کیا جاتا ہے جو معدوم و مستبعد ہو۔ موجود کو فرض نہیں کیا جاسکتا۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس حدیث سے وہی ہے جو چین میں اس وقت موجود نہ تھا۔ اس لئے بطور فرض کے فرما رہے ہیں کہ اگر وہاں بھی ہو تو حاصل کرو اور علم دین ہی ہے۔ ورنہ اگر علم کو ایسا عام کیا گیا کہ دنیوی علم بھی اس میں داخل ہو گیا تو ایک بھنگی اور چار کو بھی عالم کہنا چاہیے کیونکہ اس کو بھی دنیا کا ایک علم حاصل ہے جو کام وہ کرتا ہے اس کو وہ خوب جانتا ہے اور اگر آپ ان کاموں کو بھی علم میں داخل کر لیں گے تو پھر آپ کی خاطر سے ہم انگریزی کو بھی اس میں داخل کر لیں گے اور خیر جانے دیجئے۔ ہم لفظ ولو سے بھی استدلال نہیں کرتے مگر ہم کہتے ہیں اطلبوا العلم ولو بالصین میں تو تصریح نہیں کہ اس سے کون سا علم مراد ہے۔ اب شریعت کی دوسری نصوص سے اس کو دریافت کیا جائے۔ بس علم وہ جس کو شریعت علم کہتی ہے۔ جس کے جاننے والوں میں ایک شیخ سعدی بھی ہیں۔ ع

”علمی کہ رہے تھی تنہا یہ حالت است“

اور حدیث میں ہے الدنيا ملعونہ وما فیہا ملعون الا ذکر اللہ وما والاہ الحدیث، معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی طرف قریب نہ کرے وہ دنیا سے ملعونہ ہے۔ اس میں ایسے علوم بھی داخل ہیں اب میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ کیا سائنس اور جغرافیہ اور انگریزی زبان سے خدا کی طرف قریب ہوتا ہے۔ وصل ہوتا ہے یا فصل؟ قرب ہوتا ہے یا بعد؟ مشاہدہ ہے کہ ان سے بعد ہی پڑھتا ہے۔ گو چاہیے تو یہ تھا کہ سائنس سے اور خدا کی طرف قرب بڑھتا کیونکہ

اس سے قدرت صانع کا انکشاف زیادہ ہوتا ہے اور اپنا عجز زیادہ مشاہد ہوتا ہے کیونکہ اہل سائنس رات دن ترقی کی فکر میں رہتے ہیں اسلئے ان کے مقاصد بہت وسیع ہیں جن میں کثرت سے ایسے مقامات بھی ہیں جو عرصہ تک پورے نہیں ہوتے۔ زمانہ دراز تک ان میں ناکامی رہتی ہے بخلاف ہمارے مقاصد کے کہ وہ معدودے چند ہیں۔ جو اکثر پورے ہو جاتے ہیں مگر ہم پھر بھی اپنے عجز کے معترف ہیں اور ان لوگوں کے زیادہ مقاصد ناکام رہتے ہیں جو کھلی دلیل ہے عجز کی۔ مگر یہ لوگ باوجود مشاہدہ عجز زائد کے پھر بھی اپنے کو قادر سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے عجز پر نظر نہیں کرتے۔ بس عرصہ کے بعد کجی مقصود میں کامیابی ہو گئی۔ اس پر ناز ازاں ہوتے ہیں کہ ہم نے یہ ایجاد کر لی۔ ڈپے پتھر ایجاد کر لی۔ اگر ایجاد تمہارے ہاتھ میں تھی تو پہلے ہی دن کیوں نہ ایجاد کر لی تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ سوچو اور غور کرو۔ بانی ذہن میں ایجاد کا صحیح طریقہ آجائے تمہارے اختیار سے بالکل خارج ہے۔ یہ محض حق تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔ مگر عادات الہیہ ہے کہ جب کسی بات کے لئے انسان غور و فکر کرتا ہے تو وہ اکثر راستے کھول دیتے ہیں۔ اور بعض دفعہ اپنی قدرت ظاہر کرنے کے لئے ہزاروں غور و فکر کے بعد بھی حقیقت ظاہر نہیں کرتے۔ چنانچہ اب تک کسی کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے اور ایسی نظام بحریت موجود ہیں اگر غور و فکر کے بعد حقیقت تک پہنچ جانا تمہارے اختیار میں ہے تو ان چیزوں کی حقیقت کا انکشاف کیوں نہ کر لیا۔ غرض تجربے سے یہ بات مشاہد ہے کہ کچھ عوارض کہ منزلہ لوازم کے ہیں۔ آپ سے جمع ہو رہے ہیں چونکہ سائنس اور جغرافیہ سے قرب خداوندی نہیں بڑھتا۔ بلکہ بعد ہی ہوتا ہے تو یہ علم شرعی میں داخل نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے جاننے سے دین کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ ہاں ایسے لوگوں کو ایسا علم دین البتہ حاصل ہو جاتا ہے۔

جیسے ایک لیڈر کا قصہ ہے جو آج کل مسلمانوں کے مقتدا بنے ہوئے ہیں کہ کسی جگہ نماز کا وقت آگیا اور پانی نہ تھا۔ تیمم کی ضرورت ہوئی تو لیڈر صاحب نے اس طرح تیمم کیا کہ اول تو مٹی کو ہاتھوں پر بہایا۔ جیسا پانی کو بہایا کرتے ہیں۔ پھر کلی کرنے کی واسطے منہ میں ڈالتے اور سح کے لئے سر پر بھی ڈالتے اور پیروں پر بھی مٹی بہاتے۔ مگر منہ میں دیے ہوئے بعض لوگ ہنس پڑے اس لئے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ بس انگریزی پڑھ کر ایسا علم ہوتا ہے کہ عقل خاک میں مل جاتی ہے بھلا اگر وہ کسی سے پوچھ ہی لیتے کہ تیمم کا طریقہ کیا ہے تو اس میں کچھ حرج تھا؟ مگر پوچھتے کس طرح؟ لیڈر ہو کر اپنے جہل کو کیوں ظاہر کریں۔ گومی سے کلی کر کے اس سے زیادہ جہل ظاہر کر دیا۔ اور

مزہ یہ کہ ظہور جہل کے بعد بھی وہ قوم کے لیڈر ہی رہے۔ یہ حالت قوم کی ہے کہ اس جہل پر بھی ان کو مقتدا ہی بنائے رکھا انھیں حضرت کا یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک دفعہ موٹریں سوار تھے۔ نماز کا وقت آگیا۔ موٹر ٹھہرا لیا گیا اور اسی میں بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لی۔ حالانکہ سامنے سڑک پر ایک طرف کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے تھے۔ مگر انہوں نے موٹر کے اندر بیٹھ کر ہی پڑھی۔ بھلا موٹر میں ترک قیام کس طرح جائز ہو گیا جبکہ موٹر کھڑا ہوا تھا چلتی ریل میں تو اگر گرنے کا اندیشہ ہو تو بیٹھ کر نماز کی گنجائش بھی ہے۔ مگر موٹر میں چلتے ہوئے بھی ترک قیام کی گنجائش نہیں کیونکہ اس کا بیٹھنا یہاں وقت ہمارے اختیار میں ہے اور ریل گاڑی کا بیٹھنا ہمارے اختیار میں نہیں۔ اور اگر موٹر ٹھہرا ہوا ہو تب تو کسی طرح ترک قیام کی گنجائش نہیں۔ مگر ان لوگوں نے تو محض لیڈر بننے کے لئے نماز شروع کی ہے اس لئے نماز بھی لیڈری میں ہوتی ہے۔ شرعی نماز کی ان کو کیا ضرورت ہے گویا غلطیاں دیہاتیوں کے بھی ہوتی ہیں اور ان کو مسائل کا علم نہیں۔ مگر وہ اپنے کو تعلیم یافتہ تو نہیں کہتے نہ علم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ بلکہ بیچارے اپنے جہل کا اقرار کرتے ہیں تو گویا ان سے بھی علم دین سے غفلت کرنے پر کچھ مواخذہ ہو۔ مگر شاید ان کے عجز و دنیا کی وجہ سے ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ ہو جائے چاہے محوڑی سی سزا کے بعد ہی سہی، حق تعالیٰ کو عجز پر رحم آتا ہے۔ اس لئے بعض دفعہ گنہگاروں کو ان کی عاجزی پر بخش دیا جاتا ہے۔ اور دعوے کے ساتھ سارا علم اور تقویٰ دھوا رہا جاتا ہے۔ (الہدیٰ والمغفرۃ ص ۱۱)

۳۷۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا سے طلب کرنا محبت

الہی کا نتیجہ ہے

اللھم انی اسئلك الجنة وما قرب الیہا من قول او عمل۔ مترجم :- اے اللہ میں آپ سے جنت مانگتا ہوں اور پھر وہ چیز مانگتا ہوں جو جنت سے نزدیک کرنے والی ہو، قول ہو یا عمل، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی رغبت سے عمل کرنا سب سے ارفع حالت ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی۔ تو سمجھ لیجئے کہ ارفع تو وہی حالت ہے کہ محض رضائے محبوب کے لئے عمل کیا جائے۔ رہا حضور کا جنت مانگنا، سو اس کے متعلق وہ بات یاد کر لیجئے جو میں نے پہلے بیان کی ہے کہ عاشق کو محبوب کی چیزوں سے

بھی محبت ہو کرتی ہے۔ پس آپ کا جنت مانگنا ویسا نہیں ہے جیسا ہمارا مانگنا ہے۔ ہم تو جنت اس لئے مانگتے ہیں کہ وہاں ہم کو آرام ملے گا عوریں ملیں گی۔ خوب مزے اڑائیں گے۔ غرض ہم کو حظ نفس مطلوب ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اس بنا پر تھا کہ وہ خدا کی چیز ہے، اور خدا تعالیٰ آپ کو مانگنے کا امر فرمایا ہے جب محبوب خود چاہے کہ مجھ سے میری چیزیں بھی مانگو تو اس وقت مانگنا ہی موجب رضا ہے۔ اس وقت استغفار مناسب نہیں ہے۔

پچوں طمع خواہد ز من سلطان دیں خاک برفرق قناعت بعد ازیں۔

اسلئے آپ نے جنت مانگی۔ اور اس سے استغفار نہیں برتا، عارف کامل خدا کی ادنیٰ نعمت سے بھی استغنا ظاہر نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ جنت سے جو کہ اصل النعم ہے وہاں کوئی ابن الفارض جیسا صاحب حال ہو تو وہ بلا سے استغنا ظاہر کر دے۔ اور ایسے لوگ غلبہ حال سے معذور ہوں گے۔ ورنہ معرفت کا مقتضایہ یہی ہے کہ جیسے محبوب سے رضائے محبوب طلب کی جاتی ہے اسی طرح جس چیز کا اسے مانگنا پسند ہو، وہ بھی مانگے اور یہ بھی درحقیقت طلب رضا ہی ہے۔ کسی دوسری چیز کی طلب نہیں۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت کا سوال اس بنا پر بھی کرتے تھے کہ وہ محل دیدار ہے۔ تو درحقیقت یہ جنت کا سوال نہ تھا بلکہ دیدار محبوب کا سوال تھا۔ اسی کو کہتے ہیں ع۔

در عاشقان جنت برائے دوست می دارند دوست

اور ایک بات اس سے بھی باریک ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ جنت کی طلب اس نیت سے بھی نہیں ہوتی کہ وہاں محبوب کا دیدار ہوگا۔ بلکہ محض اس خیال سے تمنا کی جاتی ہے کہ ہماری شان تو کہاں جو دیدار کی منت کریں ہم تو اگر جائے دیدار ہی کو دیکھ لیں تو بڑی قسمت ہے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ بڑے حوصلے کے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں۔ ہم تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ قبۂ خضر ہی نظر آئے۔

مرا زلف تو موئے پسند است ہوس را رہ مدہ یوئے پست است

تو بعض دفعہ غلبہ تو اضع طلب جنت کا منشا ہوتا ہے کہ عاشق اپنے کو دصال محبوب کے قابل نہیں سمجھتا۔ اس لئے تمنا کرتا ہے کہ میں اس کو دیکھنے کے تو لائق نہیں۔ کاش اس کے شہر ہی میں جا رہا ہوں۔ اور کبھی اپنی احتیاج و اقتدار ظاہر کرنے کے لئے جنت کی طلب

کی جاتی ہے کہ اے اللہ میں آپ کی رضا کا محتاج کیوں نہ ہوگا میں تو جنت تک کا بھی محتاج ہوں۔ اس لئے بطور اظہار احتیاج کے دعا کی جاتی ہے کہ اے اللہ جنت دیدے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حال پیش نظر ہوتا تو آپ کھانا کھا کر فرمایا کرتے تھے۔ الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین غیر مودع ولا مکفور ولا مستغنی عن ربنا۔ یعنی اے اللہ اس وقت پیٹ بھر گیا ہے۔ اسلئے کھانے کو اٹھا دیا ہے ہم اس کو ہمیشہ کے لئے وداع نہیں کرتے نہ اس کی ناکدوری کرتے ہیں۔ اور نہ اے اللہ ہمیں اس سے استغنا ہے حقیقت میں آپ کی اداؤں کی یہ حالت ہے کہ

س زعفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم

کر شمع دامن دل می کشند کہ جای خواست

آپ کی جس ادا کو دیکھو اس میں غضب کی دلربائی ہے پھر کمال یہ ہے کہ اس میں نہ تصنع نہ تکلف، بلکہ ایک بیساختہ حال ہے۔

س دل سریاں نیاتی ہمہ زیور بستند

دلبراست کہ با حسن خدا داد آمد

مخالفین نے بھی ان باتوں کو دیکھ کر آپ کی سچائی کی شہادت دی اور ان کو ماننا پڑا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جس قدر کمالات تھے وہ اصلی تھے تصنع اور بناوٹ کا وہاں نام نہ تھا۔ غرض ایک مبنی طلب جنت کا یہ بھی ہوتا ہے یعنی اظہار احتیاج۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اور ہمارا مانگنا برابر نہیں اور آپ کے سوال کا یہ مطلب نہیں کہ عمل جنت کے واسطے کرنا چاہیے بلکہ اس کا منشا آپ کی شان کے مناسب تھا وہ اپنے علم کے موافق عرض کر دیا۔ لیکن اگر کوئی شخص جنت ملنے ہی کی نیت سے عمل کرے تو وہ بھی راہ صواب پر ہے غلط راہ پر نہیں، خدا تعالیٰ سے محبت ہونی چاہیے خواہ بلا واسطہ براہ راست ہو یا جنت کے واسطے ہو سب ٹھیک ہے۔

س بخت اگر مدد کند دامنش آرم بکف

گر بکشد زہے شرن در بختم نہیے طرب

یعنی مقصود قرب ہے بس قرب ہو نا چاہیے خواہ میں انہیں کھینچ لوں یا وہ مجھے کھینچ لیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ مقصود تو کام چلانا ہے کہ بندے کو خدا کی اطاعت و ذکر کی

توفیق ہو جاوے۔ اب وہ خدا کی براہ راست محبت سے ہوا تو کیا، اور جنت کی رحمت سے ہوا تو کیا دونوں راستے ٹھیک ہیں اور دونوں بڑھیاں ہیں۔ گو ایک رفیع ہے اور ایک ارفع۔

(رزم البیان ص ۴۸)

۳۸۔ اَنْبِیَاءٌ عَلَیْهِمُ السَّلَامُ بِرِزْعِ کَیْفِیَّتْ کیوں ہوتی ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نزع میں بہت شدت ہوتی تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت نزع دیکھ کر میں کسی کی سہولت نزع دیکھ کر اس کی..... تمنا نہیں کرتی اسی طرح بعض اولیاء کو بھی نزع شدید ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ تو بات یہ ہے کہ شدت نزع کا سبب تو تعلقات ہی ہیں۔ جس قدر روح کو ناسوت سے تعلق ہوگا اسی قدر نزع میں شدت ہوگی۔ مگر تعلقات دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو مانع عن الآخرت ہیں۔ جیسے جائداد اور مال وغیرہ کی محبت۔ ان سے جو نزع میں شدت ہوتی ہے اس سے تکلیف سے سخت ہوتی ہے دوسرے وہ تعلقات ہیں جو آخرت سے مانع نہیں ہیں بلکہ معین آخرت ہیں، اور یہ وہی تعلقات ہیں جو اسکے مصداق داخل ہیں۔

”اسیرش نخواہد خلاصی ز بند“

اس کی تعین عنقریب آتی ہے۔ اس سے بھی نزع میں شدت ہوتی ہے مگر اس سے چٹانی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ وہ شدت لذیذ ہوتی ہے کیونکہ اس کا منشاء قید لذیذ ہے۔ تفصیل اسکی یہ ہے کہ اہل اللہ کو حقیقی تعلق تو بحر ذات حق کے کسی سے نہیں ہوتا اور اس کا مقتضا سہولت نزع ہے مگر بعض حضرات کو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد خلق و تربیت طالبین کی خدمت سپرد ہوتی ہے اور یہ بدولت الی الخلق کے نہیں ہو سکتی اس لئے ان کو امر حق سے مخلوق کی طرف توجہ کرنا پڑتی ہے اور اصلاح و ارشاد کے لئے ان سے ایک گونہ تعلق ہو جاتا ہے اور یہ تعلق چونکہ بامر حق ہے اس لئے آخرت سے مانع نہیں ہوتا۔ بلکہ موجب امر اور سبب ترقی ہے جس سے جس قدر اصلاح و ارشاد کا فیض ہوگا اسی قدر اس کے درجات میں اضافہ ہوگا۔ چونکہ یہ خدمت سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے سپرد کی گئی ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو مخلوق کیساتھ یہ تعلق زیادہ ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام میں بھی ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد

سب سے زیادہ یہ خدمت تھی، کیونکہ قیامت تک آنے والی مخلوق کے لئے آپ ہی رسول ہیں آپ کے بعد کوئی دوسرا رسول آنے والا نہیں۔ تو آپ کو سب سے زیادہ ارشاد و اصلاح کا فکر و اہتمام تھا۔ اس لئے آپ کو نزع میں شدت زیادہ ہو گئی کیونکہ روح کو امت کے ساتھ تعلق تھا اور دصال کے وقت بھی آپ کو ان کا اہتمام تھا، مگر یہ تعلق لذیذ اور یہ فکر خوشگوار تھا آپ کے لئے اس میں اجر اور ترقی درجات تھی اس لئے شدت نزع سے جسم کو تو تکلیف ہوتی مگر روح کو کچھ تکلیف نہیں ہوتی انبیاء کے بعد بعض اولیاء ایسے ہوتے ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد و تبلیغ ہوتی ہے ان کو بھی نزع میں بوجہ طالبین کی فکر کے شدت ہوتی ہے مگر ان کو انبیاء کے برابر شدت نہیں ہوتی کیونکہ ان کی ذمہ داری انبیاء کے برابر نہیں ہے اس لئے ان کو مخلوق کے ساتھ اصلاح و ارشاد کا تعلق بھی ان سے کم ہوتا ہے۔ اور جن بعض اولیاء کے سپرد یہ خدمت نہیں ہوتی وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں ان کو نہ کسی کا فکر ہے نہ کسی سے تعلق ہے ان کا نزع بہت سہل ہوتا ہے۔ ایسے لوگ مرتے ہوئے بڑے شاداں و فرحاں ہوتے ہیں۔ بعضے غزل پڑھتے ہوئے جاتے ہیں۔ بعضے ہنستے ہوئے جاتے ہیں۔ عارف مشیر ازی فرماتے ہیں کہ

خرم آں روز کو ز منزل دیراں بردم

راحت جاں طلبم وز پے جاناں بردم

نذر کردم کہ گر آید بسر این عزم روزے

تا در میکده شاداں وغزل خواں بردم

ایک بزرگ مرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

وقت آں آمد کہ من عسریاں شوم جسم بگذارم سرسرجاں شوم۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر بعض لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان اولیاء سے افضل

ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد ہے۔ کیونکہ وہ موت کے وقت ان کے برابر بے فکر نہیں ہوتے ان کو اپنی ذمہ داری کی بھی فکر ہوتی ہے اپنے متعلقین کا بھی خیال ہوتا ہے اسی وجہ سے ان کے نزع میں شدت بھی واقع ہوتی ہے مگر یہ اعتقاد افضلیت صحیح نہیں بلکہ اکثر وہی اولیاء افضل ہوتے ہیں جو صاحب ارشاد ہیں کیونکہ ان کی حالت انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہیں اور جو جتنا انبیاء کے مشابہ ہوگا وہ دوسروں سے افضل ہوگا۔ لیکن تم کو اس تجویز کا حق نہیں ہے کہ اپنے صاحب ارشاد ہونے کی تمنا کرو۔ بس بادشاہ کو اختیار ہے کہ

تہا امتحان لیکر جو عہدہ جس کو چاہے دے۔ (العبرة بذكر البقرة ص ۱۲)

۳۹۔ تفاضل تفصیلی بین الانبیاء ممنوع ہے۔

آجکل ایک سٹیئر بنو یہ شائع ہوئی ہے جس کو تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت مقبولیت حاصل ہے لوگ شوق سے اس کو خریدتے ہیں، کیونکہ کاغذ چمکا اور لکھائی عمدہ ہے ظاہری ٹیپ ٹاپ بہت ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا باطن ایسا ہی ہوگا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہی نبی کی سٹیئر ہے۔ کیونکہ کمالات نبوت سے اس میں بحث ہی نہیں۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مدبر بادشاہ کی سوانح عمری ہے۔ زیادہ تر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر سے انتظام کا ہی پہلو دکھلایا گیا ہے اور اگر کسی جگہ اتفاق سے آپ کے کمالات نبوت کا ذکر بھی ہے۔ تو غضب یہ کیا ہے کہ دوسرے انبیاء میں نقص نکالا گیا ہے۔ چنانچہ شروع ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات کے جامع تھے۔ اور دیگر انبیاء علیہم السلام تمام کمالات کے جامع نہ تھے۔ کسی میں کوئی صفت تھی کوئی نہ تھی۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی بابت دعویٰ کیا ہے کہ وہ رحم خالی تھے۔ اور دلیل میں یہ واقعہ پیش کیا ہے۔ دَبَّ لَا تَدْرُ عَلَى الْهَرَجِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَبَّ سَارًا۔ اے رب اب زمین پر کسی بسنے والے کو نہ چھوڑیے سب کو تباہ کر دو تب کئے (جامع) یہ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ نبی کو رحم سے خالی کہا جائے (انا للہ وانا الیہ راجعون) رہی دلیل تو اس کا جواب خود نص میں موجود ہے۔

نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو نبھایا حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا کی وجہ | غور کیجئے کہ سمجھانے کی بھی کوئی حد ہے۔ اتنی مدت تک ان اذیتوں پر صبر کرنا تھوڑی بات ہے ذرا کوئی کر کے تو دکھلائے۔ نو سو برس تو کیا نو ہی برس میں حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ تو نوح علیہ السلام کا یہ تھوڑا رحم ہے کہ اتنی مدت تک قوم کی بددعا کی اور ایذا رسانی پر صبر کرتے رہے اور بددعا نہ فرمائی اس مدت کے بعد اگر وہ از خود بھی بددعا فرماتے تو اس کو بے رحمی نہیں کہہ سکتے تھے۔ چہ جائیکہ انہوں نے خود بددعا نہیں فرمائی۔ بلکہ جب ان کو وحی سے معلوم ہو گیا کہ اب ان میں کوئی ایمان نہ لائے گا اور ان کی تقدیر میں کفر ہی پر خاتمہ لکھا ہے۔ اس وقت بددعا فرمائی۔ بتلائے جب ایک قوم کی اصلاح سے مایوسی ہو جائے

تو اس وقت ان کا باقی رہنا بہتر ہے یا ہلاک ہو جانا؟ ظاہر ہے کہ ایسی قوم کی بقا میں کچھ فائدہ نہیں بلکہ اندیشہ فساد ہے کہ یہ دوسروں کو بھی غارت کریں گے۔ اس وقت ان پر بددعا کرنا بے رحمی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے حق میں رحم ہے چنانچہ نوح علیہ السلام نے اپنی بددعا میں اس بات کو ظاہر فرمادیا۔ اِنَّكَ اَنْ تَذَكَّرَهُمْ يُصْلِحُوا عِبَادَكَ وَلَا يَكِيدُوا اِلَّا فَاَجِبْ كُفَّارًا ه خداوند اگر آپ ان کو زندہ چھوڑ دیں تو یہ آپ کے دوسرے بندوں کو بھی گمراہ کر دیں گے اور کافر و فاجر کے سوا کسی کو بھی نہ جنیں گے۔ اور یہ بات نوح علیہ السلام نے اپنے قیاس سے نہیں فرمائی، بلکہ وحی سے ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ اب ان میں یا ان کی اولاد میں کوئی بھی ایماندار نہ ہوگا وَاَحِبُّ اِلَى نُوْحٍ اَذَلِّينَ يَوْمَئِذٍ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ قَدْ اٰمَنُوا فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُوْنَ تو بتلائے اس حالت میں اگر نوح علیہ السلام ان کے لئے نہ فرماتے تو اس کا انجام کیا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تمام دنیا کافروں سے بھری ہوئی تھی مسلمان بہت ہی معدودے چند تھے۔ اور کفار کے متعلق معلوم ہو چکا تھا کہ یہ نہ خود ایمان لائیں گے نہ ان کی اولاد میں کوئی مومن ہوگا اور مسلمانوں کی اولاد کے متعلق یقین نہ تھا کہ یہ سب ایمان دار ہی ہوں گے بلکہ ان میں ایماندار اور کافر دونوں قسم کے لوگ ہونے والے تھے بلکہ مسلمانوں کی اولاد میں بھی غلبہ کفار ہی کو ہو نیوالا تھا۔ اب اگر اس زمانہ کے کافر غرق نہ کئے جاتے اور ان کی اولاد بھی اس وقت موجود ہوتی۔ تو مسلمان کو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا (احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جتنے لوگ موجود ہیں وہ نوح علیہ السلام کے صرف تین بیٹوں کی اولاد ہیں۔ جب تین آدمیوں کی اولاد میں کفار کا اس قدر غلبہ ہے جو مشاہدہ میں آ رہا ہے تو دنیا بھر کے آدمیوں کی اولاد میں کفار کا کیا کچھ غلبہ نہ ہوتا۔ سب کافر ہی ہوتے۔ اس مقدمہ کے ملانے کے بعد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نوح علیہ السلام نے مسلمانوں کے حال پر بہت ہی رحم فرمایا جو اپنے زمانہ کے کافروں پر بددعا کی۔ ورنہ آج کفار کا وہ غلبہ ہوتا کہ مسلمانوں کو حقیقت نظر آجاتی اور ان کا جینا محال ہو جاتا غرض اس سٹیئر کے مصنف نے صرف ایک پہلو کو دیکھا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے واسطے ایسی سخت بددعا کی جو بے رحمی معلوم ہوتی ہے مگر اس نے دوسرے پہلو کو نہ دیکھا کہ ان کی یہ بددعا مسلمانوں کے حق میں خود جن میں یہ مصنف بھی داخل ہے۔ سرسراہتم بھی ورنہ میاں کو آج دنیا میں رہنا اور کفار سے جان بچانا دو بھر ہو جاتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اعتراض۔ یہ اعتراض تو نوح علیہ السلام پر تھا

اس کے بعد لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سیاست کا مادہ نہ تھا۔ نہ معلوم اس کے پاس کوئی وحی آگئی تھی۔ یا اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چہرہ دیکھ کر قیافہ سے پہچان لیا تھا کہ ان میں یہ مادہ ہے اور وہ مادہ نہیں۔ کچھ نہیں اس اعتراض کا منشاء صرف یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔ اس سے ان حضرات نے یہ استنباط کر لیا کہ ان میں یہ مادہ ہی نہ تھا۔ حالانکہ عدم ظہور شہنشاہی ظہور عدم کو مستلزم نہیں بھلا اگر کسی شخص کو زندگی بھر روپیہ تقسیم کر نیکام واقع نہ ملے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں سخاوت کا مادہ نہیں ذرا اس کے ہاتھ میں روپیہ دیکھ دیکھو اگر پھر بھی وہ سخاوت نہ کرے اس وقت تم کو اس بات کا حق ہے در نہ دعویٰ بلا دلیل ہے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگر سلطنت کا موقع ہی نہ ملا تو اس سے ان کا تمدن و سیاست سے خالی ہونا کیسے لازم آگیا اور تم نے کیونکر سمجھ لیا کہ ان میں انتظامی قابلیت نہیں تھی یہ بات جب چل سکتی ہے کہ ان کو سلطنت کا موقع ملتا اور پھر انتظام نہ کر سکتے۔ پس اس شخص کا اعتراض تو لغو ہو گیا اب میں ثابت کرنا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سیاست اور انتظامی قابلیت بدرجہ کمال موجود ہے گو اس جوہر سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا اور اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کیف انتم اذا نزل فیکم عیسیٰ بن مریم عدلا لا مقتتاً (ادیکھا حال) تمہارا کیا حال ہو گا اس وقت جبکہ عیسیٰ بن مریم علیہا السلام تمہارے اندر (آسمان سے) نازل ہو کر آویں گے عادل منصف ہو کر حکومت کریں گے تو حضور نے اس وقت سے متصرف فرمائی جبکہ عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں میں حکومت کریں گے اور آپ ان کے متعلق عدل و انصاف کی خبر دے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ عدل و انصاف بدون قابلیت انتظام کے نہیں ہو سکتا۔ عدل وہی کر سکتا ہے جس میں سیاست کا مادہ بدرجہ کمال موجود ہو، نیز احادیث میں بھی یہی مذکور ہے کہ اس وقت بہت امن و امان اور خیر و برکت ہوگی جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہایت عمدگی اور خوبی کے ساتھ سلطنت کا انتظام کریں گے اگر ان میں فی نفسہ یہ مادہ موجود نہیں تو اس وقت کیونکر سلطنت کا انتظام کریں گے پس معلوم ہوا کہ اس شخص نے فوج علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جامعیت پر جو اعتراض کیا ہے وہ نہایت لغو ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات ثابت کر نیکام یہ کون سا طریقہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائیوں میں نقص بکا لجاوے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یاد رکھو! انبیاء علیہم السلام کامل ہیں۔ ان میں ناقص کوئی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکمل ہیں۔ لہذا فصل

بن الانبیاء سے اسی واسطے منع کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بھائیوں کی تنقیص گوارا نہیں۔ الغرض انبیاء علیہم السلام کے مذاق باہم مختلف ہیں مگر کامل سب ہیں، اور ہر ایک کا مذاق خدا کا کے نزدیک مقبول ہے۔ (البقرة بزرع البقرة ص ۲۴)

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال بیان کرنے میں عتدال

سید نے غضب کیا ہے کہ عرب کی مذمت لکھتے ہوئے آپ کہتے ہیں کہ اس قوم میں کینہ بہت ہے حتیٰ کہ وہاں کے جانوروں میں بھی اس صفت کا غلبہ ہے۔ چنانچہ شتر کا کینہ مشہور ہے مولوی محمد علی صاحب نے سید کے تفسیر کے رد میں ایک کتاب ”البرہان“ بہت ہی عمدہ لکھی ہے بڑی قابلیت سے جواب دیا ہے۔ انہوں نے اعتراض کا بھی بڑا عمدہ جواب دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ! اول تو جانوروں کے اخلاق سے انسانوں کے اخلاق پر استدلال کرنا عجیب طریقہ استدلال ہے۔ پھر ہم سید صاحب سے پوچھتے ہیں کہ شتر کینہ جو مشہور ہے یہ عرب کا محاورہ ہے یا فارس کا۔ ظاہر ہے کہ یہ عرب کا محاورہ نہیں فارس کا ہے تو اس سے بہت سے بہت یہ لازم آیا کہ فارس کے اونٹوں میں کینہ ہوتا ہوگا۔ عرب کے اونٹوں میں اس صفت کا ہونا کیسے لازم آیا۔ اور اگر مان لیا جاوے کہ عرب کے اونٹوں میں بھی یہ صفت ہے تو آپ نے اس کے ایک عیب کو تو دیکھ لیا۔ اس کی دوسری خوبیوں کو بھی تو بیان کیا ہوتا۔ ع

”عیب آں جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو“

اونٹ میں اگر ایک عیب کینہ کا ہے تو ہزار باتیں مدح کی ہیں۔ اس میں تحمل و جفا کشی بہت ہے۔ قناعت کا مادہ بہت ہے۔ عرب کے اونٹ میٹھ و منقاد بہت ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ جہاں کسی نے اونٹ پر سوار ہونے کے لئے اس کی گردن کو جھکایا وہ فوراً زمین پر رکھ دیتا ہے پھر سوار کے پاؤں رکھنے کے بعد آہستہ آہستہ اس طرح اٹھاتا ہے کہ سوار نہایت سہولت سے پشت تک پہنچ جاتا ہے۔ لوگ کثرت سے اس طرح چڑھتے اترتے ہیں، اونٹ کی لمبی گردن میرٹھی کا کام دیتی ہے تو اگر اس کے ایک عیب سے عرب کے ایک عیب پر استدلال کیا گیا ہے تو اس کی ان خوبیوں سے بھی تو اہل عرب

کی خوبیوں پر استدلال کیا ہوتا۔

پھر عرب میں جہاں اونٹ ہیں وہاں گھوڑے بھی تو ہیں۔ جن کی اصالت
عربی گھوڑے | و نجابت و شرافت ضرب المثل ہے کہ وہاں کے گھوڑے مالک کی ساتھ
ایسے وفادار ہوتے ہیں جن کو سب جانتے ہیں دڑائی میں جہاں عربی گھوڑا دیکھتا ہے کہ میرا مالک
زخمی ہو کر گرا چاہتا ہے تو اس وقت دشمن پر حملہ کر کے اور مالک کے پاس سے لوگوں کو ہٹا کر میدان
سے اس کو لے بھاگتا ہے) اگر یہی طریقہ استدلال ہے تو گھوڑوں کی ان صفات حمیدہ سے
بھی تو اہل عرب کے کمالات پر استدلال کرنا چاہیے تھا۔ مگر کچھ نہیں۔ انجکل لوگوں نے یہ طریقہ
اختیار کر لیا ہے کہ اہل عرب کی جہالت و وحشت کو بہت ہی غلط اور بدناما بھدے عنوانوں سے
بیان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال ثابت کرتے ہیں کہ آپ نے ایسے جاہلوں کی
اصلاح کی۔ ایسے وحشیوں کو متمدن بنایا۔ ان لوگوں کی نیت تو بہت اچھی ہے مگر نہایت بُرائے
اول تو بات اتنی کہنی چاہیے جتنی اصلیت ہو۔ اہل عرب میں حضور صلی
اہل عرب کا حال | بعثت سے پہلے جہالت و وحشت ضرور تھی، مگر نہ اتنی جتنی یہ لوگ بیان
کرتے ہیں۔ پھر جتنی جہالت تھی اس کے ساتھ ان کے کمالات و صفات حمیدہ کو کبھی تو بیان کرنا
چاہیے جو ان میں زمانہ جہالت میں تھیں۔ اہل عرب میں ہمیشہ سے شجاعت کا جوہر موجود تھا۔ زبان
کے بڑے پکے تھے۔ جھوٹ بولنا جانتے ہی نہ تھے۔ مہمان نوازی اور سخی نمبر اول تھے۔ اور
ایک بات تو ان میں ایسی بھی کہ جو دنیا کی کسی قوم میں بھی نہ تھی وہ یہ کہ جب دشمنوں کے ساتھ
اپنے مقابلہ اور لڑائی کا ذکر کرتے ہیں تو دشمن کی شجاعت و بہادری کا دل کھول کر تذکرہ کرتے
ہیں کہ وہ ایسے بہادر ایسے کریم دلیر تھے حتیٰ کہ کبھی مقابلہ میں پسپا ہوتا بھی ذکر کر دیتے ہیں
غرض دشمنوں کی تعریف کرنا یہ اہل عرب کی خاص صفت ہے اس پہلو کو بھی بیان کرنا
چاہیے تاکہ ناظرین و سامعین کو اہل عرب سے نفرت نہ پیدا ہو۔ ان کی نظروں میں یہ قوم ذلیل نہ ہو
مسلمان کا دل اس بات کو کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے نبی کی قوم کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار
کرے اور اس طرح ان کا ذکر کرے جس سے قلوب میں ان سے نفرت پیدا ہو۔ جیسا سرسید
نے کیا۔ اس لئے مولانا محمد علی کو غصہ آیا اور اس کا خوب جواب دیا۔ خدا ان کو جزا بخیر دے

(البسرة بذبح البقرة ص ۶۹)

۴۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج فرمانے کی حکمت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مصالح کیوں نہ ہوتیں۔ عارفین نے بھی عجیب عجیب مصالح مزاج
میں اختیار کی ہیں۔ حضور کے مزاج میں علاوہ اور مصالح کے ایک ادنیٰ مصلحت کم از کم یہ تو ضرور ہے
کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود تبلیغ و اصلاح ہے جس میں ایک کام تو آپ کا ہے یعنی پہنچنا دینا۔ اور ایک
کام قابل کا ہے کہ وہ فیض لے، جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے وہ ہیبت عطا
فرمائی تھی، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے وہ ہیبت عطا فرمائی تھی۔ جس کی وجہ سے بڑے
بڑے سلاطین و درباری سافٹ پر آب کے رعب سے کانپتے تھے اور جو آپ کے سامنے آتا تھا
اس کو از خود گفتگو کی ہمت نہ ہوتی تھی اور فیض لینے کے لئے مستفید کے دل کھلنے کی ضرورت ہے
جب تک اس کا دل نہ کھل جائے اس وقت تک وہ فیض نہیں لے سکتا۔ پس یہ حال ہو جاتا ہے
سے سامنے جب وہ شوخ و لہو بآجائے ہے۔ تھامتا ہوں دل کو پرہاتوں سے نکال جائے ہے۔
عاشق پر جب محبوب کی ہیبت کا غلبہ ہو جاتا ہے تو جو کچھ وہ سوچ رہتا ہے کہ یوں کہوں گا یہ
پوچھوں گا۔ صورت دیکھتے ہی سب ذہن سے نکل جاتا ہے اور وقت پر کچھ بھی نہیں کہاجاتا۔

ہمارے ایک عزیز ناخواندہ کہتے ہیں

یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آجاتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہاجاتا۔

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے گاہے گاہے مزاج فرمایا کرتے تھے تاکہ ان کا
دل کھل جائے اور بے تکلف ہو کر استفادہ کر سکیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت تو بھلا کسی کچھ
ہوگی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامان غلام کی یہ حالت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ایک
جماعت کے ساتھ چلے جا رہے تھے کہ دفعہ پہنچے مڑ کر دیکھا تو سب مارے ہیبت کے گھٹنوں
کے بل گر پڑے۔ حالانکہ یہ وہ حضرات تھے جو حضرت عمر کے مرید نہ تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پیر بھائی
تھے، جن میں گونہ مسادات ہوا کرتی ہے مگر ان پر بھی آپ کا اس قدر رعب تھا۔

مگر شاید اس میں کوئی یہ شبہ نکالے کہ وہ حضرات تو معتقد تھے تو سننے کے غیر معتقدین پر
آپ کے رعب کی یہ شان تھی کہ ایک مرتبہ سفیر روم بڑی شان و شوکت کے ساتھ مدینہ میں آپ کی
خدمت میں آیا اور شہر میں داخل ہو کر لوگوں سے دریافت کیا کہ خلیفہ کا قصر کہاں ہے
گفت کو قصر خلیفہ اے چشم
تا من اسد درخت را آنجا کشم

قوم گفتندش کہ اور اقرار نیست مگر اقرار جہاں روش نیست -

۱) اس واقعہ پر حضرت مولانا پر گریہ طاری ہو گیا مگر بہت ضبط سے کام لیا (یا) لوگوں نے کہا کہ عمر کے لئے نہ قصر ہے نہ ایوان ہے پس اس کا دل ہی قصر و ایوان ہے۔ قاصد کو بڑی حیرت ہوئی کہ وہ خلیفہ جس کے نام سے سلاطین کا بیٹے ہیں۔ اسکے نہ محل نہ قصر کیا معاملہ ہے پھر اس نے پوچھا کہ آخر وہ کہاں بیٹھا کرتے ہیں لوگوں نے کہا کہ مسجدیں اکثر بیٹھا کرتے ہیں اور کبھی بازاروں میں گلی کوچوں میں اور کبھی جنگل میدانوں میں گھومتے پھرتے ہیں تلاش کر لو کہیں مل جائیں گے۔ اب وہ آپ کی تلاش میں نکلا معلوم ہوا کہ ابھی جنگل کی طرف تشریف لے گئے۔ سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ عجیب بادشاہ ہے جو تنہا بازاروں جنگلوں میں پھرتا ہے نہ ساتھ میں پہرہ دار ہیں نہ پولیس۔ آخر وہ جنگل کی طرف چلا۔ جس وقت اس باغ کی حد میں قدم رکھا جہاں حضرت عمر پڑے سو رہے تھے قدم رکھتے ہی اسکے دل پر ہیبت و رعب نے غلبہ کیا کیونکہ جنگل میں ایک خدا کا شیر پڑا ہوا تھا اور قاعدہ ہے جہاں شیر پڑا ہوتا ہے اس جنگل میں قدم رکھتے ہی بڑے بڑے بہادروں کے دل کانپ جاتے ہیں۔ اب اس سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس شخص کے پاس نہ کوئی پہرہ چوکی ہے نہ جاہ و حشم ہے نہ ساز و سامان ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ صورت دیکھنے سے پہلے ہی میرا دل ہاتھوں سے نکل اجاتا ہے یہاں تک کہ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک خدا کا شیر جنگل میں تنہا پڑا سو رہا ہے نہ اسے کسی دشمن کا خوف ہے نہ جاسوس کا ڈر۔ سر کے نیچے ایک اینٹ نیچہ کی بجائے رکھی ہے نہ کوئی فرش ہے نہ بستر، بس گلے میں ایک تلوار پڑی ہوئی ہے اور بے فکر سو رہے ہیں۔ اس حالت کا مقتضایہ تھا کہ سفیر کے دل میں خلیفہ کی بے وقعتی ہوتی۔ مگر یہاں برعکس معاملہ یہ ہوا کہ صورت دیکھتے ہی سفیر دم لرزے لگا۔ جو ہنسی نظر پڑی ہے پیراٹھانے کی ہمت نہ رہی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت وہ سفیر اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ تو بڑے بڑے سلاطین کے دربار دیکھے ہیں جن کے دربار میں رعب و داب کے ہزار سامان ہوتے تھے۔ مگر مجھ پر کسی کا رعب طاری نہ ہوا۔ آج کیا بات ہے کہ اس بے سرد سامان شخص کے رعب سے میرا پتہ پانی ہوا جاتا ہے۔ آخر اس شخص کے اندر کیا چیز ہے کہ میری رگ رگ میں اس کے دیکھنے سے لرزہ پیدا ہو گیا؟ بیشک ہجہ

ہیبت حق است این از خلق نیست ہیبت آل مرد صاحب دلق نیست

یہ خدا تعالیٰ رعب و جلال تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرہ سے ظاہر ہوا تھا بالآخر سفیر روم کی ہمت نہ ہوئی کہ حضرت عمر کو خود جنگلات دہ تو اپنی جگہ پر دیر تک کھڑا کانپتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ہی بیدار ہوئے تو دیکھا کہ اجنبی آدمی کھڑا کانپ رہا ہے آپ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور تسلی دی، جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سفیروں کو مرعوب دیکھ کر فرمایا تھا کہ تم مجھ سے اتنا کیوں ڈرتے ہو میں تو اس غریب عورت کا بچہ ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی حضرت عمر کی باتیں سننے کے بعد ہیبت تبدیل بہ محبت ہو گئی۔ اور سفیر کو آگے بڑھنے اور بات چیت کرنے کی ہمت ہوئی جس کے بعد وہ سمجھ گیا کہ واقعی مذہب اسلام حق ہے۔ پھر وہ اسلام سے مشرف ہو گیا۔

یہ تو حضرت صحابہ کی حالت تھی۔ ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کو ان سے بات کرنا ہی ہمت نہ ہوتی تھی۔

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے رعب حضرت گنگوہی رضی اللہ عنہ کا دبدبہا ہیبت کی یہ شان تھی کہ بڑے بڑے ذواب مولانا سب بے تکلف باتیں نہ کر سکتے تھے۔ حضرت کا ان پر ایسا رعب پڑتا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے رکتے اور بھٹکتے اور ڈرتے تھے۔ اور خیر بعض بزرگوں سے تو لوگ اس لئے ڈرتے ہیں کہ وہ غصیا رہے ہوتے ہیں بات بات میں ان کو غصہ آجاتا ہے اسی لئے ان کے پاس جاتے ہوئے کانپتے ہیں۔ جیسے مولانا فضل الرحمن تھے۔ یا آجکل بھی ایک بدنام ہے ع

(ہائے ہزار نام خدا سے تو بدنامی تو) (جسٹ)

مگر مولانا گنگوہیؒ میں تو غصہ کا نام بھی نہ تھا۔ میں نے کبھی مولانا کو غصہ فرماتے ہوئے نہیں دیکھا، مگر اس پر بھی مولانا کا اتنا رعب محض ہیبت حق کا اثر تھا۔ اور یہ ہیبت بعض اوقات طالبین کے لئے مانع فیض ہو جاتی ہے اس لئے حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیائے کرام اپنے اصحاب کے گاہے مزاح کر لیتے ہیں تاکہ ان کا دل کھل جائے اور ہیبت و محبت کے مل جانے سے اعتدال پیدا ہو جائے۔

(الاسعاد والابعاد ض)

۴۲۔ اس شبہ کا جواب کہ تقدیر کس طرح بدل سکتی ہے

حضرت مجدد صاحب قدس سرہ کا واقعہ ہے کہ آپ کے زمانے میں ایک بزرگ صاحب سلسلہ تھے جن سے بہت فیض جاری تھا مگر حضرت صاحب کو ان کی بابت مشکوف ہوا کہ اس کا خاتمہ شفاعت پر ہوگا۔ پس حضرت مجدد صاحب دیکھ کر تڑپ ہی تو گئے۔ آپ کے دل کے گوارا نہ کیا کہ میرے رسول کی امت کا ایک شخص شفیق ہو کر مرے اور وہ شخص بھی کیسا جس سے ہزاروں کو دین کا فیض ہو رہا ہے۔ آپ نے اس لئے دعا کرنا چاہی۔ مگر ڈرے کہ اس میں حضرت حق کی مزاحمت نہ ہو کہ تقدیر مشکوف ہونے کے بعد اسکے خلاف کی دعا کرتا ہے مگر پھر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ یاد آیا کہ میں وہ شخص ہوں کہ حق تعالیٰ سے کہہ کر شفیق ہو سید کر سکتا ہوں۔ اس پر مجدد صاحب کی بھی ہمت ہوئی۔ معلوم ہو گیا کہ ایسی دعا کو ناخلاف ادب نہیں۔ چنانچہ پھر تو آپ نے اس کے لئے بہت دعائیں کیں اور بوری کو کشش کی کہ کسی طرح اس شخص کی شقاوت کو تبدیل بر سعادت کر دیا جائے۔ حتیٰ کہ آپ کو مشکوف ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے اس کو سید کر دیا تب آپ کو چین آیا۔

تو دیکھئے! مجدد صاحب نے اس شخص کے حق میں درپردہ کتنا بڑا احسان فرمایا۔ مگر اس شخص کو خبر بھی نہ تھی۔ اسے کچھ معلوم بھی نہ تھا کہ میرے واسطے کتنی شخص کے دل پر کیا گزر رہی ہے راتوں کی نیند اس کی اڑ گئی ہے۔

خبر واقعہ تو ہو گیا مگر اسپر شبہ ہوتا ہے کہ تقدیر کس طرح بدل گئی۔ جس کے متعلق ارشاد ہے مَا يَبْدِلُ الْقَوْلَ كَذَّبَتْ حضرت مجدد نے اس کا جواب بھی خود ہی دیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض امور کے متعلق لوح محفوظ میں اطلاق ہوتا ہے اور واقعہ میں وہ کسی قید کے ساتھ مقید ہوتے ہیں مگر وہ قید لوح محفوظ میں مذکور نہیں ہوتی بلکہ وہ علم الہی میں ہوتی ہے تو اس شخص کے متعلق لوح محفوظ میں تصرف اتنا ہی تھا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا مگر علم الہی میں اس کے ساتھ ایک قید بھی یعنی بشرطیکہ کوئی مقبول بندہ اس کے لئے دعا نہ کرے۔ سو یہ واقعہ تقدیر کے خلاف نہیں ہو کیونکہ اصل میں تقدیر علم الہی کا نام ہے۔ اسی لئے یہ حضرات ام الکتاب کی تفسیر علم الہی سے کرتے ہیں کیونکہ اس میں تغیر و تبدل کبھی نہیں ہو سکتا۔ پس دراصل ام الکتاب وہی ہے گو لوح محفوظ بھی کتاب المحو والاثبات کے اعتبار سے ام الکتاب ہے، کیونکہ لوح محفوظ

میں اتنا تغیر و تبدل نہیں ہوتا جتنا کتاب المحو والاثبات میں ہوتا ہے مگر فی الجملہ تغیر اس میں ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے اور جو تقدیر علم الہی کے درجے میں ہے اس میں اس کا اصل احتمال نہیں۔ پس حقیقت کے اعتبار سے ام الکتاب وہی ہے اور اس تفسیر کے اعتبار سے کلام نفسی کے درجے میں قرآن کے قدیم ہونے کی دلیل نص سے نکل سکتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَافِي فِي امِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا الْعَلَى حَكِيم۔ یعنی قرآن ہم سے غایت قرب کے درجہ میں علی حکیم ہے۔ یہ غایت قرب لدی کا مدلول ہے اور غایت ذات حق سے مرتبہ صفات کو ہے تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن مجید درجہ صفت میں علی ہے حکیم ہے اور قرآن جو درجہ صفت ہے وہی کلام نفسی ہے اور اس لئے اس کو علی حکیم کہا گیا اور علی حکیم کا اطلاق قرآن مجید کی کسی حادث پر نہیں آیا تو لدینا اور علی دونوں کو دلالت اسکے صفت ہونے اور قدیم ہونے پر ہوئی۔ اور اس سے قبل جو ارشاد ہوا ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا قُرْآنَ عَرَبِيًّا اِسْ مِیْن اِسْ کے فعل کا مفعول ہونا اور عربیہ کے ساتھ موصوف ہونا قرینہ ہے کہ اس سے کلام لفظی کا درجہ مراد ہے تو دونوں آیتوں میں دونوں درجہ کا بیان نہایت وضاحت سے ہو گیا۔

(الاسعاد والابعاد ص ۱۵)

۴۳۔ فلسفہ اور تعلیم انبیاء علیہم السلام میں فسق

ہمارا فلسفہ ایسا ہے کہ پڑھتے پڑھتے دماغ خراب کر لیا اور آخر تک نتیجہ کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ سوائے اس کے کہ اشریقین کی یہ رائے ہے۔ اور مشائیین کی یہ رائے ہے۔ معلوم نہیں کون غلط ہے اور کون صحیح ہے۔ اور ہمارے علم یہ ہے کہ ادل ہی دن ہم نے پڑھا کہ دھنویں اتنے فرض ہیں اور وضو کرنا شروع کر دیا۔ اسی وقت سے حاصل نکلنے لگا اور عمل پر ثواب کی امید ہوئی۔ اور تمہیں کیا ملا۔ کون سا ثواب مشائیین اور اشریقین کی رائے پر ملنے کی امید ہے۔ بس یہی فرق ہے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں اور حکما کی تعلیم میں فلسفہ تو آگے ہے منطق ہی میں دیکھئے کس قدر مباحثات اور مناظرات ہیں۔ ایک ذرا سی بات ہے وہ طے ہی نہیں ہوتی۔ خواہ مخواہ فضول جھگڑے بھر دیے۔ اور اس پر نازاں ہیں کہ ہمارے علوم بڑے دقیق ہیں دقیق و بیشک ہیں۔ مگر اس وقت کا حاصل کیا ہے؟ اگر کوئی بات شکل سے حاصل ہو لیکن یہ امید ہو کہ اس کو حاصل کر کے کوئی نتیجہ معتمد بہ حاصل ہوگا تب بھی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہاں حاصل کے نام صفر ہے۔ تمام عمر اس لوٹ پوٹ میں رہے کہ یہ ٹھیک ہے یا وہ ٹھیک ہے اور طے جب بھی نہ ہوا کہ کیا

ٹھیک ہے۔ اور اگر طے بھی ہو جائے کہ امر حق یہ ہے تب بھی اس کا حاصل کچھ نہیں صرف ایک بات کا علم ہو گیا۔ اس سے کام کون سا نکلا۔

دیکھئے معقول میں پہلے علم ہی کی بحث ہے اور اس میں اس قدر مناقشات ہیں کہ انکی

بحث ہے کہ علم کون سے مقولہ سے ہے یہ ذرا سی بات ہے مگر لوگوں نے اس میں کتابیں کی کتاسیں سیاہ کر دی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ مقولہ انفعال سے ہے اور کوئی کہتا ہے اضافت سے ہے، کوئی مقولہ کیفیت سے بتلاتا ہے۔ پھر سب طرف وہ جھٹیں اور دلیلیں پیش کی گئی ہیں کہ الہی توبہ، دماغ پریشان ہو جاتا ہے، اور نتیجہ اس بحث کا کچھ بھی نہیں۔ اگر تحقیق ہو گیا، اور امر واقعی معلوم ہو گیا کہ علم فلاں مقولہ سے ہے تو مزہ علم کا تو نہ بدلا۔ یعنی جو نتیجہ اس علم سے حاصل ہونے والا ہے وہ ہر حال میں ایک ہی ہے چاہے علم کسی مقولہ سے ہو۔ اور اگر تحقیق نہ ہو اور امر حق معلوم نہ ہو تب بھی مژہ نہ بدلا یعنی جو

نتیجہ اس علم سے ہونے والا ہے وہ اب بھی مرتب ہوگا بہت ظاہر بات ہے کہ ہم پلاؤ کھا دیں یا کوئی بھون کھا دیں تو اس کی لذت یا منفعت علم ترکیب پر موقوف نہیں اس ترکیب کا ہم کو علم ہو یا نہ ہو منفعت پھر بھی حاصل ہوگی۔ لوگ ساری ساری عمر پلاؤ کھاتے ہیں باورچی پکاتا ہے اور کھاتے ہیں اس کی لذت اور منفعت جو اس پر مرتب ہے برابر حاصل ہوتی ہے حالانکہ ترکیب کسی کو نہیں آتی بلکہ واقعہ توبہ ہے کہ جس کو ترکیب آتی ہے یعنی باورچی وہ پلاؤ کے نتیجے سے اکثر محروم رہتا ہے کیونکہ اسے پلاؤ کھانیکو نہیں ملتا۔ نتیجہ صاحب خانہ کو حاصل ہوتا ہے اور پکاتا دہے جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ علم باورچی ہے اور مژہ علم کا صاحب خانہ کو حاصل ہے عالم صاحب مژہ سے محروم ہیں۔ اب فرمائیے کہ علم اچھا، یا شرہ؟ یہی حال علوم حکماء کا اور علوم شرعی کا ہے کہ ان کے پاس صرف علوم ہی میں اور انہوں نے ان کو مہنتائے نظر قرار دے رکھا ہے اور مژہ حاصل ہے۔ شرعیات جانتے والوں کو انبیاء علیہم السلام نے تو غذا کی پکائی دی ہے اور حکماء نے پکانا سکھایا ہے مگر انہوں نے جس چیز کا پکانا سکھا ہے وہ کھانے کی ہے بھی نہیں محض سو نگھنے کی ہے۔ دن بھر تو سر مارا جب چیز تیار ہوتی تو معلوم ہوا کہ یہ تو کھانے کی نہیں ہے۔ سہ

ح "چوں دم برداشتم مادہ بر آمد"

اور یہ میں بالکل غلط نہیں کہتا ہوں کہ ان کی بتلائی ہوئی چیز کھانے کی نہیں ہے بلکہ یہ بالکل سچ بات ہے جن باتوں کو انہوں نے تمام عمر سر مار کے طے کیا وہ اخیر میں غلط ثابت ہوئیں۔

تخلیم انبیاء کرام اب دیکھ لیجئے کہ وہ کار آمد ہیں یا نہیں۔ جب غلط ہیں تو کار آمد کیسی؟ توبہ بات صحیح ہوئی کہ جوچہ انہوں نے پکائی تھی وہ کھانے کی بھی نہ نکلی۔ خلاصہ یہ کہ تعلیم انبیاء علیہم السلام کی سہل ہوتی ہے کیونکہ وہ فصول باتوں میں ڈالنا نہیں چاہتے، کام میں لگانا چاہتے ہیں، ان کو خلق خدا پر غایت درجہ کی شفقت ہوتی ہے اور اپنی بڑائی جتنا منظور نہیں ہوتی بتا تو سہولت تعلیم انبیاء کی یہ ہے معنی شفقت۔ لیکن نتیجہ اس سہولت کا یہ ہوا کہ عام فہم ہونے کی وجہ سے لوگوں نے اس تعلیم ہی کو سرسری سمجھ لیا ہے یہ بڑی نادانی ہے۔ (الباطن صہ)

۴۴۔ نو تعلیم یافتہ کو ظاہری اصلاح کے ساتھ باطن کی

صفائی بھی ضروری ہے

آج کل دین کی طرف سے ایسی لاپرواہی ہے کہ خود تو دین کیا حاصل کرتے۔ اٹھان لوگوں پر ہستے ہیں جو دین کا نام بیٹے ہیں اور کس قدر دین سے بعد کی دلیل ہے۔ اور اگر کسی خیال دین کی طرف ہے بھی تو ظاہری اصلاح کا نام دین رکھ لیتا ہے۔ نفلیں ذرا زیادہ پڑھ لیں۔ وضع قطع مسلمانوں کی سی بنائی۔ بس اس کا نام دین ہے ان کی نظر بھی اس سے آگے نہیں بڑھتی۔ جب اس سے آگے نظر ہی نہیں پہنچتی تو ان امراض کا علاج اور اصلاح کیسے ہو جو ظاہر کے علاوہ ہیں اور خطرناک بھی ہیں تو اس خفائی وجہ سے ان میں اور دشواری پیدا ہوگئی تو اب سمجھئے کہ یہ امر کس قدر قابل توجہ ہوئے پس اس حدیث قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لا یستجیب الدعاء عن قلب میں انکی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان تمام امراض کی ایک اصل اور جڑ بیان کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ کس قدر قیمتی بات بیان فرمائی گئی ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ دین کے درجہ ہیں۔ ظاہری، باطنی۔ اب توبہ حالت ہے کہ باطن کے نام سے بھی لوگ آشننا نہیں رہے۔ باطن کی جگہ بطن لے لیا ہے۔ بس پیٹ بھر لیا جائے جس طرح بھی ہو۔ حلال سے ہو یا حرام سے دھوکہ سے ہو یا انشرف نفس کے ساتھ ہو، بلا طبع خاطر ہو یا حیر سے ہو۔ جس طرح سے بھی مل جائے لقمہ حاصل کر لیا جاوے ہاں بیشک ظاہر کو بعض

نے درخواست کر لیا ہے اور بس۔

اور اس میں بھی دو فرق ہیں۔ ایک تسلیم یافتہ، اور ایک عوام، عوام تو اس بارے میں اقرار ہی مجرم ہیں خود اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ جی ہمارا کیا دین، الٹی سیدھی ٹکڑیاں مار لیتے ہیں۔ دل دنیا میں لگا ہوا ہے کسی وقت خدا کی یاد دل میں آتی ہی نہیں۔ خیر یہ بیچارے اقرار تو کرتے ہیں اپنے قصور کا۔

دوسرا گروہ جو تعلیم یافتہ ہے ان پر زیادہ افسوس ہے کہ اپنے قصور کے بھی مقرر نہیں۔ انکو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ دین کا کوئی باطنی جز بھی ہے۔ عوام کو اتنا خیال تو ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ دین رکھتے ہیں وہ محض ظاہری ہے اور باطن سے ہم محروم ہیں۔ اور تسلیم یافتہ لوگ محروم ہونے کا نام بھی اپنے اوپر آنے نہیں دیتے کیونکہ شان میں فرق آجائے گا انہوں نے باطنی جز کو دین سے اڑا ہی دیا۔ بس ظاہر پر کفایت کر لی اور اس پر ناز کر بیٹھے اور سمجھ گئے کہ ہم پورے دیندار ہیں۔ اور پھر ظاہر میں سے بھی چھانٹ لیا ہے بعض اجزاء کو، گویا دین میں سے انتخاب در انتخاب کیا ہے اور اپنے نزدیک ضروری اجزاء نکال دیتے ہیں۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ دوسرے اجزاء کو خود باطنی فضول اور زائد ہیں اور وہ انتخاب کن اجزاء کا کیا ہے جن میں سہولت ہے یا جھکی عادت ہو گئی ہے جیسے نام مسلمانوں کا سار رکھ لینا۔ صورت مسلمانوں کی سی بنالینا۔ بس انہیں اجزاء کا نام دین سمجھ لیا ہے۔

حین کے اجزاء | صاحبو! دین کے اجزاء تو ہیں عقائد، اعمال، معاشرت، معاملات، اخلاق۔ ان سب کی تکمیل سے دین کی تکمیل ہوتی ہے اب یہ حالت ہے کہ ان اجزاء میں سے بعضوں کا تو نام سن کر بھی چونکتے ہیں۔ اور تعجب کرتے ہیں۔ بعض وقت زبان سے بھی کہتے ہیں کہ ان کو دین سے کیا تعلق۔ معاشرت بھی دین سکھانے کی چیزیں ہیں۔ یہ تو آپس کے برتاؤ ہیں جو ملنے جلنے سے آدمی خود سیکھ جاتا ہے۔ اس میں بھی ولولوں نے پابندیاں لگا دی ہیں۔ علیٰ ہذا معاملات میں بھی ایسی باتیں کہی جاتی ہیں۔

غرض بعض اجزاء کو دین کا جز دہی نہیں سمجھا جاتا۔ برے اعمال دیانات تک رہ گئے ہیں اور وہ اعمال بھی سب نہیں۔ ان میں سے بھی وہی لئے ہیں جن کی ایک رسم جلی آتی ہے اور جن کی بچپن سے عادت پڑ گئی ہے۔ چنانچہ بڑی دیانتداری ہے کہ غازی پڑھ لی، ڈاڑھی رکھ لی، شرعی پاجامہ پہن لیا، گوشت کھالیا۔ صورت، شکل، وضع مسلمانوں کی سی بنالی، یہ ان لوگوں کا انتہائی کمال ہے جو اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں۔ اور جو اپنے آپ دیندار بھی نہیں کہتے ان کا تو

یہاں ذکر ہی نہیں۔

غرض دین کے اجزاء میں ایسا انتخاب کیا ہے کہ اب خلاصہ کا بھی گویا جو ہر نکل آیا اور دین نامہ کیا گنتی کے صرف چند اعمال کا اور وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کہ ظاہر کے چند شعبوں کو درست کر لیا۔ غرض اس انتخاب میں بھی جو راہ دہ ظاہری رہ گیا اسکے سوار دوسری چیز یعنی باطن کا نام بھی نہیں آتا۔ بس اس ناقام ظاہر کو بنا کر خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں۔ اس بیان ظاہر کو بگاڑنے والے خوش نہ ہوں کہ ہم تو دیکھنے باطن پرست ہیں۔ مسلمانوں میں اس خیال کے لوگ بھی بہت ہیں جو سمجھتے ہیں باطن کا درست ہونا کافی ہے ظاہر کے درست کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ان کے نزدیک ظاہر کا درست کرنا باطن کے درست کرنے میں مخل ہے۔ لہذا ظاہر کو ایسا بگاڑتے ہیں کہ یہ بھی نہیں پہچان سکتا کہ یہ بھی مسلمان ہیں۔ وضع قطع بھی مسلمانوں کی سی نہیں رکھتے بلکہ نماز بھی نہیں پڑھتے۔ یوں کہتے ہیں کہ کسی کے سامنے نماز پڑھیں گے تو وہ ہمارا معتقد ہو جائے گا۔ اس سے ہمارے نفس کو خوشی ہوگی تو یہ نفس پروری ہوئی۔ اس قسم کی بہت سی خرافات میں سمجھوتہ کرنے کے لئے گھڑی ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے پھر ظاہر کی کیا ضرورت ہے۔ میرے ظاہر آرائی کی مذمت سے احتمال تھا کہ یہ لوگ خوش ہوتے۔ اس لئے کہتا ہوں کہ ان کو خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میں ظاہر کی درستی کی مذمت نہیں کرتا بلکہ اس پر کٹنا کرنے کی مذمت کرتا ہوں تاکہ وہ اصلاح باطن کی فکر کریں۔ محض اصلاح ظاہر پر قناعت نہ کریں باقی ظاہر کی درستی بھی فرض ہے اس لئے کسی کو یہ گنجائش نہیں کہ اصلاح ظاہر کو ترک کر دے گو با فرض باطن بھی درست ہو۔ اور ان بد دینوں کا تو باطن بھی درست نہیں بلکہ انہوں نے باطن اور ظاہر دونوں کو بگاڑ رکھا ہے، ظاہر کو بگاڑا ہی ہے باطن کو بھی بگاڑا ہے اور یہ اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ ظاہر تو درست ہوتا ایک ہی فرض ادا ہوتا اگر ان لوگوں کی طرف سے کہا جاوے کہ ہم اس کو نہیں مانتے کہ

باطن کی اصلاح

ہمارا باطن بگڑا ہوا ہے، باطن ہمارا بالکل اچھا ہے ہم نے ظاہر کو باطن ہی کے درست کرنے کے لئے بگاڑا ہے اس سے باطن ہمارا بالکل اچھا ہے۔ پھر یہ کہنا کہاں صحیح ہوا کہ انہوں نے باطن اور ظاہر دونوں کو بگاڑ رکھا ہے۔ میں بطور الزامی جواب کے کہتا ہوں کہ ایک شخص بادشاہ سے باغی ہے اور ہر حکم مخالفت کرتا ہے اور کسی بات میں اطاعت نہیں کرتا لیکن جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو کیوں کرتا ہے تو کہتا ہے کہ وہ میں دل سے بادشاہ کا برا خیر خواہ ہوں یہ جو کچھ مخالفت میں نے کر رکھی ہے صرف بغضب سے نہ کہنے کے لئے کر رکھی ہے تاکہ

میرے خلوص میں فرق نہ آوے۔ بتائیے آپ اس کو کیا کہیں گے۔ یہ کہیں جھوٹا بدعاش غلط کہتا ہے فرمائیے اس کی کیا وجہ ہے۔ جب ایک شخص اپنے ذمہ سے کہہ رہا ہے کہ میں دل سے مطیع ہوں اور خیر خواہ ہوں تو آپ اس کو جھوٹا کیوں کہتے ہیں اور اس کو باطنی کیوں سمجھتے ہو۔

اب میں تحقیقی جواب کے طور پر کہتا ہوں کہ اس کی وجہ سوا اسکے کیا ہے کہ ظاہر عنوان ہوتا ہے باطن کا۔ جب افعال افعال اسے مخالف نہ ہیں تو اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ باطل اس کا موافق اور مطیع ہے اور یہی کہا جائے گا کہ وہ واقع میں بھی مخالف اور باطنی ہے۔ اسی طرح سمجھ لیجئے کہ جب ایک شخص کا ظاہر خراب ہے تو یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ اس کا باطن درست ہو اور ظاہر میں اس کا اثر نہ پیدا ہو۔ سمجھ لیجئے کہ یہ ناممکن ہے کہ قلب میں کسی کی اطاعت ہو اور بدن اضطرار کے ظاہر اس کا مخالف ہو۔

یہ تقریر تو بطور جملہ معترضہ کے درمیان میں آگئی۔ اصل بیان یہ تھا کہ آجکل بہت سے دیندار ایسے ہیں جنہوں نے صرف چند اعمال کی درستی کو دین سمجھ رکھا ہے۔ پھر اعمال سے مراد اعمال ظاہری لئے گئے ہیں وہ بھی بہت نہیں بلکہ معدودے چند، جیسے ڈاڑھی بڑھانی نماز پڑھ لی۔ وضع قطع درست کر لی اور سمجھ لیا کہ ہم پورے دیندار ہو گئے۔

اس تقریر سے چونکہ یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ظاہر کو بہت ناچکھ اچھی چیز نہیں اور اس سے وہ لوگ خوش ہوتے جو ظاہر کو بگاڑتے ہیں۔ اس لئے انکی غلطی کو تیسرے میں دفع کر دیا گیا۔ باقی اصل خطاب انہیں لوگوں کو ہے جو صرف ظاہر کے بنانے کو دین سمجھتے ہیں۔ اور جن کو اپنے مرض کی خبر نہیں۔ اور وہ مرض ہے بھی ایسا جس کی خبر ہونا دشوار بھی ہے اور جب خبر ہونا دشوار ہے تو اس کی اصلاح بھی دشوار ہے۔ خبر کے دشوار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ظاہر کا بگاڑ تو محسوس ہوتا ہے لہذا خبر بھی آسانی سے ہوگی اور اصلاح بھی اس کی آسان۔ ذرا توجہ اور ارادہ کی ضرورت ہے بخلاف مرض باطن کے کہ اس کے مریض کو اس کی اطلاع تک بھی نہیں ہوتی پھر اصلاح کیسے ہو اور جب اس مرض کی مریض کو بھی خبر نہیں ہوتی تو دوسروں کو تو کیسے خبر ہوتی۔ کیونکہ وہ دوسروں کو نظر تو نہیں آتا۔ اور بدگمانی کی کسی کو تو اجازت تو اس حالت میں دوسرا اس مرض کو سمجھے تو کیسے سمجھے۔ لہذا یہ مرض نہایت دشوار ہوا۔ پس مریض خود علاج کرے تو کیسے کرے اور دوسرا آدمی علاج کرے تو کیسے کرے کیونکہ اطلاع مفقود اور وہی شرط علاج اور اگر کسی مریض کو اپنے اس مرض کی اطلاع ہوتی بھی ہے تو اس کے ساتھ ایک مرض اور بھی لگا ہوا ہے توجہ اور تاویل کا کہ اس کو کھینچ کھپا کر مرض کی مد سے نکال لیں گے اور ناجائز کو

جائز بنائیں گے حالانکہ اگر ذرا بھی دین کا احساس قلب میں ہے تو اس تاویل سے ہرگز بشارت نہیں ہوگی۔ بلکہ قلب میں اسی کا اقرار رہے گا کہ یہ گناہ ہے پھر جب خود ہی کو گناہ ہو نیک علم ہے تو اللہ تعالیٰ کو کیسے علم نہ ہوگا تو پھر اس توجہ اور تاویل سے کیا کام چلا، خدا کے سامنے تو گنہ گار ہی رہے ظاہر بنیوں کی نظر میں سرخ رو ہو گئے تو کیا سہ

کہ گئے اللہ دروغی می زنی
خلق را گیرم کہ بغیر می تمام
از بڑے مسکہ دوغی می زنی
کار با با خلق آری جملہ راست
در غلط اندازی تا ہم خاص و عام
کار با اور است باید داشتن
راست اخلاص و صدق افزاشتن
ظاہر کے بنانے سے دنیا تو دھوکہ میں اس واسطے آگئی کہ ان کی نظر صرف ظاہر تک ہے مگر باطن کو بگاڑ کر دھوکہ کیسے دے سکتے ہیں جبکہ ان کی نظر باطن تک بھی پہنچتی ہے۔ دنیا کی نظروں کے سامنے تاویلیں کر کے سرخ رو ہو گئے تو کیا ہوا، تاویل سے اصل واقعہ مٹھوڑا ہی بدل جاتا ہے۔ حق تعالیٰ کو تو اصل واقعہ کا علم ہے۔

اور تاویل میں ایک بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس چیز کی برائی پر پردہ پڑھاتا ہے۔ اصل گناہ تو مرض تھا ہی، یہ تاویل کا مرض اس سے بھی سخت ہے کیونکہ یہ نہ ہو تو گناہ ایسی چیز ہے کہ اس سے طبائع سلیمہ نفرت ہی کرتی ہیں تو امید ہو سکتی ہے کہ کبھی اس سے تنبہ ضرور ہو جائے گا اور جب تاویل درمیان میں آگئی تو گناہ کی برائی پر پردہ پڑ گیا اب تنبہ ہو تو کیونکر ہو۔ اس حالت میں دوسرا آدمی تو اس وجہ سے تنبہ نہیں کر سکتا کہ وہ ظاہر کو درست پاتا ہے کوئی برائی اسکی نظر میں نہیں آتی اور خود تنبہ اس واسطے نہیں رہا کہ مرض پر تاویل کا پردہ پڑ گیا۔ تنبہ اور تنبہ سب اڑ گئے اب اصلاح کی کیا امید ہو۔ دیکھئے کس قدر گواہی ہے باطن کی اصلاح میں۔

بعض وقت یہ ظاہر کو بنانے والے ایک اور طرح فیصلہ کرتے ہیں کہ اسمیں تاویل کی ضرورت نہیں۔ اور نفس کا مطلب حاصل رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے عیوب کو بھی جانتے ہیں اور ان میں کچھ تاویل بھی نہیں کرتے۔ اسلئے اس بات کو مانتے ہیں کہ ہمارے اندر یہ عیب ہیں لیکن ساتھ ساتھ اپنے کمالات کو بھی یاد کرتے ہیں کہ فلاں فلاں کمال بھی تو ہم میں موجود ہیں۔ علم ہے عمل ہے۔ نماز ہے۔ روزہ ہے۔ جب اتنے کمال موجود ہیں تو وہ عیوب بھی صحیح، فیصلہ غلبہ

سے ہوتا ہے اور بھلائی زیادہ ہے اور برائی کم تو بھلائی ہی حکم ہوگا۔ اس صورت میں کسی تاویل کی ضرورت بھی نہیں رہی اور اچھے بن گئے اور سب بات قاعدہ کے اندر رہی، یہ فیصلہ ذہن کا سب سے بڑا کمال رہا اس سے بات بھی دہی کی دہی رہی اور دل کو اچھی طرح سمجھالیا کہ ہم اچھے ہیں یا سیسی مدلل فقیر ہے کہ اس کا جواب دینا بھی مشکل ہے۔

اے صاحبو! دل کو سمجھانا جب کافی ہے کہ ہمارا دل قیامت کے روز فیصلہ کنندہ قرار پاوے مگر قیامت میں تو فیصلہ دوسرے کے ساتھ میں ہوگا۔ اور وہ حقائق کے موافق فیصلہ کرے گا اور اس روز دل کو سمجھالینے سے کچھ کام نہ چلے گا اور حقائق کے ظہور کے وقت ممکن ہے کہ آپ کا غالب تو مغلوب ہو اور مغلوب غالب ہو۔

دوسرے میں کہتا ہوں کہ آدمی کو ضرورت تو اصلاح کی ہے اور عیبوں کے دور کرنے کی جو اس کے اندر ہے۔

تو کیا اس دل کو سمجھالینے سے ان عیبوں کی اصلاح ہوگی؟ ہرگز نہیں بلکہ جیسے تاویل سے ان عیبوں پر پردہ پڑ گیا تھا اسی طرح اس فیصلے سے بھی پردہ پڑ گیا، تاویل بھی ایک مرض تھا یہ بھی ایک مرض ہے۔ وہ ایک قسم کا پردہ وہ دوسری قسم کا پردہ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ بھی ایک قسم کی تاویل ہے۔ اس میں اور اس میں اتنا فرق ہے کہ اس میں تاویل کا حاصل یہ تھا کہ گناہ کو گناہ تسلیم نہ کیا تھا اس وجہ سے نفس پر دھبہ نہ آیا۔ اس تاویل میں اس سے بھی بڑھ کر کمال ہے کہ گناہ کو گناہ رکھا اور نفس پر دھبہ اب بھی نہ آیا۔ خیال کیجئے کہ یہ کس قدر گہری تاویل ہے بہر حال اتنی لمبی تقریر سے یہ بات ذہن میں آگئی ہوگی۔

باطنی بیماری کا علاج

اتنے موانع موجود ہیں۔ اور پردوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، جب اس کی اطلاع دشوار ہے تو ظاہر ہے کہ علاج بھی دشوار ہے کیونکہ مرض کا علاج تو جب ہی ہو سکتا ہے جب مرض کی خبر ہو، اور جب خبر ہی نہیں تو علاج کیسا۔ اس دشواری کو دیکھ کر بعض لوگوں نے ہمت ہار دی کہ کون علاج کرے اگر ہمارے اندر امراض ہیں تو بلا سے۔ اللہ میاں بڑے کریم ہیں ہم گنہ گار ہی اللہ میاں معاف کر نیوالے ہیں۔ پھر کیوں مصیبت میں پڑے کہ اصلاح کرنے والے کو تلاش کرو۔ اس کے مخربے اٹھاؤ ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں رہو۔ اچھی خاصی مصیبت ہے جب اللہ میاں جیم کریم ہیں تو کیا ضرورت ہے اس مصیبت کو اٹھانے کی، وہ اپنی رحمت سے خود

ہی سب کام بنادیں گے۔

یہ ان لوگوں کے خیالات ہیں جو دیندار بننا چاہتے ہیں۔ اور کوئی کام خلاف شرع کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے ذہن میں نماز کی بھی ضرورت ہے، روزے کی بھی ضرورت ہے، ڈاڑھی کی بھی ضرورت ہے۔ مگر قلب کی طرف کبھی ان کو توجہ نہیں ہوتی کہ اس کے بھی کسی مرض کے اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں۔

پس سن لیجئے کہ قلب میں بھی کچھ امراض ہیں اور ان کے دور کرنے کی بھی دیسی ہی ضرورت ہے جیسے ظاہر کے سنوارنے کی ضرورت ہے جیسا کہ میں نے طویل تقریر سے ثابت کر دیا۔
(جہا طری ص ۲۳ تا ۳۱)

۴۵۔ ظاہر و باطن دونوں کی صلاح

ضروری ہے۔

ان نے تعلیم یافتہ اصحاب کے خیالات بھی سنے ہیں۔ انہوں نے دین کا خلاصہ ایک نئے طریقے سے کیا ہے۔ یہ دعویٰ تو ان میں اور فقرا میں دونوں میں مشترک ہے کہ دین کا ایک طرف ہے اور ایک باطن۔ اور مقصود اعظم باطن ہے۔ ظاہر کی چندان ضرورت نہیں اور آگے اس بات میں دونوں متماثل ہیں کہ وہ باطن کیا ہے کہ فقرائے تو مہر عمل کا باطن الگ نکالا ہے۔ نماز کا الگ روزہ کا الگ اور حج و زکوٰۃ کا الگ جیسا کہ بیان کیا گیا۔ اور ان کے بارے میں اس سے بھی زیادہ اختصار کیا ہے۔ گویا اس کی صنعت بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ انہوں نے سنت کا بھی ست نکالا۔ یہ مولویوں اور فقرا کو سب کو فضول سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کل دین کا خلاصہ ایک ہی چکر کو نکالی ہے وہ کیا ہے؟ تہذیب، اخلاق، بس تمام اعمال تو دین کے لئے ظاہر ہیں اور باطن دین کا اور حقیقت اس کی تہذیب، اخلاق ہے۔ اور کھلے الفاظ میں کہتے ہیں کہ اٹھک بیٹھک اور مال کا خرچ کرنا اور پیٹ کاٹنا جس جس عمل کو عبادت کہا جاتا ہے وہ سب بانی اسلام **عَلَّیٰ لَکُمْ** نے صرف اس واسطے تجویز فرمائی تھیں کہ تہذیب اخلاق حاصل ہو بلکہ عرب و قسٹی ملک تھا اور وہاں بہیمیت بہت زیادہ تھی ان کی

اصلاح بلا اس سخت گیری کے ہو نہیں سکتی تھی اس واسطے یہ احکام تجویز کئے گئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ریفارمر تھے۔ انکی اصلاح کے لئے اسی صحیح تدبیریں تجویز فرمائیں کہ ان سے بہتر ہوئی نہیں سکتی تھیں اور ہنگو وہ بات بدون نماز روزہ کے حاصل ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اصلی تھا یعنی تہذیب اخلاق۔ کیونکہ ہم تعلیم یافتہ ہیں اور بہمیت عرب کی سی ہم میں نہیں ہے تو واسطے اس سخت گیری کی کیا ضرورت ہے اور یہ بڑی نادانی ہے کہ تشکلم کی اصل غرض کو نہ سمجھا جاوے اور صرف الفاظ پر رہا جاوے۔ جیسا کہ خشک مولوی کر رہے ہیں۔ کیوں صاحب کیا دلیل ہے اس بات کی کہ تمام احکام سے مقصود اصلی خطرہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صرف تہذیب اخلاق ہے۔ کوئی دلیل اس پر ہونی چاہیے۔ اور میں دور کی بات کہے دیتا ہوں کہ اول تو دلائل عقلیہ سے اس کا احتمال بھی منعنی ہے لیکن بغرض حال اگر اس کا احتمال بھی ہو کہ شاید یہی مقصود ہو تو صرف احتمال پر اس دعوے کی بناء ہوئی دلیل پر تو بنا رہے ہوئی تو کیوں صاحب ایک دین ہی آپ کے نزدیک ایک ایسی چیز ہے کہ جس میں اپنے مطلب کے لئے احتمال ہی پر بنا کر کے اس سے تسلی کر لی جاتی ہے کبھی دنیا کے کبھی کسی کام کی بناء آپ کوئی عقل مند صرف احتمال پر کیا کرتا ہے۔ مثلاً ایک بہت بڑا مہاجن ہو۔ جس کے یہاں بہت دولت ہو وہ مر جاوے تو آپ اسکے یہاں جا کر کہیں کہ اسمیں سے مجھے بھی حصہ ملنا چاہیے کیونکہ میں اس کا بیٹا ہوں اور کوئی کہے تم یہ دیکھو تو جواب دیجئے کہ احتمال تو ہے کہ میں اس کا بیٹا ہوں اور جب میں دعوی کرتا ہوں کہ میں بیٹا ہوں، لہذا میراث ملنی چاہیے۔ کیوں صاحبو! کیا یہ بات چل جاوے گی اور کیا اس کو سن کر کوئی پاگل نہ کہے گا؟ یا مثلاً جو آپ کا بیٹا ہے اس کو آپ میراث سے محروم کرنا چاہتے ہیں اس طرح کہ گو اس کا بیٹا کہا جاتا ہے مگر احتمال تو ہے کہ بیٹا نہ ہو لہذا اسی شق کو ترجیح دی جاتی ہے کہ بیٹا نہیں ہے اور میراث سے محروم ہونا چاہیے تو کیا یہ بات مان لی جاوے گی؟

حین سے بے رغبتی

صاحبو! تعجب ہے کہ دنیا کے تو کسی معمولی کام کی بناء بھی احتمال میں نہیں کرتے اور دین کے بڑے بڑے کاموں میں جرات کرتے ہیں۔ اور تغیر کر دالتے ہیں۔ دنیا میں تو یہ حالت ہے کہ احتمال کے موقع پر ہمیشہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی دوا میں شک ہو جائے کہ یہ دوا افلائی ہے یا کوئی تیزاب ہے تو اس کو کوئی بھی نہیں لے گا۔ بلکہ اسی کو پسند کریں گے کہ اس کو تلف نہ کر دیا جائے گو کتنی ہی لاگت اس میں ضائع ہوتی ہو اور اس کو مکان میں رکھنا گوارا نہ کریں گے

اسی احتمال کی وجہ سے کہ کوئی پی نہ جاوے اور نقصان ہو جائے۔ یا اللہ! دین ہی کیا ایسی سستی اور بیکار چیز ہے کہ اسے بالکل سر پر سے اڑا دینے کے لئے صرف احتمال کافی ہے۔ تمام ارکان دین بدل ڈالا صرف اس احتمال پر کہ شاید مقصود ان سب سے تہذیب اخلاق ہو اور لطف یہ ہے کہ یہ احتمال بھی مرجوح بلکہ غلط اور اپنا تراشا ہو اور زبردستی کا احتمال ہے کیونکہ احتمال تو وہاں ہو سکتا ہے جہاں تشکلم کی طرف سے کوئی بیان نہ ہو۔ یہاں تو صاحب شرع کی طرف سے صاف صاف بیان موجود ہیں۔ ہر ہر عبادت کی کیفیت اور اس کے کرنے کی ضرورت اور اس پر ثواب اور ترک پر وعیدیں بیان فرماتی ہیں۔ پھر یہ احتمال بھی کہاں رہا کہ شاید مقصود تہذیب اخلاق ہی ہو، یہ تو کھلی ہوئی توجیہ القول بالایضیٰ بتائم ہے اور یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے ایک نوکر سے کہیں کہ انکو رے آؤ اور وہ آٹلے آوے اور کہے کہ مقصود تو کھانے سے تغذیہ بدن ہوتا ہے اور وہ انکو میں اتنا نہیں ہے جتنا آٹے میں ہے۔ کیا یہ حرکت اسکی نافرمانی نہیں ہے۔ حالانکہ وہ ایک معقول دہ بیان کرتا ہے مگر جواب میں اس کے یہی کہا جاوے گا کہ تو اپنی طرف سے غرض اور مقصود کو تراشنے والا کون ہے۔ کیا دلیل ہے اس بات کی کہ اس وقت ہم کو مقصود تغذیہ بدن ہے ممکن ہے کہ تفکہ مقصود ہو جس کے لئے انکو موضوع ہے نہ آٹا خصوصاً جب یہ صورت ہو کہ تغذیہ مقصود نہیں۔ مثلاً کھانے کا وقت نہ ہو یا ابھی کھانا کھا چکے ہوں یا گھر میں کوئی بیمار موجود ہو جس کو طبیعت نے انکو کھانے کے لئے کہا ہو تو اس کا آٹلے آنا اور زیادہ سخت بیوقوفی اور بدتمیزی۔ بلکہ گستاخی اور لعنت سمجھا جاوے گا۔ حالانکہ اس قرینے کے ہوتے ہوئے وہ احتمال باقی ضرور رہتا ہے۔ لیکن ایسے نوکر کو کان پھڑ کر نکال دیا جاوے گا۔

بس یہی قصہ دین کا سمجھو کہ جب دین میں قرآن اس بات کے موجود ہیں کہ خود اعمال بھی مقصود ہیں تو اپنی طرف سے ایک احتمال نکال کر ان کو بدن کا کیسے جائز ہوگا۔ اور یہ قرآن اگر معمولی بھی ہوتے تب بھی اس اختراع کی گنجائش نہ ہوتی ہے کہ تصریحات قوی موجود ہیں اس وقت میں تو اس اختراع کی مثال بالکل یہ ہوگی کہ نوکر سے کہیں انکو رے آ، اور جواب میں کہے۔ جی ہاں میں سمجھ گیا۔ آپ کا یہ مطلب ہے کہ انکو رانا بلکہ آٹلا لا۔

دین کی اہمیت

اے اللہ! عقلیں کہاں چلی گئیں یا عقل اس واسطے ہے کہ دنیا کے کام بنائے جائیں۔ اور دین کا نام آتے ہی اس کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور دین کے کاموں کو جان کر بگاڑا جاوے دنیا کے کاموں میں تو ذرا سا احتمال جو غیر ناسی عن دلیل بھی ہو پیدا ہو جاوے تو احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاوے۔ اور دین کے

کاموں میں ایک غلط احتمال اپنی طرف سے تراش کر اس پر عمل کر لیا جاوے اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ دین کو صرف ایک عزم مزدوری چہرہ سمجھا ہے جس کا مقتضایہ ہے کہ یوں کر لیا تو کیا اور یوں کر لیا تو کیا۔ اگر ذرا بھی وقعت دین کی قلب میں نہ ہوتی اور اس کی کچھ بھی ضرورت سمجھی جاتی اور درجہ موم میں بھی یہ بات ہوتی کہ قیامت آنے والی ہے اور باز پرس ہوگی اور وہاں ایسی ایسی ہولناکت تکلیفیں اور عذاب ہیں تو ادا دل تو یہ احتمال پیدا ہی نہ ہوتا اور پیدا بھی ہوتا تو پہلو احتیاط ہی کا اختیار کیا جاتا اور یوں کرتے کہ اگرچہ ممکن ہے کہ اعمال کا یہ خاص باطن (یعنی تہذیب الاخلاق) مقصود ہو (گویہ ان کا خود تراشیدہ ہے) مگر بہتر یہی ہے کہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاوے اور ظاہر کبھی ترک نہ کیا جاوے۔ کیونکہ اگر وہ احتمال غلط نکلا تو قیامت میں کیا جواب ہوگا (دیکھئے مال گذاری داخل کرنے کو تحصیل میں جاتے ہیں اور فرض کیجئے کہ بیس روپے مال گذاری کے داخل کرنے میں لیکن اگر شک پڑ گیا کہ کچھ اندہ پائی۔ اس رقم کے اوپر اور بھی ہیں تو اس صورت پر جب میں بیس روپے ہی ڈال کر چلیں گے اس خیال سے کہ کچھ تو کسر مال گذاری میں ہے جس کی مقدار معلوم نہیں شاید کوئی روپیہ کھوٹا بتا دیا جائے اور ان کی کوئی پچاس کا دینا پڑے تو احتیاط یہی ہے کہ پانچ روپے زائد لے چلیں۔ اگر خیر نہ ہوئے تو واپس آجا دیں گے۔ اور اگر نہ لے چلے اور وہاں کی پڑائی تو ذرا سی بات کے لئے اُردو پر بن جاوے گی۔ ایسے موقعوں پر دنیا میں یہ قوت سے یہ قوت بھی احتیاط ہی کا پہلو اختیار کرتا ہے پھر تعجب ہے کہ دین میں وہ لوگ جو اہل عقل ہونے کے اور تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کے مدعی ہیں احتیاط کا پہلو اختیار نہیں کرتے بلکہ ایک من گھڑت احتمال پر طبعی حکم کر دیتے ہیں اور ایسے بے فکر ہو جاتے ہیں کہ دوسری جانب کا جو درحقیقت راجح اور یقینی ہے اور اس کے مقابلہ میں یہ متحمل جانب مروج بلکہ غلط ہے) ان کو احتمال ہی نہ ہوتا۔ اس کی وجہ صرف دین کا عزم مزدوری سمجھنا ہے۔ بس اس کا آخری جواب ہمارے پاس یہی ہے کہ آنکھیں مجھے یہ معلوم ہو جاوے گا کہ کس دھوکہ میں رہے اور اس وقت کا تدارک کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔

غرض اس امر کے فرقے نے بھی دین کا ایک ست نکالا اور یہ امر کا حال است اس ست سے بڑھا ہوا ہے جو فقہار نے نکالا تھا۔ کیونکہ فقہار نے جو ست نکالا ہے وہ ایک دین کی چیز تو ہے اور انہوں نے ست بھی دنیا ہی کی ایک منفعت نکالی ہے پس وہ ست نکالا اور یہ روح ہے آجکل ہر چیز کی روح نکالی گئی ہے۔ گلاب کی روح الگ ہے چیلی کی روح الگ ہے۔ انہوں نے یہ روح نکالی ہے۔ روح کیا نکالی کہ دین کی روح ہی نکالی (تمام دین کی روح ایک ذرا سی نکالی جس کا نام تہذیب اخلاق رکھا ہے۔ اس کو

اور وہ بھی اپنے ہی نزدیک حاصل کر لیا ہے۔ بس کسی عمل کی ضرورت نہیں اگر کوئی کیا بھی تو دنیا کے فائدے کے لئے۔ مثلاً نماز پڑھی تو اس فائدے کی بنا پر کہ ان حرکات سے جسم کی ریاضت ہو جاتی ہے اس واسطے کبھی اٹھک بٹھک کر لیتے ہیں اور کبھی اور طرح کی ریاضت ہوگئی مثلاً گھوڑے کی سواری کر لی یا کرکٹ اور فٹ بال کھیل لیا تو اب ریاضت کی ضرورت نہیں رہی، بس نماز صحت یا ایک نماز کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے واسطے وضو کیا جاتا ہے جس سے صفائی ستھرائی ہوجاتی ہے اور صفائی اچھی چیز ہے اور تہذیب میں داخل ہے۔ اور اگر صبح اٹھ کر غسل کیا یا صابن سے منہ ہاتھ دھو لیا ہے اور بنگلہ اور کوٹھیلوں میں رہتے ہیں گرد و غبار کا وہاں دخل نہیں، تو اس صورت میں نماز کے واسطے وضو کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ ایک صاحب ایسا ہی کرتے تھے کہ بے وضو نماز پڑھ لیتے تھے اور اگر کسی نے کہا کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی تو کہتے یہ دقیانوسی مولویوں کے خیالات ہیں لوگ غور نہیں کرتے اور دین کی تہ تک نہیں پہنچتے۔ عرب میں جب اسلام مشروع ہوا تو افلاس بہت تھا۔ لوگ محنت مزدوری سے پیٹ بھرتے تھے۔ اور میلے کچیلے رہتے تھے اس واسطے اس وقت کے لئے بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ قید لگادی تھی کہ جب نماز پڑھو تو منہ ہاتھ دھو لیا کر دو۔ اب وہ زمانہ رہ نہیں گیا ہے اب مال کی افراط ہے۔ محنت مزدوری کی ضرورت نہیں۔ ہم آئینہ اور بنگلوں میں رہتے ہیں۔ روز صبح کو صابن مل کر غسل کرتے ہیں۔ گرد و غبار کا یہاں تک گذر نہیں۔ بتاؤ ہمارے بدن پر کیا لگ رہا ہے۔ جس کے واسطے بار بار دھویں (کوئی پوچھے کہ ہر روز صبح کو کیا لگ جاتا ہے جس کے واسطے روز روز نہلاتے ہو، مگر یہ کام تو اس استاد نے بتایا ہے جس کے حکم میں چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ یعنی فیشن نے) خود یہ بات بھی نہایت تعجب خیز ہے کہ عرب عموماً میلے کچیلے رہتے تھے یہ تاریخی بات ہے کہ ان کے یہاں تاریخ کو بڑا دخل ہے اور اس پر بڑی ایمان لاتے ہیں۔ تاریخ میں یہ لگ گیا کہ عرب میں افلاس تھا۔ آگے عموماً اپنی رائے سے تجویز کر لیا کیا تاریخ میں کہیں یہ بھی ہے کہ اہل عرب سب ایسے ہی غریب اور فاسل تھے۔ کیا ان میں متنم اور صاحب ثروت نہ تھے۔ عرب میں وہ لوگ بھی تھے جن کے یہاں سو سونام تھے تو اگر وضو کی بنا عزت اور مفلسی پر بھی تو ان لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا جاتا اور صرف غریبوں کے لئے وضو کا حکم ہوتا۔

نیز صحابہ کے حالات ابتداء میں بے شک ایسے تھے مگر پھر حق تعالیٰ نے فتوحات دیئے اور والی ملک ہوئے اور یہ حالت تھی کہ بدن پر بجائے عطر کے مشک ملا کرتے تھے۔ مگر کیا تاریخ میں کہیں ہے کہ انہوں نے وضو کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بس زمانہ آزادی کا ہے چچا ہو کر دو۔ چچا ہو کر کوئی پوچھنے والا نہیں۔ چنانچہ وہ صاحب پانچوں وقت نماز بے وضو اڑاتے تھے ایک صاحب نے اور زیادہ ترقی کی کہ نماز بھی نہ ادا کر دی۔ کیونکہ مقصود بدن اس کے حاصل تھا۔ یعنی ریاضت جیسے

گھوڑے کی سواری وغیرہ۔

ایک اور صاحب کا قصہ ہے کہ وہ ایک جگہ مدعو تھے اور بڑے معزز شخص تھے۔ ان کے ساتھ اور بہت سے اشخاص بھی مدعو تھے گویا تمام جلسہ انھیں کی وجہ سے مدعو تھا اور سالار قافلہ بھی یہی تھے نماز کا وقت ہوا تو سب لوگ اٹھے مگر یہ نہ اٹھے۔ کسی نے کہا آپ بھی نماز کو چلیں تو کہا میں نماز کو نوسمجھتا ہوں۔ لوگوں نے کہا نماز تو اسلام کی چیز ہے۔ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں تو آپ جواب میں (توبہ توبہ) کیا کہتے ہیں کہ میں اسلام ہی کو نوسمجھتا ہوں۔

صاحبو! یہ نوبت ہے ان لوگوں کی جو سربراہ اور وہ کہلاتے ہیں اور جن کی عزت کو لوگ اسلام کی عزت سمجھتے ہیں۔ اس پر اگر کوئی مولوی کچھ کہے تو کہا جاتا ہے کہ مولویوں کو تو بس فتویٰ لگانا آتا ہے مسلمانوں کے کسی ایک فرد کو تو مشکل سے ترقی ہوتی ہے ایسے یہ لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں بس ترقی قومی دیکھ ہی نہیں سکتے۔

صاحبو! یہ کیا اسلامی ترقی ہے۔ اب سنئے کہ اس شخص کے لئے اہل جلسہ میں سے بعض لوگوں نے تجویز کیا کہ اس شخص نے ایسا بیہودہ کلمہ بجا ہے اس واسطے اسے بائیکاٹ کرنا چاہیے اور اس سے قطع تعلق کر دینا چاہیے۔ تو دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ ہم کیوں اختلاف ڈالیں۔ اس نے امتیاز کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اللہ میاں آپ منٹ لیں گے۔ سبحان اللہ! یہ صاحب صلح کل ہونگے مگر کیا یہ صلح کل ہے۔ دارالسلطنت کے باغی سے دوستی کر کے تو دیکھو۔ دیکھیں صلح کل کے مذاق کو کیسا بنا ہے یہ مگر یہاں اہل جلسہ کو بھی شامل ہے کہ ایسے بیہودہ سے بائیکاٹ بھی کرنا چاہیے یا نہیں افسوس! رٹکی میں ایک کمیٹی ہوتی تھی جس میں اسپرینٹ کی ہتھی کہ نکاح کی پچہ کیوں لگائی گئی ہے۔ نکاح کی روح اور حقیقت تو تراضی ہے جہاں تراضی پائی جاوے۔ نکاح ہی کا حکم ہونا چاہیے عورت اور مرد کا ایک کے ساتھ مقید ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ ہاں جبر نہیں چاہیے۔ رضا مندی سے کسی مرد اور عورت کے مل جانے میں کیا حرج ہے مگر یہ کیا ضروری ہے۔ ایک بیوی ایک میاں ہو۔ یہ مسلمانوں میں کمیٹی ہوتی تھی۔

اس سے بڑھ کر ایک اور لطیفہ ہے (لطیفہ کیا ہے کشف ہے)

دیکھ لطف

لکھنؤ میں ایک محلہ ہے خیالی گنج۔ وہاں کے ایک صاحب مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک روز درادیر میں آئے تو پوچھنے پر بیان کیا کہ آج وہاں ایک کمیٹی ہوئی تھی جس میں اسپرینٹ کی ہتھی کہ نکاح کی اصل وجہ کیا ہے۔ بہت گفتگو کے بعد

جو اخیر بات طے ہوئی وہ یہ کہ ان کا اصلی اور سبب تنزل کا اسلام ہے جب تک اس کو نہیں چھوڑا جاوے گا ترقی نہیں ہوگی اور یہ بات پاس ہوگئی۔ لعنت ہے اس پاس ہونے پر۔

اے صاحبو! خیال تو فرمائیے۔ کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے بے غزنی کی انتہا۔ پھر اپنے کو کہتے ہیں۔ ٹھیک مسلمان ہیں۔ ٹھیک نہیں بلکہ تمہارے اسلام کی آنکھ ٹینٹ نکل آیا ہے جس نے بالکل بیکار کر دیا۔ اور جس کا علاج سوائے نشتر کے کچھ بھی نہیں اور نشتر بھی کون سا؟ نائی کا پھر وہ نشتر نہیں جس سے آنکھ بن جائے بلکہ وہ جس سے اور پھوٹ جائے اور کاٹ کر نکال دی جاوے کیونکہ اس میں قابلیت ہی بننے کی نہیں یہ تو نوبت ہے۔ اگر اسپرینٹ کوئی حکم شرعی سنایا جاوے تو کہتے ہیں کہ بس مولویوں کو فتویٰ لگانا آتا ہے اور غصہ ان کی ناک پر رکھا رہتا ہے اور ذرا ہی دیر میں برامان جاتے ہیں۔ اگر انکی ماں کو کوئی گالی دے تب دیکھیں یہ برا نہیں مانتے اور اس شخص سے دوستی قائم رہتی ہے یا نہیں اس وقت تو یہ بھی ایسا خشک برتاؤ کریں کہ مولوی بھی مخالف کے ساتھ نہ کریں۔

بات یہ ہے کہ جس سے جس کا تعلق ہوتا ہے اس کو برا کہنے سے غصہ آتا ہے۔ سو آپ کو اپنی ماں سے تعلق ہے اس واسطے ماں کو گالی دینے سے غصہ آگیا اور ایسا ہونا ہی چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو فطرت سلیمہ کے خلاف ہے۔ اور ہم کو اللہ و رسول سے تعلق ہے اس لئے جب ہمارے اللہ تعالیٰ اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دی جاوے گی تو ہم کو کیسے غصہ نہ آوے گا اور کیوں ہم برا نہ مانیں گے اور کس طرح سے ایسے بیہودہ سے دوستی رکھیں گے۔

ایک اور ایل، ایل بی صاحب کا قصہ ہے داتا بڑا تو پاس کیا مگر بی ہی رہے کہ انہوں نے مجمع میں کہا کہ رسالت صرف ایک مذہبی خیال ہے جو بضرورت مذہب مان لیا جاتا ہے ورنہ واقعہ میں اسکی کوئی اصل نہیں اور لطف یہ ہے کہ اس کے ساتھ یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کی توہین کرتا ہوں۔ ایسا نہیں بلکہ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں۔ محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بڑے رفیع امر تھے۔ اور آپ نے بڑی اصلاح کی۔ لیکن رسالت صرف ایک مذہبی خیال ہے۔ کیوں صاحبو! کیا ان پر بھی کوئی فتویٰ نہیں لگانا چاہیے۔ کیا یہ مرتد کفر نہیں ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ان کے تحت ایک مسلمان دیندار لڑکی ہے اور جھڑا جھڑپکے ہو رہے ہیں اگر لڑکی کے گھر والوں سے کہیں کہ یہ نکاح باقی نہیں اور لڑکی کو اس سے الگ کر لینا چاہیے تو ابھی نام نہان پتلوار کھینچ لی جاوے کہ ہم کو گالی

وجود عدم کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ دین کی ہر ہر چیز کو حذف کر ڈالا اور دین موجود اور سلمان ہونے کے مدعی ہیں مامورات میں سے کوئی چیز مامور نہیں مانتے۔ نماز کی ضرورت نہیں۔ اس کی حقیقت جسمانی ریاضت ہے وہ اور طریقہ سے کر لی جاتی ہے۔ روزہ بہمیت توڑنے کے لئے تھا وہ اس زمانے میں رہی نہیں کیونکہ تعلیم کا زمانہ ہے۔ اسی طرح حج زکوٰۃ وغیرہ سب کتر بیونت کر کے نادر کر دیا اور حرمت میں کسی چیز کو ممنوع نہیں سمجھتے۔ سود کی حرمت اڑادی۔ اس کا تو آج کل اتنا زور و شور ہے اور اس مسئلہ میں ایسی تاہمتیں دکھائی گئی ہیں کہ حلال ہی کر کے پھوڑا ہے۔

عصر من اجزا دین کو سب کو الگ کر دیا ہے اور منافیات دین کو دین میں داخل کر لیا ہے اور خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں اور بچے مسلمان ہیں یہ تو ایسا ہوا جیسے کوئی اپنے کنبہ والوں اور دوستوں کو اپنے گھر سے نکال کر باہر کرے اور غیروں کو اور جانی دشمنوں کو گھر میں داخل کرے اور دیکھ کر خوش ہو رہا ہو اور خوش خوشی لوگوں کو دکھا رہا ہو کہ دیکھو ہمارا گھر کیسا آباد ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں معلوم ہو جائے گا کہ کیسا آباد ہے جبکہ وہ تیری نکال بونی کریں گے۔

آجکل لیڈران قوم نے دین میں وہ تصرفات کئے ہیں اور ایسی خیر خواہی ایک بڑھیا اور شاہی باز اس کے ساتھ کی ہے جیسے کسی بڑھیا نے ایک شاہی باز کے ساتھ کی تھی۔ حکایت اس کی اس طرح ہے کہ ایک شاہی باز اگر ایک بڑھیا کے یہاں جا بیٹھا۔ بڑھیا نے اس کو پکڑ لیا اور اس کی چوچ اور پنچوں کو دیکھ کر بڑا رحم آیا۔ دیکھا چوچ کی طرح ہی ہے ناخن کس قدر بڑھے ہوئے ہیں اور پیڑھے بھی ہیں اور اس کو گود میں لیکر رونا شروع کیا کہ ہائے بچے تو کیسے زمین پر بیٹھا ہو گا تیری انگلیاں پیڑھی میں ناخن اتنے بڑھ گئے ہیں اور کھانا کیسے ہو گا کیونکہ چوچ بھی پیڑھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ توبے ماں باپ کا ہے کوئی تیری عذر کرنے والا نہیں ہے جو ناخن کاٹنا اور چوچ کو درست کرتا۔ اور رحم و شفقت نے ایسا زور کیا کہ فیجی کے کرسب ناخن کاٹ دیئے اور چوچ بھی تراش دی۔

اپنے نزدیک تو بڑھیا نے بڑی خیر خواہی اور ہمدردی کی۔ مگر خدا بچا دے ایسی ہمدردی سے کہ اس کو بربادی کر دیا۔ زودہ شمار پکڑنے کے کام کا رہا اور کھانیکے۔ یہی خیر خواہی اسلام کے ساتھ آجکل کے ہمدردان اسلام کرتے ہیں کہ یہ بھی فضول اور وہ بھی فضول۔ نماز بھی زائد اور روزہ بھی زائد۔ زکوٰۃ کی حاجت نہیں، حج بھی فضول ہے۔ اور پھر مسلمان ہونے کے مدعی۔ معلوم نہیں اسلام کس چیز کا کام ہے۔ کوٹ کا نام ہے یا پتلون

کا نام ہے۔ جب اسلام کا ہر جزو فضول ہے تو کل بھی فضول ہے اس کا نام ہی کیوں لگا رکھا ہے۔ ہم تو جانتے ہیں کہ فضول ہو جو ایسی فضول باتیں کرتے ہو۔ سچ یہی ہے کہ درحقیقت یہی لوگ فضول ہیں ایک پیسہ کا سنکھیا کھا کر مر جاتے تو دنیا ایسے ناپاک وجود سے پاک ہو جاتی۔

عصر من اس گروہ نے (یعنی امرائے) عجیب گت بنائی ہے دین کی۔ درحقیقت یہ تو دین سے بالکل الگ ہیں مگر نام ہنہاد کے لئے دین کا ایک خلاصہ نکال لیا ہے اور اس کو دین کا لب لباب سمجھ کر خوش ہیں کہ وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ لہذا ہم دین دار ہیں۔ وہ خلاصہ تہذیب اخلاق ہے۔ اس کو دین کا باطن کہتے ہیں اور خیال ہے کہ باطن ہی مقصود اعظم ہے۔ ظاہر کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے اس طرح دین کا باطن نکالا۔ اور درویشوں نے اور طرح نکالا تھا جس کو میں بیان کر چکا ہوں۔

عصر من ان دونوں جماعتوں نے ظاہر کی ضرورت نہیں رکھی پس یہ حدیث اس پر رد کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ ظاہر بھی مقصود اعظم ہے۔ کیونکہ حضور قلب کو شرط کیا دعا کے لئے چنانچہ فرماتے ہیں۔ (وَاللَّهُ لَا يَجِبُ إِلَّا الْحَالِ) یعنی اللہ تعالیٰ بلا حضور قلب کے دعا قبول نہیں کرتا۔ یہاں دعا عمل ہے اور اس کے لئے شرط ٹھہرایا ہے حضور قلب کو اور ظاہر ہے (جیسا کہ میں اوپر بھی کہ چکا ہوں کہ شرط میں حیث الشریط تابع ہوتی ہے) پس معلوم ہوا کہ اصل شرط دعا ہے اور حضور قلب اس کے تابع ہے۔ اس کو دو کے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اصل مقصود عمل ظاہر ہے اور باطن اس کے لئے شرط اور اس کا تابع ہے۔ اس سے ان دونوں جماعتوں کے اس خیال پر رد ہو گیا کہ اصل مقصود باطن ہے۔ یہ تحقیق تو نسبت بین الظاہر والباطن کی حیثیت سے ہوئی اب عقلی طور پر سمجھئے کہ اس میں فلسفیانہ راز ہے وہ یہ کہ ہر چیز کی ترقی عمل۔ ہوتی ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس کو آجکل کے لوگ تہ دل سے مانتے ہیں۔ کیونکہ ترقی کا مدار اسی پر ہے اور ترقی ہی ترقی کا آجکل ہر چار طرف غل ہے۔ سوسب کو معلوم ہے کہ خیال باطن ہے اور عمل ظاہر اور ترقی صرف خیال سے نہیں ہوتی۔ چنانچہ لیکچروں میں برابر کہا جاتا ہے کہ ترقی کے لئے ہاتھ پیر بلاؤ۔ صرف خیال سے کچھ نہ ہو گا۔ عمل کر کے دکھاؤ عملی حالت کو بدلو۔ تب کو پستی سے نکل کر عمل کے میدان میں آؤ گے۔ اس کی بنا اسی بات پر ہوئی کہ ترقی عمل سے ہوتی ہے صرف خیال اس کے لئے کافی نہیں گو یہ ضرور ہے کہ عمل اس خیال ہی سے پیدا ہوتا ہے اور خیال کا وجود عمل سے پہلے ضروری ہے کیونکہ اعضا و تبارک

ہوتے ہیں قلب کے، اور قلب میں ایک بات مرتبہ خیال میں پیدا ہوتی ہے تو اس کے بعد اس کا ظہور مرتبہ فعل میں اعضا سے ہوتا ہے۔ کہاں ہیں مدعیان سائنس اور مدعیان تعلیم۔ ذرا اپنے سائنس ہی کے مسئلہ میں غور کریں کہ ہر فعل کے وجود کے لئے دونوں باتوں کی ضرورت ثابت ہوئی۔ خیال کی بھی جس کو دوسرے لفظ میں باطن کہہ سکتے ہیں۔ اور عمل کی بھی جس کو دوسرے لفظ میں ظاہر کہا جاسکتا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ ان دونوں میں سے کارآمد دراصل چیز جس سے اثر مرتب ہوتا ہے وہ عمل ہے یعنی ظاہر نہ خیال یعنی باطن۔ گو بلا باطن کے وجود ظاہر نہیں ہو سکتا ہو۔ اس کی مثال پھل اور گٹھلی کی ہے۔ مثلاً آم ہے۔ آم کا پھل ہے نہ کہ گٹھلی۔ گو وجود پھل کا موقوف ہے گٹھلی پر۔ تو جس کو آم کھانا ہو اس کی گٹھلی سے بھی گریز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اول کام گٹھلی ہی سے پڑے گا مگر مقصود بالذات اور کام کی چیز پھل ہی ہے جیسا کہ سب جانتے ہیں۔

تو ان لوگوں کی مثال جو محض باطن کو مقصود اعظم قرار دیتے ہیں اور ظاہر و باطن | ظاہر کو نہیں سمجھتے ایسی ہوگی کہ ایک شخص نے گٹھلیاں ڈو کر بھر کر جمع کر لی ہوں اور خوش ہو کر ہمارے پاس آم ہیں اور ہم آم کھاتے ہیں اور جب کوئی اسپر اعتراض کرتا ہو تو جواب دیتا ہو کہ میاں اصلی چیز تو یہی ہے اس کے بغیر تو پھل کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ صاحبو! یہ دلیل تو ٹھیک ہے مگر کیا کوئی اس کو اس دلیل کی رو سے آم کھانے والا کہہ سکتا ہے۔ حاشا وکلا۔ آم کی ان خوشبو بھی نہیں آئی۔ اور بوجھوں مرے مفت۔ تو اصل یہی بھڑکی ہے بڑا مقصود ظاہر ہی ہو کہ وہ وجود میں موقوف ہو یا باطن پر۔ اور یہ بعینہ سائنس کا وہی مسئلہ ہے کہ ترقی کا مدار عمل پر ہے۔ نہ خیال کا کافی نہیں گو عمل کا وجود خیال ہی سے ہوتا ہے۔ ورنہ نہ خیال تو شیخ چلی نے بھی پچایا تھا۔ اگر خیال سے ترقی ہو سکتی ہے تو شیخ علی کو بڑی ترقی ہوتی۔ اور اگر یہی ترقی ہے تو ایسی ترقی تو بہت سہل ہے۔ ہر شخص بے محنت و مشقت گھریں بیٹھے حسب دلخواہ کر سکتا ہے۔ (الظاہر ص ۳۵ تا ۴۲)

صاحبو! خوب سمجھ لیجئے کہ کوئی مقصود بلا مشقت اور بلا ہاتھ پر بلائے غسل کی ضرورت | حاصل نہیں ہو سکتا۔ نہ دنیا کا نہ آخرت۔ اس مشقت ہی کا نام عمل ہے اور اسی کا ظاہر اور باطن نام صرف خیال کا ہے۔ اگر ظاہر کو اڑا دیا تو رہا کیا۔ صرف خیال جو کچھ بھی کارآمد نہیں۔ جیسا کہ آپ کا سائنس بھی اس کو ثابت کرتا ہے اور آپ خود بھی مانتے ہیں کہ ترقی عمل سے ہوتی ہے نہ صرف ارادوں اور ڈھکوسلوں سے۔ پھر یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ برا

باطن کا کافی ہے اور ظاہر کی ضرورت نہیں۔ یہ عقلی ثبوت بھی ہو گیا ظاہر کی ضرورت کا اور اس کے مقصود ہونے کا حدیث سے پہلے ثابت ہو چکا۔ اور اس حدیث کے علاوہ دوسرے نصوص بحضرت موجود ہیں جو اس باب میں بالکل صریح ہیں اور وہ نصوص اس قدر ہیں کہ دنیا بھر ان کو جانتی ہے اور ہمارے مخاطبین کو بھی معلوم ہیں کہ مگر انہوں نے ان میں ایک اور ترکیب چلی ہے وہ یہ کہ ان کے معنی بدلے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے معنی وہ نہیں جو مولوی لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں اور اپنے مذاق کے موافق کھینچ کھانچ کر معنی بیان کرتے ہیں۔ اس وقت ان کی تفصیل کا موقع نہیں۔ اجمالاً یہ کہنا کافی ہے کہ آیا وہ معنی صحیح ہوں گے جو لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں اور اہل علم نے سمجھے ہیں یا وہ جو کسی ایک دو نے اختراع کر لئے۔ اب یہ دیکھ لیجئے کہ جب سے شریعت مقدسہ آئی اس وقت سے ان نصوص کے معنی کیا سمجھے گئے۔ اور تمام امت نے ظاہر کو ضروری سمجھایا نہیں۔ تمام کتابیں بھری پڑی ہیں اعمال کی ضرورت سے اور ایک ایک عمل کی کیفیت اور اس کے اجزاء ضروری اور غیر ضروری۔ اور نعمات و محنات اور اس کے مفسدات و محکمات بات سب تفصیل کے ساتھ مدون ہیں پھر اس بھڑکے کی کیا ضرورت تھی اگر عمل کی ضرورت نہیں تھی۔ کیا اس سب امت کی امت نے غلط معنی سمجھے۔ ظاہر ہے کہ ایک کے سمجھے ہوئے معنی غلط ہو سکتے ہیں۔ نہ کروڑوں کے سمجھے ہوئے خوب سمجھ لیجئے کہ یہ الحاد ہے اور دہریت ہے اور زندہ قہرے اور شریعت کا انکار ہے جو اس کام کرب ہے وہ بیشک باطل پر ہے خواہ اپنے زعم میں تسلیم یافتہ ہو۔ اور دیندار ہو اور مقتدا ہو اور عقلمند ہو۔ اور کچھ بھی ہو۔ اور یہ اعمال ترک تھل ہے اور نفس کا دھوکہ ہے اور انجام اس کا حسرت ہوگا۔ جس کے اعمال صحیح نہیں وہ کسی شمار میں بھی نہیں اور یقین کے ساتھ سمجھ لیجئے کہ کھڑکے کے ساتھ خدنگ رسانی ہو سکتی ہے نہ فسق کے ساتھ۔ خدا تک رسانی طاعت کے ساتھ ہوتی ہے اور طاعت نام ہے عمل کا جس میں باطن کے ظاہر بھی آگیا۔ جس میں عمل نہیں وہ خدا رسیدہ بھی نہیں ہو سکتا۔ (ایضاً ص ۴۵ تا ۴۶)

۴۶۔ طبیعت بے شعور کو فاعل ماننا سراسر حماقت ہے

عقلاء میں اب تک اختلاف ہے کہ عقل جو ہر مجرد ہے یا جوہرادی ہے۔ اور نفس لاطفہ کے علاوہ کوئی چیز ہے یا خود نفس ہی کا نام عقل ہے، یہ عقل کا علم ہے پھر اس کو احکام خداوندی میں

مزاحمت کا کیا حق ہے، جو لوگ عقل کے بہت متبع ہیں وہ ہر وقت بڑے پریشان ہیں۔ ہر چیز کی لم دریافت کرنا چاہتے ہیں مگر بعض جگہ گاڑی اٹک جاتی ہے اور کوئی بات نہیں بنتی۔ اور جہاں کچھ اسباب و علل معلوم بھی ہو جاتے ہیں وہ بھی تخمینہ اور اٹکل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ پرسوں آندھی آئی تھی میں کہہ رہا تھا کہ عقلا کے نزدیک اس کے کبھی کبھار اسباب ہیں تو یہ لوگ ان اسباب میں تصرف کر کے ذرا اس کو روک تو دیں۔ آخر وہ بہت سے اسباب میں یہ تصرف کے مدعی ہیں۔ آندھی کے اسباب میں بھی ذرا تصرف کر کے دکھائیں دو حال سے خالی نہیں، یا تو اسباب اختیاری ہیں یا غیر اختیاری اگر اختیاری ہیں اور یہ قابل تصرف نہیں تو معلوم ہو کہ آندھی کا آنا اور اس کا روکنا کسی اختیار میں نہیں تو پھر خواہ مخواہ اسباب کا نام کیوں کرتے ہیں۔ سو حد کی طرح صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ حق تعالیٰ نے حکم سے آندھی آئی ہے۔ اسی طرح زلزلہ آتا ہے اس کے لئے بھی ان کے نزدیک کچھ اسباب ہیں تو ذرا ان اسباب میں تصرف کر کے زلزلہ کو روک لیتے دیں۔ زلزلہ کو تو کیا روکتے۔ جن چیزوں کا ان کو تجربے سے علم بھی ہو چکا ہے ان کی بھی لم معلوم نہیں۔ مثلاً زلزلہ سے کچھ پہلے مقناطیسیت کی خاص جذبہ زائل ہو جاتی ہے ذرا اس کی لم مجھے کوئی بتلا دے کہ آخر زلزلہ میں اور مقناطیس کی قوت میں تعلق کیا ہے۔ زلزلہ سے اس کی قوت جذبہ کیوں زائل ہو جاتی ہے۔ کوئی شخص اس کی لم بیان نہیں کر سکتا بلقی اٹکل پوچھ بات گھر دینا تو ہر ایک کو آسان ہے۔ لم تو وہ ہے جس کو دل بھی قبول کر لے دوسرے گھر گھر کر بیان کر دینا کیا مشکل ہے۔ مگر وہ ایسی ہی لم ہوگی جیسے بعض لوگوں نے چیتے کے بدن پر نشانات کی وجہ بتلائی ہے کہ وہ دھوپ میں سیاہی دار درخت کے نیچے بیٹھتا تھا اس لئے جہاں دھوپ پڑی وہاں سے سفید ہو گیا اور جہاں سایہ پڑا وہاں سے سیاہ ہو گیا۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ اس چیتے کے پاس کوئی پرکاری تھی کہ ہر روز ایک ہی جگہ میں ٹھیک بیٹھتا تھا اور آہستہ آہستہ دھوپ سے سایہ میں اور سایہ سے دھوپ میں اس طرح ہٹتا تھا کہ بدن پر گول گول ہی نشانات پڑیں کوئی نشان مربع یا مستطیل یا مثلث یا مکعب نہ ہو۔ کیا کسی کے دل کو یہ بات لگ سکتی ہے جیتا کیا ہوا، بڑا ماہر الجھنیز ہوا۔ مگر احقانہ وجہ یہ لوگ خوش ہیں کہ ہم نے تو دم بیان کر دی ہے چاہے وہ ایسی ہی وجہ ہو جیسے ایک شخص نے جاٹ سے کہا تھا کہ جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ۔ اس نے کہا شیخ رے شیخ تیرے سر پر کوہو۔ شیخ نے کہا داہ قافیہ تو ملا ہی نہیں۔ کہنے لگا قافیہ نہ ہی بوجھیں تو مرے گا ہی۔ ان کی وجہ ہوتی ہے کہ چاہے جوڑ نہ ہو مگر وجہ ہونی چاہیے۔ یہ ساری خرابی ہے۔ طبیعت بے شعور کو فاعل ماننے کی وجہ کیونکہ یہ لوگ تو یہ کہہ نہیں سکتے

کہ یہ نشانات طبیعت نے بلا واسطہ بنا دیے ہیں کیونکہ طبیعت میں ارادہ اور شعور ہی نہیں وہ کس طرح افعال مختلفہ بتاتی۔ اس لئے اسباب کا واسطہ مانتے ہیں پھر اٹکل پوچھ اسباب گھر کر نکالتے ہیں۔ اور موجد کو کسی جگہ اٹکا وہ نہیں وہ بڑا بے فکر ہے۔ جس بات کی اس سے وجہ پوچھو وہ کہتا ہے خدا نے یونہی بنانا چاہا تھا بنا دیا اور گو وہ واحد حقیقی ہے مگر ارادہ کے تعلق کی وجہ سے افعال میں اختلاف واقع ہو گیا۔ اس لئے الواحد لایصد رحمہ الواحد کے بھی خلاف نہیں، کیونکہ یہ حکم علت موجبہ میں ہے حق تعالیٰ ایجاب سے منزہ ہیں اور طبیعت میں ارادہ ہی نہیں وہ علت موجبہ ہی ہوگی اس لئے اس کی طرف ان افعال کی نسبت نہیں کر سکتے ہائے کیسے ذی شعور کو فاعل مانا اور جس جگہ ان سے کوئی تاویل نہیں بنتی۔ نہ الٹی نہ سیدھی۔ نہ کوئی سبب ظاہری سمجھ میں آتا ہے تو وہاں ہی ظالم خدا کو فاعل نہیں مانتے بلکہ ان مواقع کے لئے بخت اتفاق کو گھر لیا ہے۔ مگر یہ محض نام ہی نام ہے۔ (اللہم لا لہ الا انت سبحانک انی اعوذ بک)۔

کوئی ان سے پوچھے بخت و اتفاق ہے کیا بلا۔ اس میں فاعلیت کی قوت صفت عقل پر اعتماد کا انجام اسکاں سے آگئی اور یہ کیوں کر سبب بن گیا۔ بس اس کا کچھ جواب نہیں یہ ہے عقل محض کے اتباع کا نتیجہ جس سے ایسی بے عقلی کی باتیں ماننا پڑتی ہیں۔ موجد کیسے زمین میں ہے کہ اس کو ایسی دوران کار باتیں سوچنے کی ضرورت نہیں وہ کہتا ہے کہ سب کا فاعل خدا ہے اس نے جس طرح پیدا کرنا چاہا کر دیا۔ اور اس کو طبیعت کی ضرورت ہے نہ بخت و اتفاق کی اور جہاں ظاہر میں کچھ اسباب کا دخل معلوم بھی ہوتا ہے وہاں وہ کہتا ہے کہ اسباب مؤثر بالذات نہیں ہیں بلکہ یا تو مؤثر باذن الخالق ہیں جیسا کہ ایک قول ہے اور یا مؤثر ہی نہیں بلکہ محض علامات ہیں جیسا کہ ایک قول ہے جیسے جھنڈی کا ہلنا ریل کے چلنے کی محض علامت ہے مؤثر بالذات حق تعالیٰ ہیں اگر وہ ارادہ کریں تو سارے اسباب بیکار پڑے رہیں جیسے ڈرائیور گاڑی کو روکنا چاہے تو ہزاروں سرخ جھنڈیاں بیکار ہوتی ہیں۔ بتلائیے یہ شخص چن میں ہے یا وہ شخص جو کبھی اسباب کو فاعل مانتا ہے کبھی طبیعت کو کبھی بخت و اتفاق کو، موجد ان اسباب پرستوں کی پریشانی دیکھ کر یوں کہتا ہے

ذکر بآ و احد دم (لفظ رب)۔

ذکر بآ و احد دم (لفظ رب)۔

ذکر بآ و احد دم (لفظ رب)۔

ذکر بآ و احد دم (لفظ رب)۔

ذکر بآ و احد دم (لفظ رب)۔

اختیار کرو۔

۱۔ مصلحت دیدن آنست کہ یاران ہمکار۔

بگذارند دھم طرہ یاری گیرند۔

اور مولانا جامی فرماتے ہیں۔

خلیل آسادر ملک یقین زن
نوائے لاجب الانلین زن۔

کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اسباب اس کے قبضہ میں ہیں۔

خاک و آب و آتش بندہ اند
بائن و تو مردہ باقی زندہ اند

واقعی موحّد سے بڑھ کر کوئی چین نہیں۔ پھر مشرکین کے بعض معبود ایسے کہ ان میں باہم رقابت ہے۔ وہ ایک کی عبادت دوسرے سے چھپا کر کرتے ہیں۔ کہیں وہ یہ معلوم کر کے کہ دوسرے کے پاس بھی جاتا ہے کہ ناخوش نہ ہو جاوے۔ (تھیل للاختلاص مع اللانام ۱۹ تا ۲۲)

آجکل کے حکماء تو ایسے بد تہذیب ہیں کہ ان کے بھی منکر ہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے خدا کے منکر۔ جسے ایک چراسی اپنے انسر سے تنخواہ لیتا ہو مگر تنخواہ لینے کے بعد کہتا ہے کہ میرا کوئی انسر نہیں۔ نہ مجھے کوئی تنخواہ دیتا ہے بلکہ زمین سے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اور ہوائے اڑ کر میرے ہاتھ میں آجاتے ہیں۔

رسالہ حمید میں موحّد اور دہری کی مثال ایک گفتگو کے پرائے میں خوب لکھی ہے کہ ایک موحّد اور ایک دہری کسی جزیرے میں گئے۔ وہاں ایک مکان نہایت خوبصورت مستحکم بنا ہوا دیکھا جس ایک طرف کھانے کا کمرہ ہے جو فرش فرش اور آئینوں سے سجا ہوا ہے۔ ایک طرف سونے کا کمرہ ہے جس میں عمدہ عمدہ مہربان کچی ہوئی اور ستھی پیچھے لگے ہوئے ہیں ہر کمرہ میں ہوا کے لئے روشندان بے ہوئے ہیں۔ ایک طرف باغ لگا ہوا ہے جس کے درخت نہایت قرینہ سے لگائے گئے ہیں۔ ایک طرف حوض بنا ہوا ہے جس میں فوارہ سے ہر وقت پانی آتا ہے موحّد نے اس مکان کو دیکھ کر کہا کہ اس کا بنانے والا بڑا ہی صنّاع اور بہت ہی ماہر تھا جس نے نہایت عمدگی اور مضبوطی اور خوبصورتی کے ساتھ اس مکان کو تیار کیا۔ دہری نے کہا کہ اس کے بنانے والا کوئی نہیں۔ بلکہ عرصہ دراز سے یا ریش ہونے کی وجہ سے زمین کی مٹی جم گئی۔ پھر دھوپ سے پختہ اینٹیں بن گئیں۔ پھر ہوا سے اڑا کر وہ اینٹیں اس جگہ اکڑ جمع ہو گئیں۔ پھر ہوا چلی اور ان کو اوپر نیچے کر دیا اس طرح دیواریں بن گئیں۔ پھر مہارٹوں سے پتھر گرے اور ہوائے ان کو اڑا کر یہاں کھڑا کر دیا۔ اس سے

ستون بن گئے۔ پھر درختوں کی لکڑیاں ہوائے ٹوٹ گئیں۔ وہ اڑ کر یہاں چھت کی صورت میں قائم ہو گئیں۔ اس طرح اس نے ساری مکان کو ہوا اور دھوپ سے تیار کر دیا۔ میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ بتلائیں ان میں گدھا کون ہے آدمی آدمی کون ہے۔ یقیناً وہ شخص بالکل گدھا ہے جو ایسے مکان کی نسبت یوں کہتا ہے کہ خود بخود تیار ہو گیا۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ جو لوگ آسمان و زمین کی اتنی بڑی عجیب و غریب عمارتوں کو کسی صنّاع کی بنائی ہوئی نہیں مانتے۔ بلکہ از خود تیار مانتے ہیں وہ یقیناً نہیں۔ تو یونان کی حکمت اس حکمت سے پھر بھی اچھی تھی۔ وہ لوگ خدا کے تو قائل تھے اور اہل سائنس تو غضب کرتے ہیں کہ خدا کے بھی منکر ہیں اور سائنس دانوں میں سے جو مسلمان خدا کے قائل بھی ہیں یہ ان کی محض وضع داری ہے ورنہ ان کا خدا کو ماننا ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی سے پوچھے کہ تو نے بادشاہ کو دیکھا ہے وہ کہے کہ ہاں دیکھا ہے اس کے ایک سو نو ہتھی اور ذرا سا سر تھا اور آنکھیں نہیں تھیں۔ تو پہلا شخص یہ اوصاف سن کر کہے گا کہ کج بخت تو نے بادشاہ کو نہیں دیکھا۔ نہ معلوم کس بلا کو دیکھ لیا ہے بادشاہ تو ایسا بد صورت نہیں ہے۔

یہی حال ان سائنسدانوں مسلمانوں کا ہے جو خدا کے قائل ہیں مگر اس کے کمالات کے منکر ہیں۔ جن میں سے ایک بڑا کمال یہ ہے فی فعل ما شاء و یعمک ما یرید مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ بس خدا نے عالم کو پیدا کر کے طبیعت اگر مادہ کے سپرد و سارا کام کر دیا ہے اب جو ہوتا ہے وہ اسباب طبیعیہ سے ہوتا ہے خدا تعالیٰ کے ارادہ کو کچھ دخل نہیں گویا خدا نے گھڑی میں کوک بھردی ہے۔ اب اس کے چلنے میں فراخاں اور بال کمانی کی طاقت کو دخل ہے۔ خدا کو کچھ دخل نہیں۔ اسی لئے یہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کی نار کے گلزار ہونے کا انکار کرتے ہیں کہ آگ بھلا کیونکر ٹھنڈی ہوگی۔ یہ تو قانون طبیعت کے خلاف ہے بھلا بنی اسرائیل پر ہاڑ کیونکر معلق ہو گیا اور ایک ذرا سے پتھر میں سے بارہ چشے کیونکر بہنے لگے۔ یہ تو قانون فطرت کے خلاف ہے۔ ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کو قانون فطرت کے تابع بنا دیا۔

موحّد کہتا ہے کہ نہ معلوم تم کس عاجز کو خدا سمجھتے ہو۔ خدا تو ایسا عاجز نہیں۔ اس کی توشان یہ ہے کہ ایک پتہ بھی اس کے حکم دارادہ کے خلاف نہیں ہل سکتا۔ اور اگر وہ چاہے تو تمام عناصر کی خاصیت کو دم بھریں بدل دے۔

پھر ان اوصاف کے ساتھ ان کا یہ کہنا کہ ہم خدا کے قائل ہیں ویسا ہی ہے جیسا کہ اس شخص نے

کہا تھا کہ میں نے بادشاہ کو دیکھا ہے اس کے ایک سو نڈھتی اور آنکھیں ندارد تھیں۔ مگر بایں ہمہ ان کو کافر نہ کہیں گے کیونکہ ان کے اقوال سے صرف خدا کا انکار لازم آیا ہے۔ التزام نہیں پایا گیا ہے اور لزم کفر نہیں التزام کفر ہے اس لئے ہم ایسے مسلمان کو کافر نہیں کہتے۔

ایک اور مزے کی بات سنئے۔ جب اہل سائنس نے خدا کا انکار کیا اور طبیعت کو فاعل مانا تو ان کو اس کی بھی فکر ہوئی کہ اسباب طبعیہ کے موافق انسان کی اصل دریافت کی جائے کیونکہ لادم حلیہ (السلام) کا خدا کے ہاتھ سے پیدا ہونا تو ان کو مسلم نہیں یہ تو انسان کی عقل سے بعید ہے تو ڈراؤں کو یہ کہنا پڑا کہ انسان کی اصل بندہ ہے۔ بندہ ترقی کر کے انسان بن گیا۔ اس کا نام مسئلہ ارتقا ہے اس پیارے کو اپنے مناسب تمام حیوانات میں بندہ ہی نظر آیا۔ جب کوئی اس قول کی تردید کے درپے ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس قول کے انکار کی ضرورت نہیں۔ اس کو اپنے نسب کا حال ہم سے زیادہ معلوم ہے اس لئے وہ اپنا نسب بیان کرتا ہے وہ بندہ ہی کی نسل سے ہوگا۔ اور ہم کو اپنے نسب کا حال اس سے زیادہ معلوم ہوگا کہ آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ تو تم اس بات کا انکار کیوں کرتے ہو۔ وہ پیارے تو اپنا نسب بتلا رہا ہے۔ تمہارا نسب محفوظ رہی بتلا رہا ہے اور جس دن وہ ہمارا بتلا دے گا ہم کہیں گے کہ ”صاحب البیت ادبی ہانیہ“ گھر والوں کو اپنے گھر کی خبر دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہمارے نسب کی خبر کچھ کو ہم سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ ہمارے پاس شجرۂ نسب آدم علیہ السلام تک محفوظ ہے۔ بجھے ہمارے نسب میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ہاں تیرے پاس اپنا شجرۂ نسب محفوظ نہ ہوگا تو بجھے اختیار ہے جس سے چاہے اپنا نسب ملائے (مجمول النسب یہ نہ کرے تو اذکر کیا کرے) (جامع)

یساری خرابی طبیعت کو فاعل ماننے سے لازم آئی۔ خدا کو مان لیتے تو اس جھگڑے میں نہ پھنستے۔ یہ تو ان سائنس والوں کا حال تھا جو خدا کے منکر ہیں۔ اب ان سائنس والوں کا حال سنئے جو براے نام خدا کے قائل ہیں۔

ان میں سے ایک صاحب علم کا قصہ ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ ایک صاحب علم کا قصہ قرآن میں آدم علیہ السلام کا قصہ ڈراؤں کی تحقیق سے مصادم ہے تو وہ بولے شاید وہ پہلا بندہ جس نے انسان کی طرف سب سے پہلے ترقی کی ہے۔ (نوذ باللہ) آدم علیہ السلام ہی ہو۔ استغفر اللہ۔ استغفر اللہ۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اس بات کی نقل سے بھی۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور خدا کا قائل بتلاتے

ہیں۔ یہ محض وضع داری ہے ورنہ حقیقت میں یہ خدا کے قائل نہیں۔ بھلا ڈراؤں کو تو اس قول پر اس بات نے مجبور کیا تھا کہ وہ خدا کو فاعل نہیں مانتا۔ طبیعت کو فاعل مانتا ہے۔ اور طبیعت دفعہ ترقی نہیں کر سکتی۔ تدریجاً ترقی کرتی ہے کہ پہلے اجسام بسیط یعنی عنام کی صورت اختیار کی۔ پھر اس سے ترقی کر کے جمادات مرکبہ کی صورت اختیار کی پھر اس سے ترقی کر کے حیوانات کی صورت اختیار کی۔ پھر حیوانات میں سے کسی نے ترقی کر کے انسان کی صورت اختیار کر لی۔ مگر جو شخص خدا کو فاعل قرار مانتا ہو۔ اس کو اس قول کی طرف کس چیز نے مضطر کیا۔ اس کے نزدیک اس میں کیا استدلال ہے کہ خدا تعالیٰ آدم علیہ السلام کے پتلے کو مٹی اور پانی سے بنا کر دفعہ اس کو انسان بنا دیں۔ اس ظالم کو ڈراؤں کی تقلید کس بات نے مجبور کیا کہ وہ خواہ مخواہ ایک بنی کی توہین پر آمادہ ہوتا ہے۔

پھر اس میں علاوہ توہین بنی کے یہ بھی خرابی ہے کہ یہ تاویل ڈراؤں کے قول پر بھی غلط ہے کیونکہ ڈراؤں اس کا قائل نہیں ہے کہ دنیا میں بس ایک بندہ ترقی کر کے انسان ہوا ہو جس کی نسل میں یہ سب انسان ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ جس وقت بندہ کی طبیعت نے ترقی کی ہے تو ایک خاص وقت میں ہر چھ ہزاروں لاکھوں بندہ آدمی بن گئے۔ اور یہ سب ایک کی نسل سے نہیں تو اس شخص نے ڈراؤں کی تقلید میں قرآن کے اندر تقلید کی اور وہ تحریف بھی ڈراؤں کے یہاں قبول نہیں تو ادھر سے بھی گئے۔ ادھر سے بھی گئے۔

نذہای ملا نہ صال منم نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے رہے ہائے یہ لوگ ایک خدا کو چھوڑ کر کدھر مارے مارے پھرتے ہیں موحد کو ایک خدا سے نقل ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا واسطہ علاقہ ہے اسلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ آپ کی شان یہ ہے کہ گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از علقوم عبد اللہ بود۔

اس موحد کو اپنے علوم پر اطمینان ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو وہ علوم ہی اطمینان بخش ہیں۔ موحد کہتا ہے کہ ہر چیز کا فاعل خدا ہے۔ خدا نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کر کے انسان بنا دیا۔ اس کو کچھ ضرورت نہیں کہ اپنا نسب بندہ یا سور سے ملائے۔

تو خدا کو فاعل بنانے میں کیسی راحت ہے کہ سب جھگڑوں سے نجات ہو گئی۔ یہ تو علمی راحت ہے اور دینی حسی راحت یہ ہے کہ حوادث و مصائب میں موحد مستقل

۴۸۔ عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں ہے جتنی شریعت

خیر خواہ ہے۔

اجکل ہر بات میں عقل پرستی کا دور ہے ہر معاملہ میں اسی کو فیصلہ کے لئے حکم بنایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ شریعات میں بھی اور شریعات میں سے معادیں بھی اور پھر عقل کو نسی وہ جو دنیا کے معاملات میں ٹھوکرین کھاتی پھرتی ہے۔ تعجب ہے اس کو حکم بنایا گیا ایسے عظیم فیصلہ کے لئے۔ اور تمنا کی جاتی ہے کہ اگر عقل کے موافق احکام ہوتے تو خوب ہوتا لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بڑی مصیبت ہوتی کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں جتنی شریعت خیر خواہ ہے۔ دیکھئے اسی مقام پر عقل کا فتویٰ تو یہ ہے کہ استحضار تصدیق دو! ماضوری ہو ایک ساعت بھی غفلت جائز نہ ہو جیسا کہ ایک بزرگ غلبہ میں فرماتے ہیں۔

سہ ہر آنکہ غافل از حق یک زمان است

در آن دم کا فرست اما نہاں است

یہاں کا فرسے کا فر اصطلاحی مراد ہے۔ یعنی مومن کامل کے مقابل۔ اور کامل بھی کیسا ہو جو ملکیت کے درجے سے پہونچا ہوا ہو کیونکہ کمال کے بھی درجات مختلف ہیں اور ایک درجہ کامل کا ہے اور ایک کمال کا۔ اور پھر ملکیت کے بھی مختلف درجے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جو حق تعالیٰ کو ہر وقت یاد رکھے وہ مومن اکمل ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو شخص یا د حق میں غفلت کرے اسے اضافہ کا فر کہہ دیا ہے۔ اس سے تحقیقی اور نقی کا فر مراد نہیں جو عرض غلبہ حال جو اقتضا ہے کہ استحضار دو! ہو عقل کا بھی وہی اقتضا ہے تو اگر شریعت مقدسہ نہ ہوتی اور محض عقل ہی حاکم ہوتی تو وہ سب کو عاصی قرار دیتی۔ شریعت مقدسہ نے یہ رحمت فرمائی کہ آپ کے ذہول کی اجازت دیدی اور عدم تصدیق کو بھی جبکہ تکذیب نہ ہو تصدیق کا نام مقام کر دیا۔ اب بتائیے عقل زیادہ خیر خواہ ہوتی یا شریعت مقدسہ۔ یہ ان عقل پرستوں کو خطاب محتاج پرستش کا غلبہ ہے اور عقل کو شرح پر ترجیح دیتے ہیں۔

(آثار العبادۃ ص ۶)

۴۹۔ کفار کا مال دبا لینا حلال نہیں ہے

اجکل اجتہاد کا زور ہے حتیٰ کہ کافر بھی مجتہد ہونے لگے ہیں خواہ وہ یورپ کا ہو یا ہندوستان کا۔ تو شاید کوئی ایسا ہی مجتہد یوں کہے لگے کہ حدیث میں تو مسلم کی قید ہے تو مسلمان کا مال تو بدو و ن طیب قلب کے حلال نہیں ہوگا لیکن کافر کا تو ضرور حلال ہے۔ اور پھر شاید اس استدلال سے منتفع ہو کر ریل میں بے ٹکٹ سفر کرتے ہوں کہ وہ مسلمان کی نہیں ہے غیر مسلم اس کے مالک ہیں خواہ اس کے پاس ٹھیکہ ہے اور بیض لوگ اسے سرکاری سمجھ کر یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ سے اپنا حق وصول کرتے ہیں۔

یہ مسئلہ بھی بجائے خود قابل بحث ہے کہ غیر جنس سے حق وصول کرنا جائز ہے یا نہیں۔ مگر بہت بہت لوگ اس جگہ مسلم کی قید دیکھ کر یوں سمجھتے ہوں گے کہ کافروں کا مال لینے میں مطلقاً کچھ جرم نہیں خواہ اس پر ہمارا حق ہو یا نہ ہو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم کا مال حیرا لینے کو منع فرمایا ہے۔

اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہ قید اتفاقی ہے کہ عادتاً مسلمانوں کو سابقہ مسلمان ہی سے پڑتا ہے ورنہ نصوص عامہ کی وجہ سے اس طرح کسی کا بھی حلال نہیں۔ چنانچہ بعض احادیث و عید میں لا رجل یقطع مال لا رجل آیا ہے۔ (رواہ فی الترغیب عن الحاکم وقال صحیح علی شرطہما)

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ کافر فرامی اور کافر مسلم حقوق ظاہرہ اور معاملات میں شرعاً مثل مسلمان کے ہے۔ لہذا مالنا و حلیہم ماحلیت البتہ کافر محارب کا مال مبارک ہے مگر وہاں بھی فریب اور غدر جائز نہیں اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق ایک عجیب بات فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے چنانچہ مولانا نے فرمایا کہ بھی اگر کسی کا حق ہی رکھنا ہو تو مسلمان کا رکھے کافر کا نہ رکھے کیونکہ قیامت میں ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جا دیں گی۔ تو اگر کسی مسلمان پر ظلم کیا تو ماز روزہ ظالم کا اس کے بھائی کی کوٹے لگا۔ خیر اگر ظالم پر ظلم کیا تو باطن میں تو ہی ہمدردی بھی تو کی کہ اپنی نیکیاں اسے دے دیں۔ اور اگر کافر کا حق رکھا تو ایک تو اپنی نیکیاں پر اسے گھر۔ پھر اس صورت میں نہ تمہارا بھلا نہ اس کا بھلا۔ کیونکہ وہ تو پھر بھی جہنم ہی میں گیا۔ اگر کوئی کہے کہ پھر اسے کیا نفع ہو واجب نیکیاں اس کے کار آمد

نہ ہوں۔ جواب یہ ہے کہ نفع تو ہوگا مگر اتنا کم ہوگا کہ اسے محسوس نہ ہوگا جیسے کسی کے پاس من بھر سونے کا ایک ڈھیر ہے اور اس میں سے کسی نے ایک رتی بھر سونا چرایا تو واقع میں تو کمی ہوئی مگر محسوس نہ ہوگی۔ لیکن اس سے کوئی عاقل اور عادل اس کی اجازت نہ دے گا کہ اتنا سا چرایا کر دے مثلاً کسی سلطنت میں دودھ کے اندر پانی ملائے کی اجازت نہ ہو اور اگر کوئی یہ کہہ کر ملاوے کہ ایک من میں ایک لوٹا کیا معلوم ہوگا۔ تو کیا یہ جرم نہیں۔ یقیناً جرم ہے اگر اطلاع ہو جاوے تو ضرور سزا ہوگی۔ مگر اکثر اطلاع نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کا احساس کم ہوتا ہے۔ مگر عدم احساس سے بطلان ثبوتی تو لازم نہیں آتا۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنے نفع کا احساس نہ ہو مگر سزا میں کچھ تخفیف ہوگی ہو تو اس سے نفع کا بطلان لازم نہیں آتا۔ اسی طرح کافر کے عذاب میں بھی تخفیف ہوگی گو اسے خفت کا احساس نہ ہو۔

اگر کوئی کہے کہ قرآن میں تو ہے۔ لایخفف عنهم العذاب کہ ان کے عذاب میں تخفیف نہ کی جاوے گی اور تم کہتے ہو کہ نیکیاں ملنے سے عذاب میں خفت ہوگی، یہ متعارض ہوا۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایسی تخفیف نہ ہوگی جس سے راحت محسوس ہو۔ باقی مطلب ان پر آیت کا نہیں کہ سب کفار کو برابر عذاب ہوگا اور کسی کا عذاب کسی سے کم نہ ہوگا۔ کیونکہ جس طرح معذبین کے اعمال مراتب میں متفاوت ہیں کہ بعضے کافر کفر میں اشد اور اخلاق میں سخت ہیں۔ اور بعضے ایسے نہیں۔ اسی طرح عذاب کے بھی درجات مختلف ہیں۔ یہ نہیں کہ فرعون اور شداد اور غرود کے برابر اس کافر کو بھی عذاب ہوگا۔ جو عزیز مسکین مظلوم تھا تو جیسے کفر کے مراتب اور کفار کے درجات ہیں۔ اسی فرق مراتب کے اعتبار سے عذاب میں بھی فرق ہوگا کہ ایک کو جتنا عذاب ہوگا کسی کو اس کا صنف ہوگا اور کسی کو صنفین، اور یہ سب فرق قرآن میں آئی ہے۔ البتہ جس کے لئے جتنا عذاب دخول جہنم کے وقت تجویز ہو جائے گا پھر اس میں کمی نہ ہوگی اور یہ دوسرا جواب ہے پس مطلق خفت کی نفی نہیں ہے بلکہ عذاب مجوز میں خفت کی نفی ہے۔

بہر حال مولانا کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے۔

اب تیسرا جواب سنئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت سے یہ احتمال ہی نہ تھا کہ کوئی مسلمان کسی کافر کو نقصان پہنچائے گا اگر کرے گا تو اپنے بھائی ہی کی گلو تراشی کرے گا کیونکہ عام طور پر اس وقت لوگوں کا خیال یہ تھا۔ ع۔

ع۔ خانہ دوستان بردب در دشمنان مکوب۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس سے بھی روک دیا۔ جس سے اب خانہ دوستان بردب کی بھی گنجائش نہ رہی۔ اس کی اس لئے تشریح کر دی کہ شاید اس قول سے ظاہر ہو عمل کرنے لگے۔ اب ایسے شخص کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگر وہ دوست بھی اس پر عمل کرے اور جو کچھ آپ کے گھر سے لائے ہیں وہ بھی اور جو آپ کے گھر کا ہے وہ بھی سب لیجائے تو کیا آپ کو گوارا کرنا پڑے گا اگر گوارا نہیں تو ایسا ہی دوسرے کو بھی سمجھ لیجئے۔ (اسرار العبادۃ ص ۱)

۵۰۔ تقدیر پر اعتقاد رکھنے سے دنیا میں راحت رہتی ہے اور انکار سے پریشانی بڑھتی ہے!

اعتقاد تقدیر کی تعلیم سے فلاح آخرت کے ساتھ یہ بھی مقصود ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں راحت رہے کہ کسی چیز کے فوت ہونے سے ان کو زیادہ رنج نہ ہو کرے۔ بلکہ سمجھ کر کہ تقدیر میں یوں ہی تھا۔ صبر و شکر سے کام لیا کریں۔ اب آپ دیکھ لیں کہ اعتقاد تقدیر کا یہ اثر ہمارے اندر کتنا ہے۔ سو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہم مصائب و حوادث میں صنف قلب اور قلت اعتقاد کی وجہ سے ایسے ہی پریشان ہو جاتے ہیں جیسا ایک دہری یا منکر تقدیر پریشان ہوتا ہے۔

صاحبو! اگر تقدیر پر کامل اعتقاد ہے تو اس کا اثر ظاہر میں بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔ یاد رکھو محض زبان سے اتنا کہہ دینا تو آسان ہے کہ تم کو تقدیر پر اعتقاد ہے۔ مگر امتحان کے وقت ہر شخص کی قلبی کھل جاتی ہے اور امتحان کا وقت یہی ہے جب کہ مصائب و حوادث کا نزول ہو رہا ہو اور کسی کی قلبی بھی نہ کھلے۔ تب بھی حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے وہاں تو کوئی حیلہ نہیں چل سکتا۔

خلق را گم کر بفریے تمام
در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کار با با خلق آری جملہ راست
با خدا تزییر۔ جیلہ کے رواست
کار با اور راست باید داشتن
راست اخلاص و صدق افزاشتن

صاحبو! جو شخص سچ مچ تقدیر کا معتقد ہے اس کو رنج و غم کبھی نہیں ہوتا اور جو کبھی کبھی آپ ان کو مصائب میں دیکھتے ہیں یہ نظر بد ہے۔ بچانے کے لئے صورت رنج و غم ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں۔

لحم البشري في الدنيا والآخرة۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ہم اس پس کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں ہم کو بے چینی ہی منظور ہے تو یہ شخص قابل خطاب نہیں پھر تم کو جب جانے کہ یہ لوگ دنیا کی چیزوں سے بھی صبر کر لیتے مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ چار پیسوں سے بھی صبر نہیں اور آخرت کے بارے میں ایسی ہمت ہے کہ وہاں کی راحت اور دنیا کی حیا طیبہ سے صبر ہے اس کا نام صوفیہ کے محاورات میں صبر فرعون ہے۔ مولانا اس کی نکات فرماتے ہیں :-

ایک صبت نیست از فرزند وزن
مہر چوں داری زرب ذوالمن
اے کہ صبت نیست از دنیائے
مہر چوں داری ز منہ الما ہدون

(خیر الحیوۃ و خیر المات منہا)

۵۔ روح کو موت نہیں آتی جسم عنصری کو آتی ہے

یاد رکھو موت صرف جسم عنصری کو آتی ہے روح کو موت نہیں آتی بلکہ موت سے صرف اس کا تعلق جسم عنصری سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اب اس کے بعد یہ سمجھو کہ لذات سے منقطع ہونے والا کون ہے کیا آپ کے نزدیک یہ بدن ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ روح منتفع و متلذذ ہوتی ہے اور جسم اس کے لئے بمنزلہ آلہ و مرکب کے ہے اور یہ روح موت کے بعد بھی علیٰ حالہ باقی رہتا ہے۔ بلکہ اب اس کی قوت پہلے سے زیادہ ہو جاتی ہے تو موت کے بعد وہ اس عالم کے لذات سے متلذذ ہوتی ہے۔ اور اگر تم یہ سمجھو کہ میری حقیقت تو محض جسم کی ہے۔ تو اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے کوئی گدھا پر سوار ہو کر یوں سمجھے کہ میں گدھا ہوں۔ سو اس کا تو کوئی علاج نہیں صاحب آپ کی حقیقت وہ ہے جس کو آپ ”میں“ تغیر کرتے ہیں کہ میں نے یہ کیا میں نے وہ کیا۔ اب آپ غور کیجئے کہ اس ”میں“ کا مصداق کیا چیز ہے؟ کیا آنکھ، نازک یا منہ اور ہاتھ پیر کو ”میں“ کا مصداق کہہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ در نہ چاہیے کہ ان اعضاء کے جاتے رہے سے انسان ہی جاتا رہے اور یہ غلط ہے۔ رہے اور اعضاء شریفہ اور قوائے شریفہ جیسے قلب اور عقل وغیرہ ممکن ہے کہ آپ ان کو ”میں“ کا مصداق کہیں، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اس کا مصداق نہیں ہے۔ کیونکہ آپ ان کو اپنی طرف مضاف کرتے ہیں کہ میرا دل کمزور ہو گیا یا میری عقل میں یوں آتا

ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اضافت علامت مغائرت ہے تو معلوم ہوا کہ یہ بھی آپ کی حقیقت نہیں بلکہ حقیقت آپ کی روح ہے اور گودہاں بھی اضافت ہوتی ہے کہ میری روح مگر چونکہ مستقل دلائل سے ثابت ہے کہ یہ حقیقت ہے اس لئے یہ اضافت مجاز ہے۔ اور دوسرے اعضاء و قویٰ میں کوئی ایسی دلیل نہیں بلکہ خلاف پر دلیل قائم ہے۔ چنانچہ ایک زمانہ میں بچپن میں عقل نہیں ہوتی اور آپ ہوتے ہیں۔ ایک وقت میں یعنی بعد مدت قلب نہ رہے گا اور آپ ہوں گے صاف دلیل ہے کہ آپ کی حقیقت یہ سب چیزیں نہیں۔ اس لئے یہ اضافت حقیقہ ہے۔

بہر حال آپ کی حقیقت روح ہے اور اس پر موت نہیں آتی بلکہ وہ بجنم موت کے بعد اپنے حال رہتی ہے اور اب بجائے اس جسم کے جو موت کے بعد فنا اور شکستہ ہو جاتا ہے۔ روح کا مرکب دوسرا جسم بنتا ہے جس کو جسم مثالی کہتے ہیں۔ اب روح اس جسم کے ذریعے سے سارے انتفاعات و تلذذات حاصل کرتی ہے اور یہ جسم مثالی وہ جسم ہے جس کو تکمیل اہل ظاہر روح کہتے ہیں یعنی موت کے وقت جو چیز جسم عنصری سے الگ ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے وہ جسم ہے اور یہ بھی مادی چیز ہے مگر اس کا مادہ لطیف ہے۔ اور اس کو اس جسم عنصری کے ساتھ ایسا حلولی تعلق ہے جیسا جسم تعلیمی کا تعلق جسم طبعی کے ساتھ حکماء نے بیان کیا ہے یعنی وہ جسم مقدار اور سمیت و شکل میں بالکل جسم عنصری کے برابر ہے۔ اور وجہ تشبیہ یہی ہے در نہ جسم تعلیمی تو عرض ہے اور نہ جوہر۔ اور یہ جسم اس وقت یعنی زندگی میں اس کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے اور موت کے وقت وہ الگ ہو جاتا ہے یہی جسم مثالی ہے جو موت کے بعد روح حقیقی کا مرکب بنتا ہے اور یہ جسم مثالی گومادی ہے مگر اس جسم سے زیادہ لطیف و قویٰ ہے اور روح حقیقی جو حقیقت میں انسان ہے وہ مادہ سے بالکل مجرد ہے۔ وہ نہ اس وقت جسم کے اندر ہے نہ موت کے وقت اس سے الگ ہو بلکہ وہ تو محض جسم کی مدبر ہے جو اب بھی بدن سے الگ ہی ہے اور اس کی تدبیر کر رہی ہے اور گوتکملین نے روح کے مجرد کا انکار کیا ہے مگر اس بارے میں فلاسفہ کا قول راجح ہے دلائل سے قوت انہی کے قول کو ہے اور صوفیہ کا کشف بھی اسی کے موافق ہے کہ روح حقیقی مادہ سے مجرد ہے۔ البتہ فلاسفہ کا اس کو قدیم کہنا جیسا قدماء کا قول ہے یا حادث بعد حدوث البدن کہنا جیسا مشائیین کا قول ہے یہ بالکل غلط اور خلاف نصوص ہے اور تکمیلین نے جس چیز کو روح سمجھ کر مادی کہلے وہ دراصل روح حقیقی نہیں بلکہ جسم ہے جو مرکب روح ہے۔ غرض یہ ثابت ثابت ہو گئی کہ انسان میں جو اصل چیز ہے۔ وہ حقیقت میں وہی انسان ہے موت کے بعد وہ اپنے حال پر رہتا ہے اس کی قوت

وصفات میں کچھ کی نہیں آتی بلکہ پہلے سے کچھ ترقی ہو جاتی ہے۔
اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ روح کو موت نہیں آتی مگر جسم سے تو تعلق منقطع ہو جاتا ہے تو جو
اتفاقات روح سے تنہا نہیں ہو سکتے تو اب وہ نہ ہو سکیں گے۔ اس کا جواب بھی معلوم ہو گیا کہ موت
کے بعد جسم مثالی مرکب بنتا ہے جو اس جسم غفری سے لطیف اور قوی تر ہے وہ سب لذات سے
منتفع ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں یہاں کی لذات پتھر ہیں اور روح ان سے متلذذ ہے۔ کھانا بھی۔ پینا
بھی، سیر و تماشا بھی، ملاقات احباب بھی، مکانات اور باغات بھی وغیرہ وغیرہ، اس حقیقت
کا مراقبہ کر کے موت کا دھیان کرو، تو انشاء اللہ موت سے وحشت نہ ہوگی بلکہ اس کا شوق پیدا ہوگا۔
اور یوں کہو گے۔

خرم اکں روز کزین منزل دیراں بردم راحت جاں طلبم وز پے جان بردم
نذر کردم کہ گر آید بسراں غم روزے تادریکدہ شاداں دغزل خواں بردم
(خیر الحیات ذخیرہ المات ص ۳۶ تا ۳۷)

۵۲۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت آخرت میں کفار کے لئے

ایک رحمت عامہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ اس امت کے اوپر سے سخت عذاب ٹل گئے
ہیں جو پہلی امتوں پر آئے تھے کہ بعض قومیں سور بندر بنادی گئیں۔ جس کا تختہ الٹ گیا۔ کسی پر آسمان
سے پتھر برسے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تو بکرت ہے کہ اس امت کے کفار پر ایسے عذاب
نہیں آتے۔

اور اس رحمت کو عام اس لئے کہا گیا کہ کفار کو بھی شامل ہے جو کہ امت دعوت میں داخل ہیں
اب یہاں یہ ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ دنیا میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب کے حق میں
رحمت عامہ ہونا ثابت ہو گیا۔ مگر آخرت میں کفار کے لئے آپ کی رحمت کیا ہوگی کیونکہ وہ کفار
ابداً آباد کے لئے جہنم میں رہیں گے۔ ان کے حق میں آپ کی رحمت کا ظہور کس طرح ہوگا۔ اسی طرح
جن مومنین کی بعد سزا کے منتظر ہوگی ان کے حق میں آپ کی رحمت کیا ظاہر ہوئی۔

اس کے جواب کے لئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے اس کے سمجھنے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا ظہور کفار کے حق میں آخرت میں بھی ہوگا۔ وہ مقدمہ یہ ہے کہ بھلا اگر کوئی
شخص بڑا سخت جرم کرے جس کی سزا میں وہ بیس سال کی سزائے قید کا مستحق ہو اور اس میں سے
کچھ تخفیف کر دی جائے تو یہ بھی رحمت ہوگی یا نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بہت سخت سزا کا مستحق
ہو اور اس میں سے کچھ تخفیف کر دی جائے تو یہ بھی رحمت ہوگی یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ دونوں صورتیں رحمت
میں داخل ہیں۔

اب سمجھئے کہ قیامت کے روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن گنہگار مسلمانوں کے لئے جو کہ جہنم میں
جائیں شفاعت فرمائیں گے۔ اگر یہ شفاعت نہ ہوئی تو ان کی میعاد اور زیادہ ہوئی۔ تو میعاد کی کمی یہ
رحمت سے ہوئی۔ کوئی ہزار برس کے عتاب کا مستحق تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے
اس میں کمی کر دی جاوے۔ مثلاً پانچ سو برس کے بعد وہ جہنم سے نکال دیا جاوے تو رحمت ہونا اس کا ظاہر
ہے۔ اور کفار کے حق میں یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میعاد میں کمی کر دی جاوے۔ عذاب تو ان کو ابداً آباد
تک ہوگا مگر بقول شیخ عبدالحق محدث دہلوی جو عنقریب آتا ہے عذاب میں تخفیف کے لئے حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں بھی شفاعت فرمائیں گے چنانچہ بعض کفار کے لئے حضور کی برکت
سے تخفیف عذاب کا ذکر تو صحاح میں بھی آتا ہے کہ صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ابوطالب
کو کچھ آپ کی خدمت سے نفع ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں نہ ہوتا ابوطالب
سر سے پاؤں تک آگ میں غرق ہوتے۔ مگر میری وجہ سے یہ ہوا کہ ان کو صرف دو جوتیاں آگ
کی پہنائی جائیں گی جس سے ان کا بھیجا مثل ہانڈی کے پکے گا اور اس پر بھی یہ سمجھیں گے کہ مجھ سے
زیادہ عذاب کسی کو نہیں۔ ابولہب کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ چونکہ انہوں نے حضور کی
ولادت شریفہ کی خوشی میں بشارت لانے والی باندی کو آزار دیا تھا۔ ہر پر کے دن ذرا سا
ٹھنڈا پانی پیئے کو مل جاتا ہے۔

بانی عام کفار کے حق میں تخفیف کی شفاعت مجھے کسی
کفار کے حق میں سفارش کی نوعیت حدیث سے تو معلوم نہیں ہوئی مگر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے
رحمۃ اللہ نے اپنی ایک کتاب اشوتہ اللغات میں لکھا ہے کہ قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کی شفاعت دس طرح کی ہوگی ان میں ایک شفاعت ایسی ہوگی کہ حضور عام کفار کے لئے
شفاعت فرمائیں گے کہ یہ لوگ جس عذاب کے مستحق ہیں اس میں کچھ کمی کر دی جاوے۔ چنانچہ آپ کی

برکت سے ان کے عذاب میں کمی کر دی جاوے گی، گو کم ہونے لگے بعد بھی وہ اس قدر سخت ہوگا کہ وہ اس کو بھی بہت سمجھیں گے۔ خدا محفوظ رکھے۔ وہاں تو ذرا سا عذاب بھی ایسا ہوگا کہ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ عذاب کسی کو نہیں۔ چنانچہ ابوطالب کو حالانکہ بہت ہی کم عذاب ہوگا۔ مگر وہ یہی سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو بھی عذاب نہیں تو گو کفار کو اس کی کا احساس نہ ہو مگر حضور کی طرف سے تو رحمت ہونے میں شک نہیں رہا آپ کی رحمت تو ان کے ساتھ بھی پائی گئی۔ اور چونکہ شیخ خبیب رحمہ اللہ نے بڑے محدث ہیں اس لئے انہوں نے جو یہ دس قسمیں شفاعت کی لکھی ہیں کسی حدیث سے معلوم کر کے لکھی ہوں گی تو ہم کو وہ حدیث نہیں ملی۔ مگر چونکہ شیخ کی نظر حدیث میں بہت دیس ہے اسلئے ان کا یہ قول قابل تسلیم ہے۔ اور شیخ کے اس قول پر یہ اشکال نہ کیا جاوے کہ یہ نص کے خلاف ہے قرآن میں تو کفار کے بارے میں ارشاد ہے لَا يَخْفَعُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يَنْظُرُونَ کہ کفار سے عذاب کم نہ کیا جاوے گا۔ اور شیخ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں تخفیف عذاب کی شفاعت فرمائیں گے، دونوں میں تضاد نہ ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ آیت کا یہ مطلب کہ جس قدر عذاب آخرت میں ان کے لئے طے ہوگا پھر اس سے کمی نہ کی جاوے گی اور یہ اسلئے ارشاد فرمایا گیا تاکہ کوئی آخرت کے عذاب کو دنیا کے عذاب پر قیاس نہ کرے کہ جس طرح دنیا کی آگ کا قاعدہ ہے کہ پہلی پہلی بہت تیزی کے ساتھ بھڑکتی ہے پھر کم ہوتے ہوتے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ ایسی جہنم کی آگ ہوگی کہ رفتہ رفتہ ہزار ہزار سال کے بعد اس کی تیزی کم ہو جائیگی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہاں کی آگ ایسی نہیں جیسی ادل دن میں تیز ہوگی ہمیشہ ایسی ہی رہیگی اور یہ مطلب نہیں ہے کہ جس عذاب کے وہ قانوناً مستحق ہوں گے اسی میں بھی کسی کی شفاعت سے بھی کمی نہ ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس قدر ان کے لئے عذاب طے ہو کر قرار پائے گا۔ وہ ہمیشہ ایک حال پر رہے گا۔ زمانہ دراز گزرنے سے اس میں کمی واقع نہ ہوگی۔ واللہ اعلم

(شکر النعمۃ بذکر الرحمة ص ۵۴۰ ملخصاً)

۵۳۔ مطیع اور غیر مطیع پر مصائب آنے میں

فرق ہے

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ باتیں بیماری مقدمہ وغیرہ نمازیوں کو پیش نہیں آتیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نہ بیماری میں تخصیص منازی اور غیر منازی کی ہے نہ مقدمہ میں، نہ اگر کسی مصیبت میں میں کہتا ہوں کہ مصائب بیشک پیش آتے ہیں ان کو بھی، اور ان کو بھی، مگر فرق ہے دونوں میں ان کے واسطے مصائب سزا ہیں اور ان کے لئے باعث رفعت مراتب اور موجب قرب ہیں۔

اسپر شاید کہا جائے کہ یہ تو دل کے سمجھنے کی بات ہے۔ اور من گھڑت ہے اس کا عکس بھی تو ممکن ہے۔ جب صورتہ دونوں جگہ یکساں ہیں تو وہ بھی اپنا دل اس طرح خوش کر سکتے ہیں کہ مصیبت جو آئی ہے تو کچھ برا نہیں۔ ہمارے درجے بلند ہوں گے۔ جیسے نمازیوں نے اسی طرح دل کو سمجھ لیا تھا، میں کہتا ہوں واقعیت کسی چیز کی من سمجھوتہ کرنے سے نہیں بدلتی۔ دعویٰ دونوں فرق اس کا کر سکتے ہیں کہ مصیبت ہمارے لئے رحمت ہے لیکن کسی علامت سے امر واقعی کا پتہ چل جائے تو بات طے ہو سکتی ہے کہ حق کس طرح ہے۔ وہ علامت یہ ہے کہ خاصہ ہے کہ مطیع پر جب مصیبت آتی ہے تو اس کو پریشانی نہیں ہوتی اور رحمت کی حقیقت یہی ہے۔ اور مصیبت کی حقیقت پریشانی ہے۔ اس کو کان میں رکھو اور دونوں منظر دیکھ لو۔ ایک یہی واقعہ کہ جس کو مصیبت کہا جاوے نمازی پر یعنی مطیع پر آوے تو اس کا اس کے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے اور وہی واقعہ عارضی پر آوے تو کیا ہوتا ہے زمین آسمان کا فرق ملے گا دونوں میں۔ اور ذرا سے غور سے نزاع رفع ہو جاوے گا عامی کا دل ٹوٹ جاتا ہے مصیبت میں اور مطیع کو ڈھارس رہتی ہے۔ کیونکہ اس کے دل کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہے۔ اور عامی کے دل کو خدا تعالیٰ سے تعلق حاصل نہیں۔ تعلق خدا مقوی قلب ہے اور خدا سے تعلق میں یہ اثر کیوں نہ ہو۔ ایک کلکڑے جس کو تعلق ہوتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ پھر جس کو تعلق خدا سے ہو وہ کیسے ڈرے گا اور اس کا دل کیوں ٹوٹے گا اور عامی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کا کوئی سہارا ہوتا۔ ڈرتا ڈرتا رہتا ہے۔ یہی تو فرق ہے پولیس اور ڈاکوؤں میں۔ مقابلہ کے وہ میدان میں دونوں موجود ہیں اور مارنے میں دونوں شریک ہیں۔ ظاہری نظر دیکھنے والا کہہ سکتا ہے کہ دونوں فرق ایک مصیبت میں گرفتار ہیں

یہ بھی مرہے ہیں اور وہ بھی مرہے ہیں تو کسی کو حق پر اور کسی کو ناحق پر کیسے کہیں گے لیکن ذرا غور کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پولیس مر ضرور رہی ہے مگر دل ان کے مضبوط ہیں اور ان کو ڈھاکس بندھی ہوئی ہے۔ اور ڈاکو ہمت پولیس سے بھی زیادہ کر رہے ہیں مگر دل اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں اور پاؤں نہیں جھٹے۔ اور موقع دیکھتے ہیں کہ اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں یہ اثر اسی کا ہے کہ پولیس مطیع ہے اور حاکم سے تعلق ہے اور ڈاکو عاصی ہے۔ اس کے دل کو کسی کا سہارا نہیں۔ اس مثال سے عاصی اور مطیع کی حالتوں کا فرق بہت و وضوح کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے۔ نمازی اور مطیع پر جب مصیبت آتی ہے تو وہ صبر و سکون کے ساتھ رہتا ہے اور کوئی یہودہ کلمہ تک اس کے منہ سے نہیں نکلتا۔ اور عاصی پر جب مصیبت آتی ہے تو پوری قیامت ہوتی ہے چیخ پکار اور رد و ناپسٹیاں جاتا ہے زبان سے یہودہ کلمات جھٹاتا ہے اور دل میں شکایت ہوتی ہے یہ مصیبت جس کو مصیبت کہنا چاہیے یہ کھلی ہوئی علامت ہے اس بات کی کہ تعلق مع اللہ باقی نہیں۔ اور مطیع کا تعلق باقی ہے جو جسمانی تکلیف ہے۔ اور باق قضا طبعی اس کا احساس کرتا ہے اور رنج پاتا ہے مگر دل اندر سے تازہ ہے۔

ایک پادری نے لکھا ہے کہ مسلمان اپنے خدا سے شرمندہ نہیں ہیں اس واسطے شگفتہ رہتے ہیں۔

عاصی اور مطیع کی حالت میں فرق ضرور ہوتا ہے بلکہ ادنیٰ مسلمان کی حالت میں بھی کافر سے فرق ہوتا ہے کیونکہ تعلق مع اللہ کچھ نہ کچھ ہر مسلمان کو حاصل ہے جس کی وجہ سے اس کی حالت سے ضرور فرق ہوتا ہے کیونکہ تعلق مع اللہ کچھ نہ کچھ ہر مسلمان کو حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی حالت کو اس شخص کی حالت سے ضرور فرق ہوتا ہے جس کو بالکل تعلق نہیں یعنی کافر۔ آپ کو نسبت حق سے ضرور حاصل ہے کو آپ کو خبر نہیں ہے

یک سبد پر ناں ترابرفرق سر تو ہی جوئی لب ناں در بدر

تا بزا و خرق ہستی اندر آب و ز عیش و زجوع گشتی خراب

ہماری وہ حالت ہے کہ ساری دولتیں حاصل ہیں۔ مگر عادت ہو گئی ہے بھیک مانگنے کی ان کی طرف توجہ نہیں اور ادھر ادھر ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ عیڑوں کی تقلید کرتے ہیں۔ عقائد میں خیالات میں، معاشرت میں، صاحبو! ہمارے پاس تو اتنی دولتیں ہیں کہ دوڑے یہیں سے لے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم ان سے متمتع نہیں ہوتے اور ان سب دولتوں کی اصل تعلق مع اللہ

ہے۔ اگر ہم اس سے کام لیں تو کبھی پریشانی نہ ہو اللہ والا کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ دیکھئے سب سے بڑھ کر حادثہ موت کا ہے اور دیگر مصائب جو خوف و غم ہیں تو اس وجہ سے ہیں کہ مقدمہ موت میں مگر اہل اللہ کی حالت خود موت کے متعلق یہ ہے کہ بجائے پریشانی کے الٹی راحت ہوتی ہے۔ انہوں نے اس کو بھی ایک کھیل سمجھ رکھا ہے جس کے نام سے دنیا بھاگتی پھرتی ہے۔ ایک صاحب موت کی آرزو میں کہتے ہیں کہ

خرم آن روز کزین منزل ویاں بروم راحت جاں طلبم در پے جانا بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر این غم روزے تادریکدہ شاداں و غز نخواں بروم
(الظاہر ص ۲۷)

۵۴۔ قرآن کریم میں ہر پہلو کی رعایت ہے

قرآن کریم میں ہر پہلو کی ایسی رعایت ہے کہ کسی کلام میں ویسی رعایت نہیں ہے قرآن میں صرف مضابطہ کو پورا نہیں کیا گیا۔ اس مضمون کو آپ سہولت سے یوں سمجھیں گے کہ حکام و قسمر کے ہیں۔ ایک وہ جو مضابطہ کے پابند ہیں۔ مضابطہ کی رو سے جو کام ان پر واجب ہے وہ کر دیا اور قانون کے موافق رعایا پر احکام لازم کر دیے ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ دشوار احکام کو قانون سے خارج کریں یا ان کے سہل و آسان کرنے کی تدبیر تائیں۔ دوسرے وہ حکام ہیں جن کو رعایا سے محبت ہوتی ہے اور مخلوق کو راحت پہونچانا چاہتے ہیں اور حتیٰ الامکان قانون میں کوئی دشوار حکم داخل نہیں کرتے اور اگر کسی مصلحت سے کوئی دشوار حکم رکھتے بھی ہیں تو رعایا کو اس کے سہل کرنے کی تدبیر بھی بتلاتے ہیں اور اس تجویز میں ان پر قہر ضرور ہوتا ہے۔ مگر یہ شفقت پر مبنی ہے۔ اتنی رعایتیں وہی حاکم کر سکتا ہے جس کو رعایا پر شفقت ہو۔ اسی طرح ایک اور مثال سمجھئے کہ نصیحت کرنے والا ایک تو استاد ہوتا ہے اور ایک باپ ہوتا ہے باپ کی نصیحت میں عام لوگوں کی نصیحت سے فرق ہوتا ہے۔ استاد تو مضابطہ پوری کر دیتا مگر باپ مضابطہ پوری نہیں کر سکتا۔ وہ نصیحت کرتے ہوئے اس کا خیال رکھتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کر دے جو اس کے دل میں گھر کرے۔ کیونکہ وہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ بیٹے کی اصلاح ہو جائے اور اس میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اور اگر وہ کوئی مشکل کام بھی بتلاتا ہے تو اس کا طریقہ وہ

اختیار کرتا ہے جس سے بیٹے کو عمل آسان ہو جاوے۔ اور ان سب رعایتوں کا منشا وہی شفقت ہے۔ شفقت ہی کے ساتھ تمام پہلوؤں کی رعایت کی جاسکتی ہے اور اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کے وقت کبھی بے ترتیب بھی ہو جاتا ہے مثلاً باپ بیٹے کو کھانا دیتے ہوئے نصیحت کرے کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس مضمون پر وہ مفصل گفتگو کر رہا ہو۔ اسی درمیان میں اس نے دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سالقہ کھانے کو لیا ہے تو وہ فوراً نصیحت کو قطع کر کے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے اس کے بعد پھر پہلی باپ پر گفتگو شروع کر دے گا اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے۔ بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر۔ مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام قرب و مرتبط کلام سے افضل ہے۔ شفقت کا مقتضایہ یہی ہے کہ ایک بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے۔ دوسری بات کو بیچ میں رکھ کر پھر پہلی بات کو پورا کرے۔ یہی راز ہے اس کا کہ خدا تعالیٰ کا کلام ظاہر میں کہیں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے۔ اس ظاہری بے ربطی کا منشا شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باپ کا کوئی مضمون اس میں نہ آسکے بلکہ وہ ایک مضمون کو بیان فرماتے ہوئے اگر کسی دوسرے امر پر تنبیہ کی ضرورت دیکھتے ہیں تو شفقت کی وجہ سے درمیان میں فوراً اس پر بھی تنبیہ فرما دیتے ہیں اس کے بعد پھر پہلا مضمون شروع ہو جاتا ہے چنانچہ ایک آیت مجھے یاد آتی ہے جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے۔

قیامت کا حال | سورہ قیامہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اس وقت بڑا پریشان ہوگا اور بھاگے گا موقوفہ ڈھونڈے گا۔ اپنے اعمال پر اڑے اطلاع ہوگی۔ اس روز اس کو سب اگلے پچھلے کئے ہوئے کام سب جتلا دیے جائیں گے۔ پھر فرماتے ہیں۔ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۖ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذَ يَوْمِكَ يَٰمُنِ الْإِنْسَانُ كَآفًا ۚ اے انسان اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلائے ہوئے قوت نہ ہوگا۔ بلکہ اس دن انسان اپنے نفس (کے احوال و اعمال) سے خوب واقف ہے (کیونکہ اس وقت حقائق کا انکشاف ضروری ہو جائے گا) اگرچہ وہ (بات حق تعالیٰ کی) کتنے ہی بہانے بنائیے۔ جیسے کفار کہیں گے واللہ ہم تو مشرک نہ تھے مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں۔

عنرض انسان اس روز ایسے سب احوال کو جانتا ہوگا اسلئے یہ جتنا نا محض قطع

جواب اور اتمام حجت اور دھمکی کے لئے ہوگا نہ کہ یاد دہانی کے لئے۔ یہاں تک توقیامت ہی کے لئے متعلق مضمون ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔ لَا تَحْزَنْ بِمَا لَاقَاكَ لِيَتَعَجَّلَ بِكَ إِنَّا عَلَيْنَا جَمْعُهُمْ وَفَرَّانَا خِذَا فَرَّانَاهُ خَا تَتَّحِ حُزْنُ أَهْلِنَا شَمَّ إِنَّا عَلَيْنَا بَيِّنَاتٌ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن نازل ہوتے ہوئے اس کے یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے۔ ہمارے ذمہ ہے آپ کے دل میں قرآن کا جمادینا اور زبان سے پڑھواینا۔ تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتے کی قرأت کا اتباع کیجئے۔ پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ کو قرآن کا مطلب بھی بیان کر دیں گے۔ اس کے بعد پھر قیامت کا مضمون ہے۔ كَلَّا بَلْ يَحْبِبُونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو پھر فرماتے ہیں وَجْهَ يَوْمَئِذٍ نَّاهِيَةٌ اِنِّي رَبِّهَا نَاطِلَةٌ بعضوں کے چہرے اس دن تردنازہ ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے انہ تو راہِ نَجْوٰی پر لپکتے ہیں۔ اس سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی اس کا ذکر ہے اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے لئے زبان بیان نہ دیا کیجئے۔ لوگ اس مقام کے ربط میں تھک تھک گئے ہیں اور بہت سی توجیہات بیان کی ہیں مگر سب میں تکلف ہے اور کسی نے خوب کہا ہے۔

”کلامیکہ محتاج یعنی باشد لایعنی است“

تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں موقع ہے۔ صاحبو! اس کا دہی موقع ہے جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس کے مفسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا لقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا۔ یہ کیا حرکت ہے، لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے۔ لیکن جواب ہوا ہو گا وہ جانے کہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا باپ نے فرط شفقت سے درمیان کلام میں اس پر بھی تنبیہ کر دی۔

اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے کہ کہیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں جلدی جلدی ساتھ پڑھ رہے تھے تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا کہ آپ یاد کرنے کی نگر نہ کریں یہ کام ہم نے اپنے ذمے

لیا ہے۔ آپ نے فکر ہو کر سنتے رہا کریں۔ قرآن آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائے گا تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہوتا تو یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل بنتی مگر پھر بھی باوجود اس کے ایک مستقل ربط بھی ہے اور یہ خدا کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے۔
(سبیل النجاح ص ۱۰۱)

۵۵۔ قرآن پاک کی آیتوں میں باہم ربط ہے اور مفسرین کا بیان درست ہے۔

اس کا وجود یہ ہے کہ قرآن میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے اور شفقت کا طرز اختیار کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اسلئے مفسرین کے بیان کردہ روابط خریج نہیں ہیں اور اس ربط کو ملحوظ فرمانے کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ ترتیب نزول آیات اور ہے اور ترتیب تلاوت اور مصحف اور ہے۔ یعنی قرآن کا نزول تو واقعات کے موافق ہوا کہ ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے متعلق ایک آیت نازل ہوئی۔ پھر دوسرا واقعہ پیش آیا تو دوسری آیت نازل ہوئی و علیٰ ہذا ترتیب نزول تو حسب واقعات ہے اگر تلاوت میں بھی یہی ترتیب رہتی تو واقعی ربط کی کوئی ضرورت نہ بنتی۔ لیکن ترتیب تلاوت خود جناب باری تعالیٰ عز اسمہ نے بدل دی یعنی حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی تو جبریل علیہ السلام حکم خداوندی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہتے کہ آیت کو مثلاً سورۃ بقرہ کی فلاں آیت کے بعد رکھا جاوے اور اس کو فلاں آیت کے بعد اور اس کو فلاں سورہ کے ساتھ و علیٰ ہذا۔

تو مصحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر نہیں بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کو بھی کسی آیت کے ساتھ ملایا گیا ہے دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت اور تعلق ضرور ہے۔ کیونکہ اب اگر اب بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہوتا تو ترتیب نزول کا بدلنا مفید نہ ہوگا۔

(سبیل النجاح ص ۹)

۵۶۔ تفسیر بالرائے تحریف معنوی ہے۔

آجکل ایک شخص نے سورۃ بقرہ کی تفسیر لکھی ہے وہ مفسر اس قابل ہے کہ بقرہ ہی کی طرح ذبح کر دیا جائے۔ ظالم نے تمام عبادات کو سیاسیات پر محمول کیا ہے کہ نماز روزہ سیاسیات کے واسطے ہے نماز میں ریڈ کی تعلیم ہے تاکہ اضر کی اطاعت کرنا آجائے اگر وہ اٹھے کو کہے تو اٹھو بیٹھے کو کہے تو بیٹھو، جھکنے کو کہے تو جھک جاؤ، اسی واسطے نماز میں امام مقرر کیا جاتا ہے تاکہ سب اس کے افعال کی اطاعت و اتباع کریں جس سے ریڈ کے وقت اضر کی اطاعت سہل ہوگی۔ روزہ اس واسطے مشروع ہے تاکہ جنگ میں فائدہ کا تحمل ہو سکے کیونکہ جنگ میں بعض دفعہ کھانے کو نہیں ملتا حج بھی اسی واسطے ہے تاکہ مسلمان سفر کے عادی ہوں اور گھر چھوڑنا ان پر گراں نہ رہے اور احرام بھی اسی واسطے ہے تاکہ ترک زینت کی عادت ہو۔ ایک لنگی ایک چادر میں سردی گرمی کے تحمل کے عادی ہوں وغیرہ وغیرہ گویا کوئی عبادت خدا کی یاد اور عبادت و بندگی کے لئے مشروع نہیں ہوئی۔ بس ساری شریعت میں ملگ گیری و سیاست کی تعلیم ہے۔ یہ اس مقولہ کا مصداق "کلامیک محتاج یعنی باشد لایسنی است۔"

کیونکہ نماز روزہ اور حج سے آج تک یہ مقصود کسی نے نہ سمجھا تھا یہ باتیں فرصت میں بیٹھ کر اس نے گھڑی ہیں۔ اور کھینچ تان کر مضمون کو ان پر منطبق کیا ہے جیسے بعض شعرا نے قرآن کی بعض آیتوں کو کھینچ تان کر اوزان شعر پر منطبق کیا ہے اور اس شخص نے یہ تفسیر لکھ کر گویا مخالفین اسلام کو یہ سبق پڑھایا ہے کہ وہ مسلمان کی نماز روزہ اور حج ذکوۃ کو بھی خطرہ کی نظر سے دیکھیں کیونکہ ان سب میں مقابلہ اعدا کا طریقہ سکھایا جاتا ہے۔ اور یہ نماز نہیں۔ بلکہ چاند ماری ہے مگر مسلمان ہیں کہ اس تفسیر پر پڑیں کیونکہ وہ چکلے کا غنڈر بھی ہوتی ہے اور جلد بھی خوبصورت ہے۔ اور آجکل کتاب کی خوبی اس میں رہ گئی ہے کہ عہدہ چھپی ہوئی ہوتا مثل خوبصورت ہوا اس لئے بہت لوگ اس کو خریدتے ہیں۔ اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے اندر کیا بھرا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک صندوق نقش و نگار سے مزین ہو اور اس کے اندر سانپ بند ہو۔ خریدنے والا اوپر کے نقش و نگار سے فریفتہ ہو کر اسے خریدتا ہے مگر جب کھولے گا اس وقت حقیقت منکشف ہوگی اور میں سچ کہتا ہوں کہ اس مصنف کا دل بھی خود جانتا ہے کہ نماز روزہ حج ذکوۃ

کے جو مقاصد اس تفسیر میں لکھے ہیں وہ قرآن کا مفہوم ہرگز نہیں۔ یہ محض ایجاد بندہ ہے جس سے محض یہ مقصود ہے کہ اس تحریک کی تائید قرآن سے کی جائے جس میں یہ شخص اور اس کی ایک جماعت ایک زمانہ میں پیش پیش تھے۔ قرآن کی تفسیر ہرگز مقصود نہیں تھی بلکہ مخلوق کو دھوکہ دینے کے لئے اس کو قرآن میں ٹھونسا گیا۔ سو یاد رہے۔

خلق را گیسرم کہ بصر بی تمام در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کار با با خلق آری جملہ راست با خدا تزییر و جملہ کے روست
یہ ممکن ہے کہ تم ان تادیلوں سے مخلوق کو دھوکہ میں ڈال دو۔ مگر خدا کے سامنے یہ تادیلیں
نہ چلیں گی۔ اس لئے۔

کار با اور راست باید داشتن رایت اخلاص و صدق و فراشتن
تادیل وہ کہ وہ خدا کے سامنے بھی بیان کر سکو۔

(ارضاء لعلی صہبہ دوم ص ۳)

۵۷۔ قرآن کریم سے متعلق شبہات دور کر نیکاطریق

شبہات کا یہ علاج نہیں کہ تم اپنی رائے سے ہر شبہ کو رفع کرو بلکہ اس کا اصل علاج یہ ہے کہ شبہات کے منشاء کا علاج کرو۔ ہر شبہ کو الگ الگ رفع کرنے میں درد سہی بھی اور اس سے سلسلہ شبہات کا ختم نہیں ہو سکتا منشاء کا علاج کرو انشاء اللہ سب ایک دم سے زائل ہو جائیں گے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے رات کو اندھیرے میں گھر کے اندر چوہے پھنچو نذر کو دتے پھرتے تھے گھر والا ایک ایک کو پکڑ کر نکالتا تھا مگر وہ پھر سب کے سب اندر آ جاتے تھے۔ ایک عاقل نے کہا کہ میاں یہ سب اندھیرے کی وجہ سے کو دتے پھرتے ہیں۔ تم لیمپ روشن کر دو، یہ سب خود ہی بھاگ جائیں گے پھر کوئی پاس نہ پھٹے گا۔ چنا پڑ لیمپ روشن کیا گیا اور سب کے سب ادھر ادھر اپنے اپنے بل میں گھس گئے۔

اسی طرح یہاں بھی سمجھو کہ یہ دس اوں شبہات جو دجی اور قرآن میں آپ کو پیش آتے ہیں ان کا منشاء ظلمت قلب ہے جس کا علاج یہ ہے کہ قلب میں نور پیدا کر لو پھر ایک شبہ بھی پاس نہ آئے گا اور وہ نور کیلئے ہے نور محبت ہے۔ حضرت! محبت و عشق وہ چیز ہے کہ جب یہ دل میں گھس جاتی ہے

تو پھر محبوب کے کسی حکم اور کسی قول و فعل میں کوئی شبہ اور کوئی دوسوہ پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ایک فرد فیہر فلسفی کسی طوائف پر عاشق ہو جاوے اور وہ اس سے یوں کہے کہ سر باز اکر پڑے اتار کر ننگے آؤ تو میں تم سے بات کروں گی ورنہ نہیں تو فلسفی صاحب فوراً اس کے لئے تیار ہو جائیں گے اور یہ بھی نہ پوچھیں گے کہ یہ اس میں تیری کیا مصلحت ہے؟ اب کوئی اس سے پوچھے کہ آپ کی وہ عقل اور فلسفیت اس طوائف کے سامنے کہاں چلی گئی۔ افسوس قرآن و حدیث کے مقابلے میں تو ساری فلسفیت و عقل ختم کی جاتی ہے اور ایک ادنیٰ مردار کے احکام میں چون دچرا اور لم و کیف سب رخصت ہو گیا۔ آخر اس کی کیا وجہ؟ یقیناً آپ یہی کہیں گے کہ اس کی وجہ محبت و عشق ہے۔

پس معلوم ہو گیا کہ خدا اور رسول کے احکام میں شبہات پیدا ہونے کی وجہ عدم محبت یا قلت محبت ہے اگر آپ کے دل میں نور محبت روشن ہوتا تو یہ سارے چوہے اور پھنچو نذر خود بخود بھاگ جاتے شیخ سعدیؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

ترا عشق پمچو خودی ز آب و گل رہا بدہمہ صبر و آرام دل -
اور جب ایک مخلوق عشق کا یہ اثر ہے تو خالق کے عشق کا اثر کیا کچھ ہونا چاہیے۔
عجب داری از سالکان طریق کہ باشند در بحر معنی عین -
و مادہم شرب الم در کشند و گریختن بینند دم در کشند -
مولانا فرماتے ہیں۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلی بود گوئے گشتن بہر ادا دل بود -

اور میں علما کو بھی متنبہ کرتا ہوں کہ علما کے عرفی اخلاق ہی نے عوام کو خراب کیا ہے کہ جہاں ان کے سامنے کسی نے شبہات بیان کئے اور یہ ہر شبہ کے مفصل جواب کو تیار ہو گئے۔ اسے اصلی جواب یہ ہے کہ مرض کو تشخیص کرو اور جرط کو اکھاڑو تم شاخوں چھانٹتے ہو اس سے کیا ہو گا ہے جب جرط موجود ہے تو چند روز میں ہزاروں نئے نئے پتے اور نکل آئیں گے۔ محقق تشخیص کر کے اصل مرض کا علاج کرتا ہے اور غیر محقق آثار کا علاج کرتا ہے میں نہایت پختگی سے دعوے کیساتھ کہتا ہوں کہ جن مسلمانوں کو آجکل مذہب میں شکوک و ادہام پیدا ہوتے ہیں ان کے اس مرض کا منشاء قلت محبت مع اللہ ہے ان کو اللہ رسول کے ساتھ محبت نہیں ہے اور محض برائے نام تعلق کو تعلق کہا جاتا ہے۔ اور تعلق مع اللہ کے حاصل ہونے کا واحد طریق صرف یہ ہے کہ اہل اللہ کی محبت حاصل کی جائے۔ اہل محبت کی صحبت میں یہ غاصیت ہے کہ اس سے بہت جلد محبت پیدا ہو جاتی ہے

جیسا کہ اہل غفلت کی صحبت سے غفلت جلدی پیدا ہوتی ہے پھر جب محبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہو جائے گا۔ یہ کم کیفیت باطل اور دس ادس و شبہات سب جاتے رہیں گے۔
میں علماء سے خیر خواہی کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم ان شہادت کے جواب میں کیوں اپنا دماغ تھکاؤ ہو۔ بس تم صرف ایک کام کرو کہ ان لوگوں کو اہل اللہ کی صحبت و محبت کا پتہ دو۔
(غایۃ النجاشی ص ۵)

۵۸۔ وجود صانع کی عقلی دلیل۔

فلسفی طریقہ پر وجود صانع کی دلیل یہ ہے کہ تمام عالم حادث ہے کیونکہ بہت سی چیزوں کا حدوث تو ہم کو مشاہد ہے اور جن کا حدوث مشاہد نہیں ہوا ان کے احوال کا تغیر و انقلاب بتلا رہا ہے کہ یہ حادث ہیں۔ کیونکہ محل حادث کا حادث ہوتا ہے۔
ابھی میں نے اخبار میں ایک امریکن ڈاکٹر ماہر سائنس کا قول پڑھا ہے کہ وہ لکھتا ہے کہ آفتاب کی روشنی میں بہت کمی آگئی ہے اور عنقریب اس کی روشنی زائل ہو کر یہ چراغ گل ہو جائے گا اور اس وقت دنیا میں اس قدر سردی پڑے گی کہ مخلوق کا زندہ رہنا محال رہے گا تمام عالم فنا ہو جائے گا۔
دہم اس خبر سے خوش ہوئے کہ اہل سائنس کو قرآن سے قیامت کی خبر کا یقین نہ ہوا تھا تو اب آلات رصد سے یقین آئے لگا۔

غرض اشیاء عالم کا تغیر و انقلاب پتہ دے رہا ہے کہ یہ سب حادث ہیں۔ قدیم نہیں۔ یعنی ان کا وجود دائمی اور ضروری نہیں۔ اور حادث کے لئے ممکن ہونا لازم ہے اور ممکن کے لئے کسی مرجح کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ممکن وہ ہے جس کا وجود عدم مادی ہو۔ یعنی نہ اس کے لئے موجود ہونا ضروری ہے نہ معدوم ہونا ضروری ہے اور جس کا وجود عدم وجود برابر ہو تو اس کے وجود کے لئے کوئی مرجح ہونا چاہیے۔ ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی اور ترجیح بلا مرجح باطل ہے۔

پھر اس مرجح میں گفتگو کی جائے گی کہ وہ ممکن ہے یا کچھ اور ہے اگر مرجح ممکن ہو تو اس کے لئے دو سکر مرجح کی ضرورت ہوگی اور چونکہ تسلسل محال ہے اس لئے کہیں نہ کہیں سلسلہ ختم کرنا پڑے گا۔ اور یہ ماننا پڑے گا کہ مرجح ایسی ذات ہے جو ممکن نہیں بلکہ واجب الوجود ہے اسی واجب الوجود کو ہم صانع اور خالق عالم کہتے ہیں اس ایک سوال یہ ہوگا کہ صانع کے ماننے کے بعد بھی ترجیح

بلا مرجح لازم آتی ہے کیونکہ صانع نے تمام مخلوقات کو ایک دم سے پیدا نہیں کیا۔ کسی کو آج سے ہزار برس پہلے سو برس پہلے پیدا کیا۔ اور کسی کو بعد میں پیدا کرے گا اور کسی کو حسین بنایا کسی کو بد شکل۔ کسی کو مرد کسی کو عورت۔ کسی کو امیر کسی کو غریب، کسی کو عاقل کسی کو احمق۔ تو یہاں مرجح کون ہے؟ زید کو آج کیوں پیدا کیا۔ کل کیوں نہیں کیا تھا؟ اور اس کو امیر کیوں بنایا عمر کی طرح غریب کیوں نہ بنایا۔ زید کو عمرو برکات ترجیح تھی؟ مثلاً اس سوال کا جواب حکماء اسلام کے سوا کوئی نہ دے سکا۔ فلاسفہ کی عقلیں یہاں آکر چکر کھانے لگیں۔ حکماء اسلام نے اس کا جواب دیا ہے کہ ان امور میں ارادہ واجب مرجح ہے اور ارادہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے مرجح ہے اس کے لئے کسی دوسرے مرجح کی ضرورت نہیں۔ اس پر حکماء یونان کی طرف سے ان کے معتمدوں نے یہ اشکال دار دیا ہے کہ بیشک یہ تو ہم نے مان لیا ہے کہ ارادہ کے لئے کسی مرجح کی ضرورت نہیں وہ خود اپنی ذات سے مرجح ہے۔ مگر یقیناً خدا تعالیٰ کا ارادہ قدیم ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ارادہ تو قدیم اور مراد حادث ہو۔ اس صورت میں تخلف مراد کا ارادہ سے لازم آتا ہے اور یہ محال ہے۔

اس کا جواب حکماء اسلام نے ایسا دیا ہے کہ حکماء یونان کے ایک اعتراض کا جواب | دانت کھٹے ہو گئے۔ فرمایا کہ صفات واجب اپنی ذات میں قدیم ہیں مگر ان کا تعلق ممکنات کے حادث ہے اور تخلف مراد کا تعلق ارادہ کے بعد محال ہے اس سے پہلے حال نہیں۔ پس ہم یہی کہیں گے کہ ارادہ کا تعلق مختلف طور سے ہوتا ہے۔ اس لئے مراد کا وجود بھی مختلف ازمناہ اور مختلف حالات کے ساتھ ہوتا ہے۔

یہ عقلی دلیل ہے وجود صانع کی۔ (غایت النجاشی ص ۲۱۲)

۵۹۔ عہد ریشاق پر شبہ کا جواب۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو اس عہد کی کیفیت بیشک یاد نہیں رہی لیکن اس کا مقصد سب کو یاد ہے اور مطلوب مقصود ہی کا یاد ہونا ہے۔ کیفیت تعلیم و تعلم کا یاد رہنا ضروری نہیں۔ دیکھو جن لوگوں نے کبھی فارسی پڑھی ہے ان کو یہ محفوظ ہے کہ آمدن کے معنی آنا، پس کیونکہ آمدنی کا سبق آج کل ہر شخص کو یاد ہے لیکن آپ ان سے یہ پوچھیں کہ آمدن کے معنی آپ کو کس دن اور کس جگہ پڑھائے گئے اور آمد نامہ آپ نے کون سے استاد سے پڑھا ہے۔ تو ان سوالات کا جواب

شاید ہزار میں ایک ہی آدمی دے سکے گا۔ کیونکہ باتیں کسی کو محفوظ نہیں رہتیں تو کیا ان کے زیادہ سے سے یہ کہا جائے گا کہ آمدنا پر ٹھنا فضول اور بیکار کیا۔ ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص یہ کہے گا کہ آمدنا نہ پڑھنے سے صرف مقصود یہ تھا کہ اس کا مضمون یاد رہے۔ کیفیت تعلیم و تعلم کا یاد رہنا مقصود نہ تھا۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ ميثاق الست سے مقصود یہ تھا کہ وجود صانع اور توحید صانع کا مضمون طبائع میں مرکوز ہو جائے کیفیت تعلیم کا محفوظ ہونا مقصود نہ تھا۔ سو بجز اللہ وجود اور توحید صانع ہر شخص کے دل میں مرکوز ہے اسی کا یہ اثر ہے کہ مصنوعات کو دیکھ کر ایک جاہل بدوی بھی صانع کے وجود پر استدلال کرتا ہے۔ اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ آمدنا کی جو تم نے مثال دی ہے تو وہاں ہزار میں ایک آدمی تو ایسا نکلتا ہے جس کو کیفیت تعلیم بھی یاد ہوتی ہے چنانچہ بعض قوی الکافظ اب بھی بتلا سکتے ہیں کہ ہم نے آمدنا کس سے پڑھا تھا اور کس مکان میں پڑھایا تھا۔ مگر ميثاق الست کی کیفیت یاد رکھنے والا تو کسی ہزار میں بھی ایک نہیں ملتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے یہاں بھی بعض قوی الکافظ ایسے موجود ہیں جن کو اس عہد کی کیفیت اب تک یاد ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی اس طرف اشارہ بھی فرماتے ہیں۔
الست اذ ازل یجھال شاں بخوش
بفریاد قالا بلی در خسرو شش۔

اس میں تو اجمالاً بتلایا گیا ہے کہ اس عہد کے یاد رکھنے والے اب موجود ہیں۔ اور بعض بزرگوں کے کلام میں اس سے زیادہ تفصیل موجود ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ہم کو یاد ہے کہ اس وقت ہماری دائیں طرف اور بائیں طرف فلاں تھا۔ اور انھیں بزرگوں کے کشف سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس وقت صفت بستہ نہ تھیں۔ بلکہ یوں ہی گڑ جمع تھیں جیسے میل میں اجتماع ہوا کرتا ہے پھر اس وقت جو لوگ باہم رد و رد ہو گئے ان میں تو طرفین سے محبت ہوتی ہے اور جو لوگ رد و پشت ہوئے کہ ایک کا منہ دوسرے کی پشت طرف تھا ان میں ایک طرف سے محبت اور ایک طرف سے اعراض ہوتا ہے اور جو پشت در پشت ہوئے ان میں طرفین سے انقباض و اغراض ہوتا ہے۔ اور ان بزرگ کے مذاق پر اس حدیث کا یہی محل ہے الادراج جنود مجنۃ فما تعارف منها ائتلف و تناف منها ما اختلف ایک اور بزرگ ارشاد ہے کہ جس وقت ازل میں ميثاق لیا گیا تو سب ارواح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ کھلیں جو آپ کہیں گے وہی سب کہیں گے چنانچہ سب سے پہلے حضور اقدس و سر در دو عالم (فداہ ابا نوح و امہاتنا) کی زبان مبارک سے بلی نکلا تو آپ کے

بعد سب نے بلی کہا صلی اللہ تعالیٰ علیہ علی اکرم و اصحابہ کما یحب ویرثی) تو حضرت ایک کو سب کو اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے۔ اس امت میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جو جنت اور دوزخ کی پیمائش تک کر کے ہیں کہ جنت کتنی بڑی ہے اس کے کتنے درجے ہیں۔ اسی طرح دوزخ کی تفصیل سیر کی اور پیمائش بھی کر لی۔ اور یہ سیر روحانی طریقہ پر تھی۔ (غایۃ النجا ص ۱۵ تا ۲۰)

۶۰۔ مال تدبیر سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ تقدیر سے حاصل ہوتا ہے

اگر کوئی یہ سمجھے کہ یہ تو میری تدبیر و سلیقہ سے حاصل ہوتا ہے جیسا کہ تارون نے کہا تھا قَالَ (تَعْلَمُ الْوَيْتِیْتُ) اعلیٰ علیہم حیندی تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان تدبیروں کو راست کس نے کیا کیونکہ بہت لوگ تم سے زیادہ تدبیریں کرتے ہیں مگر ان کو خاک بھی نہیں ملتا۔ دوطالعہ سلمیٰ، اے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ اساتذہ اور سب طلبہ پر سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں زید زیادہ لائق ہے اور وہ نمبر اول میں پاس ہوتا ہے مگر نتیجہ امتحان اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے کہ زید فیصل ہوتا ہے اور عمرو جو اس سے کم درجہ میں ہے پاس ہوتا ہے۔ بتلائیے عمر کی تدبیر کو کس نے راست کیا اور زید کو کس نے ناکام کیا اگر تدبیری مدار تھا تو زید کو نمبر اول ہونا چاہیے تھا مگر مشاہدہ بارہا اس کے خلاف ہوتا ہے اسی طرح دو شخص تجارت کرتے ہیں جن میں ایک تسلیم یافتہ اور ہوشیار ہے۔ دوسرا بے قوت جاہل ہے تدبیر کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم یافتہ کی تجارت بیوقوف سے زیادہ چلتی مگر مشاہدہ بارہا اس کے خلاف ہوتا ہے کہ جاہل کی تجارت بڑھ جاتی ہے اور ہوشیار تعلیم یافتہ کو نقصان بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ غور کریں گے تو زراعت اور ملازمت وغیرہ تمام امور میں ایسی صدہا نظائر دیکھیں گے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض تدبیر کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ تدبیر راست بھی ہو جائے اور یہ بات سوائے خدا کے کسی کے قبضہ میں نہیں در نہ اپنی تدبیر کا راست ہونا کون نہیں چاہتا۔ پھر سب کے سب مقصود میں کامیاب ہی ہو کر تے ناکام کوئی نہ رہتا۔ حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ سوتدبیر کرنے والوں میں میں تیس کامیاب ہوتے ہیں اور زیادہ ناکام ہوتے ہیں اب اگر یہ کامیاب ہونے والے اپنی کامیابی کو تدبیر کا ثمرہ سمجھیں تو یہ محض ان کی حماقت ہے۔ ان کو سوچنا چاہیے کہ

تدبیر تو وہ لوگ بھی کر رہے تھے جو ناکام ہوئے پھر اس کی کیا وجہ کہ وہ ناکام ہوئے اور ہم کامیاب ہو گئے یہ سب گفتگو ان لوگوں کے واسطے ہے جو سائنس کے معتقد ہیں اور مسلمان تو سب کے سب یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ محض تدبیر موثر نہیں بلکہ تدبیر کے راست ہونے کے لئے تقدیر کی موافقت بھی شرط ہے اور تقدیر مشیت الہیہ کا نام ہے۔

اہل سائنس ناز کرتے ہیں کہ ہم نے ایسی ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں جن کی پہلے لوگوں کو خبر بھی نہ تھی میں کہتا ہوں اگر حقیقت میں تم ہی موجد ہو تو بتلاؤ کہ جس ایجاد کو تم نے ایک سال کے غور و فکر کے بعد ظاہر کیا ہے اس میں ایک سال کیوں لگا اگر تمہارے قبضے میں سب کام تھا تو ایک ہی دن میں ایجاد کر لی ہوتی اور یہی ایک کیا بلکہ جو چیز ایجاد کرنا چاہو ایک دن بلکہ ایک ساعت بلکہ ایک منٹ میں ایجاد کر لیا کرو۔ کیونکہ سب کام تمہارے لئے ہیں پھر دیر کی کیا وجہ؟ مگر ظاہر ہے کہ یہ بات کسی کے قبضے میں نہیں کہ جب چاہے جو کچھ چاہے ایجاد کر لے مگر زائد از ایک غور و فکر کرنے کے بعد ایجاد سمجھ میں آتی ہے اب بتلاؤ جس وقت بات سمجھ میں آتی ہے وہ تمہارے اختیار سے سمجھ میں آتی یا بلا اختیار خود بخود دل میں آگئی؟ اگر کہو اختیار سے سمجھ میں آتی تو اختیار ایک سال پہلے بھی موجود تھا اس وقت کیوں نہ سمجھ لیا۔ یقیناً کہو گے کہ دفعۃً بلا اختیار سمجھ میں آئی ہے۔ بس یہی تقدیر ہے اور حق تعالیٰ ہی کے سمجھانے سے تمہارے ذہن میں یہ ایجاد آئی ہے کیونکہ ان کی عادت ہے کہ جب انسان کسی کام کے لئے کوشش کرتا ہے اور اپنی سی کوشش صرف کر دیتا ہے تو وہ اعدا دفرماتے ہیں۔

بہر حال پر کسی کام نہ نہیں کہ اپنے مال و متاع کو اپنی تدابیر کا نتیجہ اور عقل کا شرعہ سمجھے۔ ہر شخص کو عاجز و دلاچار ہو کر ماننا پڑے گا کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ دوسرے کا دیا ہوا ہے یعنی حق تعالیٰ کا۔ اب فرمائیے اگر آپ خدا کا دیا ہوا مال اللہ کے راستے میں حقوڑا سا صرف کر دیں اور اس کے بدلہ آپ کو ثواب اور نعمت عظمیٰ عطا کی جائے تو یہ نعمت مفت ملی یا نہیں؟ یقیناً مفت ملی۔

(مظاہر اللہ مولد ص ۱۳)

۶۱۔ اسلام نے سادگی سکھائی ہے !!!

غیر قوموں کے طریقہ پر چلنے کی تم کو کچھ ضرورت نہیں۔ بلکہ اسی سادگی کے طریقہ پر چلو جو اسلام نے ہم کو سکھایا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شام سے لشکر اسلام نے ایک عرضداشت بھیجی تھی کہ بیت المقدس فتح نہیں ہوتا۔ اور وہاں کا پادری یہ کہتا ہے کہ فاتح بیت المقدس کا حلیہ ہماری کتاب میں موجود ہے۔ تم اپنے خلیفہ کو بلا لو ہم دیکھ لیں گے اگر ان کا حلیہ ہوگا جو اس کتاب میں ہے تو ہم بدون لڑائی کے قلعہ کھول دیں گے ورنہ تم قیامت تک فتح نہیں کر سکتے۔ اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ امیر المؤمنین یہاں تشریف لے آئیں شاید یہ قلعہ بدون لڑائی کے فتح ہوا جائے۔ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے اس درخواست پر سفر کا ارادہ فرمایا اب غور فرمائیے کہ ایک شخص کا دورہ تھا جس کے نام سے کسریٰ اور ہر قل بھی تھرتے تھے۔ مگر کسریٰ یہ تھی کہ جس قلعے میں آپ نے سفر کیا تھا اس میں چند درجہ پوند تھے اور سواری کے لئے صرف ایک اونٹ تھا اس سے زیادہ کچھ نہ تھا جس پر کبھی آپ سوار ہوتے کبھی آپ کا غلام۔ آج کل ادنیٰ سے ادنیٰ ڈپٹی کے دورے پر بڑا سامان ہوتا ہے۔ یہاں خلیفہ اعظم کے دورے میں کچھ بھی سامان نہ تھا۔ پھر آج کل ادنیٰ حاکم کے دورے میں رعایا پریشان ہو جاتی ہے کیونکہ رعایا کو ان کے دورہ کیلئے رسد کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ یہاں خلیفہ کے دورہ سے ایک متنفس کو بھی تکلیف نہ ہوتی۔ کیونکہ ہر شخص کے ساتھ ایک بھیلے میں ستوا اور ایک بھیلے میں چھوہارے بندھے ہوئے تھے منزل پر اتر کر ستو گھوڑوں پی لیا کہ در چھوہارے کھائے۔ نہ رعایا سے مرغ لئے نہ انڈے نہ دودھ لیا نہ گھی۔ جب اس شان سے کبھی سوار کبھی پیدل چلتے ہوئے شام کے قریب پہنچے تو لشکر اسلام نے استقبال کرنا چاہا۔ اپنے مانعت کر دی۔ خاص خاص حضرات نے آپ کا استقبال کیا۔ اس وقت بعض صحابہ نے کہا کہ امیر المؤمنین اس وقت آپ دشمن کے ملک میں ہیں اور وہ لوگ آپ کو دیکھیں گے اسلئے مناسب ہے کہ اپنا یہ قلعہ اتار کر دوسرا قلعہ عمدہ سا پہن لیجئے اور اونٹ کی سواری چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہو جائیے تاکہ ان کی نظریں عزت ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھن قوم لاہو نابلہ اسلام ہم وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے ہماری عزت قیمتی لباس سے نہیں ہے بلکہ خدا کی اطاعت سے عزت ہے مگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے اصرار سے ان کا دل خوش کرنے کے لئے درخت

منظور کر لی چنانچہ ایک عمدہ قمیص لایا گیا جس کو پہن کر آپ گھوڑے پر سوار ہوئے دو چار ہی قدم چلے تھے کہ فوراً گھوڑے سے اتر پڑے اور فرمایا۔ میرے دوستو! تم اپنے بھائی عمر کو ہلاک ہی کرنا چاہا تھا واللہ میں دیکھتا ہوں کہ اس لباس اور اس سواری سے میرا دل بگڑنے لگا ہے تم میرا دی ہی ہو نہ لگا قمیص اور اونٹ لے آؤ میں اسی لباس میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر چلوں گا۔

اے صاحبو! جب ایسے شخص کا دل قیمتی لباس سے بگڑ رہا ہے تو ہمارا دل اور ہمارا منہ نہ بگڑ سکا۔ پھر ہم اپنے قلب کی نگہداشت سے اتنے غافل کیوں ہیں۔ اور ہم کس چیز سے مطمئن کر دیا ہے کہ ہمارے لئے کوئی لباس مضر نہیں۔ اور جو حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا۔ نحن قوم الا وفاق ہی ہے کہ اگر ہم خدا کے مطیع و فرمانبردار ہیں تو ہم سادہ لباس میں بھی معزز ہیں ورنہ قیمتی لباس سے بھی کچھ عزت نہیں ہو سکتی۔

ع ز عشق ناتمام با جمال یار مستغنی است !

باب درنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا
خوبصورت چہرہ کو زیب و زینت کی ضرورت نہیں وہ تو ہر لباس میں حسین ہے۔ بناوٹ کی احتیاج اس کو ہے جس کو قدرتی حسن نصیب نہ ہو۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اپنا وہی لباس پہن کر چلے اور اونٹ ہی پر سوار ہوئے اور اسی لباس اور سواری پر آپ کو دیکھ کر قلم کا دروازہ کھول دیا کیونکہ جب آپ فضیل شہر کے قریب پہنچے اور نصاریٰ کو اطلاع ہوئی کہ خلیفہ اسلام تشریف لے آئے تو ان کا بڑا پادری فضیل پر آیا اور کتاب کھولی کہ حضرت عمرؓ کے حلیہ کو ان اوصاف میں ملانے لگا جو کتاب میں لکھے ہوئے تھے اس میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ حضرت عمرؓ ایسے لباس اور ابسی سواری پر تشریف لادیں گے اس معمولی لباس ہی میں آپ کی عزت مخفی تھی۔

ع کہ آب چشمہ حیوان درون تاریکی است

اگر آپ قیمتی لباس میں آئے تو پیش گوئی پوری نہ ہوتی۔ چنانچہ پادری نے جب سارے اوصاف کتاب کے موافق دیکھ لئے تو وہ چچ مار مار کر گڑا اور کہا کہ جلدی سے قلم کا دروازہ کھلو۔ دیکھا یہی وہ شخص ہے جس کا لقب توراة میں حدید ہے، یہی خارج بیت المقدس ہے تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس طرح اشرقتانی نے بدون جنگ و جدال کے بیت المقدس کو فتح کر دیا۔

تو صاحبو! ہمیں تکلیف اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔ ہماری مولانا گنج مراد آبادیؒ عزت تو سادگی ہی میں ہے۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمنؒ گنج مراد آبادی اسی زمانہ میں ایک بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ سے لفٹنٹ گورنر نے ملنے کی اجازت

چاہی۔ یہاں سے اجازت ہو گئی۔ اس وقت تو آپ یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ لفٹنٹ گورنر کے واسطے سونے کی کرسی ہم کہاں سے لائیں گے۔ خدام نے عرض کیا کہ اس کی حاجت نہیں وہ چوکی کر سی پر بیٹھ سکتے ہیں چونکہ لفٹنٹ گورنر اس وقت یہاں ہو کر آرہے تھے اور یہاں کی مدارت اس کے مذاق کے موافق ہوتی ہے اسلئے یہ خیال ہوا مگر یہ سارے منصوبے پہلے ہی پہلے تھے۔ وقت پر کچھ بھی اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ آپ کو یہ بھی یاد رہا کہ لفٹنٹ گورنر کس دن آئیں گے چنانچہ جب دن آیا اور لفٹنٹ گورنر حضرت کی خانقاہ میں پہنچے تو وہاں کوئی تکلف نہ تھا۔ سب معمولی سامان تھا۔ بعد ملاقات لفٹنٹ گورنر نے کہا کہ حضرت ہمیں کچھ نصیحت و وصیت فرمائیں۔ ارشاد فرمایا ظلم کبھی نہ کرنا۔ پھر اس نے درخواست کی کہ ہم کو کچھ تبرک عطا فرمادیا جاوے۔ فرمایا میرے پاس کیا رکھا ہے۔ پھر خادم سے فرمایا کہ ارے دیکھنا، مٹھائی کی ہڈیاں ہیں۔ کچھ ہو تو ان کو دے دو۔ یہ مانگ رہے ہیں چنانچہ ہڈیاں سے مٹھائی کا چورا تھوڑا تھوڑا سب کو دے دیا گیا جس کو سب نے نہایت ادب سے لیا اور بڑے خوش خوش واپس ہوئے۔

تو دیکھئے مولانا کو اول تو اس زمانہ کے لحاظ سے کچھ تکلف کا خیال ہوا بھی تھا۔ مگر آخر میں یہ سارے منصوبہ مٹ گئے۔ اور وہی اسلامی سادگی رہ گئی اور اسی میں ان کی عظمت و عزت ظاہر ہوئی۔

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی !!
بگڑنے میں بھی زلف ان کی بنا کی
بے تکلفی | عرض ہم کو اسلامی سادگی پر رہنا چاہیے اگر کسی مسلمان کی خاطر سے کچھ تکلف بھی کیا جائے تو اس میں بھی اعتدال اسلامی کا لحاظ ضروری ہے۔ مبالغہ نہ کیا جائے اس میں ہماری عزت ہے۔ مگر آج کل مسلمان تقلید یورپ میں اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ ان کا لباس اور ان کا طرز معاشرت ان کا طریقہ تمدن و تجارت اختیار کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس میں مسلمان کی عزت نہیں۔

ایک بار میں بریلی میں تھا۔ بھائی سے ایجنٹ نے کہا کہ ہم آپ کے بھائی سے ملنا ایک واقعہ | چاہتے ہیں۔ بھائی نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا۔ ہم خود تو حکام سے نہیں ملتے لیکن جب وہ خود ملنا چاہتے ہیں تو اعراض کرنا برا ہے۔ آخر وہ حاکم ہیں۔ ہم کو حق حکومت کا لحاظ ضروری ہے میں چلوں گا۔ بھائی نے میرے واسطے قیمتی لباس کا اہتمام کرنا چاہا میں نے کہا ہرگز نہیں۔ جس لباس میں میں یہاں آیا ہوں۔ اسی میں جاؤں گا۔ چنانچہ میں اچن اور کرتیں

ان سے ملنے گیا وہ شاید غسل کر رہے تھے۔ ہم کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے عصر کی نماز کا وقت آگیا۔ اور میں نے اور بھائی نے ان کے بجلہ ہی میں نماز پڑھی۔ پھر وہ آکر ملے اور مجھ کو اپنی خاص کرسی پر بیٹھایا اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے اصرار بھی کیا مگر نہیں مانے۔ پھر نہایت احترام کے ساتھ باتیں کیں۔ اور محوڑی دیر میں رخصت ہو کر آگئے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں انگریزی لباس میں ملتا تو وہ عزت ہرگز نہ ہوتی جو اسلامی لباس میں ہوئی۔

ملکت میں مولوی عبد الجبار صاحب واسرائے سے عبا اور چوغہ پہن کر اور عمامہ باندھ کر ملے دوسرے روماء انگریزی لباس میں گئے تھے تو واسرائے نے ان سے کہا کہ مولوی صاحب آپ اس لباس میں شہزادے معلوم ہوتے ہیں یہ لباس بڑی راحت کا ہے۔ اور ہمارا لباس بہت تکلیف دہ ہے مگر ہم اپنی قومی وضع سے مجبور ہیں ہم کو آپ کے لباس پر بہت رشک آتا ہے۔

غرض ہم کو جو شریعت نے تعلیم دی ہے اس پر چلنا چاہیے۔

(مطالعہ الاموال ص ۲۲)

۶۲۔ علماء پر ایک اعتراض کا جواب

مجھے اس وقت اس سے توجہ نہیں کہ مسلمانوں کی ترقی۔۔۔ انگریزی پڑھنے پر موقوف ہے یا نہیں۔ فرض کر لیجئے کہ اس پر موقوف ہے اور بدو ان کے مسلمانوں کو ترقی نہیں ہو سکتی۔ مگر اس پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے انگریزی نہ پڑھنے کا الزام آیا علماء پر لگانا صحیح ہے یا غلط؟ سوچتے ہوں کہ کیا علماء صرف انگریزی ہی سے منع کرتے ہیں۔ یا علم دین حاصل کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں۔ اور بتلائیے کسی اور بات سے بھی منع کرتے ہیں؟ یقیناً وہ بہت سی باتوں سے منع کرتے ہیں مثلاً جھوٹ بولنے سے غیبت کرنے اور کسی کا حق دبانے سے اگر مسلمان انگریزی علماء کے منع کرنے سے نہیں پڑھے تو ان کے کہنے سے علم دین کیوں نہیں پڑھے۔ اگر یہ مولویوں کا اثر ہوتا تو دوسری باتوں میں بھی تو ہوتا صرف اسی ایک بات میں اثر کیوں ہوا۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمان انگریزی پڑھنے میں دوسری قوموں سے اپنی سستی کی وجہ سے پیچھے ہیں کہ ان سے محنت نہیں ہوتی۔ یا افلاس کی وجہ سے کہ ان کے پاس انگریزی تعلیم کے مصارف کے لئے رقم نہیں

علماء کے منع کرنے سے کوئی رکنا۔ الاماشار اللہ وہ نادروالنادر کا معدوم۔ مگر آج کل تو الزام ملنے میں علماء کی وہی حالت ہے جیسے ایک بھٹیاری کی حکایت ہے کہ حکایت تو غش ہے مگر مولانا نے اس سے بھی زیادہ غش حکایتیں مشنوی میں لکھی ہیں اور ان سے علوم نکالتے ہیں اس لئے بیان کرتا ہوں۔

ایک بھٹیاری کا قصہ

قصہ یہ ہے کہ ایک سپاہی سرائے میں بٹھا اور بھٹیاری کو کھانا پکانے کیلئے جنس دی۔ بھٹیاریاں اکثر جنس چرایاں کرتی ہیں اس لئے سپاہی اس کے پاس مسلط ہو کر بیٹھ گیا اس نے بہت کوشش کی کہ آنکھ پکا کر چراؤں مگر سپاہی نے موقع ہی نہ دیا۔ اب اس نے یہ تدبیر کی کہ جب سپاہی کھانا کھانے بیٹھا تو ساتھ میں اپنے لڑکے کو بھی بٹھا دیا کہ تو بھی کھالے۔ شریف آدمی کا دسترخوان پر سے کسی کو اٹھانا گوارا نہیں ہوتا۔ اس لئے سپاہی خاموش ہو گیا۔ اتفاق سے بھٹیاری کی رتخ زور سے صادر ہو گئی۔ اس کے خفت اتارنے کو اپنے بچے کے ایک دھپ لگایا کہ دو دو موٹے کھانا کھاتے ہوئے کیا کرتا ہے۔ سپاہی کو انتقام کا موقع ملا۔ اس نے قصداً رتخ صادر کی اور زور سے ایک چپٹ لڑکے کو رسید کیا اور کہا یاد رکھ کرے گا کوئی منکر پے طگا تو ہی۔ اس سے بھٹیاری کو بھی بتلا دیا کہ تیری حرکت کو میں سمجھ گیا ہوں بس یہی حال آج کل کے مسلمانوں نے علماء کا کر رکھا ہے کہ گمراہ کوئی مگر الزام انھیں پر ہو گا۔ انگریزی نہ پڑھنے کا الزام بھی مولویوں پر اور مسلمانوں کے تنزل و افلاس الزام بھی علماء پر اور جاہل اور مرتد ہونے کا الزام بھی ان ہی پر۔ مسلمانوں کی نا اتفاقی کا الزام بھی انھیں پر۔ (اصلاح ذات البین ص ۱۶)

۶۳۔ اس اعتراض کا جواب کہ شریعت قید محض ہے

ہمارے ترقی یافتہ بھائی آزادی کا بہت دم بھرتے ہیں۔ اور شریعت کو قید بتلاتے ہیں۔ ہم تو اس کا برعکس دیکھ رہے ہیں کہ لوگ مقید ہیں اور ہم آزاد ہیں۔ ایک صاحب کانپور میں کوٹ، پتلون، بوٹ، سوٹ سے کسے کسے میرے پاس آئے۔ وہ بیٹھنا چاہتے تھے۔ کرسی پر وہ سہولت سے بیٹھ جاتے لیکن ہم غریبوں کے پاس کرسی کہاں۔ ہمارے لئے تو چٹائی پر بیٹھنا فرما ہے۔ اب وہ کھڑے ہیں۔ لیکن کھڑے

کھڑے بات کیسے کریں۔ ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ چھڑی پر سہارا دے کر اور تاک لگا کر بھڑے گر پڑے۔ مجھے بڑی ہنسی آئی۔ بتلائیے کہ تہذیب ہے یا تعذیب۔ یہ آزادی ہے یا قید ہے۔ بیٹھنا تو مصیبت تھا، ای اٹھنا اور بھی زیادہ مصیبت ہوا۔ اور اگر چلتے چلتے گر پڑیں تو بس وہاں ہی پڑے رہتے ہوں گے۔ اور لیجئے اگر جنگل میں کھانے کا وقت آجاوے تو ہم دانے بھی چبا سکتے ہیں۔ اور روٹی ہو وہ بھی آدمیوں کی طرح بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔ اور ان کے لئے میز کرسی ہو کا نٹا ہو۔ چھری ہو۔ جب یہ کھانا تناول فرمائیں۔ کپڑوں میں ہماری یہ حالت ہے کہ پاجامہ نہ ہو لنگی باندھ لیں گے۔ اچکن نہ ہو کرتہ کافی ہے عمامہ نہ ہو ٹوپی ہی ہے۔ پھر ٹوپی بھی خواہ کسی کپڑے کی ہو۔ پھر عدد و شرعیہ کی بھی قید نہیں کہ پاجامہ کشمیرہ کا ہو۔ لٹھے کا ہو گاڑھے کا ہو۔ گزی کا ہو، کسی شے کا ہو۔ نہ ہونگی بھی کفایت کرتی ہے۔ ان کو یہ مصیبت ہے کہ پتلون کسی خاص کپڑے کا ہو، تو کوٹ بھی اس کے مناسب ہو۔ قمیص بھی اس کے مناسب ہو۔ در نہ فیشن کے خلاف ہے۔ کیوں صاحبو! یہ آزادی تو بڑی بھاری قید ہے۔ میں ان کی آزادی کی حقیقت عرض کرتا ہوں کہ یہ لوگ صرف خدا اور رسول ہے آزاد ہیں۔ باقی نہ کھانے میں آزاد ہیں نہ پہننے میں آزاد۔ ہر بات میں مقید ہیں۔ اگر آزاد ہیں تو خدا اور رسول سے آزاد ہیں۔ تو خاک پڑے ایسی آزادی پر اور بھاڑ میں جائے ایسی مطلق العنانی اور مبارک رہے ہم کو یہ قید۔ اگر ہم مقید ہیں تو ہماری قید کی تو یہ حالت ہے۔

اسیرش نخواہد رہائی نہ بند

ادریہ وہ قید ہے۔

گرد و صد زنجیر آری۔

عز زلف آن نگار مقبلہ۔

اور ہماری ایسی قید ہے کہ مدتوں کے بعد مجھ کو کسی کو ملا ہو اور اپنے لطف و کرم سے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ کر عاشق کو اپنے پاس بٹھالے اور اس کو نہ چھوڑے تو اس عاشق کی اس وقت کیا حالت ہوگی اس کی تو غیبت میں یہ حالت تھی کہ کہا کرتا تھا کہ

اگرچہ دور افت دم بدیں امید خرسندم

کہ شاد دوست من بار دگر جانان من گیسرد

بھلا اب کیا حال ہوگا۔ بلکہ اگر محبوب یہ کہے کہ اگر تم کو زور سے ہاتھ پکڑنے میں تکلیف ہو تو تمہارا ہاتھ چھوڑ دوں تو وہ عاشق یہ کہے گا کہ میرا ہاتھ کیا جان بھی نہ چھوڑو۔ اور کہے گا کہ

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغ

سردوستاں سلامت کہ توجہ آزمائی۔

پس جن کو خدا اور رسول کے ساتھ اس درجہ محبت ہے۔ کہا وہ اس قید کو ناگوار سمجھیں گے۔ جس کسی کو محبت ہوئی ہوگی۔ وہی اس کا لطف جانتا ہے۔ ہاں جس قلب میں محبت کا مذاق ہی نہ ہو۔ وہ کیا جانے کہ اس میں کیا لطف ہے۔ نامرد اصلی کیا جانے کہ عورت میں کیا لطف ہوتا ہے۔ ورنہ اگر مذاق ہے تو خدا جانتا ہے کہ ساری قیدیں آسان ہیں۔ وہ چوٹھے میں ڈالے گا ان قیدوں سے آزاد ہونے کو اور بھاڑ میں ڈالے گا ایسی عقل کو اور سر پر رکھے گا دیوانگی کو اسی دیوانگی کی نسبت مولانا فرماتے ہیں

ما اگر فلاش و گر دیواسنہ ایم

مست آن ساقی دآں پیمانہ ایم

ایسے شخص پر جو حالت بھی ہو، ناداری ہو بیماری ہو افلاس ہو اس کو سب گوارہ ہیں۔ اور اول تو ایسے شخص کو کوئی بھی مصیبت نہیں ہوتی۔ اور بالفرض اگر ہو بھی تو اس کو اس حالت میں بھی چین ہے سکون ہے اطمینان ہے۔ اس کی زندگی لطف کی زندگی ہے خواہ کسی حالت میں ہو حق تعالیٰ اسی حیات کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔ میں عمل صالح میں ذکر و لا نسی و لھو و لعی و فلیحیث و حیاء طیبہ۔ یعنی جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت، اس کو ہم پاکیزہ زندگی عطا فرماتے ہیں۔ ان کی ہر وقت تسلی کی جاتی ہے۔ ان کے قلب میں سکون اور چین کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ان کو ہر حال میں یہ کہا جاتا ہے

سوتے نویدی مرد کا امید باست

سوتے تاریکی مرد خورشید باست

پس اس قید میں اگر ان کو کچھ توب بھی ہو تو کچھ پرواہ نہیں۔ اور ایسی قید کے مقابلے میں جو آزادی ہے وہ نری نہل ہے اور سر اسر خیران ہے۔ خرمان ہے۔ ادریہ آزادی بس خدا اور رسول سے آزادی ہے ورنہ یہ لوگ سراپا مقید ہیں۔

(الاتفاق ص ۲)

۶۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج جہانی

پر شبہات کا جواب

ان منکرین معراج آسمانی کے پاس کچھ دلائل تو عقلی ہیں، کچھ نقلی، عقلی دلائل تو یہ ہیں کہ اس سے افلاک میں خرق و انقیاد لازم آتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ کے پاس خرق و انقیاد کے امتناع پر کوئی دلیل نہیں۔ اور جب وہ دلائل پیش کریں گے اس وقت انشاء اللہ ہم ان سب کا لغو ہونا ثابت کر دیں گے چنانچہ متکلمین اس سے فارغ ہو چکے ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا قصہ احادیث میں آتا ہے کہ آپ اتنی جلد سیڑھیاں سے فارغ ہو کر واپس آ گئے کہ صبح بھی نہ ہونے پائی تھی یہ محالات سے ہے کہ مکہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے ساتویں آسمان تک آپ سیر کریں اور یہ سارا قصہ ایک رات کے محوڑے سے حصہ میں ہو جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس میں استعمال کی کیا بات ہے ہاں استبعاد ہو سکتا ہے سو وہ بھی بطور الزام کے اس طرح مدفوع ہے کہ تمہارے نزدیک زمانہ حرکت فلک الافلاک کا نام ہے۔ چنانچہ رات دن کا آنا، طلوع و غروب کا ہونا، یہ سب حرکت فلک سے مرتبط ہے۔ اگر حرکت فلک موقوف ہو جائے تو جو وقت موجود ہو گا وہی رہے گا اگر رات موجود ہوگی تو رات ہی رہے گی، دن موجود ہوگا تو دن ہی رہے گا۔ تو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے اس رات حرکت فلک کو محوڑی دیر کے لئے موقوف کر دیا ہو اور اس میں کچھ تعجب نہیں۔ مسز زہمان کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے دنیا میں بھی یہ قاعدہ ہے کہ جب بادشاہ کی سواری نکلتی ہے تو سرگ پر دوسروں کا چلنا بند کر دیا جاتا ہے۔

معراج کا واقعہ ہم جب حیدر آباد گئے تو ایک دن دیکھا کہ پولیس کے سپاہی سڑک پر سناٹا چھاپا ہوا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ نواب صاحب کی سواری نکلنے والی ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے اگر آسمان اور چاند سورج سب کی حرکت کو اس رات کچھ دیر کے لئے بند کر دیا ہو کہ جو جہاں ہے وہیں رہے۔ پس آفتاب جس جگہ تھا اسی جگہ رہا اور ستارے جہاں تھے وہیں رہے۔ کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ پایا۔ اس میں کیا استبعاد

ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے فارغ ہو گئے۔ پھر فلک کو حرکت کی اجازت ہو گئی۔ تو اب ظاہر ہے کہ حرکت فلک جس جگہ سے موقوف ہوئی تھی وہیں سے شروع ہوئی۔ تو آپ کی سیر میں چاہے کتنا ہی وقت صرف ہوا ہو مگر دنیا والوں کے اعتبار سے سارا قصہ ایک ہی رات میں ہوا۔ کیونکہ حرکت اس وقت موقوف ہو چکی تھی۔ اب اگر کوئی دوام حرکت کا دعویٰ کرے تو وہ اس کے لازم کو ثابت کرے انشاء اللہ ایک بھی دلیل قائم نہ کر سکے گا

دوسرا عاشقانہ جواب اس اشکال کا مولانا نظامیؒ نے دیا ہے

تن او کہ صافی ترا زجان ماست اگر آمد و شد بیک دم رواست

یعنی یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خیال انسانی ذرا سی دیر میں بہت دور پہنچ جاتا ہے چنانچہ آپ اسی وقت عرش کا تصور کیجئے تو ایک منٹ سے بھی کم میں عرش پر خیال پہنچ جائے گا خیال کی حرکت بہت سریع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال رفیع کی ایک قوت ہے اور روح نہایت لطیف چیز ہے، وہ مادیت کی طرح کثیف نہیں ہے اس لئے اس کی سیر میں کوئی حاجب و مانع نہیں ہوتے تو مولانا نظامیؒ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک تو ہمارے خیال سے بھی پاکیزہ تر ہے۔ جب خیال ذرا سی دیر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے تو آپ کا جسم اظہر زمین سے آسمان تک اور وہاں سے عرش تک ذرا سی دیر میں ہو آئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ ایک دلیل عقلی فلاسفہ جدید پیش کیا کرتے ہیں کہ ہوا کے طبقے سے اوپر جو غلا ہے اس میں ہوا نہ ہونے کے سبب کوئی متفلسف زندہ نہیں رہ سکتا تو آپ اگر اس میں سے گذرتے زندہ کیسے رہتے۔ مگر انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ بعزلیم اس التزام کے۔ یہ اس وقت ہے جب متفلسف کو اس کچھ مکث بھی چنانچہ آگ کے اندر اگر جلدی جلدی ہاتھ نکالا جاوے تو آگ کا اثر نہیں ہوتا۔ پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سرعت اس غلا میں سے گذر جائیں تو وہ عدم تنفس میں مؤثر نہ ہوگا۔

اور دلیل نقلی ان منکرین کے پاس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول ہے۔
 وَ اللہ من فقد حسد محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی لیلۃ الوداع کہ بعد اشب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مفقود یعنی غائب نہیں ہوا۔ اس کا جواب بعض لوگوں نے تو یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کہاں تھیں دینا اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی۔ شاید چار پانچ سال کی ہوں۔ اور اگر معراج ۳۵ بنوی ہوئی جیسا کہ

زہری کا قول ہے تو وہ اس سال پیدا ہوئی ہوں گی) اس لئے اجلہ صحابہ کی روایت اس واقعہ میں ان کی روایت سے مقدم ہے۔ مگر اس کا حاصل بظاہر یہ ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بے تحقیق ایک بات فرمادی ہم حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا پر یہ گمان نہیں کریں گے کہ کسی صاحب ادب کو ایسی جرأت ہو سکتی ہے۔ یہ ماننا کہ وہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں موجود نہ تھیں اور کس بھی تھیں۔ مگر جو بات وہ فرما رہی ہیں وہ تو عقل و بلوغ کے زمانہ میں ان سے صادر ہوئی اور ایسے وقت میں وہ بدون تحقیق کے کوئی بات نہیں فرما سکتیں۔ یقیناً تحقیق کے بعد فرما رہی ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے واقعہ کی نسبت فرما رہی ہوں کیونکہ تقدس ہے۔ تو پھر کچھ بھی مضائقہ نہیں۔

میرے ذہن میں اس کا جواب آئیے وہ بہت لطیف ہے وہ یہ کہ فقدان کے دو معنی ہیں، ایک تو چیز کا اپنی جگہ سے گم ہو جانا ہٹ جانا۔ دوسرے تلاش کرنا۔ چنانچہ دوسرے معنی میں فقدان کا استعمال نص میں بھی آیا ہے۔ قالوا وابتلوا علیہم ماذا اتفقوا ان یوسف علیہ السلام نے متوجہ ہو کر نہا کرنے والوں سے کہا کہ تم لوگ کس چیز کو تلاش کرتے ہو۔ یہاں فقدان کے معنی طلب ہی کے ساتھ زیادہ ظاہر ہیں۔ پس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا صائب مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ کی تلاش کی جاتی۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ساری رات میں اپنے گھر سے جدا ہی نہیں ہوئے وین رہے تاکہ اس سے مزاج منامی یا کشفی پر استدلال کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ گھر سے جدا تو ہوئے۔ مگر زیادہ دیر

عہ اور اگر فقدان کے دہی معنی لئے جائیں جو متبادر ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم شب مزاج میں گم نہیں ہوا تب بھی اس سے مزاج کا ردو جانی یا منامی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے اس رات جدا ہی نہیں ہوئے کیونکہ فقدان فعل متعدی ہے ذکر لازم۔ اس کے معنی غیبت و انفصال کے نہیں بلکہ گم کرنے کے ہیں جس کے لئے اس کا فائدہ دوسرے کا مفقود ہونا ضروری ہے پس مطلب یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس رات کسی نے گھر سے غائب اور گم نہیں پایا۔ اور یہ روایت درست ہے کیونکہ آپ سب گھر والوں کے ساتھ گھر میں ہوئے تھے۔ اور مزاج ایسے وقت ہوئی جو کہ عادتاً لوگوں کے گہری نیند سونے کا وقت تھا۔ پھر جاگنے کے وقت سے پہلے آپ واپس تشریف لے آئے بلکہ خود اگر گھر والوں کو صبح کی نماز کے لئے جگایا تو ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے رات کو جاگ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر میں نہ دیکھا ہو۔ اور اتنی بات مفقود ہونے کے لئے ضروری ہے۔ قلت ولعل هذا هو مراد الشيخ فعبارة بالتفتيش والا فالفقدان غير التفتيش، نعم

نہیں لگی۔ جس میں گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو اور تلاش کی نوبت آئی ہو۔ (الرفع والوضع ص ۳۲)

بقیہ گذشتہ :- وہو استدعی فاقد اکما لا یخفی (جامع) احقر اشرف علی کے ذہن میں پہلا حاشیہ دیکھ کر ہی یہ تاویل آگئی تھی۔ مگر دوسرے عنوان سے پھر باب اس تاویل کی اس دوسرے عنوان سے ذرا واضح تقریر کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ فقدان کے معنی تو گم ہی کرنے ہیں مگر اس کے دو درجے ہیں، ایک مطلق گم کرنا اور ایک ایسا گم کرنا جس کے بعد اس کی تلاش میں لگ جاوے پس پہلا درجہ فقد مطلق ہوا اور دوسرا درجہ فقد مقید۔ پس اس حدیث میں دوسرا درجہ مقید ہے یعنی ایسا مفقود نہیں ہوا جس سے تلاش کی نوبت آئی ہو کیونکہ زمانہ فقدان کا اتنا قلیل تھا کہ کسی کو اس فقدان کی اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ پس میں میری عبارتیں ہٹ جانے کو پہلے درجہ پر اور تلاش کر نیو دوسرے درجہ پر محمول کیا جاوے تو اب معنی لغوی کے خلاف نہیں ہوا۔ اور بنا بر قواعد تصوف یہ بھی ممکن ہے کہ جسم غفری ملکوت میں پہنچا ہو اور جسم ثانی ناسوت میں رہا ہو۔ اسکے دیکھنے ہوئے کسی نے اسکو جسم غفری سمجھ کر مفقود کا حکم کر دیا ہو۔ اور وہی بات ہے کہ اگر مہراج جسم غفری نہ ہوتی تو اتنا انکار اسپر ہوتا اور اگر غلط فہمی سے ہوتا تو آپ بھی جواب دے دیے کہ میں جسم غفری سے دعویٰ نہیں کرتا کہ اسپر اس قدر استبعاد کیا جاوے ۱۳ من۔

احقر ظفر احدی عن کر تلہ کہ بعد میں تفسیر تیر المقیاس میں جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے۔ ماذا اتفقوا ان یوسف علیہ السلام اور تفقد کر تفسیر ماذا تطلبون اور تطلب کے ساتھ تیری نظر سے گذری۔ اور یہ تقریر بالکل اسی معنی کے مطابق ہے جو حضرت حکیم الامت نے اس آیت کی تفسیر میں بیان فرمائے ہیں کیونکہ طلب کے معنی تلاش کرنے اور ڈھونڈنے کے ہیں۔ اور بظاہر ابن عباس کی تفسیر باللائم ہے کیونکہ فقدان اگر تطلب کو مستلزم ہوتا ہے لہذا لازم کی تفسیر لازم سے فرادی لیکن اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ گاہے فقدان سے طلب تفتیش بھی مراد ہوا کرتی ہے۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول میں بھی اس معنی کا احتمال ہے جیسا کہ حضرت مولانا نے فرمایا واداء الاحتمال اطل الاستدلال اور یہ خبر کہ تفسیر تیر المقیاس الشرحین کے نزدیک معتبر نہیں کیونکہ اس کے راوی بھی اور ان کے شاگرد محمد بن مروان سدی صنف مجرہ ہیں۔ مگر سیول نے اتفاق میں ابن عدی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ لیکن قال ابن عدی فی الکامل للکلبی احادیث صالحہ خاصہ عن ابی صالح وہو معنی والتفسیر ویس حدیث المحول من ولا اشجع (ص ۲۳) جس سے فی الجملہ اسکی تقویت ہوتی ہے۔ دوسرے مسئلہ کوئی احکام کی قبل نہیں جس میں راوی کا مجرد ہونا مضر ہو بلکہ از قبیل نقل لعنت ہے جس میں بہت وسعت ہے۔ فافهم والله اعلم۔ وانما اطلنا الکلام فی هذا المقام ليعلموا ان نعم الله على جاعتنا وول المحمد انها التفتيش احوال ابا بهاء فی تفسیر معانی القرآن الا بعد ظهور مطابقتها لا اقوال السلف وان ابا بهاء لا تنكحون لايوارد الاصغر عليهم اذ اكان بالادب لاجل الطلب ليعلموا ان حسن ذوق حضرت حکیم الامت فی التفسير بحيث لا يتخطى امر الصواب ولو قال شيئاً بغير مطالعة الكتاب۔ (دنت الحاشیہ)

۶۵۔ تبلیغ کے لئے چندہ جمع کرنے کا کام علماء کے سپرد نہیں کرنا چاہیے

میں کہتا ہوں کہ علماء یہ کام ہرگز نہ کریں بلکہ روسا و عوام خود چندہ کریں اور مولویوں سے دین کا کام لیں۔ مگر آج کل تو علماء کی مثال ڈوم کے ہاتھی جیسی ہو رہی ہے کہ اکبر نے ایک ڈوم کو ہاتھی انعام میں دیدیا تھا وہ بڑا گھبرا کر میں اس کا خرچ کہاں سے لاؤں گا آخر ایک دن اکبر کی سواری نکلنے والی تھی کہ گلی میں ڈھول ڈال کر راستہ میں چھوڑ دیا۔ اکبر نے دیکھا کہ شاہی ہاتھی گلی میں ڈھول ڈالے ہوئے پھر رہا ہے پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ ڈوم کو بلایا گیا کہ تم نے اس ہاتھی کے گلی میں ڈھول کیوں لٹکایا ہے۔ کہا حضور آپ نے مجھے ہاتھی تو دے دیا اب میں اسے کھلاتا کہاں سے میں نے اس سے کہا کہ بھائی میں تو گا بجا کر کھاتا ہوں تو ڈھول گلی میں ڈال کر گا کر بجا کر اپنا پیٹ بھرے۔ اکبر ہنس پڑا۔ اور ڈوم کو اس کی امداد کے لئے بھی عطا فرمایا۔

یہی حال آج کل مولویوں کا ہے کہ لوگوں نے ان کے گلی میں ڈال دیا ہے کہ جاؤ گاؤ بجاؤ اور روپیہ جمع کر کے خود ہی سب کام کرو۔ یاد رکھو ایک جماعت سے دو کام نہیں ہو سکتے کام کا طریقہ یہی ہے کہ روپیہ تم خود جمع کرو۔ اور مولویوں سے صرف دین کا کام لو بلکہ روپیہ جمع کر کے اپنے ہی پاس رکھو علماء کو روپیہ دو بھی نہیں۔ کیونکہ آج کل بہت لوگ ایسے بھی ہیں جو واقع میں مولوی نہیں۔ تھے مگر مولویوں میں جا گھسے۔ انہوں نے مسلمانوں کے چندوں میں بہت خیانتیں کی ہیں جس سے مولوی بدنام ہو گئے اسلئے میری رائے یہ ہے کہ روسا چندہ کر کے اپنے ہی پاس رکھیں۔ مولویوں کو نہ دیں۔ کیونکہ اس سے علماء پر دھبہ آتا ہے تو کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ آپ کے علماء بدنام ہوں۔ ہرگز نہیں۔ آپ کو تو چاہیے کہ اگر علماء چندہ کرنا بھی چاہیں تو آپ ان کو خود روئیں کہ یہ کام آپ کے مناسب نہیں۔ یہ کام ہم خود کریں گے۔ بلکہ ایک صورت سب سے اچھی یہ ہے کہ ایک ایک رئیس ایک ایک مبلغ کی تنخواہ اپنے ذمہ کر لے اس میں کسی جھگڑے ہی کی ضرورت نہیں۔ اور اگر ایک آدمی ایک مبلغ کی تنخواہ نہ دے سکے تو دو چار مل کر ایک مبلغ رکھ لیں اور اس کا حساب خود اپنے پاس رکھیں۔ یہ صورت تو روپیہ کے انتظام کی ہے۔ رہا تبلیغ کا قاعدہ اور طریقہ۔ یہ علماء کی

رائے سے ہونا چاہیے۔ تم روپیہ جمع کر کے علماء سے طریقہ پوچھو اور مبلغ بھی ان کی رائے سے مقرر کرو، پھر جس طرح وہ بتلائیں اس کے موافق کام کرو۔ اس مشورہ کے لئے ایک کمیٹی بناؤ۔ علماء کو اس مشورہ اور رائے دینے سے انکار نہ ہوگا۔ اور میں علماء سے بھی کہتا ہوں کہ وہ اس سے انکار نہ کریں پھر اس طرح اللہ کا نام لے کر کام شروع کریں۔ انشاء اللہ بہت جلد کامیابی ہوگی۔ گو اول اول دقتیں بھی پیش آئیں گی مگر دقت سے نگھبراؤں۔ پیادہ سفر کرنیکی ضرورت نہیں سواری میں سفر کریں جہاں ریل ہو وہ ریل سے پہنچئے۔ ورنہ گاڑی پہلی سے جائیں باقی فٹن اور موٹر کی ضرورت نہیں نہ کیمینڈ اور برٹ کی ضرورت ہے۔ ان فضولیات میں پیسہ قوم کا برباد نہ کرنا چاہیے۔ آپ کا قویہ رنگ ہونا چاہیے۔

اے دل اں بہ کہ خراب از منے گنگوں باشی
بے زرد گنج بھد حشمت قاروں باشی

دورہ منزل لیلی کہ خطر راست بجاں

شرط اول قدم آست کہ مجنوں باشی

(العلم والخشیتہ ص ۱۲)

۶۶۔ نسب نامے نہ تو محض بیکار ہیں، اور نہ ہی مدار

فخر ہیں۔

حق تعالیٰ نے مختلف خاندانوں اور قوموں کے بنانے میں یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس سے قنارت اور شناخت ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کا پتہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قریشی ہے یہ انصاری ہے یہ صدیقی ہے یہ فاروقی ہے اگر یہ تفاوت نہ ہوتا تو امتیاز سخت دشوار ہوتا۔ کیونکہ ناموں میں اکثر توارد ہوتا ہے ایک ہی نام کے بہت سے آدمی ہوتے ہیں۔ تو کسی قدر توجاہ سکونت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک دہلوی ہے ایک لکھنؤی ہے۔ پھر ایک شہر میں بھی ایک نام کے بہت سے ہوتے ہیں تو محلوں کے نام سے امتیاز ہو جاتا ہے کہ ایک محلت کا رہنے والا ہے اور ایک محلہ خیل کا۔ پھر وہاں بھی ایک نام کے دو تین ہوتے ہیں تو قبائل کی طرف نسبت سے امتیاز ہو جاتا ہے۔ یہ حکمت ہے اختلاف قبائل کی۔

مگر آج کل ہمارے بھائیوں نے اس کو مدار فخر بنالیا ہے۔ اب یہاں دو قسم کے لوگ

ہو گئے۔ بعض نے تونب و شرف کی جڑ ہی اکھاڑ دی۔ ان کو اس سے شبہ ہو کہ اس آیت میں اختلاف قبائل کی حکمت صرف تعارف بتلائی گئی ہے اور حکمتوں سے سکوت کیا گیا ہے تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ بس اس میں اور کچھ حکمت نہیں ہے۔ لان السکوت فی موضع البیان بیان۔ اسے نظر کر کے بعض نے تو شرافت نسب کا انکار ہی کر دیا کہ اس سے شرف کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ جس طرح دہلوی، نکھنوی، ہندوستانی، بھجالی یہ سب نسبتیں تعارف کے لئے ہیں اور ان سے کچھ شرف حاصل نہیں ہوتا اسی طرح قریشی، انصاری، سید، فاروقی، عثمانی وغیرہ نسبتیں بھی شناخت کے لئے ہیں ان سے بھی کچھ شرف حاصل نہیں ہوتا اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس شرف عربی سے محروم ہیں۔ ان میں سے بعض نے تو اپنے کو شریف ثابت کرنا چاہا ہے۔ چنانچہ ایک قوم نے اپنا عرب ہونا ثابت کیا ہے اور کہلے ہے کہ ہماری اصل راعی ہے چونکہ یہ لوگ جانور پالتے ہیں اسلئے ان کو راعی کہا گیا۔ پھر غلط عوام سے نفی تغیر ہو گیا۔ اسی طرح بعضوں نے اپنے آپ کو خالد بن ولید کی اولاد میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی طرح وہ عرب بننا چاہتے ہیں مگر اس ترکیب میں تکلف تھا کیونکہ تاریخ سے تو اس کا کچھ ثبوت نہیں ملتا محض قیاسات بعیدہ سے کام لینا پڑتا ہے جس سے ہر شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات بنائی ہوئی ہے اسلئے بعض نے اپنے نقص کو یوں دور کرنا چاہا کہ اہل شرف ہی سے اس شرف نفی کر دی کہ شرافت، نسبت کوئی چیز نہیں۔ بعض نے اس نفی میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے استدلال کیا ہے۔

الناس من جهة التماثل اکفاء ابوہم آدم والام حواء۔

وما الفخر الا لاهل العلم انہم علی الہدی لمن استہدی اولاد

ترجمہ: آدمی صورت کے اعتبار سے سب برابر ہیں کیونکہ سب کے باپ آدم علیہ السلام اور ماں حواء علیہا السلام ہیں۔ پس اہل علم کے سوا کسی کے لئے فخر نہیں ہے۔ کیونکہ وہی ہدایت پر بھی ہیں اور طالب ہدایت کی طرف رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ اس سے بعض وہ حضرات جو بنی شرف نہیں رکھتے اور علم حاصل کر چکے ہیں اس پر استدلال کرتے ہیں کہ شرف نسب کوئی چیز نہیں۔ بس شرف اگر ہے تو علم سے ہے۔ سوا دل تو یہی معلوم نہیں کہ یہ حضرت علی کا قول ہے یا نہیں پھر جس کا بھی قول ہے مطلب نفی فخر ہے کہ نسب پر فخر نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ امر عذر اختیار ہی ہے اور اس پر فخر نہ کرنا چاہیے۔ مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ حسن صورت اور سوا کچھ ہونا نعمت بھی نہیں۔ یقیناً اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ گو شرف نسب بوجہ امر عذر اختیار ہی ہونے کے سبب فخر نہیں مگر اس کے نعمت ہونے میں شبہ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی فضیلت بیان فرمائی

ہے۔ انصار کے فضائل بیان فرمائے ہیں۔ اور ایک حدیث میں ہے۔ الناس معادن لمعادن الذهب والفضة خیاردھم فی الجاہلیۃ خیاردھم فی الاسلام اذا فقهوا کہ جیسے چاندی سونے کی کانیں ہیں اسی طرح آدمیوں کی بھی مختلف کانیں ہیں جن میں بعض سونے کے مشابہ ہیں۔ بعض چاندی کے، بعض دو سے معادن کے مثل ہیں بعض دو سے معادن کے مثل ہیں پھر آپ فرماتے ہیں کہ جو خاندان جاہلیت میں اچھے شمار ہوتے ہیں وہی اسلام کے بعد بھی اچھے ہیں۔ جب کہ علم حاصل کر لیں۔ بعض نے یہ سمجھا ہے کہ اس میں قید اذا فقهوا اہل انساب کو مضرب ہے کہ اس میں ملا فضل فقہ کو فرمایا۔ مگر کچھ بھی مضرب نہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فقہ کے بعد خیار فی الجاہلیۃ کو خیار فی الاسلام فرما رہے ہیں۔ توفیق کے بعد مساوات نہ رہی بلکہ حاصل یہ ہوا کہ فقیر غریب صاحب نسب صاحب نسب کے برابر نہیں بلکہ فقیر صاحب نسب افضل ہو گا تو کوئی تورات ہے جس سے وہ خیار ہوئے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ صاحب نسب جاہل سے غیر صاحب نسب عالم افضل ہے۔ اس کا ہم کو انکار نہیں۔ مگر حدیث سے اتنی بات معلوم ہو گئی کہ شرف نسب بھی کوئی چیز ضرور ہے جس کے ساتھ علم و فقہ مل جائے تو صاحب نسب غیر صاحب نسب سے بہتر ہو گا نیز حدیث میں ہے (اللہ عزوجل فی قریش) کوئی توبہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امارت کو قریش کے ساتھ مخصوص فرمایا معلوم ہوا کہ اہل انساب میں شان متبوعیت دوسروں سے زیادہ ہے (لانا اہلبی لا کذب لانا بنی عبد المطلب)۔ جب جنگ حنین میں حضرات صحابہ کے پیر اکھڑ گئے۔ اور وہ پیچھے ہٹنے لگے تو آپ نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ میں بنی ہوں، یہ جھوٹ بات نہیں (اسلئے میرا غلبہ یقینی ہے) اور میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔ یعنی میں خاندانی اور صاحب نسب ہوں۔ میں ہرگز پسپا نہ ہوں گا تو اس میں حضور نے اپنے صاحب نسب ہونے پر فخر کیا ہے۔ اور دشمن کو ڈرا یا ہے کہ تو اپنے مقابل کو کم نہ سمجھنا، وہ بڑا خاندانی ہے جس کی بہادری سب کو معلوم ہے۔ اگر شرف نسب کوئی چیز نہیں ہے تو آپ نے (لانا بنی عبد المطلب) کیوں فرمایا نیز ایک حدیث میں ہے۔ ان اللہ اصطفیٰ من ولد ابراہیم اسمعیل واصطفیٰ من ولد اسمعیل بنی کنانہ واصطفیٰ قریشا من کنانہ واصطفیٰ من قریش بنی ہاشم واصطفانی من بنی ہاشم (در واد مسلم والترمذی)۔

یعنی حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسمعیل علیہ السلام کو انتخاب فرمایا (اس سے عرب کی فضیلت عجم پر ثابت ہوئی، کیونکہ اسمعیل علیہ السلام ابو العرب ہیں۔ اور ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے۔ (اختار اللہ العرب من بنی لاویہ)۔ اور اسمعیل علیہ السلام کی

قلب کو راحت حاصل ہوتی ہے جس کا اثر صحت پر بھی ضرور ظاہر ہوتا ہے اور ہم کو اس کی وجہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ نماز سے راحت و سرور کیوں ہوتا ہے کیونکہ ہر اثر کے لئے کسی علت کا ہونا ضروری نہیں ہے بعض چیزیں بالخاصہ مؤثر ہوتی ہیں۔ دیکھئے مقناطیس میں جو جذب معدنی کی خاصیت ہے اس کی وجہ کوئی نہیں بتلا سکتا۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ نماز میں یہ اثر بالخاصہ ہے جس کی علت بتلانی نہیں ضرورت نہیں۔

افسوس اتنی بڑی عبادت جس میں فلاح اخروی بھی ہے اور فلاح دنیوی بھی ہے اور ہم اس سے ایسے غافل ہیں کہ پانچ وقت خدا کی طرف سے ایک منادی ہم کو پکارتا ہے اور ہم جماعت میں نہیں آتے۔ حالانکہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **وَلَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ أَمُرَ بِالصَّلَاةِ أَنْ تَقَالَ عَرَفَ بِنْتِهَا** کہ میں چاہتا ہوں کہ نماز میں ایک شخص کو امام بناؤں پھر چند آدمیوں کو ساتھ لے کر دیکھوں کہ کون کون لوگ جماعت میں نہیں آئے۔ پھر جو جماعت سے پیچھے رہتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان کے گھر میں ایک دوں اور گو آپ نے ان لوگوں کے گھروں کو پھونکا نہیں مگر چاہا تو تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ **لَاقِي لِرَبِّي رُبَّحَ يَسْلُجَ فِي هَوْدَجٍ** کہ میں حق تعالیٰ کو دیکھتی ہوں کہ آپ کی خواہش کو بہت جلد پورا کر دیتے ہیں اور بھلا حضور کی یہ شان کیوں نہ ہو جب ادنیٰ ادنیٰ مقبولین کی یہ شان ہے۔

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں
ی دہیزداں مراد متقیں!

تو معلوم ہوا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا چاہا ہے تو خدا تعالیٰ نے بھی ضرور چاہا ہے۔ اب بتاؤ جس کے گھر کو خدا اور رسول پھونکنا چاہیں وہ کیونکر بچ سکتا ہے تو جوگ جماعت میں نہیں آتے ان کے گھر میں ضرور آگ لگی ہے۔

شاید تم کہو کہ ہمارا گھر کہاں جلا وہ تو اچھا خاصا موجود ہے تو اسے متعلق مولانا روم کا جواب سن لو، فرماتے ہیں۔

آتش گر نادمست این دو دمیست
جاں یہ گشت دوراں مرد و دمیت

یہ تھوڑی آگ لگی ہے جس کے دھوئیں نے دل کو سیاہ کر دیا ہے اور چہرہ پر وحشت و ظلمت برس رہی ہے۔ اس حکمت طلب سے بے نمازی کے چہرہ پر بھی ضرور ایک اثر ہوتا ہے جس سے اس کا بے نمازی ہونا لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ نمازی کے چہرہ پر جو نور ہوتا ہے اس کا

چہرہ رطابہ ہوتا ہے۔ اور بے نمازی کے دل میں ظلمت ہے اس کا چہرہ بدر و خفی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آگ ضرور لگی ہے۔ اسی کا یہ دھواں ہے جس نے ظاہر و باطن دونوں کو سیاہ کر دیا ہے۔
(الاکرمیہ ص ۲۲ تا ۲۹ ملخصاً)

۶۸۔ اتحاد و اتفاق میں حدود کی رعایت

اتحاد مطلوب کے دو درجے ہیں۔ ایک اس کا حدوث، دوسرے بقا، میں ان دونوں درجوں کے اسباب بیان کروں گا کہ حدوث اتحاد کی بنیاد کیا ہونی چاہیے اور اس کے بقا کا کیا طریقہ ہے اور وہ اسباب ایسے ہیں جو شرعی پہلو سے بھی ظاہر ہیں اور عقلی پہلو سے بھی، اور اسباب بقا کی تحقیق زیادہ اہم ہے۔ اس لئے کہ آج کل ہم لوگوں میں اتحاد و اتفاق تو پیدا ہوتا ہے مگر باقی نہیں رہتا۔ میں اس کا سبب شرعی پہلو سے بتلاؤں گا، جو عقل کے بھی مطابق ہے۔ گو مجھے عقل کا نام لیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کیونکہ عقل بڑی ہے اور شریعت سلطان ہے پس عقل کی تائید سے شریعت کی بات کو ماننا ایسا ہے جیسے غلام کی جی ہاں جی ہاں کوسن کر بادشاہ کی بات کو مانا جائے اور اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے۔ بادشاہ کی بات خود حجت ہے غلام کی تصدیق سے اس کو حجت سمجھنا سراسر حماقت ہے مگر کیا کیا جائے آج کل عقل پرستی کا غلبہ ہے لوگوں کی سمجھ میں وہی بات آتی ہے جو عقل کے مطابق ہو۔ اس سے تبرعاً عقلی پہلو سے بھی ان اسباب کو بیان کروں گا کہ میرا اصلی مذاق اس کے خلاف ہے۔

پس سنیے کہ آج کل دیکھا جاتا ہے کہ ہم لوگوں میں اتحاد باقی نہیں رہتا۔ بلکہ ایک اتحاد ہی کیا ہے مجھے تو ایسی بدگمانی ہے کہ جب میں سنتا ہوں کہ مسلمانوں نے کوئی کام شروع کیا ہے تو سب سے پہلے یہ خیال ہوتا ہے کہ دیکھئے استقلال کے ساتھ چلے گا بھی یا نہیں کیونکہ میں رات دن دیکھتا ہوں کہ نہ ہمارے کارخانے چلتے ہیں نہ انجنیں، نہ مدرسے نہ اتحاد و اتفاق۔ ہاں ایک چیز ہمیشہ چلتی ہے وہ کیا جوتا اور لٹھیر ایک بار جہاں چلا مجھ سے چلتا رہتا ہے۔ چلے اس کی بنیاد کیسی ہی کمزور ہو مگر شاخیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ جیسے عیسائی جاہلیت کے زمانہ میں ایک گھوڑ دوڑ ہوتی تھی جس میں ایک فریق کا گھوڑا آگے نکل گیا تھا تو اسی بات پر صدیوں لڑائی رہی۔ ہماری حالت آج کل اہل جاہلیت کی حالت کی مشابہ ہے کہ جہاں ذرا سی بات پر جوتہ چلا پھر دہ برسوں تک چلتا رہتا ہے۔ باقی اتحاد و اتفاق۔ اس کی عمر ہمارے یہاں بہت تھوڑی ہے۔ گو پھر ار حدیث اتحاد کی بہت کوشش کرتے رہتے ہیں اور اس پر تقریریں

بہت ہی جوتی ہیں۔ مگر آج کل کسی نے بقاءِ اتحاد کے اسباب بیان نہیں کئے۔ نہ عدم بقاء کے اسباب کو مرتفع کیا۔ حالانکہ سب سے پہلے یہ مسئلہ قابل غور تھا۔ اس لئے اس وقت میں اسی کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اور اسی کے ضمن میں اسبابِ صحیحہ حدوث کے بھی مذکور ہو جائیں گے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ خَا صًا صِلُوا بَيْنَ اَخْوَانِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں (پس اگر کبھی ان میں نزاع ہو تو) آپسے دو بھائیوں میں
صلح کرادیا کرو۔ یہاں ”فاصلہ صلیبی (اھویکیے“ میں اس پر تنبیہ ہے کہ بچوں کو کسی ایک فریق کی اعانت
نہیں کرنا چاہیے بلکہ دونوں کو اپنا بھائی سمجھ کر اس طرح صلح کرنا چاہیے۔ جسے حقیقی دو بھائیوں میں صلح
کرائی جاتی ہے کہ ان میں سے کسی کا نقصان گوارا نہیں ہوتا۔ اور صلح کا یہ طریقہ نہیں جو آج کل رائج ہے کہ
دونوں فریق کو کچھ کچھ دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جس کا حق ہوتا ہے اس کو بھی دیا جاتا ہے بلکہ صلح
کرانیکا طریقہ یہ ہے کہ جو حق پر ہوا اس کو غلبہ دیا جائے اور جو حق پر نہ ہوا اس کو دیا جائے، کیونکہ صاحب حق
کو دینا اضرار ہے۔ اور غیر صاحب حق کو دینا اضرار نہیں اس میں تو اسے اضرار سے روکنا ہے۔

اصلاح کا طریقہ

مگر آج کل عجیب دستور ہے کہ صاحب حق دغیر صاحب حق دونوں کو دلاتے ہیں۔ سو یہاں اصلاح سے یہ مراد نہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ اس سے پہلے ارشاد ہے۔

وَإِنْ كَلَامَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اتَّفَعُوا فَاصْلَحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَضَ أَحَدُهُمَا عَلَى الْآخَرِ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبَعِيَ حَتَّى تَفْقِيَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَاصْلَحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ۔

یعنی اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم لڑنے لگیں تو دونوں میں (ادل) صلح کرادو۔ پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر ظلم کرے تو جو زیادتی اور ظلم کرے تو اس سے مل کر قتال کر دو۔ یہاں تک کہ وہ حکم الہی کی طرف واپس آجائے اس سے صاف معلوم ہوا کہ اصلاح کے معنی یہ ہیں کہ حکم الہی کے موافق فیصلہ کیا جاوے اور یقیناً صاحب حق کو دبا نا حکم الہی کے خلاف ہے پس اگر ذوقین حکم الہی کی مطابقت فیصلہ پر راضی ہو جائیں تو نبھا۔ جو ظلم پر کمر بستہ ہو اور دوسرے کا حق مارنا چاہتا ہے سب کو اس سے لڑنے کا حکم ہے یہ حکم نہیں ہے کہ جس طرح ہو صاحب حق کا گلا گھونٹ گھانٹ کر لڑائی موقوف کرادو۔ آج کل لوگوں نے اصلاح اسی کو سمجھ رکھا ہے کہ بس لڑائی موقوف ہو جائے یہ چاہے

صاحب حق کو ہی دیا جائے مگر شریعت نے اس کو اصلاح ہی نہیں سمجھا بلکہ شرعاً اصلاح یہ ہے کہ حق، بمقدار رسد۔ اور جو دوسرا طریق حق دار کے حق میں پس و پیش کرے تو پھر یہ حکم ہے کہ

مسلک اس کو دماؤ اور لڑائی کی ضرورت ہو تو اس سے لڑو اس سے معلوم ہوا کہ اصلاح میں بعض دفعہ سختی اور قتال کرنا بھی مستحسن ہے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ ناطقانی کی غرض سے اتفاق کرنا تو برا ہے اور اتفاق کی غرض سے ناطقانی کرنا جائز بلکہ واجب ہے۔ مثلاً اس غرض سے اتفاق کریں کہ پانچویں سے ناطقانی کریں گے۔ یہ مذموم ہے اور یہیں سے معلوم ہو گیا کہ اگر خدا تعالیٰ سے ناطقانی کرنے پر اتفاق ہو۔ یعنی معاصی پر اجتماع ہو تو وہ کیوں برا نہ ہوگا۔ یقیناً یہ اتحاد سب سے بدتر ہے۔ مگر آج کل لوگوں نے اتفاق کا نام یاد کر لیا ہے اور اس کو مطلقاً محمود سمجھتے ہیں حدود کی رعایت نہیں کرتے یہ بالکل غلط ہے۔ شریعت میں نماز تک کے لئے حدود ہیں کہ طلوع و غروب اور دوپہر کے وقت اور بغیر استقبال قبلہ کے نماز حرام ہے۔ اسی طرح ذکر الہ کے لئے حدود ہیں کہ ذکر میں نیند آجائے تو سونے کا حکم ہے اس وقت ذکر منوع ہے۔ شریعت کا مقصود ان حدود سے یہ ہے کہ بندہ کا غلام ہونا چاہیے۔ جس وقت جو حکم ہو اس کا اشتغال کرے، چاہے عبادت کا حکم ہو، یا ترک عبادت کا، بس وہ شان ہو رہے

من چوں کلکم در میان اصبعین نیستم در صف طاعت بین بین
 قلم کی خوبی یہ ہے کہ جب چلائیں تو پہلے اوپر جب رکیں رک
 امتحان کے لئے خلاصہ جات کیونکہ قلم اگر روکے سے بھی نہ لگے تو حرف بگڑ جاتے ہیں
 اسی طرح عبادات حدود شرعیہ کے خلاف معاصی ہیں اس لئے حکم ہے کہ نیند کے وقت ذکر و قنوت
 کر کے سو رہو، تو اتنی بڑی چیز غیر مستحسن ہونے کا شبہ ہی نہیں ہو سکتا وہ بھی ایک وقت میں ترک
 حدود کی وجہ سے مذموم ہو جاتی ہے۔ تو اتحاد کے لئے حدود کیوں نہ ہوگی اور ان حدود کے خلاف
 جو اتحاد ہو وہ مذموم کیوں نہ ہوگا۔ پس اتحاد کی بھی ہر فرد مستحسن نہیں اس کو علی الاطلاق محمود کہنا اتحاد کا
 ہیضہ ہے۔ انفوس آج کل اتحاد کے فضائل بہت بیان کئے جاتے ہیں مگر اس کے حدود و اصول بیان
 نہیں کئے جاتے۔

پس خوب سمجھ لو کہ خدا سے نا اتفاقی کرنے پر اتفاق کرنا مذموم اور نہایت مذموم ہے۔ پس اس سے اس اتحاد کا حکم سمجھ لیا جاوے جس میں اتحاد کے لئے شریعت کے احکام کو چھوڑا جاتا ہے۔

صاحبو! جیسے اتفاق تمسّن ہے ایسے ہی کمی نا اتفاقی بھی تمسّن ہے۔ پس جو لوگ خداے تعالیٰ کے احکام چھوڑنے پر اتفاق کریں ان کے ساتھ نا اتفاقی کرنا اور مقابلہ کرنا مجھو دے

دیکھو جیسے عمارت بنانا محمود ہے ایسے ہی بعض عمارات گرانہ بھی محمود ہے۔ اگر آپ اپنی رعایا سے کوئی مکان خریدیں اور اس میں بجلے کے کچے کھڑوں کے عمدہ کوٹھی بنانا چاہیں تو ایسی عمارت کو گرائس گے یا نہیں؟ یقیناً گرائس لگے۔ اب بتائیے یہ افساد محمود ہے یا مذموم اس کے محمود ہونے میں کسی عاقل کا کلام نہیں ہوتا، پھر کسی موقع پر نا اتفاقی کے محمود ہونے میں کیوں شبہ ہے۔ اس نے حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جس طرح بھی ہو صلح کرادو۔ بلکہ یہ حکم دیا کہ صحیح بنیاد پر صلح کرادو، اور اگر لوگ اسپر راضی نہ ہوں تو سب مل کر غلط بنیاد کو ڈھادو۔ پھر قتال کے بعد طائفہ باغیہ حق کی طرف رجوع ہو جائے حکم یہ ہے فای ذہن نہ فاصلو بینہما الحدل ولا فسطول یعنی اب پھر ان کے معاملہ کی انصاف کے ساتھ اصلاح کر دینے میں کس لڑائی موقوف ہوتے ہی ان کا مصالحو کرادو۔ اس میں بھی لوگ غلطی کرتے ہیں۔ بعض لوگ صلح کرانا اس کو سمجھتے ہیں کہ جہاں دو آدمیوں میں نزاع ہو فوراً دونوں کا مصالحو کر دیا جائے چاہے فریقین کے دل میں کچھ ہی بھرا ہو۔ میں بھی ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ پہلے معاملہ کی اصلاح کرو ورنہ بدون اصلاح معاملہ کے نزاع مصالحو بیکار ہے۔ اس سے فریقین کے دل کا جبار نہیں نکلتا تو مصالحو کے بعد پھر کاغذ مٹوڑ ہو جاتا ہے یعنی مقابلہ، تو حق تعالیٰ نے "فارت" کے بعد یہ نہیں فرمایا۔ "فکفواہم" کہ زیادتی کرنے والا حق کی طرف رجوع ہو۔ پس تم ہاتھ روک لینے پر اکتفا کرلو، بلکہ فرماتے ہیں جب دوسرا فریق زیادتی چھوڑ دے تو اب پھر اصلاح معاملہ کی عدل کے ساتھ کوشش کرو۔ یہ تین ہی باتیں ایسی بڑھائی گئی ہے جس پر ساری عقول قربان ہیں کیونکہ نزاع بدون اس کے ختم ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر اس نکتہ پر کسی کی عقل نہیں پہنچتی۔

اصلاح کا حاصل

بہر حال اصلاح کے نہ یہ معنی ہیں کہ صاحب حق کو دیا جائے نہ یہی ہیں کہ محض مصالحو کر دیا جائے بلکہ اصلاح کے معنی یہ ہیں کہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کیا جائے۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو آج کل علماء دیوبند اور جماعۂ رضائیہ میں اتفاق کرنا چاہتے ہیں اور دونوں جماعتوں پر باہمی نا اتفاقی کا الزام دھرتے ہیں کہ اسلام کو ضرر پہنچ رہا ہے۔ سبحان للہ! اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ ایک شخص کے گھر پر چور ڈاکر ڈاکس اور وہ ان پر دعویٰ کر دے تو دونوں فریق کو نا اتفاق کا مجرم قرار دے کہ دونوں کو اتفاق پر مجبور کیا جائے۔ بلکہ اس صورت میں ہر عاقل چوروں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مالک کا مال واپس کر کے اس سے اتحاد کریں مالک کو اتحاد پر کوئی مجبور نہیں کرتا۔ نہ اس کو دعویٰ دائر کرنے سے مجرم قرار دیتا ہے۔

دین پر ڈاکہ

اسی طرح علماء دیوبند کو جس جماعت سے اختلاف ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ وہ لوگ دین پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ اور احکام میں تحریف کرتے ہیں۔ ان دونوں میں اتفاق کرانے کی صورت یہی ہے کہ اول حق و ناحق کو معلوم کیا جاوے پھر جو ناحق پر ہو اس کو دیا جائے یہ طریقہ نہایت غلط ہے کہ حق و باطل کی تعین سے پہلے ہی دونوں فریق کو اتفاق پر مجبور کیا جاتا ہے اور ہر ایک کو دیا جاتا ہے۔ یہ اتفاق ہرگز قائم نہیں رہ سکتا۔ (جامع)

اس پر فریقین اتفاق کر لیں تو خیر، ورنہ اس اتفاق کی طرف لانے کے لئے فریق مبطل سے نا اتفاقی اور قتال کا حکم ہے، پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں "لَا تَقَاتِلُوا الْمُشْکِکَ" مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس میں حق تعالیٰ نے حکم اخوت کو صفت مومن پر مرتب فرمایا ہے اور اصول کا قاعدہ ہے کہ جہاں کسی صفت پر حکم مرتب ہوتا ہے وہاں وہ صفت حکم کی علت ہوتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ہم میں جو اخوت کا تعلق ہے اس کی علت ایمان ہے اور وہی اخوت مطلوب ہے جس کی بنیاد ایمان پر ہو۔ صاحبو! آج کل جو اتفاق و اتحاد کو بکار نہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد ایمان پر

نہیں ہوتی، بلکہ ہوائے نفسانی یا ماصی پر ہوتی ہے اس لئے وہ بہت جلد ہوا ہو جاتا ہے (یعنی فناء) اس لئے اگر اتفاق کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کی بنیاد ایمان پر قائم کرو۔ مگر آج کل تو ایمان کو ایسی بقدر چر سمجھ رکھا ہے کہ اس کی کچھ وقعت ہی نہیں ہے۔ جس کی بنیاد ایمان پر رکھی جاتی ہے اس کے متعلق لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو طوائف کا کام ہے۔ چنانچہ آج کل زبانوں پر یہ بات بہت کثرت سے ہے کہ یہ وقت نماز روزہ کا نہیں ہے اتحاد کا وقت ہے۔ اور جب کوئی اللہ کا بندہ اعتراض کرتا ہے کہ اتحاد کی وجہ سے احکام شرعیہ کا فوت کرنا جائز نہیں تو نہایت بے باکی سے جواب دیا جاتا ہے کہ یہ وقت جائز و ناجائز کا نہیں ہے۔ کام کا وقت ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ اس متن پر بعض اہل علم نے حاشیہ چڑھا دیا ہے کہ اتفاق و اتحاد وہ چیز ہے کہ اس کے قائم کرنے کے لئے نماز، قضا کر دی گئیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے: "وہ احزاب میں نمازیں قضا کر دی تھیں۔ سبحان للہ! کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ بھائی کا کنبہ جوڑا، اول تو یہی بتلائیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں کس سے اتحاد کر رہے تھے جو اتحاد کی وجہ سے نمازیں قضا ہوئیں، بلکہ وہاں تو عدم اتحاد اس کا سبب ہوا تھا۔ کفار سے مقابلہ اور لڑائی تھی۔ ذکر اتحاد کی گفتگو، اور اگر کوئی شخص اپنے اس اتحاد کو بھی مقابلہ میں داخل کرنا چاہے تو پھر وہ ثابت کرے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود فرصت کے نمازیں قضا کر دی تھیں۔ یا کفار نے آپ کو نماز پڑھنے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔ احادیث و واقعات

میں صاف مذکور ہے کہ وہاں نماز کے قضا کرنے کا سبب یہ تھا کہ کفار نے آپ کو نماز کی مہلت نہ دی تھی کیونکہ مقابلے کے وقت مہلت اپنے قبضہ میں نہیں رہتی، بلکہ دونوں پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ایک مہلت لینا چاہے اور دوسرا مقابلے سے باز نہ آئے تو اس مہلت کا لینا بیکار ہے۔ پھر ایسی حالت میں نماز کیسے پڑھی جائے۔ بہر حال اس وقت قتال درپیش تھا اور ایسی حالت تھی کہ صلوٰۃ الخوف بھی نہ پڑھ سکتے تھے اس لئے آپ نے نماز قضا کی مگر آج کل جو اتحادی جلیسوں اور ترقی قوموں کے مشوروں میں نمازیں قضا کی جاتی ہیں ان پر کون سا حلقہ ہوتا ہے جس سے ان کو نماز کی مہلت نہیں ملتی، انکس باتیں بنانے اور دور از کار ریڈیوشنوں کے پاس کرنے میں تو نمازیں قضا ہوتی ہیں۔ اور ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات پر قیاس کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو کچھ تو شرم کرنی چاہیے۔ پس خوب سمجھ لو کہ یہ مسائل اور یہ دلائل سب غلط تھے۔ اور ناشایہ کیا

اتحاد غلط طور پر کیا کہ ان لوگوں کو اتحاد کا ایسا بیضہ ہوا کہ کفار کو بھی بھائی بنایا اور ایسی رعایت میں احکام شرعیہ کو چھوڑا گیا اور اس کی یہ مصاحت بیان کی جاتی ہے کہ اس سے اسلام کو کفار کی طرف انجذاب ہوگا۔ اور اگر ان کو بھائی نہ بنایا گیا تو اسلام سے بعید اور اجنبی رہیں گے۔

صاحبو! یہ خیال محض لغو تھا۔ اسلام تو ایسی حسین چیز ہے کہ کسی کی آنکھ میں کجی نہ ہو تو اس کا حسن ضرور اپنی طرف کھینچے گا۔ چاہے تم اس کو بھائی بھی نہ کہو بلکہ دشمن ہی کہو۔ ابو جہل کی آنکھ میں کجی تھی اس لئے اس کو ہدایت نہ ہوئی اور جس کی نگاہ میں کجی نہ تھی وہ کسی نہ کسی وقت اسلام کی طرف آئے اور پھر آئے حالانکہ عجمیہ اسلام سے عداوت ہی ظاہر کرتے رہتے تھے اور مسلمان بھی ہر موقع پر ان سے مقابلہ کرتے رہتے تھے۔ پس اسلام کو اپنی طرف مجذب کرنے کے لئے کسی کو بھائی بنانے کی ضرورت نہیں، وہ دشمن کو دشمن سمجھ کر بھی اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام نے دوسری قوموں کے حقوق کی بھی پوری رعایت کی ہے وہی حقوق اور وہی رعایت سر کے جذب کے لئے کافی ہے۔ پس میں یہ بھی نہ کہوں گا کہ کفار ہمارے بھائی ہیں۔ ہاں یہ کہوں گا کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں اور وہ ہمارے پڑوسی ہیں اور اسلام میں ہمسایہ کے بھی حقوق ہیں گو وہ کافر ہی ہو اور اگر ان کو بھائی کہا جاوے تو یہ بات چل نہیں سکتی نہ اس کو اس بیجا خوشامد کا یقین آ سکتا ہے۔ اور یہ قرآن کے بھی بالکل خلاف ہے۔

پس کفار سے ایسا اتحاد شرعاً جائز نہیں ہے جس میں احکام الہیہ کفار سے اتحاد کی بھی مخالفت کی جاوے۔ بھلا اگر ایسا اتحاد محمود ہو تا تو حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے (آپ کی عقل کامل پر تمام عالم کا اتفاق ہے) لا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ کی تعلیم کیوں دی ہوتی جس سے تمام عالم میں تہلکہ مچ گیا اور کفار کہنے لگے اَجْعَلُ الْاِلٰہَۃَ الْاِنْہَا وَاحِدًا اِنِّیْ ہَذَا نَسِیْتُ عَجَابًا۔ وَاَنْطَلِقُ اِلَیْہُمْ اِنِ اَمْشُوا وَاَصْبِرْ وَاَعْلٰی اِلَہِہِمْ اِنِّیْ ہَذَا الشَّیْءُ یُرَادُ اس تعلیم سے پہلے سب کفار آپ کے ساتھ متحد تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اتفاق کی بنیاد کو اکھاڑ ڈالا کیونکہ کفار کے اس موافقت کی بنیاد کفر پر تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے کفر سے ہم کو نہیں روکا گیا۔ اسلئے خوش تھے اور ظاہر ہے کہ یہ بنیاد نہایت کمزور اور پھر بنیاد تھی۔ آپ نے اس کی نیویں نکالیں پھر نئی بنیاد ڈال کر اس پر عالی شان عمارت بنانے لگے مگر ہماری حالت اس وقت یہ ہو رہی ہے کہ ترقی و اتحاد بھی کرتے ہیں تو اس طریقہ پر جس پر کفار نے ترقی کی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر نہ ہماری ترقی ہے نہ اتحاد ہے حالانکہ ہم کو کفار کی چیزوں کی طرف تو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی مانگت ہے۔

حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہیں۔ وَلَا تَدْعُ دَعْوٰی عٰیْنُکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِہِ اَرْوَاجًا مِنْہُمْ ذُہْرَۃَ الْحَیَۃِ الدُّنْیَا لِنَقِیْہُمْ ذُنُوبَہُمْ وَرِزْقُ رَبِّکَ خَیْرٌ وَّاَبْعَثْ لَہِ (اور اپنی نگاہوں کو اس چیز کی طرف دراز نہ کیجئے جس کے ساتھ ہم نے کفار کی بعضوں کو جماعتوں کو تمتع دیا ہے جس میں زندگی دنیا کی رونق ہے تاکہ اس میں ہم ان کی آزمائش کریں اور آپ کے رب کی عطا بہتر ہے اور پائیدار ہے) اس میں تو کفار کے طریقہ ترقی کی طرف نگاہ اٹھانے کی مانگت کی گئی ہے۔ آگے اپنی طرف سے ترقی کا طریقہ بتلاتے ہیں وَاْمُرْ اَهْلَکَ بِالصَّلٰۃِ وَاَصْبِرْ عَلَیْہَا لَا تَسْتَغْلِقْ رِزْقًا مِّنْ نَّذْرِنَا وَاَلْعَاقِبَۃُ لِلتَّقٰوٰۃِ اور اپنے اہل کو نماز کا حکم کیجئے (اور خود بھی) اس پر جمے رہیے۔ آپ سے ہم رزق نہیں مانگتے۔ رزق تو ہم خود ہی آپ کو دیں گے اور (اچھا) انجام تقویٰ ہی کا ہے) اس میں پابندی نماز اور تقویٰ کا حکم ہے اس کو کفار کی ترقی کے مقابلے میں بیان کرنا اس کی دلیل ہے کہ اسلامی ترقی کا طریقہ یہ ہے۔

یہی اللہ میاں نے بھی ملاوٹوں ہی کے مذاق کی رعایت کی ہے۔ اب بتلاؤ! کیا اس فرمان کو ٹاڈ دو؟ میرا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے سارے کام چھوڑ دو۔ اور نماز روزہ ہی کے ہو رہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کو اصل مقصود نہ سمجھو، باقی بضرورت دین دنیا میں مشغول ہونے کا مضائقہ نہیں اس کی ایسی مثال ہے، جیسی کھانے کی ضرورت سے کندھے جمع کئے جاتے ہیں۔ اور جب کوئی پوچھتا ہے کہ یہ کھانا کتنے میں تیار ہوا ہے تو اس کی فہرست میں کندھے اور لکڑیاں بھی شمار ہوتی ہیں۔ (الاخوة ص ۲۳۱۵)

۶۹۔ ترقی متعارف کا رد۔

ترقی کا عنوان قرآن میں بھی آیا ہے اس لئے یہ عنوان ظاہر میں بھی بہت عمدہ ہے اس کی خوبی میں کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر قرآن میں اس کو خیرات کے ساتھ مقید کیا گیا ہے کہ باہم خیرات میں ترقی کو واجب فیصلہ اسپرے کہ جس امر میں تم ترقی کی تعلیم دے رہے ہو وہ خیر ہے یا نہیں، تو ظاہر ہے کہ تم ترقی مال و حکومت کی تعلیم دے رہے ہو اور اس کا خیر ہونا تم شریعت سے ثابت نہیں کر سکتے۔

شاید تم یہ کہو کہ قرآن میں ہے اِنَّمَا لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ اور كُنْتُمْ عَلَیْكُمْ اِذْ حَضَرَ اَھْلَکُمْ الْمَوْتُ اِنْ تَرَکْتَ خَیْرًا الْوَصِیَّتِ لِلْاُولَیِّیْنَ۔ (الاحکام)

یہاں خیر کے مراد مال ہے۔ لہذا ترقی مال بھی ترقی خیر ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے۔ ۱۔ فاستبقوا الخیرات میں خیر مطلق مراد ہے کہ خیر مطلق میں باہم سبقت کرو، اور مال خیر مطلق نہیں بلکہ غیر مقید ہے جس کی خیریت کے لئے بہت سی شرطیں ہیں جن کی تم رعایت نہیں کرتے لہذا تم اپنی ترقی مالی کو ترقی خیر نہیں کہہ سکتے اور جس درجہ میں مال خیر ہے اس درجہ میں طلب مال سے ہم مانع نہیں ہیں بلکہ اس کو ہم بھی جائز بلکہ فرض کہتے ہیں کیونکہ حدیث میں ہے کسب (الحلال) فیہینة قبل (الفسق)۔

مگر تم ہی بتلاؤ کہ جیسی ترقی آج کل (یعنی زمانہ تحریکات میں) ہو رہی تھی کیا وہ آج کل کی ترقی کا حال خیر تھی اس میں شریعت سے تجاوز نہ تھا کہ مسلمانوں کو پنڈت کا لقب دیا گیا۔ ہندوؤں کو مولانا کہا گیا تھے لگائے گئے۔ لگائے گئے گوشت کو منع کیا گیا۔ مسلمانوں سے قربانی کی گائیں چھینی گئیں۔ اور ہندو کی نسبت کہا گیا کہ نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی تو وہ نبی ہوتا پھر جن لوگوں نے یہ باتیں کہیں ان سے قطع تعلق نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کو بدستور لیڈر مانا گیا وغیرہ، اگر اس صورت میں بھی تمہاری ترقی استباق فی الخیر کا مصداق تھی تو فرعون سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور کامیاب ہونا چاہیے۔ اس وقت لوگوں کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی کہتا کہ یہ کام شریعت کے خلاف ہے تو اس کو یہ جواب دیا جاتا کہ تم محض ملانے ہو۔ تم کو سیاسیات کی کچھ نہیں۔ یہ وقت جائز اور ناجائز کے سوال کا نہیں، اب تو جس طرح ہو ترقی حکومت ہونا چاہیے۔ افسوس ان لوگوں کو خیر نہیں کہ شریعت میں سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ ملاپ کی مطلوب ہے اور سلطنت سے مقصود بھی ملانا نہیں ہی کا پھیلا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَلَّذِیْنَ اِنْ مَلَکْنَاهُمْ فِی الدَّرَہِ اَخْتَمْنَا مَلِیَّ الصَّلَاةِ وَاتُوا لِلرَّحْمٰنِ عٰلَمًا وَامْرًا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ مگر لوگ اس کو مٹا رہے

تھے تو اس صورت میں اس کو ترقی خیر کون کہہ سکتا ہے۔ پس حرص کا عنوان ترقی رکھ لینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی مگر ان لوگوں نے تو اس عنوان سے اس کا عیب چھپانا چاہا ہے۔ جب اس کا نام ترقی رکھ لیا تو اب وہ ان کے نزدیک مرض اور عیب ہی نہ رہا پھر وہ اس کا علاج کیا خاک کریں گے؟ (حلالہ (خصوص ص ۷۱))

۷۰۔ تَوَجَّہْ اِلٰی اللہ کے معنی۔

اب سمجھو کہ توجہ الی اللہ کیا چیز ہے؟ بعض نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ توجہ الی اللہ یہ ہے کہ نماز پڑھے روزہ رکھے اور احکام شریعہ بجالائے۔ ان لوگوں نے ظاہری اعمال پر اکتفا کر لیا۔ یہ لوگ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہونے کو ضروری نہیں سمجھتے مگر پھر وہ سوچتے ہیں کہ باوجود یہ کہ ہم سب کچھ کر رہے ہیں لیکن اس میں برکت اور نورانیت کیوں نہیں پیدا ہوتی۔ تقاضا مناسبت کیوں نہیں ہوتا۔ چنانچہ آپ بہت سے نمازیوں کو گناہ میں مبتلا پائیں گے اور بعض نے کہا کہ توجہ الی اللہ کے معنی صرف یہ ہیں کہ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہو، یہ لوگ ذکر و شغل اور مراقبات ہی کو لے بیٹھے۔ انہوں نے نماز روزہ اور تلاوت قرآن اور نذر بد کا بکنا وغیرہ سب چھوڑ دیا۔ مگر ان کو بھی برکت اور نورانیت حاصل نہ ہوئی کیونکہ یہ لوگ بھی معاصی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور دل میں گناہوں کا تقاضا مناسبت شدید پاتے ہیں۔ تو سنا کہ توجہ الی اللہ کی حقیقت تو یہی ہے کہ خدا کی طرف دل سے متوجہ ہو، مگر حقیقت کی ایک صورت بھی ہوتی ہے اور توجہ الی اللہ کی صورت وہی ہے جو شریعت نے بتلائی ہے پس دونوں کو جمع کرنا چاہیے کہ دل سے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور ظاہر سے اعمال شریعہ کے پابند ہو۔ طاعات کو بجالاؤ اور معاصی سے بچنے کا اہتمام کرو، نگاہ کو روکو، اور نامحرموں کی باتیں بھی نہ سنا۔ اس کے بعد بھی اگر نورانیت نہ ہو تو ہم پر ہنسنا۔ اس وقت میں وہی کہتا ہوں جو ایک صاحب طین نے کہا ہے

چشم بند و لب بر بند و گوش بند !

گرد بینی نور حق بر ما بخند !

اس وقت یہ غلطی ہو رہی ہے کہ بعض تو اعمال ظاہر کے تارک ہیں اور اعمال باطن کے تارک ہیں۔ اس لئے توجہ الی اللہ کامل طور سے حاصل نہیں ہوتی۔ دونوں کو جمع کرنا چاہیے۔

(حلالہ (خصوص ص ۷۱))

۱۔ پردہ کا عقلی ثبوت

آج کل بعض ناعاقبت اندیش پردہ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ پردہ کے توڑنے میں قطع نظر خلاف شرع اور گناہ ہونے کے اتنی خرابیاں ہیں کہ آج جو عقلا پر پردہ کی مخالفت کرتے اور پردہ اٹھا دینے کی کوشش کرتے ہیں ان خرابیوں کو دیکھ کر بعد میں خودی یہ بخود کریں گے کہ پردہ ضرور ہونا چاہیے مگر اس وقت بات قابو سے نکل چکی ہوگی اب تو بنی بنائی بات ہے اس کو نہیں بگاڑنا چاہیے۔ پھر بتائیں گے اور کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ آج کل ایسا مذاق بڑھ گیا ہے کہ کوئی پردہ کو خلاف فطرت کہتا ہے۔ کوئی قید اور جس بیجا کہتا ہے۔

ایک سلمان انجینئر تھے۔ ان سے ایک پادری انجینئر نے کہا کہ مسلمانوں کا مذہب بہت اچھا ہے اس میں سب خوبیاں ہیں مگر عورتوں کو قیدیں رکھا جاتا ہے۔ مسلمان انجینئر نے کہا کہ ہاں ہم نے تو کسی مسلمان عورت کو قید میں نہیں دیکھا۔ کہا ہی قید ہے جس کا نام تم نے پردہ رکھا ہے۔ تو ان مسلمان انجینئر صاحب نے پادری سے کہا کہ پہلے آپ یہ بتائیے کہ قید کس کو کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قید جس خلاف طبع کو کہتے ہیں۔ اور جو جس خلاف طبع نہ ہو اس کو قیدہ گز نہ کہیں گے ورنہ پاخانہ میں جو آدمی پردہ کر کے بیٹھتا ہے اس کو بھی قید کہنا چاہیے۔ کیونکہ پاخانہ میں آدمی تمام آدمیوں کی نگاہوں سے چھپ جاتا ہے۔ سب سے الگ ہو جاتا ہے مگر اس کو کوئی نہیں کہتا کہ آج ہم بھی اتنی دیر قید میں رہے۔ اور دفن کروا کر اس پاخانہ میں کی بولا ضرورت بند کر دیا جائے کہ باہر سے نہ بخر لگادیں اور ایک پہرہ دار کھڑا کر دیا جائے اور اس سے کہہ دیا جائے کہ خبردار! یہ آدمی یہاں سے نکلنے نہ پاوے تو اس صورت میں بیشک یہ جس خلاف طبع ہو گا اور اس کو ضرور قید کہیں گے اور اس صورت میں بند کرنے والے پر جس بیجا مقدمہ قائم ہو سکتا ہے۔ بتلائیے ان دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے؟ فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں جس خلاف طبع نہیں اور دوسری میں خلاف طبع ہے۔

پس ثابت ہو کہ مطلق جس کو قید نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ جس خلاف طبع کو قید کہتے ہیں پس آپ کو پہلے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ مسلمان عورتیں جو پردہ میں رہتی ہیں وہ انکی طبیعت کے موافق ہے یا خلاف اس کے بعد یہ کہنے کا حق تھا کہ پردہ قید ہے یا نہیں، میں آپکو مطلع کرتا ہوں کہ پردہ مسلمان عورتوں کے خلاف طبع نہیں ہے کیونکہ مسلمان عورتوں کیلئے حیا

امربتی ہے۔ لہذا پردہ جس موافق طبع ہو اور اس کو قید کہنا غلط ہے۔ ان کی حیا کا مقتضا یہی ہے کہ پردہ میں مستور ہیں بلکہ اگر ان کو باہر پھرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ خلاف طبع ہو گا۔ اور اس کو قید کہنا چاہیے۔ (کسار النساء ص ۵۹)

۲۔ کیا وجہ ہے کہ اعمال آخرت میں رغبت

نہیں ہوتی۔

اعمال میں کوتاہی اور بے رغبتی کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اعمال میں اور ان کی اجزاء میں کچھ تعلق اور ارتباط نہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ ان اعمال پر جو ارتباط ملتی ہیں ان میں اور اعمال میں باہم کوئی علاقہ نہیں، ایسا سمجھتے جیسے اس دنیا کے اسباب اور مسببات میں علاقہ ہے۔ مثلاً سہارہ پر سے ریل میں سوار ہو کر نیلی تال چلے تو اس لین میں اور نیلی تال میں یہ علاقہ ہے کہ پہلے ریل پر چلے پھر ریل سے چل کر کانٹھ گودام کا اسٹیشن ملتا ہے وہاں کچھ دیر کے بعد اور سواری ملتی ہے جس کا لینی تال اور ان اسباب میں ایک قوی علاقہ ہے تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ کی وجہ سے کشش ہوتی ہے اور یہاں علاقہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور سمجھ میں آئے نہیں آتا کہ نظر نہیں آتا۔ اس لئے دل کی کشش نہیں ہوتی یعنی ابھرتی نہیں طبیعت جیسی کے لئے ابھرتی چاہیے۔ بخوان دیگر، میری مراد یہ ہے کہ اس مقصود کے لئے طبیعت اس واسطے نہیں ابھرتی کہ خود اس مقصود کو اپنے اختیار میں نہیں سمجھتے اور خود اس واسطے نہیں سمجھتے کہ اسباب اور مقصود میں یعنی اعمال میں اور جزاؤں میں کچھ علاقہ نہیں سمجھتے ورنہ اگر علاقے سمجھتے تو چونکہ اسباب اختیاری ہیں اس لئے اس حیثیت سے مقصود کو بھی اختیاری سمجھتے۔ جب اختیاری نہیں سمجھتے تو طبیعت ابھرتی بھی نہیں کیونکہ طبیعت اسی کام میں ابھرتی ہے جس کو انسان اپنے اختیار میں سمجھتا ہے چنانچہ یہی بات ہے کہ عامی کو کبھی سلطنت کی ہوس بھی نہیں ہوتی اس کو کبھی اس کو دوسرے بھی نہیں آتا کہ میں بادشاہ ہو جاؤں، وہ بھی اسپر غور ہی نہیں کرتا کہ کسی ترکیب سے سلطنت حاصل کرو، بادشاہ بنو، محل میں رہو، مثلاً ایک رئیس سے پوچھا کہ بادشاہ یوں محل میں رہا کرتے ہیں یوں ان ساز سامان ہوتے ہیں یوں ششم و خدم ہوتے ہیں۔ خیر ان عجبات امور کو سن کر چاہے اس کا محی خوش ہونے لگے لیکن یہ گز نہ ہو گا۔ اس کی طبیعت میں گدگدی اور دھڑ دھڑی پیدا ہو کہ کسی ترکیب سے سلطنت حاصل کرنی چاہیے لاؤ سلطنت حاصل کرنے کا طریق معلوم کریں،

یہ بھی سمجھتا ہے کہ اگر کسی سے پوچھو تو وہ بھی تودہ ڈانٹ دے گا کہ اب تو بالکل ہو گیا ہے معلوم ہونے لگا ہے کہ جوتیاں کھا دے گا۔ سبحان! رہیں جھوٹے دل میں خواب دیکھیں محلوں کا۔

غرض بادشاہوں کے قصے سنکر وہ سلطنت حاصل کرنے کا طریق معلوم نہ کرے گا۔ اور اگر معلوم بھی کر لے تو کیا ہے۔ وہ اتنے بعید ہیں کہ وہ قیما رہ کا طائر دم بھی وہاں نہیں ہو پنا سکتا۔ اب سر نوکر رکھنے والا اور گواہ اٹھانے والا بھی بادشاہوں کے قصے سنتا ہے۔ لیکن کیا بھی اس کے ذہن میں بھی یہ خیال آتا ہے کہ لاؤ میں بھی بادشاہ بننے کی کوشش کروں۔ کس سے پوچھوں کہ سلطنت کیونکر حاصل ہوتی ہے۔ اگر معلوم ہوا کہ لڑنے سے حاصل ہوتی ہے تو کیا مشکل ہے ہم بھی فوج اکٹھا کر لیں گے۔ ہم بھی لڑیں گے۔ میں پوچھتا ہوں کیا اس کے بھی ذہن میں یہ خیالات آتے ہیں؟ کبھی نہیں اس واسطے کہ وہ اسباب ہی اختیار میں نہیں تو پھر کتنا ہی بڑا مقصود کیوں نہ ہو۔ طبیعت ابھرتی ہی نہیں۔ بخل اس کے نبی تال کا حال سنا تو طبیعت میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے فکر ہوتی ہے کہ بس پچاس روپے پاس ہوں تو وہاں پہنچیں۔ اور اگر ہوں بھی پاس، بس پھر کیا ہے۔ پھر تو سمجھتا ہے کہ وہاں پہنچنا گویا ہر وقت اختیار میں ہے اور سوچتا ہے کہ جب اختیار میں ہے تو پھر کیوں نہ حاصل کیا جاوے اس مقصود کو۔ چنانچہ نہایت ثوق کے ساتھ وہاں پہنچنے کا فوراً اہتمام کرنے لگتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو جس مقصود کے اسباب کو انسان اختیاری نہیں سمجھتا ہو لیکن اسباب اور مقصود میں تعلق معلوم نہ ہو تب بھی حرکت نہیں ہوتی۔ اس حالت میں اسباب کی طرف حرکت نہ ہونگی وجہ اسباب ہیں اور مقصود میں تعلق معلوم نہ ہونا ہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مقصود کی طرف حرکت نہ ہونے کی کہ ان اسباب اور مقصود میں چونکہ تعلق معلوم نہیں اس لئے ان اسباب پر اس مقصود کے ترتیب کا متقن نہیں اور اس متقن نہ ہونے سے باوجود اسباب کے اختیاری سمجھنے کے بھی اسباب کو اختیار نہیں کرتا اس واسطے کہ مقصود اگر اختیار میں ہے تو بواسطہ اسباب ہی کے تو اختیار میں ہے تو گو اسباب اختیار میں ہیں لیکن چونکہ اسباب اور مقصود میں تعلق نہیں اس لئے اسباب کے اختیار کرنے کا حال طاری نہیں ہوا اس کو جس طرح اسباب کے اختیاری ہونے کا علم ہے۔ اسی طرح اگر یہ بھی معلوم ہوتا کہ اگر اسباب اور مقصود میں یہ تعلق ہے تب طبیعت ابھرتی اور ثوق پیدا ہوتا۔ اب وہ تعلق تو چونکہ ذہن میں حاضر نہیں اس لئے اسباب اختیار کرنے میں جی لگتا نہیں ہے۔ یہ اطمینان نہیں ہے کہ اسباب اختیار کرنے سے مقصود ضرور حاصل ہو ہی جائے گا پھر جب مقصود ہی کو اختیاری نہیں سمجھتا تو اس کے اسباب اختیار کرنے کی طرف بھی حرکت نہیں ہوتی۔

جب یہ بات سمجھیں آگئی بطور مثال کے، تو اب یہ سمجھئے کہ نعمائے آخرت اور جنت کی طرف جو طبیعت نہیں ابھرتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اعمال میں اور مقصود میں جو واقعی علاقہ ہے وہ نہیں سمجھتے یعنی ایسا علاقہ جیسا آگ جلائے اور کھانا پکھنے میں ایسا علاقہ جیسے پانی پینے اور پیاس کے بجھنے میں ایسا علاقہ جیسے ہمسر خاندان میں پیام دینے اور عورت کے گھر آجانے میں۔ غرض ایسا علاقہ نہیں سمجھتے اعمال صالحہ میں اور جنت کے حاصل ہونے میں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص قریب قریب یہ سمجھتا ہے کہ جنت میں داخل ہونا اختیاری نہیں۔ ہرگز ہرگز ذہن اس کی طرف نہیں جاتا کہ اعمال صالحہ پر جنت ضرور ہی مل جاوے گی۔ ایسا سمجھتے ہیں جنت کو کہ اعمال صالحہ پر بس محض اتفاقاً ہی مرتب ہو جاتی ہے جیسے کسی کو اتفاق سے سلطنت مل جائے مثلاً کہیں اتفاقاً ہمارے سر بیٹھ گیا اس لئے بادشاہت مل گئی۔ چنانچہ پرانے زمانہ کے ایسے ہی افسانے ہیں کہ کسی جگہ کا بادشاہ مر گیا اس کے کوئی اولاد بھی نہیں۔ اس لئے اس میں اختلاف ہوا کہ کس کو بادشاہ بنایا جاوے۔ اس کے متعلق پہلے یہ دستور تھا کہ ہمارا اڑاتے تھے وہ جس کے سر پر بیٹھ جاتا اس کو بادشاہ بناتے تھے اور کوئی فقیر بھی اس وقت ہوتا اور اس کے سر پر ہا بیٹھ جاتا اسی کو بادشاہ بنا دیتے چنانچہ ہمارا اڑا گیا۔ جانور کو کیا عقل اتفاق سے ایک فقیر ہی کے سر پر جا بیٹھا۔ بس اسی کو تخت پر بیٹھا دیا گیا۔ اب اگر کوئی فقیر یہی حوصلہ کرنے لگے اور وہاں پہنچنے کا اہتمام کرے کہ شاید ہمارے ہی سر پر بیٹھ جائے اور میں بادشاہ ہو جاؤں تو سب اس کو احمق بنائیں گے کہ یہ کیا نوع حرکت ہے۔ یعنی محض ایک موہوم امید پر کہ شاید ہمارے ہی سر پر آ بیٹھے، اتنا لمبا سفر کرنا اور جو نہ بیٹھا پھر اتنا لمبا سفر بھی کیا۔ اور وہاں سفر کے بھی بوم ہوئے یعنی ہمارا تو کیا سر پر بیٹھا سب اتنا بتاتے کہ بڑا گدھ ہے فلاں فقیر۔ اسپر قہقہہ لگا دیں گے کہ بالکل ادھی ہے بھلا تیرا ہی تو منتظر ہے ہمارا کہ کب وہ آئے اور کب میں اس کے سر پر بیٹھوں تو کہیں کا۔ اور کسی کا الو سیدھا کرنے کے لئے ہاکیوں ٹیڑھا ہونے لگا کیونکہ یہی ٹیڑھا ہونا ہے اس کا کہنا اہل کے سر پر بیٹھے۔ پھر جب یہ حال ہے تو بھلا اسپر کوئی کیا سفر کرے۔ تو جیسے ہمارا سر پر بیٹھا غیر اختیاری سمجھا جاتا ہے اسی طرح جنت کا حاصل ہونا بھی لوگ غیر اختیاری سمجھتے ہیں۔ واقعی ٹول کر دیکھئے لیجئے اپنے وجدان کو اکثر کیا یہی قاعدہ ہے کہ جنت کا حاصل ہونا کسی کے اختیار ہی میں نہیں۔ حضرت میں کہتا ہوں اگر جنت اختیار میں نہیں تو حق تعالیٰ یہ کیوں ارشاد فرماتے ہیں۔ و سار مولانا فی مغفرتی ربک وجنتی۔ دوڑ و مغفرت اور جنت کی طرف، تو کیا اللہ میاں اندھی کو ٹھہری میں دوڑا کر سر پھڑواتے ہیں۔ پھر حکم بھی دوڑ کر چلنے کا فرمایا تو معلوم ہوا کہ مڑا کر بالکل

صاف ہے جو شخص اعمال صالحہ کرے گا۔ بشرطیکہ ایمان بھی ہو، وَاللّٰهُ الْعَظِیْمُ شَیْءٌ وَاللّٰهُ الْعَظِیْمُ شَیْءٌ وہ مزدبخت میں داخل ہوگا۔ تو جب ہے کہ یہ شخص گویا تکذیب کرتا ہے نصوص کی۔ اور یہ خبرانی کی ہے جاہل و اعظونے، انہوں نے بس یہ حدیث بیان کر دی کہ ایک شخص تھا جس نے ساری عبادت گزار دی اور جنت کے کام کئے لیکن آخر میں دوزخی ہو گیا حالانکہ اس جاہل و اعظونے حدیث کو سمجھا ہی نہیں۔ حدیث میں جو آیا ہے اس کا سبب بھی کسی عمل اختیار ہی کا محدود ہے۔ (آثار المربع ص ۱۲)

۳۔ عالم مثال اور عذاب و ثواب قبر کا اثبات

اور عالم مثال کا اثبات کرتا ہوں۔ سو سمجھ لیجئے کہ یہ ثابت ہے اشارات نصوص سے۔ اور اشارات تو میں نے احتیاطاً کہہ دیا ہے ورنہ وہ اشارات بمنزلہ مراحت کے ہیں تو گویا بالترصیح یہ بات ثابت ہے کہ علاوہ شہادت یعنی دنیا کے اور عالم غیب یعنی آخرت کے ان دونوں کے درمیان میں ایک اور بھی عالم ہے جس کو عالم مثال کہتے ہیں جو من و دہر مشابہ ہے عالم شہادت کے اور من و دہر مشابہ ہے عالم غیب کے یعنی وہ برزخ ہے درمیان دنیا اور آخرت کے اور اس عالم کے ماننے سے ہزاروں اشکالات قرآن و حدیث کے حل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً حدیث میں ہے اور یہ کام کی بات ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ قبریں اس طرح سے عذاب ہوگا یا ثواب ہوگا مثلاً عذاب کی ایک صورت یہ بھی ہوگی کہ زمین مل جائے گی اور صاحب قبر کو دیلے گی۔ اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جتنا فصل لکھن اور قبر کی دیواروں میں مردہ کو رکھتے وقت ہوتا ہے وہی باقی رہتا ہے لاش دبی دباتی کچھ بھی نہیں ویسی کی ویسی رکھی رہتی ہے۔ تو یہ صورت عذاب قبر کی جو حدیث میں آئی ہے ظاہر ہے کہ دنیا کے متعلق تو ہے نہیں کیونکہ مشاہدہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔

یہ اشکال اس وجہ سے اور بھی قوی ہو گیا کہ لوگوں نے اس کو دنیا ہی کے متعلق سمجھ لیا ہے حالانکہ اگر دنیا کے متعلق ہوتا تو اس کے آثار کا نظر آنا بھی ضروری تھا۔ اور آخرت کے متعلق سمجھا جائے تو ازل تو آخرت میں وہ زمین نہیں جو لفظ زمین سے متبادر ہے۔ دوسرے یہ کہ آخرت میں اگر وہ پہرے پوچھ جادے تو پھر وہاں وہی ٹھکانے ہیں جنت یا دوزخ۔ اور داخل ہونے کے

بعد جنت سے تو کسی کا ٹھکانا ممکن نہیں اور دوزخ سے بھی سب کا ٹھکانا ممکن نہیں۔ اور حشر ہوگا جنت اور دوزخ سے باہر تو معلوم ہوا کہ ابھی جنت یا دوزخ میں گیا ہی نہیں۔ پھر حدیث کے کیا معنی تو ازل نظر میں تو کسی کو یہی شبہ ہو سکتا ہے کہ جو ملاحظہ اور اہل سائنس کہتے ہیں وہی ٹھیک ہے چنانچہ ملاحظہ اور بعض اہل سائنس جو ایمان لائے ان کا بھی مذہب یہی رہا کہ یہ سب مثالیں ہیں اور تشبیہیں ہیں۔ اور مطلب ان مثالوں کے دینے سے یہ ہے کہ ایسی حالت ہوتی ہے یعنی بعض مشابہہ ان حالتوں کے ہوتی ہے۔ واقع میں یہ حالتیں پیش نہیں آتیں۔ تو اپنے نزدیک گویا بہت بڑی دور درازے۔

حاصل اس تقریر کا یہ ہوا کہ وہ لوگ محض روحانی عذاب و ثواب کے قابل ہو گئے اور جسمانی کے منکر ہو گئے۔

اسی طرح حدیث شریف میں جو ہے (الْحَقُّ رُوحَانِیٌّ یَّرِیُّ اَعْمٰی وَحُفْرَتِیْ حَفْرَتِیْ) یعنی قبر یا جنت کا ٹھکانا ہوتی ہے یا دوزخ کا گڑھا۔ تو وہ لوگ اس پر کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے ہیں قبریں کہ یہاں نہ تو پھول ہیں جنت کے نہ آگ ہے دوزخ کی پھر اپنے ظاہری منوں پر قبر دوزخ کا گڑھا یا جنت کا ٹھکانا کیونکر ہو سکتی ہے۔ غرض یہاں قبر کی جنت و دوزخ میں تو یہ اشکال ہے، وہی آخرت سو وہاں کی دوزخ و جنت میں وہ اشکال ہے جو میں نے پہلے عرض کیا۔

بہر حال یہ اشکال حل نہیں ہو سکتا جب تک تیسرے عالم کے قائل نہ ہوں۔ یعنی عالم برزخ کے، جس کو عالم مثال بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ مشابہہ اس عالم کے بھی ہے یعنی باعتبار آخرت ہے تو گویا کہ وہ دنیا ہے۔ اور باعتبار دنیا کے گویا وہ آخرت ہے تو وہ ایسا عالم ہے جیسا کہ باغ کا پھل ایک کر بہ نسبت اندرونی حصہ باغ کے، تو گویا وہ باغ نہیں ہے۔ لیکن بہ نسبت خارج حصہ باغ کے گویا کہ وہ باغ ہے۔ یا جیسے حوالات کہ بہ نسبت گھر کے تو وہ جیل خانہ ہے مگر بہ نسبت جیل خانہ کے پھر گھر ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے عالم مثال کو دنیا کا بھی نمونہ بنایا ہے۔

تو جس وقت انسان مرتا ہے پہلے اس عالم مثال ہی میں جاتا ہے۔ وہاں ایک آسمان بھی ہے مشابہہ دنیا کے آسمان کے اور ایک زمین بھی ہے مشابہہ دنیا کی زمین کے۔ اور ایک جسم بھی ہے مشابہہ اس جسم کے لیکن وہ بھی ہے جسم ہی۔ تو مرنے کے بعد تو روح کے لئے ایک جسم مثال ہوگا اور آخرت میں جو جسم ہوگا وہ بھی ہوگا جو دنیا میں ہے۔

عصر ص ۱۲ ایمان ہے ہمارا کہ حشر روحانی بھی ہے اور جسمانی بھی یعنی یہی جسم جو ہم اب

لئے بیٹھے ہیں اور جو گل سرگز خاک ہو جائے گا اسی کو حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے پھر تازہ بنا کر محصور فرمائیں گے۔ لیکن وہاں اس جسم کی خاصیت بدل جائے گی یعنی اب تو یہ خاصیت ہے کہ جو ہم کھاتے پیتے ہیں اس کا پیشاب پاخانہ بنتا ہے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں یہاں تک کہ ایک دن مرکز فنا ہو جاتا ہے وہاں گویا ابدی اور خالد ہو جائے گا۔

عصر ض ایک تو جسم یہاں ہے اور ایک جسم ہے عالم مثال میں اور وہ مشابہ ہے اس جسم کے یہ جسم بعینہ نہیں تو عالم مثال میں بدن بھی مثالی ہے وہاں کی جنت بھی مثالی ہے دوزخ بھی مثالی ہے۔ بس اس عالم مثال ہی کا نام قبر ہے۔ اب سب اشکال رفع ہو گئے۔ کیا معنی کہ قبہ کے مراد یہ محسوس گڑھا نہیں ہے۔ کیونکہ کسی کو میٹر یا کھایا گونی سمندر میں غرق ہو گیا تو اس صورت میں چونکہ وہ زمین میں دفن نہیں ہوا اسلئے اس کو چاہیے کہ قبر کا عذاب ہی نہ ہو۔ لیکن اب اشکال ہی نہ رہا کیونکہ وہ عالم مثال ہے وہیں اس کو عذاب قبر بھی ہو جائے گا۔ اشکال تو جب ہوتا جب قبر سے مراد یہ گڑھا ہوتا جس میں لاش دفن کی جاتی ہے حالانکہ اصطلاح شریعت میں قبر گڑھے کو کہتے ہی نہیں بلکہ عالم مثال کو کہتے ہیں قبر اور وہاں ہو چنا کسی حال میں منتفی نہیں، خواہ مردہ دفن ہو یا نہ ہو۔ اور اس عالم مثال کے نہ جاننے ہی کی وجہ سے یہی کہتے ہیں، عوام کی قبر ذرا بڑی رکھنی چاہیے تاکہ مردہ کو بیٹھنے میں تکلیف نہ ہو، تو معلوم ہوتا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسی قبر کے اندر مردہ کو بیٹھایا جاتا ہو گا۔ تو بس پھر کیا ہے اگر اپنے دشمن کو ستانا ہو تو اس کی قبر ذرا تنگ بنا دی جاوے تاکہ ہرگز بھی اسے دشمن کے لئے تنہا نہ کرے ہیں کہ مر کر بھی مصیبت سے نہ بچے تو اچھا ہے حضرت یہ جو دین قبر شریعت نے تجویز کی ہے یہ اس بنا پر مقرر ہوا ہے کہ اس کے اندر مردہ کو بیٹھایا جائے گا۔ جیسے آپ اس وقت بیٹھے ہیں بلکہ یہ تو محض اکرام اور عزت ہے مومن کی کہ اس کو مر کر بھی بیکار نہ سمجھے گیا۔ مرنے کے بعد بھی اس کے مرتبے کا لحاظ کیا اور ہر طرح اس کا اکرام کیا۔ یہ نہیں کہ دباں تھا ٹال دیا۔ بلکہ یہ حکم ہوا کہ اس کی اس وقت بھی خاطر تواضع کرو۔ قرایسی بناؤ کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو دیسی ہی جگہ اس کے لئے تجویز کرتے کپڑا ایسا پہناؤ جیسا کہ وہ زندگی میں پہنتا۔ یعنی دیسا ہی صفائی ہو خوشبو میں بھی لگاؤ۔ نہلاؤ دھولاؤ بھی، غرض بنا سزاؤ کر عزت کے ساتھ اس کو رخصت کرو اور واقعی جیسا مسلمانوں میں مردہ کا اکرام ہوتا ہے کسی قوم میں نہیں ہوتا، اور عیسائیوں میں بھی بہت اکرام ہوتا ہے کسی قوم غلو بہت زیادہ ہے یہاں تک کہ بیٹی بھی کہتے ہیں۔ بوٹ بھی، بیٹی بھی غرض پوری دردی پہناتے ہیں۔ گویا وہاں جا کر بھی صاحب بہادر پہرہ ہی دیں گے۔

عصر ض عیسائیوں کے یہاں تو اکرام میں غلو ہے اور ہندوؤں کے یہاں بالکل بھی اکرام نہیں بلکہ اور الٹی ہے حرمتی ہے۔ یہاں تک کہ بیمارے کا سر بھی پھوڑتے ہیں۔ خیر وہ بے چارہ تو نہیں ہے تو واقعی سر پھوڑے جانے کا سحق۔ بہر حال اسلام میں اعتدال ہے تو وہ عالم مثال ہے جہاں مرنے کے بعد انسان اول ہو پختا ہے اور وہ مشابہ کچھ اس عالم کے ہے اور کچھ مشابہ عالم آخرت کے ہے وہیں اس کو فرشتے بٹھلاتے ہیں وہیں اس سے سوالات کرتے ہیں وہیں کی زمین اس کو دباتی ہے وہیں اس کو عذاب و ثواب ہوتا ہے وہ عالم یہی ہے جس کو محدثوں میں قبر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور لو میں اب نہیں کچھ اس کا پتہ بھی بتائے دیتا ہوں جس سے یہی اس کی کچھ حقیقت سمجھ میں آجائے۔ اور وہ عالم کچھ خواب میں منکشف ہوتا ہے لیکن ایک تو خواب ہوتا ہے سچا اور ایک ہوتا ہے محض خیال، تو خواب سچا ہوتا ہے اس میں کچھ کچھ انکشاف اس عالم کا ہوتا ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ خواب میں حقیقت اس عالم کی مغلوب ہوتی ہے کیونکہ اس میں امیر بخش اس خیال کی بھی ہوتی ہے اور وہاں بالکل حقیقت ہی حقیقت ہوگی۔ وہ حقیقت اصل بھی عالم آخرت کی حقیقت اصل کے اعتبار سے تو بمنزلہ خواب ہی کے ہے بلکہ خواب میں جو حقیقت عالم مثال منکشف ہوتی ہے وہ بمقابلہ مثال کی حقیقت اصل کے اتنی ضعیف نہیں ہوتی ہے جتنی عالم مثال کی حقیقت اصل بمقام عالم آخرت کی حقیقت اصل کے ضعیف ہے وہ اس سے بھی ضعیف تر ہے۔ تو خواب میں اگر کوئی یہ دیکھے کہ مجھے سانپ نے کاٹا تو اب وہ خواب ہی میں بھاگتا ہے۔ چلتا بھی جیتا بھی ہے چلتا بھی ہے۔ اب کوئی اس سے کہے کہ ارے تو برابر بستر پر پڑا رہا ہے نہ بچھے کسی سانپ نے کاٹا تو بھاگا نہ چلایا، کیوں خواہ مخواہ جھوٹ بول رہا ہے تو کہہ سکتا ہے مگر چونکہ یہ امر خواب میں ہر شخص کو واقع ہوتا ہے اور عالم مثال منکشف ہوتا ہے اس لئے اس کی کوئی تکذیب نہیں کرتا اور شارع علیہ السلام اس کی خبر دیں تو وہاں تکذیب کرتا ہے۔ حیرت ہے تو عالم مثال میں ہر چیز کا نمونہ موجود ہے، یعنی مبنی چیزیں ہیں موجودات حقیقہ وہ سب وہاں موجود ہیں۔

ایسی مثال ہے جتنے آئینہ کہ اس میں بھی اپنی شبیہ نظر آتی ہے لیکن جس طرح آئینہ میں بھی ہمیشہ شکل بالکل مشابہ نظر نہیں آتی، یعنی آپ نے دیکھا ہو گا کہ کسی آئینہ میں تو بڑا لمبا چہرہ نظر آتا ہے کسی میں بہت چوڑا اور ایسا بڑا کہ خود ہی پھڑپھڑانے کو جی چاہے۔ اسی طرح سیاہ آئینہ میں سیاہ صورت نظر آتی ہے حالانکہ آپ نے چہرہ پر کالک نہیں لگا رکھی ہے اور سرخ آئینہ میں سرخ صورت نظر آتی ہے حالانکہ آپ نے چہرہ پر کوئی سرخ چیز نہیں ملی رکھی، تو جس طرح

یہاں جو چیزیں آئینہ میں نظر آتی ہیں وہ من کل الوجہ مشابہت نہیں رکھتیں اصل کے ساتھ، بلکہ جو آئینہ سمجھا ہوتا ہے وہ بالکل سچا نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ کم از کم اتنا فرق تو ضرور ہوگا کہ آپ تو مثلاً بیٹھے ہیں مغرب میں لیکن آئینہ میں آپ نظر آویں گے مشرق میں۔ تو دیکھئے کہاں رہی مشابہت من کل الوجہ۔

حضرتیہ جو آئینہ میں عکس نظر آتا ہے یہ محض ایک مثال ہے۔ اصل صورت کی۔ یعنی اس کو ایک گونہ مناسبت ہے اصل صورت کے ساتھ تو جیسے آئینہ میں سب چیزیں آتی ہیں اسی طرح عالم مثال میں اور اس عالم میں جو صورتیں مشابہ ہیں۔ ان میں سے بعض میں تو مائلت نہ ہوتی ہے اور بعض میں مناسبت جب یہ بات سمجھیں اگلی تو اب یہ سمجھئے کہ وہ مناسبت بعض اوقات جلی ہوتی ہے اور بعض اوقات خفی۔ مثلاً ہم نے خواب میں دیکھا کہ فلاں شخص کے لڑکا پیدا ہوا ہے اور بعد میں سن بھی لیا کہ واقعی اس کے لڑکا پیدا ہو گیا تو یہاں تو باہم مناسبت قوی ہے اور جلی ہے جس کو مائلت کہنا چاہئے اور کبھی مناسبت قوی نہیں ہوتی بلکہ ضعیف اور خفی ہوتی ہے جیسے میں نے دیوبند میں خواب دیکھا کہ منشی سورج طلوع ایک پلنگ پر بیٹھے ہیں لیکن وہ دو ہیں یعنی سرانے بھی وہی بیٹھے ہیں اور پانسی بھی وہی بیٹھے ہیں۔ غرض یہ دیکھا کہ وہ سورج اٹھتے ہیں۔ حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے یہ خواب بیان کیا تو مولانا نے فی البدیہ فرمایا کہ انشاء اللہ ان کے لڑکا پیدا ہوگا کیونکہ اولاد جو ہے وہ باپ کا وجود ثانی ہے چنانچہ ان کے گھر میں امید تھی لڑکا ہی پیدا ہوا۔ یہ مناسبت خفی تھی۔ یعنی بیٹے کو باپ کی شکل میں دیکھا یہ مائلت کو نہیں کہی جاسکتی ہاں مناسبت ہے۔ اب جس کو اس عالم مثال کی وجہ مناسبت کا زیادہ علم ہے وہی متبرہ ہوتا ہے اور جس کو جتنا زیادہ اس مناسبت کا علم ہوگا اتنا ہی وہ اعلیٰ درجہ کا معتبر ہوگا۔ کیونکہ تعبیر خواب کا حاصل یہ ہے کہ ممبر صورت مرئیہ سے صورت مثالیہ کی عبور کرتا ہے تو یہ ممبر صورت مناسبت کو سمجھ لیتا ہے کہ یہ کس حقیقت کی صورت ہے اور یہ کوئی بزرگی کی بات نہیں۔ بلکہ محض فراست ہے۔ چنانچہ بعض کفار بھی نہایت صحیح تعبیر دیئے ہیں۔ یہاں تک کہ البوہل بھی بڑا ممبر تھا تو اب کیا اس کو بھی بزرگ کہیں ہے۔

(آثار المربع ۳۸ تا ۴۳)

۷۴۔ اس اعتراض کا جواب کہ عالم آخرت محض

خیالی ہی ہے۔

یہ لوگ عالم مثال کے ایسے قائل ہوتے کہ سرے آخرت ہی کو اڑا دیا۔ یعنی آخرت کی حقیقت یہ یہ بیان کی کہ آخرت بھی مائلت میں وہاں مادیات نہیں، یعنی جیسے دنیا عالم مادی ہے اور عالم آخرت ان کے نزدیک ایسا نہیں ہے وہ غیر مادی ہے حالانکہ اہل حق کے نزدیک آخرت بھی عالم مادی ہے اور وہ غلط کار لوگ کہتے ہیں کہ آخرت عالم مادی نہیں ہے بلکہ محض تخیل ہوگا۔ لیکن ایسا قوی تخیل ہوگا کہ یوں معلوم ہوگا جیسے مادیات ہوں۔ پس ایسا عالم ہوگا جیسے خواب میں ہوتا ہے کہ سانپ کے کاٹنے کی تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے۔ انسان ڈرتا بھی ہے بھاگتا بھی ہے، چیتا بھی ہے، چلا تا بھی ہے لیکن واقع میں نہ کوئی سانپ ہوتا ہے نہ وہ کاٹتا ہے نہ کچھ ہوتا ہے وہ عذاب قبر کے بھی اسی طور پر قائل ہیں کہ مثلاً یہ جو آیا ہے کہ سانپ اور بچھو کاٹیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پیرچ سانپ اور بچھو کاٹیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسی سانپ اور بچھوؤں کے کاٹنے کی تکلیف ہوتی ہے اسی ہی تکلیف روح کو ہوگی اس تکلیف کو تعبیر کر دیا جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عنوان سے کہ سانپ بچھو کاٹیں گے۔

حضرتیہ وہ لوگ اس کے قائل ہو گئے کہ آخرت میں عذاب اور ثواب اس طور پر ہوگا جیسے بعض اوقات انسان پر خیال کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہاں بھی اعمال کی صورتیں ایسے طور سے نمایاں ہوں گی کہ وہ یوں سمجھے گا کہ میں باغوں میں پھر رہا ہوں، حوروں میں مشغول ہوں اور واقع میں باغ نہ ہوں گے نہ حوری ہوں گی۔ مگر تصنیف تخیل کا ایسا ہوگا جیسے یہاں آدمی بیٹھ کر وہم کر اپنے اوپر غالب کر لیتا ہے۔ (آثار المربع ص ۳۸)

اگر کوئی آخرت کو بھی ایسا ہی سمجھنے لگے جیسے بعض فلاسفہ کا عقیدہ ہے تو یہ سرا سر گمراہی ہے اور بالکل غلط عقیدہ ہے سو بعض کار تو یہ عقیدہ ہے جو مذکور ہوا کہ عالم آخرت میں اعمال ہی بشکل درخت وغیرہ تخیل ہوں گے اور ان میں واقعیت کچھ نہ ہوگی۔

باقی جو فصوص کو مانتے ہیں ان کا یہ عقیدہ تو نہیں لیکن ان میں بعض مبتدعین جیسے معتزلہ جنت و عذاب جنت کو فی الحال موجود نہیں مانتے۔ ان کو سرری نظر سے کچھ تاخیر مل گئی اس حدیث سے

کہ جنت ایک جلیل میدان ہے اور اس کے درخت سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واکبر ہیں۔ اس حدیث سے انہیں دھوکا ہوا اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ کسی شیخ سے پڑھنا چاہیے۔ وہ یوں سمجھے کہ جنت بھی خالی ہے اور دوزخ بھی خالی ہے ہم جیسے جیسے عمل کریں گے۔ یہ عمل ہی اس شکل سے ظہور کریں گے سو خوب سمجھ لیجئے یہ بھی غلطی ہے۔ واقع میں یہ سب چیزیں پہلے سے موجود ہیں مگر باوجود ہونے کے یہ انہیں اعمال کے ثمرات، کیونکہ خدا تعالیٰ کو تو معلوم ہے کہ کون شخص کیا کیا عمل کرے گا۔ اسی کے مناسب سزا جزا کی صورت پہلے سے بنا کر اس کے وجود واقعی کی خبر دیتے کے لئے یہ فرمایا اعدت للکافرین اعدت للمتقین۔ جیسے میزان کو پہلے سے معلوم ہو کہ میرے مہمان کا مزاج علیل ہے اور وہ پہلے سے اس کے مزاج کے مناسب کھانا تیار کر کے رکھ دیوے تو وہ کھانا رکھا گیا مزاج کے مناسب سے، یعنی سودا یا صفا یا بلغم کے لحاظ سے پلاؤ یا اور کوئی چیز اس کے لئے تیار کی گئی۔ ہاں یہ ادربات ہے کہ کسی میزان کو خبر ہی نہ ہو کہ میرے مہمان کا مزاج کیسے ہے۔ وہ کیا پرہیزی کھانا کھاتا ہے لیکن حق تعالیٰ جو میزان ہیں۔ انہیں تو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے مہمانوں کے مزاج کی کیا کیفیت ہے انہیں تو پہلے ہی سے مفصل علم ہے کہ میرا فلاں فلاں بندہ فلاں فلاں عمل کرے گا۔ پس ان اعمال کے مناسب ہی جزا و جزا کو مہیا فرما رکھا ہے۔ پس ”قیعان“ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ واقع میں وہ موجود ہے کیونکہ جنت کا معنی نہایت وسیع بالفعل موجود ہونا تو منصوب ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ درجہ حصول فی الحال میں قبل صدور اعمال بمنزلہ قیعان کے ہے اور درجہ ذات میں قیعان نہیں ہے۔

حاصلی یہ ہے کہ فی نفسہ قیعان نہیں بلکہ جنتوں کے حق میں قیعان ہے جیسے ایک شخص نے دس ہزار روپے اپنے خادموں کے لئے خرچہ جمع کر دیئے اور فی کام دس روپے پچاس روپے علی قدر مراتب نامزد کر دیئے۔ پھر وہ شخص سب کو خطاب کر کے یوں کہتا ہے کہ اتنا روپیہ خرچہ کرنے میں رکھا گیا ہے اگر تم خدمتیں کر دو گے تو خزانہ میں سب کچھ ہے۔ ورنہ یوں سمجھو کہ بالکل خالی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ قبل خدمتیں کرنے کے متعارف حق میں گویا خزانہ خالی ہے جب خدمتیں کرنا شروع کر دو گے تو اب سمجھو کہ وہ پر ہو گا واقع میں تو وہ اب بھی پر ہے لیکن متعارف حق میں وہ جی پر سمجھا جاوے گا جب تم خدمتیں کر دو گے تو معنی یہ ہیں حدیث کے کہ اعمال کے ثمرات تو پہلے سے مہیا کر دیئے گئے ہیں لیکن وہ ابھی کسی کی ملک نہیں بنائے گئے جیسے جیسے بندے عمل کرتے جاتے ہیں وہ ثمرات ان کے نامزد ہوتے جاتے ہیں۔

اب اس تقریر پر سب اشکالات رفع ہو گئے تو عالم مثال میں بھی حق تعالیٰ نے انہیں اعمال کو پہلے سے متحمل فرمایا ہے اور جنت و دوزخ میں بھی انہیں اعمال کی شکلیں پہلے سے پیدا فرمادی ہیں کیونکہ حق تعالیٰ کو تو معلوم تھا کہ میرے بندے کیا کیا اعمال کریں گے انہیں اعمال کی صورتوں کو جنت و دوزخ بنا دیا۔ (ایضاً صفحہ ۹۱۵)

۷۵۔ حقیقت پل صراط

حقیقت پل صراط امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھی ہے کہ شریعت میں ہر چیز کا اعتدال مقصود ہے اور اعمال فروع ہیں اخلاق کی۔ تو اصل محل اعتدال کا اخلاق ہیں۔ ان کا بیان یہ ہے کہ اخلاق کے اصول تین ہیں۔ یعنی اصل میں تین قوتیں ہیں۔ جو جڑ ہیں تمام اخلاق کی۔ یعنی جن قوتوں سے اخلاق پیدا ہوتے ہیں وہ تین ہیں۔ قوت عقلیہ، قوت شہویہ، قوت غضبیہ۔ حاصل یہ کہ منافع کے حصول اور مضار کے رفع کے لئے خواہ وہ دنیویہ ہوں یا اخرویہ، دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک وہ قوت کہ جس سے منفعت و مصرت کو سمجھے کہ یہ مصرت یا منفعت ہے وہ قوت مدد کہ قوت عقلیہ ہے اور ایک یہ کہ مصرت کو سمجھے کہ اس کو حاصل کرے۔ یہ قوت شہویہ کا کام ہے۔ اور یہ کہ مصرت کو سمجھے کہ اس کو دفع کرے۔ یہ قوت دفعہ قوت غضبیہ ہے پھر ان تینوں سے مختلف اعمال صادر ہوتے ہیں۔ پھر ان اعمال کے تین درجے ہیں۔ افراط و تفریط و اعتدال۔ چنانچہ قوت عقلیہ کا افراط یہ ہے کہ اتنی بڑھے کہ دج کو بھی نہ ملنے جیسے یونانیوں نے کیا۔ تفریط یہ ہے کہ اتنی گھٹے کہ جہل و سفٹک اتر آئے اسی طرح قوت شہویہ کا ایک درجہ افراط ہے کہ حرام و حلال کی بھی خبر نہ رہے۔ بیوی اجنبی سب برابر ہو جائیں۔ اور ایک درجہ ہے تفریط۔ یعنی ایسے پرہیزگار بنے کہ بیوی سے بھی پرہیز کرنے لگے۔ یا ایسا زاہد ایسے حریص ہوئے کہ اپنا پرہیز سب ہضم کرنے لگے۔ یا ایسے زاہد بنے کہ ضرورت کی چیزیں بھی چھوڑ دیں۔ اسی طرح قوت غضبیہ کا افراط یہ ہے کہ بالکل بھڑیا ہی بن جاویں۔ اور تفریط یہ کہ ایسے نرم ہوئے کہ کوئی جوتے سے بھی مارے دیں کو برا بھلا بھی کہے تب بھی غم نہ آوے۔ یہ تو افراط و تفریط تھا۔ ایک ان تینوں قوتوں کا اعتدال۔ یعنی جہاں شریعت نے اجازت دی ہو وہاں تو ان قوتوں کو استعمال کرے۔ اور جہاں اجازت نہ دی ہو وہاں ان قوتوں سے کام نہ لے۔ یہ اعتدال ہے۔ تو ہر وقت میں تین درجے ہوتے۔ افراط، تفریط، اعتدال

ان سب درجوں کے الگ الگ نام ہیں۔ جو قوت عقلیہ کا درجہ افراط ہے اس کا نام ہے جزیرہ اور جو تفریط کا درجہ ہے اس کو سفاهت کہتے ہیں جو اعتدال کا درجہ ہے اس کا لقب حکمت ہے۔ اسی طرح قوت شہویہ کا افراط کا درجہ فجور ہے۔ تفریط کا درجہ محمود ہے اعتدال کا درجہ عفت ہے۔ اور قوت غضبیہ کا بڑھا ہوا درجہ تہور ہے گھٹا ہوا درجہ جن ہے۔ اعتدال کا درجہ شجاعت ہے۔

تویہ نو چیزیں ہونیں۔ جو تمام اخلاق حسنہ و سیئہ کو جادوی ہیں اور مطلوب ان نو درجوں میں صرف تین درجے اعتدال کے ہیں۔ یعنی حکمت، عفت، شجاعت، باقی سب رد اکل ہیں تو اصول اخلاق حسنہ کے یہ تین ہوتے۔ اور ان تینوں کے مجموعہ کا نام عدالت ہے اس لئے اس امت کا لقب وسط ہے۔ یعنی امت عادلہ، غرض انسان وہ ہے جس میں اعتدال ہو۔ اب آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں بزرگ تو بہت ہیں، انسان بہت کم ہیں۔ چنانچہ مشاعر کہتا ہے۔

س زاهد شدی و شیخ شدی و دانش مندی -

ایں جملہ شدی ولیکن انسان نشدی -

جب یہ بات سمجھیں اگلی تو اب یہ سمجھئے کہ اعتدال حقیقی سب میں زیادہ مشکل ہے کیونکہ اعتدال حقیقی کہتے ہیں وسط حقیقی کو کہ اس میں وہ برابر نہ افراط ہو نہ تفریط ہو اور شاہدہ سے اس کا دشوار ہونا ظاہر ہے۔ اور پل صراط اسی اعتدال کی صورت مثالیہ ہے اور اس کی دشواری تلوار کی تیزی کی صورت میں ظاہر ہوتی اور اس کا اعتدال حقیقی بال سے زیادہ باریک ہونے کی صورت میں ظاہر ہو کیونکہ جب اعتدال وسط حقیقی ہوگا اور وسط حقیقی غیر منقسم ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ منقسم ہو تو پھر خود اس میں طرین اور وسط نکلیں گے، تو وہ وسط حقیقی نہ رہا۔ بہر حال وسط حقیقی کا غیر منقسم ہونا لازم ہے۔ اور وہ بال منقسم ہے تو وہ بال سے زیادہ باریک ہوگا۔

بس اس طرح شریعت کا وسط حقیقی ہونا اس شکل سے ظاہر ہوگا کہ وہ پل صراط بال سے زیادہ باریک ہوگا۔ اس تشبیہ میں کوئی اختلاف اصول عقلیہ لازم نہیں آتا۔ اور اس درجہ کے وسط ہونے سے اس کا مشکل ہونا بھی لازم آیا کہ نہ ادھر جاؤ نہ ادھر جاؤ۔ بیچوں بیچ میں رہو۔

بس یہ حقیقت پل صراط کی وہ شریعت کی صورت مثالیہ ہے جس کا بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہونا ثابت کر دیا گیا۔ تو شریعت پر چلنے والے اب بھی پل صراط پر چل رہے ہیں جب یہ ہے تو جو یہاں پل صراط پر یعنی شریعت پر چل چکا ہے وہ وہاں بھی باسانی چل سکے گا کیونکہ وہ یہی تو ہے۔ اب بتلائیے پل صراط پر چلنا کیا دشوار ہوا جو یہاں شریعت پر چل رہا ہے اسے وہاں بھی

چلنا آسان ہو جائے گا۔

سو پل صراط پر چلنے کا طریقہ بہت ہی آسان ہے اور وہ سنت کا طریقہ ہے۔ یہی سنت پنج کا راستہ ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں شیخ سعدیؒ

مپندار سعدی کہ راہ صفا
تواں رفت جز در پیے مصطفیٰ -
دریں راہ جز مرد راہی ز رفت
گم آن شد کی دنیاں راہی ز رفت
(آشنا والمرئع ص ۵۹)

۷۶۔ عقل کے معنی اور تشریح

عقل کے معنی لغت میں روکنے والا ہیں۔ اسی سے عقلاری کو کہتے ہیں کہ وہ جالڑ کو بھاگنے سے روکتی ہے۔ تو عقل کا حامل یہ ہو کہ وہ ایسی قوت ملد کہ ہے جو مفرت سے روکتی ہے۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ مفرت کیا چیز ہے اور منفعت کیا چیز ہے سو اصل میں مفرت کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور منفعت کی بھی، کیونکہ ہر منفعت میں کچھ مفرت بھی ہے اور ہر مفرت میں کچھ منفعت بھی ہے۔ اب عقل کا یہ کام ہے کہ وہ یہ بتا دیتی ہے کہ کہاں منفعت کا پہلو غالب ہے اور کہاں مفرت مثلاً ایک شخص کو شہت کی پیاس لگی ہوئی ہے۔ حلق خشک ہو جاتا ہے۔ دم نکلا جاتا ہے اسے وقت میں اس کے پاس صرف دودھ ہے۔ مگر دودھ ایسا ہے جس میں سے کچھ ساپ بھی پی گیا ہے جس کی ذمہ سے زہر پلا ہو گیا ہے اب بعض دوست تو یہ کہتے ہیں میاں دودھ پی بھی لو۔ ہتھارا حلق تو تر ہو جائے گا مگر پیاس تو بجھ جائے گی۔ اور بعض کہتے ہیں اسے ہرگز نہ پینا۔ کیونکہ اس میں زہر ہے۔ اس وقت حلق تر ہو جائے گا۔ مگر پھر حیات ہی منقطع ہو جائے گی۔ اس وقت عقل یہ فیصلہ کرے گی کہ گو دودھ پی لینے میں قدرے منفعت بھی ہے مگر یہ منفعت مستحبہا نہیں۔ اس لئے نہیں پینا چاہیے۔

الغرض منفعت قابل اعتبار وہ ہے جو ضرر پر غالب ہو۔ اسی طرح ضرر وہ قابل اعتبار ہے جو نفع پر غالب ہو۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ اس کے اور ملایئے کہ دنیا کی منفعت سے آخرت کی منفعت بڑھی ہوئی ہے۔ اور دنیا کی مفرت سے آخرت کی مفرت بڑھی ہوئی ہے۔ دنیا کی منفعت و مفرت آخرت کی منفعت و مفرت کے آگے کوئی چیز نہیں۔

ان دونوں مقدموں کے ملانے کے بعد عقل بھی یہی فتویٰ دی گی کہ جس کام میں دنیا کی منفعت ہو مگر آخرت کی مفرت ہو۔ ایسی منفعت کو چھوڑ کر آخرت کی مفرت سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اسی طرح کسی کام میں دنیا کی مصرت ہو اور آخرت کی منفعت ہو تو عقل کہے گی کہ چھوٹی مصرت کو بڑی منفعت کے لئے گوارہ کرنا چاہیے۔
 بس یہ ہے اصلی عقل۔ مگر آج کل لوگوں نے دنیا کمانے کا نام عقل رکھ لیا ہے۔ اگر اسی کا نام عقل ہے تو فرعون سب سے بڑا عاقل ہو گا مگر اس کا جاہل اور احمق ہونا تمام مسلمان کو مسلم ہے۔
 (الامتنی ص ۲)

خدا کا لا کھلا کھ شکر ہے کہ آج بتاریخ ۳ ربیع الاول ۱۴۵۳ھ
 بمقام موضع گنج متصل لاہور میں مواعظ کے انتخاب
 کا سلسلہ متعلقہ جوابات شبہات و اعتراضات اختتام
 کو پہنچا۔ واللہ العزیز۔

مکتبہ محمد تقی الدینی دہلی

سہارن پور۔ یوپی۔ پن نمبر ۲۴۰۵۵۲

کتبہ منظور الحسن اعظمی